خواب خواہش اور زندگی

رابعہ رزاق

kitaabghar.com

خواب، خواہش اور زندگی

رابعہ رزّاق

نوٹ:۔

اس ناول کے جملہ حقوق بنام مصنفہ رابعہ رزّاق محفوظ ہیں۔ مصنفہ نے یہ ناول خصوصی طور پر کتاب گھر (http://kitaabghar.com) کو آن لائن پبلشنگ کی اجازت دی ہے۔ لہٰذا اس تحریر کی کسی بھی اور آن لائن میگزین، ویب سائٹ، سیل فون ایپ یا انٹرنیٹ پر کسی بھی شکل میں کاپی کرنا خلافِ قانون ہے۔ خلاف ورزی کرنے والے کو قانونی کارروائی کا سامنا اور بھاری جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔

انتساب

میرے ابا جان اور امی جان کے نام
جنہوں نے اپنے خوابوں کو ہمارے راستوں کا جگنو بنا دیا
محض ہماری خواہشوں کی تکمیل کے لیے

http://kitaabghar.com
facebook.com/kitaabghar

یادوں کے دریچے کے اُس پار!

ایک خاموش طبع بچی ہے اور اس کے خیالات کا سلسلہ ہے۔

اس کی کوئی بہن تھی نہ سہیلی، مگر فطرت کے حسین نظارے، بکری کے بچے، چوزے اور کورس کی کتابیں اس کے سنگی تھی تھے۔

اردو کی کتاب کی ہر کہانی اسے زبانی یاد تھی اور وہ ہر کہانی کے کردار کے ساتھ بہت دور تک نکل جاتی تھی۔ سویا ہوا محل شاید کلاس ٹو یا تھری کی کتاب میں تھا اور یادوں میں آج تک محفوظ ہے۔

گویا کہانی پڑھنے کا شوق بچپن سے تھا۔

اور لکھنے کا.....

اس کا کریڈٹ امتل اور ریحانہ کو جاتا ہے۔

امتل نے کہا ناول لکھو۔

ریحانہ کے ساتھ بیٹھ کر جب کہانی کا تانا بانا بنا۔ تو اس نے خواب خواہش زندگی کا نام دیا۔

(ریحانہ اس کام میں ماہر ہے۔)

پھر ریحانہ نے ہر مہینے ڈانٹ ڈانٹ کر لکھوایا۔

خواب خواہش اور زندگی میرے تخیل کی پیداوار نہیں۔

بلکہ اس کے تمام کردار میرے اردگرد کی دنیا میں بستے ہیں۔ بہت ساری جگہوں پر حالات و واقعات کی ترتیب بھی تبدیل نہیں کی۔

مجھے عاشر عباس کی کہانی لکھنی تھی اور پھر باقی پردہ نشینوں کے کردار بخوبی اس کا حصہ بنتے چلے گئے۔

میں یہ نہیں کہتی کہ شمائلہ کو اس کے کیے کی سزا ملنی چاہیے تھی اور وہ اسی لائق تھی۔ میرا خیال ہے ہماری دنیا میں ایک ناشکری اور نفس کی غلام عورت کا کردار ہمیشہ سے سوالیہ نشان بنا رہا۔ اسے عورت کے نام پر دھبا کہا جاتا ہے، اسے گالیاں دی جاتی ہیں اور کبھی کبھی اس کا دفاع بھی کیا جاتا ہے کیونکہ ہم اپنے حصے کے بہت سارے قصور اور خطائیں فطرت و ماحول کے کھاتے میں ڈال کر بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔

لیکن کہیں اگر کوئی فطرت کے ساتھ تصادم کی صورت میں یہ بھی بھول جائے کہ عورت فطرتاً ''ماں'' ہوتی ہے تو پھر شمائلہ ماں کا جنم ہوتا ہے۔

اور ایسی عورتوں کو سزا کوئی نہیں دیتا مگر اولاد کے پاس احتساب کا پورا حق ہوتا ہے۔ اور اس احتساب سے کڑی سزا کوئی نہیں۔ اور کیوں نہ ہو۔ ماحول اور فطرت تو مریم اور راحت کے لیے بھی آزمائش تھا۔

مگر وہاں جیت نفس کی نہیں، عورت کی ہوئی، ماں کی ہوئی، وقت کے حصے میں عورت کے لیے ہی نہیں مرد کے لیے بھی برابر کی آزمائشیں ہیں۔

اور میرا مشاہدہ ہے کہ مردان آزمائشوں سے راہ فرار اختیار کرتے ہیں۔ مجھے راجہ طارق محمود سے یہ ہی شکایت تھی کہ اس نے جوگ کیوں لیا اور اپنی ساری زندگی کو بے ثمر کیوں کا۔

اس کہانی کی بنت میں، میرا دل ہمیشہ عظیم شاہ کے کردار پر پہنچ کر عجیب سے دکھ اور یاسیت میں گھر جاتا تھا۔ مجھے پتا تھا، لوگ اس سے نفرت کریں گے۔

لیکن مجھے اس کردار سے ہمدردی تھی۔

وہ بچے جو وقت اور حالات کی ٹھوکروں میں پل کر جوان ہوتے ہیں، جو اپنی معصوم عمر کو ایک ''خاموش حیرت'' سے گزارتے ہیں۔ وہ تمام عمر دوسروں کو حیران کرتے رہتے ہیں۔

ہم بہت سے بچوں کو عظیم شاہ بننے سے بچا سکتے ہیں۔ ارہم سڑک پر، چائے کے ہوٹلوں پر،

ورکشاپس میں، لڑکوں کے ساتھ کام کرنے والے بچوں کو دھتکارنے کے بجائے ہمدردی کی نگاہ سے دیکھیں۔

خواب زندگی ہوتے ہیں، خواب امید ہوتے ہیں لیکن خواب اور خواہش اگر حسرت اور ہوس میں ڈھلتے جائیں تو پھر منیر کمال، شمائلہ کمال، سرمد بخاری اور سعدیہ جیسے کردار جنم لیتے ہیں۔ لیکن اگر شر و خیر کا تضاد کچوکے لگاتا ہے تو سعدیہ کی طرح گھر واپسی کا راستہ مل جاتا ہے۔

حقیقت کو جاننے کے لیے تجربے کی بھینٹ چڑھنا ضروری نہیں۔ مشاہدے سے کام لے کر، عقل و فہم کو استعمال میں لا کر، زندگی کی بساط پر خواب اور خواہش کے مہرے جیت کے یقین کے ساتھ بچھائے جا سکتے ہیں۔

رابعہ رزاق

رنگا رنگ کہانیوں سے سجا، خوبصورت اور دلکش

سوہنی ڈائجسٹ

SohniDigest.Com

اگر آپ بھی لکھ رہے ہیں اور اُردو قارئین کی تلاش میں ہیں تو اپنی کہانیاں Inpage میں کمپوز (ٹائپ) کر کے پورے اعتماد کے ساتھ سوہنی ڈائجسٹ میں بھیجیے۔ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔

ابھی sohnidigest@gmai.com پر ای میل کریں۔

قسط نمبر 1

اونچی نیچی پگڈنڈیاں اور گرتے پڑتے قدم..... چہرے پر بیزاری اور کوفت کے ڈھیر سارے رنگ لیے کبھی آسمان کی طرف نگاہ ڈالتا اور کبھی بے سمت راستوں پر.....

یا اللہ یہ سفر کب ختم ہوگا نانو آپ نے بھی مجھے کہاں پھنسا دیا ہے۔ اس نے پتھر کو زوردار ٹھوکر رسید کی اور چھوٹے سے سفری بیگ کو ایک کندھے سے دوسرے کندھے پر منتقل کرتے ہوئے قدموں کی رفتار تیز کر دی۔

دائیں جانب تہہ در تہہ کھیتوں کی ایک طویل قطار اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی اور وہ سوچ رہا تھا یقیناً یہ راستہ کسی آبادی پر جا کر ختم ہوگا مگر یہ راستہ ہوتا تو تب نا۔

وہ تو جانے کن اونچی نیچی ڈھلوانوں میں پھنس گیا تھا صاف دکھائی دے رہا تھا مدتوں اس راستے پر کوئی آیا نہ گیا ورنہ قدموں کے دھندلے دھندلے نشانات تو ہوتے جو عموماً ایسے علاقوں میں لوگوں کی آمد و رفت کی وجہ سے بن جاتے ہیں۔

''آہ لوگ.....'' کچی سڑک پر پیچ کے ہچکولے کھاتے سفر نے اچھی طرح باور کرا دیا تھا کہ یہاں آدم زاد ناپید ہے۔

''تو پھر راجہ صاحب ان جنگلوں میں کیا کر رہے ہیں عشروں سے بن اچھے..... لیکن اس کا مطلب یہ تھوڑی ہے کہ بالکل ہی دنیا کے آخری کونے پر گھر بنا لیا جائے اور رشتے دار اسلام آباد میں بسا رکھے ہیں۔''

ڈیڑھ گھنٹے کی طویل اور کٹھن مسافت نے اسے اس قدر نڈھال کر دیا تھا کہ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ پیروں میں پتھر باندھ کر چل رہا ہے خنک موسم کے باوجود جسم کے ہر مسام سے پسینہ پھوٹ پڑا تھا اس سے پہلے کہ وہ پھولے سانس کے ساتھ لڑکھڑا کر گرتا ایک بڑے نیلگوں پتھر پر دھپ سے بیٹھ گیا۔

وہ اس وقت کو کوس رہا تھا جب اس نے نانو سے ڈانٹ کھا کر راجہ ہاؤس میں آنے کا فیصلہ کیا تھا اور ان سے مکمل جغرافیائی اتا پتا بھی سمجھنے کی زحمت نہیں کی۔

''یقیناً غلطی میری ہے۔'' اس نے ایک گہری سانس لی اور کھڑا ہو گیا سورج بادلوں سے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا گھڑی پر نگاہ کی تو پتا چلا کہ شام بھی اب اپنے محور سے دور نہیں اور گہری ہوتی شام تو اسے ضرور کسی وحشی درندے کی غذا بنا سکتی تھی۔

وہ بھاگنے کے سے انداز میں اونچی نیچی پگڈنڈیوں پر چلنے لگا اسے لگ رہا تھا جیسے اس کے سامنے یہ جو چھوٹی سی پہاڑی نما ڈھلوان ہے یہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا امتحان ہے اسے عبور کرنے کے بعد ہی وہ خود کو کسی قابل گردان سکے گا اور پھر ہوا بھی یہ ہی بکری کی طرح ادھر ادھر چھلانگیں لگاتے لگاتے وہ بالآخر اس پہاڑی کی چوٹی تک جا پہنچا تھا اور چوٹی پر کھڑے ہو کر اس نے گرد و پیش کا جائزہ لیا تو خوشی سے باچھیں کھل گئیں۔

سامنے جھاڑیوں سے بھرا ریتیلا میدان تھا اور میدان کے پس منظر میں نادیدہ ستونوں پر کھڑی سرسبز بلندیاں اور ان بلندیوں پر آباد گھر اسے ورطہ حیرت میں ڈال گئے تھے۔

''کس قسم کے لوگ ہیں ہوا میں معلق۔''

اس کے پیروں میں بجلی سی دوڑ گئی تھی۔

اب وہ ہرن کی طرح قلانچیں بھرتا ہوا نیچے کی طرف اترنے لگا تھا جھاڑیاں، سمگریزے کچھ بھی نہ دیکھ رہا تھا وہ جلد از جلد کنکریٹ کی اس سڑک تک پہنچنا چاہتا تھا جو اوپر سے بل کھائے سانپ کی طرح

نظر آ رہی تھی اور اس کے اختتام پر سرسبز درختوں میں گھرا ہوا وہ سرخ کھپرل کی چھت والا گھر تھا جس کی تلاش میں آج اس نے زندگی کی سب سے بڑی مشقت کی تھی۔

بنیادی طور پر وہ پرسکون مزاج کا انسان تھا اس کے اندر سیاح والی بے چینی اور مسافروں والا حوصلہ مفقود تھا۔ ایم ایس سی فارسٹری کرنے کے بعد وہ رزلٹ تک خوب آرام کرنا چاہتا تھا۔

میوزک اور فلمز انھوائے کرنا چاہتا تھا کہ محکمہ جنگلات میں یہ پُرکشش جاب اسے آفر ہو گئی تھی دراصل اپنے اپارٹمنٹ میں اس کی اب تک کی کارکردگی آؤٹ اسٹینڈنگ رہی تھی اور مختلف پروجیکٹس کے پریکٹیکل کے دوران بھی اس نے اپنی دلچسپی اور صلاحیت کا بھرپور ثبوت دیا تھا پھر نانو کی دعائیں بھی تھیں کہ وہ اپنے ساتھیوں سے یکدم آگے نکل گیا تھا۔

ضابطے کی ضروری کارروائیوں تک اسے میر پور آفیسرز ہاؤس میں رہنا تھا مگر نانو نے آتے ہوئے ایک ایڈریس تھما دیا تھا۔

وہ ان کی حکم عدولی ایک ہفتے تک کرتا رہا مگر اس بار ان کے لہجے کی سختی نظر انداز نہیں کر سکا۔

وہ پُرسکوت سی فضا میں گہرے سانس لیتے ہوئے آہنی گیٹ کے سامنے کھڑا ہو کر یہ سوچ رہا تھا وہ کس خوشی میں یہاں چلا آیا ہے۔

مین گیٹ پر جدید سیکورٹی سسٹم انٹرکام کی موجودگی نے اس کی تھکن کو شدید قسم کی حیرت میں بدل دیا تھا۔

''نانو کے رشتے دار بھی خوب ہیں امارات کا یہ حال ہے اور شہر میں گھر تک نہیں بنا سکے۔'' وہ اپنے لیے تعارفی جملے ترتیب دیتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

باوردی سیکورٹی گارڈ نے ضروری تفصیلات جاننے کے بعد اس کے لیے مین گیٹ یوں کھولا تھا جیسے وہ لینڈ کروزر میں بیٹھا ہو۔

''اوہ بھئی میرے لیے یہ چھوٹا گیٹ بھی کافی تھا۔'' زبان سے پھسل ہی گیا تھا سیکورٹی گارڈ نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ ابدر کا راستہ دکھایا تھا اور وہ دو قدم ہی چلا تھا کہ ایک اور ملازم خدمت کو حاضر ہو گیا۔

''لائیے صاحب! یہ سامان مجھے دیجیے آپ کے لیے گیسٹ روم کھول دیا ہے راجہ صاحب شام کی چائے پر مہمانوں سے ملاقات کرتے ہیں اور وہ وقت گزر چکا ہے آپ سے ڈنر میں ملاقات کریں گے تب تک آپ فریش ہو کر ریسٹ کیجیے۔''

کس قدر نستعلیق ملازم تھا اور با اعتماد بھی۔ اس کا اعتماد رخصت کرنے کے درپے وہ جو چند لمحے ٹھہر کر خوبصورت سے لان کا جائزہ لینا چاہتا تھا اس کے انداز سے مرعوب ہو کر ادھر ادھر دیکھے بغیر چل پڑا۔

نیا ناحول پُر اسراری خاموشی اور مشینی آدمی یقیناً اسے بہت سوچ سمجھ کر یہاں کا مہمان بننا ہوگا۔

وہ گیسٹ روم کے دروازے پر رُک کر اپنے جوتوں کا جائزہ لے رہا تھا جو یہاں تک کی مسافت میں اپنی قدر و قیمت کھو چکے تھے جبکہ دروازے کے اندر وال ٹو وال بچھا قیمتی کشمیری قالین چکنی مٹی سے اٹے جوتوں تلے آنے کے لائق ہرگز نہیں تھا۔

اس نے طبیعت کی نفاست سے مجبور ہو کر باہر ہی جوتے اتار دیئے اور محتاط قدموں سے اندر داخل ہو گیا۔ ملازم اس کا بیگ رکھ کر واپس جا چکا تھا نرم قالین میں دھنسے پاؤں کو جیسے امان مل گئی تھی تھکن سے چور چور تلوے مخملیں سبزے جیسی سکون آفریں نرماہٹ سے محظوظ ہونے لگے تھے۔ وہ جہازی سائز بیڈ پر گرنے کے سے انداز میں لیٹ گیا۔

''رات کے کھانے میں بہت وقت ہے پہلے مجھے آرام کرنا چاہیے۔'' اس نے طمانیت بھری سانس لے کر کمرے کا جائزہ لیا جس کی ہر چیز اعلیٰ ذوق کا مظہر تھی۔

وہ مکمل ستانے کے موڈ میں تھا کہ وہی ملازم دستک دے کر اندر آ گیا۔

''راجہ صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔'' سنجیدہ سا انداز تھا۔

''مگر وہ تو رات کے کھانے پر.....'' وہ جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

''ممکن ہے آپ ان کے خاص مہمان ہوں.....'' تقریباً اس کے ہم عمر ملازم کے چہرے پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ آئی تھی اور اس کا دل خواہ مخواہ دھڑک اٹھا تھا۔

''میں فریش ہونا چاہتا ہوں۔'' اس نے اپنی ابتر حالت کی طرف اشارہ کیا۔

''بہتر جناب میں تھوڑی دیر میں حاضر ہوتا ہوں۔'' وہ واپس پلٹ گیا تھا۔

''توبہ ہے..... کیسا درباری ماحول ہے.....'' وہ بڑبڑاتے ہوئے واش روم میں گھس گیا۔ کپڑے تو ٹھیک ہی تھے البتہ چہرے پر زمانے بھر کی بے زاری سجی تھی۔

اچھی طرح رگڑ رگڑ کر ہاتھ منہ دھونے اور بالوں میں برش کرنے کے بعد وہ خود کو خاصا فریش محسوس کر رہا تھا۔

آئینے میں اچھی طرح اپنا جائزہ لینے کے بعد خود کو اوکے کیا تھا اور جوتوں کے بجائے پشاوری چپل پہن کر وہ تیار کھڑا تھا کہ ملازم نے دستک دی۔

''آیئے سر!'' دروازے سے باہر نکلتے ہوئے پھر اس کے دل کی دھڑکن بے تال ہوئی تھی۔

''کاش میں نے نانو سے یہ ہی پوچھ لیا ہوتا کہ یہ محترم کیا شے ہیں تو اس وقت اتنا کانشس نہ ہوتا۔''

دراصل یہ سب کچھ اس کی توقع کے برعکس تھا جب نانو نے اس سے راجہ صاحب کا سرسری تذکرہ کرتے ہوئے ان کے گھر جانے کی تاکید کی تو وہ بالکل بھی دھیان سے ان کی باتیں نہیں سن سکا تھا اس کا پکا ارادہ تھا کہ وہ میرپور پہنچ کر آفیسرز ہاؤس سے صرف ضرورت کے وقت ہی باہر نکلے گا۔

پیدل چلنے کا وہ ویسے بھی چور تھا اور ایڈریس ڈھونڈنا یہ ایک اور مرحلہ تھا پھر یہاں کا قابلِ اعتبار

موسم صبح دھوپ دوپہر میں بارش اور شام سے پہلے آسمان پر قوس قزح کی شرارت۔

اس نے بہت کچھ سوچا تھا مگر یہ نہیں سوچا تھا کہ راجہ ہاؤس میں ایک جدید دنیا اس کی منتظر ہوگی اور پروٹوکول الگ، گویا وہ کسی پرائم منسٹر ہاؤس میں آ گیا ہو۔

اس کی نظریں وسیع و عریض راہداری میں آویزاں قیمتی پینٹنگ اور وال پیپر پر جمی تھیں۔ ملازم راہداری عبور کر کے ایک دروازے پر رک گیا تھا۔

''راجہ صاحب اندر تشریف رکھتے ہیں۔'' اس نے دروازہ کھول کر کہا اور خود بائیں طرف مڑ گیا۔

''السلام علیکم!'' بھاری پردے ہٹا کر اس نے اندر قدم رکھتے ہی کہا وسیع و عریض ہال کمرے میں اس قدر سکوت تھا کہ اسے اپنی ہی آواز کا ارتعاش دیر تک محسوس ہوا۔

''وعلیکم السلام!'' دریچے کے سامنے کھڑی شخصیت نے پلٹ کر بڑی گونج دار آواز میں جواب دیا تھا اور اس کے قدم زمین نے جکڑ لیے تھے نظریں سامنے کھڑی شخصیت سے ٹکرا کر واپس نہیں پلٹی تھیں بلکہ کمرے کی پُراسراری فضا میں معلق ہو گئی تھیں۔

چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اس لمحے عاشر عباس کے دل و دماغ صرف طوفان کی زد میں ہیں۔

''راجہ طارق محمود!'' وہی چند قدم چل کر اس کے پاس آئے تھے اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا۔

''عاشر عباس!'' اس کا ہاتھ میکانکی انداز میں اٹھا تھا گرم جوشی کا فقدان دونوں طرف ہی تھا شاید دونوں فریقین ان لمحات میں اپنے اپنے احساسات سے نبرد آزما تھے، سرد موسم کی کہر میں لپٹے ہوئے احساسات.....!

''راجہ عاشر عباس.....!'' انہوں نے جتانے والے انداز میں کہا اور وہ یکدم ان لمحوں کے طلسم سے آزاد ہو گیا جو اس کی خود اعتمادی اور حاضر دماغی کے لیے خطرہ بن گئے تھے۔

''مجھے لوگ عاشر عباس کے نام سے ہی جانتے ہیں۔'' اسے اپنا ہی لہجہ اجنبی لگا تھا۔

''ویل سیڈ! مگر تم اپنے پورے نام سے تو واقف ہو.....'' ان کے چہرے پر خوبصورت سی مسکراہٹ ہلکی سی چھب دکھلا کر غائب ہو گئی تھی۔

عاشر لمحوں کے طلسم سے آزاد ہو گیا تھا اس لیے اب نظر بھر کر ان کا جائزہ لے رہا تھا۔

عمر کے اس خوبصورت دور میں ان کی دلکشی اور وجاہت میں اضافہ کرتے گرے بال سلیقے سے جمے ہوئے تھے۔ کشادہ پیشانی پر کوئی شکن نہیں تھی اور نہ ہی چہرہ کسی مالی و ذہنی نا آسودگی کی چغلی کھا رہا تھا۔ سرمئی کھدر کا سوٹ، اور سیاہ شال ان پر بے حد جچ رہی تھی اور سرخ و سفید چہرے پر نرمی کا تاثر اسے اپنی طرف بلا رہا تھا مگر وہ اپنی جگہ جما کھڑا تھا۔ دل نادان تو بھاگنے کی ترغیب دے رہا تھا لیکن کوئی غیر مرئی قوت تھی جو اس کے قدموں کی زنجیر بن گئی تھی وہ اس وقت گہری سبز آنکھوں کے حصار میں بری طرح مقید ہو گیا تھا۔

''گلے نہیں لگو گے.....'' شخصیت کا سارا کروفر آن کی آن میں باپ کے پر شفیق روپ میں ڈھل گیا تھا۔

یہ اس کی نظروں کا دھوکہ تھا یا ان لمحوں کی ان کہی سچائی کہ راجہ طارق محمود کی سبز آنکھوں کے کنارے بہت تیزی سے سرخ ہوئے تھے اور اگلے ہی لمحے وہ ان کے کھلے بازوؤں میں سما گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

ہال کمرے کے ٹھہرے ہوئے جامد سناٹے میں دو نفوس کی گہری سانسوں کے ارتعاش کے علاوہ اور کوئی آواز نہ تھی۔ وقت اپنی گردش روک کر ان دونوں کے چہروں پر پھیلے نا قابل فہم تاثرات کو کینہ توز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''آپ تو انگلینڈ میں تھے نا۔'' یہ تکلیف دہ سکوت عاشر نے توڑا تھا جس کے چہرے پر پھیلی سرخی اندرونی کیفیت کی غماز تھی۔ وہ مضطرب تھا نہ مسرور..... اور یہ بھی سمجھنے سے قاصر تھا کہ ایک مدت بعد باپ کو سامنے دیکھ کر کس ردعمل کا مظاہرہ کرے۔

اس نے اب تک کی زندگی میں صرف ایک ہی رشتے کو قریب سے برتا تھا اور وہ رشتہ نانو کا تھا جن کی محبت اور توجہ کے ہر رنگ کو اس نے پورے استحقاق کے ساتھ وصول کیا تھا۔ وہ اس کے لاڈ بھی اٹھاتی تھیں اور اس پر کڑی نظر بھی رکھا کرتی تھیں۔ شاید اسی لیے وہ ماں باپ کی کمی کو اپنی کمزوری اور محرومی نہیں بنا سکا تھا اور ویسے بھی بہت چھوٹی سی عمر میں نانو نے جب اسے شہزادے اور شہزادی کے ملن کی کہانی سنانے کے بجائے ماں اور باپ کے ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لیے بچھڑنے کی حقیقی کہانی سنائی تھی تو اسے صبر آ گیا تھا اور نانو نے یہ بھی کہا تھا۔

بس اللہ کی مرضی یہ ہی تھی۔

تب وہ اس جملے کی گہرائی سے واقف نہیں تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ جس طرح وہ زندگی کے ہر رنگ و آہنگ کے ساتھ سمجھوتہ کر کے مطمئن ہوتا گیا تو اس نے جانا کہ انسان کی حیثیت وقت کی بساط پر بچھے مہرے سے زیادہ نہیں ہے اور یہ تو بازی گر ہر منحصر ہے کہ کس وقت وہ کون سی چال چل جائے۔

زیادہ دن نہیں ہوئے مجھے یہاں آئے ہوئے۔

''مگر یہ محل نما مکان اور باغات کا سلسلہ.....'' وہ محض سوچ کر رہ گیا۔

''آپ کا گھر بہت اچھا ہے۔'' اس نے تکلیف دہ خاموشی سے گھبرا کر کہا۔

''ہاں یہ مکان بہت اچھا ہے زیادہ دن نہیں ہوئے ہیں اس کو فرنشڈ ہوئے۔'' ان کی آواز ان کی شخصیت کی طرح مرعوب کر دینے والی تھی وہ ایک بار پھر سوچ میں پڑ گیا تھا۔ اب کیا بات کرے جب کہ راجہ طارق محمود کی سحر انگیز نگاہیں اس پر جمی تھیں۔ وہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا اس کے خدوخال کشادہ پیشانی پہ بکھرے بال، بڑی بڑی آنکھیں اس کی نشست کے پر تکلف سے انداز میں وہ اپنی نوجوانی کا عکس دیکھ رہے تھے۔

''سفر کیسا رہا.....''

''سفر.....اس دکھ بھری داستان کا احوال نہ ہی پوچھیں تو اچھا ہے۔'' وہ بے ساختہ مسکرا دیا تھا اور یہ مسکراہٹ انجانے میں ان کے دل کے تار چھیڑ گئی تھی۔

''کیا مطلب.....گاڑی تو یہاں لنک روڈ تک آتی ہے اور پرائیویٹ گاڑیاں گھر تک.....''

''میں شاید آگے چلا گیا تھا نانو نے ایڈریس بھی تو اس انداز سے سمجھایا تھا کہ میں اندازے سے یہاں تک پہنچا ہوں۔'' اس نے ذرا سا توقف کیا۔

''مگر آپ یہاں کیوں رہتے ہیں.....'' وہ اپنے مخصوص انداز میں جھنجھلا کر بولا تھا۔

''مائی سن یہ ہماری آبائی زمین ہے جس گھر میں تم بیٹھے ہو یہاں پر ہمارے دادا پردادا کا کبھی گھر ہوا ہوگا.....ہم بزرگوں کی نشانیوں سے بھلا کیسے دستبردار ہو سکتے ہیں.....دنیا کے کسی بھی ترقی یافتہ ملک میں رہ لیں مگر اپنی مٹی کی کشش پیچھا نہیں چھوڑتی.....'' وہ اپنی مخصوص گونج دار آواز میں مخاطب تھے۔

''اوہ.....'' وہ محض ہونٹ سکوڑ کر رہ گیا۔

''خالہ جان کی صحت کیسی ہے۔''

''خالہ جان.....'' اس نے استفہامی نگاہوں سے دیکھا۔

''تمہاری نانو میری خالہ بھی تو ہیں۔'' وہ اس کی بے خبری پر مسکرا دیئے تھے۔

''آپ خود ان سے کیوں نہیں ملتے۔'' وہ آہستہ آہستہ اس صورتحال سے مانوس ہو رہا تھا۔

''برسوں پہلے ایک خلیج حائل ہوئی تھی دونوں خاندانوں کے درمیان جسے گزرتے وقت نے وسیع تر ہی کیا ہے حالانکہ وقت تو مرہم ہی رکھتا آیا ہے اب تو کوئی ملال بھی باقی نہیں پھر بھی ایک احساسِ زیاں جو وہاں پہنچ کر شدید ہو جاتا ہے اور شاید وہ بھی اسی کیفیت میں گھر جاتی ہیں اس لیے.....''

تکلیف دہ یاد کی پرچھائیاں ان کے چہرے ہر ہلکورے لے رہی تھیں۔

اور پہلی بار عاشر کا دل چاہا کہ اس احساس زیاں کے وہ محرکات جاننے کی کوشش کرے جو آج

تک اس کی نظروں سے پوشیدہ رہے۔

''نانو اپنی زندگی میں ہلچل مچائے رکھتی ہیں خود بھی فٹ رہتی ہیں اور دوسرے کو بھی فٹ رکھتی ہیں۔ یقیناً انہیں ایسا ہی کرنا چاہیے تھا اگر وہ ایسا نہ کرتیں تو اس وقت مجھے بہت مایوسی ہوتی.....لیکن حقیقت یہ ہے کہ جیسا میں نے اپنے بیٹے کے بارے میں سوچا تھا اسے ویسا ہی پایا.....''

''بیٹا.....'' اس کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

''ہے تو عجیب سی بات مگر سچ یہ ہی ہے کہ میں آج تک آپ کی کوئی شبیہ اپنے تصور میں نہیں لا سکا آخری بار جب میں آپ سے ملا تھا تو اس وقت میری عمر شاید نو دس سال تھی اور آج میں پچیس سال کا ہو چکا ہوں۔'' اس نے جتانے والے انداز میں کہا اور راجہ طارق محمود کے چہرے پر تاریک سائے کی طرح کوئی احساس آ کر گزر گیا تھا۔

مگر اگلے ہی لمحے وہ اپنے بیٹے کی صاف گوئی پر مسکرا دیئے تھے۔

''تم شکایت کرنے میں حق بجانب ہو اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تمہاری یہ شکایت بھی دور ہو جائے گی تب شاید تم اس مصلحت کو بھی سمجھ سکو گے کہ میں پندرہ سال تک اپنے بیٹے سے کیوں نہیں مل سکا۔''

ان کے لہجے میں کانچ سے ٹوٹ رہے تھے وہ عجیب سے تاثرات کے ساتھ انہیں دیکھنے لگا۔ کچھ ایسا تھا ان کی شخصیت میں کہ وہ اپنے دل میں آنے والا ہر منفی خیال جھٹک کر اپنے اور ان کے درمیان رشتے کو سوچنے لگا۔

کتنی بڑی سچائی تھی ان کا رشتہ..... کس قدر استحقاق تھا اس میں..... وہ تمام عمر بھی ان سے دور رہتا مگر اس نام کو اپنے نام سے جدا نہیں کر سکتا تھا اس احساس کو دل سے نہیں نکال سکتا تھا جو ان کے گلے سے لگ کر پہلی بار اس نے محسوس کیا تھا۔

پھر بھی اس کے دل و دماغ میں کشمکش سی جاری تھی۔ وہ ایک بار پھر ان کی بانہوں میں سمٹ کر اپنی

تشنگی مٹانا چاہتا تھا مگر دماغ نے بڑی شدت کے ساتھ اس امر کی نفی کی تھی..... وہ اکسا رہا تھا۔

پچیس سال تک جس شخص نے تمہیں اپنی توجہ اور محبت سے محروم رکھا ہے اب تم اس کے لیے اپنے دل میں گرازمت پیدا کرو۔ تم آج اسکے پاس خود چل کر آئے ہو۔ وہ تمہارے پاس نہیں آیا یہ تو نظروں کا دھوکہ ہے اب تمہاری عمر دھوکہ کھانے کی نہیں۔

وہ یکدم اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''میں آرام کرنا چاہوں گا.....'' لہجہ سپاٹ اور آنکھیں بے تاثر تھیں۔

راجہ طارق محمود بھی اس کے ساتھ کھڑے ہو گئے تھے۔

''مگر اس سے پہلے کچھ کھالو..... یقیناً تم نے دوپہر میں بھی کچھ نہیں کھایا ہوگا۔''

''نہیں موڈ نہیں ہے.....'' اس نے رخ موڑ کر کہا اور دروازے کی طرف قدم بڑھا دیئے ان کی نظریں اس کی چوڑی پشت پر جمی رہ گئی تھیں۔

☆.....☆.....☆

''دراصل ہوا یوں کہ اس سے پہلے مجھے اتنی فرصت ہی نہیں ملی کہ میں کائنات کے سب سے حسین رنگ یعنی وجود زن کے بارے میں سوچتا اور کسی خیالی پیکر کو دل کا مہمان بنا کر محبت جیسے جذبے کی آہٹ محسوس کرتا مجھے فراغت ملی تو تمہاری آواز سن بیٹھا..... پتا نہیں کیا بات ہے تمہاری آواز میں کہ میں تمہیں سننے کے بعد پہروں تمہیں سوچتا ہوں تمہیں دیکھنے کی خواہش میں تمہارے کئی اسکیچ بناتا ہوں اور پھر مٹا دیتا ہوں، ہے نا دیوانگی کے جو مجھ جیسے پریکٹیکل مائنڈ اور میچور بندے کو زیب نہیں دیتی لیکن میں نے سنا ہے جب عقل دل کی پاسبانی سے غافل ہو جائے تو ایسے ہی حادثے رونما ہوتے ہیں جو زندگی میں رنگ ہی رنگ بھر دیتے ہیں۔''

اس کے ہاتھ بڑی روانی سے کی بورڈ پر چل رہے تھے زندگی میں پہلی دفعہ کسی کو اتنی تفصیل سے

ای میل کر رہا تھا اور یکسوئی کا یہ عالم تھا کہ موبائل شور مچا مچا کر خاموش ہو گیا تھا۔ سامعہ نے یونہی اندر جھانکا تو حیرانی سے سائیڈ ٹیبل پر پڑے موبائل اور پھر اپنے بھائی کو دیکھا۔ محویت برقرار تھی وہ عادت سے مجبور ہو کر اندر چلی آئی۔

''بھیا جانی یہ موبائل کب سے بج رہا ہے اور آپ ہیں کہ دنیا و مافیہا سے بے خبر بیٹھے ہیں۔'' اس نے آ کر کندھا ہلایا تو خزیمہ کا ارتکاز ٹوٹا۔

''ڈیئر سسٹر دنیا و مافیہا سے بے خبر تو پہلے بیٹھے تھے ابھی تو ہم ہوش میں آئے ہیں بس ذرا جوش میں آنے دو ایک نئی تاریخ لکھی جائے گی اس گھر میں۔''

وہ مزاجاً شوخ تھا اور اس وقت تو انگ انگ سے سرشاری جھلک رہی تھی سامعہ نے قدرے حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھا جہاں مذاق نہیں کر رہا کی واضح تحریر درج تھی وہ متجسس سے انداز میں اس کے سامنے بیڈ پر ٹک گئی۔

''بھیا جانی خیر تو ہے۔'' وہ خزیمہ عادل کی سب سے چھوٹی اور لاڈلی بہن تھی شوخی اور شرارت میں اس سے دو ہاتھ آگے کچھ خزیمہ کی طرف سے رعایت ملی ہوئی تھی اس لیے عموماً کام کے وقت اس کے کمرے میں آ کر بلاوجہ کی کہانیاں شروع کر دیتی اس وقت بھی شام کی چائے کے لیے اس کی پکار پڑنے والی تھی لیکن اس نے بھائی کے ریلیکس موڈ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اندر پناہ لے لی تھی۔

''تم فارغ ہو یا پھر فرار ہو.....'' وہ بھی سب سمجھتا تھا زیر لب مسکراتے ہوئے اس کی چال کی داد دی۔

''میں اس وقت فارغ ہی ہوں اور دیکھیں آپ کی ٹیبل کا کیا حشر ہو رہا ہے لائیں ٹھیک کر دوں۔'' وہ پھرتی کا مظاہرہ کرنے لگی۔

''اس کے بعد کپڑے پریس کرنے ہیں اور ہاں آج اپنے ہاتھوں سے کافی پلاؤ گی۔'' خزیمہ نے تو دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

''بھیا جانی! کپڑے پریس کرنے کے لیے ماسی کی بیٹی کو صرف آپ کی وجہ سے رکھا ہے اور آپ ہیں کہ اس سہولت کا فائدہ اٹھانے کے بجائے مجھ غریب پر ظلم وستم کرتے رہتے ہیں۔'' اس نے منہ بسورا۔

''بائی داوے آپ کیا کر رہے ہیں کون سی تاریخ لکھنے جا رہے ہیں۔'' اچانک ہی اس کا تجسس جاگا۔

''بچوں کو بتانے والی بات نہیں ہے۔''

''بھیا!'' اس نے احتجاجاً ذرا بلند آواز میں پکارا اور بیڈ پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔

''آخر آپ کب تک مجھے بچہ سمجھتے رہیں گے میٹرک کے پیپرز دینے ہیں مجھے اس سال۔''

''میٹرک کیا تو نہیں ہے نا..... چلو پہلے میٹرک کر لو پھر بات کریں گے اس موضوع پر تمہارے میٹرک ہونے تک شاید یہاں سے بھی جواب آ ہی جائے۔'' وہ ایک بار پھر کی بورڈ کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ چہرے پر بڑی شریر سی مسکراہٹ مچل رہی تھی۔ سامعہ نے بھیتیہ کر لیا تھا پاس ورڈ معلوم کر کے پہلی فرصت میں اس راز سے پردہ اٹھائے گی جو مانیٹر کے سینے میں مقید ہو چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

''خزیمہ عادل.....'' اس نے زیر لب یہ نام دہرایا اور پھر بے اختیار ہنستی چلی گئی۔

''خولہ خیریت تو ہے.....'' بیٹھے بیٹھے ہنسی کے دورے تو اسے اکثر پڑتے تھے لیکن اس وقت چونکہ نگاہوں کا مرکز مانیٹر اسکرین تھی اس لیے ماریہ نے سوچا شاید کوئی اچھا سا لطیفہ پڑھ لیا ہے۔

''ادھر آ..... پڑھ کتنا زبردست لکھا ہے کسی نے۔'' اس نے ماریہ کو پکارا تو وہ کتابیں چھوڑ چھاڑ کر اس کے پاس آ گئی۔

جوں جوں خزیمہ عادل کی طویل ای میل پر نظریں دوڑ رہی تھیں ان کی دلچسپی اور شوق کا عالم بڑھ رہا تھا۔

''ارے یہ تو کوئی رائٹر ہے.....''

''رائٹر ہے یا پاگل ہے.....''

''اب اتنے رف کمنٹس تو نہ دو.....کیا پتا اس نے جو لکھا ہو وہ صحیح ہی ہو۔''

ماریہ کو فوراً خزیمہ عادل سے ہمدردی ہو چلی تھی بلکہ اسے ان تمام لوگوں سے ہمدردی ہو جاتی تھی۔ جو ایف ایم کے لسنرز تھے اور خولہ کا پروگرام ذوق وشوق سے سنتے تھے۔

خولہ کی آواز کا جادو سر چڑھ کر بولتا تھا بلا کی دلکشی تھی اس کے لہجے میں اور وہ اپنے ہاسٹل کے روم میں بیٹھ کر انٹرنیٹ کے ذریعے ریڈیو ایف ایم کے لیے یہ پروگرام کرتی تھی ان لمحات میں ماریہ سارے کام چھوڑ کر کمرہ لاک کر کے باہر نکل جاتی تا کہ ساؤنڈ کا پرابلم نہ ہو۔

اول جلول سے حلیے میں بیٹھی خولہ کی آواز کا تازگی بھرا احساس اور پس پردہ میوزک کی تان صبح کی ساری دلکشی اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھی اور وہ دو گھنٹے کا پروگرام کرنے کے بعد بھاگتی دوڑتی اپنی کلاس میں پہنچی تھی۔

سوا نو بجے سر عالم کی کلاس شروع ہوتی تھی اور خولہ کو اپنی سیٹ تک پہنچنے میں ساڑھے نو بج ہی جاتے تھے۔

''خولہ! آپ کو وقت کی اہمیت کا احساس کب ہوگا۔'' یہ سوال اس سے اکثر پوچھا جاتا اور وہ محض سر جھکا کر رہ جاتی یہ الگ بات کے ماریہ کا دل چاہ رہا ہوتا کہ جلدی سے اٹھ کر بتا دے۔ محترمہ سات بجنے میں صرف پندرہ منٹ باقی ہوتے ہیں تو اٹھ کر بیٹھ جاتی ہیں۔ اب بھلا آسان تھوڑی ہے ریڈیو پر بغیر چائے پانی کے مارننگ شو کرنا۔ یہ کمال تو صرف خولہ کمال کا ہی ہو سکتا ہے۔

☆.....☆.....☆

''خالہ جان وہ بالکل ویسا ہی ہے جیسا میں نے سوچا تھا۔'' وہ بے حد مسرور لہجے میں انہیں بتا رہے تھے اور دوسری طرف وہ ان کی بے تابی پر بس مسکرا کر رہ گئی تھیں۔

''تم سے مل کر خوش ہوا..... یا.....''

''نہیں خالہ جان..... وہ شاید حیران ہے اور کچھ الجھ بھی گیا ہے آپ نے اسے کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔''

''اگر بتا دیتی تو کیا آتا..... میں نے اسے یونہی اپنے کسی رشتے دار کا حوالہ دیا تھا اب تمہارا کام ہے اسے منانا اتنا تو حق بنتا ہے نا اس کا بھی وہ تم سے اپنی خفگی کا اظہار کرے۔''

''خالہ جان! مجھے یہ بھی منظور ہے وہ میرے پاس رہے گا تو میں منا لوں گا۔''

وہ بہت بچکانہ انداز میں اپنی بے چینی کا اظہار کر رہے تھے۔

''بہت زیادتی کی تم ماں باپ نے اس کے ساتھ لیکن وقت ہر درد کا مداوا ہوتا ہے بڑا مگن اور پُر سکون سا رہتا ہے میرا بیٹا۔'' ان کے لہجے سے اس وقت صرف اور صرف اولاد کی محبت چھلک رہی تھی۔

''آپ نے اسے بتا دیا کہ اب وہ یہیں رہے گا میرے پاس؟''

''نہیں میں نے اسے کچھ نہیں بتایا میرے خیال میں وہ تمہارے قریب رہے گا تو تم بہتر طور پر اسے وہاں رہنے کے لیے آمادہ کر سکو گے۔ پتا ہے جتنا نرم خو ہے اتنا ہی ضدی بھی.....'' وہ بے ساختہ گہری سانس لے کر رہ گئے۔ (ضدی ماں کا بیٹا جو ہوا)

''خالہ جان..... آپ اسے سمجھائیں نا وہ ضدی ہے تو کیا ہوا پالا تو اسے آپ نے ہے زندگی کو گزارنے کے گُر تو آپ نے سکھائے ہیں نا۔'' راجہ طارق محمود نے انجانے میں ان کے زخموں کو چھیڑ دیا تھا۔

''انہوں نے بیٹی سے محبت بھی کی تھی اور تربیت میں کوئی کسر بھی نہیں چھوڑی تھی پھر بھی۔'' ایک بے نام سا کرب ان کے رگ و پے میں دوڑنے لگا تھا۔

''طارق ماں تو میں اس کی بھی ہوں اور تمہاری بھی مگر آج بھی اپنی تربیت پر شرمندہ ہوتی رہتی ہوں۔''

اس لمحے ان کا بے لچک لہجہ گہرے تاسف میں ڈوبا ہوا تھا۔

''خالہ جان ہماری قسمت میں اگر یہ سب لکھا تھا تو پھر کسی بندہ بشر کا کیا دوش..... آپ نے تو

ہماری بھلائی ہی چاہی یہ تو کسی کو بھی نہیں پتا ہوتا کے کسی فیصلے کے حتمی نتائج کیا ہوں گے۔"

"ہاں اگر ہم قسمت کو بھی دوش نہ دے سکیں تو پھر یہ پچھتاوے ہمیں ایک دن بھی نہ جینے دیں..... چلو جاؤ جا کر اپنے بیٹے سے باتیں کرو۔ محبت کا مان دو گے تو خود ہی تمہارے گلے سے آ لگے گا....."

"گلے سے تو وہ لگا تھا مگر میں جانتا ہوں وہ ایک بے اختیاری فعل تھا۔"

رسماً اور رواجاً ہی سہی اس نے ان کے کھلے بازوؤں کی لاج رکھ لی تھی۔

"ٹھیک ہے خالہ جان آپ سے پھر بات کروں گا ویسے بھی آپ کے آرام کا وقت ہے میرا بیٹا ابھی تو اپنے کمرے میں ہی ہے..... اس کے انتظار میں بھوکا بیٹھا ہوں....."

انہوں نے اجازت چاہی۔

"وہ صرف سبزی کھاتا ہے، دودھ مکھن گھی بھی دیہاتیوں کی طرح شوق سے کھاتا ہے اور زیادہ مقدار میں....."

"اگر ضد میں ماں پر گیا ہے تو کچھ عادتیں باپ کی بھی لی ہوں گی نا۔" انہوں نے بے ساختہ کہا۔

"عادتیں تو خیر ساری اچھی ہیں اور ضدی تو تم بھی کم نہیں تھے۔"

"لیکن خالہ جان میری ضد تو بہت بے ضرر سی ہوتی تھی جہاں دوسرے کی تکلیف کا احساس ہوتا فوراً اپنی ضد سے دستبردار ہو جاتا یاد ہے ناں آپ کو....."

"مجھے سب یاد ہے جاؤ جا کر کھانا کھاؤ اور اسے بھی کھلاؤ....." شفقت بھری اس تنبیہہ کے ساتھ وہ فون بند کر چکی تھیں اور راجہ طارق محمود کی سماعتوں میں ان کی آواز ابھی تک گونج رہی تھی۔

"جتنا نرم خو ہے اتنا ضدی بھی۔"

☆.....☆.....☆

وہ کمرے میں بکھری ہوئی اپنی چند چیزیں سمیٹ کر ان کے پاس آیا تھا۔ بلیو جینز پر بلیک ہائی نیک جرسی میں اس کا دراز سراپا بے حد نمایاں لگ رہا تھا انہوں نے ایک بھرپور نظر اس پر ڈالی اور اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ قدرے تکلف سے بیٹھ کر بلا تمہید ہی گویا ہوا۔

''میں جانا چاہتا ہوں..... صبح مجھے ہیڈ آفس میں حاضری دینی ہے اور یہاں سے راستہ بہت طویل ہے۔''

''اور اگر میں تمہیں نہ جانے دوں صاحبزادے۔'' ان کے انداز میں محسوس کیا جانے والا استحقاق تھا۔

''میرے خیال میں آپ مجھے روکنے کا اختیار نہیں رکھتے محض صاحبزادہ کہہ دینے سے اس رشتے کی تائید نہیں ہو جاتی میں اپنی مرضی سے یہاں آیا تھا اور اپنی مرضی سے جا بھی سکتا ہوں۔''

وہ ذرا بھی مرعوب نہ ہوا۔

''بہت خوب..... کیا دنیا کا کوئی قانون ہم دونوں کے رشتے کی حقیقت کو جھٹلا سکتا ہے۔''

وہ مبہم سے انداز میں مسکرائے۔

''مجھے دنیا کے قانون سے کیا لینا دینا جب میرا دل ہی قبولیت پر آمادہ نہیں۔'' وہ دوٹوک انداز میں کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا تھا چہرے پر ہنوز اجنبیت تھی۔

اس کے انداز سے محظوظ ہوتے ہوئے اس کے قریب چلے آئے اس لمحے ان کی آنکھوں میں بڑی والہانہ چمک تھی ان کے خوبرو بیٹے کا وجود کسی دلفریب خوشبو سے مہک رہا تھا وہ خود بھی قیمتی اور منفرد خوشبو کے دل دار تھے بے ساختہ پوچھ بیٹھے۔

''کون سی خوشبو استعمال کرتے ہو.....''

عاشر جوان کی قربت میں جز بز سا ہو رہا تھا ایک بالکل غیر متوقع سوال پر بلا ارادہ مسکرا دیا۔

''میری پسند بدلتی رہتی ہے.....'' اس نے سراسر جھوٹ بولا تھا۔

''میں برسوں سے ایک ہی خوشبو استعمال کر رہا ہوں۔''

وہ یہ نہ بتا سکے میں برسوں سے جو خوشبو استعمال کر رہا ہوں وہ تمہاری ماں کو بے حد پسند تھی اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی ہر بار اسے منتخب کر لیتا ہوں۔

''پھر مجھے اجازت.....''

''نہیں.....صبح تمہیں ڈرائیور چھوڑ آئے گا اور تمہیں اندازہ ہو جائے گا جس راستے کو تم طویل سمجھ رہے ہو وہ اتنا ہے نہیں طوالت تو محض دور رہنے کا بہانہ ہے۔''

''میں آپ کی آخری بات سے متفق ہوں۔''

''مگر میں متفق نہیں ہوں میں تمہیں اپنے قریب دیکھنا چاہتا ہوں۔''

انہوں نے رسان سے کہا۔

''ایک بار پھر آپ مجھ پہ اپنا فیصلہ مسلط کر رہے ہیں۔'' وہ کوشش کے باوجود تلخ نہ ہو سکا۔

''بس میں اپنی خواہش کی تکمیل چاہتا ہوں۔''

''اور میری خواہش.....''

اس کی کشادہ پیشانی پر بے شمار شکنوں کا جال بن گیا تھا۔

''او کے..... میں انتظار کروں گا جب تمہاری خواہش تمہیں مجھ تک لے آئے لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم یہاں پر رہو۔ تمہارا گھر ہے اب اس گھر کو بھی تمہاری ضرورت ہے میں ہمیشہ یہاں نہیں ہوتا بزنس کی نوعیت ایسی ہے کے بمشکل مہینے کے چند دن یہاں گزار پاتا ہوں۔ ساری جاگیر نوکروں کے رحم وکرم پہ ہوتی ہے والی وارث تم ہی ہو آج خیال نہیں کرو گے تو کل پچھتاوا ہوگا۔''

''والی وارث.....'' وہ بہت حیران ہو کر پوچھ رہا تھا۔

''جہاں تک میرے علم میں ہے آپ کی دو عدد بیٹیاں بھی ہیں۔''

''میں ان کے حصے کے جاغذات تیار کروا چکا ہوں وہ یہاں کی پراپرٹی میں حصے دار نہیں ہیں۔''

''اوہ.....'' اس نے لب سکوڑے۔

''مگر مجھے اس سب کی ضرورت نہیں ہے بے شک آج تک میں نے اپنی ضرورتوں کے لیے آپ پر انحصار کیا ہے مگر اب میں انڈ پینڈنٹ ہو چکا ہوں میں اپنا بوجھ اٹھا سکتا ہوں۔'' ان کے سامنے اس کے استقلال میں ذرا بھی فرق نہیں آیا تھا۔

''بے وقوفی کی باتیں مت کرو میں تمہیں تمہارا حق دینا چاہتا ہوں تم لاکھ مجھ سے متنفر سہی مگر میں نے ہمیشہ اپنے فرائض ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔'' اس بار ان کا لہجہ تند تھا اس کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

''یہ لب ولہجہ یہ انداز نو دس سال کے بچے کو تو متاثر کر سکتے ہیں مگر میں نے بہت کم عمری میں زندگی کو اتنے قریب سے دیکھ رکھا ہے کہ اب اس طرح کی خواب ناک باتیں مجھے مرعوب نہیں کر سکتیں۔ آپ نے اپنے فرائض ضرور ادا کیے ہوں گے مگر میری ضروریات روپے پیسے سے ہٹ کر بھی تھیں اور اس معاملے میں میری ماں اور میرے باپ دونوں نے اپنی ذمہ داریوں سے انصاف نہیں کیا تو میں کیسے ان کے لیے باعث اطمینان ہو سکتا ہوں.....''

اس کی سیاہ آنکھیں بے تاثر تھیں اور لب میکانکی انداز میں ہل کر ایک دوسرے میں پیوست ہو چکے تھے۔

''بیٹے تم کچھ بھی کہہ کو اپنے اور میرے رشتے کی حقیقت سے منکر نہیں ہو سکتے۔''

''پتا نہیں آپ کس زمانے کی بات کر رہے ہیں یہ رشتے ناتے سب کتابی باتیں ہیں سر آپ تو کامیاب بزنس مین ہیں آپ کو اس طرح کی باتیں سوٹ نہیں کرتیں۔'' وہ اس لمحے کتنا کٹھور بن چکا تھا

اپنی اس کیفیت پر خود بھی حیران تھا۔

''بہت ضدی ہو مگر یہ یاد رکھنا میں تمہارا باپ ہوں۔''

پتا نہیں کیوں اس کی کسی بھی بات پر غصہ ہونے کے بجائے وہ محظوظ ہو رہے تھے اسے بغور سنتے ہوئے ان کے چہرے پر نرم سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی جو عاشر عباس کو تاؤ دلانے کے لیے کافی تھی۔ وہ انہیں بھرپور طریقے سے نظر انداز کرنا چاہتا تھا اس لیے رخ موڑ کر کھڑا ہو گیا۔

''میں آپ سے بحث نہیں کروں گا..... نانو نے مجھے یہاں آنے کے لیے کہا تھا اور میں صرف ان کے حکم کی تعمیل میں بغیر سوچے سمجھے چلا آیا میں نے تو ان سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ اچانک ہی انہیں اس جزیرے پر رہنے والے رشتے دار کیوں یاد آ گئے۔ دراصل میں ان سے بھی بحث نہیں کرتا بہر حال میرا یہاں آنا اور آپ سے ملنا محض اتفاق ہی تھا آپ کی توقع جو بھی ہو میں اس پر پورا نہیں اتر سکتا۔''

اس نے دوٹوک انداز میں کہہ کر باہر کی جانب قدم بڑھا دیئے تھے راجہ طارق محمود کے چہرے پر بے نام سا ملال پھیل گیا تھا۔

انہوں نے زندگی میں بہت کچھ کھویا تھا مگر بیٹے کی سرد مہری نے سب سے بڑے خسارے کا بوجھ ان کے کندھے پر رکھ دیا تھا وہ عمر کے اس حصے میں بھی توانا اور چاق و چوبند تھے مگر آج انہیں لگ رہا تھا جیسے دس سال کا فاصلہ ایک لمحے میں طے کر لیا ہو وہ گرنے کے سے انداز میں صوفے پر بیٹھ گئے عاشر کے قدموں کی آہٹ بھی فضا سے معدوم ہو چکی تھی وہ یقیناً راہداری سے اپنے کمرے کی طرف مڑ چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ ریڈیو کیا سنتا اسے تو اب تک کی زندگی میں سر کھجانے کی فرصت نہیں ملی تھی۔ نفاست پسند طبیعت کے سبب ابھی تک اس کی نوبت بھی نہیں آئی تھی اس کا تو اس نے وہم و گمان بھی نہیں کیا تھا۔

جو لوگ ریڈیو ایف ایم کے لسنرز تھے وہ تو ضرور آر جے ڈی جے لوگوں سے متاثر ہوتے تھے مگر

اس کا تو اس چیز سے دور دور تک بھی واسطہ نہ تھا۔

اور کل تک تو وہ صرف موٹر سائیکل سوار تھا اس لیے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک آواز کا دیوانہ ہو جائے گا یہ دیوانگی تو اس برانڈ نیو کار کی عنایت تھی جو کارفنانسنگ اسکیم کے نتیجے میں اس کی زندگی کا حصہ بنی تھی ہر مہینے معقول آمدنی والی جاب حاصل کرنے کے بعد اس نے اپنی ذات کے لیے پہلی عیاشی یہ ہی کی تھی جو اس کے گھر والوں کے لیے بھی اتنی ہی سود مند تھی جتنی کے اس کے لیے۔

ابا کی یونیورسٹی سے محبت کا یہ عالم تھا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی وہ وزٹنگ فیکلٹی سے وابستہ تھے اور اس نے صبح صبح انہیں یونیورسٹی ڈراپ کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی۔ ایک دن ہوا یہ کہ ابا ہی ریڈیو ٹیونگ کرتے ہوئے خبروں کے ایک پروگرام پر رک گئے۔ یہی بی سی کے کسی نیوز کاسٹر کی آواز لگ رہی تھی۔

ایف ایم کی فریکوئنسی پر اس طرح کا نستعلیق لب ولہجہ ان کی حیرت تو لازمی تھی ویسے بھی وہ بی بی سی ریڈیو کے شائق تھے اب گاڑی میں بیٹھ کر ان کی مزید تسلی تشفی ہو جاتی اس لمحے وہ بھی گاہے بگاہے تبصروں اور تجزیوں کے اس پروگرام کی طرف سماعتیں مرکوز کر لیتا مگر توجہ مکمل طور پر نئی گاڑی کی پُر احتیاط ڈرائیونگ کی طرف ہوتی۔

اس دن بھی ابا اپنی پسند کا پروگرام سن کر آف کے بٹن پر ہاتھ رکھنا ہی چاہتے تھے کہ ایک خوشگوار سی آواز بڑے منفرد انداز میں صبح بخیر کہتے ہوئے ان کی توجہ کا مرکز بن گئی ابا نے آف کے بٹن سے ہاتھ ہٹا دیا اور وہ بھی مکمل اس آواز کی طرف متوجہ ہو گیا۔

صبح کی بھرپور تازگی اپنے اندر سمیٹے اس آواز میں کوئی تو بات ایسی تھی کہ ان دونوں نے یہ پروگرام سننا شروع کر دیا۔

"دل کو ناگوار لگنے والی ہر وہ چیز چاہے وہ کیفیت ہو یا رویہ پہلے بری لگتی ہے لیکن ہم سب کا مسئلہ یہ ہے کہ ہم آہستہ آہستہ ان برائیوں کے عادی ہو جاتے ہیں دو ایک بار ضرور اس برائی کے خلاف احتجاج

کرتے ہیں غصہ کرتے ہیں مگر پھر اپنا حوصلہ کھو دیتے ہیں اور ہوتا یوں ہے کہ.....!"

وہ بلا تاقف اور بے حد رواں لہجے میں بول رہی تھی ایف ایم کے مخصوص انداز سے ہٹ کر ابا نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

وہ بھی قائل ہو رہا تھا تھوڑی دیر کے بعد اس نے اپنے تعارف کے ساتھ یہ کہا کہ وہ ایف ایم کی فریکوئنسی پر آپ سے مخاطب ہے لیکن ہوسٹن اسٹوڈیو سے تو وہ مزید دلچسپی کے ساتھ اس کا پروگرام سننے پر مجبور ہو گئے۔

اس کا رواں لہجہ اس کی شین قاف سے درست اُردو اور ٹھہرا ہوا انداز گفتگو..... ہر چیز اپنی جگہ دلچسپ اور ستائش کا محور تھی۔

اس نے اپنا نام خولہ کمال بتایا تھا اور یہ تو کمال ہی ہو گیا تھا کہ سفر کے اختتام پر یونیورسٹی کی رنگ برنگی دنیا کو ایک نظر ٹھہر کر دیکھنے والا خزیمہ اس کی آواز کے زیر و بم میں اس قدر مگن تھا کہ اسے پتا بھی نہیں چلا اور وہ گاڑی کو پھولوں بھری روش کے ساتھ ساتھ یوٹرن پر بھی ڈال چکا ہے ابا نے جانے کب اللہ حافظ کہا تھا اسے تو بہت ساری باتیں یاد رکھنی تھیں۔

وہ کہہ رہی تھی۔

"ہمیں زندگی میں ہر موڑ پر سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے اور ہر نیا سمجھوتہ پہلے سمجھوتے سے شدید تر ہوتا ہے دراصل ہوا یہ تھا ہم نے پہلا سمجھوتا اس وقت کیا تھا جب ہم اس دنیا میں آئے تھے دیکھیں نا وہ گھر وہ لوگ ہم نے خود منتخب نہیں کیے تھے۔"

☆.....☆.....☆

وہ ان کے ہونے کو بہت اعتماد کے ساتھ رد کر آیا تھا لیکن اب مسئلہ یہ تھا کہ نیند نہیں آ رہی تھی کروٹیں بدل بدل کر تھک گیا تھا بستر پر گویا کانٹے اُگ آئے تھے حالانکہ یہ بستر بھی راجہ ہاؤس کے نرم

گرم بستر کی طرح پُرسکون تھا چونکہ وہ پہلی بار اس شہر میں آیا تھا۔

جاب کے ابتدائی دن تھے اس لیے آفیسرز ہاؤس میں بھی چیزیں بڑے اعتماد کے ساتھ اس کے استعمال کے لیے پیش کی گئی تھیں تاکہ وہ موسم اور حالات کی سختی سے خوش اسلوبی سے نبٹ سکے ہواؤں میں خنکی گھلنے کے بعد رات تو ویسے بھی ان علاقوں میں ٹھنڈی ہو جاتی تھی اور وہ تو گرمیوں جوانجوائے کرتا تھا موسم بدلنے کی اطلاع سب سے پہلے اس کے کمرے سے ملتی تھی جہاں گرم کمبل بیڈ کی پائنتی پر رکھا ملتا تھا نہانے کے لیے تو وہ گرمیوں میں بھی گرم پانی کا استعمال کرتا تھا۔

اتنے دنوں سے وہ یہاں پر بالکل بھی تو بے سکون نہیں ہوا تھا مگر آج دوپہر میں راجہ ہاؤس سے واپس پلٹنے کے بعد سے یہ فضا بہت بوجھل محسوس ہو رہی تھی۔

''راجہ طارق محمود.....'' یہ نام اس کی سماعتوں کے لیے نیا تو نہیں تھا اور ماضی میں اس نام سے اس کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ بعض اوقات کسی فارم میں والد کا نام لکھتے ہوئے وہ ایک لمحے کو سوچ میں پڑ جاتا کہ ان کا پورا نام کیا ہے۔

ایسا نہیں تھا کہ نانی کی تربیت میں کمی کے باعث وہ اپنے ناں باپ سے غافل ہو گیا تھا لیکن ایسا ضرور تھا کہ ان کی بھرپور تربیت کے باعث اس کی شخصیت میں کوئی تشنگی کوئی جھول باقی نہیں رہا تھا اس نے بہت کم عمری میں حقائق کو تسلیم کر لینے کے بعد تمام غیر اہم چیزوں کی پرواہ کرنا چھوڑ دی تھی۔

ماں باپ کے درمیان رشتہ برقرار کیوں نہیں رہ سکا..... وہ سوچتا تو بہت الجھ جاتا اسی لیے نانی کی اس بات کو ذہن میں بٹھا لیا کہ بعض فیصلے قدرت اس لیے کرتی ہے کہ انسان کا ایک ایسی طاقتور ہستی پر اعتقاد برقرار رہے جو کن کہہ دے تو ہو جاتا ہے۔ بندے اور معبود کا وہ رشتہ برقرار رہے جس کی بنیادی غائب پر یقین ہے۔ نانی بہت پڑھی لکھی ہوتیں تو جانے آج کہاں اور کس اعلیٰ عہدے پر ہوتیں مگر بحیثیت خاتونِ خانہ بھی انہوں نے بڑی بھرپور اور جدوجہد سے پُر زندگی گزاری تھی۔

تمام غیر اہم چیزوں کو سوچ سمجھ کر نظر انداز کرنے والا عاشر عباس حیرت انگیز طور پر آج ایک عام سی بات کو لے کر جاگ رہا تھا۔

وہ راجہ طارق محمود کو سوچتے ہوئے جاگ رہا تھا اور اس کے جاگنے کی وجہ راجہ ہاؤس نہیں بلکہ بڑے طمطراق سے نظر آنے والا وہ شخص تھا جس کی شخصیت کے سحر سے بچ نکلنا اتنا آسان نہیں تھا۔

اور وہ تو پھر ان کا بیٹا تھا کہیں نا کہیں تو دل نے سرکشی کرنے کی ٹھان ہی لی تھی۔

دل تو ازل سے نادان ہے اس نے عقل کا سہارا لیا تو پتا چلا وہاں سے بھی مدد کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔

لایعنی باتوں کو سوچتے ہوئے اسے جانے کب نیند آ گئی تھی اس لیے آنکھ کھلی تو سورج کی تیز کرنیں کھڑکی کے راستے اندر تک کا راستہ بنا چکی تھیں۔

اس نے بستر سے چھلانگ لگائی اور واش روم کی طرف دوڑ لگا دی آفس سے دیر ہو چکی تھی اور آج اپنے اپنی ٹیم کے ساتھ چیڑ کے جنگل کا سروے بھی کرنا تھا جہاں گزشتہ ہفتے آگ لگ جانے کے باعث کافی نقصان ہو چکا تھا۔ جنگلات میں لگنے والی آگ تخریب کاری کا نتیجہ بھی ہو سکتی تھی اسی امکان جو مد نظر رکھتے ہوئے وہ بغور اس علاقے کا معائنہ کرنا چاہتا تھا۔

مختصر سا شاور لینے کے بعد وہ بالکل فریش تھا ناشتے کا ارادہ فی الحال ترک کرتے ہوئے ادنے گاڑی آفس کے راستے پر ڈال دی۔ رات کے مقابلے میں دوپہر کا استقبال کرتی یہ صبح خاصی پُر حدت ہواؤں کی وجہ سے ذرا بھی خوشگوار محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ خنکی کے ساتھ خشکی بھی تھی۔ موسم کے کتنے رنگ تھے وہ خود بھی وضاحت کرنے سے قاصر تھا۔

آفس میں تیار ٹیم نے اس کا استقبال کیا تھا چونکہ اس نے یہاں آتے ہی لوگوں پر اپنی اصول پسندی اور کام سے لگن والی شخصیت کو ثابت کر دیا تھا اسی لیے اب اس کا مثبت نتیجہ سامنے آ رہا تھا۔

جنگلات کا باقاعدہ سروے آج اس کا پہلا تجربہ تھا لیکن اس کے ساتھ ٹیم بھی بہت ایکسائیٹڈ تھی وہ اس شہری بابو کو نت نئی معلومات فراہم کرنے کے حوالے سے زیادہ مستعد نظر آ رہی تھی۔

ایک معصوم سے کلرک نے تو اطلاع بھی فراہم کی تھی کہ اس جنگل میں کسی چڑیل کا مدفن بھی ہے اکثر رات گئے اس جگہ سے بھیانک سی آوازیں آتی ہیں۔

''یقیناً اس چڑیل کو تمہارے کدی نانا، دادا نے مارا ہوگا۔''

''اور کیا صاحب میرے نانا تو شیر سے کشتی کرتے تھے۔'' وہ حد سے زیادہ مرعوب تھا عاشر نے اس کی سادگی پر محض مسکراتے ہوئے پروگرام کو حتمی شکل دی تھی۔

جونیئر کلرک شکیل کا کہنا کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا کیونکہ چیڑ کا یہ گھنا جنگل مدتوں سے لوگوں کے لیے خوف اور دہشت کی علامت بنا ہوا تھا ہواؤں کی سرسراہٹ میں پتوں کی سائیں سائیں ملتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی ذی روح اپنے دکھوں پر بین کر رہا ہو۔ کبھی شاخ پر بیٹھا عقاب اونگھ آنے پر سنبھل کر پھڑ پھڑاتا تو یوں لگتا جیسے پورا جنگل توپ کے دہانے پر ہو۔

عاشر عباس تو وہاں پہنچ کر ایک لمحے کو دم بخود سا رہ گیا۔ فطرت کی صناعی ہرے رنگ کی صورت پورے ماحول پر سحر سا طاری کر رہی تھی اپنی ہی آواز کی بازگشت اور جنگلی درندوں کی چنگھاڑ سے دل اچھل کر حلق میں ضرور آتا مگر پھر نیچر کو اپنی دسترس میں کرنے کا تجسس ہر قسم کے خوف پر غالب آ جاتا۔

اس کے اسسٹنٹ کا خیال تھا۔

یہاں لکڑی غیر قانونی طور پر فروخت بھی ہوتی ہے لوگ بغیر اطلاع اور اجازت کے درخت کاٹنے کے بعد ہرجانہ بھی ادا نہیں کرتے۔

''صرف ایک شخص ہے جو اصولوں میں کھرا ہے میں نے ہمیشہ اسے لکڑی کی قیمت زیادہ بتائی اور وہ ادا کر کے چلتا بنا۔'' سرمد آزاد رطب اللسان تھا عاشر نے یونہی پوچھ لیا۔

"وہ کون ہے....."

"راجہ طارق.....ان کے گھر میں استعمال ہونے والی لکڑی اسی جنگل سے گئی ہے۔ سال کے بارہ مہینے باہر رہتا ہے مگر گھر ائسا بنوایا ہے جیسے وائٹ ہاؤس.....امیر ہے مگر عیاش نہیں....." سرمد آزاد کو یہ موضوع حد درجہ پسند آیا تھا مگر عاشر عباس کی سوئی راجہ طارق سے ذرا آگے کھسک کر اس بات پر آن رکی تھی کہ

"وہ امیر ہے مفر عیاش نہیں۔"

اس نے ایک دفعہ اپنی مما کو نانی سے بات کرتے سنا تھا اور وہ کہہ رہی تھیں۔

"وہ عیاش آدمی ہے دولت کے بل بوتے پر ہر برائی کو کرنے کا سرٹیفکیٹ حاصل کر لیتا ہے۔ کتنی عجیب بات تھی مما بچپن سے ان کے ساتھ رہنے کے باوجود انہیں عیاش کہہ رہی تھیں اور یہ شخص جو انہیں سرسری جانتا تھا امیر بھی کہہ رہا تھا اور بھلا مانس بھی۔"

صرف اتنا ہی نہیں وہ تو ان کی ظاہری شخصیت سے بھی متاثر نظر آ رہا تھا عاشر عباس نے ان سنی کرتے ہوئے قدم آگے بڑھائے مگر کوئی غیر مرئی طاقت تھی جو ان کو بھی سرکشی سے روک رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ ہر پروگرام میں کسی نا کسی سمجھوتے کی بات کرتی تھی۔

"لسنرز ہم پتا نہیں یہ ہی کیوں سوچتے ہیں کہ سمجھوتہ محبت کی موت ہے مجھے تو یہ لگتا ہے کہ سمجھوتا محبت کو مضبوط کرنے اس کو سمجھنے اور پرکھنے کے لیے وقت فراہم کرتا ہے اور پھر اس وقت کی سطلب سے بڑی تبدیلی یہ ہوتی ہے کہ آپ محبت کو از خود اپنا لیتے ہیں محبت دراصل ایک عادت ہے اور عادت کو پختہ کرنے کے لیے اس کے ساتھ رہنا ضروری ہے۔"

وہ بلا تکان بول رہی تھی اور خزیمہ ابا کے برابر بیٹھا گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے عجیب سی الجھن میں گرفتار ہو گیا تھا دل چاہ رہا تھا ان ساری باتوں کا جواب دے ابھی اسی وقت لائیو کال کے ذریعے یا پھر

فوراً سے بیشتر ای میل کر کے مگر یونیورسٹی کے راستوں پر دوڑتی بھاگتی گاڑی میں ایسا کوئی تجربہ ممکن نہیں تھا وہ ابھی ابا کے ساتھ انہیں ڈراپ کر کے واپس پلٹا تو وہ اپنے پروگرام کو سمیٹ رہی تھی۔

''اور فرینڈز! اندھیرے کتنے ہی گھور کیوں نہ ہوں اماوس کی رات بے شک طویل ہو مگر سورج کو طلوع ہونے سے اور چاند کو چمکنے سے کوئی نہیں روک سکتا یہ قانون قدرت ہے کہ رات سے دن کا جنم ہوتا ہے اور یہ ہی دن ہمیں رات کی تاریکی سے نبرد آزما ہونے کی طاقت دیتا ہے۔

دن رات کے اسی تسلسل کا نام زندگی ہے دونوں سے سمجھوتا کیجیے اور مجھے دیجیئے اجازت..... ہوسٹن اسٹوڈیو سے.....''

اس کے ساتھ ہی خزیمہ نے زوردار بریک لگائے تھے کہ آنکھوں کے بالکل سامنے بلی کا منا سا بچہ کسی کپڑے کے ربن سے الجھا ہوا تھا یہ کھیل کافی دیر تک جاری رہ سکتا تھا مگر خزیمہ نے نیچے اتر کر دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کیا اور بلی کے بچے کو فٹ پاتھ کا راستہ دکھا کر اپنی سیٹ پر واپس آیا اور اتنی دیر میں پیچھے ڈھیر ساری گاڑیوں کی قطار نے باجماعت ہارن بجا کر ایمرجنسی کا نفاذ کر دیا تھا۔

اور پھر شام کو اس نے فرصت پا کر آج کے دن کی مکمل روداد خولہ کو لکھ بھیجی تھی جس کے جواب میں وہ ذرا بھی متاثر نہیں ہوئی تھی۔

''اٹس یور ڈیوٹی.....'' اس کا اتنا مختصر جواب پا کر وہ سر دے پاؤں تک آگ بگولا ضرور ہوا تھا مگر ہمت نہیں ہاری تھی۔

سمجھوتے پر اس نے اپنے دلائل سے قائل کرنے کی کوشش کی تھی اور اب وہ دلیلیں ڈھونڈ رہا تھا سمجھوتہ سیریز کامیاب ہو بھی سکتی تھی مگر خولہ کمال بھی اپنے نام کی ایک تھی مجال ہے جو کسی بات کا اثر ہوتا ہو۔

خزیمہ نے غصے میں آ کر سائن آف کرنے کا فیصلہ کیا تو اس کا بالکل الگ انداز کا میسج اپنے ہونے کا احساس دلانے لگا۔

وہ ایک شعر تھا

محبتوں کے سفر پر ہیں گامزن جو لوگ
خدا کرے میں ان سب کو سرخرو دیکھوں

پتا نہیں اس نے یہ کس جون میں لکھ دیا تھا مگر خزیمہ کے لیے یہ ہی بہت تھا کہ اب وہ آہستہ آہستہ اس کی نیٹ فرینڈ بنتی جا رہی تھی۔ اس نے شاید اس حقیقت کو قبول کر لیا تھا کہ خزیمہ حد سے زیادہ مستقل مزاج دوسرے لفظوں میں ڈھیٹ ہے۔

لیکن خزیمہ جب اس حقیقت سے آشنا ہوا تو سر پیٹ کر رہ گیا۔ خولہ کمال..... سامعہ کی نیٹ فرینڈ بن گئی تھی یہ حادثہ کیسے ہوا تھا سامعہ کی شریر آنکھوں میں واضح طور پر درج تھا۔

بھیا جانی ایک دن آپ سائن آف کرنا بھول گئے تھے۔ اس نے نظریں چرا کر اس قدر معصومیت سے کہا کہ وہ اپنا سارا غصہ ٹھنڈا ہونے پر افسوس میں مبتلا ہو گیا۔

''پھر.....''

''پھر کیا۔ بس میں نے خولہ کی آئی ڈی کو نوٹ کر لیا.....''

''صرف نوٹ کر لیا یا سب کچھ پڑھ لیا۔''

''نہیں بھلا مجھے آپ کی میلز پڑھنے سے کیا فائدہ ہوگا۔ میں نے تو ایف ایم سنا تھا۔'' اس کے بیانات خاصے مضحکہ خیز تھے خزیمہ دل ہی دل میں ہنسا۔ سامعہ کا بھولپن کہیں نا کہیں سے عود کر آ ہی جاتا تھا۔

دراصل وہ سب کچھ جان گئی تھی اور اب بھیا جانی کے عتاب سے بچنے کے لیے نت نئے بیانات کا سہارا لے رہی تھی۔

خزیمہ تھک ہار کر اپنی کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔

''تم آئندہ میرے کمرے میں نہیں آؤ گی۔''

''سوچ لیں خولہ کمال سے میری اچھی گپ شپ ہوگئی ہے۔''

''مائی فٹ گپ شپ.....وہ بہت بزی رہتی ہے۔''

''جی نہیں، وہ صرف یونیورسٹی میں پڑھتی ہے اس کا سبجیکٹ آرٹ اینڈ کلچر ہے وہ ہاسٹل میں رہتی ہے اس کی مما کی ڈیتھ ہو چکی ہے ایک اور سسٹر کشمالہ کمال ہے جو بی بی سی میں ہے۔''

سامعہ نے حیرت انگیز طور پر جو معلومات فراہم کی تھیں وہ تو شاید خزیمہ مہینوں میں بھی حاصل نہیں کر سکتا تھا اس کے چہرے پر خوشی عجیب و غریب انداز میں جلوہ گر ہوئی تھی۔ سامعہ قابلیت جھاڑنے کے درپے تھی مگر خزیمہ نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

''بس کرو مجھے بھی سب پتا ہے۔'' بھرم تو رکھنا تھا۔

''بھیا جانی آپ کو کچھ نہیں پتا وہ تو آپ کو لفٹ بھی نہیں کروا رہی تھی۔''

''تمہاری بھول ہے بہنا.....'' خزیمہ کو نظر انداز کرنا آسان نہیں۔

''ہوسٹن اور کراچی میں بڑا طویل فاصلہ ہے یہ مت بھولیے۔''

''راستے مختصر کرنے ہمیں آتے ہیں۔''

''پہلے دوست تو بنالیں.....'' اس نے دو قدم پیچھے کھسک کر گویا منہ چڑایا تھا۔

''اگر بنالیا تو.....''

''تو میں بھابھی بنالوں گی.....'' وہ چہکی اور خزیمہ نے تائیدی انداز میں سر ہلا کر گویا ہار مان لی تھی۔ آنکھوں میں اترنے والی چمک بڑی انوکھی سی تھی۔ سامعہ نے بڑی دلچسپی سے دیکھا۔

''میرے لیے زبردست ٹریٹ کا بندوبست کریں سب ہو جائے گا۔'' بھائی کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا بہنوں کی اولین ترجیح ہوتا ہے سو وہ بھی اس وقت یہ ہی کر رہی تھی۔

''بھوکی، ندیدی، بلیک میلر.....''

''سوچ لیں.....'' وہ کندھے اچکا کر بے نیازی سے بولی تو خزیمہ نے تھک کر ہاتھ جوڑ لیے۔

''منظور ہے سائیں بابا.....بس ہمارا کام ہو جائے۔''

''تیرا کام ہو جائے گا بچہ.....'' وہ ہنستی ہوئی دروازے سے باہر نکل گئی۔

خزیمہ نے ایک بار پھر بڑے کھلے دل کے ساتھ تسلیم کیا تھا کہ لڑکیاں لڑکوں سے زیادہ ذہین ہوتی ہیں۔ سامعہ نے بے ضرر سی شرارت کر کے اس کے راستے ہموار کر دیئے تھے۔

خولہ کمال جو بھی تھی جیسی بھی تھی مگر بہت غیر محسوس طریقے سے اس کے معمولات کا حصہ بن گئی تھی صبح اس کی باتوں سے محظوظ ہونا اور رات میں ای میلز سے لطف اٹھانا۔

صحیح معنوں میں اب وہ اپنی زندگی کے اس دلچسپ دور سے گزر رہا تھا جہاں سے کچھ لوگ بہت جلد بازی سے گزرتے ہیں اور ان کے ہاتھ سوائے تلخ تجربات کے کچھ نہیں آتا مگر اس کا تو معاملہ برعکس تھا۔

زندگی کا وہ موڑ جہاں اسے ایک ساتھی کی ضرورت تھی اس موڑ پر ٹھہر کر اس نے اپنے اطراف میں نظریں دوڑائیں تو کوئی نظر نہیں آیا تھا لیکن یہ چند ہفتے پہلے کی بات تھی آج اس موڑ پر ٹھہرنے کے لیے وقت نے اس کے ہاتھ میں امید کے جگنو تھما دیئے تھے اور وہ ان کی جگمگاہٹ سے خوب خوب لطف اندوز ہو رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

صبح پکنک تھی اور وہ رات کو پاؤں پکڑ کر بیٹھا ہوا تھا۔

''میرے خیال میں موچ آ گئی ہے۔''

اس کے چہرے پر شدید تکلیف کے آثار تھے عامر فکرمندی سے دیکھتے ہوئے صوفیہ کی طرف مڑ گیا۔

لڑکیوں کی طرف سے اس پکنک کی ہیڈ وہ تھی شجاع نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا جو بے نیازی سے ببل گم کے غبارے بنا رہی تھی ذرا جو اسے کسی کا احساس ہو۔

''ہم لوگ پکنک پر ضرور جائیں گے کس نے ان محترم کو مشورہ دیا تھا کہ جمپ لگاتے پھریں یہ عمر ہے اس طرح کی حرکتیں کرنے کی۔''

وہ اچھی تو لگتی تھی مگر ستم یہ تھا کہ پوری استانی تھی شجاع نے بمشکل مسکراہٹ دبائی اور ایک بار پھر چہرے پر مظلومیت طاری کر لی۔

''ہٹو تم لوگ یہاں سے..... میں ابھی آیوڈیکس سے مالش کرتی ہوں صبح تک بالکل ٹھیک ہو جائے گا کیوں شجاع.....'' عائزہ سب کی ہمدرد تھی اس کی گواہی تو سب لوگ دیتے تھے۔

''ہونہہ ڈرامے باز کہیں کا۔'' وہ بدستور اس کی حرکت پر غصے میں تھی۔

''مرہم نہیں لگا سکتیں تو زخم بھی مت لگائیں۔'' چہرے پر زمانے بھر کی سنجیدگی طاری کر کے کہا۔

''صوفیہ کیا بدتمیزی ہے کبھی کسی کی پریشانی کا خیال کر لیا کرو۔'' فائزہ نے فوراً سے بیشتر کلاس لی جو وہ اکثر لیا کرتی تھی اور گھر بھر کی لاڈلی صوفیہ تو ان عنایتوں کی عادی تھی اس لیے ذرا سی دیر کے لیے بھی اس کے چہرے کے تاثرات نہیں بدلے۔

''اوکے ہم کل ضرور جائیں گے میں صبح تک بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا ان محترمہ کی خاطر.....''

آخری جملہ اس نے بہت ادا کے ساتھ کہا تھا وہ یکدم اس کی طرف مُڑ گئی۔

''آپ بہت بڑے ڈرامے باز ہیں اس طرح کے ڈرامے کرنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''آپ کو متاثر کرنے کے لیے۔'' وہ بہت مزے سے بولا تو کمرے میں موجود سارے نفوس صرف مسکرا کر رہ گئے اس سے زیادہ ری ایکٹ کرتے تو صوفیہ کے ہاتھوں ایک آدھ ضرور ضائع ہو جاتا۔

''میں نہیں جاؤں گی.....'' وہ حسب عادت واک آؤٹ کر گئی تھی مگر سب کو پتا تھا اگلی صبح وہ سب کچھ بھول کر ان کے ساتھ شامل ہو گی۔

اس کے جانے کے بعد شجاع اچھل کر کھڑا ہو گیا تھا۔ پاؤں کی موچ کے آثار تک نہیں تھے اس

کے چہرے پر فائزہ نے بڑے ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی گردن پکڑ لی تھی۔

''تم انتہائی خبیث آدمی ہو۔'' عامر اس کی شرارت میں برابر کا حصہ دار تھا۔ یہ ڈرامہ تو صرف صوفیہ کو زچ کرنے کے لیے کیا گیا تھا جس کے ساتھ اس بات کی شرط لگی تھی کہ لڑکے چاہیں تو کچھ بھی کر سکتے ہیں یعنی لڑکیوں کے پروگراموں کو آسانی سے ملیامیٹ کر سکتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

شہر کے پوش علاقے میں یہ گھر جس کا نام بیت السکون تھا۔

صرف نام کا ہی بیت السکون نہیں تھا بلکہ اس کے مکین بھی اس نام کی تشریح کرتے نظر آتے تھے دو بھائی اس کے اوپر نیچے کے پورشن میں مقیم تھے جبکہ تیسرا بھائی اپنے حصے میں بیوہ بہن کو رہنے کی اجازت دے کر خود عرصہ دراز سے شارجہ میں مقیم تھا۔

بیت السکون کے پچھلے حصے میں ہر وقت دھما چوکڑی مچی رہتی۔ یوں تو بیت السکون کے سارے بچے اب شعور کی دہلیز پر قدم رکھ چکے تھے مگر ان کی شرارتیں اور زندگی سے بھرپور حرکتیں کبھی کبھی اس یقین کو ڈگمگانے لگتیں۔

صوفیہ کو اکلوتی ہونے کا اعزاز حاصل تھا اور لاڈلی چہیتی بھی تھی۔ ماموں کے پاس رہنے کا اضافی فائدہ تھا بچپن میں باپ کی شفقت اور محبت سے محروم ہو گئی تھی۔

ماں نے بہت چاہا کہ وہ اس طرح کے ناز و نعم میں نہ پلے جو آگے چل کر اس کی شخصیت پر اثر انداز ہو مگر بیت السکون میں ان کے دو بھائیوں نے ان کی ایک نہ چلنے دی۔

شوہر کے انتقال کے بعد راحت بیگم کے معاشی حالات کچھ عرصے کے لیے دگرگوں ضرور ہوئے تھے جب ان کے شوہر کے بزنس کا شیرازہ بکھر گیا تھا اور پھر صوفیہ کے مستقبل کو سامنے رکھ کر انہوں نے خود ہی ہمت کی اور ایک نئے روپ میں خود کو ڈھالا۔ بھائیوں کی مدد سے بزنس کی شُد بُد حاصل کی اور

دونوں گارمنٹ فیکٹریوں کی دیکھ بھال کے لیے سرگرم ہو گئیں۔ مخالفت کا سامنا روسسرال والوں کی طرف سے رہا مگر ان کا حوصلہ کم نہ ہوا اور زندگی اس ڈگر پر چل نکلی جہاں انہوں نے کام اور صرف کام کو اپنی ترجیحات بنالیا اور پھر وقت بدلتے دیر نہیں لگتی انسان عزم و حوصلے کے ساتھ اگر کسی راستے کا تعین کر لے تو سفر کی ہر دشواری ختم ہو جاتی ہے۔

آج وہ اسی مقام پر کھڑی تھیں جہاں ان کی زندگی کی مثال دی جاتی تھی ایسے میں اگر صوفیہ ہٹ دھرم اور بد دماغ ہو گئی تھی تو یہ اس کا قصور نہیں تھا بلکہ جس طرح کے حالات میں وہ پل کر بڑی ہوئی تھی جس طرح کے معمولات بچپن سے اسکی زندگی کا حصہ رہے تھے وہ یقیناً نظر انداز نہیں کیے جا سکتے تھے ماموں ایک حد تک کاڈ کر سکتے ہیں اور ممانیاں بھی ایک حد تک خیال رکھ سکتی ہیں اسے ماں کی کمی بارہا محسوس ہوئی وہ ان کی گود میں سر رکھ کر سونا چاہتی اور وہ فائلوں میں گم ہوتیں۔ وہ ان کے ساتھ گھومنے کے بہانے ڈھونڈا کرتی اور وہ اسے اپنے آفس میں ایک چیئر پر بٹھا دیتیں وہیں سارے کھلونے اور کھانے پینے کی چیزیں آجاتیں اور اس کا شوق ہوا ہو جاتا۔

لیکن جب وہ سمجھداری کی عمر میں داخل ہوئی وقت اور حالات کی نزاکت کو سمجھنا شرور کیا تو پھر خود بخود بے چین دل کو قرار آ گیا اسے اندازہ ہوا کہ ماں کی ذمہ داری کس قدر بڑی ہے اور اس کی خواہشیں کدس قدر چھوٹی۔

صوفیہ بدل گئی تھی مگر اس کی معصوم سی ضد اس کے بے نام سے غصے سے اب بھی سب پیار کرتے تھے۔ سب اسے تنگ کرتے تھے زچ کرتے تھے مگر خیال اس سے بڑھ کر رکھتے تھے عامر، عائزہ اور فائزہ ان تینوں کے لیے وہ کبھی بھی پھوپھی زاد نہیں رہی بلکہ وہ اسی تکون کا حصہ تھی بعض اوقات سلمی بھی کہہ دیتیں کہ میرے چار بچے ہیں۔

اسی طرح محسن اور انعم بھی اس کے ہم عمر ہونے کی وجہ سے لڑتے جھگڑتے ضرور مگر تھوڑی دیر کے

بعد محسن سب کچھ بھلا کر منا لیتا اور انعم کو وہ خود منا لیتی انعم کو منانا نہیں آتا تھا اور وہ اس سے ناراض نہیں رہ سکتی تھی۔

یہ بالکل بے ضرر جھگڑے ہوتے تھے کبھی آئس کریم نہ کھلانے پر اور کبھی بارش میں بھیگ کر گندے پاؤں سے لان کی گھاس خراب کرنے پر اور اس کی مدت بھی مختصر ہوتی لیکن شجاع نے جب سے بیت السکون میں قدم رکھا تھا صوفیہ کو کسی پل قرار نہیں آتا تھا۔ وہ چند سال پہلے بھی اپنی اسٹڈیز کو جاری رکھنے یہاں آیا تھا مگر پھر اس کا یہاں دل نہیں لگا تو وہ لندن چلا گیا تھا اور اب وہاں سے واپس آیا تھا تو نہ صرف دل و دماغ مکمل طور پر یہاں لگا لیے تھے بلکہ چند مہینوں سے وہ راحت بیگم یعنی اپنی پھوپھی کا رائٹ ہینڈ بن گیا تھا۔

اب تو فارغ وقت میں صوفیہ بھی ان کی مدد کو موجود ہوتی لیکن شجاع نے جس طرح ان پر اپنی قابلیت کا سکہ جمایا تھا اس کے وہ خاص طور ہر گُن گاتیں اور شجاع بہت چپکے سے صوفیہ کو وی کا نشان دکھا دیتا اور وہ اس فتح سے زیادہ اس کی آنکھوں میں مستقل براجمان رہنے والی شوخی اور بامعنی سی چمک سے خائف ہو جاتی۔

☆.....☆.....☆

''نانو میرا کوئی ارادہ نہیں ہے ان کے ساتھ رہنے کا ان کے گھر جانے کا آپ کو پتا ہے مجھے اتنی مہربانیوں کی عادت نہیں ہے۔'' وہ فون پر ان سے مخاطب تھا اور اس کا دوٹوک لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ اس موضوع سے خاصا خائف ہے۔

''دیکھ عاشر بچے! تو مجھ سے بھی اتنا دور ہے اور وہاں اپنے باپ کے پاس بھی نہیں رہے گا تو مجھے بہت پریشانی ہوگی چل میری خاطر ہی سہی مان جا.....''

وہ اپنے لاڈلے کی ساری عادتیں جانتی تھیں جو سختی سے نہیں بلکہ محبت سے ہر بات مان لیتا تھا۔

''نانو پلیز مجھے تھوڑا ٹائم دیں ابھی مجھے یہاں ایڈجسٹ ہونے میں وقت لگے گا اور جب اس ماحول کا عادی ہو جاؤں گا پھر سوچوں گا تب تک آپ اصرار نہیں کریں گی مجھے ویسے بھی آپ کی بہت یاد آ رہی ہے اگر آپ نے مجھے پریشرائز کیا تو میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آ جاؤں گا۔''

''جانتی ہوں تیری سب چالاکیاں..... مجھے تو بالکل یاد نہیں آتا۔'' وہ نم آنکھوں کے ساتھ مسکرا دی تھیں وہ ان کی اولاد کی اولاد تھا مگر انہوں نے اسے اپنی اولاد کی طرح پالا تھا بلکہ محبت کا پیمانہ اس کے معاملے میں لبریز ہی رہا اور یہ بھی اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ ان کی اکلوتی اولاد کی بھی اکلوتی اولاد تھا اس کی محبت بانٹنے کے لیے کوئی نہیں تھا اسی لیے وہ بڑے سکون سے نانو کے سایہ شفقت میں رہتا رہا اور آج جب دور ہوا تھا تو انہیں اپنے روز و شب بوجھل محسوس ہوتے تھے یوں لگتا تھا جیسے زندگی کا کوئی مصرف ہی نہیں وہ عمر کے اس حصے میں کہ جب ان کا نواسا جوان تھا خود بھی بہت چاق و چوبند اور باہمت نظر آتی تھیں مالی حالات بھی مستحکم تھے پرانے وقتوں کے بنے ہوئے پرانے سے گھر کے دو پورشن کرائے پر تھے اور دو دوکانیں تھیں وہ بھی کرائے کی شکل میں آمدنی کا مضبوط ذریعہ تھیں انہیں مالی پریشانی تو کبھی نہیں ہوئی البتہ پہلا ذہنی دھچکا اس وقت لگا تھا جب کم عمری میں ہی شوہر کی رفاقت سے محرومی کا دکھ سہنا پڑا اور دوسری بار وہ اس لمحے ٹوٹ گئی تھیں۔ جب انہوں نے سنا کے شمائلہ طارق کے ساتھ خوش نہیں ہے اور وہ طلاق چاہتی ہے۔

ان کی بیٹی طبعاً خودسر اور خود پسند ضرور تھی مگر انہیں اس حد تک اندازہ نہیں تھا کہ طارق کے ساتھ باہمی رضامندی سے جوڑا جانے والا یہ رشتہ اتنا ناپائیدار ثابت ہوگا۔ شمائلہ نے اپنی آزادی کی خوشی منائی اور انہیں عاشر عباس نے ایک بے رشتے کی زنجیر سے باندھ دیا۔ راجہ طارق محمود نے یہ فیصلہ عاشر عباس کی بھلائی کے لیے کیا تھا کہ وہ اپنی ماں کے زیر سایہ رہے مگر ماں نے اپنی زندگی کو بچے کے دائرے میں قید کرنے کے بجائے نئے سفر کی ٹھانی تب راجہ طارق محمود بھی کسی نئی منزل کی تلاش میں تھے اور عاشر عباس

کو اس لمحے وہ مشفق گود میسر آ گئی جس کی پُر اسراری کشش آج بھی اس کے اندر توانائی دوڑا دیتی تھی۔

وہ اپنے لمبے چوڑے وجود کے ساتھ اب بھی ان کی گود میں سمانے کی کوشش کرتا تھا تب ان کا نرم لہجہ اس کی سماعتوں میں رس گھولنے لگتا۔

''پتا ہے بچے میری خواہش ہے تو جتنا قد آور ہے اتنا ہی تیرا ظرف بھی بلند ہو اکثر قد آور لوگ اندر سے بونے ہوتے ہیں خود بھی مشکل میں رہتے ہیں اور دوسروں کے لیے بھی مشکلیں کھڑی کرتے ہیں لیکن تو میرا بیٹا ہے تجھے مشکلیں سمیٹنی ہیں اللہ نے تجھے زندگی کی ہر نعمت سے نوازا ہے قد، بت، آنکھیں، چہرہ اور سب سے بڑی بات تیرا مہربان دل کبھی اس کی ناشکری نہیں کرنا اور اس کا شکر ادا کرنے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ اپنی ذات کو دوسروں کے لیے کارآمد بنا یہاں تک کہ تیرے ماں باپ بھی اس کا حق رکھتے ہیں۔''

''اور میرے ماں باپ نے میرے حق کا کیا کیا.....؟'' وہ کبھی کبھی الجھ جاتا۔

''وہ ان کا ظرف ہے یہ تیرا ظرف ہے تو ان جیسا بن جائے گا اس میں تیری کیا خوبی ہوگی۔'' وہ اس کے گھنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے محبت سے کہتیں اور وہ اس شیریں لہجے کی مٹھاس کو اپنے اندر اتارتے ہوئے آنکھ موند کر پرسکون ہو جاتا گویا یہ بات اس نے تسلیم کر لی ہے۔

☆.....☆.....☆

مہینے کی آخری تاریخیں تھیں آفس میں کام بھی زیادہ تھا اسے اپنی ماہانہ کارکردگی کی رپورٹ مرتب کرنا تھی پچھلی دفعہ چیڑ کے جنگلات میں آتشزدگی کا جو واقعہ ہوا تھا اس کی تحقیقاتی رپورٹ مرتب کرنے کے لیے اس نے خاصی محنت کی تھی محکمہ جاتی اثر و رسوخ سے قطع نظر اس کی ذاتی دلچسپی نے اس کی رپورٹ کو دلچسپ اور اہم بنا دیا تھا۔

مقامی لوگوں کا یہ خیال تھا کہ چونکہ اس جنگل میں کسی چڑیل کا مدفن ہے اسی لیے وہ اپنے غڈے

اور رنج کا اظہار کرنے کے لیے درختوں کو خاکستر کر دیتی ہے اور آئے دن اس طرح کے واقعات ہوتے رہتے ہیں جبکہ اس کی عقل اور باریک بینی سے کیے گئے سروے کے مطابق یہ کارنامہ کسی چڑیل کا نہیں بلکہ بھوت نما اس انسان کا ہے جو آتشزدگی کی آڑ میں جنگلات سے قیمتی جڑی بوٹیاں حاصل کرتا ہے چونکہ آزادانہ نقل و حرکت پر پابندی تھی اس لیے آتشزدگی کے واقعات سے لوگوں کو خوفزدہ کر کے نقل و حرکت کو آسان بنایا جاتا تھا اور اس غفلت کا فائدہ اٹھا کر جڑی بوٹیوں کے حصول کو ممکن بنایا جاتا تھا ہو سکتا ہے ان کے مقاصد کوئی اور بھی ہوں مگر فی الحال اس کی سمجھ میں یہ ہی آیا تھا اور اس رپورٹ کے بعد وہ اپنے اعلا افسران کی نظروں میں قابل ذکر مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور جب اسی حوالے سے تعریفی سند اسے راجہ طارق محمود کی طرف سے ملی تو حیران سا ان کا چہرہ دیکھتا رل گیا۔

''مجھے خوشی ہے کہ تم نے اپنے کیریئر کے آغاز سے خود کو ثابت کرنا شروع کر دیا۔''

وہ اس کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ جما کر بولے اور یہ سب کہنے وہ اس کے چھوٹے سے آفس میں آئے تھے ابھی تک وہ انھیں بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہہ پایا تھا۔

''تم فارغ ہو جاؤ ساتھ نکلتے ہیں.....''

''مگر میں کچھ مصروف ہوں شاید رات تک.....''

''ٹھیک ہے میں انتظار کر لیتا ہوں۔'' انہوں نے بہت سکون سے کہہ کر سامنے رکھے صوفے کا رخ کیا تھا۔

''آپ کو زحمت ہوگی..... میں اپنا کام ادھورا نہیں چھوڑتا۔''

مجھے بھی اپنا کام ادھورا چھوڑنے کی عادت نہیں..... چلو وقت ضائع مت کرو اپنا کام ختم کرو.....''

قدرے بارعب انداز میں کہہ کر وہ سیٹرل ٹیبل پر رکھے اخبار کی طرف متوجہ ہو گئے۔ عاشر مصروفیت کا تو بہانہ گھڑ رہا تھا ان جا سکون دیکھ کر اب مصروفیت ڈھونڈنے لگا تھا پتا نہیں کیوں وہ انہیں سختی

سے انکار نہیں کر سکا تھا مگر انہیں انتظار کی کوفت سے دوچار کرنے کی منصوبہ بندی بھی خود بخود ہو گئی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا وہ کم از کم چار گھنٹے تک تو انہیں یہاں بیٹھنے پر مجبور کر لے گا۔

☆.....☆.....☆

بیت السکون میں ہنگامہ پرور لوگوں کی پہلے ہی کمی نہیں تھی مگر جب سے شجاع نے اس گھر میں قدم رکھا تھا سب کے پیروں میں گھنٹیاں سی بندھ گئی تھیں یہ آؤٹنگ سراسر لڑکوں کے دماغ کی اختراع تھی بوٹنگ پر جانا، مچھلیاں پکڑنا اور وہیں پکا کر کھانا انہوں نے لڑکیوں کو بالکل بھی لفٹ نہیں کروائی تھی اور اسی لیے دونوں گروپوں کے درمیان سرد جنگ کا آغاز ہو چکا تھا۔

''فائزہ یہ تو کوئی بات نہیں پچھلی دفعہ بھی یہ لوگ باؤلنگ ٹورنامنٹ میں لاہور گئے تھے ہم میں سے کسی نے کچھ نہیں کہا تھا اور اس بار پھر یہ لوگ پکنک منائیں گے اکیلے.....نو.....نیور.....'' صوفیہ عادتاً تلملا رہی تھی۔

''چھوڑو نا یار مجھے تو ان تفریحات میں کوئی مزا نہیں آتا اور سمندر پر پکنک بالکل فضول سارا کمپلکشن خراب ہو جاتا ہے۔''

انعم نے چھوٹی سی ناک سکوڑتے ہوئے اپنی بے زاریت کا اظہار کیا وہ ایسی ہی تھی نازک اندام میدے جیسی رنگت پر داغ بھی جلد ہی لگ جاتا تھا اس لیے خود کو سات پردوں میں چھپا کر رکھتی تھی۔

''تم تو چپ ہی رہو.....بورنگ لڑکی.....''

صوفیہ نے اسے تو ڈانٹ دیا اور خود عائزہ کے پہلو میں بیٹھ گئی۔

''عائزہ یار کچھ سوچو نا ہم بھی چلیں گے تمہیں پتا ہے لاسٹ ٹائم میں نے چھ مچھلیاں پکڑی تھیں۔'' اس کی ضد بعض اوقات بالکل بچوں والی ہوتی تھی۔

''سوچنے کی کیا بات ہے ہم بڑے ابا سے کہہ دیتے ہیں لڑکوں کو اکیلے نہ بھیجیں سمندر کا معاملہ

ہے یہ لوگ تو ہیں بھی لاپرواہ ان کے ساتھ ہم جیسی ذمہ دار لڑکیوں کا ہونا بہت ضروری ہے۔'' آخری جملہ اس نے صوفیہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دھیمی سی شرارتی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔

''تم تو ہو ہی ان کی گہری دوست ہمیشہ ان کا فیور کرتی ہو.....''

''اچھا نا اب خواہ مخواہ لڑو تو مت فی الحال تو کچن میں چلو آج سویٹ ڈش کون بنائے گا کس کی باری ہے۔''

''کم از کم میری تو نہیں ہے۔ صوفیہ وہیں پاؤں بسار کر لیٹ گئی۔'' انعم نے کشن کے پیچھے منہ چھپا لیا فائزہ کی نظریں میگزین پر ٹک گئیں اور عائزہ غصے میں تینوں کو گھورتی شاید کوئی ہدایت کی دعا مانگتی واک آؤٹ کر گئی۔

عائزہ ضرورت سے زیادہ ذمہ دار، ہمدرد اور بامروت تھی سارے زمانے کا درد اس کے جگر میں تھا اس لیے اکثر و بیشتر مشق ستم بنتی رہتی آج سویٹ ڈش بنانے کی باری انعم کی تھی مگر اس کے چہرے پر صاف لکھا تھا۔

''میں تھک گئی ہوں۔''

اور یہ تھکن بھی اس کی اپنی تخلیق کردہ تھی۔ فلاور میکنگ کلاسز اور پھر حسن کی آب و تاب برقرار رکھنے کے لیے نئے نئے ٹوٹکوں پر عمل درآمد..... بھلا اتنی مشقت کے بعد تھکن تو ہوگی نا!

فائزہ میں احساسِ ذمہ داری اس وقت عود کر آتا تھا جب اس کے سسرال والے آنے والے ہوتے تھے اس وقت اس کی مستعدی قابل دید ہوتی تھی۔ عائزہ اس سے چھوٹی تھی لہذا وہ بھی گھن چکر بنی رہتی مگر اس کے نتائج ہمیشہ اتنے شاندار برآمد ہوتے تھے کہ وہ لوگ فائزہ کے سلیقے، ہنرمندی اور شائستگی کے گھن گاتے ہوئے رخصت ہوتے تھے اور وہ تھی بھی من موجی..... دنوں ان کی تعریف پر خوش رہتی چپکے چپکے مسکراتی رہتی آج کل اس کی شادی کی تیاریاں بھی ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔

اور اگر کبھی باری ہوتی صوفیہ کی تو پھر شور و ہنگامہ زیادہ ہوتا اور کام کم، کبھی اس کی کلائی جل جاتی کبھی ہاتھ پر چھینٹے پڑ جاتے تو کبھی دو چار پلیٹوں کا زمین بوس ہو جانا یقینی ہوتا اس سب کے باوجود تائی جان نے شیڈول میں کسی قسم کا ردو بدل نہ کرنے کا تہیہ کیا ہوا تھا یہ بھی ان کی تربیت کا ایک انداز تھا وہ باری باری ساری لڑکیوں کو کچن کے معاملات سے آگاہ کرنے کی ذمہ داری بخوبی انجام دے رہی تھیں۔

''تایا ابا کی طرف سے تو پکنک کی اجازت مل گئی تھی مگر تائی امی کی ڈکٹیٹر شپ کہاں جاتی..... سب کے ارمانوں پر ان کی ایک ہی بات سے پانی پھر گیا۔

''ان کو اپنا آپ سنبھالنا آتا نہیں مچھلیاں پکڑیں گی کوئی ضرورت نہیں ہے پانی کی سیر ویر کو جانے کی۔''

عائزہ اور فائزہ کی مجال نہیں تھی اپنی والدہ محترمہ کے حکم سے سرتابی کی البتہ صوفیہ منہ بسورتے ہوئے ان سب میں آگے ہو گئی تھی۔

''امی! اتنے دنوں سے ہماری کوئی آؤٹنگ نہیں ہوئی۔''

''جاؤ جا کر اپنی زمینوں کا چکر لگا آؤ مگر ادھر سمندر و مدر کی طرف جانے کی ضرورت نہیں.....'' وہی مرغے کی ایک ٹانگ.....

''زمینوں پر آج کل گھاس بھی نہیں کھود سکتے کیا فائدہ جانے کا.....'' اس کی بڑبڑاہٹ واضح تھی تب ہی شجاع نے داخلی دروازہ عبور کر کے لاؤنج کی پُراسراری خاموشی کا جائزہ لیا اور قریبی کشن پر ٹک گیا۔

''کوئی اسپیشل کلاس چل رہی ہے آپ لوگوں کی۔''

''ہاں یوگا کی.....آپ بھی جوائن کریں نا۔'' انعم نے بے ساختہ پھلجڑی چھوڑی تھی۔

''نہ جی مرنا ہے کیا..... بائے داوے میں آپ لوگوں کی عزت افزائی ملاحظہ کر سکتا ہوں۔'' وہ صوفیہ کے چہرے پر نظریں جما کر بولا۔

''عزت افزائی ہو گی ہمارے دشمنوں کی۔'' جواب بھی ویسا ہی تھا اس نے بمشکل مسکراہٹ

چھپائی اور چہرہ تائی امی کی طرف موڑ لیا۔

''تائی امی مسئلہ یہ ہے کہ مچھلیاں پکڑیں گے ہم اور پکائے گا کون..... ایسا کریں عائزہ کو ہمارے ساتھ چلنے دیں۔ اس کی کوکنگ اچھی ہے باقی یہ لوگ تو شاید جانے میں انٹرسٹڈ نہیں ہیں.....'' وہ بڑے رازدانہ انداز میں ان سے مخاطب تھا۔

''سب سمجھتی ہوں تم لوگوں کی چالاکیاں..... حد ہوگئی ایک کے بعد دوسرا سفارش لے کر آ گیا۔''

تائی امی بھی اپنی انوکھی سوچ پہ خود کو داد دے رہی تھیں اور شجاع کی نظریں صوفیہ سے جا ٹکرائیں جو اس کی تواضع پر خوب محظوظ ہو رہی تھی۔

''تائی امی مجھے کیا ضرورت ہے ان کی سفارش کرنے کی ان کو ساتھ لے جانے سے بہتر ہے ہم لوگ رشیدہ کی بیٹی فرزانہ کو لے جائیں کام تو طریقے سے کر لے گی۔''

''بس میں نے کہہ دیا نا اس طرح کی پکنک لڑکیوں کے لیے نہیں ہوتی.....'' شجاع بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے ان کی طرف مُڑ گیا۔

''دیکھو میں نے تو اپنا کام کیا نا اب..... تم لوگوں کی قسمت۔''

''آپ ہماری قسمت کی فکر نہ کریں ہم ویسے بھی جانے کے موڈ میں نہیں ہیں لہذا آپ کی محنت بے کار گئی۔''

صوفیہ نے نخوت سے کہا۔

''اچھا یہ بات ہے تو آنکھوں میں آنسو کیوں آ رہے ہیں۔'' وہ جاتے جاتے پلٹا۔

''آپ کے ساتھ نہ جانے کی خوشی میں..... کیوں صوفیہ.....'' انعم نے بھی پنجے جھاڑ اور شجاع مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔

''لڑکیاں نہیں گئیں تو ہم جا کر کیا کریں گے۔'' برآمدے میں کھڑے ہو کر سوچا اور خیال کے

پردے پہ صوفیہ کا تپا تپا روپ لہرا گیا۔

وہ اسے تنگ نہیں کرنا چاہتا تھا مگر اسے زچ کرنا اس کے غصے سے محظوظ ہونا اس کے دل کی آواز تھی۔

☆.....☆.....☆

''اور کبھی کبھی یوں ہوتا ہے زندگی دل کی آواز کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتی ہے اور آپ کو پتا ہے یہ آپ کی شکست نہیں، یہ تو وہ جیت ہے جو دوسرے کو جیتنے کے بعد آپ کو ملی ہے..... اگر آپ بھی ایسے کسی احساس سے گزرے ہوں تو ہم سے شیئر کیجیے یہ اسٹیشن ہے دل والوں کا دل کی بات کرنے والوں کا اور جناب دل سے جو صدا نکلتی ہے وہ اثر رکھتی ہے اور اس وقت ہم پلے کرنے جا رہے ہیں اپنے ایک ایسے ہی کالر کے دل کی صدا.....!''

یہ خولہ کمال تھی..... جس کی آواز کا جادو خزیمہ کو مسحور کیے دے رہا تھا پتا نہیں اس نے کس کالر کے دل کی صدا کو ٹیون کیا تھا مگر خزیمہ کو محسوس ہو رہا تھا یہ اس کے بھی اندر کی آواز ہے۔

زندگی میں تم ملے تو..... پھر مجھے ہے کیا کمی

پل بھر میں مجھ کو تم چھوڑنا نہیں چھوٹا سا دل توڑنا نہیں

وہ آفس جانے کے راستے پر تھا اور دوران ڈرائیو وہ فون سے گریز کرتا تھا ورنہ اس وقت اس کا فل چاہ رہا تھا کہے

دل تو انوکھا لاڈلا ہے کھیلن کو مانگے چاند

اور اسے یقین تھا اس کے جواب میں بھی وہاں سے کوئی بھاری بھرکم منطق کے ساتھ ایک دلیل پیش کر دی جائے گی۔

اور اس کے دل کی بات دل میں رہ جائے گی اور وہ اس خوش گوار موڈ کو کسی دلیل کی زد میں نہیں آنے دینا چاہتا تھا اس لیے سماعتیں خولہ کمال کی طرف اور نگاہیں اپنی منزل کی طرف جانے والے راستوں پر جما دیں۔

"لسنر ز زندگی اپنے تجربات سے سکھاتی ہے اور اس کا یقین ہمیں اس وقت آتا ہے جب کوئی زندگی دینے کے بعد چلا جاتا ہے اور ہم سوچتے ہیں کوئی بھی ضروری نہیں کسی کے لیے مگر پھر ایسا کیوں ہوتا ہے جب دل کہتا ہے۔

گزر جائے گی تیرے بغیر بھی ایک کمی سی ہوگی جس کی کسک تھکائے گی نہیں بلکہ حوصلہ بنے گی مشکلوں سے لڑنے کا ارے آپ بھی سوچ رہے ہوں گے میں کیا فلسفہ بگھارنے بیٹھ گئی ہوں۔

وہ بھی صبح صبح اور جناب آپ کی صبح خوشگوار ساعتوں کی نذر کرتے ہیں یہ خوب صورت سا ٹریک..... اور اس ٹریک کے بعد ہوگا اختتام جی ہاں وقت آن پہنچا آپ سے کل تک بچھڑنے کا چلیں پہلے یہ سنتے ہیں۔"

اور اس کے ساتھ خزیمہ نے گاڑی پارکنگ میں کھڑی کر کے ریڈیو آف کیا تھا۔

☆.....☆.....☆

بہت سارے دنوں کی طرح ایک اور خوشگوار دن کا آغاز ہوا تھا وہ ریڈیو تک پہنچا تو اس کا کولیگ ارشد ٹکرا گیا۔ ہمیشہ کی طرح پریشان اور بدحواس.....

خزیمہ اسے دیکھ کر اکثر سوچتا تھا یہ ایسا کیوں ہے اسے قرار کیوں نہیں اور آج اس کا دل چاہ رہا تھا پوچھ ہی لے۔

"کیوں بھئی! خیر تو ہے....." دل میں آئی بات ہونٹوں سے نکلی تھی اپنی بے ساختگی پر حیرت تو ہوئی تھی مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا کیونکہ ارشد کو اس لمحے یقینی طور پر کسی ہمدرد مہربان کندھے کی تلاش تھی۔

وہ پھٹ پڑا وہیں کھڑے کھڑے.....

"یار یہ بھی کوئی زندگی ہے گھر جاؤ تو بیوی کی بک بک اور دفتر آؤ تو باس کی جھک جھک....."

یقیناً اس وقت زور بیوی کی بک بک پر تھا کیونکہ باس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

''ریلیکس یار! بچوں کی طرح مت سوچو..... یہ سب تو چلتا رہتا ہے۔'' خزیمہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر قدم آگے بڑھائے۔

''کب سے چل رہا ہے، کب تک چلتا رہے گا ہماری زوجہ محترمہ نے ہمیں صرف پیسہ بنانے کی مشین جان لیا ہے اور بس.....''

وہ واقعی دلگرفتہ تھا۔ خزیمہ جھرجھری لے کر رہ گیا اسے اس طرح کے حالات کا کوئی تجربہ نہیں تھا لیکن اتنا ضرور جانتا تھا بہت چوٹ پہنچتی ہے جب رشتے احساس کی حد سے نکل کر کسی تصرف میں رہنے والی شے کی مانند ہو جائیں۔

''ارشد! تو سمجھوتا کر لے..... پتا ہے تیرے جلنے کڑھنے سے حالات بہتر نہیں بدتر ہوں گے تیرا مسئلہ یہ ہے تو حد سے زیادہ زود رنج ہے حساس ہے ساری باتیں دل پہ مت لیا کر..... مشکل ہو جاتی ہے۔''

ایسا ہی کوئی سبق شاید کسی پروگرام میں خولہ نے پڑھایا تھا اور وہ اس وقت اسی کا ترجمان بنا ہوا تھا خود پر حیرت کے ساتھ.....

(یعنی میرا لب ولہجہ بھی بدل گیا) احساس ہوا تو مسکرا دیا اور ارشد گہری سانس لے کر اپنے چیمبر کی طرف مُڑ گیا۔

ہفتے کا آغاز تھا اور بہت سارے کام تھے اس لیے وہ اپنی ساری سوچوں کو طاق میں ڈال کر اپنے روم کی طرف مُڑ گیا لیکن ان تھوڑے سے دنوں میں اس نے جانا تھا۔

''جو لوگ دھیان کے رستوں ہر ہم سفر ہوتے ہیں ان کی موجودگی بار گراں نہیں ہوتی ان کے ہونے سے نہ کام متاثر ہوتا ہے اور نہ صلاحیت..... وہ پتا نہیں کیوں سلیمانی ٹوپی پہن کر ساتھ ہوتے ہیں.....''

خزیمہ کی سوچوں کو مرتب کرنے والی خولہ کمال تھی ایک آواز ایک احساس یہ سب سے بڑا سچ تھا۔

☆.....☆.....☆

راجہ طارق محمود کو کوئی انتظار کروائے یہ جرات ان کے بیٹے کے علاوہ اور کس میں ہو سکتی تھی انہیں عاشر عباس کے کمرے میں بیٹھے ہوئے ایک گھنٹہ ہو چکا تھا اور اس کی مصروفیت کا عالم یہ تھا کہ وہ سر اٹھا کر دیکھنے سے بھی گریز کر رہا تھا۔

اس دوران اس کا پیون دو دفعہ کافی سے تواضع کر چکا تھا کمرے کی فضا میں ٹھہرا ہوا سکوت اس بات کا غماز تھا کہ یہاں آنے والے کئی گھنٹوں میں بھی کسی گفتگو کے ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

راجہ طارق محمود کو اپنے تحمل اور عاشر عباس کو اپنی ہے دھرمی پر رشک آ رہا تھا اور وقت ان دونوں پر اپنی حاسد نظریں جمائے اس لمحے کا منتظر تھا جب باپ بیٹا ایک دوسرے کے مدمقابل آ کر فطرت کے طے شدہ اصولوں سے منکر ہو جائیں اس رشتے سے انکاری ہو جائیں جس کی کشش نے اس لمحے دونوں کو اپنے حصار میں گھیر رکھا تھا۔

نہ بیٹے کی تربیت ایسی تھی جو باپ کو کمرے سے نکل جانے کا حکم دیتی اور نا باپ اتنا انا پسند تھا کہ بیٹے کی ضد کو باعث توہین محسوس کر کے واپس پلٹ جاتا۔

تقدیر کہیں نہ کہیں دونوں کے راستے ہموار کر رہی تھی وہ راستے جو آج سے کئی سال پہلے خاردار جھاڑیوں سے اٹ گئے تھے۔

ضد اور ہٹ دھرمی کی خاردار جھاڑیوں سے.....

متضاد رویوں کے نوکیلے کانٹوں سے.....

''سر آپ خواہ مخواہ اپنا قیمتی وقت ضائع کر رہے ہیں میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکوں گا۔''

بالآخر عاشر نے ہی اس سکوت کو توڑا اسے یقین ہو چلا تھا کہ یہ شخص پورے طمطراق سے اس کے سامنے براجمان ہے اپنی بات منوانے کے ہر ہنر سے واقف ہے (لیکن اس کے باوجود) وہ کچھ سوچنا چاہتا تھا مگر مقابل بیٹھی ہستی کا سحر اتنا بھی بے اثر نہیں تھا کہ اس کے خیالات کی رو بھٹک جاتی۔

فی الحال تو اسے راجہ ہاؤس نہ جانے کے ارادے پر قائم رہنا تھا۔

برخوردار وقت تو آپ کا بھی بہت قیمتی ہے جسے آپ کافی دیر سے ضائع کر رہے ہیں یہ تو کوئی اچھی علامت نہیں۔ وہ مسکرائے تھے بظاہر اخبار میں گم ہونے کے باوجود اس کی ایک ایک حرکت اور چہرے پر آنے والی ہر کیفیت سے محظوظ ہو رہے تھے۔

اس کی شہد رنگ آنکھوں میں واضح طور پر تحریر تھا کہ وہ انہیں زچ کر رہا ہے۔

''پھر تو وقت ہم دونوں کا قیمتی ہوا بہتر ہے کہ ایک دوسرے کی مصروفیات میں خلل نہ ڈالا جائے میں یہاں بہت سکون سے ہوں پھر میری جاب ایسی ہے کہ مجھے کبھی بھی حاضر ہونا پڑتا کے۔ میں یہاں جاب اس لیے نہیں کہ صبح دفتر آؤں اور شام کو چھٹی کے بعد فطرت کے نظاروں سے محظوظ ہونے نکل جاؤں۔''

''میں اس کام سے بھرپور انصاف کرنا چاہتا ہوں میں جتنے دن بھی یہاں رہوں گا اپنا بیسٹ دینے کی کوشش کروں گا لہذا آپ مجھے ایسی دنیا کے خواب مت دکھائیں جو مجھے کاہل کر دے جو میرے اندر زمین سے محبت کا نہیں جاگیر کی چاہت کا جذبہ جگا دے پلیز.....''

وہ بہت ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا اور اس کی آنکھوں کے آئینے کہہ رہے تھے کہ اس لمحے وہ اپنے باپ سے دل کی باتیں کر رہا ہے وہ بے ساختہ کھڑے ہو گئے اور دل چاہا کہ اپنے سینے سے لگا کر اس کی سچائی کی داد دیں مگر وہ میز کے اس پار تھا۔

اور یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ کھڑے ہوتے اور عاشر عباس بیٹھا رہتا۔

وقت ایک بار پھر دونوں کو آمنے سامنے کھڑا کر کے متلاشی نگاہوں سے جائزہ لے رہا تھا کہ کوئی تو کمزوری ہاتھ آئے دونوں انسانوں کی.....

کہیں تو کوئی در کھلے قربت کو فاصلوں میں بدلنے کا رشتوں میں تنفر لانے کا۔

مگر!

اس بار سارے فیصلے وقت کے ہاتھ میں نہیں تھے یہ فطرت کا ہی اصول تھا کہ بیٹا باپ کے مقابل تھا اپنے پورے قد کے ساتھ مگر نظروں میں احترام اور لہجے میں نرمی لیے ورنہ کیا کچھ نہیں جانتا تھا وہ اپنے باپ کے بارے میں.....

''ٹھیک ہے مجھے تمہاری تمام باتوں سے اتفاق ہے لیکن یہ میرا تم سے وعدہ ہے کہ تمہارے فرض اور ذمہ داری کی تکمیل میں راجہ ہاؤس کبھی حائل نہیں ہوگا.....

تم وہاں کے مالک ہو.....وہاں تمہارا حکم چلے گا تم کسی کے پابند نہیں ہو جو تمہارے شوق اور ذمہ داریوں میں خلل پڑے گا۔

اینی ویز! آج تو تم میرے ساتھ چل رہے ہو باقی باتوں پر بعد میں سوچا جائے گا.....آج کچھ لوگ انوئیٹڈ ہیں تمہیں مقامی لوگوں سے میل ملاقات بڑھانا ہوگا یہ بھی تمہاری جاب کا حصہ ہے.....

''وہی حتمی لہجہ.....قطعی انداز.....جسے وہ بچپن میں سن کر سر جھکا لیا کرتا تھا اور اس کی ماں تن کر کھڑی ہو جاتی تھی۔

''آپ.....آپ میرے اکلوتے بیٹے کے ساتھ اس لب و لہجے میں بات مت کریں یہ احساس کمتری کا شکار ہو جائے گا۔''

پتا نہیں وہ کس قسم کے احساس کمتری کی بات کرتی تھیں عاشر سوچتا ضرور تھا مگر زیادہ دیر تک نہیں۔

''بیگم! مجھے اپنے بیٹے کے ساتھ کس طرح بات کرنی چاہیے یہ میں آپ سے بہتر جانتا ہوں آپ فکر نہ کریں۔''

وہ اپنے مخصوص لہجے میں کہہ کر گویا بات ہی ختم کر دیتے اور شمائلہ بیگم کے ماتھے کی لکیریں گہری ہو جاتیں۔

اور پھر دنوں تک گھر کی پُر آسائش فضا سکوت میں ڈوبی رہتی بس صبح و شام کے معمولات کے دوران وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے آتے اور مسافروں کی طرح مطلب کی چند باتیں کر کے خاموش ہو جاتے۔

عاشر کو یہ ماحول اس فضا سے بہت بہتر لگتا تھا جس میں ایک مہربان ہوتا اور دوسرا بے زار.....

☆.....☆.....☆

تائی امی کی ڈکٹیٹر شپ نے کام کر دکھایا تھا اور پکنک کا پروگرام کینسل ہو گیا تھا۔

اتفاق سے انہوں نے کسی چینل پر ساحل سمندر پر ڈوب جانے والوں کا کوئی پروگرام دیکھ لیا تھا اور ان کے ذہن میں نئی پرانی سب خبریں تازہ ہو گئی تھیں پھر انہیں یاد آیا کے چاند کی بھی پوری تاریخیں ہیں۔

لہذا اس موسم میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا سمندر کی سیر کا.....

اور ان کا فیصلہ پتھر پر لکیر کی طرح ہوتا تھا بچے تو بچے گھر کے بڑے بھی ان کا احترام کرنے کے پابند تھے۔

"ویسے یہ کس کی کالی زبان کا کارنامہ ہے کوئی منہ کھولے گا۔"

عامر کو شجاع سے زیادہ افسوس ہو رہا تھا اس نے اپنے سارے دوستوں کو بھی دعوت دے رکھی تھی سارے پروگرام کا ستیاناس ہو گیا تھا اب دوست اپنے پروگرام کے تحت جا رہے تھے اور وہ تائی امی کے فیصلے کا شکار ہو گیا تھا۔

"اللہ نہ کرے جو ہماری زبان کالی ہو.....لیکن یہ بھی تو سوچو ہمارے بغیر جانے کی سزا ملنی تھی نا۔" انعم خاصی مطمئن تھی۔

"معاف کر دو.....تم لوگ اتنی بھی درویش نہیں ہو۔"

عامر کا ملال کم نہیں ہو رہا تھا سارے دوست جو تصور ہی تصور میں مچھلیاں پکڑ رہے تھے۔

''اچھا بابا ہم لوگ جو کچھ بھی ہیں اب ہمارا دماغ تو مت کھاؤ۔''

انعم ریموٹ اٹھا کر چینل بدلنے لگی اور عامر کشن میں منہ چھپا کر صوفے پر دراز ہو گیا شجاع اسی لمحے لاؤنج میں داخل ہوا تھا۔

عامر اور انعم کے ہوتے ہوئے صرف ٹی وی کی آواز اسے جھٹکا تو لگا تھا مگر آج دراصل غیر معمولی دن تھا۔ جس کا سب سے زیادہ افسوس عامر اور سب سے زیادہ خوشی انعم کو ہوئی تھی۔

دونوں ندی کے کنارے تھے ساتھ ساتھ بھی چلنا ہے اور الگ رہنے کا ڈرامہ بھی کرنا۔

''بس کرو یار اس سوگ سے باہر نکلو دیکھو میں تمہاری خاطر آفس سے جلدی آ گیا ہوں..... حالانکہ میڈم صوفیہ کی نظریں آج صرف میری کارکردگی پر تھیں۔''

''میڈم صوفیہ.....'' عامر نے کشن ہٹا کر اسے یوں گھورا جیسے اپنی سماعتوں پر شبہ ہو۔

''جی ہاں.....ان کے باپ کے آفس میں ہمارا حال کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔''

''ان کے باپ کا نہیں وہ ماں کا آفس ہے.....''

''وہی.....بہر حال وہاں محترمہ شیرنی بنی رہتی ہیں۔''

''پنجے وغیرہ بھی مارتی ہوگی.....کہاں کہاں نشان ہیں۔''

عامر اٹھ کر اس کے قریب آ گیا اور ہاتھوں کا جائزہ لینے لگا۔

''نشان تو خیر سارے یہاں محفوظ ہیں۔'' اس نے دل پر ہاتھ رکھ کر مسکراہٹ بکھیری۔

''گن گن کر بدلے لوں گا.....تم فکر نہ کرو۔''

''اللہ تمہیں اس کا اجر دے گا.....'' اس کی خفگی تفریح کے کسی نئے پروگرام پر عملدرآمد کے بعد ہی ختم ہو سکتی تھی۔

''چل نا.....ختم کر اب یہ صدمہ.....ایک دو دن میں شکار کا پروگرام بنائیں گے ابھی مجھے یہ

بتا.....تو کبھی راحت آنٹی کے سسرال والوں سے ملا ہے۔"

شجاع نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔

"تو کیوں پوچھ رہا ہے خیر تو ہے۔" وہ مکمل اس کی طرف متوجہ ہو گیا انعم بھی ٹی وی بند کر کے ان کے پاس آ گئی۔

"کیا ہوا.....پھر کوئی مسئلہ ہوا ہے۔"

"ابھی مسئلہ ہوا نہیں ہے لیکن مجھے کہیں کوئی گڑبڑ لگتی ہے.....راحت آنٹی کا سب سے بڑا پرابلم ہی یہ ہے وہ کچھ بتاتی ہی نہیں حد سے زیادہ انٹرووورڈ ہیں اور ان کی بیٹی غوری میزائل....." شجاع کے چہرے کی سنجیدگی آخری جملے پر ختم ہو چکی تھی۔

"فی الحال تیرا مسئلہ غوری میزائل ہے راحت آنٹی کی خاموشی یا پھر ان کے سسرال والے۔"

عامر قدرے پریشان ہو گیا تھا شجاع کو یہاں آئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا لیکن عامر کے لیے اس طرح کا اظہارِ تشویش نظر انداز کیے جانے کے قابل نہیں تھا۔ راحت بیگم کے سسرال والے بیت السکون کی نئی نسل کے لیے ہمیشہ سوالیہ نشان رہے۔

صوفیہ کو بہت کم عمری میں ان کی طرف جانے سے روک دیا گیا تھا۔

راحت بیگم کا یہ فیصلہ صوفیہ کے لیے کبھی کبھی تکلیف دہ بھی ہوتا تھا وہ احتجاج بھی کرتی تھی مگر اس کی ماں نے جس طرح کی پر مشقت زندگی اس کی خوشگوار زندگی کے لیے گزاری تھی یہ سب دیکھنے کے بعد وہ احتجاج کے راستے سے واپس پلٹ آتی تھی۔

وہ اگر راحت بیگم کے ساتھ اکیلی رہ رہی ہوتی تو شاید آج مسائل کا انبار دونوں ماں بیٹی کی زندگی میں ہوتا مگر بیت السکون نے اگر راحت بیگم کی راہ کے کانٹے سمیٹ لیے تھے تو صوفیہ کو بھی عدم تحفظ کا شکار نہیں ہونے دیا تھا۔

اسے باپ کی طرف کے خونی رشتوں کی کمی محسوس تو ہوتی تھی مگر ماؤں کی محبت ہر احساس کو زائل کر دیتی تھی۔

''اب تجھے کیوں چپ لگ گئی۔'' عامر نے کندھا ہلا کر اسے متوجہ کیا۔

''یار میں یہ سوچ رہا ہوں گڑبڑ کس کے دماغ میں ہے۔ مجھے تو کبھی کبھی راحت آنٹی بھی صوفیہ کی ہم عمر لگتی ہیں۔''

''تو یہ بات ان کے سامنے کہہ کر دیکھنا ایسی چھترول ہوگی کہ ابا کے گھر میں ہی جا کر سانس لے گا۔''

تو ایک دن بھی ان کے ساتھ آفس گزارنا پھر میں تجھ سے پوچھوں گا۔''

''اس چکر میں تم دونوں مقصد کی بات سے ہٹ گئے ہو۔ شجاع آپ کو کوئی چیز پریشان کر رہی تھی۔'' انعم نے دونوں ہاتھ جوڑ کر موضوع پر لانے کی کوشش کی تھی۔

''میرے ہلکے پیٹ کے دوستو..... بات اتنی سیریس نہیں لیکن ہو سکتی ہے مستقبل میں۔ آج آفس میں ایک صاحب سے کافی وقت صوفیہ کے کمرے میں گزار کر گئے ہیں اور راحت آنٹی اس دوران کافی ٹینس تھیں اس کے بعد انہوں نے صوفیہ کے ساتھ کمرہ بند میٹنگ کی اور اختتام پر میں نے صوفیہ کو پُر سکون اور راحت آنٹی کی آنکھوں میں سرخی دیکھی۔''

شجاع کی نظروں کے سامنے گویا کوئی فلم سی چل رہی تھی۔

''اوہ میرے ڈرامہ رائٹر..... اس سارے قصے میں تو تیرا سوال کہیں پیچھے ہی رہ گیا.....''

''نہیں میرا سوال..... اب سب سے اوپر آ گیا ہے میں یہ جاننا چاہتا ہوں وہ لوگ کون ہیں۔ ..... کس مزاج کے ہیں..... انہیں صوفیہ سے دلچسپی ہے یا اس رشتے سے جو ان کے اور صوفیہ کے درمیان ہے؟''

وہ کھڑا ہو گیا تھا انعم نے بغور اس کے چہرے کا مشاہدہ کیا جو سوال اس کی آنکھوں میں تھا وہ کافی

عرصہ پہلے اس گھر میں بھی ڈسکس ہوا تھا۔

''کیا وہ لوگ صوفیہ سے دستبردار ہو جائیں گے۔''

تب راحت بیگم نے کہا تھا۔''صوفیہ میری بیٹی ہے صرف میری ان کا کیا لینا دینا۔انہیں کوئی حق نہیں کہ وہ اس کی زندگی کے فیصلے کرتے پھریں۔''

انعم نے من وعن الفاظ شجاع کی سماعتوں تک منتقل کیے تھے مگر اس کے ماتھے پر نظر آنے والی سوچ کی لکیریں کم نہ ہوئی تھیں۔

☆.....☆.....☆

انسان کبھی کبھی اپنے خیالات پر خود ہی شرمندہ ہو جاتا ہے اسے اس.....وقت بالکل اس بات کا اندزہ نہیں ہوتا کہ وقت اور حالات بدلتے دیر نہیں لگتی خیالات کا دھارا کب اپنا رخ بدل لے یہ بھی اس کے بس میں نہیں ہوتا.....

یہ خزیمہ ہی تھا جو کچھ عرصہ پہلے کام کام صرف کام کے مقولے پر عمل پیرا زندگی کو کامیابی کے تمغوں سے سجا رہا تھا اسے وہ سب لوگ وقت کا ضیاع کرتے نظر آتے تھے جو کسی نہ کسی تفریحی مشغلے سے منسلک تھے۔

ایف ایم کے لسنرز اور پریزینٹر دونوں کے احمق لگنے کی وجہ بھی یہ ہی تھی کہ وہ اسے صحت مندانہ سرگرمی قرار نہیں دیتا تھا۔

اسے لگتا تھا آواز اور الفاظ کا یہ جادوئی کھیل نوجوان نسل کے لیے خوابوں کی دنیا کے در کھولتا ہے اور ستم یہ کہ ان خوابوں کے پورا ہونے کا امکان دور دور تک نظر نہیں آتا۔

وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ ہونے والا سلوک آج تک نہیں بھولا تھا۔جب وہ ایک ایف ایم کی آر جے سے ملنے اس کے اسٹوڈیو پہنچا تھا اور اسے کئی گھنٹوں کے انتظار کے بعد جس خاتون کا دیدار

نصیب ہوا تھا وہ اس کی رشتے کی چاچی نکلی تھی جو گھر والوں کی وجہ سے نام بدل کر پروگرام کرتی تھیں ان کے شوق نے فرحان کی پُر تجسس فطرت کو ایسا سبق پڑھایا تھا کہ وہ خاندان کی تمام خواتین کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے کی عادت میں مبتلا ہو گیا تھا۔

''کون..... کب کیا کرتی ہے۔'' یہ اس کا پسندیدہ سوال بن گیا تھا۔

اور اب ایسا ہی ایک سوال خزیمہ کی زندگی میں چپکے سے داخل ہو گیا تھا۔

اس کی رات یہ سوچتے ہوئے گزرتی کہ خولہ کمال کون ہے۔ کہاں رہتی ہے ایف ایم کے علاوہ اور کیا کرتی ہے کیا مشاغل ہیں اور پتا نہیں کیسی ہو گی اپنی آواز کی طرح دلربا اور جب ان سوالوں کی بازگشت سے آزاد ہوتا تو اس کی آواز کا ساز چھڑ جاتا..... اسے اپنے اردگرد جلترنگ سے بجتے محسوس ہونے لگتے پہلے اسے اپنی صبح ہنگامہ پرور لگتی تھی کبھی سامعہ کو ڈراپ کرنا پڑتا اور کبھی ابو کو۔

مگر آج کل مستعدی کا عالم یہ تھا کہ وہ صبح سویرے جاگ جاتا اور سات بجے سے جو خولہ کمال کو سننے کا شغل شروع ہوتا تو نو بجے تک جاری رہتا۔

آج سامعہ کا سکول آف تھا ابو بھی یونیورسٹی نہیں جا رہے تھے لیکن خولہ کو سکون سے سننے کے لیے وہ اپنے آفس کے لیے وقت سے پہلے نکل گیا تھا۔

رات ہی تو اس نے اپنے پسندیدہ گانے کے بول ای میل کیے تھے اسے پوری امید تھی کہ یہ گانا خولہ کی ٹریک لسٹ میں شامل ہو چکا ہو گا۔

اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہی ریڈیو ٹیون کیا تھا مگر نیوز بریک نے اس کی بے چینی کو انتظار میں بدل دیا تھا۔

''خزیمہ صاحب! بے قراری حماقت کی حدوں کو چھونے لگی ہے۔ جسے دیکھا نہیں ..... جانا نہیں..... اس کے لیے خود کو ہلکان کرنا کہاں کی عقل مندی ہے۔'' کسی نے سرزنش کی تھی وہ شرمندہ سا

اپنی کمزوری کا جواب ڈھونڈنے لگا مگر اندر کا احتجاج اتنا زور آور تھا کہ خود پر ترس سا آنے لگا۔

''خزیمہ عادل! آپ کی یہ عمر حقیقت پسندانہ فیصلے کرنے کی ہے اور آپ کوسوں میل دور بیٹھی ایک ریڈیو پریزینٹر کے عشق میں مبتلا ہونے کی کوشش کرنے لگے۔''

سرزنش کا یہ سلسلہ دراز بھی ہو سکتا تھا مگر خولہ کمال کی آواز ساون کی بوندیں بن کر اس پر برسنے لگیں اور وہ لمحہ لگائے بغیر خود احتسابی کے عمل سے باہر نکل آیا۔

''لسنرز ہم اپنی زندگی میں خوشیاں تلاش کرنے کے لیے پتا نہیں کیا کچھ کرتے رہتے ہیں لیکن اپنی زندگی سے کاش کا لفظ الگ نہیں کرتے۔

کاش یوں نہ ہوتا تو یہ ہو جاتا

اور اس طرح کی کئی باتیں.....

پتا ہے لسنرز اگر ہم یہ لفظ کاش اپنی زندگی میں آنے بھی نہ دیں تو پچھتاوے کبھی ہمیں دکھ میں مبتلا نہ کریں۔ ہمارے بہت سارے دکھ خود ساختہ ہوتے ہیں۔ جی بات ہو رہی ہے ہینڈ میڈ دکھوں کی تو کیوں نہ بات ہو جائے اس فنکار کی۔ جو انسانی کیفیت کے ہر رنگ میں ڈھل جانے کا ہنر رکھتا تھا۔

آواز سنیں گے ہم محمد رفیع کی اور یہ ٹریک پسند کیا ہے بس میں بیٹھے ہمارے ایک لسنر نے.....''

خزیمہ عادل کا دل اس وقت یوں اچھلنے لگا تھا جب گانے کے یہ بول اس کی سماعتوں سے ٹکرائے تھے۔

میں نے پوچھا چاند سے کہ دیکھا ہے کہیں

وہ گانا سننے میں اس قدر بھی محو نہیں تھا کہ اسے اوورٹیک کرنے والی جیپ نہ نظر آتی جو ذرا سا آگے جا کر غیر متوازن ہو گئی تھی اور برج کی کنکریٹ دیوار سے ٹکرا گئی تھی۔

اس نے بروقت بریک لگا کر خود کو روکا تھا اور صد شکر کے اس کے پیچھے آنے والی گاڑیاں بھی

فاصلہ رکھ کر چل رہی تھیں ورنہ حادثے کی ایک لمبی قطار کسی اخبار کے رپورٹر کی منتظر ہوتی جو یقیناً اس مصروف شاہراہ پر سب سے پہلے خبر لینے کا اعزاز حاصل کر لیتا۔

☆.....☆.....☆

''میرے خیال سے ہمیں جانا چاہیے..... دونوں کو کافی چوٹیں آئی ہیں..... یہ آج کا نیوز پیپر دیکھ لو..... راحت تم صوفیہ کے بارے میں سوچ لو اور بہتر ہے کہ ساتھ لے چلو بعد میں سنے گی تو بدگمان ہوگی۔''

تایا ابا نے ایک ہی سانس میں فیصلہ سنایا تھا ان کی بات اکثر حتمی ہوتی تھی کوئی بھی ان کے سامنے حجت نہیں کرتا تھا۔

اس وقت بھی راحت بیگم نارے بندھے کھڑی ہوگئی تھیں صوفیہ کو ساتھ لے جانے کا بالکل ارادہ نہیں تھا مگر بڑے بھائی کو ٹالنا بھی آسان نہیں تھا۔

جیپ کے حادثے میں زخمی ہونے والے صوفیہ کے تایا اور ان کا اکلوتا بیٹا تھا انہیں تو خیر کل ہی خبر مل گئی تھی دونوں آئی سی یو میں تھے۔ سفیر کے سر پر چوٹ آئی تھی۔

راحت بیگم کی نگاہوں میں ماضی کے وہ خوشگوار پل گھوم گئے تھے جب سفیر اپنی ماں سے چھپتا چھپاتا ان کے بیڈروم کے کسی کونے میں دبک کر بیٹھ جاتا۔

ماں دسترخوان سجا کر اس کا انتظار کرتی رہتی اور وہ صوفیہ کہ سیر لیک پر گزارہ کر لیتا۔

''او بھئی مجھے مرچیں لگتی ہیں۔'' وہ نہ کھانے کا ایک ہی بہانہ یاد رکھتا اور راحت بیگم صوفیہ کے لیے آلو ابالتے ہوئے خاص طور پر اس کے حصے کا بھی ڈال دیتیں۔

سفیر ابھی تک آئی سی یو میں تھا جب کہ اس کے والد کو پرائیویٹ روم میں منتقل کر دیا گیا تھا۔

یہ انفارمیشن انہیں استقبالیہ کاؤنٹر سے ملی تھی روم اور آئی سی یو کے باہر کی متوقع صورتحال کو ذہن میں رکھتے ہوئے وہ دونوں کاریڈور کی طرف مڑ گئے تھے جبکہ صوفیک نے اندر جانے سے انکار کر دیا تھا۔

راحت بیگم کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا مگر صوفیہ کسی بھی وقت کچھ بھی کر سکتی تھی یہ سوچ کر وہ پریشان ہوئے بغیر آگے بڑھ گئیں تایا ابا نے بھی اس کا فی الحال باہر رہنا بہتر سمجھا وہ ایک مدت بعد ان لوگوں سے مل رہے تھے۔

ان کا رابطہ راحت بیگم سے ہوتا رہا تھا مگر یہ ملاقاتیں آفس تک محدود تھیں آئی سی یو کے باہر صرف خاموشی کا راج تھا اور شیشے کے اس پار سفیر کا سر سفید پٹیوں میں جکڑا ہوا نظر آ رہا تھا انہوں نے بے ساختہ اس کی تندرستی کے لیے ہاتھ اٹھائے تایا ابا نے اپنا ہاتھ ان کے شانے پر رکھ دیا۔

''اللہ کرم کرے گا..... کم عمری میں ماں کی دعاؤں سے محروم ہو گیا تھا تم بھی اس کی ماں جیسی ہو..... دعا کرو جلد صحت یاب ہو جائے۔''

تایا ابا کے لہجے میں کچھ تو ایسا تھا کہ راحت بیگم کا چہرے گہرے ملال میں گھر گیا اور آنکھیں نمکین پانی سے تر ہو گئیں۔

کافی دیر تک اس پر نظریں جمائے کھڑی رہیں اور جب پلٹیں تو دیکھا کہ صوفیہ اپنے چچا کے ساتھ سامنے سے آ رہی ہے وہ ان لوگوں سے گاہے بگاہے ملتی تھک مگر اس لمحے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے درمیان فاصلوں کی اجنبیت بالکل نہ ہو اپنے چچا کی کسی بات پر اس نے پورے اعتماد کے ساتھ ان کی طرف مڑ کر دیکھا تھا اور مسکرا دی تھی راحت بیگم پریشان تو تھیں یہ دیکھ کر ایک انجانے سے خوف میں مبتلا ہو گئیں۔

''امی آپ تایا ابا کے پاس نہیں جائیں گی ان کا روم اس طرف ہے میں ان سے مل کر آئی ہوں۔''

اس نے اس بار ماموں کو بھی حیران کیا تھا جو اس کے چچا سے خیریت دریافت کر رہے تھے۔

''بھائی صاحب کی حالت تو اب کافی بہتر ہے مگر ہم سب کو سفیر کی طرف سے ڈر لگا ہوا ہے کل سے ہوش میں نہیں آیا۔'' وہ بتا رہے تھے۔

''بھائی صاحب کے ہوتے ہوئے سفیر ڈرائیونگ میں کیسے غفلت کر گیا۔'' راحت بیگم اپنے جیٹھ کی سخت طبیعت سے واقف تھیں بے ساختہ پوچھ بیٹھیں۔

''بس کیا کہہ سکتے ہیں.....شاید تقدیر میں اس طرح کا حادثہ لکھا تھا اللہ سفیر کو اچھا کر دے آپ بھی دعا کریں۔''

''اللہ نے آزمائش لکھی ہے تو وہ آسان بھی کرے گا ہماری دعائیں سفیر کے ساتھ ہیں.....آپ بالکل پریشان نہ ہوں اسے بروقت ٹریٹمنٹ مل گیا ہے جلد ہی ہوش میں بھی آجائے گا۔''

تاہا ابا نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی اور پھر یہ مختصر سا قافلہ پرائیویٹ روم کی طرف چل پڑا۔

ہسپتال کی عمارت کتنی ہی بڑی اور ہوادار کیوں نہ ہو اس کے ماحول میں رچا ہوا خوفناک سناٹا دل و دماغ پر ایسا اثر کرتا ہے کہ غیروں کے لیے بھی تندرستی اور سلامتی کی دعا نکلتی ہے۔

راحت بیگم کو اس خاندان کی طرف سے کبھی سکھ اور راحت کا پیغام نہیں ملا تھا خصوصاً بھائی صاحب اول دن سے ان کے لیے مسائل کھڑے کرتے آئے تھے مگر آج ان کے لیے دل میں شکایتیں اپنی جگہ تھیں اور سفیر کے لیے دعائیں اپنی جگہ.....

وہ خود تو کافی بہتر نظر آرہے تھے مگر جوان بیٹے کی تکلیف ان کی قوت ارادی کو کمزور کر رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

کیسا پاگل شخص ہے ساری ساری رات
دیواروں کو درد سنایا کرتا ہے
رو دیتا ہے آپ ہی اپنی باتوں پر
اور پھر خود کو ہنسایا کرتا ہے

وہ راجہ ہاؤس میں نہیں رہنا چاہتا تھا مگر سرخ اور سرمئی اینٹوں سے بنی ہوئی منفرد عمارت میں کوئی تو ایسی بات تھی جو اس کے قدموں میں بیڑیاں ڈال رہی تھی۔

اس نے رات کا کھانا علاقے کی معتبر شخصیات کے ساتھ کھایا تھا جس میں اس کے افسران بھی شامل تھے اور یہ سب لوگ راجہ طارق محمود کی محبتوں کے قدر دان اور ان کی شاہانہ زندگی کے زبردست معترف تھے۔

انہوں نے عاشر عباس کی ذہانت اور قابلیت کو سراہتے ہوئے اس بات پر بھی حیرت کا اظہار کیا تھا کہ وہ شہر کی پُر آسائش زندگی چھوڑ کر خود کو یہاں مشق ستم بنانے آ گیا تھا۔

جس پر راجہ طارق محمود نے بھرپور اعتماد اور استحقاق کے ساتھ کہا تھا۔

"راٹھور صاحب..... فطرت کبھی نہیں بدلتی اس زمین سے رشتہ اس کی سرشت میں ہے یہ خود کو کیسے ان موسموں سے جدا کر سکتا تھا۔"

تب اس نے چونک کر اپنے باپ کو دیکھا تھا جو اس کے قریب بالکل نہیں رہے تھے مگر اس کے مزاج کے بہت سارے رنگوں سے واقف تھے۔

عاشر عباس فطرت کے ہر اس رنگ کا پرستار تھا جو تخلیقِ کائنات سے تخلیقِ آدم تک کی جستجو میں معاون ثابت ہوتا تھا۔

اسے درختوں کا شور.....

پہاڑی جھرنوں کا ساز.....

اور پرندوں کی سُریلی آوازیں.....

دنیا کی ہر موسیقی سے زیادہ دلکش محسوس ہوتی تھیں اسے سرد موسم کی شامیں اس لیے بھی اچھی لگتی تھیں کہ ان میں ہواؤں سے اپنے من کی بات کہنے کے لیے لفظوں کا سہارا نہیں لینا پڑتا۔

اور اس موسم میں بوندوں کی کن من روح کے تار تک ہلا دیتی تھی اور یہ سب کچھ وہی محسوس کر سکتا تھا اور فطرت کے مظاہر سے پیار کرتا تھا۔

جسے شاہکار قدرت غور و فکر کی دعوت دیتے تھے اور اس معاملے میں راجہ طارق محمود کو اپنا بیٹا ماضی کے ان دنوں کی یاد میں لے جاتا تھا۔

جب وہ بھی گھنٹوں گھنے درختوں کی چھاؤں میں بیٹھ کر اپنے آپ سے بات کرتے تھے۔

انہیں احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ وقت کا تیز رفتار پرندہ کہاں سے کہاں پہنچ چکا ہے اور اپنی ذات کی تلاش میں مشغول یہ درویش صفت بندہ کب شمائلہ رحمان کی پسند بن گیا تھا اس کا احساس تو اسے بھی بہت بعد میں ہوا تھا۔

اور راجہ طارق محمود کے لیے یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی خوابوں کی دنیا میں رہنے والی خود سر شمائلہ رحمان تو ہمیشہ سے ان کے خوش رنگ خوابوں کی حصہ دار تھی۔

اپنی ذات کا ادھورا پن اس وقت مکمل ہوتے محسوس ہوتا تھا جب اسے خود میں شامل کر کے دیکھتے تھے اور پھر وہ ان کی ذات کا حصہ بھی بنی مگر اپنی بے چین فطرت سے مجبور تھی اس لیے نارسائی کا دکھ دیتے ہوئے ذرا بھی پشیمان نہیں تھی۔

بیٹے سے قربت کی سرشاری میں جانے کیوں وہ شمائلہ رحمان کی بے وفائی کے بارے میں سوچنے بیٹھ گئے تھے انہوں نے خود کو سرزنش کی اور لمحہ موجود میں آنے کی کوشش کرتے ہوئے عاشر عباس کی طرف متوجہ ہو گئے جس کی توجہ کا مرکز وہ فریم شدہ تصویر تھی۔

جس میں فوٹو گرافر نے ان کی بیٹی کی زندگی کا ایک یادگار لمحہ مقید کر کے وقت کو باندھ دیا تھا۔

وہ راجہ طارق محمود کی بانہوں میں یوں سمٹی ہوئی تھی جیسے کوئی نومولود اپنی ماں کی گرمی سے دستبردار ہونے کو تیار نہ ہو۔

اس کا سنہرے بالوں والا سر ان کے چوڑے شانوں پر دھرا تھا اور وہ وہاں سے پلٹ کر بڑی شرارتی نگاہوں کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔

عاشر عباس کو تصویر کی آرٹسٹک اپروچ اور فوٹو گرافر کی پھرتی نے دلچسپی لینے پر مجبور کیا تھا اور راجہ طارق محمود اسے بتانے لگے تھے۔

''کشمالہ کی گریجویشن شاندار نمبروں سے کمپلیٹ ہوئی وہ اس کالج کی پہلی پاکستانی لڑکی تھی جس نے دو سبجیکٹس میں فل مارکس لیے تھے۔

ہم سب کے لیے یہ فخر کی بات تھی تب ہم نے پاکستانی کمیونٹی کے ساتھ یہ کامیابی شیئر کرنے کے لیے ایک پارٹی دی تھی۔''

وہ اور بھی بہت کچھ بتا رہے تھے مگر عاشر عباس کی سوئی جانے کیوں کامیابی پر اٹک گئی تھی۔

اسے اب تک اکیڈمک لائف میں ہمیشہ آؤٹ اسٹینڈنگ اسٹوڈنٹ کا ٹائٹل ملا مگر.....

وہ ہمیشہ ہر مقابلہ جیت کر دم لیتا تھا مگر اس کی نظروں نے کبھی حاضرین کو اس امید کے ساتھ نہیں دیکھا کہ وہاں اس کا کوئی اپنا ہوگا۔

وہ پوزیشن ہولڈر تھا مگر اس کے اعزاز میں نانو نے اس کا فیورٹ کھانا بنایا تھا پارٹی تو.....

اس کا پُرسکوت چہرہ تصویر کے مقابل تھا۔

مگر زاویہ نگاہ کسی اور سمت منتقل ہو چکا تھا۔

''راجہ صاحب! فون سن لیجیے۔''

ان کے ذاتی ملازم نے کارڈلیس انہیں تھمایا تھا اور وہ عاشر عباس کی طرف پشت کر کے فون سننے لگے۔

''کشمالہ! اس وقت..... بیٹا جی خیر تو ہے۔'' وہ واقعی پدرانہ شفقت سے مالا مال تھے عاشر عباس دھیمے قدموں سے چلتا ہوا مرکزی دروازے کی طرف مُڑ گیا آج تو یہاں سے جانا ناممکن تھا مگر وہ کل یہاں نہیں رک سکتا تھا۔

☆.....☆.....☆

''ارسہ اور علی کی شادی کا کارڈ بھی آ گیا ہے اور ہم لوگ ابھی تک جھک مار رہے ہیں۔''

عامر کو اب ایک نئے صدمے نے گھیر لیا تھا دراصل علی عامر جا فرسٹ کزن اور ارسہ عائزہ کی دوست تھی دونوں کی پہلی ملاقات بیت السکون میں ہوئی تھی۔

اور پھر اس کے بعد سلسلہ چل نکلا کہنا مناسب نہیں تھا بلکہ یہ سلسلہ باندھنے میں ان سب نے اہم کردار ادا کیا تھا ارسہ بیچاری تو ابھی شادی کے لیے بھی تیار نہ تھی۔

''یار تم لوگ سمجھنے کی کوشش کرو مجھے ابھی شادی کی ذمہ داری نہیں اٹھانا۔'' وہ احتجاج کرتی۔

''تم سے کون کہہ رہا ہے ذمہ داری اٹھاؤ..... شادی کرو گھومو پھرو انجوائے کرو۔'' یہ مشورہ صوفیہ نے دیا تھا اسے زندگی یوں ہی سہل لگا کرتی تھی۔

''بقول محسن..... ہماری صوفیہ فکر نہ فاقہ.....''

''دیکھو ارسہ ایک نہ ایک دن تو شادی کرنی ہے اور پھر زندگی میں علی جیسے لوگ مقدر سے ملتے ہیں وہ بہت ڈیسنٹ ہے تمہاری کیئر کرتا ہے تم سے پیار کرنے لگا ہے اگر اس وقت شادی نہ ہوئی تو وہ کہیں اور کرنے پر مجبور ہو جائے گا وہ اپنے گھر میں سب سے بڑا ہے۔''

عائزہ نئے سرے سے اس کو سمجھانا شروع کرتی اور ارسہ کے چہرے کی ہیجانی کیفیت سکون میں ڈھلنا شروع ہو جاتی۔

''وہ کتنا ڈیسنٹ ہے وہ تو تم نہ ہی کہو۔'' بہت دیر کے بعد مسکراہٹ نمودار ہوتی۔

''کیوں بہت تنگ کرتا ہے..... سونے نہیں دیتا.....'' عائزہ کو اس کے چہرے کے رو پیلے رنگ مزادے جاتے اور اب تو خیر اسے تنگ کرنے کی سند مل گئی تھی۔

شادی ارسہ اور علی کی تھی لیکن بیت السکون میں تیاریوں کا یہ عالم تھا کہ کوئی شام بازار میں گزارے بغیر نہ گزرتی۔ سارا جھگڑا موسم کا تھا۔

نہ سرد نہ گرم

اور اس موسم میں لباس کا انتخاب کم از کم انعم اور صوفیہ کے لیے ایک مشکل مرحلہ تھا اور اس دفعہ تو صوفیہ کے لیے خریداری بھی عائزہ کو کرنا پڑ رہی تھی۔

وہ آج کل ہسپتال میں مصروف تھی اور پھر جو وقت گھر میں گزرتا وہ اتنا قلیل ہوتا کہ اس میں صوفیہ کو شاپنگ پر آمادہ کرنا ایک مشکل مرحلہ۔

حادثہ بیت السکون میں نہیں ہوا تھا لیکن اس کے اثرات یہاں بھی محسوس کیے جا سکتے تھے۔

راحت بیگم پریشان تو تھیں مگر کسی گہری سوچ نے انہیں تھکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

صوفیہ کا تو ٹائم ٹیبل ہی بدل گیا تھا۔

وہ بلا ناغہ ہسپتال جا رہی تھی اور اس بار اس کی خودسری راحت بیگم کو تو تکلیف دے ہی رہی تھی وہ اپنے کسی ماموں کے دباؤ میں نہیں آ رہی تھی۔

اس کا اپنے تایا کی عیادت کے لیے جانا۔

سفیر کے لیے پریشان ہونا فطری تھا لیکن جو حالات اور فاصلے دونوں خاندانوں کے درمیان رہے تھے ان کی وجہ سے رابطہ بڑھانا اور خصوصاً صوفیہ کا انوالو ہونا تشویش ناک ہوتا جا رہا تھا۔

راحت بیگم نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

''امی! آپ مجھے کیوں ایک زخمی کی عیادت سے روک رہی ہیں آپ خود ہی تو کہتی تھیں یہ ثواب کا کام ہے مجھے بھی کرنے دیں نا۔''

اس کی بھی اپنی ہی منطق ہوتی تھی۔

''میں تمہیں منع نہیں کر رہی لیکن تمہارا روز جانا مناسب نہیں اور پھر تم اکیلی کیوں چلی جاتی ہو.....'' وہ نہایت تحمل سے بولیں۔

وہ عمر کے اس موڑ پر کھڑی تھی جہاں ذرا سی سختی اس کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی۔

اس کا جھکاؤ اپنے ددھیالی رشتے داروں کی طرف ہو گیا تھا اور اس موقع پر راحت بیگم کی سختی اس کے رویے میں منفی تبدیلی لا سکتی تھی۔

شاید اسی ڈر کی وجہ سے وہ اسے نہ روک پا رہی تھیں اور نہ اسے یہ سمجھا پا رہی تھیں کہ

آج وہ لوگ تم سے محبت کا اظہار کر رہے ہیں۔ جو تمہاری ماں کو تعظیم دے رہے ہیں۔

کل انہی لوگوں نے تمہارے باپ کے مرنے کے بعد تمہیں اس حال کو پہنچا دیا تھا کہ تم دودھ مانگتے مانگتے سو جاتی تھیں۔

تمہارے آنسو خشک ہو جاتے تھے تب تمہارے تایا اپنے بچے کے ٹوٹے ہوئے کھلونے تمہارے آگے ڈھیر کر دیتے تھے اسی بچے کے..... جو آج ہاسپٹل بیڈ پر پڑا ہے۔

تم کبھی نہیں مانو گی لیکن تم نہیں جانتیں یہ لوگ دراصل تمہاری زندگی چاہتے ہی نہیں تھے۔

وہ اس کے چہرے پر نظریں جمائے بہت دور نکل گئی تھیں ان کا اپنا چہرہ اندرونی اضطراب کے باعث سرخ ہو چلا تھا اور آنکھوں کے سرخ ڈورے مزید گہرے ہو گئے تھے۔

صوفیہ بے اختیار ان کے پاس چلی آئی اور ہاتھ تھام لیے۔

''امی! آر یو او کے.....''

''ہاں میں ٹھیک ہوں۔'' وہ صوفے پر بیٹھ گئیں۔

''آپ ٹھیک ہی تو نہیں ہیں میں دیکھ رہی ہوں آپ کسی الجھن میں ہیں..... کل آپ نے آفس سے بھی چھٹی کر لی تھی۔''

وہ ان کے سامنے گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئی تھی اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں اپنے لیے تفکر کے سائے انہیں شانت کر رہے تھے۔

صوفیہ ان کی دلی کیفیت سے بے خبر نہیں تھی ان کے لیے یہ ہی کافی تھا۔

''تمہارا روز روز جانا تمہارے ماموں کو بھی اچھا نہیں لگتا۔'' انہوں نے رسان سے کہا۔

''امی ہم کب تک یہاں رہیں گے۔'' اس نے اچانک الٹا سوال کیا تھا۔

''کیا مطلب یہاں رہیں گے۔''

''امی دیکھیں نا اب آپ بزنس وومین ہیں اسٹرونگ بزنس وومین..... آپ کا اتنا بڑا سرکل ہے میں بڑی ہوگئی ہوں ہم لوگ الگ اکیلے رہ سکتے ہیں نا۔''

وہ ایک نئے مطالبے کے ساتھ کوئی اور ہی صوفیہ لگ رہی تھی۔

''تم پاگل تو نہیں ہوگئی ہو..... ہم کیوں اکیلے رہیں گے اپنوں کے درمیان جو تحفظ مجھے اور تمہیں میسر ہے وہ کہیں اور نہیں مل سکتا۔ تم بچی تھیں مجھے تمہاری فکر کم تھی اب تم جوان ہو چکی ہو.....''

''اب میں اپنی فکر خود کر سکتی ہوں۔''

''صوفیہ! فضول باتیں مت کرو..... میری نرمی کا فائدہ مت اٹھایا کرو..... جن باتوں کو تم جانتی نہیں ان پر بحث نہ ہی کرو تو ہم دونوں کے لیے بہتر ہے۔'' وہ قطعیت سے کہہ کر کھڑی ہوگئیں۔

''امی پتا نہیں کیوں بہت ساری باتیں اب میں جاننا چاہتی ہوں اور میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ میری زندگی کا ہر فیصلہ ماموں کریں۔''

وہ رخ موڑ کر کھڑی تھی اور اس کا لہجہ ہر طرح کی مروت سے عاری تھا۔

''صوفیہ!'' وہ شاید زندگی میں پہلی بار اس پر چیخی تھیں انہیں اپنے آواز کی بازگشت دیر تک سنائی دیتی رہی تھی اور صوفیہ ماں کے خطرناک تیور محسوس کر کے خاموشی سے باہر چلی گئی تھی۔

اور اب یہ شجاع کی قسمت کہ وہ جو پھوپھی کی تلاش میں ان کے پورشن کی طرف آیا تھا سیڑھیوں پر بیٹھی صوفیہ سے ٹکرا گیا۔

عجیب منظر تھا..... اس کے گھنیرے سیاہ بال اس انداز سے اس کا چہرہ چھپائے ہوئے تھے کہ وہاں کسی زندگی کے آثار محسوس نہیں ہو رہے تھے۔

وہ گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی تھی اور بالوں کے گچھوں نے پورا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔

اس وقت تو اس چہرے کو ڈھونڈنا بہت ضروری تھا جو کسی چاند کی مانند سیاہ بادلوں کی اوٹ میں تھا۔ شجاع نے ذرا سا آگے بڑھ کر اس کے کندھے کو جنبش دی۔

''ہیلو..... خاتون کیا آپ زندہ ہیں۔'' وہ اپنی کاروائی پوری کرنا چاہتا تھا وہ دل و جاں کے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا یہ مطلب بالکل نہیں تھا کہ اس کے سامنے موم کی طرح پگھل جاتا۔

''خاتون..... میں نے آپ کو پکارا ہے۔''

اسے مجبوراً بالوں کی ایک لٹ کھینچنا پڑی اور صوفیہ کے بال کوئی چھولے یہ تو ممکن ہی نہیں تھا۔ اس نے سر کیا اٹھایا تھا بلکہ کسی خونخوار بلی کی طرح پنجے بھی جھاڑے تھے شجاع ایک سیڑھی مزید نیچے نہ اترتا تو یقیناً زخمی ہو جاتا۔

''آپ کو بدتمیزی کے سوا بھی کچھ آتا ہے.....'' اس کا ردعمل متوقع تھا۔

''آپ کے سوا کچھ نظر جو نہیں آتا..... بدتمیزی تو ہو گی۔'' وہ دونوں بازو سینے پر لپیٹتے ہوئے مسکرایا تھا۔

صوفیہ تن کر کھڑی ہو گئی تھی پہلے پنجے جھاڑے تھے اور اب کاٹنا ضروری ہو گیا تھا۔

''''خاتون! آپ پنجے مارنے کے علاوہ اور کیا کرتی ہیں۔''

وہ بھی ہار ماننے والوں میں سے کہاں تھا۔

''میں کاٹتی بھی ہوں..... آپ راستے سے ہٹ جائیں۔ اور پلیز آپ سیدھے سیدھے میرا نام لیا کریں یہ خاتون واتون نہ کہا کریں۔''

وہ ایک ساتھ بہت ساری باتیں کر گئی تھی اور اب سامنے کھڑی راستہ مانگ رہی تھی۔

اس کا اتنے قریب آنا بھی ستم ہی تھا شجاع نے راستہ کشادہ کرنے میں ہی عافیت جانی۔

''ویسے کب کاٹیں گی۔'' وہ پلٹا تو صوفیہ چند قدم کے فاصلے پر جا چکی تھی۔

''آپ سہہ نہیں پائیں گے۔'' وہ بالوں کو ہاتھوں سے سنوار رہی تھی اس کی حاضر جوابی شجاع کو بے حد پسند آئی تھی۔

''آپ اجازت تو دیں.....'' وہ اوپر جانے کے بجائے نیچے آ گیا تھا۔

''پلیز شجاع آپ میرا دماغ نہ خراب کیا کریں میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔''

وہ بے ساختہ بول گئی تھی اور شجاع کے چہرے کی شریر سی مسکراہٹ قہقہے میں ڈھل گئی تھی۔

اتنے عرصے میں وہ صوفیہ کو خاصا جان گیا تھا اور پھر مگن بھی تھی اس لیے اس کی آنکھوں کے سارے رنگ سمجھ میں آ جاتے تھے اور چہرے کی ہر کیفیت دل کے دروازے پر بھی لے جاتی تھی جہاں دستک دینا اس نے اپنا معمول بنا لیا تھا۔

اس وقت وہ پریشان بالکل نہیں تھی بلکہ پشیمان تھی یہ اس کے چہرے پر واضح لکھا تھا۔

شجاع نے چند لمحے رک کر اس کا جائزہ لیا۔

''کیا اسے ہمدردی کی ضرورت ہے؟'' اس نے خود سے سوال کیا اور جواب نفی میں آیا۔

''محترمہ میرا آپ کو پریشان کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے میں تو آپ کے کزن کی خیریت دریافت کرنے آیا تھا..... کیا حال ہے ان کا۔''

وہ یکدم سنجیدہ ہو گیا اور صوفیہ نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔

''سفیر بھائی ٹھیک نہیں ہیں البتہ تایا جان کل گھر چلے جائیں گے۔'' وہ واقعی ان کے لیے پریشان تھی۔

''میں نے سنا ہے ان کے سر پر چوٹ کی وجہ سے آنکھیں بھی متاثر ہوئی ہیں۔''

''ڈاکٹرز کا خیال ہے ان کی نظر پر فرق پڑے گا۔''

''اینی نیورو پرابلم.....'' شجاع کو اس ان دیکھے نوجوان سے ہمدردی ہو چلی تھی جو تیز رفتاری کی سزا کاٹنے کے لیے سوالیہ نشان بن گیا تھا۔

سر کی معمولی سی چوٹ بھی بڑی کمزوری دے جاتی ہے یہ تو پھر خوفناک حادثہ تھا جس میں ڈرائیونگ سیٹ والا حصہ مکمل طور پر تباہ ہو گیا تھا۔

سر کی اتنی شدید چوٹ کے بعد سفیر کا ہوش میں آنا بھی ایک معجزہ ہی تھا ورنہ ڈاکٹرز نے تو مایوسی کا اظہار کر دیا تھا۔

انہیں خدشہ تھا کہ وہ کوما میں چلا جائے گا۔ مگر یہ قدرت کی مہربانی ہی تھی کہ وہ زندہ لاش بننے سے بچ گیا تھا۔

''اچھا یہ بتائیں.....ابھی کوئی مصروفیت تو نہیں۔''

شجاع نے فضا سازگار ہوتے دیکھ کر پوچھا۔

''فی الحال تو نہیں ہے بس کپڑے پریس کرنے تھے۔''

''کپڑے واپس آ کر پریس ہوتے رہیں گے ہم سب لوگ طارق روڈ جا رہے ہیں بہانہ تو شاپنگ کا ہے مگر آج کا ڈنر ارسہ اور علی کی طرف سے ہے۔''

''مگر ان کی تو ڈیٹ فکس ہو چکی ہے۔''

''ارے تو کیا ہوا..... یہ ہی دن تو ہیں ان کی آزادی کے..... ایک دوسرے کے ساتھ وقت گزاریں گے اور بعد میں اپنی ان حرکتوں پر ہنسا کریں گے جیسے ہم بھی ان حرکتوں پر خوش ہوا کریں گے۔''

اسے زیادہ دیر نہیں لگی تھی اپنے جامے میں آنے کے لیے صوفیہ نے بس گھورنے پر اکتفا کیا تھا۔

وہ اب تسلیم کر چکی تھی کہ باتوں میں شجاع سے جیتنا اتنا بھی آسان نہیں۔

''آپ لوگ چلے جائیں میرا کوئی موڈ نہیں ہے۔''

''اور میرا موڈ آپ کے بغیر جانے کا نہیں ہے سمجھیں آپ..... دس منٹ میں تیار ہو کر آ جائیں ہم سب ویٹ کر رہے ہیں۔''

شجاع نے کچھ اس انداز سے کہا تھا کہ وہ حیران سی اسے دیکھتی رہ گئی۔

''آپ مجھے آرڈر کس خوشی میں کر رہے ہیں۔''

''آپ کو مجھے انکار کرنے سے پہلے سوچ لینا چاہیے کہ میں کچھ بھی کر سکتا ہوں آپ کے پاس صرف دس منٹ ہیں ہری اپ.....''

وہ اب دروازے سے باہر نکل چکا تھا اور صوفیہ اس کی چوڑی پشت کو یوں گھور رہی تھی جیسے جلا کر بھسم کر دے گی لیکن افسوس کہ وہ اس طرح کی قوتوں سے محروم تھی ورنہ شجاع کے اب تک ہزاروں پتلے جلائے جا چکے ہوتے۔

☆.....☆.....☆

خولہ کمال پاکستان آ رہی تھی..... یہ خبر تھی یا پٹاخہ..... جو سامعہ نے اپنے مخصوص انداز میں اس کے کانوں کے قریب چھوڑا تھا وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

''سچ بتا..... تجھے کیسے پتا چلا۔''

''سب کچھ اگر آپ کو بتا دیا کروں تو میری ضرورت ختم ہو جائے گی ہے نا۔''

وہ یقیناً کسی نئی ڈیل کے لیے پر تول رہی تھی۔ خزیمہ فوراً محتاط ہو گیا۔

''توبہ ہے سامعہ..... تم بھی نا اپنی نوعیت کی واحد چیز ہو..... مجھے پتا ہے وہ پاکستان آ رہی ہے شاید اگلے ہفتے کی فلائٹ کنفرم ہوئی ہے اس کی۔''

وہ بڑے اعتماد کے ساتھ رعب ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا اور سامعہ کا چہرہ ہنسی ضبط کرنے کی کوشش

میں سرخ ہو رہا تھا۔

''جی آپ بالکل صحیح کہہ رہے ہیں وہ اگلے ہفتے واپس چلی جائے گی۔'' سامعہ کی ہنسی اس کا خون جلا رہی تھی مگر ضبط بہت ضروری تھا۔

''کیا مطلب.....وہ چلی جائے گی۔'' خزیمہ نے گویا ہار مان لی تھی۔

''جی.....وہ آج رات اسلام آباد پہنچ رہی ہے۔''

''اسلام آباد.....اسے تو کراچی آنا چاہیے.....میں تو یہاں ہوں۔''

''مگر اس کے پاپا وہاں ہیں.....وہ آپ سے نہیں ان سے ملنے آ رہی ہے۔''

سامعہ کی ٹون میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی اور خزیمہ ہونق سا اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔

اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ خولہ کمال پاکستان آسکتی ہے اور اس کی خواہش اتنی جلدی پوری ہو سکتی ہے۔

☆.....☆.....☆

''نانو آپ کی طبیعت خراب ہے اور آپ مجھے آج بتا رہی ہیں اور وہ بھی اتنا سوچ سوچ کر میں بس آج ہی آ رہا ہوں۔'' وہ فون سنتے ہی بے تاب ہو کر کھڑا ہو گیا تھا اس کا بس چلتا تو ابھی اڑ کر ان کے پاس پہنچ جاتا اپنی نانو کے معاملے میں وہ اتنا ہی حساس تھا اور نانو بھی اس کمزوری سے بخوبی واقف تھیں اس لیے فون پر کھانسنے میں بھی احتیاط کر رہی تھیں۔

''عاشی! تم میری بالکل فکر مت کرو میں اب بالکل ٹھیک ہوں تمہیں پتا تو ہے ذرا سا موسم بدلا نہیں اور میری ناک بہنا شروع۔'' وہ اسے بہت پیار سے عاشی کہتی تھیں اور وہ ہمیشہ احتجاج کرتا تھا۔

''نانو! میں آپ کی بیٹی نہیں بیٹا ہوں یہ عاشی تو بالکل لڑکیوں والا نام ہے۔''

''تو میرا عاشی ہے فکر نہ کر اور کسی کو کہنے نہیں دوں گی۔'' وہ تسلی دیتیں اور پھر سب کو ٹوکتیں۔

''میرے بیٹے کا نام عاشر عباس ہے پورا نام پکارا کرو ان لفظوں کی بھی تاثیر ہوتی ہے جو شخصیت

پر اثر انداز ہوتے ہیں۔"

وہ اس کے بال سنوارتے ہوئے کہتیں۔

"نانو آپ میرے لیے اچھا سا کھانا پکا کر رکھیں میں بس چند گھنٹوں میں آپ کے پاس ہوں گا۔"

"مگر بچے! تیری نئی نئی نوکری ہے میں بالکل ٹھیک ہوں بس ذرا بد پرہیزی ہوگئی اور کھانسی شروع۔"

دل تو اسے دیکھنے اور گلے لگانے کی ضد بہت دنوں سے کر رہا تھا مگر مصلحت کہتی تھی اس دوری میں عاشر کے شوق کی تکمیل اور اس کے مستقبل کا تحفظ ہے اور پھر انہیں اس بات کی بھی تسلی تھی کہ وہ اپنے باپ سے ملتا رہتا ہے۔

باپ بیٹے کے درمیان فاصلہ حالات کی ستم ظریفی سے زیادہ باپ اور نانی کا مشترکہ فیصلہ تھا وہ کئی حصوں میں بٹ جاتا تو آج اپنی ذات میں اتنا پُر اعتماد نہ ہوتا اس نے بہت چھوٹی سی عمر میں ماں باپ سے دوری پر سمجھوتا کر لیا تھا اور پھر نانو کی مثبت تربیت کا اثر تھا کہ وہ ان کے لیے رات کی تنہائیوں میں روتا نہیں تھا بلکہ ہر بار ان سے ملنے کے بعد اپنے اردگرد حفاظتی باڑ کو بڑھاتا چلا جاتا۔

اسے دونوں نانو کے مہمان لگتے اور وہ انہیں ان کے شایان شان پروٹوکول دے کر نانو کو ہر طرح کی شرمندگی سے بچا لیتا۔

اور پھر بعد میں ان سے ضرور پوچھتا۔

"نانو آپ کے مہمان جاتے ہوئے کوئی نیا حکم تو نہیں دے کر گئے۔"

"سب جانتی ہوں تیری چالاکیاں.....ان کے سامنے ایسا معصوم اور نانو پر جان چھڑکنے والا بن جاتا ہے کہ جیسے میرے بغیر رہ نہیں پائے گا۔"

"ہاں تو.....اس میں جھوٹ کیا ہے۔ آپ رہ پائیں گی میرے بغیر۔"

اور اس وقت وہ انہی الفاظ کی بازگشت اپنے اردگرد محسوس کر رہی تھیں۔

یہ سچ ہے زندگی جینے کا ڈھنگ خود سکھاتی دیتی ہے انہیں عاشر کو دیکھے بغیر نیند نہیں آتی تھی وہ بھی ماتھے پر گالوں پر ان کے بوسے کی نرمی لیے بغیر نہیں سوتا تھا۔ مگر آج کتنے دن گزر گئے تھے دونوں ہی اپنی اپنی جگہ تنہائیوں سے نبرد آزما تھے۔

نانو کی طبیعت اتنی خراب نہیں تھی جتنی کے عاشر کو محسوس ہو رہی تھی لیکن وہ تو ویسے بھی اسلام آباد جانے کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا اور پھر ویک اینڈ پر یہ حرکت تو بالکل جائز تھی۔

اس نے فون بند کر کے اپنا بیگ پیک کرنا شروع کر دیا تھا اس کی ہر صبح کا آغاز نانو سے فون پر بات کے ساتھ ہوتا تھا وہ اکثر اسے جگایا کرتی تھیں اور کبھی کبھار وہ انہیں جاگنے کی خبر دیتا تھا۔

یہ سلسلہ اول دن سے جاری تھا۔ راجہ طارق محمود کو نانی نواسے کی اس زبردست ذہنی ہم آہنگی پر رشک آتا تھا اور اس کا اظہار جب انہوں نے عاشر سے کیا تو وہ محض مسکرا دیا تھا۔

یہ کہہ نہیں پایا کہ

آپ کیا سمجھتے ہیں جو آپ سے شکوہ نہیں کرتا آپ کی بے اعتنائیوں اور ناانصافیوں پر خاموش رہتا ہے وہ احساس سے عاری ہے۔

وہ اگر احساس سے عاری ہوتا تو محبت اس کے اندر زندگی بن کر نہ دوڑ رہی ہوتی۔

کیا مجھے راجہ صاحب کو اپنے جانے کی اطلاع دینی چاہیے۔ وہ بیگ پیک کرنے کے بعد آفس کھ لیے تیار ہوتے ہوئے خود سے سوال و جواب کر رہا تھا اور اس سے پہلے کے وہ خود کو ان سے بات کرنے کے لیے راضی کرتا ان کا فون آ گیا۔

اپنے مخصوص دبنگ لہجے میں حال احوال دریافت کرنے کے بعد وہ اسے ایک آفر کر رہے تھے۔

''میں شام کو اسلام آباد کے لیے نکل رہا ہوں تم چلو گے؟'' عاشر کے چہرے پر اس آفر کے بعد ایک خوشگوار سی حیرت پھیلی اور پھر جلد ہی معدوم بھی ہو گئی۔

وہ اسے اپنی بیٹیوں کی آمد کے بارے میں بتا رہے تھے اور انہیں ریسیو کرنے راجہ طارق محمود خود جا رہے تھے۔

خوشی کیا ہے؟ وہ اس کے مفہوم سے واقف تھا مگر خوشی کا جشن کیسے منایا جاتا ہے؟ اسے لگا جیسے وقت اب اسے یہ بھی سکھا کر دم لے گا۔

''برخوردار! آپ میرے ساتھ اسلام آباد چل رہے ہیں۔ تیاری پکڑ لیں خالہ جان بھی اداس ہوں گی۔'' اس کی طرف سے خاموشی میں جواب خود بخود آ گیا تھا۔

''مگر میں آج خاصا مصروف ہوں۔'' اس نے آئینے میں بال سنوارتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

''تمہاری مصروفیت شام تک ختم ہو سکتی ہے خود کو مصروفیت کے دائرے میں گھیر کر مجھ سے دور رہنے کے بہانے مت تلاش کیا کرو بیٹے۔ میں نے یہ زندگی ہمیشہ اچھے وقت کے انتظار میں گزاری ہے۔''

ایک وقت آئے گا ہم دونوں صرف رشتے نبھا رہے ہوں گے تب ہمارا درد مشترکہ ہو گا اور ہم ساتھ ساتھ ہوں گے۔'' وہ آج صبح صبح بہت سنجیدہ تھے عاشر نے لمبی بحث سمیٹنے کے لیے رضامندی ظاہر کر دی تھی۔

اسے کوئی نہ کوئی گاڑی تو ہائر کرنا ہی تھی۔

☆.....☆.....☆

''نانو آپ کو پتا ہے..... راجہ صاحب کی بیٹیاں آ رہی ہیں۔'' وہ ان کی گود میں سر رکھ کر اطمینان سے لیٹا تھا اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں سکون ہلکورے لے رہا تھا مگر اس کے لہجے میں کوئی تو الگ بات تھی جو نانو کو بے ساختہ مسکرانے پر مجبور کر گئی۔

''ہاں! مجھے پتا ہے اور وہ لوگ پہلے یہاں میرے پاس آئیں گے اب تو میری گود خالی کر..... بہت سارے کام کرنے ہیں مجھے مہمان بچیاں پہلی بار پاکستان آ رہی ہیں۔''

''مگر وہ یہاں کس خوشی میں آ رہی ہیں اور آپ نے انہیں منع کیوں نہیں کیا۔ آپ کی حالت ہے کسی کی مہمان نوازی کی۔''

وہ گود سے نکل کر سامنے آ گیا تھا برہمی کا اظہار کرتے ہوئے۔

''کیوں میری حالت کو کیا ہوا۔''

''بس کریں بہانے مت بنائیں میری حالت کو کیا ہوا.....'' وہ ان کو بغور دیکھتے ہوئے بولا تو ان کی گلابی رنگت میں سرخیاں سی گھل گئی تھیں۔

''ایک تو زکام نے ناک میں دم کیا ہوا ہے اور اب تو آ گیا ہے سر کھانے کے لیے۔ اور یہ تیرے بال بہت بڑے ہو گئے۔ جا ابھی جا کر کٹوا لے۔ کل پھر مجھے ٹائم نہیں ملے گا..... چل اٹھ.....''

اچانک ہی انہوں نے نیا موضوع ڈھونڈ لیا تھا اور اس کے بالوں کی فکر تو وہ اچھی طرح کرتی تھیں جیسے نوعمر لڑکیوں کے بالوں کو نانیاں دادیاں سنوارنے میں لگی ہوتی ہیں۔

''ابھی میرا بالکل موڈ نہیں ہو رہا آپ کو چھوڑ کر جانے کا۔''

''دیکھ رہی ہوں تیرے تیور..... بہت سست ہو گیا ہے..... تیرے آفس میں کوئی کام نہیں ہے کیا۔'' وہ اسے مصنوعی برہمی سے گھورنے لگیں۔ ان کا اس کے پاس سے اٹھنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔

''نانو میرے آفس میں کام بہت ہے لیکن مجھے کوئی کام کرنے ہی نہیں دیتا عجیب مزاج کے لوگ ہیں ابھی تک میری مہمان نوازی میں مصروف ہیں۔'' اس کے چہرے پر مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

''تیری مہمان نوازی اس لیے کر رہے ہیں کہ تو راجہ طارق محمود کا بیٹا ہے۔ اکلوتا بیٹا تیرے باپ کی جاگیر کا حساب کتاب رکھنا بھی مشکل کام ہے۔''

''نانو ماں ایک بات تو بتائیں یہ میرا باپ زندگی بھر جاگیر ہی بناتا رہا اسے گھر بار رشتوں ناتوں کی کوئی فکر نہیں تھی اسے انسانوں سے محبت نہیں تھی۔''

''اس کے جیسی محبت تو شاید ہی کسی نے کی ہوگی دولت تو اس کی قسمت میں تھی مگر رشتے اس سے بھاگتے رہے یہ اس کی بدقسمتی کے میری بیٹی کے نصیب کی سیاہی تھی جو اسے بھی گہن لگا گئی۔''

ان کے لہجے میں صدیوں کی تھکن اتر آئی تھی چند لمحے پہلے والی بشاشت یادوں کے گرداب میں گم ہوگئی تھی۔ عاشر یکدم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''نانو! کبھی کبھی مجھے آپ بھی بہت ظالم لگتی ہیں ہمیشہ ماں کو ہی قصوروار ٹھہراتی ہیں آپ کو کبھی بھی اپنی جج منٹ غلط نہیں لگتی۔''

''میں ماں ہوں تیرے ماں باپ کی اور اب تیری بھی بتا تو مجھ سے چھپ سکتا ہے کوئی راز رکھ سکتا ہے اپنے اندر۔'' وہ گہرے لہجے میں بولیں۔

''میں تو کھلی کتاب ہوں۔'' اس نے بے نیازی سے کہا۔

''اولاد ماں باپ کے لیے کھلی کتاب ہی تو ہوتی ہے دونوں اسی آنگن میں کھیل کود کر بڑے ہوئے تھے ہر لمحہ میری نظروں کے سامنے رہتے تھے لڑتے جھگڑے پتا نہیں کب جوانی کی دہلیز پر آن کھڑے ہوئے اور ایک دوسرے کا ساتھ مانگنے لگے۔ میں اس وقت بھی سوچتی تھی دونوں کا میل ہی غلط ہے۔'' وہ اپنے مدہم لہجے میں کہتے ہوئے یادوں کے سفر پر نکل گئی تھیں ان کی آنکھیں اداسیوں کے گہرے بھنور میں ڈوب گئیں تھیں اور ان کے سرخ ڈورے گہرے ہونے لگے تھے۔

''اور جب میل ہو رہا تھا.....'' اس کے ذہن میں راجہ طارق محمود کی شاہانہ زندگی کا نقشہ گھومنے لگا وہ انہیں اداس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جانتا تھا نانو کے لیے سب سے تکلیف دہ موضوع اس کے ماں باپ کی زندگی ہے مگر اب اسے بھی بہت سے سوالوں کا جواب ڈھونڈنے کی جستجو ہونے لگی تھی۔

وہ شاید کبھی ضرورت محسوس نہ کرتا اگر راجہ طارق محمود کسی افسانوی کردار کی طرح اس کی زندگی میں سوال بن کر نہ آتے۔

''میں نے طارق سے کہا تھا..... اسے سمجھایا تھا..... یہ تیرے لیے نہیں ہے تو غلط کر رہا ہے تم دونوں کی عادتوں میں مزاج میں زمین آسمان کا فرق ہے بہت سمجھوتہ کرنا پڑے گا۔''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولیں اور پھر مسکرا دیں بھیگی سی مسکراہٹ ان کے چہرے سے اچھی طرح آشنا تھی۔

''تب دونوں ایک دوسرے کی محبت میں اندھے ہو رہے تھے سمجھوتہ کرنے کو بھی تیار تھے ایک دوسرے کی عادتوں کے ساتھ نباہ کرنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔

مگر بچے! شادی شدہ زندگی میں محبت سمجھوتہ بن جائے کوئی عیب نہیں زندگی گزر ہی جاتی ہے لیکن شادی شدہ زندگی کے عیب محبت کو بوجھ بنا دیں تو پھر وقت کاٹے نہیں کٹتا اور پتا ہے یہ محبت کب بوجھ بن جاتی ہے جب چاند چہرے کے دائیں بائیں اندھیرا بھی نظر آنے لگتا ہے۔''

وہ بڑے ہموار لہجے میں ان کی زندگیوں کا تجزیہ کر رہی تھیں اس وقت ان کا چہرہ تاثر سے عاری ہو چکا تھا۔

شاید عاشر عباس کی طرح وہ بھی ان دنوں کو سوچ رہی تھیں جب اس کے ماں باپ کی لڑائیاں گھر کی چار دیواری سے نکل کر محفلوں کا موضوع بننے لگی تھیں۔

دونوں کا حلقہ وسیع تھا اور دونوں ہی خوب ڈسکس ہوتے تھے عاشر کے ذہن میں ان دونوں کا دھندلا سا عکس تھا جب وہ لوگوں کے سامنے خوش نظر آنے کی اداکاری کرتے اور گھر آ کر ایک دوسرے کے عیب گننے بیٹھ جاتے۔

اسے یاد ہے ایک دفعہ ماں نے کہا تھا۔

''یہ میری قسمت تھی جو تم فرش سے اٹھ کر عرش پر بیٹھ گئے ورنہ تمہارے پاس تھا کیا چند ایکڑ بنجر زمین..... اور آج تمہیں جو عزت ملتی ہے میری وجہ سے۔''

اور پھر اس نے اپنے باپ کی بھاری آواز سنی تھی۔

''اچھا بیگم ہم مان لیتے ہیں یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا لیکن اب تو ہو گیا نا..... آپ اپنی قسمت چھین لیں ہم سے۔''

''قسمت چھین لی تو جو تمہارے آگے پیچھے تتلیاں پھرتی ہیں انہیں کیسے خوش کرو گے۔'' جملے کی کاٹ وہ آج اچھی طرح محسوس کر سکتا تھا۔

''بیگم وہ تتلیاں..... تمہاری ہی تو سہیلیاں ہیں میں کب انہیں دعوت دیتا ہوں۔''

''ہاں تو وہ ہمارے درمیان آتی ہی اس لیے ہیں کہ تم نے مجھے نظر انداز کرنا شروع کر دیا ہے۔'' اس کی ماں نے احتجاج کا آغاز کر دیا تھا۔

''عاشر یہ بات کبھی نہیں بھول سکتا تھا کہ وہ جب بھی کسی پارٹی سے واپس آتے تو ماں چند قدم آگے چل رہی ہوتیں اور دونوں اس کے پاس آنے کے بجائے اسے پیار کرنے کے بجائے اپنے کمرے میں بند ہو جاتے بحث کرنے کے لیے اور شاید جھگڑا کرنے کے لیے۔''

''نانو آپ دونوں کو مارتی وارتی نہیں تھیں۔'' اسے ایک دم سے شرارت سوجھی تھی۔

''میں کیا مارتی..... قسمت نے خود ہی انتظام کر لیا ان کی سزا کا.....''

''لیکن نانو سزا تو کسی کو بھی نہیں ملی۔ دونوں اپنی زندگی میں خوش ہیں۔ اپنی اپنی پسند کی شادی کر لی اور بس.....''

''شادی..... شادی تو صرف شمائلہ نے کی..... طارق تو آج بھی اکیلا ہے۔ اس نے میرے کہنے کے باوجود دوبارہ شادی نہیں کی۔ بس اپنے کام سے نکاح کر لیا اور خود کو چھپا لیا۔''

نانو نے آج ایک اور راز سے پردہ اٹھایا تھا ویسے تو اسے ان دونوں کی زندگی الف لیلوی داستان لگتی تھی مگر اس وقت بہت زیادہ حیران تھا اور شاید پریشان بھی ہو گیا تھا۔

''لیکن نانو.....ان کی دو بیٹیاں ہیں جو آج پاکستان آ رہی ہیں۔''

''وہ بیٹیاں اس کی اپنی نہیں ہیں لے کر پالی ہیں۔''

''نانو یہ کہانی بھی تو ہو سکتی ہے۔'' وہ مشکوک لہجے میں بولا۔

''نہیں.....طارق مجھ سے کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا مجھے خود سے زیادہ اس پر یقین ہے۔'' وہ اپنی بات کہہ کر کھڑی ہو گئی تھیں اور عاشر وہیں بیٹھا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

صوفیہ تین دن سے آفس نہیں آ رہی تھی اور بہت سارے کام اس کے کمپیوٹر میں مقید تھے وہ اکاؤنٹس کا شعبہ دیکھتی تھی اور بزنس کی دنیا میں مہینے کی آخری تاریخیں ہوں یا شروع کی اس ڈپارٹمنٹ کی سرگرمی عروج پر ہی ہوتی ہے۔ صوفیہ کی لاپروائی اور غائب دماغی پر راحت بیگم کی خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ تو تھی ہی لیکن آج شجاع سے ضبط نہیں ہوا تھا اس نے صوفیہ کے خالی کمرے کا آخری بار جائزہ لینے کے بعد راحت بیگم کے کمرے کا رخ کیا تھا۔

وہ پروڈکشن ٹیم کے ساتھ میٹنگ میں مصروف تھیں شجاع کو دیکھ کر حیرت اور خاموشی لازمی تھی وہ کبھی اس طرح ان کی مصروفیت میں مخل نہیں ہوتا تھا۔ اور اس وقت تو اس کے چہرے پر سنجیدگی کی گہری لکیریں انہیں پریشان سا کر گئیں۔

''اٹس اوکے.....آپ لوگ میٹنگ جاری رکھیں۔'' وہ اپنی مخصوص کرسی گھسیٹ کر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ اس کے آنے کے بعد راحت بیگم نے گفتگو کا سلسلہ مختصر کرتے ہوئے چند ہدایات دیں اور پروڈکشن ٹیم کے ساتھ تفصیلی میٹنگ کا ٹائم طے کرتے ہوئے ان سے اجازت لی۔

وہ چاروں بھی شاید شجاع کی بے وقت آمد کو کسی سنجیدہ معاملے کا آغاز سمجھ کر خاموش ہو گئے تھے اتنی ہی خاموشی سے اٹھ کر چلے بھی گئے۔ شجاع کی اس فیکٹری میں کیا اہمیت تھی اور وہ راحت بیگم کے

لیے کیا اہمیت رکھتا تھا یہ بات چیدہ چیدہ لوگ ہی جانتے تھے۔ شجاع نے اول دن سے خود کو مالکان کے بجائے ملازمین کا حصہ تصور کیا تھا۔

وہ ملازمین کے درمیان رہ کر کام بہتر انداز میں کرنے اور ان سے کام لینے کا اصول اپنائے ہوئے تھا اسے گارمنٹس کے بزنس کا ذرا بھی تجربہ نہیں تھا مگر آج وہ پورے اعتماد کے ساتھ یہ بات کہتا تھا کہ اب میں اپنی فیکٹری رن کر سکتا ہوں۔

گوروں کے دیس میں رہ کر اس نے زندگی گزارنے کے بہت سے اصول سیکھے تھے ان میں سے بہت سے اصول اس کی زندگی کا حصہ بن چکے تھے۔ وہ ان تھک محنت کے بعد نتائج سے بے پرواہ ہو جاتا تھا جانتا تھا محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی اور اس کے آنے کے چند مہینوں بعد ہی راحت بیگم نے محسوس کیا تھا کہ محنت کامیابی کی وہ چابی ہے جس کا استعمال ہر کسی کو نہیں آتا۔

''شجاع! کیا بات ہے مجھے کچھ پریشان لگ رہے ہو۔'' کمرہ خالی ہونے کے بعد راحت بیگم مکمل اس کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔

''میں پریشان نہیں حیران ہوں صوفیہ کو اپنے ذمہ داری کا احساس ہی نہیں آج بھی وہ ابھی تک نہیں آئی آپ نے اسے کہا تھا آنے کے لیے۔''

اس کا لہجہ قدرے بے چینی لیے ہوئے تھا اور آنکھوں میں کسی انہونی کا مدہم سا عکس راحت بیگم نے نظر بھر کر اس کے خوبرو چہرے کو دیکھا اور ایک گہری سانس لے کر یوں بولیں جیسے خود سے ہمکلام ہوں۔

''پتا نہیں میں غلط ہوں یا میرا فیصلہ.....''

''کیا مطلب.....'' شجاع کی بڑی بڑی روشن آنکھوں میں کسی انہونی کا عکس گہرا ہونے لگا تھا۔

''صوفیہ کہتی ہے آپ کوئی اکاؤنٹنٹ رکھ لیں مجھ سے نہیں ہوتا یہ بورنگ کام..... وہ اب ایم بی اے کرنے کے بجائے کسی آرٹ سکول کو جوائن کرنے کا کہہ رہی ہے۔''

ان کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ تھی جیسے اپنا تمسخر اڑا رہی ہوں شجاع کو اس لمحے وہ دلربا سی لڑکی بالکل اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ جس کے اوٹ پٹانگ فیصلے اس کے سامنے بیٹھی بہادر عورت کو کمزور کر رہے تھے۔

یہ سچ ہے انسان مقدر سے بھی لڑ لیتا ہے مگر اولاد اس کے سارے ہتھیار کند کر دیتی ہے۔

زندگی میں سمجھوتے توڑ دیتے ہیں لیکن اولاد کے لیے کیا گیا سمجھوتا ہر موڑ پر طاقت بن جاتا ہے۔

آج جانے کیوں راحت بیگم کو اپنی طاقت کا ذخیرہ کم ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔

انہیں تنہا زندگی نے اتنا نہیں تھکایا تھا جتنا کہ ان چند دنوں میں صوفیہ کے رویے نے انہیں مضمحل کر دیا تھا ان کا اندرونی اضطراب شجاع کو بخوبی محسوس ہو رہا تھا کیونکہ وہ خود بھی کسی ایسی ہی کیفیت سے دوچار تھا۔

''میں اسے لے آتا ہوں اگر آپ کہیں تو۔'' وہ یکدم کھڑا ہو گیا۔

''نہیں۔ وہ ہاسپٹل چلی گئی ہو گی شاید وہاں سے خود آ جائے۔'' انہوں نے بے مقصد ایک فائل کے ورق الٹنے شروع کر دیئے تھے۔

''مگر اس کا روز روز ہاسپٹل جانا آپ اسے منع کر دیں۔ یہ حادثہ تو ہماری زندگیوں کو زخم دے گیا ہے۔'' وہ تھکے ہارے انداز میں دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

راحت بیگم نے فائل بند کر کے اسے بغور دیکھا آج وہ معمول کے مطابق ہشاش بشاش نہیں نظر آ رہا تھا اس کی صبح بہت جلدی ہوتی تھی، جاگنگ، ورزش کے بعد جوسز سے ناشتا پھر بزرگوں میں بیٹھ کر ان سے چھوٹی چھوٹی باتیں کرنا اور پھر وقت پر آفس پہنچنا۔

اس کے معمولات میں کبھی تبدیلی نہیں آتی تھی وہ اپنی ذمہ داریوں کے ساتھ بھرپور انصاف کرنے والا مستقل مزاج انسان تھا۔ اسے صوفیہ آفس روٹین میں گڑبڑ کرتے ہوئے کبھی اچھی نہیں لگی وہ اول دن سے ایک ہی بات پر احتجاج کر رہا تھا کہ صوفیہ آفس ڈسپلن کا خیال کرے۔

مگر وہ بھی صوفیہ تھی وہ نہ تو اپنی ذات سے زیادہ اہم کسی کو گردانتی تھی۔

راحت بیگم کے لیے یہ ہی بہت تھا کہ وہ ان کی نظروں کے سامنے رہتی ہے ویسے بھی یہ در و دیوار تو اس کی بچپن کی شوخیوں سے بھی آشنا تھے اور وہ تھکی ہاری شامیں بھی اس گڑیا کے غم میں برابر کی شریک تھیں جب وہ نیند سے بوجھل آنکھیں لیے ماں کی آغوش ڈھونڈتے ڈھونڈتے کسی میز پر سر رکھ کر سو جاتی یا پھر گیسٹ روم میں رکھے صوفے پر گٹھڑی بن جاتی۔

''تو ٹھیک ہے اگر صوفیہ اس کام میں انٹرسٹڈ نہیں ہے تو زبردستی مت کریں۔'' وہ کسی نتیجے پر پہنچ چکا تھا اسی لیے قدرے پرسکون ہو گیا۔

''تو کیا اسے وہ کرنے دوں جو وہ چاہتی ہے۔ آج جن لوگوں کے ساتھ اس کے صبح شام گزر رہے ہیں کل وہ اس پر اپنا حق جتانے آ جائیں گے۔ تو کیا تب بھی میں اس کی بات مان لوں۔ اسے تو عادت ہو گئی ہے صرف اپنی منوانے کی۔ وہ کب کسی کا احساس کرتی ہے۔'' وہ ضبط کر تو رہی تھیں مگر دل کی بے کلی ان کے ایک ایک لفظ سے عیاں تھی ان کا لہجہ برفیلا تھا اور چہرہ گزرے وقت کی مسافت کا احساس کر کے دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

شجاع کا دل چاہ رہا تھا ابھی جا کر صوفیہ کو اس ہسپتال سے لے آئے جو بیت السکون کا سکون رخصت کرنے کی وجہ بن رہی تھی یہ تو وہ جانتا تھا کہ صوفیہ کسی کے احساسات کی پرواہ نہیں ہوتی۔ نہ ہی وہ خود کو کسی مسئلے کا ذمہ دار سمجھتی ہے مگر وہ اس حد تک سنگدل اور بے حس ہے کہ اپنی ماں کی تکلیف میں اضافہ کرے یہ سوچ کر ہی شجاع گہرے ملال میں گھر گیا تھا اسے صوفیہ کی ہر ادا منفرد لگتی تھی مگر اس کی انفرادیت میں خود غرضی کا رنگ اس قدر حاوی تھا شجاع کے دل پر چوٹ سی پڑی تھی۔

ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ اس کے اچھے بھی آپ کا احساس کریں گے۔ اور جو سوچیں قبل از وقت خود پر طاری کر لی ہیں انہیں فوراً اتار پھینکیں نہ صوفیہ اتنی احمق ہے اور نہ ہم سب اتنے کمزور کہ ان لوگوں کی ساری باتیں مان لیں گے۔

وہ اٹھ کر ان کے پاس آ گیا تھا اور انھیں اپنے مضبوط بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا تھا۔

''تم ان لوگوں کو نہیں جانتے۔ بلکہ میں بھی آج تک اس معاملے میں کوری ہوں۔''

وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ نہیں تھام کر بولی تھیں۔

''چلیں اس معاملے میں بھی صوفیہ ہماری مدد کرے گی۔ ویسے بھی ہمیں ان کو جاننے کی ضرورت بھی کیا ہے وہ لوگ اگر صوفیہ سے کسی قسم کی ہمدردی رکھتے ہیں تو..... آپ انہیں ان کی شرائط یاد دلا دیں اور وہ وقت بھی جب آپ صوفیہ کو لے کر وہاں سے نکلی تھیں۔''

اس نے گویا چٹکی بجاتے ہوئے مسئلہ حل کیا۔

''آج صوفیہ آئی..... تو میں اس سے اچھی طرح نبٹ لوں گا کہ یہ آفس دراصل اس کے باپ کا نہیں ماں کا ہے اور وہ کم از کم اپنی ماں کی نصف محنت کا ہی خیال کرے۔''

''لیکن اسے تو یہ ہی بات اچھی نہیں لگتی کہ ماں محنت کرتی ہے۔ مجھے کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے کہ وہ میرے کام سے بھی کبھی خوش نہیں ہوئی اسے آسائشات اچھی لگتی ہیں۔ جنہیں وہ اپنا حق سمجھ کر وصول کرتی ہے۔''

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی شجاع سے وہ باتیں کر رہی تھیں جنہیں ایک مدت سے دل میں چھپا رکھا تھا۔

''پھر تو اسے یہ احساس دلانا بہت ضروری ہے کہ آسائشات کوئی پلیٹ میں رکھ کر پیش نہیں کرتا ان کے لیے حالات کی تلخیاں سہنی پڑتی ہیں۔''

شجاع کا جملہ پورا ہوا ہی تھا کہ کوئی دروازہ ناک کر کے اور پھر جواب کا انتظار کیے بغیر اندر آ گیا تھا۔

وہ پلٹا اور مسکراہٹ لبوں میں دبا کر راحت بیگم سے مخاطب ہوا تھا۔

''کیا یہ محترمہ نئی اپائنٹ ہوئی ہیں آپ نے مجھے بتایا نہیں؟''

☆.....☆.....☆

خولہ کمال آفیشل لیو پر تھی اور اس کے پروگرام کے بجائے بیک ٹو بیک میوزک کی صدا نے خزیمہ عادل کی سماعتوں کو بوجھل سا کر دیا تھا اس نے بے دلی سے والیوم کم کر کے سارا دھیان ڈرائیونگ کی طرف لگا دیا۔ سامعہ نے اس کی بے زاریت کا سبب جاننے کے بعد بمشکل اپنی بے چینی پر قابو پایا اور عام سے لہجے میں یوں استفسار کیا جیسے خولہ کمال ان کی پڑوسن ہو۔

''خولہ سے بات ہوئی آپ کی۔''

''سامی! تم بھی نا عجیب باتیں کرتی ہو مجھے کیا ضرورت ہے اس سے بات کرنے کی۔ وہ اچھا پروگرام کرتی ہے اور یوں سمجھ لو۔ اس کو سننے کے بعد مجھے بھی ایف ایم سننے کی عادت پڑ گئی ہے۔''

وہ قدرے لاپروائی اور بے نیازی کا مظاہرہ کر رہا تھا سامعہ نے گردن گھما کر اسے دیکھا اور پھر یوں مسکرائی جیسے اس پر ترس آ رہا ہو۔

''بھیا جانی! یہ ایف ایم سننا بھی اچھی خاصی بیماری ہے میں نے سنا ہے لوگ عجیب دیوانے سے ہو جاتے ہیں ان آوازوں کے پیچھے اور یہ سارا اس آڈیو سسٹم کا کمال ہوتا ہے جس پر عام سی آواز بھی خاص محسوس ہوتی ہے۔

پتا ہے ہماری ایک ٹیچر بتا رہی تھیں کہ ان کی ایک فرینڈ پوری پوری رات ایف ایم سنتی تھی اور آج وہ نفسیاتی ہاسپٹل میں ہے بھیا اسے کیا ہوا ہوگا۔''

سامعہ کی معصومیت اپنی انتہا کو چھو رہی تھی خزیمہ نے سر پیٹ لیا تھا اس کے نفسیاتی ہسپتال جانے کی بہت سی وجہیں ہو سکتی تھیں مگر یہ قصور ایف ایم کے کھاتے میں اس لیے لکھا گیا تھا کہ وہ پوری رات سنتی تھی خزیمہ کم از کم اس حوالے سے بے فکر تھا وہ دو گھنٹے سے زیادہ نہ تو سنتا تھا نہ ہی اس میں اتنی ہمت تھی۔

''استانی جی آئندہ کوشش کروں گا ایف ایم نہ سنوں آپ کا اسکول آ گیا ہے۔''

''لیکن بھیا وہ خولہ کی بات تو وہیں رہ گئی ہے مجھے یقین ہے وہ اب اسلام آباد سے پروگرام کرے گی۔''

اس نے دروازہ کھولتے ہوئے اطلاع دی۔

"تمہیں بہت خبر ہے ان باتوں کی۔"

"مجھے پتا ہے ناں چینلز پر اس طرح کی حرکتیں ہوتی رہتی ہیں۔" وہ بڑے مدبرانہ انداز میں کہہ رہی تھی جیسے اس فیلڈ میں کام کرنے کا وسیع تجربہ ہو۔

کم از کم آج عمر کے اس حصے میں خزیمہ عادل کو یہ ہی محسوس ہوتا تھا کہ سامعہ کی سوچ اس کا انداز فکر اور حالات حاضرہ سے بھرپور آگاہی کے معاملے میں وہ خزیمہ سے کئی ہاتھ آگے ہے اس کی عمر میں خزیمہ کو اپنی گیند اور بلے جمع کرنے سے فرصت نہیں ملتی تھی ریڈیو اور ٹی وی میں دلچسپی بھی برائے نام تھی لیکن سامعہ تو اسے بعض اوقات چلتا پھرتا اخبار محسوس ہوتی جس کے پاس اپنی عقل اور سمجھ کے مطابق سب کچھ ہوتا تھا۔

خزیمہ اسے ڈراپ کر کے گھر کے راستے پر واپس ہو لیا سامعہ نے ایک نئی سوچ کا سرا پکڑا دیا تھا۔

خولہ کمال..... اسلام آباد میں..... کسی سے ملنے آئی ہے شاید..... وہ اسلام آباد سے پروگرام کر سکتی ہے۔

وہ جس ایف ایم چینل کے ساتھ وابستہ تھی اس کا ہیڈ آفس اسلام آباد میں تھا اور تقریباً آٹھ گھنٹے کی ٹرانسمیشن وہاں سے براڈ لاسٹ ہوتی تھی۔

اسے یک معلومات ویب سائٹ کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد حاصل ہوئی تھیں۔ آج اس نے آفس پہنچنے کے بعد سب سے پہلے اس چینل کی سائٹ کو لاگ ان کیا تھا۔

چینل سے وابستہ تمام اینکرز اور آر جے کا پورٹ فولیو بھی ویب سائٹ کا حصہ تھا لیکن ان میں خولہ کمال نہ تھی اس کی نظریں بے چینی سے کمپیوٹر اسکرین پر دوڑتی رہیں۔ کی بورڈ کی ٹک ٹک کے دوران اسے اپنی تلاش کا یہ سلسلہ اس وقت موقوف کرنا پڑا جب ایم ڈی صاحب کا پی اے اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''تین بجے ایم ڈی صاحب کے ساتھ آپ کی میٹنگ ہے۔''

''تین بجے۔یعنی لنچ کے فوراً بعد.....خیریت.....صرف میرے ساتھ یا باقی لوگ بھی.....''

اسے تشویش ہوئی۔

''فی الحال تو آپ کو انفارم کیا ہے۔'' وہ پیشہ وارانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا اور خزیمہ نے زیر مطالعہ میٹر کمپیوٹر اسکرین سے آف کرتے ہوئے ایک طائرانہ نگاہ اپنی رسٹ واچ پر ڈالی۔

''یار مجھے پھر یاد دلا دینا اگر بھول جاؤں ابھی تو بارہ بجے ہیں۔''

''اوکے۔'' وہ خزیمہ کی نک سک سے درست شخصیت سے ویسے ہی مرعوب رہتا تھا اس کی بے تکلفی پر خوشی محسوس کرتے ہوئے اپنے چیمبر کی طرف مڑ گیا۔

☆.....☆.....☆

کشمالہ کمال اور خولہ کمال.....راجہ طارق محمود کی بیٹیاں ان کے دائیں بائیں یوں جگہ گھیر کر بیٹھی تھیں جیسے وہ ہمیشہ سے اس ماحول کا حصہ رہی ہوں۔نانو کے چہرے پر بھی گرمجوشی کے بھرپور تاثرات تھے۔

عاشر عباس نے ایک اچٹتی سی نگاہ اس سارے منظر پر ڈالی تھی وہ لمحوں میں جان گیا تھا کہیں کوئی کمی نہیں ہے اس نے سرسری انداز میں خیریت دریافت کرنے کی رسم نبھائی اور اپنے کمرے کی طرف مڑ گیا۔

خولہ کمال کی گہری سبز آنکھوں نے اس کے لمبے چوڑے سراپے کا اس وقت تک تعاقب کیا جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا تھا۔راجہ طارق محمود اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں اس کے بارے میں بتا رہے تھے۔

''یہ میرا شہزادہ ہے اکثر مجھ سے خفا رہتا ہے۔''

''تم لوگوں کو بھی اس کا غصہ سہنا پڑے گا۔برا لگے گا لیکن میری خاطر پی جانا.....زندگی بھر مجھ سے دور رہنا.....ناراضی تو اس کا حق بنتا ہے۔'' وہ اس کے قدموں کے نشان گنتے ہوئے کہیں دور کھو گئے تھے۔

ان کے پُر وقار چہرے پر بیٹے سے محبت کا عکس بڑا خوبصورت تاثر دے رہا تھا کشمالہ نے بغور انہیں دیکھا اور بے اختیار سی ہو کر ان سے لپٹ گئی۔

دنیا کی تمام دولت ایک طرف اور اس شخص کا محبت بھرا دل ایک طرف..... وہ اکثر انہیں دیکھ کر سوچتی تھی۔

محبت کرنے والے ہر عہد میں پیدا ہوتے ہیں لیکن کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی محبت سے لطف اندوز ہونے کے لیے پورا ایک عہد بھی کم محسوس ہوتا ہے۔

پھر قدرت بھی تو ان کے ساتھ عجیب سا برتاؤ کرتی ہے دلوں پر راج کیا کرتے ہیں ایسے لوگ اور خود پیار کو ترستے ہیں۔ وہ آج تک راجہ طارق محمود کی وحشتوں کا سبب نہیں جان پائی تھی۔

''پاپا! آپ کا بیٹا ہم سے کیوں ناراض ہے۔'' خولہ کی نظریں ابھی تک اس راستے پر جمی تھیں جو عاشر عباس کے بھاری قدموں کی سختی کو بڑے ضبط کے ساتھ سہہ گیا تھا۔

(یہ تو ہم دونوں کا گلا ولا دبا دے گا۔)

''وہ کسی سے ناراض نہیں ہے بس مجھے دوری کی سزا دے رہا ہے۔ خیر اس کی رنجش بھی بے وجہ نہیں دھیرے دھیرے ہم اس کے دل کا ملال دھو ہی ڈالیں گے۔''

''تم لوگ پہلی بار یہاں آئی ہو..... میری فکر چھوڑو اس شہر کے موسم کو انجوائے کرو..... گلابی شامیں ہوتی ہیں آج کل.....''

''گلابی اور شام.....'' وہ دونوں ہی مسکرا دی تھیں نانو نے نظر بھر کر اس رونق کو دیکھا تھا اور بے قرار سی عاشر عباس کے کمرے کی طرف چل پڑی تھیں۔ جانتی تھیں جب تک ان کی گود میں سر رکھ کر بالوں میں ہاتھ نہیں ڈلوائے گا ان کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں نہیں دبائے گا تکیے میں منہ دے کر جاگتا رہے گا۔

وہ اس کے پاس بیٹھ کر کوئی قصہ چھیڑ دیتی تھیں اور عاشر عباس جیسے ہر الجھن سے آزاد ہو کر نیند کی وادیوں میں پرواز کرنے لگتا تھا۔

☆.....☆.....☆

حیرت.....اور خالص حیرت۔

وہ اپنی نیلگوں آنکھوں میں سموئے اس گھر کی طویل راہداریوں میں بنا آہٹ کے گھوم رہی تھی۔

اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ رات جس گھر کے کشادہ اور بے پناہ اونچی چھت والے گھر میں خاصی بے آرام گزری وہ اتنا کشادہ اور آرٹسٹک اسٹائل کا ہوگا۔

وہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچتے پہنچتے خاصی تھک گئی تھک۔

''پاکستان کے کیپٹل سٹی میں اتنا بڑا گھر..... پاپا کی خالہ تو خاصی رچ ہیں۔'' اس نے باہر جانے والی شفاف روش کے کنارے بنے سنگی چبوترے پر بیٹھتے ہوئے ایک طائرانہ نگاہ نانو کے اس مسکن پر ڈالی اور تازہ ہوا کے خوشبودار جھونکے جو نہ جانے کن کن درختوں کو چوم کر آ رہے تھے انہیں اپنے اندر جذب کرنے لگی۔

اس کے دائیں جانب باغ تھا یا لان..... وہ سمجھ نہیں پائی کیونکہ اس طرح کے مناظر اس نے فلموں میں ضرور دیکھے تھے مگر حقیقت میں وہ آج پہلی بار ایسے گوشہ زمین ہر براجمان تھی جس کے چاروں طرف خزاں آلود پتوں کا شور عجیب سا طلسماتی منظر پیش کر رہا تھا۔

اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ پاکستان میں پہلی صبح کو ہی وہ ایک ایسے منظر کا حصہ ہوگی جو اسے خوابوں میں نظر آیا کرتا تھا۔

حد نظر تک پھیلا ہوا زرد پتوں کا فرش.....

اور اپنی خزاں رسیدگی پر ہواؤں کی تندہی سے گلہ کرتے طویل القامت درختوں کے درمیان اپنی

سدا بہار قسمت پر نازاں سرو کے درختوں کی قابل دید قطار.....

اس کی آنکھوں سے حیرت ختم ہوتی تو ذہن سوچنے کے قابل ہوتا وہ تو بس دیکھے جا رہی تھی کبھی یہاں.....کبھی وہاں.....

ایسا نہیں تھا کہ اس نے ترس ترس کر یا کسی پسماندہ علاقے میں زندگی گزاری تھی زندگی کے ابتدائی سال جرمنی کے ایک مہنگے علاقے میں۔ اور اب لندن کے ایک کشادہ اپارٹمنٹ میں زندگی کی تمام تر آسائشوں سے محظوظ ہونے والی شاہانہ مزاج کشمالہ کمال کے لیے اس قدیم طرز تعمیر کی حامل عمارت میں کوئی تو ایسی بات تھی کہ اس کے دل و دماغ عجیب سے سکوت کی زد میں آ گئے تھے۔

صبح کی پُر اسرار خاموشی اور بڑے بڑے گول جالی دار ستونوں کے پیچھے سے جھانکتی چمکیلی دھوپ نے اسے اتنا مست کیا ہوا تھا کہ وہ یہ بھی بھول گئی کہ اس اجنبی گھر میں آج اس کی پہلی صبح ہے اور یہاں کبھی بھی کوئی بھی آ سکتا ہے۔

جب ہی تو اس کی نظروں نے عاشر عباس کا تعاقب کرتے ہوئے یہ بھی نہ سوچا کہ وہ اس بے تکلفی پر کیا محسوس کرے گا۔

وہ بیرونی پھاٹک نما گیٹ سے اندر آیا تھا ڈارک براؤن ٹریک سوٹ میں اس کا تمتماتا ہوا چہرہ اپنی سنہری رنگت کے باعث بہت نمایاں لگ رہا تھا ماتھے پر آئے ہوئے بالوں کی لٹوں نے اس کے چہرے کی دلکشی بڑھا دی ابھی وہ اپنی ہی دھن میں کسی بات پر دھیمے سے مسکرایا تھا یا اس کا چہرہ ہی ایسا تھا کشمالہ بلاوجہ سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

پتا نہیں کیوں اس لمحے وہ رات والے عاشر عباس سے بہت مختلف اور مہربان سا لگا تھا۔

''پاپا نے کہا تھا وہ مجھ سے ناراض رہتا ہے لیکن یہ شخص کسی سے ناراض نہیں رہ سکتا۔'' اس نے فوراً سے پیشتر حتمی رائے دے دی تھی۔

گو کہ اگلے لمحے اسے افسوس بھی ہوا تھا کیونکہ وہ اسے نظر انداز کر کے لمبے لمبے قدم اٹھاتا اندر کی جانب چلا گیا تھا۔

اس نے ایک بار بھی مُڑ کر نہیں دیکھا تھا کہ اس مصنوعی چٹانی سلسلے کے ساتھ بنے سنگی چبوترے پر کوئی بیٹھا ہے۔

وہ سبکی سی محسوس کرتے ہوئے یکدم کھڑی ہوگئی۔ دوپٹے کے تکلف سے آزاد اس کا دراز قد سراپا جینز اور کُرتے کی قید میں تھا وہ پاکستانی لباس بہت کم پہنتی تھی جبکہ خولہ کی وارڈ روب میں زیادہ شلوار قمیص ہی ہوتے تھے۔

دونوں ایک ہی دن اور ایک ہی گھنٹے کے دوران چند منٹوں کے وقفے سے پیدا ہوئی تھیں اس لیے نین نقش اور قد قامت میں بلا کی مماثلت تھی۔

گہری جھیل جیدی نیلی آنکھیں سنہرے بال اور چھریرا بدن۔

اگر کہیں فرق محسوس ہوتا تھا تو ان دراز لٹوں کی وجہ سے جو کشمالہ کی کمر پر جھولتی رہتی تھیں اور خولہ کے سنہری گچھے اس کی گردن سے نیچے نہیں جاتے تھے۔

ان کے قریب رہنے والے لہجے کے اتار چڑھاؤ سے شناخت کر لیتے تھے خولہ کی مترنم آواز کا سحر کانوں میں رس گھولتا تھا اور کشمالہ کو لوگ اس لیے سننا چاہتے تھے کہ اس کی آواز ذہن کی بند کھڑکیوں پر دستک دیتی تھی۔

عجیب دماغ میں بسنے والی آواز تھی اس کی..... بھاری شفاف اور جادوئی سی.....

اور جادو تو اس کی سنہری لٹوں اور سانچے میں ڈھلے ہوئے جسم میں بھی بلا کا تھا راجہ طارق محمود نے اب تک بے شمار لوگوں سے معذرت کی تھی جو اسے اپنے گھر کی رونق بنانا چاہتے تھے۔

اس کا ہاتھ تھام کر دل کی دنیا آباد کرنے والوں کی بھی ایک لمبی فہرست تھی لیکن وہ مان کے ہی نہیں دیتی تھی۔

خولہ اسے اکثر تنگ کرتی تھی کہ تمہیں کسی پرنس کا انتظار ہے۔

وہ اکثر اس سے مسکراتے ہوئے کہتی یہ پرنس کی پرسنالٹی تو ڈیفائن کرو..... کیسا ہوتا ہے پرنس۔

راجہ طارق محمود نے کہا تھا یہ میرا شہزادہ ہے۔

لمبا چوڑا..... خود میں گم..... اور خود سر بھی.....

☆.....☆.....☆

نانو نے ناشتے کا خوب اہتمام کیا تھا۔

پاکستانی، دیسی اور انگریزی ہر طرح کا ناشت دستر خوان پر موجود تھا۔

اتنے بڑے گھر میں ڈائننگ ٹیبل نہیں تھی یا اس گھر کا دستور ہی یہ تھا وہ دونوں ایک ہی انداز سے سوچتے ہوئے قدرے پُر تکلف نظر آ رہی تھیں نانو کا دھیان صرف ان دونوں کی تواضع پر لگا ہوا تھا ان کے چہرے سے چھلکتی خوشی اور آنکھوں میں ہمکتی چھوٹی چھوٹی خواہشیں بخوبی احساس دلا رہی تھیں کہ آج ایک مدت کے بعد اس گھر کے سناٹے کو زندگی سے بھرپور آوازوں کے جلترنگ نے توڑا ہے۔

ان کا نواسا عاشر عباس بھی اتنا کم گو نہیں تھا لیکن بیٹیوں کی شوخ ہنسی اور ان کی شرارتی گفتگو کے لیے یہ گھف ایک زمانے سے ترس رہا تھا آج ان کی خواہش پوری ہوئی تھی تو وہ اس سے لطف اندوز ہونے کا پورا انتظام کر رہی تھیں۔

"بچے! تم نے اپنی اولاد کی خوب تربیت کی ہے ماشاء اللہ دونوں بہت سلجھی ہوئی اور رکھ رکھاؤ والی بچیاں ہیں۔"

"خالہ جان! کیوں مجھے شرمندہ کرتی ہیں آپ سب جانتی تو ہیں ان دونوں کی تربیت میں میرا کوئی کمال نہیں۔ اس کا پورا کریڈٹ ان کی ماں کو جاتا ہے۔"

وہ لسی کے گلاس میں چینی ملاتے ہوئے بولے۔

''اللہ اسے اپنی رحمت کے سائے میں رکھے نیک عورت تھی کوئی پتا چل جاتا ہے کون کس کا خون ہے۔'' ان کے لہجے میں بے چین سی حسرت مچلنے لگی۔

''خالہ جان! یہ سب قسمت کے کھیل ہوتے ہیں اور ہم سب غلطی سے سیکھتے ہیں۔ شاید اس نے کچھ سبق اس وقت پڑھے جب زندگی نالائقی کی سزا دے چکی تھی۔''

''پپا ہمارا کام تو سبق پڑھنا ہوتا ہے اور یہ فیصلہ تو وہ ٹیچر کرتا ہے کہ جسے ہم وقت کہتے ہیں کہ ہم نے جو پڑھا وہ ہمارے لیے تھا بھی یا نہیں۔''

خولہ فروٹ یوگرٹ کھاتے ہوئے اچانک بولی تھی اور کشمالہ نے گھور کر اسے دیکھا تھا۔

پتا نہیں دونوں کس ٹرانس میں تھے اس نے اپنی موجودگی کا احساس دلا کر سب کچھ درہم برہم کر دیا تھا دونوں لمحہ موجود میں آ کر خولہ کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے وہ کسی بریکنگ نیوز کی نیوز کاسٹر ہو۔

''بیٹے! ریڈیو کا کیا پروگرام ہے؟'' نانو کے اس سوال نے اب ایک لمحے کو دونوں کو متوجہ کیا تھا۔

وہ ان کے بارے میں اتنا کچھ جانتی تھیں انہیں حیرت کے ساتھ خوشی بھی ہو رہی تھی۔

''پپا نے صرف پاکستان آنے کو کہا تھا اگر ہمیں پتا ہوتا کہ آپ کے روپ میں ہم اتنی زبردست شخصیت سے ملنے والے ہیں تو ہم ضرور آپ سے ملنے کی جلدی کرتے۔'' کشمالہ کے انداز میں کوئی بناوٹ نہیں تھی وہ بھرپور مغربی سراپے میں مکمل مشرقی لڑکی تھی اس کے چہرے پر عجیب سی تمکنت تھی اور آنکھوں میں خود آگاہی کا مکمل احساس.....

وہ انہیں پہلی نظر میں اچھی لگی تھی حالانکہ اس کا حلیہ اس کی سوچ اور اندر کی سادگی کا عکاس نہیں تھا وہ جدید دنیا کے تقاضوں سے آشنا مکمل مغربی سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔

ان کا دل چاہا اس کی محبت کا مان گلے لگا کر دیں اور یہ کیفیت ان کے چہرے پر خوشی کی صورت میں بھرپور طریقے سے چھلکی تھی جسے راجہ طارق محمود نے پوری شدت کے ساتھ محسوس کیا تھا۔

وہ جانتے تھے اس عمر رسیدہ عورت کی محرومی.....

اور یہ بھی جانتے تھے کہ عورت اس وقت ہار جاتی ہے خود سے شرمندگی محسوس کرتی ہے جب اسے اپنی تربیت کا خراج ادا کرنا پڑتا ہے جب اسے یہ سننا پڑتا ہے کہ وہ اولاد کو بہتر زندگی گزارنے کے گر نہیں سکھا سکی۔

لیکن بہت سے لوگ یہ بھی جانتے تھے کہ راجہ طارق محمود سے مل کر جس عورت کا خیال دل میں آتا ہے اور اس کی تربیت کو داد دینے کو دل چاہتا ہے وہ یہ ہی ہیں۔ فاطمہ بنت محبّ عالم۔

''تم دونوں اب آ گئیں میرے لیے یہ ہی بہت ہے۔ اب جانے کی بات نہ کرنا زیادہ اچھی بات ہو جائے گی۔''

انہوں نے دونوں کو بغور دیکھا۔

''مگر ہم تو چند دنوں کے لیے آئے ہیں۔ ہمارا تو سب کچھ وہاں پر.....'' خولہ نے قدرے فکر مندی سے کہا تو راجہ طارق محمود کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

''خالہ جان! یہ جو میری چڑیا ہے بہت حساس ہے بلاوجہ کی سوچیں پال لیتی ہے اپنے دل پر جبر کر لیتی ہے مگر دوسروں کا دل نہیں توڑتی۔

انہوں نے پاس بیٹھی خولہ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور وہ اگلے ہی لمحے کسی ننھی سی بچی کی طرح ان کے بازوؤں میں سمٹ گئی۔

''پروگرام کرنے کا ارادہ ہے۔ چینل زیادہ دور نہیں۔'' انہوں نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔

''نہیں پاپا مجھے ریسٹ کرنا ہے خوب تفریح کرنی ہے اور بس۔''

''او کے فائن۔ آج کا دن ریسٹ۔ کل سے خوب تفریح۔ کیا خیال ہے۔ مالا! وہ کشمالہ کی طرف مُڑے۔

''جی پپا آئی اگریڈ۔ آج ہم صرف نانو کا گھر گھومیں گے۔ پاپا۔ ان کا گھر باہر سے کتنا خوبصورت لگتا ہے نا۔ بالکل کسی پیلس کی طرح۔

وہ یکدم ایکسائیٹڈ ہوگئی تھی۔

''اندر سے خوبصورت نہیں۔''

''خوبصورت ہے بہت لیکن اندر سکون ہے گہری خاموشی۔ ایسا لگتا ہے کوئی گم ہو جائے گا۔ اس نے راجہ طارق محمود کی طرف یوں دیکھا تھا جیسے وہ انہیں خبردار کر رہی ہو۔

''اس پیلس میں اکثر لوگ کھو جاتے ہیں تم دونوں اپنا خیال رکھنا۔'' وہ مسکرا دیئے تھے پُر ملال انداز میں۔

نانو نے نظروں کا زاویہ بدل لیا تھا۔

❁ ❁

ناول **خواب خواہش اور زندگی** ابھی جاری ہے۔ مزید واقعات اگلے صفحات میں پڑھیں۔

رنگا رنگ کہانیوں سے سجا، خوبصورت اور دلکش

سوہنی ڈائجسٹ

SohniDigest.Com

اگر آپ بھی لکھ رہے ہیں اور اُردو قارئین کی تلاش میں ہیں تو اپنی کہانیاں Inpage میں کمپوز (ٹائپ) کر کے پورے اعتماد کے ساتھ سوہنی ڈائجسٹ میں بھیجئے۔ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔

ابھی sohnidigest@gmai.com پر ای میل کریں۔

قسط نمبر 2

''خزیمہ عادل ایم ڈی صاحب کی بیگم کے ساتھ اسلام آباد جا رہا ہے۔'' یہ خبر شاید میٹنگ ختم ہونے سے پہلے ہی کمرے کی دیواروں سے سوراخ بنا کر باہر نکل گئی تھی۔

اس کا میٹنگ کے بعد ان کے کمرے سے باہر آنا اور اپنے چیمبر تک پہنچنا محال ہو گیا تھا معنی خیز نظروں سے وار تو ہو ہی رہے تھے۔ دبے دبے انداز میں قہقہوں کی تلوار بھی خوب چل رہی تھی۔

اسے اچھی طرح اندازہ تھا ایم ڈی صاحب کی یہ مہربانی کاشف اور مظہر کو تو کسی صورت ہضم نہیں ہو رہی ہو گی وہ دونوں اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور تھے اور خزیمہ اپنی قسمت پر حد درجہ یقین رکھتا تھا۔

اسلام آباد آفس کے سیٹ اپ میں اس کی انوالومنٹ اتنا بڑا واقعہ تو نہیں تھی۔ کیوں کہ وہ اس فرم میں ایگزیکٹو پوسٹ پر تھا اس کی ذمہ داریوں میں کبھی بھی اضافہ ہو سکتا تھا اصل میں واقعہ تو ایم ڈی صاحب کی بیگم کے ساتھ جانا تھا۔ وہ بد دماغ سی خاتون تھی ان کی ناپسندیدگی کا گراف خاصا بلند تھا۔ اصل میں انہیں بھی عوام الناس سے گھلنے ملنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ اور انہوں نے خزیمہ کے ساتھ اسلام آباد جانے کی ہامی بھر لی تھی یہ تشویشناک بات تھی۔

وہ ایم ڈی صاحب کی گڈ بک میں تو اول دن سے تھا وہ ہمیشہ اسے بڑے خوشگوار موڈ میں مخاطب کرتے تھے۔

کبھی اس کی ڈریسنگ کی تعریف کرتے۔

کبھی اس کے بالوں کو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھتے۔

اور ایک دن تو انہوں نے حد ہی کر دی تھی وہ کئی دن تک اس جملے کے ٹرانس میں رہا تھا۔

''خزیمہ! مجھے تمہاری مسکراہٹ بہت اچھی لگتی ہے ہنستے رہا کرو موسم بدلنے کا احساس ہوتا ہے۔''

وہ تو اپنی بات سے محظوظ ہوتے ہوئے رخصت ہو گئے تھے اور اس کی مشکوری نظریں مظہر کی نظروں سے جا ملی تھیں جو بڑی کاٹ دار نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''اگر یہ جملہ کسی ایم ڈی صاحبہ نے کہا ہوتا تو مسئلہ نہ تھا۔''

''کیوں تمہیں ایم ڈی صاحبہ نے کہا تھا۔'' وہ محض مسکرا دیا تھا۔

''ہائے ہمارے ایسے نصیب کہاں سنا ہے ان بڑے لوگوں کے شوق بھی ان کی طرح بڑے ہوتے ہیں ان کی پسند کا دائرہ وسیع ہوتا ہے۔ سنبھل کر چلنا۔''

اس کے لہجے کی چبھن نے خزیمہ کے پورے جسم میں سرد سی لہر دوڑا دی تھی۔ اگر وہ آفس میں نہ ہوتا تو خزیمہ ضرور اس سے پوچھتا کہ

''تمہیں بڑے لوگوں کے شوق جاننے کی جستجو کیوں ہے؟''

میں سنبھل کر چلوں یا نہ چلوں تمہیں میری اتنی فکر کیوں ہے۔'' خزیمہ نے اس دن تو سرد مہری کا مظاہرہ کر کے جان چھڑا لی تھی۔

مگر وہ آج پھر کٹیلے جملوں کی تلوار لیے سر پر کھڑا تھا۔

''کہا تھا ہم نے سنبھل کر چلنا..... یہ شخص تجھے پھنسا کر دم لے گا۔''

''بالفرض ایسا ہو بھی جاتا ہے تو تمہیں کس بات کی پریشانی ہے۔ میرے پھنسنے کی یا اس شخص کے ہاتھ سے نکل جانے کی۔'' وہ بدمزگی تو نہیں چاہتا تھا لیکن اتنا بھی متحمل مزاج نہیں تھا کہ ہر بات خاموشی سے سہہ لیتا.....

''تیرے تو وارے نیارے ہو گئے.....''

وہ شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ اس کے اندر تک آگ لگا گیا تھا۔

''ول یو شٹ اپ پلیز تمہیں گھٹیا سوچنے کی عادت پڑ گئی ہے۔''

ایک لمحے کو تو اسے اپنی آواز بھی اجنبی سی محسوس ہوئی تھی۔

''چلو دیکھ لیتے ہیں ہم بھی یہیں پر ہیں کیوں کاشف.....''

اس کا ہم مزاج بھی آ گیا تھا اس کی زبان مظہر کی طرح کانٹے نہیں اگلتی تھی مگر قابو میں بھی نہیں رہتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی صفات پر خوب ناز کرتے تھے۔

''تمہیں پتا ہے خزیمہ اس طرح کی مہربانیوں کے کیا فائدے ہوتے ہیں۔ جلد از جلد ترقی پھر گاڑی اور گھر اور آخر میں باس کی معذور بیٹی سے شادی۔''

کاشف نے کسی بوگس فلمی کہانی کا اسکرپٹ سنایا تھا مظہر نے ہاتھ پر ہاتھ مار کر تائید کی تھی خزیمہ نے ایک گہری سانس لے کر دونوں کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔

''پلیز مجھے میرا کام کرنے دو..... مجھے باس کے آرڈرز فالو کرنے ہیں اور بس..... پتا نہیں اتنا زیادہ سوچنے کی فرصت کیسے مل جاتی ہے تم دونوں کو..... جاؤ یہاں سے.....''

وہ بے زاریت سے کہہ کر اپنے بکھرے کام سمیٹنے لگا کاشف اور مظہر ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے اپنے چیمبر کی طرف چل پڑے۔

دونوں ہیومن ریسورس میں تھے اپنی ذمہ داریوں سے زیادہ دوسروں کے مسائل پر نظر رکھتے تھے خزیمہ کا قصور یہ تھا کہ وہ اس کے کورس میٹ رہ چکے تھے ایک سمسٹر میں..... اس بے نام سی شناسائی کی سزا اسے خوب ملا کرتی تھی۔ وہ جانے کیوں اس کے ضبط کا امتحان لیتے تھے یہ بات وہ آج تک نہیں سمجھ پایا تھا حالانکہ اس کا ڈپارٹمنٹ بھی الگ تھا سوائے لنچ آورز اور ٹی ٹائم کے ملاقات بھی نہیں ہوتی تھی۔

وہ کبھی بھی ان کی بے سروپا باتوں پر ہلکان نہیں ہوتا تھا اول تو فرصت کا ہی فقدان تھا۔

جو بمشکل ہاتھ آتی تھی اس میں بھی آج کل دنیا کا سب سے اہم کام ہوتا تھا خولہ کو میل کرنا اور اس کی مختصر سی میل کا انتظار کرنا.....

آج کے دن کا انتظار ابھی تمام نہیں ہوا تھا۔

وہ دو دن سے رابطے میں نہیں تھی اس کا میل باکس خالی پڑا تھا وہ پروگرام بھی نہیں کر رہی تھی آفیشل لیو کی وجہ سے۔

گویا سامعہ کی خبروں میں سو فیصد صداقت ہے کہ وہ پاکستان آ چکی ہے اور اسلام آباد.....اس نے یہ ہی تو بتایا تھا۔

''اسلام آباد.....میں بھی کل صبح کی فلائٹ سے اسلام آباد جا رہا ہوں۔'' اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔

''کیا مجھے قسمت اس سے ملانے کے لیے وہاں لے جا رہی ہے؟'' اس کا چہرہ اندرونی مسرت سے جگمگانے لگا۔

''کیا تم اسے سڑکوں پر ڈھونڈو گے۔'' دماغ نے سرزنش کی۔

''نہیں میں اسے میل کروں گا فون کروں گا اس کے آفس خیر اگر وہ میرے مقدر میں ہوئی تو مجھے ضرور ملے گی۔'' وہ دل ہی دل میں خود سے مخاطب تھا۔

ایم ڈی صاحب کی بیگم کے ساتھ اسلام آباد جانے کا بوجھ اترنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی تھی۔

اس کے ہاتھ تیزی سے کی بورڈ پر حرکت کرنے لگے۔ وہ ایم ڈی صاحب کا انتہائی مشکور ہو چلا تھا بھلا انہیں شکایت کا موقع کیسے دے سکتا تھا۔

☆.....☆.....☆

بیت السکون کی ہنگامہ خیزی کچھ دنوں کے لیے ارسہ اور علی کے گھر منتقل ہوگئی تھی ان لوگوں نے اگر اس بندھن کو باندھنے میں اہم کردار ادا کیا تھا تو اب وہ اسے اٹوٹ بنانے کے سارے انتظامات بھی اپنے ہاتھ میں لے چکے تھے۔

عامر تو ویسے بھی ایونٹ مینجمنٹ کے شعبے سے وابستہ تھا بقول انعم کے تم صرف ٹینٹ اپنے ہاتھوں سے نہیں لگاتے باقی سارے کام تو خود کرتے ہو..... اس کے بعد وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیتی۔

''اللہ کے لیے عامر۔ آرٹ اینڈ کلچر سائنس پڑھ کر کوئی ڈھنگ کا کام کر لیتے۔''

''بندر کیا جانے ادرک کا مزا یہ تو وقت بتائے گا کہ میں جس شعبے سے اٹیچ ہوں وہ کتنی ترقی کر رہا ہے اور پھر تمہاری شادی کا پنڈال بھی تو میں سجاؤں گا۔ تم فکر کیوں کرتی ہو دنیا حیران رہ جائے گی۔''

''دنیا تو واقعی حیران رہ جائے گی جب دولہا ایونٹ ارینج کروا رہا ہوگا۔'' یہ چٹکلا شجاع نے چھوڑا تھا اور انعم اچھل کر کھڑی ہوگئی تھی۔

''شجاع آپ سے مجھے ایسی امید نہ تھی۔''

''تم ان سے دوسری امید رکھنا بھی مت یہ آج کل کسی اور چکر میں ہیں فل ٹائم اسی کی فکر میں مبتلا۔'' عامر اپنے سلکی بالوں کی پونی بنانے کے چکر میں تھا۔

''انسانیت کے ناتے۔ باقی تو کوئی مسئلہ نہیں۔'' شجاع کا اطمینان قابلِ دید تھا عامر نے پونی بنا کر دم لیا تھا اب اسے مشکوک نگاہوں سے تک رہا تھا۔

''مانا سرکار کہ محبت کا چھپانا ہے محبت مگر کبھی کبھی اعتراف کر لینے میں کوئی حرج نہیں وہ بھی دوستوں کے سامنے۔'' عامر نے اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر کچھ اس انداز سے کہا تھا کہ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اسے یوں ہی ہوا میں تیر چھوڑنے کی عادت تھی جو اکثر نشانے پر لگ جاتے تھے۔

''یہ سراسر تمہارے شیطانی دماغ کی کارستانی ہے ورنہ۔''

اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی عامر نے اچک لیا تھا۔

''ورنہ ہم نے تو کچھ سنا ہی نہیں۔'' وہ ہنس پڑا۔

''اب سن کیا لیا میں تو دیکھنے کی بات کر رہا تھا۔''

انعم جو گھٹنوں کے بل بیٹھی بک شیلف کا جائزہ لے رہی تھی پلٹ کر انہیں یوں دیکھنے لگی جیسے کسی نئے واقعے کے شواہد جمع کر رہی ہو۔ ان لڑکوں کے پاس تو لڑکیوں سے زیادہ فضول باتیں ہوتی ہیں۔

''یہ کونسی محبت کی بات ہو رہی ہے۔'' وہ سوچنے کے بجائے پوچھنا چاہتی تھی مگر دونوں ایک دوسرے کی گردن دبوچنے کی کوشش میں لاؤنج سے باہر چلے گئے اس نے ایک گہری سانس لے کر اپنی مطلوبہ کتاب اٹھالی اور صوفیہ کے پورشن کا رخ کرنے کے بجائے اپنے کمرے میں آ گئی۔

آج کل صوفیہ نے خود کو اتنا مصروف کیا ہوا تھا کہ اس سے ملاقات ہی نہیں ہوتی تھی شجاع کی صوفیہ میں دلچسپی کم از کم ان دونوں کے نوٹس میں بخوبی تھی..... وہ کتاب کے صفحے پلٹتے ہوئے بھی بلاوجہ اس کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

اس کا طوفانی مزاج۔

اس کی غیر مستقل مزاجی۔

بے جا ضد۔

کبھی کبھی اس کا بے رحم لہجہ ہر رشتے کو بالائے طاق رکھ دیتا تھا اور شجاع تو لفظوں جا جادوگر تھا اس کے لہجے کی شیرینی باندھ لیتی تھی۔

اس کی تو عادت تھی ہر ایک سے چاہت کا قیمتی لبادہ اوڑھ کر ملنا..... ہر ایک کے ساتھ خلوص کی معطر کلیوں کا تبادلہ کرنا۔

پتا نہیں کیوں صوفیہ کو کانٹے پکڑنے کی ضد تھی۔

☆.....☆.....☆

صوفیہ شام گئے گھر لوٹی تھی اور دونوں پورشن کا جائزہ لینے کے بعد اب لان میں آ کر بیٹھی تھی غصہ اس بات پر آ رہا تھا کہ عامر، عائزہ، انعم، فائزہ، شجاع کوئی بھی نہیں تھا سب کے سب اسے چھوڑ کر ارسہ کے گھر مہندی میں چلے گئے تھے۔

''پتا نہیں ان لوگوں کے پاس اتنی فرصت کیوں ہے کبھی یہاں تو کبھی وہاں اور مجھے بتایا بھی نہیں۔'' اس کی آنکھوں میں جلن سی ہونے لگی۔

اپنا نظر انداز ہونا تو اسے قطعی گوارا نہ تھا اور آج تو یہ سب لوگ باقاعدہ پلاننگ کے ساتھ غائب ہوئے تھے اسے انوائٹ کرنا تو دور کی بات بتانا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔

وہ مضطرب انداز میں بالوں کی لٹوں کو انگلیوں پر موڑتے ہوئے کبھی ایک پورشن کے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی اور کبھی دوسرے.....

''ارسہ کی مہندی میں کتنا مزا آ رہا ہوگا نا..... خوب ہلا گلا اور شرارتیں میری یاد انہیں بھلا کیونکر آئے گی..... اللہ کرے مر جاؤں کہتی بھی ہوں امی سے۔ چلیں یہاں سے یہ لوگ اب ہمیں بوجھ سمجھنے لگے ہیں مگر نہیں انہیں بھی تو شوق ہے نا بوجھ بننے کا۔''

سوچوں کا دھارا کب منفی رخ پر بہنے لگے صوفیہ کے لیے کوئی مشکل بات نہیں تھی۔

سب کا بھرپور پیار سمیٹنے کے باوجود وہ بچپن سے لے کر اب تک ایسی ہی تھی لمحوں میں خود کو اذیت دینے کے لیے کوئی ایسی سوچ پال لیتی کے جس کا گزر شاید ہی کسی کے ذہن کے کونے سے بھی ہوتا ہو۔

آنکھوں کی جلن کب گرم پانی کی صورت باہر نکلنے لگی اس کا تو پتا بھی نہیں چلا تھا بس چہرہ بھیگ رہا تھا۔

اور اس کا بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا کہ خود کو روکے یا اس نمکین پانی کو صاف کرلے۔

وہ تو بس رونا چاہتی تھی۔ بے حد بے حساب۔

کبھی کبھی یوں ہی تنہائی کی آغوش میں سر رکھ کر رونا اور اپنی یتیمی کا ملال کرنا اسے بہت سکھ دیتا تھا

اس لمحے وہ دنیا کے ہر اس چہرے سے بدگمان ہوتی تھی جو اسے اپنا کہتا اور پیار لٹاتا نظر آتا تھا۔

جب آنکھوں کی برسات تھم جاتی اور اپنی کم مائیگی کا احساس سسکیوں کے ساتھ ہواؤں میں تحلیل ہو جاتا تو وہ ایک نئے حوصلے کے ساتھ سب کے درمیان آ جاتی۔

اپنے بہادر اور بے نیاز ہونے کا نقاب چڑھا کر۔

اپنی آنکھوں میں احساس برتری کی چمک لے کر۔

اور اپنی ذات کے تفاخر کو ثابت کرنے کا عزم لے کر۔

اپنی زندگی جو دو حصوں میں منقسم کرنے کا ہنر بھی اسے خود بخود آ گیا تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ انسان اپنے ماحول کے ساتھ سمجھوتا صرف اس دن تک کرتا ہے جب تک اس کا شعور بے داری کی منازل عبور کر کے اپنے افعال اور اعمال کی ذمہ داری خود نہ اٹھا لے۔

وہ بھی شاید بے داری کی اس منزل پر کھڑی تھی جہاں سے آگے اسے اپنی زندگی کے راستے خود بنانے تھے۔

''اور جب میں یہ طے کر چکی ہوں تو پھر مجھے ان سب کی پرواہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

میں کیوں ان بے حس لوگوں کی خاطر اپنا دل جلاؤں اپنے آنسو ضائع کروں۔

اونہہ۔ مائی فٹ۔''

اس نے بے دردی سے اپنا چہرہ رگڑا اور پاؤں پٹختے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چل پڑی۔

☆.....☆.....☆

سرمئی بادلوں کے آوارہ مرغولے رات سے ہی آسمان کی وسعتوں میں تیر رہے تھے صبح ان کا برسنا یقینی تھا اور وہ موسم بدلنے سے پہلے ہی واپس جانا چاہتا تھا اس نے صبح سویرے روانگی کے لیے بیگ باندھنے کے بعد نانو کے کمرے کا رخ کیا تھا۔

''پتا ہے نانو! ہم لوگ پاکستان آنے سے پہلے بہت ڈرے ہوئے تھے بے شک پپا کا لونگ اسٹینڈرڈ بہت ہائی ہے لیکن میں نے فیوڈلز کی بہت سی اسٹوریز بھی پڑھ رکھی ہیں اور مجھے پپا ماڈریٹ فیوڈل لگتے ہیں۔''

وہ دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ اجنبی آواز کی بے تکلفی محسوس کر کے رک سا گیا۔ آج سے پہلے اس نے کبھی اس دروازے پر دستک دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی استحقاق تو یہ ہی کہتا تھا کہ آج بھی ضرورت نہیں مگر اخلاقیات نے فوراً اپنے پر پھڑ پھڑائے تھے اور وہ ہلکی سی دستک دے کر اندر آ گیا تھا۔

نانو اپنے مخصوص جہازی سائز پلنگ پر براجمان تھیں تکیے سے ٹیک لگائے ان کی توجہ کا مرکز سامنے بیٹھی کشمالہ تھی جو ایک ہی دن میں ان کے اتنے قریب آ چکی تھی کہ عاشر کو اس کی موجودگی سے الجھن سی ہونے لگی۔

یہ اس کی جگہ تھی جہاں وہ بیٹھی تھی۔

یہ وقت اس کا تھا جسے اس نے تصرف میں لے رکھا تھا۔

وہ جھنجھلا کر پلٹنے ہی لگا تھا کہ انہوں نے آواز دے دی۔

''بیٹے عاشر۔ آ جاؤ نا۔'' ان کی آواز پر کشمالہ نے بھی پلٹ کر دیکھا اس کوشش میں اس کے سنہرے سلکی بال کلپ کی قید سے آزاد ہو کر کمر پر بکھر گئے تھے۔

کمرے میں بیٹھنے کے لیے صوفہ کم بیڈ بھی فولڈ ہوا رکھا تھا لیکن کشمالہ نے غیر شعوری طور پر خود کو سمیٹا اور نانو کے برابر میں رکھے تکیے کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ نانو کی آنکھوں میں عاشر عباس کو دیکھ کر انوکھی سی چمک امڈ آئی تھی انہوں نے حسبِ عادت دونوں بانہیں پھیلا کر اسے اپنے پاس بلایا اور بالکل چھوٹے سے بچے کی طرح اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔

کشمالہ کے لیے محبت کا یہ مظاہرہ دلچسپ بھی تھا اور نیا بھی۔ اس کے شنگرفی لبوں پر خود بخود

مسکراہٹ پھیل گئی۔

یہ نوجوان دلکش خدوخال کا مالک تو تھا لیکن اپنے دراز قد کو نمایاں کرنے کے لیے ڈریسنگ بھی خوب کرتا تھا وہ بغور اس کا جائزہ لینے لگی۔ سٹیل گرے سوٹ میں ملبوس بڑی بڑی آنکھوں میں قدرے برہمی کے تاثرات لیے یہ مکمل ایشیائی وجاہت رکھنے والا شخص اسے کل رات سے ہی متوجہ کرنے لگا تھا۔

لیکن اچنبھے کی بات یہ تھی کہ اس سارے وقت میں اس نے ایک بار بھی کشمالہ کو توجہ سے نہیں دیکھا تھا دیکھنا تو دور کی بات اس کی موجودگی کا احساس بھی نہیں کیا تھا۔

کشمالہ کمال حیران کیوں نہ ہوتی اس نے تو آج تک ہر محفل اور ہر صاحبِ نظر سے اپنے پریوں والے حسن کی داد ہی وصول کی تھی کوئی اس کے بالوں پر مرتا تھا اور کوئی اس کی آنکھوں میں ڈوب مرنے کو تیار تھا کہیں اس کی آواز جادو جگاتی تھی اور کبھی اس کا چلنا قیامت ڈھا دیتا تھا۔ وہ سراپا غزل تھی۔

کسی شاعر کی رومان پرور محبوبہ کی طرح حسن کے سانچے میں ڈھلی ہوئی۔ شاہی محل کی دلربا شہزادی کی سی آن بان رکھنے والی۔

وہ خود تو ستائشی نظروں کی عادی تھی لیکن زندگی میں پہلی بار اپنی نظروں میں کسی کے لیے ستائش محسوس کر رہی تھی۔

ایک ایسے شخص کے لیے نگاہوں کا رخ موڑ رہی تھی جس کے ساتھ اس کا رشتہ بہت متنازعہ سا تھا۔

وہ راجہ طارق محمود کا بیٹا تھا۔ اور اس کی ماں کا نام شمائلہ کمال تھا، شمائلہ کمال جو اس کی طرح خوبصورت آواز اور دلکش لب و لہجے کی مالک تھی جس نے اپنی پوری زندگی آرٹ کے لیے وقف کر دی تھی۔ اس نے تھیٹر شوق کی خاطر کیا اور جب قلم تھاما تو ادب کی دنیا میں ہلچل مچا گئی بہت الگ تھی وہ۔

پتا نہیں کیوں چلی گئی۔

☆.....☆.....☆

دن کو کرنیں رات کو جگنو پکڑنے کا شوق
جانے کس منزل پر لے جائے گا یہ پاگل پن

وہ کوشش کے باوجود بھی اس شخص سے چھپ کر نہیں بیٹھ سکتی تھی جس کی آنکھوں میں اسے اپنا عکس کچھ اس خوبی کے ساتھ نظر آتا تھا کہ وہ چاہتے ہوئے بھی اس سے آنکھیں نہیں ملا سکتی تھی۔

عجیب زمانہ شناس آدمی تھا وہ.....

اس دن آفس میں امی کے سامنے زندگی کی اونچ نیچ یوں سمجھا رہا تھا جیسے وہ کوئی کم فہم بچی ہو۔

اس کی کوئی بات غلط نہیں تھی لیکن صوفیہ کے لیے ان کو ماننا خلاف طبع تھا۔

وہ اب زندگی اپنے ڈھنگ سے گزارنے کا سوچ چکی تھی اور اب اس میں کسی دوسرے کی مداخلت سے ترمیم کی گنجائش نہیں تھی۔ یہ ہی بہت تھا کہ وہ اس کی ساری باتیں سن کر خاموش ہو گئی تھی اور اس وقت بھی چپ کی مہر لگائے اسے یوں تک رہی تھی جیسے وہ کسی مورت سے مخاطب ہو۔

بے حس اور غیر متحرک مورت.....

''صوفیہ وہ لوگ زندگی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ جاتے ہیں جنہیں صرف دوسروں سے شکایتیں ہوتی ہیں.....

میں نے آپ کو ان چند مہینوں میں زندگی سے لڑتے بھی دیکھا ہے اور اب بہت زیادہ شکایت کرتے دیکھ رہا ہوں۔ مانا کہ ہمیشہ حالات ایک سے نہیں رہتے۔''

''کیا آپ میرے حالات کا مذاق اڑانے آئے ہیں یا یہ جاننے کے میں آپ سب کے بغیر کتنی اداس ہوں اور اگر ان دونوں باتوں کا جواب مل گیا ہو تو مجھے اکیلا چھوڑ دیں..... میں بالکل ٹھیک ہوں مجھے کہیں جانا ہی نہیں تھا اس لیے کمرہ بند کر کے آرام کر رہی تھی اب آپ آ گئے ہیں بے آرام کرنے تو..... سہہ رہی ہوں۔'' وہ مزید صوفے میں گھس کر بیٹھ گئی تھی اور ریموٹ سے ٹی وی آف کر کے اسے

ایک طرف پھینک دیا تھا۔ وہ ایک ہی سانس میں اتنا کچھ بول گئی تھی کہ شجاع کو اپنا سانس روک کر اسے سننا پڑا تھا۔

''ذرا جو اس لڑکی میں مروت اور مصلحت ہو.....'' وہ اس کے خفا خفا چہرے پر نظریں جمائے سوچ رہا تھا۔

''بہت آرام کر لیا آپ نے..... اب آپ جلدی سے تیار ہو جائیں..... مجھے ویسے بھی دیر ہو گئی ہے عامر کے فون پر فون آ رہے ہیں وہ لوگ رسم وغیرہ پر ہمارا ویٹ کر رہے ہیں۔ ویسے یہ رسم کیا چیز ہوتی ہے۔'' وہ اس کے سامنے سے کشن گھسیٹ کر ذرا فاصلے پر لے گیا اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا۔

''جی مجھے بہت سے کام کرنے ہیں آپ یہاں سے تشریف لے جائیں تو انہیں شروع کروں۔''

وہ آج بہت پُرسکون انداز میں دفاعی محاذ پر جمی ہوئی تھی ورنہ تو اسے خونخوار بلی کی طرح غرانا اور بوقت ضرورت پنجے مارنا بخوبی آتا تھا وہ اس کی شخصیت کے بہت سے رنگوں سے اختلاف رکھنے کے باوجود اپنے دل کو اس کے قریب آنے سے نہیں روک پا رہا تھا۔

وہ اس کے خیالوں خوابوں کی شہزادی بالکل نہیں تھی نہ ہی وہ تصوراتی پیکر سجا کر اپنی سوچوں کو خوشگوار بنانے کا قائل تھا۔

اس نے زندگی کو ہمیشہ اپنی عمر کے حصار سے باہر نکل کر دیکھا تھا وہ وقت سے دو قدم آگے چلنے کا قائل تھا۔

اپنے دل کو عقل کے تابع رکھنے کا ہنر اس نے اپنے باپ سے سیکھا تھا لیکن صوفیہ کو دیکھ کر اس کے دل و دماغ میں دھواں دھار قسم کا مذاکرہ چھڑ جاتا تھا۔

گو کہ ہار کوئی نہیں مانتا تھا اور لاحاصل بحث کے انجام پر شجاع کی پرشوخ نگاہیں اس کے چہرے پر جم جاتی تھیں جو نہ تو دوسروں کے لیے ہنستی تھی اور نہ ہی دوسروں کی پریشانی پر فکرمند ہوتی تھی۔

وہ کبھی کبھی اسے پرابلم چائلڈ لگتی تھی۔

اب اگر یہ خیالات صوفیہ تک منتقل ہو جاتے تو شجاع کی آخری رسومات یقینی تھیں۔

اور یقینی تو اس کا نہ جانا بھی تھا کیونکہ وہ اپنی جگہ پر یوں جم کر بیٹھی ہوئی تھی جیسے یہاں سے اٹھنے پر وہ اسے گود میں اٹھا کر۔ لے جائے گا۔

''آپ جاتے کیوں نہیں مجھے نہیں جانا مہندی و ہندی میں۔''

''لیکن مجھے تو آپ کے بغیر نہیں جانا مہندی و ہندی میں۔'' وہ اسی کے انداز میں بولا تو نہ چاہتے ہوئے بھی صوفیہ کے چہرے پر مدہم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''گڈ یہ ہوئی نا بات..... آپ کو پتا ہے جو آنکھیں ہوتی ہیں نا ان میں دل کی ہر بات اسکین ہو جاتی ہے آپ چھپ نہیں سکتے۔''

''آپ کیوں میرا دماغ خراب کر رہے ہیں۔'' وہ پھر سے اکھڑ گئی تھی۔

''آپ کیوں اپنا اور میرا ٹائم خراب کر رہی ہیں میں نے کہہ دیا آپ کے بغیر نہیں جانا تو پھر نہیں جانا..... آپ میری ضد سے واقف ہیں۔''

''تو ٹھیک ہے مت جائیں..... میری بلا سے۔''

''ٹھیک ہے نہیں جاتے..... آپ کے ساتھ اچھا وقت تو یہاں بھی گزر جائے گا۔''

وہ پاؤں پسار کر بیٹھ گیا تھا صوفیہ کی کوفت میں اضافہ ہو گیا تھا اس سے پہلے کے وہ اسے کمرے سے باہر نکالنے کی تدبیر کرتی شجاع کا موبائل بج اٹھا۔

دوسری طرف جانے کون تھا وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

''کب..... میں تو ابھی ان سے مل کر آیا ہوں۔'' اس نے پریشانی کے عالم میں کہا اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

صوفیہ جو اس کے ساتھ ہی کھڑی تھی اب ہونق ہو کر اس دروازے کو تک رہی تھی جہاں سے وہ باہر گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

یہ سچ ہے کہ زندگی میں وہ سب کچھ اس طرح نہیں ہوتا جس طرح ہم چاہ رہے ہوتے ہیں۔

اور ہم کب یہ چاہتے ہیں کہ تقدیر ہمیں حالات کے ستم سہنے کے لیے اکیلا چھوڑ دے اور خوش بختی کے سارے لمحے اندیشوں کی نظر ہو جائیں۔

راحت بیگم کی پوری زندگی بھی اندیشوں میں گزر گئی تھی۔

گھر بسایا تھا بڑی چاہ سے شوق سے.....

اور بڑے مان کے ساتھ اس کا ہر کونا سجایا تھا مگر ذرا حالات کی ستم ظریفی دیکھیے خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولتے ہوئے جانے کب اس کی ڈور ڈھیلی ہوئی اور وہ دھڑام سے نیچے زمین پر آ گریں۔

مٹی کچی تھی اندر چوٹ تو لگی مگر کسی کو نظر نہ آئی۔

لیکن آج تو نہ مٹی کچی تھی اور نہ ہی چوٹ ایسی جو کسی کو نظر نہ آتی۔

سب لوگ ان کے پورشن میں جمع تھے اور صوفیہ کسی مہارانی کی طرح سر اٹھائے کبھی ایک چہرے کو تکنے لگتی اور کبھی دوسرے کو.....

اس لمحے اسے دوسروں کے احساسات و جذبات کی بالکل پرواہ نہیں تھی۔

مسکن کے سارے مکین موجود تھے سوائے شجاع کے.....

اس نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا تھا یہ واحد شخص تھا جو اس کی خودسری کو اب چیلنج کرنے لگا تھا ورنہ کوئی اور اس کی زندگی کے فیصلوں کو ہاتھ میں لے ایسا آج تک ہوا نہیں تھا۔

اور یقیناً آج بھی سب کی بے بسی اس کی تسلی کا سامان بن رہی تھی۔

وہ اس گھر سے جا رہی تھی۔

اپنے چچا تایا کے گھر رہنے کے لیے جا رہی تھی۔

اس گھر میں رہنے جا رہی تھی جہاں بیس سال پہلے اس پر عرصہ دراز تنگ کر دیا گیا جہاں راحت بیگم نے شوہر سے دائمی جدائی کے بعد ایک ایک دن اس خوف میں گزرا تھا کہ ان دونوں کے پیار اور رفاقت کی نشانی صوفیہ کو کوئی چھین نہ لے۔

اس کو کوئی نقصان نہ پہنچائے۔

پتا نہیں کیوں انہیں سب کے چہروں پر ایک ہی تحریر نظر آتی تھی۔

"اب تمہارا اس گھر میں کیا کام۔ صوفیہ ہمارا خون ہے اور تم ایک غیر عورت..... تمہیں ندیم شاہ نے عزت بخشی تھی ورنہ ہم ذات کے اونچے لوگ نہ اپنی عورت کو باہر جانے دیتے ہیں اور نہ باہر کی عورت کو اپنے خاندان میں لا کر نسل خراب کرتے ہیں....."

ان کے ذہن میں ہر وقت اسی طرح کی باتیں گونجا کرتیں اور ان کا ہر گزرتا دن آزمائش سے بھرپور ہوتا۔

اور صبح اسی آزمائش کی گھڑی نے پھر ان کو توڑ کر رکھ دیا تھا وہ بس ساکت نگاہوں سے اپنی اکلوتی لاڈلی بیٹی کو دیکھ رہی تھیں جس کے خوبصورت گلابی ہونٹوں نے بڑی روانی میں یہ جملہ مکمل کیا تھا۔

"امی! اب میں یہاں نہیں رہنا چاہتی میں اب خود کو ان سیکیور فیل کرتی ہوں مجھے لگتا ہے میرا گھر وہ ہے۔

میرا فرسٹ بلڈ ریلیشن ان لوگوں کے ساتھ ہے وہ سب مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں وہاں پر میرا کمرہ بھی بہت اچھا ڈیکوریٹ ہوا ہے اور....."

اس نے گہری سانس لی۔

وہ دھماکے پر دھماکے کر رہی تھی اور راحت بیگم کی سماعتیں جواب دے گئی تھیں انہوں نے بے ساختہ اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے۔

''بس کرو.....بس.....''

صدمے نے ان کے لفظ چھین لیے تھے اور وہ صوفے پر ڈھے سی گئی تھیں۔

''امی.....اس میں غلط کیا ہے بابا کی ڈیتھ ہوئی تھی انہوں نے آپ کو ڈائی ورس تو نہیں کیا تھا جو آپ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یہاں آ گئیں اور زندگی بھر کا احسان لیا مجھے پتا ہے ماموں سب بہت اچھے ہیں مگر جو کام ان لوگوں کو کرنے چاہیے تھے وہ دراصل میرے تایا چچا کی ذمہ داری تھی آپ نے کبھی ان کو ذمہ داری کا احساس دلایا ہی نہیں۔''

انہیں لگا جیسے صوفیہ کے لہجے سے شعلے لپک رہے ہوں۔

یہ کون سی صوفیہ تھی۔

وہ معصوم سی گڑیا جس کی ہر ضد انہوں نے بغیر کسی تامل کے پوری کی۔

جس کا خیال رکھتے ہوئے وہ کبھی ندیم شاہ کی یادوں سے غافل نہیں ہوئیں۔

جس کی آنکھوں میں اول تو آنسو آنے بھی نہیں دیئے اور اگر آئے بھی تو انہیں اپنی پلکوں سے چُن لیا۔

''اے میرے اللہ.....میری صوفیہ.....کہاں کھو گئی.....یہ طوفان ہمیشہ میرے گھر کے راستے پر ہی کیوں چلا آتا ہے۔''

وہ بے تحاشا رونے لگی تھیں۔

انعم.....جو صوفیہ سے اپنی کوئی لڑائی کرنے آئی تھی یہ منظر دیکھ کر الٹے قدموں واپس بھاگی تھی۔

تھوڑی دیر میں پورا گھر ان کے پورشن میں جمع تھا اور صوفیہ کو متاسف نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''کیا تم نے کبھی یہ سوچا..... کہ تمہاری ماں یہاں کیوں آ گئی تھی یا پھر ہم اسے وہاں سے کیوں لے آئے۔'' بڑے ماموں نے رسان سے پوچھا۔

''میں نے سوچا اور مجھے یہ ہی سمجھ آیا کہ آپ لوگوں نے ٹھیک نہیں کیا۔'' اس نے ڈھٹائی سے کہتے ہوئے نظریں اوپر نہیں اٹھائی تھیں عائزہ کو تسلی ہوئی تھی گویا کچھ تو احساس کی رمق باقی تھی۔

''کیا اب تم ہمیں سمجھاؤ گی کہ ہم نے کیا ٹھیک نہیں کیا۔ کیا تم ان حالات کا اندازہ لگا سکتی ہو۔'' چھوٹے ماموں کے لہجے میں تلخی سمٹ آئی تھی۔

''دیکھیں ماموں جان ماضی کو چھوڑ دیں جو گزر گیا واپس نہیں آ سکتا لیکن جو گزر رہا ہے وہ تو بھرپور انداز میں گزارا جا سکتا ہے نا۔''

وہ بے حس ہو چکی تھی۔

''کیا مطلب ہے تمہیں کوئی کمی ہے یہاں پر کیا ہم نے کبھی تم میں اور عائزہ میں فرق کیا کیا تمہیں اپنے بچوں سے بڑھ کر پیار نہیں دیا۔''

ممانی جان کی آواز پھٹ سی گئی تھی انہیں اندازہ ہی نہیں تھا کہ صوفیہ اس قدر بدگمان بیٹھی ہے اور اسے یاد ہی نہیں کہ وہ ہمیشہ عائزہ، فائزہ اور انعم کے حصے کا پیار بھی سمیٹتی رہی ہے۔

''لیکن ممانی جان زندگی میں سب کچھ پیار ہی نہیں ہوتا۔ آپ کی شناخت بہت ضروری ہے۔'' اس نے حتمی انداز میں کہا اور سر ایک بار پھر جھکا لیا۔

پتا نہیں وہ اپنے فیصلے پر پشیمان تھی یا ان سب کے لیے پریشان تھی جو اس کو آج تک اپنی ذات کا حصہ سمجھتے رہے تھے۔

''کیا تم اپنے فیصلے میں ردو بدل کر سکتی ہو.....'' کسی نے نہ چاہتے ہوئے پوچھا تھا وہ آواز پہچانتی تھی اسی لیے سر اٹھا کر عامر کو دیکھنے لگی۔

''میں تو کبھی اپنے لیے کوئی فیصلہ نہیں کر سکی ردو بدل تو بعد کی بات ہے۔''

اس کی آواز مدہم ہو گئی تھی۔

''تو کیا تم مذاق کر رہی ہو..... یا ہم نے غلط سنا۔''

چھوٹے ماموں کے ماتھے کی شکنیں گہری ہو گئی تھیں ان کی صبح کا معمول تھا کہ وہ واک سے واپس آتے ہوئے راحت بیگم کے پاس جاتے صوفیہ کو جگاتے اس کے ماتھے پر بوسہ دیتے اگر سو رہی ہوتی تو کوئی معصوم سی شرارت کر کے اس کو جگاتے

کبھی پانی کی چند بوندیں آنکھوں میں ٹپکاتے۔

کبھی اس کے کان میں تنکا ڈال دیتے۔

کبھی اس کی ناک کھجانے لگتے اور کبھی اس کے بالوں میں گرہ لگاتے رہتے جب تک وہ جاگ نہیں جاتی اور ان سے لپٹ کر اپنے حصے کا پیار نہیں سمیٹ لیتی وہ اس کے پاس سے جاتے نہیں تھے۔

آج ان کی یہ معصوم پری ان کے مدمقابل کھڑی تھی اپنی زندگی کے بھیانک فیصلے کے ساتھ۔

اور ان سب سے اتنی بدگمان نظر آ رہی تھی کہ انہیں لگ رہا تھا جیسے یہ کوئی صوفیہ کی ہمشکل ہے کم از کم صوفیہ اتنی کٹھور اور بے حس نہیں ہو سکتی۔

لیکن سچ اور جھوٹ میں بڑا واضح فرق ہوتا ہے جو کبھی چھپتا نہیں۔

وہ صوفی ہی تھی۔

ان کی اپنی پیاری صوفیہ بے حسی اور اجنبیت کا حصار اتنا مضبوط کیسے ہو گیا؟

کب ہوا؟

یہ جاننا اب اتنا ضروری نہیں تھا اور جان بھی لیا جاتا تو کیا ہوتا کیونکہ فیصلہ تو ہو چکا تھا۔

وہ فیصلہ جو بائیس سال کی باشعور اور تعلیم یافتہ لڑکی نے کیا تھا۔

وہ فیصلہ جس نے ایک ماں کے اندیشوں کو حقیقت کا روپ دے دیا تھا۔

وہ سب اس کو روکتے بھی تو کیسے.....

دل پر گہری چوٹ سی لگی تھی اور سوچ ایک ہی نقطے پر آ کر ٹھہر سی گئی تھی.....

صوفیہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ تم اچھا نہیں کر رہی ہو۔

تمہیں کوئی حق نہیں کہ ہم سب کی بے لوث محبت کے ساتھ یہ تماشا کرو۔

تم ایک خود غرض اور اپنی ذات سے محبت کرنے والی لڑکی ہو۔

تمہیں آج اتنا بڑا فیصلہ کرتے ہوئے اپنی ماں کے آنسو نہیں نظر آ رہے تو ہمارے جذبات کی تمہیں کیا پرواہ ہوگی۔

تم ضرور جاؤ اپنوں کے پاس..... ایک دن بہت پچھتاؤ گی تب..... تب شاید ہمارے پاس کچھ نہ ہو تمہیں دینے کے لیے.....

ہمارے ہاتھ تو تم خالی کر کے جا رہی ہو..... تب شاید ہماری آنکھیں بھی اجنبیت کی عینک لگا لیں۔

کیسے رہ پاؤ گی ہم سب کے بنا..... اس مسکن کے بنا، اپنی ماں کے بنا، اپنے ادھورے خوابوں کے ساتھ..... کیسے خوش رہ پاؤ گی احمق لڑکی..... سوچنا..... ضرور سوچنا.....

وہ سب ایک ایک کر کے لاؤنج سے رخصت ہو گئے تھے

اور آخر میں بڑے ماموں بھی کھڑے ہو گئے تھے۔

''راحت سنبھالو خود کو صوفیہ کو جینے دو اپنی مرضی کی زندگی وہ تم سے ملتی رہے گی نا اور پھر آفس میں بھی تم دونوں کا ساتھ ہوگا اسے کل رخصت تو ہونا ہی تھا نا بیٹیاں کب ہمیشہ ہمارے پاس رہتی ہیں تم سمجھو۔ وہ آج رخصت ہو رہی ہے۔

مت زبردستی کرو۔'' وہ انہیں بازوؤں میں سمیٹ کر تسلی دیتے ہوئے اس کی طرف پلٹے تھے۔

''کوشش کرو۔ ماں کا دل اداس نہ ہو۔ اس کی رضا سے جاؤ۔ ہماری طرف سے کوئی پابندی نہیں۔'' وہ سپاٹ سے لہجے میں کہہ کر رخصت ہو گئے تھے اور صوفیہ نے ایک گہری سانس لے کر اپنا سر صوفے کی پشت پر گرا دیا تھا۔

پتا نہیں اس نے یہ سب کیوں کیا تھا اور اب جب کہ ہو گیا تھا تو دل جیسے کسی گہرے پاتال میں ڈوبا جا رہا تھا۔

وہ اچانک ہی زار و قطار رونے لگی تھی۔

☆.....☆.....☆

عاشر عباس نے کہا تھا اس لیے اسے بھی یاد رہ گیا تھا کہ دسمبر کی دھوپ ڈھونڈنے والوں کو اس موسم کی برسات بہت تنگ کرتی ہے۔ اس وقت تو اس کا دل چاہا تھا کہ پوچھے برسات ہر موسم کی تنگ کرتی ہے اور دسمبر کی دھوپ تو جسم و جاں میں توانائی بھر دیتی ہے۔ بھلا دونوں کا کیا مقابلہ۔

حالانکہ اسے تو ہر موسم کی برسات بہت پسند تھی اور وہ دل کھول کر موسم کی شرارتوں سے لطف اندوز ہوتی تھی مگر اس نئے شہر کا مزاج سمجھنے سے پہلے وہ موسموں کے ساتھ کسی قسم کی دوستی نہیں چاہتی تھی۔

موسموں سے دوستی کے مقابلے میں تو دل اس کے بس میں تھا لیکن عاشر عباس کو ایک بار پھر دیکھنے کی خواہش اتنی طاقتور تھی کہ وہ خود کو سرزنش بھی نہ کر سکی اور بھاگتی ہوئی ٹیرس پر آ گئی تھی۔

اسے اپنی بے چینی سے زیادہ وقت کے میل پر حیرت ہوتی تھی عاشر عباس برآمدے کی سیڑھیوں پر کھڑا نانو سے الوداعی ملاقات کر رہا تھا انہوں نے اس کے ماتھے پر بھرپور محبت کی مہر ثبت کی اس کے چہرے اور آنکھوں پر ہاتھ پھیرا شاید وہ کسی آیت کا ورد کر رہی تھیں ایک تو آسمان بادلوں سے اٹا ہوا تھا اور پھر صبح کا ملگجا سا اجالا۔

اسے براؤن منظر میں لپٹا ہوا عاشر عباس کا چہرہ واضح نظر نہیں آ رہا تھا البتہ اس کا اونچا لمبا سراپا جس

بے نیازی کے ساتھ روش عبور کر رہا تھا اس نے کشمالہ کے دھیان کے دروازے پر انوکھی سی دستک دی تھی۔

نئے شہر کے نئے موسموں سے لطف اندوز ہوتے اسے اپنے اندر تبدیلی کا یہ لمحہ عجیب سی بے چینی سے دوچار کر گیا تھا۔

اس کا دل چاہ رہا تھا یہ مغرور سا شخص دروازے سے باہر نکلتے ہوئے ایک بار پلٹے اور پھر اس کی نظریں پرواز کرتی ہوئی ٹیرس پر جا کر ٹھہر جائیں۔

اس کا دل چاہا وہ ایک بار پلٹے دیکھے تو سہی وہ کس کے خیالوں میں اپنی اجارہ داری چاہتا ہے اور پھر وقت نے یہ تماشا بھی کر دکھایا آہنی دروازے سے باہر نکلتے ہوئے وہ پلٹا تھا۔ اس نے نانو کو ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہا تھا اور اس سے اس کی نظریں بھٹک کر ٹیرس پر کھڑے ایک ہیولے پر جا رکیں۔

اسے حیرت سی ہوئی سر جھٹکا اور باہر نکل گیا وہ نانو کی نظروں سے تو اوجھل ہو گیا تھا مگر کشمالہ کی نظریں اب بھی اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔

ڈرائیور نے مستعدی سے دروازہ کھولا ڈرائیور سے کوئی بات کرتے ہوئے گاڑی کے اندر بیٹھ گیا تھا کشمالہ کو حیرت ہوئی تھی کہ اس غیر ارادی نظر کے بعد پھر کیوں نہیں مڑا تھا۔

وہ اتنی غیر اہم ہے یا وہ اتنا خود پرست ہے کہ اپنے آگے کسی کو گردانتا ہی نہیں اسے اس طرح کے واقعات پر غصہ کبھی نہیں آتا تھا۔ بلکہ اسے تو عادت تھی لوگ نظریں جمائے اس کے منتظر رہتے تھے اور وہ سر جھٹک کر گزر جاتی تھی اس نے بھی کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا کہ راہ شوق پر کون کیوں اداس بیٹھا ہے اور آج وہ لمحوں میں اس راہ شوق پر جا بیٹھی تھی اب دل جبکہ اسی کی طرف مائل تھا تو غصے کے جذبات نے غالب آ کر کشمالہ کمال کو آئینہ دکھانا شروع کر دیا تھا۔

کشمالہ! تم پر یہ حماقت کچھ سوٹ نہیں کرتی۔

تم جانتی ہو تم کیا ہو اور وہ کیا اور تم پہلی ہی نظر میں اسے ڈھونڈنے نکل پڑیں۔

دیکھو جب تلاش کے سفر پر نکلتے ہیں نا یا تو اپنا آپ گم کرنا پڑتا ہے یا پھر اپنی پہچان مٹا کر کوئی نیا روپ دھارنا پڑتا ہے۔

تم یہ دونوں کام نہیں کر سکتیں تمہیں اپنی ذات کا بھرپور ادراک ہے اپنی ذات کے ساتھ انصاف کرو گی تو کامیاب رہو گی یہ دل کی بے اختیاری قابلِ بھروسہ نہیں ہوتی بے لگام ہی کرتی ہے۔

اس کے اندر جنگ کا آغاز ہو چکا تھا اور صرف ایک ہی رات میں وہ کسی انجانے ان دیکھے میدان جنگ میں آن کھڑی ہوئی تھی اسے غصہ نہ آتا تو کیا ہوتا۔

☆.....☆.....☆

خولہ کو اسلام آباد اسٹوڈیو میں جا کر اندازہ ہوا تھا وہ اتنے اچھے کولیگز اور ان کی شرارتوں سے محروم تھی۔

آواز کی دنیا کے ساتھی اس کے اعزاز میں شاندار سی دعوت کا اہتمام کرنے کے ساتھ اب اس بات کا بھی مطالبہ کر رہے تھے کہ وہ نیو ائیر ٹرانسمیشن میں بھی حصہ لے گی۔

"لیکن میں صرف آرام کرنے آئی ہوں۔ میرا بالکل موڈ نہیں آن ائیر جانے کا اور نہ ہی میری کوئی تیاری ہے۔"

اس نے بہانہ تراشا۔

"خولہ تم کچھ بھی کہہ لو لیکن شام کو دو گھنٹے کے لیے تم آن ائیر جا رہی ہو۔"

سمیع نے فیصلہ سنایا تھا وہ پروگرام منیجر ہونے کے ساتھ ساتھ اور بھی کئی ذمہ داریاں سنبھالنے ہوئے تھا۔

خولہ نے رشک سے اس کے اعتماد اور آنکھوں کی پرعزم چمک کو دیکھا اسے اس طرح کے لوگوں کو ہمیشہ خراج تحسین پیش کرنے کا دل چاہتا تھا اور اپنے پروگراموں میں وہ اس طرح کے موضوعات پر بات کرتی رہتی تھی۔

سمیع ایک معذور انسان تھا ایک حادثے میں اس کی داہنی ٹانگ اور ہاتھ ضائع ہو گئے تھے۔ وہ مصنوعی ٹانگ اور ہاتھ کے ذریعے سے نارمل انسانوں کی طرح کرتا تھا۔

اسے چلنے میں دقت محسوس ہوتی تھی جس کے لیے وہ بیساکھی کا سہارا لیتا تھا اس لمحے اس کے چہرے پر لمحے بھر کے لیے احساس محرومی کے تاثرات ابھرتے بس چند لمحے گزرنے کے بعد وہ ہشاش بشاش سب کو اپنی پُر مزاح باتوں سے محظوظ کر رہا ہوتا اس کی بڑی بڑی براؤن آنکھوں میں محرومی کے چند پل بھی بہت بھاری محسوس ہوتے تھے خولہ کی اکثر اس سے فون پر بات ہوتی تھی پھر ای میل کا سلسلہ بھی تھا لیکن اس محرومی کا تذکرہ کبھی نہیں ہوا تھا تذکرہ آج بھی نہیں ہوا تھا بس وہ سرد موسم میں تکلیف زیادہ محسوس کر رہا تھا جو اس کے چہرے اور آنکھوں سے بھی عیاں تھی۔

جب اس نے خولہ سے پروگرام کرنے کی ریکویسٹ کی تو وہ موڈ نہ ہوتے ہوئے بھی اس کی خوشی کے لیے راضی ہو گئی تھی۔

''اوکے۔'' اس پروگرام کا فارمیٹ میری مرضی کا ہوگا۔

اس کا راضی ہونا ہی کافی تھا سمیع نے فوراً سر ہلا دیا تھا دراصل وہ اس نیٹ ورک پر سب سے زیادہ سنی جانے والی آر جے تھی اس کی غیر موجودگی میں جو گیپ آ رہا تھا اس کی وجہ سے لسنر شپ دوسری طرف بھی منتقل ہو سکتی تھی۔

سمیع نے اس ریڈیو چینل کی ترقی کے لیے آج تک جو بھی فیصلے کیے تھے ان کا رزلٹ ہمیشہ شاندار رہا تھا مینجمنٹ کبھی اس کے فیصلے چیلنج نہیں کرتی تھی اور وہ ان کے اعتماد پر ہمیشہ پورا اترتا تھا۔

خولہ کو اسلام آباد اسٹوڈیو سے آن ائیر لینے کا فیصلہ اتنا بڑا نہیں تھا لیکن تھوڑی سی دیر میں ان دونوں کے مخالفین خاصے پیدا ہو گئے تھے۔ پروفیشنل جیلسی کے ساتھ ثمرہ کا پرسنل بی ہیوئر بھی چینج ہو گیا تھا۔ وہ اسلام آباد سینٹر کی فیورٹ آواز تھی اس کا پروگرام انٹرٹینمنٹ سے بھرپور ہوتا وہ خود بھی ہلا گلا کرنے

والی شخصیت تھی اور پروگرام بھی اسی موڈ پر کرتی تھی۔

سمیع کو اس کے رویے سے خاصی تکلیف پہنچی تھی اسے ثمرہ اچھی لگتی تھی شاید دل کے کسی کونے میں اس کے لیے خاص قسم کے جذبات بھی محفوظ تھے جنہیں وہ عیاں کرنے سے ڈرتا تھا لیکن وہ ان احساسات کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا جو ثمرہ کی آنکھوں میں اسے اپنے لیے نظر آتے تھے اس کے باوجود ثمرہ کو محسوس ہوا تھا کہ وہ خولہ پر خصوصی توجہ دے رہا ہے۔

''یا میرے اللہ یہ لڑکیاں کتنی جلدی فیصلے سنا دیتی ہیں۔'' وہ اپنے چیمبر میں چھپ کر بیٹھ گیا تھا۔

وہ ثمرہ سے لڑنا چاہتا تھا مگر کس حق سے اس کا چہرہ بے نام سی وحشت کی لپیٹ میں تھا۔

کبھی کبھی اسے اپنی زندگی کی محرومی بہت تنگ کرتی تھی وہ آج تک اس محرومی کے ساتھ زندگی کے ہر میدان میں کامیاب ہوتا آیا تھا وہ کرکٹ نہیں کھیل سکا لیکن شطرنج کا چیمپئن تھا اس نے سائیکل نہیں چلائی لیکن وہ سوئمنگ کر لیتا تھا۔

مگر زندگی کے تقاضے تو اس سے کہیں زیادہ تھے۔

شطرنج کی بساط پر رکھے مہروں سے دل بہلانا الگ بات اور ایک جیتے جاگتے ہنستے کھیلتے نارمل انسان سے دل لگانا دوسری بات۔

یہ میری زندگی کا مسئلہ نہیں ہے۔

میری سوچ کو اس ایک جگہ پر ٹھہرنا نہیں ہے۔

مجھے آگے جانا ہے بہت آگے۔

مجھے مسائل ذات میں نہیں الجھنا۔

مجھے مثال بننا ہے ان سب کے لیے جو کسی کمی کو روگ بنا لیتے ہیں جو زندگی سے شکوہ کرتے ہوئے یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ جو انعام انہیں ملا ہے بہت سے لوگ تو اس سے یکسر محروم ہیں۔

وہ یکدم ہی خود سے لڑائی کا سلسلہ موقوف کر دیتا تھا۔

اس کے چہرے پر پھیلے کرب کے سائے جلد ہی معدوم بھی ہو جاتے وہ فیصلہ کر لیتا کہ ابھی اسے بہت سارے کام کرنے ہیں۔

وہ اپنے چیمبر سے نکلنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا جب خولہ آ گئی اور شاید اس کے پیچھے ثمرہ تھی جو خولہ کو دیکھ کر واپس پلٹ گئی تھی اسے افسوس تو ہوا تھا لیکن وہ بے کار کی سوچوں میں وقت ضائع کر کے اپنی قوت ارادی کو کمزور نہیں کر سکتا تھا۔

اور خولہ کہہ رہی تھی۔

''میں اپنے اس پروگرام میں سمیع صولت کو ٹریبیوٹ دینا چاہتی ہوں میں اس سے بات کرنا چاہتی ہوں اس کے بارے میں اس کی زندگی کے بارے میں۔ وہ کیا سوچتا ہے کیا چاہتا ہے خود کو کہاں دیکھتا ہے۔'' وہ مسکرائی بڑی معنی خیزی کے ساتھ۔

''میں نے آپ سے کہا تھا پروگرام کا فارمیٹ میری مرضی کا ہوگا اب آپ انکار نہیں کریں گے کیونکہ میں آن ائیر جا رہی ہوں اس کا پرومو آن ائیر جا چکا ہے۔''

کمال مسکراہٹ تھی اس کے چہرے پر سمیع صولت دوبارہ بیٹھ گیا۔ آواز کے ذریعے لوگوں کے دلوں میں گھر کرنے والی خولہ کمال کا اصل روپ اتنا دلکش تھا اسے اپنا کمرہ روشن لگ رہا تھا۔

''یہ ٹھیک نہیں ہے۔'' وہ شرمسار سا نظر آ رہا تھا۔

''یہ ایسا غلط بھی نہیں ہے ہم ہزاروں لوگوں کے انٹرویوز کرتے نظر آتے ہیں اور اپنے قریب رہنے والے آؤٹ اسٹینڈرڈ لوگوں کو بھول جاتے ہیں یہ جسٹس تو نہیں۔''

وہ بھی خولہ کمال تھی کہاں ہار مان سکتی تھی۔

''مجھے اوپر بات کرنا پڑے گی اس کی تو اجازت ضروری ہے۔''

''آپ ضرور کریں لیکن میں اجازت لے چکی ہوں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی سنہری بالوں کے گچھے نے گویا گردن پر جھولتے ہوئے تائید کی اور وہ بھی مسکرا دیا بہت دنوں بعد اس کے چہرے کی مسکراہٹ نے دل کی سرشاری کا ساتھ دیا تھا۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں اتنے طاقتور.....

''مجھے پتا ہوتا تم پہلا حملہ مجھ پر کرو گی..... میں کبھی تمہیں آفر نہ کرتا۔''

وہ جیسے اپنے آپ میں لوٹ آیا تھا نوجوان نسل کا پسندیدہ سمیع صولت.....

''اب تو ہوگئی نا آپ سے غلطی۔''

''میرے لسنرز مایوس ہو جائیں گے۔'' اس نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''یقیناً آپ کی لسنرز مایوس ہو جائیں گی لیکن سچ کے ساتھ دنیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنے آپ کو منوانا اور اپنی حیثیت تسلیم کروانا بہت ضروری ہے۔''

''تم نے پورا ارادہ کیا ہوا ہے۔'' وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا تھا۔

''میرا پورا ارادہ یہ ہے کہ لوگ سمیع صولت سے جھوٹی محبت نہ کریں اس سے سچا پیار کریں جو وہ ریزرو کرتا ہے۔''

''خولہ اٹس ٹو مچ۔'' وہ پریشان ہو گیا یکدم۔

''نو اٹس ریلٹی یو آر بریلینٹ، ڈیشنگ اینڈ اسپیشل۔''

''کون سا والا اسپیشل۔'' وہ اس کی نیلی آنکھوں کی چمک سے خوب محظوظ ہوا تھا۔

کس قدر شفاف تھیں اس کی آنکھیں دل کی ہر بات سامنے لے آئی تھیں۔

''کس کے لیے کون کتنا اسپیشل..... یہ تو اپنے اپنے وژن کی بات ہے۔''

خولہ کمال سمیع صولت کو پہچان کے ایک نئے مرحلے سے آشنا کر کے اسٹوڈیو کی طرف چل دی تھی۔

تھوڑی سی دیر کے بعد دونوں کی سحر انگیز آواز ہوا کے دوش پر محو سفر تھی اور خولہ اپنے مخصوص انداز

میں پروگرام کا آغاز کر رہی تھی۔

زندگی ہمیشہ ان لوگوں پر مہربان رہتی ہے جو زندگی کے ہر لمحے کو ہمت اور حوصلے کے ساتھ جیتے ہیں..... یہ سچ ہے کہ بزدل کے پاس کتنے ہی بڑے ہتھیار کیوں نہ ہوں اگر وہ انہیں استعمال کرنے کی صلاحیت اور حوصلہ نہیں رکھتا تو اس کا کوئی فائدہ نہیں لیکن بہادر آدمی بغیر کسی ہتھیار کے میدانِ جنگ میں ثابت قدم رہ کر اپنی اہمیت منوا سکتا ہے اور زندگی ان جیسے بہادر لوگوں کو ہمیشہ سلام کرتی ہے اور ہم سلام پیش کرتے ہیں.....

☆.....☆.....☆

اسے دھوپ بالکل اچھی نہیں لگتی تھی چاہے وہ سرما کی نرم گرم دھوپ ہو یا گرما کی لو پھینکتی تپش۔

وہ اس معاملے میں قدرے نازک مزاج بھی واقع ہوا تھا فوراً سن برن بھی ہو جاتا تھا لیکن اسلام آباد پہنچنے کے بعد اس نے اپنی زندگی میں سب سے زیادہ جس چیز کی کمی محسوس کی تھی وہ دھوپ تھی۔

اس کا دل چاہ رہا تھا کہ سارے کام چھوڑ چھاڑ کے دسمبر کی دھوپ کا مزا لے لے وہ بھی اپنے چھوٹے سے گھر کے آنگن میں بیٹھ کر۔

اس نے سامعہ سے فون پر بھی یہ عجیب و غریب سی فرمائش کی تھی۔

"سامی یہاں بہت سردی ہے سن کر دینے والی میرے تو ہاتھ پیر بھی سیدھے نہیں ہو رہے کام کیا خاک کروں گا ذرا سی دھوپ بھیج دے۔"

"کیوں وہاں پیسے لگتے ہیں دھوپ سینکنے کے۔" اس نے بھی حاضر جوابی کی خوب تربیت لی ہوئی تھی۔

"بالکل پیسے لگتے ہیں..... سورج بادشاہ کی اپنی مرضی ہے نکلے نہ نکلے کوئی نہیں پوچھنے والا اور ہم جیسے تو ہو جاتے ہیں خوار....."

وہ خاصا بے زار نظر آ رہا تھا۔

''آپ تو بالکل بورنگ ہیں مزا لیں اس موسم کا۔ آئسکریم کھائیں اور وہ جو مشہور مشہور سڑکیں ہیں ان پر ٹہلیں۔ شام کو ہوٹل کی لابی میں بیٹھ کر کافی پئیں..... ہائے میں ہوتی تو..... ایک کافی خولہ کے ساتھ بھی پی چکی ہوتی۔

آپ بھی نا..... سست زمانے بھر کے.....'' سامعہ نے اتنی روانی سے یہ سب کچھ کہا تھا کہ بہت ساری باتیں بغیر کسی وقفے کے اس کے سر کے اوپر سے گزر گئی تھیں۔

''تم پاگل ہوگئی ہو سامی۔ اور یہ جو تمہاری بہت زیادہ زبان چلنے لگی ہے نا۔ میں آ کر پوچھوں گا تم سے۔ پتا نہیں کیا کچھ پڑھتی رہتی ہو اور.....'' وہ سنجیدگی سے گویا ہوا۔

''اچھا نا..... اب یہ کوئی ایسی بھی غلط بات نہیں آپ خولہ سے ملیں نہ ملیں مجھے بتائیں نہ بتائیں آئی ڈونٹ مائنڈ۔''

وہ بے نیازی سے بولی اور خزیمہ نے فون بند کرنے کا ارادہ کرتے ہوئے اس کی پھر کلاس لے لی تھی۔

''تم سدھر جاؤ میں یہاں کام کرنے آیا ہوں تفریح کرنے نہیں اور بالفرض تفریح کر بھی لوں تو تمہیں بالکل نہیں بتاؤں گا۔ اماں کو بتا دینا میں بالکل ٹھیک ہوں اور بہت مصروف ہوں اللہ حافظ.....'' غصہ آواز سے بخوبی عیاں تھا سامعہ نے بمشکل اپنی مسکراہٹ روکی۔

اور اس نے فون رکھ کر گہرا سانس لیا تھا۔

''یہ سامعہ بھی بہت جلدی بڑی ہوگئی ہے۔ میڈیا نے بڑا ظالمانہ سلوک کیا ہے اس جنریشن کے ساتھ ہر طرف سے معلومات کی انتہا نے انہیں پہلے سوچو پھر بولو کی کامیاب حکمت عملی سے بھی دور کر دیا ہے پتا نہیں سوچوں کا یہ بے لگام دریا کہاں جا کر رکے گا۔'' وہ سامعہ کے انفرادی رویے جو ہمیشہ اجتماعی

تناظر میں دیکھتا تھا پتا نہیں کیوں اسے اپنا آپ سامعہ سے بہت دور جاتا محسوس ہوتا تھا۔

وہ سمجھ نہیں پاتا تھا کہ یہ کون سا جنریشن گیپ ہے اور اگر یہ بھی جنریشن گیپ ہے تو قصور کس کا ہے اور خسارے کا سودا کس نے کیا وہ اکثر ان سوچوں کے ساتھ بہت دور نکل جاتا تھا۔

وہ کوئی سوشل اسکالر نہیں تھا اور نہ ہی مستقبل قریب یا بعید میں اس کا ارادہ کوئی ایسی تنظیم جوائن کرنے کا تھا جو سوشل ریفارم کے لیے کام کر رہی ہو۔

لیکن ایک احساس ذہن آور تخلیقی صلاحیتوں کے درست استعمال کے ارادے پر کاربند رہنے کا عزم اس کے خیالات کی دنیا میں ہلچل مچایا کرتا تھا۔

وہ اس نسل کا نمائندہ نہیں بننا چاہتا تھا جو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ایک بے سمت زندگی گزار رہی ہے۔

ایک دھوپ سینکنے کی خواہش کی تھی مگر سامعہ کی تیز دھاری زبان نے خواہش کے ہی ٹکڑے کر دیے تھے وہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں آن کھڑا ہوا۔

شام ڈھل چکی تھی اور یوں محسوس ہو رہا تھا آدھی رات کا سماں ہو ایک تو سردی پھر اسلام آباد کے مکینوں کا مزاج سر شام گھر میں مقید ہو جانا۔

خزیمہ نے ایک ہی دن میں اس شہر سے جذباتی وابستگی کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔

آفس اسائنمنٹ بھی کم نہیں تھے اور وہ بھی مکمل احساس ذمہ داری کے ساتھ اس نے فوراً سے پیشتر اس خبر کی صداقت کے لیے اپنے ذرائع کا استعمال کیا تھا کے اسے واقعی اسلام آباد آفس ٹرانسفر کیا جا رہا ہے یہ خبر سو فیصد سچی نہ سہی لیکن اس میں جھوٹ کی آمیزش بھی بس گزارے لائق تھی۔

وہ ہرگز بھی یہاں رہنے کا رسک نہیں لینا چاہتا صبح سردی شام سردی اور دن میں بس کام یہ کوئی بات ہے بھلا۔

اس کی نظریں سیاہ تارکول کی تاریک سڑک پر جمی تھیں جہاں سے اکا دکا گاڑیوں کا گزر انسانی سرگرمیوں کے واقع ہونے کا ثبوت دے رہا تھا۔

''مجھے مینجمنٹ سے بات کرنی پڑے گی اگر وہ کوئی ایسا فیصلہ کرتے ہیں کہ میرا ٹرانسفر کر دیا جائے تو میں انہیں صاف بتا دوں گا۔ کہ میں یہاں نہیں رہ سکتا اگر آپ میری کارکردگی میں تسلسل چاہتے ہیں تو مجھے میری جگہ پر رہنے دیں۔''

وہ اپنے بچپن کے دوست ایاز سے مخاطب تھا ایاز نے صرف خیریت دریافت کرنے کے لیے فون کیا تھا اور خزیمہ دل کا بوجھ ہلکا کرنے بیٹھ گیا تھا۔

''پریشان کیوں ہوتا ہے وہ لوگ تیری مرضی کے خلاف ٹرانسفر تو نہیں کریں گے۔''

''میری مرضی پوچھیں تو تب نا تجھے پتا ہے نا مالکان کے مزاج کا آپ نہیں کر سکتے تو کوئی دوسرا آپ کی جگہ لے لے گا اور آج کل ایک اچھی نوکری ملنا کتنا مشکل ہے یہ تو جانتا ہے۔''

ایاز اور خزیمہ نے ایم بی اے امتیازی نمبروں سے پاس کیا تھا اس کے باوجود دونوں طویل انتظار کے بعد اس عہدے تک پہنچے تھے۔ اور اب اپنی کارکردگی کی بنا پر مسلسل آگے بڑھ رہے تھے حالانکہ آغاز میں دونوں کے ساتھ وہی ہوا تھا جو اس ملک کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو ایک باوقار ڈگری کے بعد سہنا پڑتا ہے۔

کہیں تجربہ مانگا جاتا ہے کہیں قابلیت کے ساتھ ذاتی مراسم کبھی سفارش رشوت دونوں ساتھ ساتھ۔

اور جب یہ سب چیزیں نہ ہوں تو پھر قسمت کی طاقت کے نتائج کا انتظار کیا جاتا ہے۔ اور قسمت وقت کے دائرے میں قید ہوتی ہے۔ اپنے مقررہ وقت کے بغیر فیصلہ نہیں کرتی۔

انہیں قسمت نے مایوس نہیں کیا تھا بلکہ خزیمہ تو ہمیشہ اپنی قسمت سے بہت مسرور رہتا تھا۔

خولہ کے معاملے میں بھی وہ اپنی قسمت کی مہربانی کے طفیل منزل کے قریب نہ سہی لیکن ان راستوں پر ضرور کھڑا تھا جو ذرا سی محنت اور تلاش کے بعد منزل کیطرف لے جا سکتے تھے۔ ارے منزل تو۔

اس نئے صدمے میں الجھ کر وہ انی تلاش کو بھول ہی گیا تھا۔اس نے جلدی سے ایاز کو خدا حافظ کہا اور کمپیوٹر کی طرف مڑ گیا اس میل باکس میں تو جیسے اس کی خوشیاں قید تھیں۔

وہ قدرے مطمئن سے انداز میں خوشیوں کی تتلیوں کے تعاقب میں اپنے دماغ کو مصروف کرنے لگا تھا۔

☆.....☆.....☆

سمیع صولت اور خولہ کمال پرائم ٹائم میں آن ایئر گئے تھے گو کہ پروگرام کے فارمیٹ کے مطابق سمیع کا انٹرویو لیا جانا تھا لیکن تھوڑی سی گپ شپ کے بعد یہ کمبائن پروگرام ہو گیا تھا جسے سننے والوں نے انھوائے کرتے ہوئے خوب کالز کی تھیں۔

خولہ کے لیے یہ تجربہ نیا تھا وہ لائیو کالز ریسیو نہیں کر سکتی تھی اس کے لسنرز ای میل یا ایس ایم ایس کے ذریعے اس کے ساتھ رابطے میں رہتے تھے اور آج ان سب نے اس رعایت کا خوب فائدہ اٹھایا تھا سامعہ نے بھی اتفاقاً ریڈیو ٹیون کیا تھا اور جب خولہ کمال کی آواز سماعتوں سے ٹکرائی تو اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔

''یہ بھیا بھی مجھے بے کار سمجھتے ہیں ابھی فون کرتی ہوں میں نے کہا تھا نا کہ وہ اسلام آباد سے پروگرام کرے گی۔'' سامعہ بڑبڑاتے ہوئے فون کارنر کی طرف چل پڑی۔امی نے مشکوک نظروں سے اس کے چہرے پر آنے والے تاثرات کا جائزہ لیا۔ایف ایم تو پاگل کر دینے والی دنیا ہے۔

''سامی! تم ریڈیو سنتے ہوئے خود بھی بولنے لگتی ہو یہ کیا پاگل پن ہے۔'' انہوں نے چشمہ ماتھے سے آنکھوں پر ٹکاتے ہوئے قدرے غصے سے کہا۔

''امی میں اپنے فیورٹ آر جے کو ایک ساتھ سن کر ذرا زیادہ ہی ایکسائیٹڈ ہو گئی تھی آپ کو پتا ہے ان دونوں کا پروگرام بہت ہی دلچسپ ہوتا ہے۔کام کی باتیں زیادہ کرتے ہیں۔'' وہ نمبر ڈائل کرتے ہوئے وضاحت کر رہی تھی۔

دھیان خولہ کمال کی آواز کی طرف تھا جو مکمل طریقے سے سنائی نہیں دے رہی تھی لیکن اتنا ضرور اندازہ ہو رہا تھا کسی سنجیدہ موضوع پر ہی بات ہو رہی ہے۔

''کیا دلچسپ ہوتا ہے سوائے گانوں کے اور بھی کچھ ہوتا ہے اس ریڈیو میں۔'' انہوں نے مٹر چھیلتے ہوئے تبصرہ کیا ایک طرف سامعہ کی آواز دوسری طرف اس کے پسندیدہ آر جے کی آواز کانوں میں پڑ رہی تھی اس لیے مٹر چھیلنے کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔

''سامی بہت سارے مٹر چھیلنے ہیں آ کر تم بھی ہاتھ بٹا لو۔ میں بیٹھے بیٹھے تھک گئی ہوں۔ اب تم فون گود میں رکھ کر بیٹھ جاؤ گی کس کو کرنا ہے۔ یہ فارغ لوگوں کے کام ہوتے ہیں ریڈیو والوں کو فون کرنے سے کیا حاصل بھلا۔''

بہت سارا غصہ ایک جگہ جمع ہو گیا تھا اس لیے آج ریڈیو والوں کی شامت لازمی تھی۔

''امی! میں بھیا سے بات کر رہی ہوں۔ آپ اپنا ہیڈ سیٹ آن کر لیں مجھے ابھی مٹر چھیلنے ہیں مصیبت اور پروگرام بھی سننا ہے۔''

اس نے جلدی سے کہہ کر فون بھی بند کر دیا تھا اور خزیمہ اپنے موبائل کو یوں تک رہا تھا جیسے خولہ کمال کا چہرہ موبائل اسکرین پر روشن ہو رہا ہو۔

اس کے ذہن نے ابھی تک خولہ کمال کا کوئی خاکہ نہیں بنایا تھا سوائے اس کے کہ خولہ اسے ہنس مکھ مگر سنجیدہ سی لڑکی محسوس ہوتی تھی۔

اور جب اس نے ہیڈ سیٹ لگا کر اپنے مطلوبہ فریکوئنسی کو ٹیون کیا تو خولہ کمال کی آواز کے جلترنگ اس کی سماعتوں میں انوکھا سا ساز بکھیرنے لگے تھے وہ اپنے مخصوص لب و لہجے میں مخاطب تھی۔

رستہ بھی کٹھن دھوپ میں شدت بھی بہت تھی
سائے سے مگر اس کو محبت بھی بہت تھی
خیمے نہ کوئی میرے مسافر کے جلائے
زخمی تھے بہت پاؤں مسافت بھی بہت تھی
کچھ تو تیرے موسم ہی مجھے راس کم آئے
اور کچھ میری مٹی میں بغاوت بہت تھی
خوش آئے تھے شہر منافق کی امیری
ہم لوگوں کو سچ کہنے کی عادت بھی بہت تھی

''اور لسنرز جب سچ کہنے کا حوصلہ رکھتے ہیں تو ہار یا جیت کی پرواہ کیے بغیر اپنے سچ کا ردعمل جاننے کا حوصلہ بھی ہونا چاہیے زندگی اگر سچ کی عملی تعبیر ہو تو تکمیل کا احساس ہر ادھورے پن پر غالب آجاتا ہے۔
سچ کا آئینہ شفاف ہوتا ہے اس کی خوبصورتی دیکھنے کے لیے ہمیں بعض اوقات ایسے لوگوں سے ملنا پڑتا ہے جو بظاہر ادھورے مگر اپنی ذات میں بہت مکمل ہوتے ہیں۔
اور لسنرز آپ کو پتا ہے ذات کی تکمیل کب ہوتی ہے کون لوگ اس اعزاز کے مستحق ہوتے ہیں شاید سمیع صولت جیسے اور ہو سکتا ہے بہت سے مکمل لوگ بھی سمیع صولت جیسی تکمیل سے آشنا نہ ہوں۔''

☆.....☆.....☆

نانو کا پیلس نما گھر بھول بھلیاں بھی تھا وہ کبھی ایک کونے سے اندر جاتی اور کبھی دوسرے کونے سے باہر نکلنے کی جستجو میں وہیں آکر رک جاتی جہاں سے چلی تھی اس کوشش میں البتہ اس نے اپنی پسند کی دنیا دریافت کر لی تھی اوپر والے پورشن میں لائبریری نما اسٹڈی روم اسے حیرت کی دنیا میں لے گیا تھا۔

وہ بھاگتی ہوئی ان کے پاس آئی تھی۔

''نانو! یہ اتنا بڑا اسٹڈی روم اور اتنی ڈھیر ساری کتابیں کس کی ہیں کیا آپ پڑھتی ہیں۔''

وہ کچن میں گاجر کا حلوہ اپنی موجودگی میں تیار کروا رہی تھیں کشمالہ کی بے چینی پر کفگیر ایک طرف رکھ کر اس کی طرف مڑ گئیں شاید تیز چلنے کی وجہ سے اس کی شفاف جلد پر سرخی ابھر آئی تھی یا پھر وہ کتابوں کی اتنی دیوانی تھی کہ خوشی سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی۔

''پہلے یہ کمرہ تمہارے نانا کے تصرف میں تھا ان کی زندگی میں مجھے بھی بہت شوق تھا اور میں بھی فارغ وقت کتابیں پڑھ کر ہی گزارا کرتی تھی اب تو نظر کمزور ہو گئی ہے۔ بڑھاپا اجازت نہیں دیتا سر بوجھل ہونے لگتا ہے ورنہ دل تو بہت چاہتا ہے۔

طارق بھی موڈ میں ہوتا تو اس کمرے کا رخ کرتا البتہ شمائلہ نے تو اپنی زندگی کے زیادہ دن ان کتابوں کے ساتھ اور بہت تھوڑے دن ہم سب کے ساتھ گزارے۔

وہ اپنے باپ کی طرح دیوانی تھی۔ ہر طرح کی کتاب پڑھتی اور پھر دونوں باپ بیٹی بحث کرنے بیٹھ جاتے۔ ایک زمانے میں، میں نے دونوں پر پابندی لگا دی تھی کہ وہ فلسفہ، مذہب اور تاریخ نہیں پڑھیں گے۔

پہلے پڑھتے اور پھر ایک دوسرے کے ساتھ الجھے رہتے مجھے تو لگتا تھا اس طرح کے مباحثے دونوں کے درمیان احترام کو ختم کر رہے ہیں..... بلا وجہ کی تنقید..... بے سبب ادبی بحثیں.....

آج تو یوں لگتا ہے جیسے کبھی ان خاموش کمروں میں کوئی رہا ہی نہیں نہ کوئی بولتا ہے اور نہ کوئی سننے والا۔

پہلے تو یہ دیواریں بھی کان لگائے رہتی تھیں اب تو یہ بھی بے حس ہو گئی ہیں سماعت سے محروم۔''

وہ ایک ہی رو میں بولتے بولتے یکدم چپ ہو گئی تھیں ان کے چہرے پر چند لمحے پہلے جو تاثرات تھے وہ وقت کی خود رو نشانیوں کو گہرا کر گئے تھے۔ ان کا بڑھاپے کی دانائی سے سجا چہرہ کسی گہری

سوچ میں ڈوب گیا تھا۔

پتا نہیں وہ رونا کیوں نہیں چاہتی تھی حالانکہ اس کی آنکھیں پانی پانی ہو رہی تھیں اور ڈھیر سارا نمکین پانی انہوں نے اپنے اندر اتار لیا تھا۔

''نانو! آپ کو نانا یاد آ رہے ہیں یا شمائلہ۔''

وہ انسانی نفسیات کے ہر پہلو پر نظر رکھتی تھی وہ جانتی تھی نانو کے لیے اس وقت کون سا موضوع ان کے کرب کو کم کر سکتا ہے ان کے درد کو مدہم کر سکتا ہے۔

''پتا ہے مالا بچے! جو لوگ قبر کی تاریکی میں اتر جائیں ان کی یادوں کا سورج کبھی غروب نہیں ہوتا ان کے ہجر کا چاند ٹھنڈی میٹھی روشنی دیتا رہتا ہے تمہارے نانا تو زندگی ہار گئے بھلا موت سے ہماری کیسی رقابت لیکن جو لوگ زندگی میں ہمیں ہارنے پر مجبور کر دیں ان سے رسماً بھی یادوں کا رشتہ رکھنے کا دل نہیں چاہتا۔''

''نانو! یہ سب ہمارے اپنے بس میں کہاں ہوتا ہے۔ یاد کا موسم ہم سے پوچھ کر تو نہیں آتا نا اور نہ ہی ہم رشتوں سے بدگمان ہونے کا جشن یہ سوچ کر منا سکتے ہیں کہ اب ان سے ہم نے کوئی واسطہ نہیں رکھنا۔ وہ لمحوں میں ان کے اندر اتر گئی تھی۔'' انہوں نے بے ساختہ اسے اپنے ساتھ لپٹا کر ماتھا چوم لیا تھا۔

یہ جس ماں کی بھی بیٹی تھی مگر اس لمحے انہیں اپنے جگر کا ٹکڑا محسوس ہوئی۔ حساس، بامروت اور چہرہ شناس۔

''نانو! شمائلہ آج کل کہاں ہیں۔'' اس نے دھیرے سے پوچھا۔

''پتا نہیں چند مہینے پہلے اس نے ڈھاکہ یا نیپال سے فون کیا تھا۔ وہ سارک کے سلسلے کا کوئی پروگرام اٹینڈ کرنے گئی تھی۔''

''نانو! آپ کو پتا ہے وہ پرفارمنگ آرٹ کی دنیا کا بہت بڑا نام ہیں۔ آرٹ اینڈ تھیٹر کے

اسٹوڈنٹ انہیں اپنی آئیڈیل کہتے ہیں وہ بہت بڑے فنکاروں کے ساتھ پورے قد سے کھڑی ہوں تو ان سے نظر نہ ہٹے۔" اس نے عقیدت سے کہا۔

"کیا فائدہ ایسے قد کا جو زمین پر دیکھنے کے لیے تکبر کے جذبات میں الجھا دے۔ ایسی نظر جس کام کی جو بے کیف مسکراہٹوں سے لبریز ہو۔ یہ لمحے بھر کی شناسائی کا رشتہ ہے۔

اور جب آنکھیں خواب سے جاگتی ہیں تو پھر کوئی منظر جچتا نہیں..... پتا ہے مالا..... کبھی کبھی ہمارے چاروں طرف سمندر ہوتا ہے اور ہمارے پاس پینے کو قطرہ نہیں ہوتا۔ یہ محبت، یہ شہرت، یہ بہت بڑا نام سمندر کی کڑواہٹ سے زیادہ کچھ نہیں۔" وہ جانے انجانے میں اس کے ارادوں کو متزلزل کرنے کی سعی کر گئی تھیں۔ اس کے اندر وہ کیسے اتر گئی تھیں اسے بھی حیرت ہوئی تھی۔ اسے بھی یہ دنیا بہت پسند تھی۔

اپنے آپ کو ہر روپ میں دیکھنے کی چاہ..... کب مشن بن جاتی ہے کسی مقصد کا روپ دھار لیتی ہے شروع میں بالکل اندازہ نہیں ہوتا۔

☆.....☆.....☆

ایک صوفیہ کے جانے سے مسکن کی زندگی میں اتنا ٹھہراؤ آ جائے گا اور سب لوگ اپنے اپنے معمولات میں مصروف ایک دوسرے سے بے گانہ نظر آنے لگیں گے..... شجاع کے لیے اس غیر معمولی یکجہتی کے مظاہرے میں سوائے الجھن اور ڈپریشن کے کچھ نہیں تھا۔

کیا مسکن کی گہما گہمی صوفیہ کی وجہ سے تھی؟

کیا سب لوگ اس کے لیے ہنسا کرتے تھے شرارت کرتے تھے کہ صوفیہ خوش رہتی تھی۔

وہ باری باری سب کے چہرے دیکھتا اور بے زار سا باہر نکل جاتا۔

"صوفیہ تم اس قابل ہی نہیں ہو کہ تمہیں چاہا جائے۔ تمہیں وہ پیار دیا جائے جو رشتوں جو باندھے رکھتا ہے۔ تمہیں اپنے اس دل میں جگہ دی جائے جہاں کا ہر رستہ اپنی دلربا کا منتظر ہے۔ نہیں

صوفیہ.....تم صرف سزا کی مستحق ہو.....تم اپنی ماں کی مجرم ہو.....تم ان سب کی محبتوں کی مجرم ہو.....
تمہارا بھلا میری محبت پر کیا حق.....''

وہ خزاں آلودہ درختوں کی قطار کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پتوں کو بڑے انہماک سے روندنے میں مصروف تھا۔

اس طرح بے بسی اور ناکامی کا احتجاج کرنا اس کی سرشت نہیں تھی۔ وہ آخر وقت تک جنگ لڑ کر ہارنے والوں کو بہت پسند کرتا تھا اور خود بھی اس کی تقلید کرنے کی کوشش کرتا تھا لیکن صوفیہ کے معاملے میں اس کی فطرت نے بغاوت کا آغاز کر دیا تھا۔

وہ اس کی مزاج آشنا نہیں تھی مگر اچھی لگنے لگی تھی۔

وہ اس کے خوبصورت چہرے کو اس دل سے ہم آہنگ کرنا چاہتا تھا جو ہر وقت زمانے بھر کی بد گمانی سے اٹا رہتا تھا۔ وہ اسے بے تحاشا پیار کرنا چاہتا تھا۔ کم کرنا چاہتا تھا اس کی تشفی کو جو اس کی شخصیت کے ادھورے پن کی وجہ بن رہی تھی۔

اس کی کوئی بات بھی پوری نہیں ہوئی تھی اور وہ چلی گئی تھی۔

اس دن جب وہ اپنے دوست کے گھر سے لوٹا تو مسکن کا غیر معمولی سناٹا چند ہی لمحوں میں اسے محسوس ہو گیا تھا لیکن اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کا سبب صوفیہ کی ہنگامی روانگی ہو گا۔

عامر نے عجیب سی نظروں کے ساتھ اسے دیکھا اور پھر دھیمے لہجے میں مختصر اطلاع دے کر خاموش ہو گیا۔

''صوفیہ اپنے گھر چلی گئی۔''

''واٹ.....صوفیہ کا کون سا گھر ہے۔'' وہ اچھل ہی تو پڑا لڑکیوں کا اپنا گھر تو ان کا سسرال ہوتا ہے۔ ایک دن میں سسرال جانا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا۔ وہ صرف ایک ہی دن تو اپنے دوست کے گھر ٹھہرا تھا۔ اس کی والدہ کی دیکھ بھال کے لیے۔

''صوفیہ اپنے پاپا کے گھر چلی گئی..... آئی مین وہ اب یہاں نہیں رہنا چاہتی۔ اسے اپنے تایا یا پھر چچا کے پاس رہنا ہوگا۔ اب یہ معلوم نہیں۔''

انعم نے اخبار کے صفحے سے نظریں اٹھا کر نارمل لہجے میں بتایا اور شجاع مارے صدمے کے پورا کا پورا ان کی طرف مُڑ گیا۔

عائزہ..... فائزہ..... محسن..... انعم اور عامر..... سب ہی اپنے مخصوص وقت میں اس مشترکہ ہال میں جمع تھے۔ ان کی موجودگی میں اتنا سناٹا بلکہ تکلیف دہ خاموشی آج کے دن کی سب سے بڑی خبر تھی۔ اور اس کے پس منظر میں جا کر مزید کیا انکشاف ہونے تھے شجاع نے فوری طور پر خود کو ایک نئے دھماکے کے لیے تیار کیا تھا گو کہ پہلے دھماکے نے سماعتوں کو کدی قابل نہیں چھوڑا تھا۔

''تم لوگوں نے اسے جانے دیا۔ تم سب لوگ چپ چاپ اسے جاتا دیکھتے رہے۔'' اس نے انہیں لتاڑا۔

''ہم سب اس لیے اس کو جاتا دیکھتے رہے کہ اس نے جس طرح ہماری محبتوں کا مذاق اڑایا وہ بتانے کے لائق نہیں۔'' فائزہ روہانسی ہو رہی تھی۔

''کیا مطلب۔ کیا کہہ کر وہ محترمہ چلتی بنیں۔''

''کیا کہہ کر خود نہیں چلتی بنیں گھر کا ڈرائیور سامان سمیت اسے اس کی منزل تک چھوڑ آیا۔'' عامر بہت زیادہ ڈپریس تھا۔

''وہ تو پاگل ہے کیا گھر والے بھی اس کے ساتھ.....'' وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

''پاگلوں کو بھی اتنی سمجھ ہوتی ہے کہ دل کیسے ٹوٹ جایا کرتے ہیں۔'' عائزہ کی آواز میں بھی آج وہ توانائی نہیں تھی۔

''یا اللہ! یہ ایک دن میں.....'' اس نے سر اٹھایا تو آنکھیں بے پناہ سرخ ہو رہی تھیں۔ انعم

گہرے افسوس میں گھر گئی۔

''صوفیہ تم نے کیا کچھ کھو یا تمہیں احساس ہی نہیں۔تم بہت پچھتاؤ گی۔'' وہ اس میٹھے سے درد سے کسی قدر آشنا تھی۔اسی لیے سب سے زیادہ شجاع کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

''آپ اس سے بات کریں وہ ضدی ہے۔احمق ہے۔''

''میں اس ضدی اور احمق سے اس لیے بات نہیں کروں گا کہ اسے رشتوں کی الف ب معلوم نہیں اور چلی ہیں نئے رشتے بنانے اور انہیں نبھانے۔میں نہیں سمجھتا کہ ہمیں اس کی کمی کا سوگ منانا چاہیے۔''

اس وقت تو اس نے بڑی ہٹ دھرمی کے ساتھ کہہ دیا تھا اور آج وہ پھر سوگ منانے اس باغ میں چلا آیا تھا جو آج کل خزاؤں کی زد میں تھا۔راستوں کے گلاب جانے کہاں کھو گئے تھے اور ہر سو کھا پتا اپنی کم مائیگی پر سراپا احتجاج تھا۔

ہم عجیب طرز کے لوگ تھے، ہمارے اور ہی روگ تھے
میں خزاں میں اس کا منتظر اسے انتظار بہار تھا
میری لمحہ بھر کی گفتگو کبھی اس کے ساتھ نہ ہو سکی
مجھے فرصتیں نہ مل سکیں وہ ہوا کی رتھ پہ سوار تھا

اسے گئے ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے مگر شجاع کمال کو یہ دنوں کا سفر سالوں پر محیط لگ رہا تھا۔اسے بالکل اندازہ نہیں تھا۔وہ دل لگی کرتے کرتے اس حد تک دل کو لگا بیٹھا تھا کہ اب اس کی دوری کسی تیز دھار آلے کی طرح کاٹ رہی تھی۔

اسے تو اب پتا چلا تھا کہ محبت کا آفتاب طلوع ہوئے زمانہ بیت چکا اب تو اس کی روپہلی کرنوں کی تپش نے جسم سے روح تک کا سفر شروع کر دیا تھا۔ایک لامتناہی سفر۔

یہ سچ ہی تو ہے زندگی دور آسمان کے سینے پر سفر نہیں کرتی۔ یہ تو ان جوان دلوں میں دھڑکن بن کر رہتی ہے جو محبت کا ساز چھیڑ دیں تو کائنات جھومنے لگتی ہے۔ گنگنانے مسکرانے لگتی ہے۔

☆.....☆.....☆

وہ پہلی بار جب ہم ملے
ہو گئے شروع یہ سلسلے

وہ اپنے ہی پروگرام کا ٹریک گنگناتے ہوئے کنٹرول روم سے باہر آئی تھی تب ہی عالیہ احمر نے اسے آواز دے کر روک لیا تھا۔

''خولہ کمال! آپ کا فون ہے۔''

''میرا فون..... یہاں پر کس کا ہو سکتا ہے۔'' اسے ذرا حیرت ہوئی تھی اور ریسیور کان سے لگانے کے بعد جو اجنبی اس سے مخاطب تھا اس نے حیرت کا سلسلہ دراز کر دیا تھا..... یہ تو اس کا وہ کریزی لسنر تھا خزیمہ عادل۔

''خولہ! یہ میرے دل و دماغ کا مشترکہ فیصلہ تھا۔ ان فیکٹ میں کافی دیر تک خود سے لڑتا رہا اور پھر جیت گیا نادان دل.....''

وہ کس قدر پر اعتماد اور مضبوط لہجے میں بات کر رہا تھا۔ خولہ کے لیے اس طرح کا انداز تخاطب گویا وہ اس کے بچپن کا دوست ہو جو چند سال پہلے بچھڑ گیا تھا۔

''مسٹر خزیمہ! آپ اگر دل نادان کو سمجھا لیتے تو بہت اچھا ہوتا خواہ مخواہ اپنا اور میرا وقت ضائع کیا۔'' وہ جل کر بولی تھی۔

''اب تو ہو گیا نا..... آگے بات کر لیں۔'' اس کی مسکراہٹ اگر وہ دیکھ لیتی تو اپنا اعتماد بھول جاتی جبکہ چند لمحوں کی خاموشی نے خزیمہ کے اعتماد میں کئی گنا اضافہ کر دیا تھا۔

''مسٹر خزیمہ! میں یہ تو نہیں کہوں گی کہ آپ نے میرا نمبر کیوں ڈائل کیا اور مجھ سے بات کرنے کی کوشش کیوں کی لیکن اب کر لی تو، آئندہ مت کیجیے گا۔ میں اس طرح کے رابطوں کی قائل نہیں۔''

وہ اپنے بات مکمل کر کے فون بند کرنا چاہتی تھی کہ اس نے حاضر جوابی کا ثبوت دیتے ہوئے پھر خولہ کی توجہ حاصل کر لی تھی۔

''خولہ.....! میں بھی بے مقصد رابطوں کا قائل نہیں۔ مجھے آپ سے بات اس لیے نہیں کرنا تھی کہ میں آپ کی آواز براہ راست سننا چاہتا ہوں۔ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ آپ کی آواز نے مجھے آپ کے عشق میں مبتلا کر دیا ہے لیکن میں اتنا ضرور کہتا ہوں کہ اگر میں یونہی آپ کے خیالات اور آپ کی آواز سے مستفیض ہوتا رہا تو ایک دن آپ کے عشق میں حد سے گزر جاؤں گا۔'' وہ اچھی خاصی بات کرتے ہوئے یکدم پٹری سے اتر گیا تھا۔ خولہ نے فون حقیقتاً پٹخ دیا تھا۔

''کیا ہوا..... خیریت ہے.....'' عالیہ احمر کے لیے اس طرح کا ردعمل نیا نہیں تھا۔ وہ اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ مغرب میں پلی ہوئی یہ مشرقی لڑکی خود آگاہ بھی تھی اور اپنے وقار کی حفاظت کرنا بھی جانتی تھی۔

''ڈونٹ وری۔ ایسا ہوگا تمہارے لسنرز کو پتا چل گیا ہے کہ اب تم یہاں پر ہو۔''

''یار کوئی پرائیویسی بھی تو ہوتی ہے اب ہر کوئی منہ اٹھائے داستانِ امیر حمزہ سنانے بیٹھ جاتا ہے اور میں تو بالکل حادی نہیں ہوں ان تماشوں کی۔''

''خولہ! ایک بات تو بتاؤ تم اس قدر با محاورہ اردو کیسے بول لیتی ہو۔''

''میری مما اور پاپا کی کوشش تھی کہ ہم زبان کے معاملے میں پرفیکٹ ہوں میں صرف اردو ہی نہیں اور بھی کئی زبانیں اسی روانی سے بول لیتی ہوں۔ بس مما بہت کانشس رہتی تھیں وہ خود پی ایچ ڈی تھیں لسانیات میں۔''

''ونڈرفل اور تمہارے پاپا۔''

''میرے پاپا کا بس ایک ہی شوق ہے دنیا جہاں کی کتابیں اپنے اسٹڈی روم میں جمع کرنا پھر پڑھنا اور ہم دونوں سے ان پر تبصرہ کرنا۔''

''ہم دونوں.....یعنی تم اور تمہاری مما.....''

''نہیں میں اور مالا.....مما اب ہم میں نہیں۔انہیں کینسر ہم سے ہمیشہ کے لیے دور لے گیا۔''

اس کی نیلگوں آنکھوں میں افسردگی کے رنگ پھیل گئے تھے۔

''اوہ.....ویری سوری.....یو آر لکی.....تم نے اتنے ذہین ماں باپ کے ساتھ زندگی کو برتنا سیکھا۔''

''یس آئی ایم.....لیکن کبھی کبھی.....وقت سے پہلے حقیقت کا ادراک دماغ کو الجھانے بھی لگتا ہے مطالعہ آپ کے ذہن کی ساری گرہیں کھول دیتا ہے.بہت مشکل ہوتا ہے ان کو پھر سے جوڑنا اصل میں بہت سارے علم ہم بغیر استادوں کے نہیں حاصل کر سکتے،اسی طرح ہر کتاب ہم بغیر استاد بھی سمجھ بھی نہیں سکتے۔''

''اینی وے۔بیسٹ آف لک فار یور اپ کمنگ پروگرام۔''خولہ نے عالیہ سے مزید بات نہ کرنے کا ارادہ کرتے ہوئے سمیع صولت کے چیمبر کی راہ لی۔

عالیہ بھی اپنے پروگرام کی ٹریک لسٹ میں مصروف ہوگئی۔اس وقت کوئی اسپانسر پروگرام آن ائیر جا رہا تھا اس لیے اسٹوڈیو میں موجود آر جے اور انجینئر زقدرے سکون سے تھے۔

☆.....☆.....☆

گزری مسافتوں پہ بھی ڈالیں ذرا نظر
قربت کی ساعتوں کا مقدر بھی دیکھ لیں
شاید کہ مل سکیں نہ نئے موسموں میں ہم
جاتی رتوں کا آخری منظر بھی دیکھ لیں

اس نے جاتے سال کا آخری سورج بہت غور سے دیکھا تھا اور ایک گہرا سانس لے کر ڈھیر سارا نمکین پانی اپنے اندر اتار لیا تھا۔ ایسا آج پہلی بار تو نہیں ہوا تھا۔ وہ گزشتہ کئی دنوں سے شام کے کچھ پل اس چھت پر تنہا گزارتی اور اپنی زندگی کے اس احمقانہ فیصلے پر غور کرتے ہوئے مسکن کے بارے میں سوچنے بیٹھ جاتی۔

وہ نا چاہتے ہوئے بھی ان در و دیوار کی نشانیاں سوچنے لگتی جہاں اس کے شب و روز آزاد تتلی کی مانند تھے۔ وہ ایک پھول سے دوسرے پھول تک جاتی اور رنگوں سے محظوظ ہوتی رہتی۔

صوفیہ..... اسے کسی نے آواز دی تھی یا سماعتوں کا دھوکہ تھا اس طرح کا دھوکہ اس کی سماعتیں دن میں کئی بار دیتیں۔

لیکن آج اسے یقین ہو چلا تھا سماعتیں دھوکہ نہیں دیتیں اسے مسکن کے در و دیوار آواز دیتے تھے۔

جب ہی تو کسی نے آ کر اسے ہلایا تھا۔

''بی بی جی! آپ کو وڈی امی بلاتی ہے۔''

''کیوں خیر ہے یہ وڈی امی تمہاری میری کیوں خیر خبر رکھتی ہیں۔''

وہ عادت کے مطابق جھنجھلا رہی تھی۔ یہ جانے بغیر کے اس کے سامنے کوئی بڑی مامی اور چھوٹی مامی نہیں۔

''بی بی جی! آپ کے مہمان آئے ہیں۔''

''میرے مہمان..... مگر کون.....'' وہ جیسے قفس کے لاچار پرندے کی طرح پھڑ پھڑا کر اڑنے کو بے چین ہو گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

کچھ لوگ اپنی ذات میں اتنے ہمہ گیر اور ہمہ صفت ہوتے ہیں کہ انہیں خود بھی پتا نہیں ہوتا کہ لوگ ان کی ذات کے کس پہلو کو سب سے زیادہ پسند کرتے ہیں۔انہیں خود بھی اندازہ نہیں ہوتا کے عقیدت مندوں کی قطار میں کون جس پہلو کی رغبت لیے کھڑا ہے کچھ لوگ بس دنیا میں اسی لیے آتے ہیں کہ انہیں بے حساب بے حد چاہا جائے۔

اور چاہتوں کے اس ہجوم میں اپنی ذات کا وقار لیے اپنے لہجے میں دنیا کی محبتوں کا تفاخر سمیٹے اور آنکھوں میں چاہے جانے کا خمار لیے ہمارے ساتھ براجمان ہیں.....

شمائلہ کمال.....

ہم جانتے ہیں آپ سب بھی ہماری طرح شمائلہ کمال کی جادوئی آواز سننے کے مشتاق ہیں اور ہمارا یہ پروگرام بڑے اعتماد کے ساتھ یہ اعزاز سمیٹ رہا ہے کہ کسی بھی ٹی وی چینل پر تھیٹر اور آرٹ کی ملکہ کا یہ پہلا مکمل انٹرویو ہے۔

گویا گفتگو کا سلسلہ ہم یہاں سے جوڑنے میں حق بجانب ہیں کہ آج جس شمائلہ کمال کے ان گنت پرستار ہیں وہ پرستاروں کی دنیا کا چاند بننے سے پہلے کہاں تھیں کیا تھیں.....؟

میزبان کا دلکش انداز بیاں اور لہجے کا بھاری پن پیشہ وارانہ مسکراہٹ کے ساتھ دلچسپی کا بھی غماز تھا وہ خود کو اس لمحے بڑا خوش قسمت محسوس کر رہا تھا۔

شمائلہ کمال صحافیوں اور ٹی وی چینلز کو اس حد تک نظر انداز کرنے کی عادی تھیں کہ اب انہیں ان کے متعلق خواہ مخواہ تجسس ہو گیا تھا نہ وہ کبھی میگزین کے ٹائٹل پیج کا حصہ بنیں اور نہ ہی کسی اخبار میں فن و ثقافت کے صفحے پر ان کی کوئی چٹ پٹی خبر شائع ہوئی۔

اور پھر جس کلاس کی وہ فنکارہ تھیں ان کے پرستار بھی اسی پائے کے تھے وہ سال کا بیشتر حصہ ثقافتی طائفوں کی نمائندگی کرتے ہوئے گزارتیں ان کا طوطی پاکستان سے زیادہ بھارت میں بولتا تھا

شاید وہ لوگ ان کی صلاحیتوں کے بڑے قدر دان تھے۔ وہ بہترین کلاسیکل رقاصہ تھیں لیکن ان کی محفلوں تک عام لوگوں کی رسائی ممکن نہ تھی عمر کے اس حصے میں بھی ان کے جسم کی لچک اور بے داغ چہرے کی تازگی لوگوں کو خیرہ کر دیتی تھی۔

وہ ہر نظر محبوب تھیں اس لیے نہیں کہ ان کی صلاحیتوں کا کوئی ثانی نہیں تھا بلکہ اس لیے کہ وہ محبتوں کی بارش میں تن من بھگونے کا ہنر جانتی تھیں ان کی آنکھیں ہمیشہ ایک غیر محسوس سی کھوج میں لگی رہتیں۔

اس وقت بھی کیمرے کے طاقتور لینس نے ان کی سنہری آنکھوں کا احاطہ کر رکھا تھا اور کنٹرول روم میں بیٹھے پروڈیوسر کو بھی ایک لمحے کے لیے اپنی توجہ بھٹکتے ہوئے محسوس ہوئی تھی۔

انہوں نے جانے کیا اپنے بارے میں بتایا تھا اور کیا کہہ کر مسکرائی تھیں اس کے دھیان میں بالکل نہیں تھا۔ اس نے پہلی فرصت میں کیمرہ مین کو ہدایت کی۔

''فریم چینج کرو یہ فیملی انٹرویو ہے کسی نئی اداکارہ کا مہورت نہیں۔'' اپنی توجہ بھٹکنے کا ملال کم کر کے وہ پھر سے ڈیوٹی پر حاضر ہو گیا تھا۔ اور اب توجہ کا مرکز میزبان تھا جو ان سے سوال کر رہا تھا۔

''آپ نے کہا آپ ہمیشہ سے اسی طلسم کدے میں رہی ہیں فن کی دنیا سے جڑے رہنا آپ کا شوق نہیں ضرورت نہیں آپ کی روح کا تقاضا ہے لیکن سب سے زیادہ طمانیت آپ کو کہاں ملتی ہے؟''

میزبان کی ادب دوستی کا راز آج افشا ہوا تھا پروڈیوسر اپنے انتخاب پر بہت خوش تھا۔

''شاید وجد کے عالم میں اپنے آپ کو ڈھونڈنا خود سے باتیں کرنا مجھے سب سے زیادہ اچھا لگتا ہے۔''

کمال مسکراہٹ تھی ان کے چہرے پر۔

''مگر یہ تو دنیا کی سب سے مشکل زبان ہے جو ہر کسی کی سمجھ میں نہیں آتی اور نہ ہی ہر کوئی اسے اس انداز سے سمجھنا چاہتا ہے جس کا اظہار فنکار اپنے اعضاء کی جنبش سے کر رہا ہوتا ہے۔''

''دیکھیں اپنی اپنی سمجھ کی بات ہے میں سچ بتاؤں آپ کو میں رقص صرف اپنے لیے کرتی ہوں جب

مجھے خود سے بات کرنی ہوتی ہے اپنا دکھ بانٹنا ہوتا ہے اپنی خوشی شیئر کرنا ہوتی ہے میں اس کا سہارا لیتی ہوں۔"

انہوں نے پہلی بار کسی سوال کا سیدھا جواب دیا تھا ورنہ اب تک کی ساری گفتگو تو کسی ادبی فلسفی خاتون سے ہو رہی تھی شوبز کا حوالہ تو کہیں پیچھے رہ گیا تھا پروڈیوسر نے شکر کا سانس لیا انٹرویو اگر بوریت کا شکار ہو جاتا تو اس کی اب تک کی ساری محنت رائیگاں جاتی اور عام ناظرین کو شمائلہ کمال کی ادبی گفتگو سے کیا مطلب..... وہ تو یہ جاننا چاہتے تھے کہ شمائلہ کمال بھارت میں خوش رہتی ہیں کہ پاکستان میں۔

انہوں نے شوہر سے علیحدگی اختیار کر رکھی ہے یا انہوں نے شادی ہی نہیں کی ان کے بچے کیا کرتے ہیں وغیرہ.....

دراصل شمائلہ کمال کا شمار ایسے فنکاروں میں ہوتا تھا جو سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے حیلے بہانے نہیں ڈھونڈتے اور دراصل انہیں اس طرح کے حوبوں کی ضرورت بھی نہیں ہوتی قسمت کی دیوی مہربان ہو تو شہرت اور عزت خود بخود ان کا مقدر بن جاتی ہے۔ ان کی فنکارانہ صلاحیتوں کو اظہار کے مواقع میسر آنے لگیں تو روشنی کی دنیا کے مصنوعی نظارے انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتے۔

"کب بہت زیادہ خوش ہوتی ہیں۔"

میزبان نے بھی ناظرین کی مشکل آسان کر دی۔

"میں کبھی ناخوش نہیں رہتی مجھے زندگی سے کبھی شکایت نہیں ہوتی میں نے جو چاہا جس چیز کی تمنا کی وہ مجھے اس لیے میرے پاس بے شمار لمحے ہیں جب میں بہت خوش ہوتی ہوں....."

اصل سوال کہیں ہوا میں رہ گیا تھا میزبان اور کنٹرول روم ٹیم کو سخت مایوسی ہوئی۔

"اپنوں کے ساتھ گزرے لمحوں کو کس طرح مناتی ہیں کس انداز سے سیلبریٹ کرتی ہیں؟"

ایک اور کوشش ہوئی ذاتیات تک پہنچنے کی۔ جس کے بارے میں سب کا مشترکہ خیال تھا کہ شمائلہ کمال کی ذاتی زندگی اچھا خاصا معمہ ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کس خاندان سے ہیں انہوں نے کسی سے

شادی کی یا نہیں وہ مقامی ہیں یا کسی اور ملک کی باشندہ۔

انہیں دیکھ کر ان سے مل کر اس طرح کے سوال بلاوجہ سر اٹھانے لگتے تھے ان کے یورپین نین نقش سانچے میں ڈھلا ہوا انتہائی متناسب جسم اور رس گھولتی آواز کا جادو سوالوں کی دنیا میں نہ بھی لے جائے تب بھی ان کی شخصیت کا اسرار مرعوب تو ضرور کرتا تھا۔

''کیا یہ بتانا ضروری ہے کہ میں اپنی ذاتی زندگی کس طرح سے گزار رہی ہوں؟''

انہوں نے الٹا سوال داغ دیا تھا اور میزبان کی حاضر جوابی نے بروقت کام کیا اور وہ مسکرا دیا۔

''فنکار اپنے پرستاروں کی ملکیت ہوتا ہے اس کی ذاتی زندگی اس دن ختم ہو جاتی ہے جب وہ لائم لائٹ میں آتا ہے۔''

''میں نہیں مانتی اس بات کو میرا فن میرے پرستاروں کی ملکیت ضرور ہو سکتا ہے لیکن میری زندگی کے وہ حصے جن پر صرف میرا حق ہے وہ میں آپ سب سے شیئر کرنے کی پابند نہیں ہوں اور نہ ہی کوئی اور شخصیت جس کا تعلق عوام سے جڑا ہوا ہے وہ اس کے لیے پابند ہے۔ میرے فن پر آپ سب کا حق ضرور ہے لیکن میری زندگی کو تو میرا رہنے دیں۔''

وہ بات کرتے کرتے اچانک کیمرے کی طرف مڑ گئی تھیں اور ٹی وی اسکرین کے ذریعے ہزاروں لاکھوں لوگوں سے مخاطب بھی حیرت انگیز طور پر سب کو ان کا یہ انداز یہ معنی خیز التجا بڑی اچھی لگی تھی۔

''اچھا یہ بتائیں آپ خود کو فن کے بام عروج تک پہنچا محسوس کرتی ہیں یا ابھی کہیں کوئی کمی ہے؟''

اب یہ سوال ضروری تھا گفتگو میں تلخی کا شائبہ آنے سے پہلے.....

''میرے خیال میں بہت سارے کام ابھی مجھے کرنے ہیں۔ میں سفر کے آغاز میں ہوں۔ مجھے نہیں پتا کتنے موڑ آئیں گے اور منزل نظر آئے گی۔''

''آپ کے خیال میں کون سی چیز پائیدار کامیابی کی ضامن ہوتی ہے؟''

رسمی گفتگو کا آغاز ہو چکا تھا پروڈیوسر کی ساری توجہ اب کیمرہ مین کے فریمز کی طرف تھی تا کہ اسکرین کی خوبصورتی برقرار رہے لوگوں کے لیے اور خود اس کے لیے بھی تجسس کا مرحلہ گزر چکا تھا۔

''ضد.....''

سوال جتنا جامع تھا جواب اتنا ہی انوکھا۔ میزبان کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے احمقانہ سے تاثرات ابھرے۔

''جی آپ کون سی ضد کی بات کر رہی ہیں؟''

''مجھے لگتا ہے یہ ضد ہی ہے جو ہمیں طاقتور بناتی ہے حالات سے لڑنے کا حوصلہ دیتی ہے۔ کبھی کمزور نہیں پڑنے دیتی ضد مثبت ہو یا منفی آپ کو ناکام نہیں ہونے دیتی اب یہ انتخاب آپ نے کرنا ہے کہ آپ کی ضد کس مقصد کے لیے ہے۔''

''ویری انٹیلی جنٹ۔ آپ بچپن میں کون سی ضد زیادہ کرتی تھیں؟''

''میں ڈھیر سارے پرندے خریدنے کی ضد کرتی اور پھر انہیں اڑا دیتی گھر والے میری اس خوشی سے خاصے بے زار رہتے تھے مگر میں اپنی ضد سے باز نہیں آتی تھی۔''

''بچپن گزر گیا یا آج بھی.....''

میزبان نے مسکراہٹ بکھیری تھی اس یقین کے ساتھ کہ وہ ان کے ماضی یا ذاتیات کو کریدنے میں کامیاب ہو رہا ہے۔

''میں اب پرندوں کو خریدنے کی ضد نہیں کرتی ان کا تعاقب کرتی ہوں۔ شمائلہ کمال نے بھی غضب کی مسکراہٹ بکھیری تھی۔''

یہ پروگرام مسکراہٹوں کے تبادلے سے خاصا منفرد بن گیا تھا پروڈیوسر کے چہرے کی مسکراہٹ بھی کم نہیں ہو پا رہی تھی۔

''زندگی سے شکایت.....''

''اگر میں زندگی سے محبت کرتی ہوں اس کے ہر رنگ سے انصاف کرتی ہوں تو اس سے شکایت بھی کر سکتی ہوں۔ یہ میرا اور میری زندگی کا ذاتی معاملہ ہے میں لوگوں کو کیوں بتاؤں۔''

وہ کتنی خوبصورتی سے دامن بچا گئی تھیں اس کا احساس سب لوگ کر رہے تھے جو کسی نہ کسی حوالے سے شمائلہ کمال کے بارے میں کچھ جانتے تھے اور اس کا احساس کشمالہ نے بھی لمحوں میں کیا تھا جو ٹی وی اسکرین پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ یہ حسن اتفاق ہی تھا کہ وہ پاکستانی میڈیا کو مطالعاتی نظروں سے دیکھنے کے لیے چینل سرچ کرنے بیٹھی تھی تب اس کی انگلی نے ایک چینل پر مزید حرکت کرنے سے انکار کر دیا تھا اس کی نظروں کے سامنے کشمالہ کمال تھیں۔

حسین..... دلکش اور ساحرانہ مسکراہٹ کی مالک.....

بلا کی گلیمرس اور چہرے کے خال وخد میں ذہانت سے زیادہ دانشمندی کا خمار لیے۔

''اوہ مائی گاڈ..... ہاؤ لکی عاشر عباس.....'' اس نے بے اختیار نانو کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائی تھیں مگر وہ اپنے نماز کے کمرے میں مقید ہو چکی تھیں اور یہ سلسلہ لمبا چلا کرتا تھا خولہ اپنے ریڈیو کے ساتھیوں کے ساتھ کسی ڈنر میں مدعو تھی اور پاپا اچانک ہی لاہور روانہ ہو گئے تھے ان کی مصروفیات ایسی ہی تھیں خولہ تو پھر بھی شکایت کرتی رہتی تھی کہ پاپا مشین بن چکے ہیں البتہ وہ اس بات کی شدت سے قائل تھی کہ اس مشین کے اندر دنیا کا خوبصورت دل دھڑکتا ہے۔ یہ کتنا منفرد امتزاج تھا۔ مشین کے اندر دل جو دھڑکتا تھا محبت کرتا تھا احساس کی دولت سے مالا مال تھا۔

اور یہ دل اس کے پاپا کا دل تھا۔ طارق محمود کا دل تھا۔ شمائلہ کمال کے پہلے شوہر کا دل جس کے بارے میں بات کرتے ہوئے شمائلہ کمال ہر بار کنی کترا گئی تھی۔ کشمالہ نے دل ہی دل میں اس کی ذہانت کی داد دی تھی۔

ہوتے ہیں کچھ لوگ بھی ایسے جنہیں اللہ تعالی ہمیشہ فراوانی سے نوازتا ہے اس کے باوجود ان کی زندگی سے ادھورا پن جاتا نہیں یہ تضاد کیوں ہوتا ہے اور کیا اس تضاد کے ساتھ زندگی گزارنا آسان ہوتا

ہے نانو کی باتیں پاپا کی تنہائی اور آج شمائلہ کمال کے انٹرویو سے اخز کیے جانے والا نتیجہ اسے سوچوں کی ایک نئی وادی میں دھکیل گیا تھا۔

''شمائلہ از امیزنگ بٹ.....'' اس نے سوچا اور چینل سوئچ کر دیا اسکرین کا سحر ختم ہو چکا تھا کیونکہ انٹرویو اختتام پذیر ہو چکا تھا۔ کمرشل بریکس نے ماحول بدل دیا تھا تب ہی ٹی وی لاؤنج میں رکھے فون کی بیل بجنے لگی۔

یہ ایک خوش نصیب آلہ تھا جو اس گھر میں شاذ و نادر ہی بجتا تھا اور نہ ہی کسی کو اس کے بجنے کا انتظار ہوتا تھا۔ نانو کی پرسکون دنیا کا یہ خاموش سپاہی اس وقت خوب شور کر رہا تھا اس نے بادل نخواستہ اٹھا لیا ورنہ وہ تو موبائل فون ریسیو کرنے کے معاملے میں بھی بہت سست تھی۔

ریسیور کان سے لگاتے ہی جو آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔ وہ بالکل اجنبی نہیں تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو اس کا طلسم پھیلا ہوا تھا۔ ذرا بھاری..... ذرا مترنم..... شاید کسی پہاڑی جھرنے کی طرح.....

''اماں! آپ نے میرا پروگرام دیکھا۔'' لہجے میں ایکسائٹمنٹ سے زیادہ حکم کا تاثر تھا۔

''میں اماں نہیں ہوں آپ تھوڑی دیر بعد کال کیجیے۔ وہ نماز پڑھ رہی ہیں۔'' اس نے رسان سے کہا۔

اسے یقین تھا کہ اگر خاموش رہتی تو ماں بیٹی کے درمیان تعلقات کے بہت سے پراسرار پہلو ہاتھ لگ جاتے۔ وہ تو یقیناً اماں سمجھ کر بولتی جاتیں اور سنتی بھی جاتیں کہ اماں کو کب ان کی باتوں کے جواب دینے کی عادت تھی۔

''تم کون ہو؟''

بلا تمہید تخاطب کا یہ انداز کشمالہ کو برا نہیں بلکہ بولڈ لگا تھا۔

''میں کشمالہ ہوں یوں سمجھ لیں آپ کی زبردست فین۔'' اس بار اس نے انگریزی کا سہارا لیا تھا تاکہ وہ اسے کم از کم آپا اور ملازمہ کے خانے سے نکال دیں۔ دونوں کے درمیان تعلقات کی نوعیت میں فاصلوں کی سرحد کا آغاز کہاں سے ہوتا تھا۔ یہ کشمالہ کو تو نہیں پتا تھا البتہ کشمالہ کمال کی گہری سانس نے

کسی غیر معمولی پن کا احساس دلایا تھا تب ہی کشمالہ کو اپنی ایکسائٹمنٹ کم کرنا پڑی۔

''تم طارق کی بیٹی ہو شاید۔'' انداز میں بے نیازی اور لہجے کی کاٹ کا امتزاج اس جملے میں خوب سمٹا ہوا تھا۔ وہ بے ساختہ مسکرا دی۔ ایک انٹلکچوئل عورت کا یہ انداز اس کے مکمل عورت ہونے کا ثبوت دے رہا تھا۔

حالانکہ وہ تو صرف طارق کی بیٹی تھی اور فون پر مخاطب تھی۔ اگر اس وقت مخاطب طارق کی بیوی ہوتی تو پتا نہیں اس کا کیا حال ہوتا۔

''میں آپ کا میسج نانو کو بتا دوں گی یا پھر آپ خود دوبارہ کال کر لیجیے گا۔'' وہ نانو کے گھر میں تھی اور ان کا احترام اس پر اس وقت تک لازم تھا جب تک وہ اس کا حصہ تھی۔

''او کے تم یہاں کب سے ہو، عاشر کہاں ہے۔'' اس بار تو اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا یہ وہی حسین آرٹسٹ ہے جس کے حسنِ صورت اور حسنِ کلام کے قصیدے پڑھنے کے لیے لفظ کم پڑ گئے تھے۔ جس کی ذہانت اور کشادہ دلی کو خراج تحسین پیش کیا جاتا تھا۔ اس نے بمشکل خود کو کمپوز کیا۔

''آپ کو بتانا ضروری تو نہیں کہ میں یہاں کب سے ہوں۔ اینی ویز میں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں میں آپ کی زبردست فین تھی گڈ بائے۔''

اس نے یہ سب کہہ کر دل کو خاصی حد تک تسلی دی تھی اگر وہ اتنا بھی نہ کرتی تو خود سے شرمندہ رہتی۔

بہر حال یہ آج کے دن کا ایک برا تجربہ تھا۔ اسے نانو کے آنسوؤں کا مطلب سمجھ میں آنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ کبھی کسی کے بارے میں رائے قائم کرتے ہوئے جلدی نہیں کرتی تھی لیکن آج خود بخود رائے تبدیل ہو گئی تھی اسے خواہ مخواہ افسوس ہونے لگا تھا۔

''پاپا مجھے آپ کی پانی پانی آنکھوں کے سرخ ڈورے ہمیشہ اپیل کرتے ہیں درد کے اس دریا میں کچھ تو ایسا ہے جس کی پردہ داری کرتے ہوئے آپ لہولہو ہو گئے۔''

سورج کی بے کنار صحرا میں
دھول اڑاتا ہے یاد کا موسم
اپنی بے حرف آنکھ ایسے میں
زندگی کے ورق الٹتی ہے
جیسے بارش میں بھیگتی چڑیا
گھونسلے کی طرف پلٹتی ہے

کوئی شاعر بہت جذب کے عالم میں پڑھ رہا تھا۔ اردو ادب کی دلدادہ کشمالہ طارق کا دھیان ہر طرف سے پلٹ کر ان لفظوں کی حقیقت کھوجنے میں لگ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

راحت جبیں کا بہت خوبصورت نیا ناول
زندگی ہم تجھے گزاریں گے
ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں
kitaabghar.com

ندا حسنین کا بہت خوبصورت نیا ناول
قربت ہجر میں محبت
ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں
kitaabghar.com

''کیا مسکن سے کوئی آیا ہے۔'' دل کے دروازے پر یقینی دستک ہوئی تھی۔ اس نے بھاگتے ہوئے سیڑھیاں چھلانگیں اور آخری سیڑھی سے چند سیڑھیاں پہلے اس کا پاؤں پائنچے میں الجھ کر اس بری طرح پھسلا تھا کہ وہ منہ کے بل فرش سے آ لگی تھی۔ لمحوں میں حقیقتاً اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔ سامنے کون کون تھا اور کس نے اسے آگے بڑھ کر تھاما تھا اتنی شدید چوٹ کے بعد وہ بالکل بھی اندازہ نہیں کر پائی تھی اور سر پکڑ کر گرد و پیش سے غافل ہوتی چلی گئی تھی۔

انعم اور عامر ڈرائنگ روم میں اس کے منتظر تھے لیکن انتظار اس خبر کے ساتھ تمام ہوا تھا کہ صوفیہ بے ہوش ہے اسے چوٹ لگ گئی ہے سیڑھیوں سے گر کر۔

''چوٹ لگ گئی سیڑھیوں سے گر کر..... مگر کیسے..... وہ کوئی بچی ہے.....'' وہ دونوں ایک دوسرے کو حیران پریشان نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ پتا نہیں وہ کون سے کمرے میں تھی اور کس کے پاس تھی عامر کا چہرہ مارے خفت کے سرخ ہو گیا تھا۔ انعم نے ڈرائنگ روم کا دروازہ عبور کیا۔ وہ اس اجنبی گھر کے کون سے کمرے کا رخ کرے تب کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

اصل میں سر پر چوٹ لگی ہے فکر نہیں کرو ابھی ڈاکٹر کو کال کیا ہے۔ وہ شاید اس کی چچی تھیں۔

''میں اس کے پاس جا سکتی ہوں۔ اپنی جان سے پیاری صوفیہ کے لیے۔''

''ہاں کیوں نہیں..... وہ اس طرف ہے..... چلو میرے ساتھ۔''

عجیب سرنگ نما گھر تھا۔

''کیسے رہتی ہو گی صوفیہ یہاں اسے تو مسکن کا صحن اور ٹیرس چھوٹا لگتا تھا۔'' وہ اپنے تاثرات پر قابو پاتی ہوئی اس کمرے میں آ گئی تھی۔ جہاں صوفیہ بے ہوش پڑی تھی۔

اس کے ماتھے اور ناک پر گہری چوٹ کا نشان واضح ہو گیا تھا۔ انعم نے بے ساختہ آگے بڑھ کر اس کے ماتھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''صوفی.....'' مدہم مگر اپنائیت سے بھرپور صدا۔

''اٹھو صوفی دیکھو میں انعم ہوں..... ہری اپ۔'' صوفیہ کے لاشعور میں ہلچل سی مچی تھی اس کی تراشیدہ پلکوں میں غیر محسوس سی جنبش ہوئی تھی تب ہی کمرے میں کھڑے باقی نفوس کے درمیان خاموش گفتگو کا تبادلہ ہوا اور داخلی دروازے سے ڈاکٹر نے اندر آ کر ہجوم کم کرنے کی ہدایت کی۔

بہتر ہے آپ انہیں میرے کلینک لے آئیں۔ وہ ضروری چیک اپ کے بعد گھر کی سب سے بڑی خاتون جو یقیناً صوفیہ کی تائی تھیں سے مخاطب ہوا تھا۔

''یہ بے ہوش کیوں ہے؟''

''اصل میں سر اور ناک کے نازک حصوں پر چوٹ کو برداشت کرنا آسان نہیں یہ محترمہ تو خود بھی نازک سی ہیں آپ انہیں کلینک بھجوانے کا انتظام کریں ان کے ایکسرے بھی ضروری ہیں۔''

ڈاکٹر اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ بے ہوش نہیں غافل ہے۔ کسی بچکانہ سی ضد نے اسے یہ ردعمل اختیار کرنے پر اکسایا ہوا تھا۔ بہر حال چوٹ بھی معمولی نہیں تھی اور ڈاکٹر کو اپنے فرائض سے انصاف تو کرنا تھا۔

انعم اور عامر کو پریشانی صوفیہ کی غنودگی سے نہیں بلکہ گھر والوں کے رویے سے ہوئی تھی۔ سب کے سب اسے ان کے حوالے کر کے اپنے اپنے کاموں میں مگن ہو گئے تھے۔ ان دونوں کے ساتھ ہی وہ ڈاکٹر کے کلینک تک آئی تھی اور پھر انعم کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی وہ کیوں اور کون سے درد کو رو رہی ہے یہ اس کے چہرے پر صاف لکھا تھا۔

''یہ کیا بچکانہ حرکت ہے حالت دیکھو اپنی اور اوپر سے رو رو کر حشر کر لیا ہے۔''

عامر نے دونوں کو بمشکل الگ کیا ڈاکٹر کا کلینک اتنا بڑا نہیں تھا جو یہ مناظر اس کی نظروں سے پوشیدہ رہ جاتے اسے اپنی مریضہ کی ذہنی حالت کے بارے میں جو شبہ ہوا تھا۔ اس کی تصدیق بھی ہو گئی تھی۔

''آپ لوگ انہیں مکمل ریسٹ کرنے دیں کسی قسم کا اسٹریس ان کے لیے ٹھیک نہیں ہو گا میں ابھی

ایکسرے کا انتظام کرتا ہوں خدانخواستہ فریکچر نہ ہو گیا ہوا بھی تو سوجن زیادہ ہے اس کے کم ہونے کے بعد ہی پتا چلے گا چوٹ کا اثر ہڈی پر کہاں تک ہوا ہے۔'' ڈاکٹر بھی مہارت اور تجربے کے حوالے سے گزارے لائق ہی لگ رہا تھا۔ کلینک میں مریضوں کا رش بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔

عامر نے لمحوں میں فیصلہ کیا تھا۔

''ہم انہیں اپنے گھر لے جا رہے ہیں ان کے ہاں سے کوئی آتا ہے تو انہیں انفارم کر دیں کہ وہ اپنے گھر چلی گئی۔'' عامر نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا تھا۔

''لیکن میں کیسے چلی جاؤں۔'' اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ وہ خوفزدہ نظروں سے دونوں کو دیکھنے لگی۔

''جس طرح وہاں سے آئی تھیں اور دیکھ لیا ہم نے تمہارے گھر والوں کا تمہارے ساتھ محبت بھرا انداز کم آن صوفیہ تم اتنی احمق بھی نہیں تھیں جتنی کے ان چند دنوں میں ہو گئی ہو۔''

عامر نے ذرا جو اس کی چوٹ کا لحاظ کیا ہو۔ آنسو اس کی آنکھوں میں یوں جمع ہو گئے تھے جیسے انہیں آواز دی گئی ہو۔

چوٹ کا درد اپنی جگہ۔

مگر ان دونوں کے سامنے جو دل پر گھاؤ لگا تھا اس کی چبھن اتنی شدت کے ساتھ ہو رہی تھی کہ وہ مزاحمت کا ہر انداز بھول گئی تھی۔

یاد رہا تو اتنا کہ یہ دو لوگ جو اس وقت اس کے ساتھ ہیں اگر نہ ہوتے تو تائی اس طرح گرنے کے بعد سہارا دینے کے بجائے صلواتوں سے نوازتیں وہ عجیب و غریب عورت تھیں۔

اپنے آپ سے ناراض.....

اولاد سے خفا.....

شوہر سے بے گانگی.....

اور گھر کے ہر فرد سے سرد جنگ لازمی.....

دو دن میں وہ ان کا مزاج سمجھ گئی تھی اور اس کے بعد کسی کبوتری کی طرح گردن میں سر دے کر بیٹھ گئی تھی۔

"یا اللہ..... یہ مجھ سے کیا غلطی ہو گئی۔"

چند دنوں کے بعد اس کی ہر سوچ کا اختتام اس انداز سے ہو رہا تھا وہ تو بڑے بڑے خواب لے کر آئی تھی۔ اپنے گھر جائے گی وہاں سے ہو کر زندگی کو اپنے رنگ ڈھنگ سے جینے کا مزا ہی کچھ اور ہو گا۔

ان تمام دنوں میں وہ آفس اس لیے نہیں گئی تھی کہ اسے راحت بیگم کو دکھی نہیں کرنا تھا ان کے زخموں کو تازہ نہیں کرنا تھا بلکہ اسے تایا نے منع کر دیا تھا کہ فی الحال وہ آفس نہ جائے۔ اس گھر میں رہے لوگوں کو سمجھے ان فاصلوں کو مٹانے کی کوشش کرے جو اس کے اور اس گھر کے درمیان ہیں۔

لیکن صوفیہ کا دماغ کب پابندیوں سے آشنا تھا جو دوسروں کے کہے پر من و عن عمل کرتا وہ تمام دن اپنے کمرے میں بیٹھی رہتی کوئی کھانے ہر بلا لیتا تو چلی جاتی یا جب دل کرتا کچن میں کھڑے کھڑے کچھ نہ کچھ کھا لیتی اس کی یہ بے نیازی تائی کو ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی جب ہی وہ اول دن سے اس کو دیکھ کر ناک بھوں چڑھا لیتیں اور صوفیہ کو اس بے رخی سے زیادہ سفیر کے ہمدردانہ رویے پر حیرت ہوتی وہ تو ان کا بیٹا لگتا ہی نہیں تھا۔ گو کہ وہ ابھی صحت یابی کے مراحل سے گزر رہا تھا۔ اپنے جسم کو مکمل آزادی کے ساتھ حرکت نہیں دے سکتا تھا۔ اس کے لیے ایک کل وقتی میل نرس رکھا گیا تھا جس کے ساتھ وہ کبھی اسٹک کے سہارے اور کبھی اس کا ہاتھ تھامے ادھر سے ادھر چہل قدمی کرتا نظر آتا۔ یہ اس کی زبردست قوت ارادی تھی جو وہ آج اپنے پاؤں پر کھڑا تھا۔ اور اس کی ذہنی صحت بھی تیزی سے بہتر ہو رہی تھی ورنہ پہلے تو وہ ایک بات کر کے گھنٹوں چپ رہتا اسے یاد ہی نہیں رہتا کہ وہ دراصل کیا بولنا چاہ رہا ہے۔

اگر وہ اپنی مدد آپ کے تحت خود کو اس حادثے سے باہر نہ نکالتا تو کسی وہیل چیئر کا محتاج ہو جاتا کیونکہ اس گھر میں تو حوصلہ افزائی کرنے کا رواج ہی نہیں تھا نہ ہی کسی کے پاس ایک دوسرے کے لیے فرصت ہوتی تھی۔ تیمارداری تو دور کی بات صوفیہ نے ان سب کو ایک دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھاتے نہیں دیکھا تھا سب کی ٹرے اپنے اپنے کمرے میں چلی جاتی حالانکہ یہ گھرانہ زیادہ نفوس پر مشتمل نہیں تھا۔

تایا تائی ان کے چار بچے.....

اور چاچا چچی کے تین بچے سب کے سب مخالف سمتوں میں سفر کرنے والے عالیہ اور عظمی کی شادی ہو چکی تھی۔ لڑکوں میں واحد سفیر تھا جو سلجھی ہوئی شخصیت کا مالک تھا۔ باقی عدیل اور نعمان تو کسی اور ہی منزل کی جانب رواں دواں تھے۔ عمر کے سب سے خوبصورت دور میں وہ بے مقصد اور بے لگام زندگی گزار رہے تھے۔

آج جس خود اعتمادی کے سہارے وہ ایک فیصلہ کرنے کے بعد ان سب کے درمیان تھی وہ خود اعتمادی اسی ماحول کی دین تھی۔

اسے بڑی شدت کے ساتھ بیت السکون کی وہ شامیں یاد آتیں جب کوئی ماموں اپنی ساری اولادوں کو جمع کر کے بیٹھ جاتے اور گرما گرم بحث کے بعد یہ فیصلے کیے جاتے کہ کون اب کیا کرے گا کس کا رجحان بچپن سے لے کر اب تک کیا رہا؟ کون آئی ٹی میں فیوچر بنا سکتا ہے اور کس کے لیے بزنس کلاسز ضروری ہیں۔ کس کا انٹرسٹ آرٹ کی طرف ہے اور کون اپنی توانائیاں آئی کیو لیول بہتر بنانے میں صرف کرے۔

بچوں کو مستقبل کے فیصلوں کی آگاہی دینے کے لیے اس طرح کی محفلیں بیت السکون کا معمول تھیں۔

اور یہاں پر اس طرح کی محفلیں تو دور کی بات اس نے کسی کو ایک دوسرے سے مشورہ کرتے نہیں دیکھا تھا۔

اسے تو سب لوگ عجیب وغریب عادات کے مالک لگتے تھے۔

پتا نہیں میرے پاپا ان جیسے تھے یا ان سے الگ.....

وہ یہاں آنے کے بعد اکثر یہ سوچا کرتی اس کا قیام بھی اس کمرے میں تھا جو کبھی اس کے والدین کی زندگی کے خوبصورت لمحوں کا گواہ بنا تھا۔

اسے اس جگہ کے علاوہ گھر کے کسی حصے سے انسیت محسوس نہ ہوتی تھی اس کی آنکھیں ہر جگہ سے مایوس ہو کر آسمان پر پرواز کرتے پرندوں پر مرکوز ہو جاتیں۔

اور پرندوں سے دوستی نے یہ دن دکھایا تھا کہ وہ ماتھے اور ناک پر گہرے نیلے نشانات سجا کر بیٹھی ہوئی تھی۔

اس حالت میں بیت السکون جانا، سب کا سامنا کرنا، اس کے دل کی دھڑکن غیر معتدل ہونے لگی تھی۔

''عامر..... میں ٹھیک ہوں..... میں ایک دو دن میں آجاؤں گی..... اب یہ شکل لے کر تو نہیں جا سکتی..... سب پریشان ہوں گے۔''

''سب کی پریشانی کی تم فکر مت کرو، سیدھی طرح گھر چلو مانا کہ یہ تمہارا گھر ہے، یہ لوگ بہت عظیم ہیں تم سے بہت پیار کرتے ہیں مگر ہم بھی تمہارے کچھ لگتے ہیں۔

تم اپنی یاداشت پر زور دو، تمہیں یاد آئے گا۔ ایک اور گھر.....'' عامر سنجیدگی سے کہتے کہتے ایک دم شرارت پر اتر آیا تھا۔ اب اس کی آنکھوں میں برہمی کے بجائے نرمی اور اپنائیت کے تاثرات تھے۔

صوفیہ نے ایک گہری سانس سینے کے قفس سے آزاد کی اور مزید کچھ سوچے سمجھے بغیر انعم کا ہاتھ تھام لیا۔

''چلو اور ہاں..... ڈاکٹر صاحب کی فیس.....'' وہ بمشکل مسکرائی تھی عامر نے مصنوعی مکا اسے دکھاتے ہوئے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال لیا تھا۔

اسے بیت السکون جانے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا، یہ تو طے شدہ بات تھی۔

☆.....☆.....☆

نانو کے ہاتھ کا بنا ہوا بادام کا حلوہ کھاتے ہوئے وہ آتش دان کے سامنے بیٹھ گیا تھا۔ وادی کے بیشتر حصے برف باری کی لپیٹ میں تھے اسی لیے سردی کی شدت میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔

''اس حلوے کے لیے تو نانو کا شکریہ بہت ضروری ہے۔''

عاشر نے موبائل فون والی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ وہ بجنے لگا۔ اس نے ہاتھ میں لے کر دیکھا۔ اسکرین پر کسی اجنبی جگہ کا نمبر آ رہا تھا۔ یس کا بٹن پش کر کے اس نے ہیلو کہا تو دوسری طرف مسرت سے لبریز آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔

''عاشر بیٹے..... میں ہوں آپ کی مما..... کیسے ہیں آپ.....'' وہ ہمیشہ اسی انداز سے متعارف ہوتی تھیں۔

''میں ٹھیک ہوں اور آپ ٹھیک ہیں۔''

وہ آج تک اس انداز سے ان کی خوشی اور بے چینی کو انجوائے نہیں کر پایا تھا جس طرح وہ اس سے بات کرتے ہوئے کرتی تھیں۔

''تم سناؤ بیٹے! یہ کون سا پروفیشن چوز کیا ہے تم نے۔ اس بیک ورڈ علاقے میں کتنا اپ سیٹ ہو رہے ہو گے۔ آج کل تو سردی بھی اتنی زیادہ ہے۔''

''لیکن یہ علاقہ تو بالکل بیک ورڈ نہیں ہے۔ یہاں بھی انجوائے کرنے کے لیے بہت کچھ ہے اور رہی بات پروفیشن کی تو..... میں جہاں انصاف کر پاؤں، وہی کام کر سکتا ہوں نا۔'' وہ آتش دان میں چیڑ کی لکڑی سلگاتے ہوئے بے نیازی سے بولا۔

''وہ تو ٹھیک ہے مگر میں نے تمہارے لیے کچھ اور سوچ رکھا تھا۔''

وہ یوں ہی محبت اور استحقاق سے بات کرتی تھیں۔ کبھی تو عاشر بہت الجھ جاتا تھا اور کبھی بے حسی کے ساتھ جواب دے رہا ہوتا۔

(آپ کو جب سوچنا چاہیے تھا، تب نہیں سوچا۔ اب سوچ کر کیا کریں گی۔)

اس نے چیڑ کی لکڑی کی خوشبو اپنے اندر اتارتے ہوئے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

''چھوڑیں کوئی اور بات کریں۔'' وہ بہت ساری باتیں اس لیے موضوع بحث نہیں بناتا تھا کہ ان کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ بہت سارے ایسے لمحوں کا گواہ تھا جب ماں اور باپ دونوں کے درمیان لڑائی کا نقطہ آغاز وہ ہوتا تھا۔

اس کی تربیت..... اس کا لائف اسٹائل..... اس کا کیریئر..... یہ سب چیزیں بہت بچپن سے ہی ان دونوں کے درمیان ڈسکس ہونے لگی تھیں۔ اس نے محض اسکول جانا شروع کیا تھا تو ماں باپ کے درمیان اس بحث کا آغاز ہو گیا تھا کہ وہ کیا بنے گا؟ بہت بعد میں جا کر اسے سمجھ آیا تھا کہ انہیں ایک دوسرے سے ساتھ اختلاف کرنے کے لیے کوئی بھی ایشو مل جائے۔ وہ خواہ مخواہ پریشان ہوتا تھا کہ اس کی وجہ سے لڑائی ہو گئی۔

''بیٹے میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔ ایسا لگتا ہے کہ ایک زمانے سے میں نے اپنے بیٹے کی صورت نہیں دیکھی۔ مجھے بتاؤ تم کہاں پر ہو۔ اپنے باپ کے ساتھ تو نہیں ہو۔'' سوال سے زیادہ ان کی بے چینی پر بدمزا ہوا تھا۔

''ویسے کیا کریں گی مل کر..... دو سال پہلے ہی تو ہم ملے تھے۔ میں بالکل ویسا ہوں کچھ بھی تو نہیں بدلا۔''

وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔ اسے کبھی کبھی اپنی ماں پر ترس آتا تھا ان کی بہت ساری باتوں کو اس لیے ہنس کر ٹال دیتا کہ اسے ماں باپ کی جنگ میں کسی کا فریق نہیں بننا تھا۔

وہ بادام کا حلوہ آتش دان میں سلگتی خوشبودار لکڑی کی تپش کو انجوائے کرتے ہوئے نانو سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ ماں کے فون پر بوریت سی محسوس کرنے لگا تھا۔

اس کا اپنے ماں باپ کے ساتھ وقت اور راستوں کا فاصلہ ہی نہیں ذہنی فاصلہ بھی بہت زیادہ تھا۔ وہ دس سال کا تھا جب ماں نے اس گھر کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا جہاں سے اس کے ماں باپ نے نئی زندگی اور رفاقتوں کے خوش رنگ موسم کا آغاز کیا تھا اسے محسوس ہوا تھا کہ اس نے اپنی زندگی کو اپنے ہی ڈھب سے گزارنے کے لیے جو قدم اٹھایا تھا اس میں اپنی ممتا کو سب سے پہلے اپنے پاؤں تلے روند دیا تھا۔

اور یہ صرف اس کے محسوسات نہیں تھے۔ بہت سے لوگوں نے اس وقت صدمے اور تحیر کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ اس خبر کو سنا تھا کہ شمائلہ نے طارق محمود سے علیحدگی اختیار کر لی اور وہ اپنے اکلوتے بیٹے سے بھی دستبردار ہو گئی ہے۔ دراصل وہ جس شخص کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہے وہ اسے بیٹے کے ساتھ قبول نہیں کرنا چاہتا۔ پتا نہیں اس خبر میں کس حد تک سچائی تھی مگر آج بھی عاشر عباس کو دیکھ کر اس کے ماں باپ کی سیاہ بختی پر ملال ہوتا تھا جو اس جیسے ذمہ دار اور تابعدار بیٹے کی تربیت میں اپنا حصہ نہیں ڈال پائے۔

جو اس کی ذہانت اور کامیابی کے تمغے اپنے کندھے پر نہیں سجا پائے۔ وہ عاشر عباس جیسے بیٹے سے آج اتنے فاصلے پر تھے کہ وہ ان کا فون بادل نخواستہ ریسیو کرتا تھا اور جب کر لیتا تھا تو بیزاریت کے غلبے کو نہیں روک پاتا تھا۔

"بیٹے مجھے بتاؤ نا میں آپ سے کب ملنے آؤں میں آج کل فارغ ہوں۔"

پتا نہیں کیوں اسے یہ بے چینی مصنوعی لگ رہی تھی اور پھر جب فراغت کی نوید ملی تو اس کا یقین بھی ہو گیا۔

"لیکن میں بالکل فارغ نہیں ہوں میں کچھ پراجیکٹس پر کام کر رہا ہوں ایک دو دن میں سروے کے لیے نکل رہا ہوں اور میرا سفر کشمیر کے پہاڑی جنگلات سے شروع ہوگا۔ آپ خواہ مخواہ زحمت کریں گی۔"

''اس موسم میں سفر اور وہ بھی ان علاقوں میں جہاں ٹرانسپورٹ کا کوئی انتظام نہیں دیکھو بیٹے دھیان سے مجھے تمہاری فکر رہے گی۔'' آج ماں کچھ زیادہ ہی جذباتی محبت کا مظاہرہ کر رہی تھی وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔

(بے چارے میرے ماں باپ..... کب تک میرا دل جیتنے کی کوشش کرتے رہیں گے انہیں کب اندازہ ہوگا میں اب ان کے اختیار سے بہت دور جا چکا ہوں)

''اچھا ٹھیک ہے میں کوشش کروں گا یہ سفر چند دنوں کے بعد شروع ہو۔ البتہ آپ کے لیے یہ موسم ٹھیک نہیں رہے گا کافی سردی ہے۔ مجھے ذرا کچھ کام نبٹانے ہیں اس لیے پھر بات کرتے ہیں۔''

اس کا پیشہ ورانہ لب و لہجہ شمائلہ کمال کو محسوس تو ہوا تھا مگر وہ نظر انداز کر گئی تھیں۔ عاشر عباس برسوں پہلے جس خول میں بند ہو کر ماں باپ کی محبت کے دائرے سے نکل گیا تھا اب اس خول کو توڑنا ناممکن تو نہیں البتہ مشکل ضرور تھا وہ ضدی ماں باپ کا بیٹا تھا اس لیے اس کو ہٹ دھرمی ورثے میں ملی تھی۔ اس کا قطعی لہجہ..... حتمی اندازِ گفتگو اور پُر اعتماد شخصیت مقابل کے لیے ہمیشہ چیلنج ثابت ہوتی تھی۔

اور اب تو مدمقابل وہ دو لوگ تھے جو بطور ماں باپ اس کے لیے قدرت نے انعام کیے تھے لیکن اس کے ساتھ قدرت نے قسمت بناتے وقت کمی پیشی کچھ اس انداز سے رکھی تھی کہ آج وہ دونوں لوگ اس کے لیے متنازعہ کردار بنے ہوئے تھے۔ کبھی وہ متنازعے کے لیے ان کا بیٹا بن جاتا اور کبھی ان کی ایسی ملکیت جس ہے جملہ حقوق ضد اور انا کے نام محفوظ کیے گئے ہوں۔

''عاشر تم ایک دن مانو گے اس بات کو کہ تمہارے باپ نے تمہاری ماں کے ساتھ بہت زیادتی کی تھی۔ تم مانو گے اس بات کو کہ تم اپنی ماں کی اولین ضرورت ہو۔ اپنے خون سے تمہاری پرورش کی ہے۔ تم مجھ سے کیسے دستبردار ہو سکتے ہو۔''

وہ سوچ رہی تھیں اور وقت کا پنچھی بڑی کینہ توز نظروں کے ساتھ انہیں دیکھتے ہوئے یہ سوچ رہا

تھا کہ اس عورت کو اپنی ضد کے ٹوٹنے کا کتنا خوف ہے اسے یہ ڈر نہیں کہ اس کوشش میں رشتے ٹوٹ جاتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

جاناں!
میں نے اب کے سال بھی سبز رتوں کا پہلا پھول
اک تیری خاطر شاخ ہجر سے توڑ کے
اپنی زرد کتاب میں رکھا
کوئی نہ جانے
کوئی کوئی آوارہ بھولا بھٹکا بادل
عمر کے ترسے پیاسے دشت کی
پل میں پیاس بجھا جاتا ہے
کوئی نہ جانے
بعض اوقات ایک بھولی بسری ہوئی یاد بھی
ایسے پوری ہو جاتی ہے
جیسے غیر آباد جزیرے
رستہ بھول کے آنے والے لوگوں سے بس جاتے ہیں.....!

"دوستو! کبھی آپ نے سوچا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے یہ غیر آباد جزیرے کیوں ایسے لوگوں کو فراخدلی سے اپنے دامن میں جگہ دیتے ہیں جبکہ وہ ان کے اپنے بھی نہیں ہوتے کیوں ان کے دکھ سکھ کو اپنا کر لیتے ہیں یہ ہنر انہیں کون سکھاتا ہے۔

شاید کوئی نہیں..... یہ تو آپ کا انعام ہوتا ہے جس کے دامن میں سما جائے۔ اور یہ بھی کوئی نہیں جانتا کون کب..... غیر آباد جزیروں پر مستقل ٹھکانہ کر کے دل کی دنیا میں سما جائے۔

یہ بھی تو کسی مانوس اجنبی کی آمد سے پہلے غیر آباد جزیرے کی طرح ہوتا ہے کشادہ مگر بنجر زمین کی طرح جہاں پڑاؤ کرنے والے اپنے قدموں کے نشان چھوڑ جاتے ہیں اور کبھی نہیں پلٹتے اور جسے پلٹنا نہیں ہوتا وہ وہیں ڈیرہ ڈال دیتا ہے اس کا قیام لمبا ہو جاتا ہے۔

کبھی آپ کے ساتھ ایسا ہوا اور اگر ایسا ہوا تو ہمارے ساتھ شیئر کیجیے ہماری ٹیلی فون لائنز کھل چکی ہیں اب سے دو گھنٹے تک اور میں آپ کا ساتھ دوں گی اور میں آپ کا ساتھ دوں گی خوبصورت ٹریکس کے ساتھ لیس دس از خولہ کمال.....''

آج کل وہ اپنے ہر شو کا آغاز شاعری کے خوبصورت انتخاب سے کرتی تھی زبان و ادب پر اس قدر مہارت اور اتنا خوبصورت انتخاب سمیع صولت کو اگر ورطہ حیرت میں ڈال دیتا تھا تو ثمرہ عجیب سی کیفیت سے دوچار ہو جاتی تھی۔

خولہ کمال کو بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہ چند دنوں میں کسی مثلث کا حصہ بن جائے گی۔ سمیع صولت اس کی قابلیت، ذہانت اور حسن سے مرعوب تھا اتنا تو وہ سمجھ سکتی تھی لیکن ثمرہ اسے اپنا حریف اور پھر رقیب سمجھنے لگی تھی یہ جاننے کے بعد شاید وہ صدمے سے بے ہوش ہو جاتی۔

اور باوجود سردی اور خراب موسم کے پاپا کے گاؤں جانے کا پروگرام بنا کر اسلام آباد اسٹوڈیو کو ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہہ دیتی۔

اچھی بات یہ تھی کہ ثمرہ کے احساسات جس انداز سے سمیع صولت کے سامنے عیاں ہوتے تھے اس انداز پر آج تک دوسروں کی نظر نہ گئی تھی۔

اسے یقین تھا کہ خزیمہ اگر یہ شو سن رہا ہوگا تو سب سے پہلا فون اسی کا آئے گا اور ہوا بھی یہ ہی۔

نہ جانے کیوں اپنے یقین کی تصدیق پر وہ بے ساختہ مسکرا دی۔

''جی خزیمہ صاحب کیا کہیں گے آپ زندگی کے اس راز کے متعلق جو ہر کسی کو بتایا بھی نہیں کرتے۔''

''بات یہ ہے کہ اگر راز آپ کو بتا دیا..... وہ راز نہ رہا نا..... ہاں البتہ کبھی آپ سے ملاقات رہی تو ضرور بتائیں گے کے دل کہ غیر آباد جزیرے پر پہلا حادثاتی پڑاؤ کس کا تھا.....''

وہ باتیں بگھارنے میں خاصا کورا تھا لیکن اس وقت اپنی حاضر جوابی کو داد دے رہا تھا۔

''جناب مان لیتے ہیں آپ کی یہ بات بھی کیا سننا چاہیں گے۔''

اور تب خزیمہ نے فرمائش کر دی تھی۔

حسن والوں کو خبر کیا..... عاشقی کیا چیز ہے۔

اور خولہ نے معذرت کرتے ہوئے لائن ڈراپ کر دی تھی یہ غزل ٹریک لسٹ کا حصہ نہ تھی اس نے کمرشل بریک کا اعلان کرتے ایک دوسرا ٹریک اسٹینڈ بائی میں کر لیا تھا۔

☆.....☆.....☆

دراصل کچھ حاصل کرنے کی سرشاری وقت گزرنے کے ساتھ کم ہوتی جاتی ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ ہم اس کے ہونے سے بھی انکاری ہو جاتے ہیں لیکن کچھ کھو دینے کا ملال وقت گزرنے کے ساتھ کم ہونے کے بجائے بڑھتا جاتا ہے صوفیہ کو بیت السکون سے جانے کے بعد احساس ہوا تھا کہ وہ کیا کھو کر آ گئی اور ملال کی اس کیفیت کا غلبہ تو اس اگلے دن سے شروع ہو گیا تھا جب اس کی تائی نے اس کا لحاظ اور مروت بالائے طاق رکھ کر اس کے تایا سے یہ فرمائش کی تھی کہ چونکہ گھر میں ایک فرد کا اضافہ ہو گیا ہے لہذا آپ راشن کا خرچ بڑھا دیں۔

وہ کافی دیر تک انہیں سکتے کے عالم میں دیکھتی رہی تھی ابھی ایک دن بھی نہیں ہوا تھا اور حساب

کتاب شروع ہو گیا تھا اور اس کی امی کے ساتھ کیا کچھ نہ ہوا ہو گا اس کے دل پر چوٹ سی پڑی تھی۔

پھر بھرم ٹوٹا تو آنسو بھی اسی تواتر سے بہنے لگے۔

تایا نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

''اس گھر کا ہر دوسرا بندہ نفسیاتی مریض ہے خاص طور پر تمہاری یہ تائی تم کوئی بات دل پر مت لینا میں ہوں۔ تمہاری دلجوئی کرنے والا مجھے احساس ہے تم نے بہت بڑا قدم اٹھایا۔ تمہارا فیصلہ ہم سب کے لیے باعث فخر ہے۔ آخر کو تم اس گھر کی بیٹی ہو اور راحت بیگم نے تمہیں ہم سے چھین لیا تھا۔

اسے اپنا گھر سمجھو..... مزے سے رہو..... دفتر وغیرہ ابھی جانے کی ضرورت نہیں تمہاری ماں بلاوجہ پریشان یوگی اور ویسے بھی تم شاہد کچھ اور پڑھنا چاہتی ہو.....

گو کہ ہمارے ہاں بیٹیوں کو اتنی آزادی نہیں دی جاتی لیکن تم میری پیاری بیٹی ہو تمہاری خوشی مجھے ہر حال میں عزیز ہے۔''

یہ وہ تمام باتیں تھیں جو تایا نے پہلے دن وقفے وقفے سے اس کی سماعتوں میں منتقل کی تھیں اور دن کے اختتام پر شام گہری ہونے سے پہلے اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ آج اس کی زندگی کی پہلی شام ہو بوجھل..... سیاہ اور گہرے رنج میں ڈوبی ہوئی۔

ورنہ ایسی شام نہ پہلے کبھی آئی تھی نہ خاموشی نے اس انداز سے بین کیا تھا اور نہ ہواؤں کے شور میں اتنی چیخیں تھیں وہ اس کمرے میں جا کر بہت روئی تھی جو کبھی اس کے بابا کا تھا۔ اس کی امی کا تھا آج ان کے نام کا وہاں کچھ بھی نہیں تھا سوائے ان خاموش دیواروں کے جو دو پیار کرنے والے دلوں کے درمیان سچے رشتے کی گواہ تھیں۔

جو ان قربتوں کی گواہ تھیں جب دو قالب ایک جان میں ڈھل جاتے ہیں۔

''بابا! آپ کو بھی جانے کی بہت جلدی تھی۔''

اس نے ہمیشہ کی طرح آنسوؤں جو سمیٹ کر پھر سے خود کو اس فیصلے کے درست ہونے کا یقین دلایا۔

اور آج وہ بیت السکون میں بیٹھی اپنے موجودہ فیصلے کے درست ہونے کا جشن منا رہی تھی۔

''مامی میں نے اچھا کیا نا آ گئی؟''

چہرے پر تکلیف کے آثار ہونے کے باوجود لبوں سے مسکراہٹ جدا نہیں ہو رہی تھی اس دن سب اس سے کس قدر ناراض تھے اور آج کسی کو یاد بھی نہیں تھا کہ اس نے کیا کیا تھا۔

سوائے راحت بیگم اور شجاع کے.....

وہ راحت بیگم کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

''بس کرو.....اپنا بچکانہ پن اب ختم کر دو..... بڑی ہو گئی ہو.....''

انہوں نے دھیرے سے اسے الگ کر کے حوصلے کے ساتھ کہا۔

''میں آپ کے لیے بھی بڑی ہو گئی۔'' اس نے سر پکڑا ہوا تھا۔

''میرے لیے تم اس دن بہت سمجھدار اور بڑی ہو گئی تھیں جب تم نے اس گھر سے جانے کا فیصلہ اس یقین کے ساتھ کیا تھا کہ تم اپنے گھر جا رہی ہو.....''

''مگر امی اس میں غلط کیا ہے.....آپ کچھ تو ان پر ذمہ داری ڈالتیں نا.....''

اس نے آنسوؤں کے درمیان کہا تو وہ مسکرا دیں۔

''تمہیں کیا لگتا ہے یہ زندگی کی آزمائشیں میں نے اپنی خوشی سے منتخب کی ہیں تمہیں وقت کے ساتھ خود ہی احساس ہو جائے گا کہ میرا فیصلہ تمہاری بھلائی کے لیے تھا۔'' وہ تھکے تھکے انداز میں کہتے ہوئے صوفے پر ٹک گئی تھیں اور صوفیہ ان کے گھٹنے تھام کر بیٹھ گئی تھی۔

وہ دراصل ایسے ہجوم میں تنہا کھڑی تھی جو اپنا حق بھی مانگ رہا تھا اور اپنی ذمہ داریوں سے بھی غافل تھا۔

''تم کتنے دن کے لیے آئی ہو اپنے تایا وغیرہ کی ہر مشن لے کر آئی ہو.....''

انہوں نے سنجیدگی سے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''میں ڈاکٹر کے پاس آئی تھی اور میرے ساتھ کوئی نہیں آیا تھا۔ میں کس کو بتاتی..... عامر کو وہ ڈاکٹر بھی ناتجربہ کار لگا اور خود مجھے بھی..... بس میں اس کو اپنے گھر جانے کا انفارم کر کے آ گئی۔ ویسے اگر کسی نے مجھے ڈھونڈنا ہوتا تو اب تک فون آ چکا ہوتا.....''

وہ اپنے سابقہ جامے میں واپس آ رہی تھی اس کا مخصوص پر اعتماد انداز بحال ہو رہا تھا یہ بات اس نے خود بھی محسوس کی۔

اب اتنا کچھ جاننے کے بعد اس کی عقل پر پڑے پردے نہ ہٹتے تو عجب ہی تھا۔

☆.....☆.....☆

نائلہ طارق کا بہت خوبصورت نیا ناول

ہوش رُبا

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

مریم جہانگیر کا بہت خوبصورت نیا ناول

محبت اب اور نہیں

کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
مکمل ناول پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

سردیوں میں سورج کو غروب کی بھی جلدی ہوتی ہے اس کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ آج کے کام اسی تاریخ میں نبٹا لے مگر شام ہوتے ہی گھپ اندھیرے کے بادل ساری توانائیاں سلب کر لیتے یہ کشمیر کا قدرے ترقی یافتہ علاقہ تھا لیکن بجلی کی فراہمی کے مسائل ٹرانسپورٹ کی عدم دستیابی اور سردی کے باعث لوگوں کا شہروں کی طرف تبادلہ تمام سرکاری اور غیر سرکاری کاموں کے تسلسل پر اثر انداز ہوتا تھا۔

سردی کا موسم سارے سال کی تیز رفتاری کو سست روی میں ڈھال دیتا تھا۔ وہ یہاں کی ٹھہری ہوئی زندگی پر اگر..... کرنے نکلتا تو اور بہت سے پہلو ڈھونڈ نکالتا جو سرد اور پہاڑی علاقوں کی سدا بہار ترقی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

ابھی تو اسے صرف اس بات پر غصہ آ رہا تھا کے مختصر سے دن کے بعد طویل شام اور گہری کالی رات میں کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا اور اتنا زیادہ آرام تو اسے اپنی طبیعت کے لیے گراں محسوس ہوتا تھا۔

وولٹیج کی کمی کے باعث آفس میں گزشتہ کئی دنوں سے کمپیوٹرز بھی بند پڑے تھے اور فائلوں میں چھپی کہانیوں کو ڈھونڈنے کے لیے اضافی سرچ لائٹ کی ضرورت پڑ رہی تھی وہ عجیب جھنجلاہٹ کے عالم میں آفس سے نکلا تھا۔ آفیسرز ہاؤس تک کا فاصلہ تو زیادہ نہیں تھا مگر اس نے جان بوجھ کر لمبا راستہ اختیار کیا تھا۔ تا کہ کسی طور تو یہ وقت کٹے اس کے قدم بازار کی طرف مُڑ گئے تھے جس کی رونق بھی سردی کی نظر ہو گئی تھی۔

یقیناً مقامی لوگوں نے اپنی دلچسپی اور زندگی گزارنے کا اہتمام کر رکھا ہو گا جب ہی تو وہ سر شام خوشی خوشی گھروں میں مقید ہو جاتے تھے۔

اس نے سوچا اور ایک کتابوں کی دکان میں داخل ہو گیا۔ جس میں کتابیں کم اور نئے پرانے اخبارات زیادہ تھے وہ کشمیر سے شائع ہونے والے ایک مقامی جریدے کی ورق گردانی کرنے لگا ناقص پرنٹنگ کے باعث گو کہ لفظ آنکھوں کے لیے بوجھل محسوس ہو رہے تھے۔

تب ہی اس کی نظر ایک خبر پر ٹھہر گئی۔

کشمیر کے بیشتر جنگلات جرائم پیشہ افراد کی سرگرمیوں کا مرکز بن چکے ہیں۔ وسیع و عریض رقبے پر پھیلے ہوئے ان جنگلات میں جرائم پیشہ افراد کا قیام اگرچہ کوئی نئی بات نہیں لیکن گزشتہ کئی سالوں سے محکمہ جنگلات کی طرف سے دیکھ بھال میں غفلت کے باعث ان کی مجرمانہ سرگرمیوں کا دائرہ جنگلات کی حدود سے نکل کر لوگوں کے گھروں تک پہنچ گیا ہے خصوصاً خواتین اور بچے مشکوک افراد کی آزادانہ نقل و حرکت کے باعث عدم تحفظ کا شکار ہیں۔

گو کہ خبر عام سی تھی اس نے ابھی تک اس طرح کی بہت سی خبریں جو فائلوں میں محفوظ تھیں اور ان پر آج تک کسی قسم کی کاروائی بھی نہیں کی گئی تھی پڑھی تھیں ان خبروں کی سورس کچھ بھی ہو مگر ایک بات مشترک تھی محکمہ جنگلات کی غفلت یا غیر ذمہ داری.....

گویا یہ محکمہ آج تک کوئی ایسا کارنامہ انجام نہیں دے سکا تھا جس کو مثبت انداز میں خبر کا حصہ بنایا جاتا۔

ایک بک اسٹال یا کتابوں کی دوکان پر کھڑے ہو کر اس طرح کی خبر کا مطالعہ کرنا اسے عجیب سی کیفیت سے دوچار کر گیا تھا۔ وہ بھی تو محکمہ جنگلات کا ہی حصہ تھا اسے بھی تمام تر باتوں کا ذمہ دار بنا کر یہاں بھیجا گیا تھا اور وہ بھی کیا کر رہ تھا سر شام موسم سے شکوہ کرتے ہی اپنے سیاحتی دورے پر نکل جاتا یا اپنے کمرے میں مقید کوئی کتاب پڑھتا رہتا۔

اس نے تو اپنے طور سے آج تک کوئی انوسٹی گیشن نہیں کی تھی شروع میں جس طرح اس نے ایک دو مہم میں حصہ لیا تھا اور حوصلہ افزا نتائج سامنے آئے تھے اگر وہ اسی تسلسل کو برقرار رکھتا تو آج بک اسٹال پر کھڑا اپنا محاسبہ نہ کر رہا ہوتا میں کیا کر رہا ہوں۔

ایک ایماندار افسر وہ بھی تو ہوتا ہے جو کچھ نہ کرے بس معاملات کو نبٹا کر اپنی فائلوں کو تندرست کرتا رہے اور آخر میں دو چار تمغے لے کر رخصت ہو جائے۔

اس سوچ نے ہی اسے اتنا شرمندہ کیا تھا کہ وہ جھرجھری لے کر کتابوں کی دکان سے باہر نکل آیا۔

سامنے ہی چائے کا چھوٹا سا ہوٹل تھا خود کو ری چارج کرنے کے لیے اب چائے بہت ضروری تھی۔ وہ نسبتاً پرسکون سی ٹیبل پر بیٹھ گیا۔ ہوٹل میں رش اس لیے بھی تھا کہ جنریٹر سے چلنے والے ٹی وی پر پڑوسی ملک کے گانے چل رہے تھے۔ چائے اور گانے..... یہاں کے لوگوں کی بے ضرر سی تفریح تھی وہ بے ساختہ مسکرا دیا اپنے سامنے والی ٹیبل پر بیٹھے نوجوان کو دیکھ کر.....

وہ بھی اکیلا بیٹھا تھا اور چائے کا ایک کپ اس کے سامنے رکھا تھا اگلے ہی لمحے وہ اٹھ کر اس کے پاس آ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں شاید کوئی کیمرہ وغیرہ تھا۔

اس کے چہرے پر غیر مقامی ہونے کی چھاپ بڑی واضح تھی عاشر نے کھڑے ہو کر اس سے ہاتھ ملایا۔

''میں کاشف کیانی ہوں آپ کے سامنے والے ریسٹ ہاؤس میں رات کو ہی شفٹ ہوا ہوں۔ میں نے آپ کو صبح دیکھا تھا۔'' اس کے سیاہ بال، سیاہ آنکھیں اور چہرے کی غیر معمولی سرخی کا بڑا انوکھا امتزاج عاشر کے سامنے تھا۔

وہ پہلی نظر ہی میں اسے ذہین اور دلکش شخصیت کا مالک لگا۔

''میں جانتا ہوں آپ عاشر عباس ہیں۔''

''ویری گڈ..... آپ تو خاصے باخبر ہیں۔'' عاشر کی آنکھوں میں چمک بڑھ سی گئی تھوڑی دیر پہلے جب وہ یہاں آ کر بیٹھا تھا اسے کسی اپنے جیسے کی کمی شدت کے ساتھ محسوس ہوئی تھی۔

اس نے سوچا تھا دوست زندگی کا حسن ہوتے ہیں..... تنہا چائے پینے کا بھلا کیا لطف..... اور اب اس سے کاشف کیانی چائے پینے پر اصرار کر رہا تھا۔

''میں جرنلسٹ ہوں ایک انٹرنیشنل نیوز ایجنسی کے ساتھ کام کر رہا ہوں۔ میں اکثر یہاں آتا رہتا ہوں۔ لاسٹ ٹائم یہاں آیا تھا تو آپ شاید اسلام آباد میں گئے ہوئے تھے۔''

''آئی رئیلی ایڈ مائر.....تم واقعی جرنلسٹ ہو.....'' عاشر نے بے تکلفی سے کہتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔

''بٹ میں آپ سے بہت انسپائر ہوا.....لوگ اپنا کیریئر بنانے کے لیے یو کے اور جرمنی جاتے ہیں آپ یہاں چلے آئے.....''

اس کے لہجے میں کوئی بناوٹ نہیں تھی اس کی آواز میں کچھ تو ایسا تھا کہ عاشر نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

''مجھے نہیں پتا کہ میں اپنا کیریئر بنانے یہاں آیا ہوں.....یا اس زمین کی کشش نے مجھے اس راہ پر ڈالا یہ تو وقت بتائے گا میں اپنی ذمہ داریوں سے کس حد تک انصاف کر پایا۔'' ملازم بچہ چائے رکھ کر چلا گیا تھا عاشر نے خود ہی بات پلٹ دی۔

''یہ کیریئر اور پروفیشن کی باتیں پھر کبھی کریں گے تم بتاؤ کیسا لگا یہاں آ کر کام کرنا.....میں تو ابھی تک اس ماحول کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

''اصل میں ہم لوگ تیز رفتار ماحول سے اٹھ کر آئے ہیں اس لیے یہاں آ کر زنگ لگتا محسوس ہوتا ہے۔''

کاشف نے گرم چائے کا سپ انجوائے کرتے ہوئے کہا۔

''حالانکہ یہاں کرنے کے لیے بہت کچھ ہے ہم لوگ اسٹیپ لینے سے گھبراتے ہیں۔'' عاشر نے در پردہ اپنی نالائقی کو لتاڑا تھا۔

''لیکن میرا تو صدمہ کچھ اور ہے.....بازار سنسان.....ویران کھلیانوں میں کوئی رونق نہیں.....رستے بوجھل.....جب وجود زن سے کائنات میں رنگ تو وہ یہاں کیوں نظر نہیں آتا۔'' کاشف کی بے بسی دیکھنے والی تھی اس کا چہرہ ہنسی ضبط کرنے کی کوشش میں سرخ ہو چلا تھا عاشر نے بڑی دلچسپی اور محویت سے اسے دیکھا۔ کتنے مختصر سے وقت میں وہ دونوں بے تکلف ہو گئے تھے۔

ہمارا رب ہمارے دل کی باتیں کتنی جلدی سن لیتا ہے۔اسے حیرت نہیں ہوئی بلکہ شرمساری نے آن گھیرا تھا۔

''اوہ تو یہ مسئلہ ہے تم اس دریافت کے لیے اتنی محنت کرتے ہو ہر سال یہاں آتے ہو۔''

''ہر سال نہیں ہر مہینے۔میرے باس کو بھی مجھ سے ہمدردی ہے کہتا ہے کہ کوشش جاری رکھو۔'' اس نے احتجاجاً کہا۔

''دیکھو اس معاملے میں میرا تجربہ صفر ہے تم کائنات میں حسن کے قائل ہو اور میں ابھی اس صدمے سے بچنا چاہتا ہوں زندگی پڑی ہے ابھی۔''

''عاشر مجھے آپ جیسے ہینڈسم بندے سے ان باغیانہ خیالات کی امید نہیں تھی سوچا تھا مل کر ڈھونڈیں گے۔'' وہ سختی مایوسی کا اظہار کر رہا تھا مصنوعی انداز میں۔

''تمہیں ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں وہ دیکھو سیاہ چادر میں.....'' عاشر نے اس کی توجہ پیچھے کی طرف مبذول کروائی وہ مڑ کر دیکھنا چاہتا تھا مگر عاشر نے ہاتھ پکڑ کر رکنے کا اشارہ کیا۔عاشر کی نظروں نے اس کا تعاقب کیا۔

گہرے سبز لباس اور سیاہ چادر میں ملبوس وہ لڑکی ہوٹل کے سامنے والی پتھریلی سی سڑک ہر سر جھکائے چل رہی تھی اور جب وہ برآمدہ نما ہال کے قریب پہنچی تو اس کا رخ بدل گیا۔

وہ آگے جاتے جاتے پلٹ آئی اب وہ ان دونوں کی طرف آ رہی تھی کاشف کی پشت اس کی طرف تھی۔

اس کے چہرے پر سیاہ چادر کا روایتی سا نقاب تھا البتہ اس کا تذبذب اور پریشانی آنکھوں سے بخوبی عیاں تھی۔

''کیا میں آپ سے بات کر سکتی ہوں۔'' وہ عاشر سے مخاطب تھی ہاتھ مروڑتے ہوئے۔اب

کاشف نے ذرا سا پلٹ کر دیکھا تھا۔اس کے بات کرنے کے انداز میں اعتماد کے ساتھ خوف کی جھلک بھی نمایاں تھی وہ دونوں کھڑے ہو گئے۔

''جی بولیے.....''

''میں یہاں پاس ہی رہتی ہوں.....امی کی طبیعت بہت خراب ہے وہ پبلک ٹرانسپورٹ سے سفر نہیں کر سکتیں۔ ہارٹ پیشنٹ ہیں مجھے کوئی کار یا جیپ وغیرہ بھی نہیں مل رہی جسے ہائر کر لوں آپ پلیز میری ہیلپ کر سکتے ہیں۔''

پتا نہیں کیوں اسے ان دونوں کی شکلوں پر لکھا ہوا نظر آ رہا تھا کہ دونوں اس کی مدد کر سکتے ہیں۔ جبھی وہ آگے جاتے جاتے ان کی طرف مڑ گئی تھی اس کا لہجہ گفتگو کا انداز اس کے تعلیم یافتہ ہونے کی ضمانت تھا۔

کاشف نے عاشر کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''میری جیپ اپنے کمپاؤنڈ میں کھڑی ہے۔'' عاشر اسے ضرورتاً استعمال کرتا تھا ورنہ آفس اور آفیسرز ہاؤس کے درمیان زیادہ فاصلہ نہ ہونے کے باعث وہ اکثر واک کرنے کو ترجیح دیتا تھا۔

''او کے میرے پاس کار ہے آپ انہیں یہاں لے کر آئیں گی یا ہم آپ کے ساتھ چلیں۔''

کاشف کے چہرے پر تھوڑی دیر پہلے کی شرارت کا شائبہ تک نہ تھا۔

''آپ کو گھر آنا پڑے گا میں ان کو بتا دیتی ہوں وہ آپ کو گائیڈ کر دیں گے۔''

اس نے ہوٹل کاؤنٹر پر بیٹھے ایک شخص کی طرف اشارہ کیا جو اتنی دیر میں ان تینوں کی طرف متوجہ ہو چکا تھا بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک چھوٹے سے ہوٹل میں بیٹھے دو اجنبی لڑکے ان کی محلے دار سے بات کر رہے تھے اور ان کے کان نہ کھڑے ہوتے لڑکی نے بھی یہاں کے ماحول کو دیکھتے ہوئے سمجھداری کا مظاہرہ کیا تھا اور لالا صغیر کو اپنی مشکل بتا کر ان سے مدد لینے سے آگاہ کیا۔

''آپ گھر پہنچو..... میں ان کے ساتھ آجاتا ہوں..... اللہ سب ٹھیک کرے گا پریشان نہ ہو۔''

وہ ادھیڑ عمر کا ایک معقول شخص تھا اس کا ہوٹل چونکہ مرکزی مقام پر تھا اس لیے وہ تمام تر سرگرمیوں سے آگاہ رہتا تھا وہ جانتا تھا کہ قدسیہ اپنی ماں کے حوالے سے اکثر پریشان رہتی ہے۔

اور سب سے بڑا مسئلہ یہاں ٹرانسپورٹ کا ہوتا تھا اول تو دستیاب نہیں تھی اور اگر ٹائم ٹیبل کے مطابق دستیاب ہو بھی جاتی تو رش اتنا کہ ایک آدمی بمشکل جگہ بنا پاتا۔

''ہم دونوں آپ کے ساتھ ہی چلتے ہیں آیئے آپ بھی گاڑی میں آجائیں کیوں انکل۔''

کاشف نے ماحول کے مطابق خود کو ڈھال لیا تھا۔

''چلو یہ بھی ٹھیک ہے ویسے میں یہاں سب کا لالا ہوں تم بھی مجھے لالا ہی کہہ سکتے ہو۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے تصحیح کی اور چاروں ہوٹل کے برآمدہ نما صحن سے نکل کر دائیں طرف کی ایک ذیلی سڑک پر آگئے۔

کاشف نے اپنی برانڈ نیو کار کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی اور عاشر عباس اس کے برابر میں بیٹھ گیا تھا جبکہ وہ دونوں پیچھے بیٹھ گئے تھے۔

کاشف نے ذرا سا پیچھے مڑ کر ایک نظر قدسیہ کی ویران آنکھوں پر ڈالی اور گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔

شام نے رات کے اندھیرے کی دہلیز پر اپنا سر رکھ دیا تھا اکا دکا گھروں کی روشنیوں نے ماحول کو قدرے بہتر بنا دیا تھا اور زندگی کے آثار محسوس ہو رہے تھے ان کا سفر ایک ذیلی سڑک سے شروع ہو کر دوسری ذیلی سڑک پر ختم ہو گیا تھا اور اب کاشف کی گاڑی قدرے روشنی میں ایک بڑے سے مگر اجنبی گھر کے سامنے کھڑی تھی۔

☆.....☆.....☆

شجاع اسے نظر انداز کر رہا تھا یا اسے کسی قسم کی سزا دے رہا تھا وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی وہ کل سے یہاں تھی اور ابھی تک اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی یہ محض اتفاق نہیں ہو سکتا تھا وہ جس دن یہاں سے گئی تھی تب بھی وہ بیت السکون میں نہیں تھا اسے یقین تھا اگر وہ ہوتا تو شاید آج حالات مختلف ہوتے.....

اس کا مستقبل اتنا غیر یقینی نہ ہوتا۔

وہ کم از کم اپنے تایا کا یہ حکم ماننے کی پابند تو نہ ہوتی کہ تم کل صبح چلی آنا۔

انہوں نے جب فون کیا تو اپنے گھر والوں کی غیر ذمہ داری اور بے حسی کا قصوروار بھی اس کو ٹھہرا دیا انہیں تو عامر اور انعم کے آنے پر بھی اعتراض تھا اور سب سے بڑی بات وہ اسے اپنے گھر کے رکھ رکھاؤ محلے میں اونچا نام اور لوگوں میں بنی ہوئی برسوں کی ساکھ کے بارے میں بتا رہے تھے جو صوفیہ کی وجہ سے اس کی لاپروائی اور بے وقوفانہ حرکتوں کی وجہ سے متاثر ہو سکتی تھی۔

ایک لمحے کو تو اس کا دل چاہا..... ابھی سارا حساب کتاب برابر کر دے انہیں بتا دے کہ وہ صوفیہ سے مخاطب ہیں جسے غلط کو غلط کہنا بخوبی آتا ہے مگر پہلی بار وہ کسی مصلحت کے تحت خاموش ہو گئی اور محض کل آنے کا کہہ کر فون بند کر دیا۔

''یہ لوگ تو مجھے کچا کھا جائیں گے جس طرح میرے باپ کو کھا گئے۔ ان کے اندر تو انسانیت نام کی کوئی چیز نہیں۔'' اس کی سوچ میں بلا کی تلخی گھلی ہوئی تھی۔

''انعم! مجھے یہ بتاؤ شجاع کہاں ہے؟'' اسے کل جانا تھا وہ آج ہر حال میں شجاع سے ملنا چاہتی تھی وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کے اس کے اندر اتنی بے چینی کیسے سما گئی۔ لیکن اب اگر ایسا ہو چکا تھا تو اس کا کچھ نہ کچھ تدارک بہت ضروری تھا۔

امی آفس سے آ چکی تھیں شجاع بھی اکثر ان کے ساتھ ہی آتا تھا اس لیے اس وقت اس کے آفس میں ہونے کا امکان نہیں تھا۔

''انعم میں نے کچھ پوچھا ہے۔'' وہ برآمدے میں ہی اسے گھیر کر کھڑی ہوگئی تھی اس کے چہرے کی سوجن تو کم ہوگئی تھی مگر گہرے نشانات ابھی باقی تھے انعم نے قدرے دلچسپی سے اس کا چہرہ دیکھا اور مسکرادی۔

''ویسے تم نے اپنے حسن کے دروازے پر اچھا خاصا دربان بٹھا دیا اب تمہیں نظر نہیں لگے گی۔''

''انعم پلیز..... میں اس وقت مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں..... میں بہت گلٹ فیل کر رہی ہوں مجھے شجاع سے ملنا ہے وہ کیوں اتنے نخرے کر رہا ہے۔'' وہ بے بسی سے بولی۔

''گلٹ تم فیل کر رہی ہو۔ نخرے وہ کر رہا ہے۔ عجب مشکل ہے لیکن مجھے کیا پتا وہ کہاں ہے تم اس کا موبائل چیک کرو.....''

''نہیں مجھے اس کا موبائل چیک نہیں کرنا میں نے پہلے بھی کوشش کی تھی وہ لائن ڈس کنیکٹ کر دیتا ہے وہ پتا نہیں کیوں مجھے سزا دے رہا ہے حالانکہ وہ بھی تو مجھے کال کر سکتا تھا..... لیکن اسے سزا جو دینی ہے۔'' صوفیہ نے شاید آج پہلی بار اپنی بے بسی کا ذکر ان الفاظ میں کیا تھا آج اس کی چمکتی آنکھوں میں وہ جوت نہیں تھی بلکہ وہ تو بے خوابی کے دکھ سکھ سے بوجھل ہو رہی تھیں انعم کو وہ دن یاد آ گیا جب اس کی ان ہی آنکھوں میں اجنبیت کے رنگ بڑے واضح تھے اور مذاق اڑا کر چلتی بنی تھی مگر مسئلہ یہ تھا کہ اس کی محبت میں کوئی غرض نہیں تھی پتا نہیں کیوں اس کی بڑے سے بڑی غلطی بھی تھوڑی دیر کے بعد اس کی حماقت محسوس ہوتی تھی اور حماقتیں اکثر نظر انداز کر دینے کے لئے ہوتی ہیں اس لیے وہ اور عامر سب کچھ بھول کر اس سے ملنے اسے دیکھنے چلے گئے تھے۔

اور اسے دیکھ کر انہیں محسوس ہوا تھا جیسے وہ سالوں سے اسی گھر میں رہ رہی ہو۔

اس کا چہرہ، اس کی آنکھیں اس کے بالوں کے سیاہ گچھے مدتوں سے وقت اور حالات کی گرد سے اٹے ہوئے ہوں۔

وہ اتنے تھوڑے دنوں میں فریب زندگی سے آشنا ہو کر اپنی آنکھوں کی مشعلیں گُل کر بیٹھی تھی۔

شاید اسی لیے کسی نے بھی کچھ کہے بغیر اسے گلے سے لگا لیا تھا اس کے چہرے پر جو لکھا تھا اس نے کسی ایسے جنگل میں رہنے کا انتخاب کر لیا ہے جو برسات میں بھی جلتا ہو۔

''میرے خیال میں وہ اپنے کمرے میں ہوں گے۔'' انعم کا دل چاہا ہو چھے دل کے دریچے پر ہونے والی دستک کیسی محسوس ہوتی ہے مگر وہ بہت جلدی میں تھی اس نے بغیر سوچے سمجھے اپنے قدم اس منزل کی طرف بڑھا دیئے تھے جہاں ہر قافلہ دل کو پہنچنے کے لیے کسی یاد اور احساس کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

محبتوں میں عداوتیں کیسی
چاہنا کسی کو تو پھر شکایتیں کیسی
جب تمہارا اس پر اعتبار ہے اتنا
تو ذرا ذرا سی بات پر وضاحتیں کیسی

وہ جتنا اس کمرے میں آنے سے گھبراتی تھی اس وقت اسی کا دروازہ بغیر دستک دیے کھول لیا تھا۔

اپنے بیڈ پر نیم دراز ٹی وی کی طرف متوجہ شجاع نے پلٹ کر دیکھا اور پھر دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔

''آپ سمجھتے کیا ہیں خود کو آپ سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ میری خیریت ہی پوچھ لیں۔''

سبز اور زرد رنگ کی شوخ پھولوں والی شال میں لپٹی ہوئی صوفیہ کی زبان وہ سب کچھ بالکل نہیں بول رہی تھی جو اس کے چہرے اور آنکھوں میں درج تھا۔ شجاع ایک گہری سانس لے کر کھڑا ہو گیا۔

صوفیہ اگلے لمحے اس کے مدمقابل تھی اور اس کے ہاتھ سے ریموٹ لے کر ٹی وی آف کر دیا تھا۔

آپ نے تو شکر ادا کیا ہو گا میں یہاں سے چلی گئی۔ لیکن آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں مر گئی۔

اب تو آنکھیں، چہرہ اور زبان سب ہم آواز ہو گئے تھے شجاع نے دو قدم آگے آ کر اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی تھی۔

''خاموش ہو جاؤ ہمیشہ فضول بکواس کرتی ہو۔ فضول فیصلے کرتی ہو اور ہم سب کو گھاس کھلا کر چلتی

بنتی ہو اور جب ہر فیصلہ اپنی مرضی سے کرتی ہو تو پھر اب کیوں رونا شروع کر دیا ہے۔'' وہ اس کے اتنے قریب تھا کہ صوفیہ کو اپنا آپ جلتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ حیران آنکھوں میں پگھلتی چاندنی میں اتنی چمک تھی کہ اس کی نظریں بے اختیار جھکتی چلی گئیں۔

''میں نے یہ فیصلہ اپنی مرضی سے ضرور کیا تھا لیکن مجھے کسی نے نہیں روکا کہ میں اپنی مرضی نہ کروں۔ کیا عائزہ، انعم میں سے کوئی ایسا کرتا تو ماموں اتنی آسانی سے مان جاتے.....''

اس کے لہجے میں کوئی تو ایسی بات تھی کہ شجاع کے دل پر چھائی بدگمانی خود بھی سوالیہ نشان بن گئی۔

''لیکن تم ہم سب کو اذیت دینے کے لیے ایسی باتیں کیوں کرتی ہو تم نے اگر یہ فیصلہ اپنے بھلے کے لیے کیا ہوتا تو مجھے اتنا افسوس نہ ہوتا۔'' وہ تاسف سے بولا۔

''اور جو اذیت میں جھیلتی ہوں وہ کچھ نہیں۔''

وہ بے بسی سے سر جھکا کر رہ گئی۔

''جب آگ دونوں طرف برابر لگی ہوئی ہے تو جھگڑا کس بات کا۔'' وہ شوخی سے مسکرا دیا۔

''کیا مطلب جھگڑا کس بات کا میں تو اس بات پر جھگڑ رہی ہوں کہ آپ میری خیریت پوچھنے کے بھی روادار نہیں.....'' اس نے بڑی خوبصورتی سے شوخ لمحوں کی جسارت کو روک دیا تھا۔

''اور کس بات کا غصہ ہے۔'' شجاع سب کچھ بھول کر اب اسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ ہمیشہ کے لیے اس کمرے میں آ گئی ہو۔ اس کی زندگی میں آ گئی ہو۔

''آپ نے مجھے فون تک نہیں کیا۔''

اب اس نے رخ پھیر لیا تھا۔

''تم مجھ سے پوچھ کر مجھے بتا کر گئی ہو.....''

''میں کب بتاتی میں نے بس اچانک فیصلہ کر لیا تھا۔''

''اور اگر تمہارا یہ اچانک فیصلہ کسی کی جان لے لیتا.....''

''نہیں شجاع کوئی نہیں مرا کرتا ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر.....''

''ایک بار پھر میرا نام لو.....''

''کیا بدتمیزی ہے کیوں میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔''

''نام لو نا پلیز..... بہت دنوں سے میری سماعتیں اس آواز کی متلاشی تھیں۔''

''شجاع پلیز.....'' اس کی بے بسی قابل دید تھی شجاع کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے آج بلی شیر کے قبضے ہے بلی بھی وہ جس کے خونخوار پنجوں سے شیر بھی محفوظ نہیں تھا۔

''اگر کوئی کسی کے لیے نہیں مرتا۔ تو پھر یہ کیا ہے تم کیوں مجھ سے لڑ رہی ہو کہ آپ مجھ پر نہیں مرتے.....''

اس کے دل کی دنیا میں کئی جگنو اور ستارے روشن ہو گئے تھے۔

''شجاع آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں میں یہاں آئی تھی سب کے سے ملی تھی اور کل مجھے جانا ہے آپ سے نہ ملتی تو کتنا افسوس ہوتا نا آپ کو.....''

''تمہاری ہمت ہے یہاں سے قدم باہر نکالنے کی اب..... تم مجھے بتا رہی ہو کہ میں کل چلی جاؤں گی..... دس از ٹو مچ صوفیہ۔''

اس کا لہجہ ہی نہیں چہرے کا رنگ بھی بدل گیا تھا وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر صوفہ کم بیڈ کی طرف مڑ گیا۔

''بیٹھو یہاں پر اور کچھ عقل کی باتیں کر لو.....'' وہ بھی اس کے سامنے بیٹھ گیا تھا۔

''صرف مجھے یہ بتاؤ کہ تم کس مجبوری کی بنا پر وہاں جا رہی ہو..... تم نے ان لوگوں سے کیا کمٹ منٹ کی ہے۔

آج بیس بائیس سال کے بعد تمہاری پرواہ کرنے کے لیے وہ سب لوگ کیوں بے چین ہو گئے

مجھے ان سوالوں کے جواب دو ابھی اسی وقت۔"

"میرے پاس ان سب سوالوں کے جواب نہیں۔" وہ یکدم ہی سر اس کے کندھے پر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

☆.....☆.....☆

"یار! شمائلہ تو کرپٹ عورتوں کی طرح ہوتی جا رہی ہے۔"

اس کے اردگرد آوازوں کا ہجوم تھا اور اس ہجوم میں سب سے نمایاں آواز اس کی قریبی سہیلی کی تھی۔ اس کی گہری نیند جیسے کسی خوفناک دھماکے سے ٹوٹی تھی وہ بل کھا کر اٹھی اور ٹیبل لیمپ آن کر کے نیند سے بوجھل آنکھوں کو کھولنے کی کوشش کی مگر ان میں تو مرچیں سی گھل گئی تھیں۔

اس نے اپنے ساتھ والے تکیے پر ہاتھ مارا۔ وہاں کوئی نہیں تھا اس بار آنکھیں بغیر کسی کوشش کے کھل گئی تھیں۔ آنکھیں نہ بھی کھلتیں سویا ہوا ذہن تو جاگ ہی گیا تھا۔

رات کا آخری پہر شروع ہو چکا تھا اور منیر کمال اس کے ساتھ اپنے بستر پر نہیں تھا اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا جگ اٹھا کر پانی گلاس میں انڈیلا اور ڈھیر سارا پانی ایک ہی سانس میں حلق سے اتارا۔

پتا نہیں کیوں آنکھوں میں سوئیاں اور حلق میں کانٹے چبھتے تو وہ ان کی تکلیف کم کرنے کی کوشش نہیں کرتی تھی اس کا دل چاہتا تھا آگ یونہی لگی رہے اور اس کا وجود دھواں دینے والی لکڑی کی طرح سلگتا رہے لیکن اس وقت تو آگ ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔

آنکھوں کی سوئیاں تو منیر کمال کی بے حسی پر نکل گئی تھیں اور حلق کے کانٹے اس کو آواز دینے کے لیے ختم کرنے پڑے تھے۔

وہ موبائل اٹھا کر حیرت سے دیکھنے لگی۔

تین مس کالز تھیں اور تینوں منیر کمال کے موبائل سے تھیں حیرت ہے شاید ایک گھنٹہ پہلے ہی تو ان

دونوں کی بات ہوئی تھی اور اس نے دس منٹ میں آنے کا کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔

شمائلہ نیند کی گولی لے چکی تھی اس لیے بستر پر جاتے ہی بے سدھ ہو گئی تھی۔ اور ویسے بھی ان دونوں کے درمیان زندگی کے کسی موڑ پر ایسی کوئی شرائط نہیں طے ہوئی تھیں جن کے مطابق وہ ایک دوسرے کا انتظار کرتے یا ایک دوسرے کی نیند پر اثر انداز ہوتے اگرچہ آزادی کی یہ زندگی شمائلہ کی اپنی منتخب کردہ تھی لیکن کبھی کبھی اس کے اندر کی عورت بے دار ہوتی تو اس کا دل چاہتا وہ منیر کمسل کو گریباں سے پکڑ لے اور اس سے پوچھے تم اتنی حسین و جمیل بیوی کے ہوتے ہوئے ادھر ادھر کیسے منہ مار لیتے ہو مگر بہت سارے احتجاج نما جملے اکثر اس کے اندر ہی گھٹ کر رہ جاتے اور اس کے اردگرد مختلف آوازوں کے ہجوم کے ساتھ ایک آواز سب سے بلند ہوتی۔

''شمائلہ! کرپٹ عورت تھی۔''

اس نے منیر کمال کا نمبر ڈائل کیے بنا موبائل سائیڈ ٹیبل پر پٹخ دیا اور بوجھل ہوتے سر کے ساتھ اپنی پسندیدہ کیبنٹ کی طرف آ گئی جہاں مختلف قسم کے ملکی اور غیر ملکی مشروبات سجے ہوئے تھے اس نے ایک فلیور منتخب کیا اور بوتل لے کر روم فریج کی طرف آ گئی۔

وہ آگ جو تھوڑی دیر پہلے ٹھنڈی ہو گئی تھی اسے سلگانا ضروری تھا گیلی لکڑی کی طرح.....

☆.....☆.....☆

منیر کمال کا انتخاب اس نے خالصتاً کاروباری شرائط کے ساتھ کیا تھا اور اپنی آزادی کی زندگی کا تسلسل برقرار رکھنے کی اجازت بھی انہی شرائط کا حصہ تھی منیر کمال اس کی زندگی میں آنے والا دوسرا مرد تھا۔ وہ طارق محمود کی بیوی تھی اور یہ شخص اس کے حواسوں پر چھا گیا تھا۔

وہ حاضر جواب، شوخ، عورت کی۔ نفسیاتی کمزوریوں کو بڑی خوبی کے ساتھ اپنی گرفت میں لینے والا ہوشیار مرد تھا اس کی مردانگی ہوس بن کر نہیں بلکہ ہیجان انگیز جذبات کی صورت میں آنکھوں سے جھلکتی تھی جس میں ضرورت کے مطابق کمی پیشی کر لیتا تھا۔

وہ طارق محمود کی طرح سنجیدہ، کم گو اور دھیمے مزاج کا بارعب مرد نہیں تھا۔

اس کی بے باکی اور زندہ دلی کے چرچے تو پورے کلب میں عام تھے۔

یہ وہ کلب تھا جہاں رات گئے تک امراء اور رؤسا کی محفلیں جمتی تھیں اور طارق محمود ان کا روح رواں ہوتا تھا۔

بزنس کی باتیں اور مالیاتی خسارے پر تبصرے.....

سیاسی اتار چڑھاؤ کے معاملات.....

اسٹاک مارکیٹ کی صورتحال پر اثر انداز ہونے والی پالیسز.....

اور بھی نہ جانے کیا کچھ.....

ایسے میں امراء اور رؤسا کی بیگمات کے لیے دلچسپی کا محور منیر کمال کی وہ تھیٹر کمپنی بن گئی تھی جو کلب کے ممبران کے لیے ہر مہینے ایک تھیٹر ڈرامہ منعقد کرنے کی پابند تھی۔

اسٹریٹ تھیٹر کرنے والی کمپنی کو اتنا بڑا کنٹریکٹ قسمت سے ہی ملا تھا یا پھر منیر کمال کی چرب زبانی اور کاروباری صلاحیتوں نے اس کمپنی کو راتوں رات شہر کے اعلیٰ طبقے کا حصہ بنا دیا تھا۔

وہ تو اس رنگ برنگی دنیا میں آ کر حیران کم اور پھر متجسس زیادہ تھا اس کی آنکھیں ہر لمحہ کھوج میں رہتیں اس کے چہرے کی مسکراہٹ کے پیچھے بس ایک سوال کلبلا رہا ہوتا۔

"یہ لوگ زندگی کے ہر حسین لمحے سے کیسے محظوظ ہوتے ہیں.....؟"

وہ بعض اوقات کسی تنہا گوشے میں بیٹھ کر ان عورتوں اور مردوں کے چہرے پڑھنے کی کوشش کرتا جو بظاہر تو ساتھ نظر آتے مگر کوئی تو تشنگی تھی جو خلیج پیدا کر رہی تھی۔

اس نے بہت جلدی یہ جان لیا تھا کہ اس کلب میں آنے والی بیشتر خواتین اپنے شوہروں سے نالاں ہیں اور بہت سے شوہر اپنی بیویوں کو بس مجبوراً برداشت کر رہے ہیں۔

زبردستی کے یہ بندھن دونوں فریقین کی سرگرمیوں پر اثر انداز نہیں ہوتے تھے مصنوعی ہی سہی مگر اسے اس رنگ برنگی خوشبوؤں سے مہکی ہوئی دنیا میں ہر کوئی قہقہے لگاتا نظر آتا۔

زندگی جینے کا یہ انداز انوکھا تو نہیں تھا البتہ اس کی دلچسپی کا محور اس لیے بن گیا تھا کہ وہ بنیادی طور پر ڈرامے اور تھیٹر کے شعبے کا آدمی تھا۔

وہ خود لکھتا اداکاری بھی کرتا تھا اسے ہر لمحے نئے واقعے اور نئی کہانی کی تلاش رہتی تھی۔

وہ سنجیدہ تھیٹر کے حوالے سے کام کر رہا تھا اس کی کمپنی اپنے مرکزی خیال اور مخصوص قسم کے نظریات کے ساتھ کام کر رہی تھی۔

عورتوں کے وہ جذباتی اور نفسیاتی مسائل جو ان کی ذہنی آزادی اور تخلیقی صلاحیتوں پر اثر انداز ہوتے تھے ان کے بنیادی حقوق کے حصول کی راہ میں رکاوٹ بنتے۔

اس نے چند دنوں کے مشاہدے کے بعد اپنی کمپنی سے وابستہ ادیبوں کو اس طرح کے موضوعات پر اسکرپٹ لکھنے کی ذمہ داری سونپ دی تھی۔

اس سلسلے کی اس کی پہلی کاوش ہی خواتین میں خاص طور پر مقبول ہو گئی تھی۔

وہ ایک رقاصہ کی کہانی تھی جسے کلاسیکل رقص کا جنون کی حد تک شوق ہوتا ہے مگر ایک شو کے دوران اس کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔ اور وہ وہیل چیئر پر آ جاتی ہے۔

پھر اس کا تمام وقت اس حسرت اور ملال میں گزرتا ہے کہ وہ کب اور کیسے دوبارہ اپنے مشغلے کی طرف جا پائے گی اسی دوران اس کی جذباتی وابستگی ایک مرد کے ساتھ ہو جاتی ہے جو اس کے دل کی دنیا پلٹ دیتا ہے مگر وہ اسے رقاصہ کی حیثیت سے مسترد کر دیتا ہے۔

جذبات کا اتار چڑھاؤ اندرونی کیفیات کا بھرپور اظہار اور آنکھوں کے آئینے سے جھانکتا سوز و گزار

وہ عشاء کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد تسبیح لے کر بیٹھی تھیں صوفیہ نیب آ کر ان کی گود میں سر رکھ دیا تھا۔

''امی آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں نا۔''

''کیا تمہیں اس سے کوئی فرق پڑتا ہے۔'' وہ تسبیح دراز میں رکھ کر اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

''سارا جھگڑا ہی تو اسی توجہ کا تھا اس نے سب سے پہلا شکوہ ان سے یہ ہی تو کیا تھا کہ وہ ان کی سوتیلی بیٹی ہے۔

''مجھے بہت فرق پڑتا ہے آپ جانتی ہیں لیکن میں یہ بھی چاہتی ہوں کہ آپ اس حقیقت کو تسلیم کر لیں کہ میں نے یہ فیصلہ ہم سب کی بھلائی کے لیے کیا ہے۔''

اس کے چہرے پر اب تھوڑی دیر پہلے والی بشاشت نہیں تھی۔ کوئی انجانا سا احساس تھا جسے راحت بیگم بھی سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''دیکھو صوفی! تم ان کا خون بے شک ہو۔ لیکن تم میری بیٹی ہو اس عورت کی بیٹی جسے وہ اپنے خاندان یا گھر کا حصہ کبھی نہیں بنا سکے۔''

''امی! ایسا کیوں ہوا تھا کیا آپ نے ان کے گھر کا حصہ بننے کی کوشش نہیں کی تھی۔''

''پتا ہے صوفیہ کبھی کبھی مجھے تمہارے سوال، تمہارا تجسس تکلیف میں مبتلا کر دیتا ہے میں تمہاری ماں ہوں اور تمہاری خوشی تمہارا سکون میری زندگی میں سب سے پہلے ہے۔ لیکن تم یہ سوچتی ہو کہ میں نے اپنی خوشی اپنے سکون کی خاطر تم سے تمہارا گھر تمہارا خاندان چھین لیا۔ وہ لوگ دور کر دیئے جو تمہاری زندگی کے بارے میں مجھ سے زیادہ فکر مند ہیں۔

تمہیں حیرت ہوتی تھی کہ میں نے تمہیں جانے دیا تمہیں روکا نہیں تم پر غصہ نہیں کیا نہ تمہارے کسی ماموں ممانی نے تمہیں روکا تمہیں لگا کہ سب تمہیں بوجھ سمجھ رہے تھے اب تمہارے جانے سے خوش ہیں پتا ہے ہم سب نے تمہیں کیوں نہیں روکا تھا۔ تاکہ تم مجھے مورد الزام ٹھہرانے کے بجائے خود حالات کا جائزہ لو ان لوگوں میں رہو اور ہر فیصلہ کرو کہ تمہاری ماں نے اپنے آرام اور خوشی کو ترجیح دی تھی یا تمہاری اچھی زندگی کو.....

اب تمہیں روکنا ہم میں سے شاید کسی کے بس میں نہیں تھا اور سب سے بڑی بات مجھے تمہاری

آنکھوں کی بدگمانی تکلیف دیتی ہے۔تمہارا لہجہ میری طاقت سلب کر لیتا ہے مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے میں تمہاری خوشیوں کے لیے اپنی انا کا دائرہ توڑ دیتی تو آج یوں تمہاری گفتگو میں احساس محرومی نہ ہوتا۔

تم نے سب سے اپنے حصے کی محبت وصول کی۔ جسے تم ترس سمجھتی رہی میں چاہتی ہوں کہ تم اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق اپنے مستقبل کا فیصلہ کرو ہوسکتا ہے اس میں مجھے نقصان اٹھانا پڑے لیکن ایک دن تو ایسا ہونا ہے نا.....''

انہوں نے ایک گہری سانس لی وہ اس کے گھنگریالے بالوں کو نرمی سے سلجھا رہی تھیں ان کا پور پور محبت کی بولی بول رہا تھا اور صوفیہ کی ہر دھڑکن سماعت بنی ہوئی تھی۔آج اتنے دن بعد ماں کی قربت اور ان کی گود نصیب ہوئی تھی، اس کا دل چاہ رہا تھا اس رات کی صبح کبھی نہ ہو وہ یونہی ان کی محبت اور توجہ کا مرکز بنی رہے۔ پتا نہیں کیوں اس کی تشنگی کبھی ختم نہیں ہوتی تھی۔شاید وہ ایک تقسیم شدہ ماں کی بیٹی تھی جسے کام بھی کرنا تھا اپنے دکھوں پر تنہائی میں بیٹھ کر ملال بھی کرنا ہوتا تھا اور اسے وقت کی گردش سے بچانے کے لیے بہت زیادہ محنت بھی کرنا تھی۔

وہ اپنے بھائیوں کے لیے بوجھ نہیں تھیں اور ایسا نہیں تھا کہ صوفیہ کے ماموں اس کا خرچ نہیں اٹھا سکتے تھے ان کے تمام بھائی اس حیثیت میں تھے کہ اپنی بہن اور بھانجی کی کفالت کر سکتے تھے لیکن ان کی خودداری کے لیے یہ بہت بڑا دھچکا تھا کہ وہ صوفیہ کی بہترین زندگی کے لیے اپنے بھائیوں پر انحصار کرتیں۔

صوفیہ کا اعتماد شاید اسی دن رخصت ہو جاتا جب وہ شعور کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی اس احساس سے آشنا ہوتی کہ اسے ہمدردی کے عوض سے پالا جا رہا ہے دراصل ہم جس معاشرے میں سانس لے رہے ہیں یہاں قدم قدم پر جس نوعیت کی منافقت اور بے حسی کا سامنا ہوتا ہے اس میں اگر کوئی اچھائی اور سچائی کے راستے پر چلنا چاہے حقوق العباد کی اصل حقیقت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائے تو اول لوگ اس کا جینا حرام کر دیتے ہیں یا پھر اس کی ذمہ داری کی فہرست بننے والوں کی زندگی تماشا بن جاتی ہے۔راحت بیگم کی دور اندیشی نے آنے والے وقت کے مسائل کو بہت پہلے جان لیا تھا اور انہوں نے

خود کو ہر طرح کی مشکلات کا عادی بنانے کی مشق شروع کر دی تھی۔

صوفیہ کی بہترین اسکولنگ

اس کے مہنگے ترین مشاغل

پُر آسائش زندگی

یہ سب کچھ بغیر پیسے کے ممکن نہیں تھا۔ شاید زندگی اس موڑ پر اپنی تلخ سچائیوں کے ساتھ سامنے آ کر کھڑی ہو جاتی ہے اور آپ کی سب سے بڑی طاقت وہ دولت بن جاتی ہے جو صرف آپ کی ہوتی ہے۔

محرومی کی زندگی میں خوشیاں بھی بوجھل محسوس ہوتی ہیں۔

وہ صوفیہ کو کسی محرومی سے آشنا نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

لیکن اب صوفیہ کی آنکھوں میں ڈھیر سارے شکوے دیکھ کر انہیں اپنی عمر بھر کی ریاضت رائیگاں جاتی محسوس ہوتی تھی۔

انہیں محسوس ہوتا تھا جیسے ماں کی تربیت پر خون کی تاثیر غالب آ گئی ہو اسی لیے جب صوفیہ نے اپنے تایا کے پاس جانے کا فیصلہ کیا تو وہ ہار سی گئیں۔

صوفیہ کی آنکھوں میں وہی اجنبیت تھی جو کئی سال پہلے اس کے تایا چچا کی آنکھوں میں تھی۔

اس کا لہجہ اتنا بے رحم تھا کہ ماضی کے کئی بھیانک منظر ان کی نگاہوں کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے اور وہ ضبط کے دریا میں ڈوبنے ابھرنے لگیں۔

ان کی خاموشی ہی ان کا احتجاج تھا جسے صوفیہ نے ان کی کمزوری سمجھا لیکن محض چند دن کے بعد وہ اس احتجاج کے پس منظر سے آشنا ہو گئی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے اس نے خود اپنے ہاتھوں سے گڑھا کھودا اور اس میں کود گئی ہو.....

تائی نے بڑی ڈھٹائی کے ساتھ اسے گھر کے خرچ میں شیئر کرنے کے لیے کہا تھا او وہ حق دق کھڑی رہ گئی تھی۔

''کیا کروں پورا نہیں پڑتا۔ سفیر کی بیماری گھر کے سو اخراجات اور پھر تم تو کماتی ہو۔ اپنی ماں کو بھی تو دیتی ہوگی۔ یہ بھی تو تمہارا ہی گھر ہے ہمیں تو اس حادثے نے مار ڈالا ورنہ سفیر بہت محنت کر رہا تھا تمہارے تایا اب اس عمر میں کہاں تک کریں۔ مارکیٹ بھی تو ٹھنڈی پڑی ہے۔''

اس کے تایا ہول سیل مارکیٹ سے منسلک تھے۔ چاول اور دالیں ان کے بنیادی آئٹم تھے۔ ان کا کاروبار گھاٹے میں جا رہا ہو یا منافع میں۔ صوفیہ کو تو یہ لوگ کسی حال میں بھی خوش نہیں لگے تھے اب پتا نہیں خوشحالی اسے نظر نہیں آتی تھی یا پلاسٹر ادھڑی دیواروں کے پیچھے چھپی ہوئی تھی لیکن کوئی تو بات تھی جو اسے سمجھنے میں دقت ہو رہی تھی۔

''مگر تائی مجھے تو امی سے پاکٹ منی لینا پڑتی تھی، اینڈ آف منتھ میں تو سارے پیسے اڑا دیتی تھی۔''

اس نے سرد مہری سے کہہ کر ٹی وی کی طرف منہ کر لیا۔

''کیوں تمہاری ماں نے تمہیں یہ نہیں سکھایا کہ برے وقت کے لیے کچھ بچا کر رکھتے ہیں۔ وہ تو بڑی ہوشیار تھی دیکھو نا۔ آج اس کی ہوشیاری اس کے کام آ رہی ہے۔ ہم تو گنوار ہی رہے۔''

صوفیہ کے کان کھڑے ہوئے آج پہلی بار اس کی ماں پر تبصرہ اس گھر میں ہو رہا تھا وہ بھی اتنے متنازعہ الفاظ کے ساتھ۔

اس کا تجسس تائی کو مزید بولنے پر اکسا رہا تھا۔

ناول خواب خواہش اور زندگی ابھی جاری ہے۔ مزید واقعات اگلے صفحات میں پڑھیں۔

قسط نمبر 3

''امی ہشیار اور آپ گنوار..... پھر جھگڑا تو نہ ہوانا۔''

اسے اپنا جملہ خود بھی سمجھ نہیں آیا تھا البتہ موقع کی مناسبت سے تائی کو تاؤ دلانے والا ضرور لگا تھا۔

''ارے ہم سے کہاں جھگڑا کیا اس نے۔ وہ تو ہمیں اس قابل بھی نہیں سمجھتی تھی۔ پڑھی لکھی تھی یروقت دوسرے مسئلوں میں الجھی رہتی تھی۔'' انہوں نے ایک گہری سانس لی صوفیہ کو حیرانی سی ہوئی۔

''دوسرے مسئلے؟''

''تو اور کیا بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا اس کا، کتابیں، فائلیں اس کا تو گھر میں دل ہی نہیں لگتا تھا۔''

''اور میرے ابو؟'' وہ دفعتاً ان کی بات کاٹ کر بولی۔

''وہ بے چارہ کیا کرتا کینسر کا مریض جو باہر ملک سے کما کر لایا تھا سارا بیوی کو دے دیا ہم تو سوچ رہے تھے اس گھر کی مرمت کروائے گا مگر اس نے تو اول دن سے ہی الگ ہونے کا سوچ رکھا تھا۔''

تائی کی ٹھنڈی آہیں، صوفیہ کی حیرانی اور بڑے سے کمرے کا بے ترتیب ماحول اس ساری کہانی کو پس منظر فراہم کر رہا تھا۔

صوفیہ کے لیے یہ دھماکہ تو تھا کہ اس کے ابو کو کینسر جیسی بلا نے نگل لیا وہ ٹی وی کی آواز مدہم کر کے ان کے قریب چلی آئی تھوڑی دیر پہلے ان کا بھی سارا دھیان ماضی کی اس داستان پر مرکوز تھا لیکن اب وہ سبزی والے کو گالیاں دے رہی تھیں جس نے گلی سڑی پالک دے دی تھی۔

''حرام خود کہیں کے سبزی میں پانی ڈال ڈال کر اس کا بیڑا غرق کر دیتے ہیں تو لوکلو.....اور نکلے پاؤ.....حد ہے بے ایمانی کی۔''

وہ تیز طرار زبان کے ساتھ تیکھے نقوش اور مضبوط جسامت کی مالک تھیں۔ان کی آواز ان کے مزاج کے ساتھ بالکل فٹ بیٹھتی تھی۔صوفیہ کو تو اول ملاقات میں ہی ان سے وحشت سی محسوس ہوئی تھی۔ انسیت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا وہ ان سے سو دور ہی رہتی تھی لیکن آج قریب آنے کا بہت فائدہ ہو گیا تھا تب اس نے سوچا تھا اس بے رحم عورت کے ساتھ وقت گزارنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

''امی.....'' اچانک ہی اس نے سر اٹھا کر انہیں پکارا اور وہ اپنے خیالوں کی دنیا سے پلٹ کر آئی تو صوفیہ ایک اور بے رحم یاد کے ساتھ ان سے مخاطب تھی۔

''ابو کو کون سا کینسر تھا آپ نے کبھی مجھے نہیں بتایا کیا ان کا علاج نہیں ہوا تھا یا آخری اسٹیج پر۔''

''بلڈ کینسر۔'' وہ اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول پڑی تھیں۔

''کیا آپ نے ان کی زندگی میں ہی کام شروع کر دیا تھا۔'' یہ دوسرا پیالہ تھا زہر کا جو وہ خاموشی کے ساتھ پی گئیں۔

''نہیں میں تمہارے ابو کی بیماری کی وجہ سے ان کی ہیلپ کر دیا کرتی تھی خاص طور پر پیپر ورک وغیرہ کے معاملے میں۔''

''گارمنٹ فیکٹری ان کی زندگی میں شروع ہوئی.....'' وہ بے چین سی تھی۔

''نہیں.....اس زمانے میں انہوں نے ایک کمپنی میں اپنا سرمایہ انویسٹ کیا تھا جس کا انجام کمپنی فلاپ اور عمر بھر کی جمع پونجی ڈوب گئی تھی تب ہی ان کا کینسر ڈائگنوس ہوا اور وہ جینے کی خواہش کو موت کی نیند سلا کر ایک دن چپکے سے قبر میں اتر گئے۔'' اندرونی کرب ان کے چہرے سے جھلک رہا تھا۔

''آئی ایم سوری امی! میں نے آپ کی تکلیف کم کرنے کے بجائے بڑھا دی۔میں آپ کو دکھی نہیں

کرنا چاہتی تھی اور نہ ہی ان سارے سوالوں کا مقصد کوئی بے اعتباری ہے پتا ہے امی مجھے اس بات کا سو فیصد یقین ہے کہ میری ماں نے اپنی زندگی کا کوئی بھی فیصلہ اپنی خوشی اور بھلائی کے لئے نہیں کیا ہوگا....."

اس کی آنکھوں میں بے اختیار امڈ آنے والی نمی انہیں بے چین کر گئی تھی وہ ضبط کر رہی تھیں۔اس کی عمر کی لڑکیاں تو بس انوکھے رو پہلے خواب دیکھتی تھیں اور خوش رہتی تھیں پتا نہیں کیوں وہ سب سے مختلف تھی۔

بچپن میں بھی وہ بڑی بڑی خواہشیں کرتی تھی۔

"میرا دل چاہتا ہے ساری دنیا کے بچے میرے گھر آجائیں۔"

ایک دفعہ اس نے کسی پارک کے بینچ پر بیٹھے ہوئے کہا تھا۔

"تو آپ پھر کہاں رہیں گی وہ تو آپ کی ساری چیزیں لے لیں گے ٹوائز، بکس کچھ بھی تو نہیں رہے گا آپ کے پاس۔" انہوں نے اسے ڈرایا تھا۔

"کوئی بات نہیں.....آپ میرے لیے اور لے کر آجائیں گی نا۔"

وہ مزے سے بولی۔

"اوہ تو یہ بات ہے آپ اپنی چیزوں سے بور ہوگئی ہیں آپ کو نئی شاپنگ کرنی ہے۔" وہ اس کی ذہانت کی داد دے رہی تھیں اور اس کے چہرے پر اطمینان کے رنگ پھیلتے جا رہے تھے۔

وہ ہمیشہ بہتر سے بہترین کی جستجو میں رہتی تھی اس کی بے چین فطرت کو اسی صورت قرار آتا تھا جب تک وہ دل کی ہر خواہش کو عملی جامہ نہیں پہنا دیتی تھی۔

اس کا اپنے تایا کے گھر جا کر رہنے جی جستجو کرنا راحت بیگم کے لیے تکلیف دہ ضرور تھا انہیں لگتا تھا جیسے وہ اس آزمائش میں تھکتی جا رہی ہیں لیکن صوفیہ کی تسلی اور ذہنی سکون کے لیے اس کی خواہش کی تکمیل بھی بہت ضروری تھی ورنہ اس کا انتہائی ردعمل کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

"اچھا مجھے یہ بتاؤ تمہیں کون سب سے زیادہ اچھا لگا....." وہ اس سے زیادہ سزا نہیں دے سکتی تھیں۔

''آپ مجھ سے یہ کیوں نہیں پوچھ رہیں کہ مجھے وہاں کون سب سے زیادہ نا قابلِ برداشت لگا.....''

ماں کا لہجہ بدلا تھا تو اس کے چہرے پر بھی طمانیت کے رنگ پھیل گئے تھے۔ آنکھیں نمی پی کر مسکرانے لگی تھیں۔

''وہ تو خیر تمہارے چہرے پر لکھا ہے وہاں تمہیں کیا کچھ اچھا نہیں لگا لیکن میں یہ ضرور چاہوں گی کہ تمہاری تربیت اور تمہاری ذات پر کبھی کوئی حرف نہ آئے اس کا تجربہ بھی تمہیں وقت کے ساتھ ہوگا کہ وہ لوگ غلط قسم کی رائے قائم کرنے کے ساتھ اس کا پرچار بھی خوب کرتے ہیں۔ میں یہ سارے کام اس گھر میں رہ کر بھی کر سکتی تھی..... تمہاری پرورش، بزنس اور اس گھر کی بہتری کے لیے کوئی نیا اسٹیپ.....

لیکن میری ذات پر انگلی اٹھانے والے کبھی میری کمزوری نہیں بن سکے وہ گھر میرے لیے ایک بند گلی بنتا جا رہا تھا جس کے دوسری طرف جانے کے لیے مجھے دیوار میں سوراخ کرنا پڑے اور یہ ہی میری خطا ہے۔''

شاید آج زندگی میں پہلی بار انہوں نے اپنے بارے میں بات کی تھی صوفیہ نے حیرانی سے انہیں دیکھا اور پھر سارے گلے شکوے مٹا کر ان سے لپٹ گئی۔

اس کی ماں ایک صابر عورت تھی جس نے اپنے احساسات کو اس وقت برف کی سلوں میں دبا دیا تھا جب آتش جذبات کو بھڑکانے کے لیے صرف نگاہوں کی حدت ہی کافی ہوتی ہے۔

تائی نے کہا تھا۔

''دراصل تمہاری ماں کو ہم سے بہتر کوئی مل گیا تھا اس لیے وہ تمہارے بیمار باپ کو چھوڑ کر چلی گئی تھی ہم تو تماشا دیکھتے رہ گئے بھلا عورت اتنی کمزور بھی ہو سکتی ہے۔''

کسی بھی یکطرفہ کہانی کا کردار بن کر ساری عمر اس ملال میں نہیں گزار سکتی تھی کہ اس کی ماں ایک

کرپٹ عورت تھی اور لوگ اس کی قوت ارادی اور کردار کی مضبوطی کو منفی انداز میں ڈسکس کرتے رہیں اور اس کے پاس اپنی ماں کے تقدس کو ثابت کرنے کے لیے کوئی ٹھوس دلیل نہ ہو.....

سفیر کے ایکسیڈنٹ کے دوران جب اس کا ربط تائی اور چچی کے ساتھ بڑھا اور تایا کے ساتھ ملاقاتوں کا دورانیہ طویل ہوا تو اسے قدم قدم پر یہ احساس دلایا گیا کہ وہ ایک خود غرض اور بے حس ماں کی اولاد ہے۔

اسے بار بار یہ جتایا گیا کہ اس کی ماں نے یہ کاروبار اپنی ذاتی تسکین اور شاید دوسرے معنوں میں ذاتی عیاشی کے لیے شروع کیا وہ اگر کم فہم اور جاہل لوگوں کی صحبت میں رہ رہی ہوتی تو ان جملوں کی سنگینی کو کبھی محسوس نہ کرتی لیکن اسے تو ان تھوڑے سے دنوں میں آنکھیں اور چہرے پڑھنے کا ہنر بھی آ گیا تھا۔

تائی نے بڑی سفاکی سے کہا تھا۔

"کردار کی مضبوط عورتیں اپنے شوہر کی دہلیز پر سر پٹخ پٹخ کر مر جاتی ہیں مگر یوں گھر سے بے گھر ہونے کے بہانے نہیں ڈھونڈتیں۔"

اس نے یہ بات سننے کے بعد خود کو اپنے ضبط کی داد دی تھی ورنہ دل چاہ رہا تھا کوئی بھاری پتھر اٹھا کر ان ہے سر پر مار دے اور خود کو بھی ختم کر دے۔

وہ ایسا کر بھی گزرتی اگر اس لمحے اپنی ماں کی زندگی کے بے داغ ہونے کے بارے میں اس کا یقین متزلزل نہ ہو جاتا.....وہ جاننا چاہتی تھی ہر خطا کی ذمہ دار عورت ہی کیوں.....

وہ دیکھنا چاہتی تھی لوگ عورت کی کمزوری سے کیا فائدہ اٹھاتے ہیں اسے کئی دنوں تک نیند نہیں آئی تھی۔

اس کی اجلی شفاف صورت والی مہربان ماں جس کی آنکھیں بھی چمکدار آئینے کی طرح تھیں جس کے لب کبھی مصنوعی رنگ سے سرخ نہیں ہوئے تھے۔

وہ بہت سارے لوگوں کی نظر میں کرپٹ تھی.....

ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ صوفیہ کی امی کو لوگ کرپٹ کہتے ہیں۔

وہ اس کی ماں کے بارے میں غلط گمان بھی کیسے کر سکتے تھے۔

اس نے بہت سارے دن بڑی تکلیف میں گزارے تھے اسے لگتا تھا جیسے اس کے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی۔

نہ اسے بیت السکون اچھا لگتا تھا.....

نہ ماموں کا پیار سکون دے رہا تھا اور.....

نہ ماں کی محبت ذہنی کرب کو ختم کر رہی تھی۔

بس ایک آگ سی لگی ہوئی تھی دن رات اس کی نظریں تائی، چچی، تایا اور چچا کی متلاشی رہتیں۔

کبھی ان پر رحم آتا۔

کبھی ان سے نفرت محسوس ہوتی۔

اور کبھی اپنی ماں.....

وہ سوچنا نہیں چاہتی تھی لیکن بے رحم جملوں کی بازگشت اسے سوچنے پر مجبور کر دیتی۔

وہ پس منظر جاننے پر مجبور کر دیتی جو ماں کے پر تقدس رشتے کو سوالیہ نشان بنانے کا محرک بنا تھا۔

''امی آپ کو مجھ پر اعتماد ہے نا.....اور اس بات کا یقین بھی کہ آپ کی بیٹی اتنی بہادر ہے کہ لوگ اس کے بارے میں سوچتے ہوئے بھی خوف زدہ ہی رہتے ہیں۔''

وہ ہلکی پھلکی ہو کر ان کے سامنے آ بیٹھی تھی پتا نہیں وہ کیا باور کرانا چاہ رہی تھی۔

''مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے.....تن جب تک وہاں رہنا چاہو.....بس اپنا خیال رکھنا۔ کھانے پینے میں لاپرواہی نہیں کرنا۔''

ان کے لہجے میں اچانک ہی بے ربطگی آ گئی تھی پتا نہیں وہ کیا سوچ رہی تھیں کیا وہ اس کا چہرہ پڑھ چکی تھیں۔

''امی! آپ کی بیٹی بہت بہادر ہے۔ آپ اطمینان کر لیں۔ کوئی اس کی سوچ کو نہیں بدل سکتا۔''

وہ بھی ان کا چہرہ پڑھنے کی سعی کر رہی تھی اور شاید دونوں ہی اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو گئی تھیں۔

دونوں کی ایک دوسرے سے خائف نظریں وقت کی گود میں ایک ناقابلِ فراموش لمحہ ڈال چکی تھیں جس کا احتساب ہونا باقی تھا۔

ماں بیٹی ایک دوسرے کے مدمقابل آنا باقی تھا۔

لیکن مہربان پل اب اس سازش میں لگ گئے تھے کہ ایسا کبھی نہ ہو.....

☆.....☆.....☆

راحت جبین کا بہت خوبصورت نیا ناول

تتلی جیسا پیار

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

فرح بخاری کا بہت خوبصورت نیا ناول

کنارِ خواب جو

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

اسلام آباد میں سردی کا زور ٹوٹ رہا تھا اب فضا میں تپش گھلنا شروع ہو گئی تھی دھوپ اچھی لگتی تھی لیکن اس کے ساتھ دوستی کا رشتہ ٹوٹتا جا رہا تھا۔ اہل اسلام آباد اس بدلتی رت کا استقبال بہار کی تیاریوں کے ساتھ کرتے تھے۔ نانو بھی اپنے گھر کے بڑے سے باغ میں نئی کیاریوں میں مصروف تھیں۔

اس بار تو درختوں پر نئی قلموں کا بھی ارادہ تھا کشمالہ کو ان کی یہ سرگرمی اتنی اچھی لگ رہی تھی کہ وہ بھی درانتی لے کر اضافی گھاس پھوس کاٹنے بیٹھ گئی ان کی نہ نہ کے باوجود۔

''نہ بچے! یہ تیرے کرنے کا کام نہیں۔ اپنے ہاتھ دیکھے ہیں نرم و نازک سے خراشیں پڑ جائیں گی۔''

''ارے نانو! یہ تو کچھ بھی نہیں..... میں تو اپنے سارے کام خود کرنے کی عادی ہوں۔ برتن بھی دھوتی تھی اور کپڑے بھی.....''

اس نے ننھے ننھے پودوں کو زمین سے جدا کرتے ہوئے ایک لمحے کو افسوس کیا اور پھر رفتار بڑھا دی ''یہ تو فطرت کا اصول ہے کمزور کو طاقت ور کی توانائی کے لیے قربانی دینا ہی پڑتی ہے۔

بن ماں کے بچوں کو اپنے حصے کا کام بھی کرنا پڑتا ہے اور ماں کے حصے کا بھی میرے عاشر کو بھی عادت ہے کبھی مجھ سے ضد نہیں کرتا۔ خود لگا رہتا ہے۔''

ان کے لہجے میں مٹھاس گھلی ہوئی تھی کشمالہ کی سماعتیں شوق بن گئی تھیں۔ اس کا دل بے نام سی تال پر دھڑک کر خاموش ہو گیا۔

''نانو! ایک بات پوچھوں آپ برا تو نہیں منائیں گی۔''

وہ بلو کلر کے ٹراؤزر شرٹ میں گھٹنوں گھٹوں چلتی ہوئی بہت معصوم لگ رہی تھی۔ نانو کو اس کے ساتھ بے نام سی انسیت ہو چلی تھی۔ خولہ ذرا الگ تھلگ سی رہتی تھی اور پھر ریڈیو کے ساتھ بھی مصروف تھی لیکن کشمالہ اور وہ ایک دوسرے کی صحبت سے خوب محظوظ ہو رہی تھیں۔

''اگر برا مان بھی لیا تو..... تمہیں غصہ نہیں آئے گا نا۔''

''نہیں میں آپ سے سوری کرلوں گی اصل میں یہ سوال ذاتی سا ہے نا۔'' وہ درانتی سائیڈ پر رکھ کر ان کے نزدیک آ گئی۔ وہ اپنے ملائم بوڑھے ہاتھوں سے کیاریوں کی مٹی نرم کر رہی تھیں ان کے ساتھ فنکارانہ مہارت سے چل رہے تھے۔

''یہ جو آپ کا گرینڈسن ہے عاشر یہ آپ کے پاس کیوں رہتا ہے اپنے ممی پپا کے پاس کیوں نہیں رہتا۔''

نانو کو اس سوال پر حیرت نہیں ہوئی تھی نا ہی برا لگا تھا انہیں پتا تھا جلد یا بدیر وہ اس طرح کے سوالات کرے گی وہ بہت تھوڑے سے دنوں میں ان کے اتنے قریب آ گئی تھی کہ اب اس کی آنکھوں سے جھلکتا تجسس پریشان نہیں کرتا تھا۔

بلکہ ایک مدت کے بعد کوئی انہیں ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا ان کے اندر کی گھٹن کو باہر نکال رہا تھا۔

ان سے ان کے دل کی باتیں کر رہا تھا جو انہیں بہت اچھی لگ رہی تھیں۔

ساری عمر اپنے خول میں بند رہنے والے لوگ اپنے اندر کتنے گہرے ہوتے ہیں اس کا اندازہ کوئی دوسرا کبھی نہیں کر سکتا بلکہ وہ بھی نہیں جس پر بیت رہی ہوتی ہے البتہ جب درد کا سیلاب آنکھوں کا رنگ بدل دیتا ہے تب لوگوں کی توجہ کا انداز بھی بدل جاتا ہے اور انہیں خود بھی اپنے ساتھ ہونے والے غیر معمولی پن کا احساس ہوتا ہے۔ شاید کشمالہ نے انجانے میں ان کے خول پر ضرب لگائی تھی اور وہ اب چیخ رہا تھا۔

''اصل میں عاشر کی ممی پپا میں علیحدگی ہو چکی ہے۔''

انہوں نے آغاز کیا کشمالہ کو لگا یہ ان کے لیے خاصا تکلیف دہ موضوع ہے۔

''یہ تو مجھے پتا ہے اور مجھے یہ بھی پتا ہے پپا نے ان کو ڈائی ورس کر دیا تھا۔''

وہ دھیمے سے بولی۔

''نہیں طارق نے اسے ڈائی ورس نہیں کیا تھا بلکہ اس نے خود ڈائی ورس لی تھی طارق تو آخری

وقت تک سمجھوتا کرنا چاہتا تھا اور اس نے کوشش بھی کی لیکن شمائلہ نئی دنیاؤں کے سفر پر جانا چاہتی تھی اس نے کسی منیر کے لیے میرا طارق چھوڑ دیا۔

میں نے دونوں کو ماں بن کر پالا تھا۔ میرے سامنے دونوں کی زندگی کا ایک ایک ورق کھلا تھا مجھے اچھی طرح پتا تھا کس کی کمزوری نے وقت کو داؤ پیچ کھیلنے کا موقع دیا۔" وہ کس حد تک اپنی تربیت پر پشیمان تھیں۔

کشمالہ کے لیے یہ انکشاف ہی تھا کہ شمائلہ کمال نے طارق محمود کو چھوڑ دیا تھا اس نے اب تک عمر کا جتنا حصہ بھی جیا تھا اس میں اسے طارق محمود جیسے خوبرو، باوقار، بادشاہ دل اور شاید کشادہ ظرف مرد نایاب نظر آئے تھے۔

اس نے بے پناہ ذہین اور خوبرو مردوں کے درمیان بھی وقت گزارا تھا لیکن جو خوبیاں وہ اپنے پپا میں محسوس کرتی تھی وہ اس کی چہرہ شناس آنکھیں بہت کم ڈھونڈ پائی تھیں۔

اس نے کبھی کسی کو طارق محمود سے ناخوش نہیں دیکھا تھا ایک طویل فہرست تھی ان کے چاہنے والوں کی جن سے وہ خود بھی جیلس ہوا کرتی تھی وہ بیک وقت بہت متحمل مزاج اور اصول پسند تھے۔

وہ دوستی ہمیشہ اپنے برابر کے لوگوں سے رکھتے تھے لیکن کم حیثیت لوگوں کے لیے ان کی محبت اور ہمدردی کا انداز بھی الگ ہی نظر آتا تھا۔

ان کی شخصیت میں کوئی اسرار نہیں تھا نہ ہی کوئی پیچیدگی مگر ان کے ساتھ رہتے ہوئے خواہ مخواہ کی پراسراریت محسوس ہوتی تھی۔ دل جونت نئے بہانے سوجھتے تھے ان کے اندر جھانکنے کے لیے اور مزے کی بات وہ کسی کو روکتے بھی نہیں تھے۔

ایسے شخص کو شمائلہ کمال نے مسترد کر دیا تھا بحیثیت شریک حیات۔

اسے زندگی بھر کی تنہائی سونپ دی۔ وہ کیسی عورت تھی جو ان کی نشیلی آنکھوں میں ڈوبنے کے بجائے سطح پر ہی رہی۔

کشمالہ کو لگ رہا تھا جیسے پپا کی شخصیت سے زیادہ ان کی زندگی کی کہانی پراسرار تھی۔
اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔اس کے پپا میں کس چیز کی کمی تھی۔
جو عورت کو گھائل نہ کر سکے۔
جو اس کی طلب کو پورا نہ کر سکے۔
دولت، طاقت، وجاہت اور چاہت اور کیا چاہیے ہوتا ہے زندگی میں۔
''نانو! پاپا محبت کرتے تھے شمائلہ سے۔''
''دیوانگی کی حد تک اور دس سال یہ تعلق جڑا رہا۔ چھ سال محبت کے چار سال سمجھوتے کے پھر سب کچھ تعلق ٹوٹ گیا اور ایسا نہ ہوتا تو طارق ٹوٹ جاتا مر جاتا۔
میں اسے زندہ درگور نہیں دیکھ سکتی تھی۔ میں نے شمائلہ سے کہا تم جس راستے پر چل نکلی ہو وہاں سے واپسی ممکن نہیں تم اپنی زندگی جیو، طارق کو میں سنبھال لوں گی۔'' وہ بڑے بے رحم انداز میں اپنی بیٹی کی زندگی کا تجزیہ کر رہی تھیں۔ کشمالہ کو عجیب سا بھی لگا۔
''انہیں عاشر نے بھی نہیں روکا۔'' اس نے ڈرتے ڈرتے ہی پوچھا۔
''اگر عاشر اس کی کمزوری ہوتا تو منیر کمال کبھی اس کی کمزوری نہ بنتا۔اس نے طارق کو عاشر دے دیا تھا اور خود منیر کمال لے لیا تھا۔ بس اتنی سی کہانی ہے میرے بچے!''
ان کا بے رحم لہجہ کسی حد تک نرم پڑا تھا۔ کشمالہ نے تیز ہوا سے اڑتے بالوں کو سمیٹ کر آسمان کی طرف دیکھا۔
''اولاد باپ کے بغیر احساس محرومی کا شکار ہو جاتی ہے اور ماں کے بغیر بکھر جاتی ہے میں نے اسے دونوں تکلیفوں سے بچا لیا۔ جب تک اس کے نانا حیات تھے باپ کی شفقت لٹاتے رہے۔ تربیت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔''

پرندے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ نانو کی نظریں بھی اب ان پر جا ٹھہری تھیں۔

''نانا کی زندگی میں شمائلہ نے فیصلہ کر لیا تھا۔''

وہ دونوں ایک ہی سوچ کے زیر اثر تھیں۔ آزاد فضاؤں کے پنچھی بھی گھر کو لوٹ جاتے ہیں۔

''شمائلہ کے فیصلے نے ان کی زندگی لے لی تھی جس دن اسے منیر کمال کے ساتھ رخصت کیا اس دن کی رات کے آخری پہر چپ چاپ آنکھیں بند کر لیں۔''

ان کی آنکھوں کے آبگینے چھلک ہی گئے تھے۔ کشمالہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کہے لیکن وہ کسی ماہر نفسیات کی طرح انہیں رونے دینا چاہتی تھی۔

''نانو عاشر کیا سوچتا ہے یہ سب کیوں ہوا۔'' وہ اس کے چہرے کو پوری شدت کے ساتھ یاد کر رہی تھی اس نے جاتے ہوئے پلٹ کر دیکھا تھا۔

''میں اس سے ہمیشہ کہتی ہوں اس کے ماں باپ کی شادی ہمارا ایک غلط فیصلہ تھا اور غلط فیصلے کا انجام یہ ہی ہونا تھا۔ وہ اگر ساتھ رہ رہے ہوتے تب بھی ایک دوسرے کو خوشی نہیں دے سکتے تھے ان کا الگ ہونا ہی بہتر تھا۔''

''نانو! کیا منیر کمال پپا سے زیادہ ہینڈسم تھا۔'' وہ ابھی تک اسی بے چینی میں تھی وہ نہیں ماننا چاہتی تھی کہ زندگی کے فیصلے محض ظاہری خدوخال کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔

''ایک بات بتاؤ بچے! جب عورت خطا پر اتر آئے اور اپنی ذات کے تکبر میں اس حد تک گرفتار ہو جائے کہ اسے دنیا کی ہر خوبصورتی بے وقعت لگنے لگے تو پھر وہ یہ نہیں دیکھا کرتی کون کیسا ہے وہ بس یہ دیکھتی ہے کون کس قدر اس کی پرستش کر رہا ہے۔ کون اس کی ستائش کے جام لٹا رہا ہے۔''

انہوں نے اپنے آنسو سمیٹ لیے تھے نیلگوں گیلی آنکھوں میں بس درد ہی درد موجیں مار رہا تھا۔

''مگر نانو زندگی صرف محبت اور ستائش کے سہارے نہیں گزرتی عزت اور عزت نفس بھی کوئی چیز

ہوتی ہے۔'' وہ بے ساختہ کہہ گئی۔

''شمائلہ کا نفس جیت گیا تھا اور عزت ہار گئی تھی عورت بڑی کمزور مخلوق ہے اسی لیے مرد کو اس کا کفیل بنایا گیا ہے۔''

''لیکن مرد ہی اس کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتا ہے۔'' کمزور سا احتجاج.....

''جب تک عورت نہ چاہے مرد اس کی طرف گناہگار نظروں سے نہیں دیکھ سکتا۔'' وہ پر یقین تھیں کشمالہ کا سر خود بخود اثبات میں ہل گیا۔

''نانو! یہ کیا بات ہوئی سارا قصور عورت کا۔ پپا نے بھی کچھ تو کیا ہوگا۔'' اب یہ بحث ملال کم کرنے کے لیے تھی۔

''تمہارے پپا کی کمزوری اس کی بیوی تھی اس کی خوشی اور اس کی ہنسی تھی۔ اس کی ہر بات مان کر اسے آزادی دے کر اسے اپنی محبت کا مان دے کر اس یقین کے ساتھ آزاد چھوڑ دیا تھا کہ عورت کا تحفظ چار دیواری میں نہیں، اس ہر اعتبار میں ہے اور بس یہیں اس سے غلطی ہوگئی۔''

ان کے چہرے پر صدیوں کی تھکن سمٹ آئی تھی کشمالہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کن الفاظ میں ان سے ہمدردی کرے ان کے دکھوں پر مرہم رکھے۔

ان گنت درد سنبھال رکھے تھے انہوں نے۔

شمائلہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی اور اکلوتی اولاد کو صرف ماں باپ کا لاڈ پیار ہی نہیں بگاڑتا بلکہ ان کی قسمت بھی ان سے خاص قسم کی رعایت برتتی ہے۔

پتا نہیں شمائلہ کمال نے خطا کے کون سے لمحے کی زد میں آ کر اپنے گرد بنایا ہوا طارق محمود کا حصار توڑ دیا تھا اور پھر وہ اپنے رستے سے بھٹکتی ہی چلی گئی تھک شاید یہ کوئی نہیں جان سکتا تھا شمائلہ کمال خود بھی نہیں۔

☆.....☆.....☆

کمال ولا..... جدت اور مہارت کا حسین امتزاج تھا۔ اس کے وسیع و عریض کوریڈورز کی شان میں اضافہ کرتے ٹیک ووڈ کے نقشین دروازوں کی تعداد بھی اب شمائلہ کو یاد نہیں تھی۔

ہفتے گزر جاتے تھے اسے اپنے ہی گھر کی سیر کیے۔

اسے اپنے ذاتی ملازم اور ملازمہ کے علاوہ کسی کا نام یاد نہیں تھا جو اس ولا میں دندناتے پھرتے تھے۔ لیکن وہ یہ بات نہیں بھولتی تھی کہ اس ولا کی اینٹ سے لے کر پردوں تک کی خریداری اس کے خون پسینے کی کمائی سے ہوئی ہے۔

خون پسینے کی کمائی کیا ہوتی ہے؟

اس سے بہتر بھلا کون بتا سکتا تھا۔

حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ولا کی تعمیر و تزئین میں استعمال ہونے والی ہر چیز امپورٹڈ ہونے کی اسٹیمپ تھی سوائے منیر کمال اور شمائلہ کمال کے۔

اس حیرت کا اظہار جب اس نے منیر کمال سے کیا تو وہ ہنس پڑا تھا۔

بہت بے تکلفی کے ساتھ اس نے اپنی بانہیں اس کے گرد حمائل کرتے ہوئے کانوں کے قریب سرگوشی سی کی تھی۔

"تمہیں تو ڈائریکٹ جنت سے امپورٹ کیا ہے میں نے تم بھلا اس دنیا کی کب لگتی ہو آسمان سے اتری ہوئی حور ہو..... میری رانی....." اس کا لہجہ لمحے بھر میں معمور ہو جاتا تھا۔

وہ اس کی گرم سانسوں کی تپش سے جھلسنے لگی تھی۔ اس کا چہرہ یکدم سرخ ہو گیا تھا اور اس نے بے ساختہ منیر کمال کے کشادہ سینے میں منہ چھپا لیا تھا جو فرانسیسی خوشبوؤں سے مہک رہا تھا۔

"آئی لو یو سو مچ..... شمائلہ۔" اس کا پُر حدت انداز شمائلہ کے اندر برقی رو دوڑا دیتا تھا..... وہ واقعی خود کو ماورائی مخلوق سمجھنے لگتی تھی۔ اس کے ہر انگ سے فخر و غرور جھلکنے لگتا تھا۔

وقت کے کئی خاموش لمحے..... راجہ طارق محمود کے ساتھ اس کی دلداری اور قربت کے گواہ تھے لیکن منیر کمال کی محبت کے جوش میں اتنی طغیانی تھی کہ وہ کسی الہڑ کم سن دوشیزہ کی طرح اس میں بہتی چلی جاتی تھی۔ وہ اس کی بانہوں میں یوں سمٹتی تھی جیسے مرد کی محبت اور قربت کو پہلی دفعہ برت رہی ہو۔

اور منیر کمال اپنی فتح پر شاداں و فرحاں اس کے جذبات کی دنیا میں تلاطم برپا کر کے کسی ماہر و مشاق تیراک کی طرح کنارے پر آ جاتا۔

اس نے کلب کے سب سے مضبوط و مقبول ممبر کی بیوی کو پہلے اپنی ذہانت سے جیتا اور پھر خود ہار گیا دل سمیت.....

وہ جان گیا تھا شمائلہ کی کمزوری..... وہ کہانی کار تھا کرداروں کے ساتھ کھیلنے کا ہنر جانتا تھا۔

بہت سے لوگوں کے لیے اس کہانی میں کچھ بھی نیا نہیں تھا اور بہت سے لوگوں کو اس کہانی کا ہر پہلو اچنبھے میں ڈال گیا تھا۔

ہر وہ شخص..... جو طارق محمود یا شمائلہ کو جانتا تھا کبھی تو طارق محمود کو پر تجسس نگاہوں سے دیکھنے لگتا اور کبھی شمائلہ ان سب کی تمسخر بھری نگاہوں کی زد میں ہوتی۔

''اس مرد میں کیا کمی ہے؟ یہ شخص اتنی حسین عورت کا شوہر..... مگر اس کو خوشی نہ دے پایا بے چاری بھٹک گئی..... کوئی تو کمی ہوگی اس میں۔''

اپنے بالوں جو نزاکت سے سنوارت ہوئے عورتیں تبصرہ کرتیں اور..... مرد بھی بھلا کب چپ رہتے۔

''بڑی ناقابل بھروسہ مخلوق ہے یہ عورت.....''

''اپنی خوش نصیبی کی دشمن آپ ہوتی ہے۔ یہ منیر کمال کے جھانسے میں کیسے آ گئی۔''

''مجھے تو کوئی بہت بڑی بزنس ڈیل لگتی ہے۔''

''لیکن یار..... ! طارق..... منیر کمال سے کیا بزنس ڈیل کرے گا۔ مجھے تو شمائلہ کرپٹ لگتی

ہے..... میں تو اپنی بیوی کو اس سے دور ہی رکھوں گا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا ان عورتوں کا۔"

آوازوں کی دبی دبی چنگاریاں جب شعلے بن کر بگڑ کنے لگیں تب طارق محمود کو احساس ہوا وہ کس قدر اندھیرے میں جی رہے ہیں۔

اپنی عورت پر اندھا اعتماد ہوا میں راکھ بن کر بکھر گیا تھا اور وہ گھٹن وحبس زدہ ماحول میں سانس لیتے ہوئے خوف سا محسوس کرنے لگے تھے۔ ان کی آنکھوں میں درد نے کچھ اس طرح اپنا ڈیرہ جمایا تھا کہ وہ ان کی سرخی سے خود بھی خوف زدہ ہو جاتے۔

انہیں شمائلہ نے دھوکہ دیا تھا..... اس شمائلہ نے جو بچپن سے ان کے ساتھ تھی۔ جس کی زندگی کے ہر کامیاب اور خوشگوار لمحے میں وہ اپنی محبت اور توجہ کا حصہ ڈالتے آئے تھے۔

وہ اس کی خوشی میں اپنا، آپ بھول جاتے تھے صرف اس کو ایک نظر بھرپور استحقاق کے ساتھ دیکھنے کے بعد ان کی آنکھیں جگمگانے لگتی تھیں اور آج وہ آنکھیں خون رنگ تھیں۔

ویسے بھی اب وہ اس کی فرقت کا ملال کرتے بھی تو کس لیے۔

انہیں تو نامعتبر رفاقت کے صدمے نے شمائلہ کے دلکش خال وخد کی صورت میں کچھ اس طرح گھیرا تھا کہ انہیں اپنی نادانی اور کم مائیگی کا پختہ یقین ہو گیا تھا۔

شمائلہ کمال کا اپنے ولا میں قیام مختصر ہوتا تھا لیکن جتنی دیر کے لیے وہ ولا میں ہوتی شکیلہ کی ذمہ داریوں میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا۔ وہ اس کی ملازمہ خاص تھی۔ اس کا دلکش چہرہ کسی بھی ملازم کو کبھی بھی مہربان اور خوبصورت نہیں لگا تھا یا شاید وہ جس روپ میں ان سے ملتی تھی وہ روپ زمانے بھر کی تلخی کو سمیٹے ہوئے ہوتا تھا۔

بہر حال کمال ولا کے ملازمین کی فوج کو اپنے وقت کی اس عظیم فن کار سے کوئی رغبت نہیں تھی البتہ شکیلہ کی ذمہ داریاں اور اس کا مقام اس ولا کے لیے خصوصی نوعیت کا تھا۔

وہ متناسب جسم، درمیانے قد اور سانولی رنگت میں بے پناہ کشش سمیٹے..... اپنے آپ سے باخوبی آگاہ رہنے والی عورت تھی۔ وہ عموماً ساڑھی زیب تن کرتی تھی اور بعض اوقات شمائلہ بس اسے اپنے سامنے بٹھا کر دیکھا کرتی تھی۔

باتوں باتوں میں اس کی ساڑھی کا پلو ڈھلک جاتا اس کے گہرے گلے سے جسم کی بہاریں جھلکنے لگتیں تب شمائلہ اسے ڈپٹ کر کہتی۔

''تجھے کمزوریوں سے کھیلنا خوب آتا ہے جانتی ہے نا منیر کمال کی عادت کو پھر بھی باز نہیں آتی۔''

''اور جب آپ منیر صاحب کو تین مہینے کے لیے چھوڑ کر غائب ہو جاتی ہو اس وقت میرا یا ان کا خیال نہیں آتا۔'' وہ اتنی ہی سر چڑھی ہوئی تھی۔

''بس کر..... جانتی ہوں تیرے لیے منیر مجھ سے بڑھ کر ہے، تو کبھی میرے ساتھ چلنے کے لیے راضی نہیں ہوتی۔ کتنی بار کہا ہے مگر تیرے مزاج ہی نہیں ملتے۔'' وہ اس سے ایسے شکوہ کرتیں جیسے دونوں میں گہری دوستی اور بڑا بامعنی سا رابطہ ہو شکیلہ کے چہرے کی مسکان اس کی سنہری رنگت کی تمتماہٹ میں اضافہ کر دیتی اور وہ بڑے غیر محسوس طریقے سے شمائلہ کے عریاں بازو کو دباتے دباتے اس کے کندھے اپنے ہاتھوں کی مقناطیسی حرارت سے سہلانے لگتی اور پھر یہ سلسلہ جسم کے ان نشیب و فراز تک جا پہنچتا جن کی دلکشی اور تازگی اب منیر کمال کی دلچسپی کا محور نہیں تھی۔ وہ تو بس اپنی اتنی باکمال اور حسین بیوی کو ایک پروڈکٹ سمجھتا تھا اور اس کی مارکیٹنگ کے لیے کوئی بھی طریقہ اختیار کرنے کو تیار رہتا تھا۔

شمائلہ جب سے اٹھی تھی سگریٹ پہ سگریٹ پھونک رہی تھی ڈھیر ساری نیند لینے کے باوجود نہ آنکھوں کے سرخ ڈورے کم ہوئے تھے اور نہ ہی کسل مندی..... اس نے اب تک لیمن جوس کے چار گلاس پیے تھے لیکن کچن انچارج کی ہمت نہیں تھی کہ ناشتے کا پوچھ لیتی تب ہی وہ شکیلہ کو بلا لائی تھی۔

''بیگم صاحب! یہ آج کس بات کی سزا دے رہی ہیں خود کو.....'' وہ اس کے سامنے کاؤچ ڈال کر بیٹھ گئی اور عادت کے مطابق اس کے پاؤں اپنی گود میں رکھ کر دبانے شروع کر دیے۔

''کیا بہت درد ہو رہا ہے۔'' اس نے دھیرے سے استفسار کیا۔

''تجھے پتا ہے اب مجھے درد نہیں ہوا کرتا اذیت ہوتی ہے اور بہت سکون ملتا ہے اٹھ گئے تیرے صاحب.....؟''

''پتا نہیں میں نے تو نہیں دیکھا میں تو صبح سے آپ کے درزی کے ساتھ جھگڑا کر رہی تھی عجیب کچی پکی سلائی کر رہا ہے۔''

وہ اب اس کی ٹانگیں دبا رہی تھی نیلے رنگ کے مہین لباس میں اس کا گورا جسم خوب دمکتا تھا۔ شکیلہ نے ایک بھرپور نظر سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیا اور پھر پیار سے پوچھنے لگی۔

''ناشتا کر لیں بیگم صاحبہ صبح صبح یہ زہر اپنے اندر مت اتارا کرو اپنے چہرے کی چاندنی دیکھو اس دھوئیں سے ماند پڑنے لگی ہے نہ ظلم کیا کرو..... خود پر۔'' وہ کبھی کبھی یوں ہی اس کی ہمراز بن جاتی تھی تب شمائلہ کا چہرہ اجنبی سی مسکراہٹ سے چمکنے لگتا۔ اس کی مہربان نظریں شکیلہ کے سلونے چہرے پر جم جاتیں۔

''تجھے فکر ہے..... زمانے کو فکر ہے بس فکر نہیں ہے تو میرے اپنوں کو..... میرے جسم و جاں کے مالک کو..... میرے خون کے رشتوں کو..... پتا ہے شکیلہ اب اس زندگی میں وہ پہلے والا مزا رہا نہیں..... کچھ نیا نہیں کہنے کو.....''

اس کے چہرے کے تاثرات میں ملال اور تھکن کے بجائے بے زاریت کا غلبہ ہوتا تھا۔

شکیلہ کبھی تو حیرت سے اسے دیکھنے لگتی اور کبھی سر جھکا کر مسکرا دیتی۔

سچ ہے جانور کے منہ کو خون لگ جائے تو وہ دودھ اور شہد کی نہریں پھلانگ کر اس تک جا پہنچتا ہے اور عورت کے تن کو حرام کی لت لگ جائے تو وہ اپنے گناہ گار ہونے کے بہت سے جواز ڈھونڈ لیتی ہے۔

شکیلہ شمائلہ کمال کے ماضی حال اور شاید کسی حد تک اس کے مستقبل سے بھی واقف تھی عورت تھی نا..... خود اس کا مقدر جس بھٹی میں سلگ رہا تھا شمائلہ کے لیے اس بھٹی میں بے غیرتی اور دولت کے بجائے دولت اور امارات کا الاؤ روشن تھا۔

''ناشتا لاؤں.....'' وہ پھر سے بولی۔

''جاؤ جا کر اپنے صاحب کو جگاؤ..... جانے کب اس کا نشہ ٹوٹے گا مجھے بہت سے کام نبٹانے ہیں۔'' شمائلہ ایک اور سگریٹ سلگاتے ہوئے بولی۔

اس لمحے اس کے لہجے اور جملوں کی نزاکت محسوس کرنے کی کوشش بے سود ہی ہوتی تھی۔ یہ بات شکیلہ بھی اچھی طرح جانتی تھی اور شمائلہ کمال خود بھی کہ وہ دنیا کے لیے کچھ اور ہے اور اس ولا میں اس کا اپنے لیے روپ دوسرا ہے۔ اس دوہری زندگی کا عذاب خود اس نے اپنے گلے میں ڈالا تھا اس لیے وہ بڑی حد تک مطمئن بھی نظر آتی تھی۔

☆.....☆.....☆

ماورا طلحہ کا بہت خوبصورت نیا ناول

مرگِ تمنا

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

تنزیلہ ریاض کا بہت خوبصورت نیا ناول

نور القلوب

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

بیت السکون کی صبح معمول کے ہنگامے اور رونق سے بھرپور تھی..... یہ خوشیوں کا وہ آنگن تھا جہاں ہر لمحہ زندگی ہنستی مسکراتی نظر آتی تھی۔ صوفیہ کو آج صبح کسی نے نہیں جگایا تھا بلکہ وہ مست ہو کر سو ہی نہیں پائی تھی پوری رات نیند کا سلسلہ جوڑنے اور خواب بننے میں گزر گئی تھی۔

کبھی ہنستا مسکراتا شجاع نظر آجاتا اور کبھی اس کی خوف ناک غصیلی نگاہیں تعاقب کرنے لگتیں۔

''تم اب دوبارہ وہاں جانے کی حماقت نہیں کرو گی، سمجھیں۔'' یہ دھمکی اتنی طاقت ور تھی کہ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ بستر چھوڑنے سے پہلے اس نے وال کلاک پر نظر ڈالی۔

''اب میں اسے ناراض کر کے نہیں جاؤں گی لیکن وہ میری بات سمجھے بھی تو.....''

اس نے جلدی جلدی پانی کے چھپاکے اپنے چہرے پر مارے اور بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اپنے کمرے سے باہر آگئی۔

کچن سے ملحق ڈائننگ ہال میں راحت بیگم چائے اور اخبار کے ذائقے سے لطف اندوز ہو رہی تھیں اور شجاع ان کے سامنے بیٹھا کسی خبر پر تبصرہ کر رہا تھا۔ پتا نہیں شجاع نے ان کے ساتھ ناشتے کا معمول کب سے بنایا تھا لیکن صوفیہ کے لیے یہ ہی کافی تھا کہ وہ ناشتے کی ٹیبل پر اکیلی نہیں تھیں۔

یقیناً وہ رات کا کھانا بھی ان کے ساتھ کھاتا ہوگا۔ اس نے سوچا۔

وہ ایسا ہی تھا بالکل غیر محسوس طریقے سے اپنی زندگی کو دوسروں کے لیے لازم بنا لیتا تھا اپنی ذات کو بھول کر دوسروں کی زندگی جینا شروع کر دیتا تھا اسے رشتوں جوان کے احترام اور محبت کے ساتھ جینے کا ہنر خوب آتا تھا۔

صوفیہ کو بے ساختہ اس پر ڈھیر سارا پیار آیا وہ بہت دیر تک پردے کی آڑ میں کھڑی رہ کر اس کے خوبرو چہرے کی شگفتگی اور بلند قامت سراپے کی مضبوطی کو زادِ راہ بنانے کا حق رکھتے ہوئے نظر بھر کر دیکھ سکتی تھی مگر گھڑی کی تیز چال نے تو گھنٹیاں بجا کر احساس دلایا تھا کہ صبح کافی بیت چکی ہے۔ اس نے

دانستہ پردوں سے آواز پیدا کی دروازے سے ٹکرا کر اپنے آنے کی اطلاع دی اور ڈائننگ ہال میں داخل ہوگئی۔ آج سے پہلے نہ اسے شجاع کو دیکھنا اتنا مشکل محسوس ہوا تھا اور نہ ہی اپنے اعتماد کو برقرار رکھنے میں کسی طور مشقت سے کام لینا پڑا تھا مگر آج یہ دونوں کام ہی اس کی جھلاہٹ میں اضافہ کر گئے تھے۔ وہ شجاع کی مسکراتی نگاہوں بسے خائف ہوتی ہوئی راحت بیگم کے ساتھ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی اور انہیں بانہوں کے گھیرے میں لے کر اپنی محبت اور وارفتگی کی مہران کے چہرے پر ضبط کر دی۔ وہ کبھی کبھی اپنی بے ساختہ محبت کا اظہار کرتی تھی۔

راحت بیگم اس کی معصومیت اور اس کے اندر برپا رہنے والی جنگ کے درمیان توازن کے اس مظاہرے پر یک دم ہلکی پھلکی سی ہوگئی تھیں۔ انہیں یقین ہو گیا تھا صوفیہ کے لیے زندگی جس آزمائش میں انہوں نے کاٹی..... جو ریاضت ان کی تنہا ذات کا مقدر بنی وہ کبھی رائیگاں نہیں جائے گی صوفیہ ان کا مان ہے جو وقت کے فریب میں نہیں آسکتی۔

''کس خوشی میں لاڈ ہو رہا ہے۔'' اس کی پر حدت نگاہوں میں بڑا معنی خیز سا احتجاج تھا۔ صوفیہ کو اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں پر بلاوجہ غصہ آنے لگا۔

''آپ کیوں جیلس ہو رہے ہیں؟''

''سبحان اللہ میرے جیلس ہونے کو یہ ہی ہتھکنڈے رہ گئے ہیں سن رہی ہیں پھوپھی جان! محترمہ صحبت کے اثر میں لگتی ہیں..... کیا لگتی ہیں وہ تمہاری آنٹیاں..... ان کے ساتھ بھی اتنا ہی لاڈ ہوتا ہے یا پھر دور دور سے۔'' وہ اسے بلاوجہ تنگ کرنے لگا۔

''ان کے ساتھ لاڈ آپ بھی نا کسی سیارے سے آئے ہوئے لگتے ہیں۔ بھلا امی کا ان سے کیا مقابلہ.....'' وہ اپنا اعتماد بحال کر چکی تھی۔

''اچھا..... میں تو سمجھا تھا انہوں نے شاید امی سے بڑھ کر پیار اور محبت نچھاور کی ہوگی جو آپ

بوریا بستر باندھ کر چلتی بنیں۔" وہ اخبار کی ورق گردانی کرتے ہوئے لاپروائی سے بولا۔

"آپ کو کیا پریشانی ہے میرے بوریا بستر سے..... میری مرضی میں جاؤں نہ جاؤں یہاں رہوں۔" اس نے تپ کر کہا تو راحت بیگم نے فوراً سرزنش کی۔

"صوفیہ.....! بڑا ہے وہ تم سے۔"

"یہ جہاں رہ کر آئی ہیں وہاں چھوٹے بڑے سب برابر ہیں پھوپھی جان.....! دعا کریں ان پر اس ماحول کا اثر نہ ہوا ہو۔" وہ اسے مکمل زچ کرنے کے موڈ میں تھا۔

سوئی جاگی آنکھوں میں کبھی حیرانی اور کبھی غصہ لیے وہ لگ بھی اتنی اچھی رہی تھی کہ اس سے نظریں چرانا خود پر ظلم کرنا تھا۔ اسے نظروں کے حصار میں رکھنا اس لمحے اس پر کسی ظلم سے کم نہیں تھا وہ عین اس کی نظروں کے سامنے تھی اور ماں کے پہلو میں۔

زندگی میں اب تک اسے ان دو لوگوں نے ہی اتنا مان دیا تھا کہ آج اس کی بے قراری کسی ان دیکھی سرکش سمت کی طرف نہیں بھاگ رہی تھی۔

اس نے رات سونے سے پہلے یہ اعتراف کر لیا تھا کہ اس ایک دن میں اس نے اپنی زندگی کے وہ سارے پل سیراب ہوتے محسوس کیے ہیں جو اپنی ذات کے بے وقعت ہونے کی محرومی میں گزرے تھے جن میں ہمیشہ یہ احساس غالب رہا تھا کہ اسے محبت حق نہیں خیرات سمجھ کر دی جاتی ہے۔ وہ جو سب کی محبت پر نازاں اور سب کے پیار کو اپنی طاقت سمجھ کر اتراتی پھرتی ہے وہ دراصل ان سب لوگوں کا ترس ہے..... جنہیں کسی نہ کسی مجبوری کے تحت یہ ذمہ داری تو نبھانی تھی۔

مگر آگہی کا وہ پل ان سارے لمحوں پر بھاری تھا جب اس نے شجاع کی خوبصورت آنکھوں میں اپنے عکس کو سجے دیکھا تھا۔ اس وقت اس کے دل نے بڑی عجیب و غریب خواہش کی تھی اس کا دل چاہا تھا وہ ان آنکھوں کو اپنی ہتھیلیوں میں چھپا لے۔ کسی کی نظر نہ پڑے ان پر..... کوئی نہ دیکھے سوائے اس کے

اور وہ بھی کسی کو نہ دیکھیں سوائے اس کے۔

لیکن اس وقت وہ ان آنکھوں میں خود کو دیکھنے کے باوجود مغلوب نہیں ہو رہی تھی۔

صغیر نے ناشتا لگا دیا تھا۔ شجاع نے خستہ پراٹھے کی خوشبو اپنے اندر اتارتے ہوئے اسے اشارہ کیا تھا۔

''آپ کا تو دماغ خراب ہے۔'' وہ بے ساختہ بول کر پچھتائی کیوں کہ راحت بیگم ادب آداب کے معاملے میں ہمیشہ اسے سرزنش کرتی رہتی تھیں اس وقت انہوں نے اسے باقاعدہ ڈانٹا۔

''آپ انہیں بھی تو دیکھا کریں۔'' وہ روہانسی ہوگئی شجاع کی مسکراہٹ جو دل جلا رہی تھی۔

''روز صبح، شام، دوپہر دیکھتی رہتی ہیں تم اب اپنی بات کرو۔ آج آفس چلنا ہے نا۔'' وہ مگن سے انداز میں بولا۔

''میں ابھی آفس نہیں آ رہی اور ویسے بھی آج مجھے جانا ہے واپس اور میں نے امی کو بتا دیا ہے میں ایڈمیشن لے رہی ہوں آرٹ کالج میں۔ تایا نے بھی پرمیشن دے دی۔'' وہ بھی اسی کے انداز میں بڑے تحمل سے بولی۔ یہ الگ بات کہ دل دھڑک بھی رہا تھا اس کی کل والی بات یاد تھی۔

وہ جتنی سرکش ہوگئی تھی اس سے زیادہ سرکش رویے کا تقاضا اس کی طبیعت کرتی تھی۔

''پھوپھی جان! کیا صوفیہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔'' وہ انتہائی سنجیدگی کے ساتھ ان سے مخاطب تھا۔ چائے کا مگ اس نے ایک طرف رکھ دیا تھا اور ٹشو سے ہاتھ صاف کرنے لگا تھا۔

''ہاں آج اسے واپس جانا ہے۔'' وہ ناشتا کر چکی تھیں کرسی سے اٹھتے ہوئے نظر کا چشمہ انہوں نے اپنی آنکھوں پر جما لیا۔

شجاع بھی ان کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اس کی زیرک نظریں سفید رنگ کے لباس میں ملبوس اس باوقار سی عورت کی اندرونی ٹوٹ پھوٹ باخوبی دیکھ رہی تھیں۔

''کیا جانا بہت ضروری ہے۔'' وہ عنوان سے مضمون کی غرض وغایت جاننا چاہتا تھا۔

''ہاں میں نہیں چاہتی صوفیہ زندگی کے کسی موڑ پر یہ سوچے کہ اسے ماں نے اپنے نفع ونقصان کے لیے ہتھیار بنایا۔ میں چاہتی ہوں وہ آنے والی زندگی میں اتنی پر اعتماد ہو کہ اپنے لیے کوئی بھی فیصلہ کرتے ہوئے کسی دباؤ کا شکار نہ ہو وہ کنارے پر کھڑے ہو کر گہرائی کا اندازہ نہ لگائے بلکہ گہرائی میں اترے۔''

''اگر اس کوشش میں وہ ڈوب گئی تو.....''

''مجھے یقین ہے ایسا نہیں ہوگا..... کبھی نہیں ہوگا..... آج اسے جانا ہے تم بھی اسے خوشی خوشی رخصت کر دو لڑنا جھگڑنا بند.....''

وہ پتا نہیں کیوں مسکرا دی تھیں۔ صوفیہ بت بنی دونوں کو سن رہی تھی۔ شجاع نے آگے بڑھ کر ان کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

''لو یو پھوپھی جان.....! یو آر امیزنگ.....''

''تھینک یو..... مائی سویٹ سن..... میں اب نکل رہی ہوں تم کب آؤ گے۔'' وہ صوفیہ کی طرف پلٹتے ہوئے شجاع سے مخاطب تھیں۔

''اگر آپ کہیں تو میں صوفیہ کو چھوڑ آؤں۔'' اس نے فوراً فیصلہ کیا۔

''ہاں..... چلو یہ ٹھیک رہے گا لیکن دروازے تک۔'' انہوں نے مسکرا کر تنبیہہ کی۔

''جاؤ..... لیکن خود سے بے خبر نہ ہو جانا اور پھر کوئی چوٹ نہ لگا بیٹھنا کسی کو تنگ نہ کرنا..... میری جان ہے تم میں اپنا خیال رکھنا۔'' انہوں نے محبت اور ممتا کی گرمی اس کے اندر منتقل کرتے ہوئے ماتھا چوما صوفیہ کو محسوس ہوا جیسے وہ اندر تک ساون کی تیز بارش اے بھیگ رہی ہو۔

''تم صوفیہ کو چھوڑتے ہوئے آفس آؤ گے نا.....'' انہوں نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''پھوپھی جان! یہ آفس کے کاموں سے کیوں بھاگ رہی ہے۔ ایسا بھی نہیں کہ اس کا بزنس

میں انٹرسٹ نہیں ہے۔'' وہ یہ بات سمجھنے سے قاصر تھا کہ صوفیہ کو آفس آنے میں کیا قباحت ہے اور یک دم اس کے مزاج میں قنوطیت کیوں سما گئی ہے۔

''میں چاہتی ہوں یہ زیادہ سے زیادہ وقت ان کے ساتھ گزارے اور پھر وہاں سے آفس کا فاصلہ بھی زیادہ ہے اور یہ سفر سے ویسے بھی بھاگتی ہے۔'' انہوں نے بڑا مناسب سا جواز پیش کر کے گفتگو سمیٹ دی۔

ان کے جانے کے بعد شجاع جی جان سے صوفیہ کی طرف متوجہ ہو گیا تھا جو لاپرواہ نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی مگر ساری حسیات ماں کے رویے کی کھوج میں لگی ہوئی تھیں شجاع نے صحیح تو کہا تھا۔

''یو آر امیزنگ۔'' وہ کن اکھیوں سے اس ہلتے پردے کو دیکھ رہی تھی جس کے پیچھے ان کا مضبوط سراپا گم ہو گیا تھا۔

''آپ کو سکون مل گیا میری برائیاں کر کے۔''

''اپنی چیز کو دیکھ کر سکون ہی تو ملتا ہے۔'' وہ مسکراتا ہوا اس کے سامنے آ گیا۔

''آپ کتنی فضول باتیں کرتے ہیں۔''

''میں تو خیر ہمیشہ ہی اتنی فضول باتیں کرتا رہوں گا اور آپ کو برداشت کرنا پڑے گا لیکن کیا آپ کو اندازہ ہے اپنی فضولیات کا..... میں نے کہا تھا اب نہیں جانا تو پھر..... میری بات کو کوئی اہمیت نہیں۔'' اس کے لہجے میں اپنائیت بھرا گلہ تھا صوفیہ نے پہلی بار اپنے دل کی دھڑکن منتشر ہوتی محسوس کی اور اس کا بے ساختہ اظہار صوفیہ کی نگاہوں میں بھی سمٹ کر آ گیا تھا۔ اس نے پلکیں جھکا کر فرار کی راہ ڈھونڈی لیکن شجاع نے اسے اپنے حصار سے نکلنے کی اجازت بالکل نہیں دی تھی۔

''شجاع آپ سمجھنے کی کوشش کریں..... میں ابھی سفر کے آغاز میں ہوں..... مجھے اسے ادھورا نہیں چھوڑنا..... آپ مجھ پر یقین کریں میرے لیے آپ کی بات بہت اہم ہے۔''

''اسی لیے تم جنگلوں کے سفر پر جا رہی ہو..... کیا تمہاری عقل بھی گھاس چرنے گئی ہے کسی جنگل میں۔'' شجاع نے اسے ڈپٹا۔

''آپ بھی پتا نہیں کیسی باتیں کرتے ہیں بے سروپا.....'' وہ جھنجھلا گئی۔

''تو پھر کیسی باتیں کروں سر پیر والی..... میری ہر بات فضول..... اور تم کتنی فضول ہو..... اس کا اندازہ ہے تمہیں عجیب مشکل میں ڈال دیا ہے تم نے..... دل میں تمہیں سنبھال کر رکھوں یا تمہاری حماقتوں کو.....'' اسے اپنی گفتگو سے مقابل کو زچ کرنا خوب آتا تھا صوفیہ سر تھام کر بیٹھ گئی۔

''میں کوئی حماقت نہیں کر رہی آپ کو ایک دن خود پتا چل جائے گا کہ میں نے یہ سب کیوں کیا۔''

''اور وہ دن کب آئے گا۔'' اس کے انداز میں بے چینی تھی۔

''یہاں سے جاؤں گی تو وہ دن آئے گا نا اور آپ نے مجھے پہنچا دیا خیریت سے۔ مجھے آثار نظر آ رہے ہیں۔'' وہ اپنی جون میں واپس آنا چاہتی تھی لیکن شجاع کی آنکھوں میں جگنوؤں کی بستی سجائی تھی۔

وہ اس کی ساری توانائیاں سلب کر رہی تھی۔

''ہم کب چلیں گے..... آپ تیار تو ہوں..... دو چار ہاتھی باندھنے پڑیں گے کیا.....؟'' اس کی جھلاہٹ بڑی بے ضرر سی تھی۔

''پہلے مجھے تو باندھ لو..... پھر ہاتھی ڈھونڈنا۔'' وہ مسکرا دیا۔

''آپ کو باندھنے کی کیا ضرورت ہے۔'' وہ کچھ اور کہتے کہتے رک گئی۔ شجاع نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے اس کے سادہ مگر تر و تازہ چہرے پر نظر ڈالی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''بہت پیاری لگنے لگی ہو..... بالکل زندگی کی طرح..... میری امانت کا خیال رکھنا..... اپنا آپ سنبھال رکھنا.....'' وہ اس کے لہجے کی پھوار میں بھیگنے لگی تھی۔

''مجھے تمہارے مشن پر شک نہیں..... لیکن مجھے وہ لوگ ناقدرے اور کم ظرف لگتے ہیں۔ تم ان

کے خاندان کا حصہ ضرور ہو مگر تمہارے ساتھ اب صرف راحت بیگم کا نام باقی ہے۔ تمہارا مضبوط حوالہ تمہارے ساتھ نہیں..... لیکن جب خود کو مشکل میں محسوس کرو..... مجھے ایک منٹ کی تاخیر کے بغیر پتا چلنا چاہیے۔'' ٹھہرے ہوئے پرسکون لہجے میں اچانک اٹھنے والا یہ جوار بھاٹا۔ صوفیہ کے لیے بالکل نیا تھا۔

وہ بالکل مختلف شجاع تھا۔ مضبوط مستحکم لہجے میں اپنا حق بڑے بھرپور الفاظ کے ساتھ جتاتے ہوئے۔ وہ اس کے حصار میں کمزور پڑنے کے بجائے خود کو اتنا مضبوط محسوس کرنے لگی تھی کہ ذرا سا آگے بڑھ کر اپنے دونوں ہاتھ اس کے مضبوط ہاتھوں میں دے دیے۔

''آپ میری مدد کریں گے ناں۔ مجھے آپ کی ضرورت ہے۔ مجھے ان لوگوں کے دل میں اترنا ہے جو میری ماں کو غلط کہتے ہیں۔ مجھے اپنی ماں کے کردار کا آئینہ صاف کرنا ہے۔ میرا باپ عین جوانی میں زندگی ہار گیا..... کوئی کچھ کہتا ہے اور واقعات کی ترتیب کچھ کہتی ہے آخر میں کس پر یقین کروں.....؟ یہ سب جاننا تو میرا حق بنتا ہے نا..... اپنی ماں کی سچائی ثابت کرنا تو میری ذمہ داری ہے۔'' شجاع کے اعتماد اور اعتبار نے اسے اپنے اندر کا غبار نکالنے کا حوصلہ دے دیا تھا اور وہ بلا تکان بولتی چلی گئی تھی۔

نہ اس لمحے وہ سرکش بیٹی تھی..... نہ ضدی لڑکی..... نہ احساس محرومی میں جکڑی ہوئی کم فہم صوفیہ..... وہ تو بس صوفی تھی ان سب کی لاڈلی..... ان سے شکایتیں کرنے والی اپنی اہمیت کا احساس دلانے کے لیے ہر اوٹ پٹانگ حرکت کرنے والی..... لیکن اس لمحے اس نے اپنے یقین اور اعتماد کی جو ڈور اس کے ہاتھ میں تھمائی تھی وہ اس کے محسوسات کو سرشاری سے دوچار کر گئی تھی۔ ایک لمحے کو اس کا دل چاہا کہ وہ ذرا سا اپنے ہاتھوں کا دائرہ تنگ کر کے اس کے سارے درد دور کر دے۔ اس کے ہر وہم ہر خدشے کو اپنی پلکوں سے چن لے مگر وہ اس کی بے ساختگی میں سرزد ہونے والی رعایت سے فائدہ اٹھا کر اس کا اعتماد اور اعتبار متزلزل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنائیت کے ان لمحوں کا حسن نہیں کھونا چاہتا تھا جو انجانے میں اس کی اولین چاہت کو بڑے بامعنی رشتے میں استوار کر گئے تھے۔

اس نے اپنے جذبوں کی تمام شدتیں اپنے ہاتھوں میں سمو دی تھیں تب ہی وہ لمحوں کی اس شرارت پر ہراساں ہو کر پیچھے ہٹی تھی۔

''میں نے کیا کہا.....'' وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر بھرپور شرارت سے مسکرا دیا۔

''مجھے آپ سے کوئی بات نہیں کرنی..... آپ کو بدتمیزی کے سوا بھی کچھ آتا ہے..... میں سنجیدہ بات کر رہی ہوں اور آپ کو تفریح سوجھ رہی ہے۔'' وہ اپنی خفت مٹانے کے لیے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولی۔

''آپ اتنے قریب آ کر سنجیدہ بات کریں گی تو سوچیں بندہ بشر ہے کبھی بھی بہک سکتا ہے..... میں نے تو پھر خود کو سمجھا لیا۔'' وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا کہ صوفیہ کے حواس ہی مختل ہونے لگے۔

''میں تیار ہونے جا رہی ہوں آپ خواب دیکھتے رہیں۔'' اس نے ڈائننگ ہال سے رخصت ہونے میں ہی عافیت جانی دروازے کی طرف مڑی تھی کہ اس کی بھاری آواز زنجیر کر گئی۔

''صوفیہ.....! ہر مسئلے کا حل ضرور ہوتا ہے اور یہ ہی احساس ہماری زندگی کو امید کی ڈور سے باندھے رکھتا ہے میں یہ نہیں کہتا کہ تم ایسے سفر پر جا رہی ہو جو تمہاری منزل نہیں لیکن میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ ہمیں حالات کی سختیاں پریشان نہیں کرتیں بلکہ وہ خدشے اور خیالات آزمائش کا باعث ہوتے ہیں جو اردگرد کے ماحول سے پیدا ہوتے ہیں..... تم آج سے پہلے شاید اتنا نہیں سوچتی تھیں لیکن اپنے تایا وغیرہ سے ملنے کے بعد تم نے ایک سے بڑھ کر ایک الجھن پال لی..... جو کہ فطری بات ہے لیکن اس سے اہم بات یہ ہے کہ تمہیں اپنی الجھن دور کرنے کے لیے یک طرفہ حالات و واقعات کا جائزہ نہیں لینا اور نہ ہی تم نے جذبات کے ہاتھوں کھلونا بننا ہے تمہیں سچ کو حقائق اور انصاف کی کسوٹی پر پرکھنا ہوگا..... مجھے اچھا لگے گا جب تم مجھ سے کچھ نہیں چھپاؤ گی..... یاد رکھنا ہمارا رشتہ دل و نگاہ سے آگے کا ہے..... روح کی گہرائیوں میں اترنے کی کوشش کرنا..... میرا اعتبار ہر لمحے تمہارے ساتھ رہے گا۔''

وہ اس کی آواز سن کر پلٹی نہیں تھی اور اب جب پلٹی تھی تو اس کا چہرہ ملے جلے تاثرات کے ساتھ سرخ ہو چکا تھا۔

''آپ سمیت سب کو کیوں لگتا ہے کہ میں کچھ غلط کرنے جا رہی ہوں کسی غلط ارادے کے ساتھ جا رہی ہوں یا پھر میرے ساتھ کچھ غلط ہو جائے گا..... وہ لوگ اتنے برے نہیں اور پھر سب سے بڑی بات میں ان کا خون ہوں..... مجھے کوئی خوف نہیں کہ وہ میرے ساتھ کوئی زیادتی کریں گے.....

الٹا میں آج کل انہیں زچ کر رہی ہوں اور وہ برداشت کر رہے ہیں۔'' اس کے لہجے کی تلخی محسوس کر کے شجاع بے چین سا ہو گیا۔

''اسی لیے تمہیں احمق کہتا ہوں..... ہر بات کی نگیٹیو سائیڈ تمہیں پہلے سمجھ آتی ہے..... اینی ویز فی الحال کوئی بحث نہیں..... تم بھی تیاری کرو میں بھی تیار ہونے جا رہا ہوں..... پھر تمہارے ساتھ کچھ اور لمحے حاصل زیست کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ جاتے لمحے اسے مزید پریشان اور بدگمان نہیں کرنا چاہتا تھا۔'' اس کی مسکراہٹ میں کچھ تو ایسا تھا کہ اس بار وہ رکی نہیں تھی اور اپنے کمرے میں جا کر ہی دم لیا۔

''یہ شخص پہلے تو مجھے صرف چال باز، ڈرامے باز لگتا تھا لیکن یہ تو پورا کا پورا جادوگر ہے..... شعبدے باز..... کبھی کچھ کبھی کچھ..... اور میں بھی کتنی پاگل ہوں بلا سوچے سمجھے اس کی انگلی تھام کر چل پڑی اور وہ کہہ رہا ہے روح کی گہرائیوں میں اترنے کی کوشش کرنا۔

حد ہے..... مجھے ابھی تک اپنی زندگی سمجھ نہیں آئی اور وہ.....'' اس کا چہرہ دہکنے لگا۔ آنکھوں کی جھیلوں میں بڑے انوکھے رنگ کے موتی جگمگانے لگے تھے۔

☆.....☆.....☆

اس رات قدسیہ کی امی اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملی تھیں۔ کوئی زندگی ایسی نہیں جسے موت کا مزہ نہ چکھنا ہو مگر قدسیہ کی امی کی موت نے عاشر عباس اور کاشف کیانی دونوں کو ساکت کر دیا تھا وہ ایک عام سی عورت تھیں ان سے شناسائی کا رشتہ محض چند گھنٹوں پر مشتمل تھا مگر وہ زندگی کی جنگ ہارنے سے پہلے انہیں ایسی حقیقت سے آشنا کر گئی تھیں۔

کہ انہیں ان کی موت کا ذمہ دار اپنا آپ لگ رہا تھا انہوں نے اس ایک رات میں زندگی کا وہ چہرہ دیکھا تھا جو نظام کی بے حسی اور طبقاتی کش مکش کے باعث اپنی اصلی شکل وصورت کھو چکا تھا۔ جس جا حسن محض لفظوں کی حد تک کتابوں میں محدود تھا ورنہ سچائی تو یہ تھی کہ شکست وریخت کے عمل سے دوچار آبادی کا یہ مخصوص حصہ کسی ماورائی طاقت کا منتظر تھا جو لمحوں میں ان کی زندگی بدلنے کی قدرت رکھتا ہو..... مگر ایسا ہو نہیں سکتا تھا۔

کاشف اس بار ایک مشکل ترین پروجیکٹ کا حصہ بن گیا تھا ورنہ اس نے افریقہ کے قحط زدہ علاقوں کا سفر بھی کیا تھا لیکن خود کو اتنا بے بس محسوس نہیں کیا تھا۔

''کاش کے ہم اس کی امی کو کسی بہتر ہسپتال لے جاتے..... ہم نے بھی زیادتی کی نا..... بیچاری کی حالت اتنی نازک تھی اور ہم جا کر سو گئے۔''

''لیکن ہم کہاں لے کر جاتے تمہیں پتا ہے ہسپتال اس علاقے سے چار گھنٹے کے فاصلے پر ہے اور وہ بھی انتظامیہ کی بے حسی کا شکار..... میں نے آج صبح ہی سروے کروایا ہے یہاں تو بہت سارے لوگ جان بچانے والی دعاؤں کے انتظار میں ختم ہو جاتے ہیں۔ کچی پکی سڑکوں پر ٹوٹی پھوٹی گاڑی کا سفر ان سے جینے کی ہر امنگ چھین لیتا ہے اور وہ علاج کروانے کا سوچتے ہی نہیں۔'' عاشر کا چہرہ گہری سوچ کا غماز تھا۔

''لیکن پہاڑوں کے دامن میں آباد اس وادی کا کوئی تو پرسان حال ہونا چاہیے نا..... چارٹر طیاروں میں سفر کرنے والے حکمرانوں کو نظر نہیں آتا کہ ان کچے پکے مکانوں میں بھی انسان رہتے ہیں یہ نامساعد حالات ان کا مقدر نہیں ہیں انہیں بھی زندگی جینے کا حق پوری خوشی اور تحفظ کے ساتھ ہے لیکن اس کا احساس کون کرے گا میں ایک دو ڈاکومنٹریز بنا کر ان کے مسائل ان کے جذبات سامنے لا کر سوچوں گا میں نے تیر مار لیا اب باقی کے کام دوسروں کی ذمہ داری..... تم اپنی ڈگری کی وجہ سے اس اہم پوسٹ

پر ہو لیکن تمہیں بھی محسوس ہوتا ہے کہ محدود عملے اور انتظامات کے ساتھ تم لوگوں کے مسائل حل نہیں کر سکتے تم انہیں اس خوف سے نجات نہیں دلا سکتے جو گھنے جنگلوں میں ہونے والی مجرمانہ سرگرمیوں کی وجہ سے ان عورتوں کے بچوں کے ذہنوں میں بس گیا ہے۔

سوچو نا تم کیا کر رہے ہو..... میں کیا کر رہا ہوں..... کچھ بھی نہیں..... سخت سردی میں یہ لوگ موسم بدلنے کا انتظار کرتے ہیں اور گرمیوں میں مٹکے اٹھائے عورتیں پانی کی تلاش میں ان پہاڑوں پر بھٹکتی نظر آتی ہیں..... تم نے کبھی ان بچوں کی محرومیوں کو پڑھنے کی کوشش کی ہے ان کی نظریں تو ٹی وی اسکرین پر جمی ہوتی ہیں مگر سوچ کا دائرہ..... ان دیکھی ان جانی بغاوت کا جال بن رہا ہوتا ہے انہیں اپنے کچے گھر بالکل نہیں اچھے لگتے جب وہ شاندار عمارتوں کی بلندی کو حسرت سے دیکھتے ہیں اور پھر پتا ہے کیا ہوتا ہے ان بلندیوں کی تلاش میں گھروں سے بھاگ جاتے ہیں..... اور پوری زندگی سفر میں گزار دیتے ہیں..... میرا دل چاہتا ہے میں ان سب لوگوں کی قسمت بدل دوں جو پہاڑوں میں رہ کر پتھروں سی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔'' کاشف کا چہرہ سرخ ہو چلا تھا۔

''لیکن یہ صرف ہمارے ملک کا مسئلہ نہیں ہے زمین کی تقسیم تو ہر معاشرے میں موجود ہے۔ سب لوگ شہروں میں نہیں رہ سکتے اور مضافات کے بغیر معاشرہ مکمل نہیں ہوتا۔'' عاشر نے رسان سے کہا۔

''لیکن مضافات کو سہولیات سے محروم رکھنا۔ غریب کی مشکلات کو اس کا جرم بنانا اچھے معاشروں کا وتیرہ نہیں ہوتا کبھی فرصت ملے تو ان ملکوں کا سفر کرنا جو ہمارے بعد آباد ہوئے اور ان کے ہاں دولت کی تقسیم شہر اور گاؤں کی بنیاد پر نہیں ہوتی انہوں نے پہاڑوں اور جنگلوں میں بھی زندگی کی خوشیاں بکھیر رکھی ہیں۔ کاشف تصور کی آنکھ سے ان وادیوں کی سیر کر رہا تھا جہاں اس نے قدرتی حسن اور فطری نعمتوں کو انسانی ضروریات اور آسائشات کا حصہ بنتے دیکھا تھا مگر کھلی آنکھوں سے جو کچھ ان دونوں نے

دیکھا وہ ہر خوبصورت رات پر اداسی کے بادلوں کی طرح تن گیا تھا۔

وہ جانتا تھا حالات بدلنے کے لیے جستجو کرنا پڑتی ہے اور جستجو وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے ذہنی اور جسمانی حالات ان کو اجازت دیں۔

میں قدسیہ سے ملنا چاہتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ لڑکی کسی احمقانہ ضد کے ہاتھوں اپنا فیوچر خراب کر رہی ہے۔'' کاشف یکدم کھڑا ہو گیا۔

''تم نے اس کے بھائی کو دیکھا تھا ناویل ڈریسڈ، پولشڈ اور پر اعتماد..... مجھے تو حیرت ہوئی..... اس نے دونوں کو یہاں کیوں چھوڑ رکھا تھا۔ وہ ان ذمہ داریوں سے بھاگ رہا ہے۔'' عاشر نے یاد دہانی کے طور پر اس کی ظاہری شخصیت کا نقشہ کھینچا تھا۔

''قدسیہ اور وہ دو بہن بھائی ہیں قدسیہ کا بھائی عرصہ دراز سے اپنی فیملی کے ساتھ دبئی میں مقیم تھا اس کا وہاں تعمیرات کا کاروبار تھا لیکن اس کے آبائی گھر کی چھت لکڑی اور مٹی سے بنی ہوئی تھی شاید یہ گھر آج سے تیس پینتیس سال پہلے تعمیر ہوا ہوگا۔ اس کے بیوی بچے نہیں آسکتے تھے وہ بھی مزید چند دن رہنے کی نوید دے کر قدسیہ کے لیے پریشان ہو رہا تھا۔

میں تمہیں اکیلا بھی نہیں چھوڑ سکتا اور ساتھ لے جانا بھی مشکل ہے۔ تمہارے سسرال والوں نے بھی عجیب تماشا لگا رکھا ہے۔

نہ اس کی خبر ہے نہ اپنی ذمہ داری کا احساس ہے۔'' وہ قدرے بے حسی سے کہہ کر باہر نکل گیا تھا اور قدسیہ کی حیران آنکھیں یکدم برسنے لگیں اب تو وہ گود بھی نہیں رہی تھی جس میں سر چھپا کر رو لیا کرتی تھی۔

''امی مجھے بھی ساتھ لے جائیں آپ کو پتا بھی تھا یہ دنیا اچھی نہیں ہے۔'' اس نے بے دردی سے اپنا چہرہ رگڑا اور ماں کی بکھری چیزیں سمیٹنے لگی جو ممتا کی خوشبو سے مہک رہی تھیں ان کی گرم چادریں، سوئیٹرز، نماز کی چادر، جائے نماز، تسبیح، ان کی دوائیاں، قرآن پاک اور بھی بہت کچھ ان کے

لمس سے آشنا ان کے زیر استعمال ہر چیز اس کے درد میں اضافے کا باعث بن رہی تھی وہ تھک گئی تھی روتے روتے اب وہ بس انہیں یاد کرنا چاہتی تھی۔ تب ہی دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ نہ بھائی اور نہ ہی مہمان رشتے دار اسے ہی دروازے تک جانا تھا۔ دستک دوبارہ ہوئی تھی اس نے چادر جما کر برآمدے کا رخ کیا تھا۔

☆.....☆.....☆

آپ سب کی سماعتوں کی نظر ہوا کے دوش پر آپ کی اپنی جانی مانی آواز خولہ کمال اب آپ کے ساتھ بہت سی باتیں ہوں گی مگر اس سے پہلے ایک سچی بات بزبان شاعر.....!

یہ بھی دن ہیں اس سے پل دو پل ملنا ناممکن ہے
وہ بھی دن تھے کٹ جاتی تھیں ساری راتیں باتوں میں
میں اور تم سے پہنچ گئے آپ جناب کے صیغوں میں
رفتہ رفتہ در آئی ہے کیسی دوری باتوں میں

اور جناب.....! رشتہ محبت کا ہو، یا خلوص اور یا پھر خون کا ہمیں لگتا ہے کہ اس میں اظہار اولین شرط کے امجد اسلام امجد نے تو صرف محبت کی طبیعت میں بچپنے کی بات کی تھی۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ ہر رشتہ ایسے ہی بچپنے کی ضد سے بھرپور نظر آتا ہے۔ کبھی کم یا کبھی زیادہ اظہار کی طاقت لفظوں کی ضرورت یا بار بار جذبوں کی شدت کو بیان کرنا رشتوں کی ڈور کو مضبوط کرتا رہتا ہے۔

ہم بھی چاہتے ہیں کہ آپ سے ہمارا تعلق جڑا رہے ہمارا آپ کا رشتہ ہمیشہ قائم رہے اس لیے ہمیں ضرورت رہتی ہے ہمیشہ آپ کی تنقید اور تعریف کی اور دوستو یہ بھی جان لیجیے کے ہم میں اتنا حوصلہ ہے کہ اپنی خوبی یا خامی کو آپ کے الفاظ میں سن سکیں۔

دراصل زندگی کے ساتھ.....مثبت رویہ ہمارے بہت سے مسائل کو ختم کر دیتا ہے۔ یہ ضروری

ہے کہ ہم ہمیشہ درست بات کریں، درست فیصلہ کریں مگر یہ بھی بہت ضروری ہے کہ اگر کوئی ہمیں غلط یا درست کے بارے میں آگاہ کرے تو ایک لمحے کے لیے ہی سہی ہمیں اسے ٹھہر کر سننا ہوگا۔ ایک لمحے کے لیے ہی سہی ہمیں سوچنا ہوگا کہ کہیں وہ ٹھیک تو نہیں کہہ رہا۔ ہوسکتا ہے وہ ہم سے مخلص ہو۔

اور جناب جو رشتہ خلوص کی بنیاد پر بنایا جائے وہ کبھی بوجھ نہیں بنتا۔ اس کی خوبصورت آواز برقی تاروں کے سفر پر تھی اور خزیمہ دل کی دھڑکنوں کو خاموش رہنے کی ہدایت کرتے ہوئے یوں اس میں مگن تھا جیسے وہ مقابل بیٹھ کر محو کلام ہو۔

دو دن بعد اسے واپس چلے جانا تھا اور وہ ابھی تک خولہ کمال کی آواز سے ہی محظوظ ہو رہا تھا۔ اس کے شہر میں اس کے اتنے نزدیک قیام کے باوجود وہ اس سے ملنے کی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا اور نہ ہی وہ براہ راست اس کا فون ریسیو کرتی تھی جب کہ اس کی بے قراری کا عالم یہ تھا کہ یہ آواز صبح و شام اس کی سماعتوں میں رس گھولا کرتی۔ آفس کے کام، ڈھیر سارے لوگوں سے ملنا، ان سے بزنس کے معاملات پر خشک اور قطعی انداز میں بات کرنا۔

کراچی اور اسلام آباد میں بیٹھے ڈائریکٹرز کی خوشنودی کو اولیت دینا اور مزے کی بات ان تمام تر تھکا دینے والی مصروفیات کے ساتھ خولہ کی آواز سننا اس سے کسی گانے کی فرمائش کرنا اس کی اولین ترجیحات میں شامل تھا۔

جب وہ پروگرام نہیں کرتی تھی تب بھی وہ خزیمہ کے سماعتوں کے ساتھ ہوتی تھی۔ کبھی مترنم سی دھن اس کی سماعتوں کو چونکا دیتی اور کبھی ستار بجنے لگتا۔ عجیب مشکل میں آ گئے تھے شب و روز..... اور دل تھا کہ خوب نادانیوں پر اکسا رہا تھا۔

"مجھے آج ہر صورت میں خولہ کمال سے ملنا ہے ورنہ....."

اس نے یکدم ہی گاڑی کو بریک لگایا اور یوٹرن لینے کے لیے گیئر بدل لیا حالانکہ وہ سامعہ کی

فرمائشی لسٹ کو پورا کرنے کے لئے کسی زنانہ قسم کے بازار میں جانے کا ارادہ رکھتا تھا مگر اس وقت خولہ سے ملنے کی چاہ سارے ضروری قسم کے کاموں پر حاوی آ چکی تھی۔

چاہت میں بے قراری ایسی ہی ہوا کرتی ہے۔ ہر تقاضا پس پشت چلا جاتا ہے اور دل چاہتا ہے کہ کچے گھڑے پر دریا پار کر لیا جائے۔ خزیمہ تو چاہت کے ایسے موڑ پر تھا جو ان دیکھا ان جانا تھا وہ بالکل نہیں جانتا تھا اس کے حصے میں اجنبی حسینہ کی کج ادائیں آئیں گی۔ یا اس کی لطف و کرم کی عنایت ہو گی مگر اتنا جانتا تھا کہ ادھورے لفظ ادھوری باتیں اور محبت کی ادھوری کہانی زندگی میں شہنائیاں بکھیر دیتی ہے اور وہ اپنی زندگی میں آنے والی بیاررت کو زنجیر کرنا چاہتا تھا۔ یہ راستے اس کے لیے اجنبی ضرور تھے لیکن اسے یقین تھا کہ وہ اپنے جذبوں کے سارے پھولوں، پودوں کے تر و تازہ رنگوں اور خوشبوؤں کی طرح سچا اور کھرا ہے جو اس وقت اس کے ارد گرد اپنا حسن بکھیر رہے تھے اس کی گاڑی ایسے راستوں پر رواں دواں تھی جو خوش رنگ پھولوں سے مہک رہے تھے ہواؤں میں بڑی انوکھی سی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ خزیمہ جو یقین نہیں آ رہا تھا کہ پورا ماحول اس کے دل کی سرشاری سے ہم آہنگ ہے۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ وہ بالکل درست سمت جا رہا ہے۔

گاڑی ایک چار منزلہ عمارت کے سامنے روک کر اس نے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ ایک تجارتی علاقہ تھا اور ایف ایم ریڈیو کا نشریاتی اسٹوڈیو اس منزل کے کسی ایک فلور پر تھا اس نے مین گیٹ پر اپنی کمپنی کا حوالہ دے کر اندر جانے کی اجازت حاصل کی اور لفٹ کے سامنے کھڑے ہو کر اس فہرست کا جائزہ لیا جس پر مختلف کمپنیز کے نام اور ان کے فلور نمبر درج تھے وہ اپنے مطلوبہ فلور پر نظریں دوڑاتے ہوئے جانے کیوں مسکرا دیا۔

آج پھر اس کا دل انوکھی تال پر دھڑک رہا تھا اسے یقین تھا کہ تھوڑی دیر کے بعد وہ خولہ کمال کے سامنے ہو گا کیونکہ اس کا پروگرام ختم ہو چکا تھا لفٹ اسے تھرڈ فلور پر لے آئی تھی سامنے کی استقبالیہ

کاؤنٹر تھا اس نے بڑی ہی شائستگی کے ساتھ اپنا تعارف کروایا اور خولہ کمال سے ملنے کی درخواست کی۔

کاؤنٹر کی دوسری طرف بیٹھی لڑکی نے قدرے حیران سی نگاہ اس خوبرو نوجوان پر ڈالی جو اسکائی بلیو ٹی شرٹ اور جینز میں اپنے ورزشی جسم کے ساتھ پہلی ہی نظر میں متوجہ کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا البتہ لہجے کی بے قراری پر وہ مسکرا دی۔

''سر..... آپ نے دیر کر دی خولہ کمال شاید اب یہاں سے پروگرام نہ کریں.....'' اس نے قدرے افسوس سے اطلاع دی۔

''مگر ابھی تو وہ پروگرام کر رہی تھیں؟'' وہ حیران سا اس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کہیں وہ مذاق تو نہیں کر رہی۔

''نہیں دراصل وہ پہلے سے ریکارڈ پروگرام تھا۔ آپ نے محسوس نہیں کیا آج اس میں کوئی کال شامل نہیں تھی۔'' اس لڑکی کو خزیمہ عادل سے بھرپور ہمدردی ہو رہی تھی۔

''میں اس کا پروگرام سنتے ہوئے اپنے حواسوں میں ہوں گا تو یہ باتیں محسوس کروں گا۔'' وہ بڑبڑایا اور کاؤنٹر پر بیٹھی لڑکی کا چہرہ بے ساختہ مسکراہٹ سے چمکنے لگا۔

''جی کچھ کہا آپ نے۔'' وہ چونک کر بولی۔

''نہیں میں نے آپ سے تو کچھ نہیں کہا کیا وہ کل آئیں گی۔''

''سر! اس کے بارے میں میری اطلاع خاص نہیں۔ دراصل میں تو کاؤنٹر پر ہی ہوتی ہوں۔ آپ ہمارے اسٹیشن منیجر سے مل سکتے ہیں ان کا روم یہاں سے لیفٹ چیمبر میں ہے۔'' اس نے اندر کی طرف اشارہ کیا۔

اس کے دائیں جانب ایک لمبی سی لابی نما ہال تھا۔ جس کے دونوں طرف میز کرسیاں لگی ہوئی تھیں اور اکا دکا لوگ ان پر براجمان نظر آ رہے تھے۔ ٹیکنیکل اسٹاف تھا یا پریزنٹرز اس نے ذرا بھی دلچسپی

نہ لی اور پلٹ کر بیرونی گلاس ڈور کی طرف دیکھنے لگا۔

''سر! آپ کا نام.....؟'' اس بار وہ کھڑی ہوگئی تھی۔

''خزیمہ عادل.....'' اسے اپنی آواز اجنبی محسوس ہوئی تھی اس کے قدموں میں ڈھیر ساری تھکن اتر آئی تھی۔

وہ واپسی کے لیے پلٹا دو قدم آگے چل کر پھر پیچھے پلٹا.....اس لابی میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو اسے خولہ کمال جیسا لگتا۔ البتہ وہ کاؤنٹر گرل اب وہاں موجود نہیں تھی۔

''ارے.....یہ کس طرف گم ہوگئی۔''

☆.....☆.....☆

نانو کا گھر اول دن سے کشمالہ کی دلچسپی کا محور تھا اسے ویسے بھی پرانی چیزیں، قدیم کتابیں اور شاید بوڑھے لوگ ہمیشہ مرعوب کرتے تھے۔

اور یہ گھر پرانے وقتوں کا ضرور بنا ہوا تھا لیکن اس کا آرکیٹیکٹ اندرونی اور بیرونی آرائش ساگوان کی لکڑی کے نقشین دروازے اور کھڑکیاں اتنی دلکش نظر آتی تھیں کہ کشمالہ کو قدیم یورپ کے وہ گھر یاد آجاتے جن کے اندر جا کر وہ عجیب سے سحر میں مبتلا ہو جاتی تھی اس نے زندگی کے بہت سے سال یورپ میں گزارے تھے کینیڈا، آسٹریلیا اور پھر جرمنی میں جاب کی وجہ سے بھی ہاسٹل میں رہنا پڑا تو کبھی سنگل اپارٹمنٹ کے تنگ و تاریک کمروں کے ساتھ بادل نخواستہ سمجھوتا کرنا پڑا۔

وہ فطرتاً ایسی ہی تھی ہر ماحول میں ڈھل جانے والی اور اگر کبھی کسی ماحول میں کوئی کمی پیشی دیکھتی تو اسے بدلنے کی کوشش بھی ضرور کرتی جیسے آجکل وہ دن کا بیشتر حصہ نانو کے گھر کی آرائش اور کچھ نئی تبدیلیوں کے حوالے سے ان کو قائل کرتے ہوئے گزار رہی تھی۔

یہ تو اسے یہاں آکر پتا چلا تھا کہ اس کے اندر کی کشمالہ کو کس قدر گھر بنانے سنوارنے اور سجانے

سے دلچسپی ہے۔اس نے نانو کے کمرے کے لیے خاص طور سے شاپنگ کی تھی فرنش فلاورز..... ڈرائی فلاورز ارینج منٹ کے ساتھ ان کی کتابوں کے لیے بڑا آرٹسٹک سا ریک اور ایک چھوٹی سی ٹرالی جس کے نچلے خانے میں ڈرائی فروٹ اور سونف وغیرہ رکھا ہوتا تھا۔ پہلے ان کے کمرے میں بلیو کلر اسکیم میں پردے اور کارپٹنگ ہوئی تھی اب بلیو کے ساتھ سفید رنگ بڑی دلکش تبدیلی کا باعث بنا ہوا تھا۔ان کے کمرے کا اے سی کئی دنوں سے خراب پڑا تھا چونکہ موسم بھی اتنا گرم نہیں ہوا تھا اس لیے اس کی طرف بھی کسی کا دھیان نہیں جا رہا تھا..... کشمالہ نے نانو کی نہ نہ کے باوجود الیکٹریشن بلوا لیا تھا۔

اور جب ان کے کمرے کی طرف سے پوری طرح اطمینان ہو گیا تھا کہ اب یہاں مزید تبدیلی کی گنجائش نہیں اور نہ ہی نانو ہونے دیں گی تو اس کا دل چاہا کہ وہ کمرے کے سامنے والی راہداری سے گزر کر اس بند دروازے کے سامنے جا کر کھڑی ہو جائے جس کی وسعت کا اندازہ باہر سے تو بخوبی ہوتا تھا لیکن کیا یہ کمرہ اندر سے بھی اتنا ہی پُر رونق اور کشادہ تھا جتنا کہ اس گھر کے باقی کمرے۔

دراصل یہ عاشر عباس کا بیڈ روم تھا جس کی صفائی نانو اپنی موجودگی میں کرواتی تھیں اور ان کی عدم موجودگی میں کوئی بلا ضرورت گول کمرہ عبور کر کے اس راہداری کی طرف بھی نہیں آتا تھا یہ تو کشمالہ کی فرصت اور ہمت کا کمال تھا جو وہ پورا دن اس گھر کے در و دیوار ناپتی اور پھر سنوارنے کی جستجو میں لگ جاتی۔

تب اسے خیال آیا تھا اگر وہ اچھی براڈ کاسٹر نہ ہوتی تو شاید انٹریئر ڈیکوریٹر ہوتی۔

اپنا یہ خیال جب اس نے نانو سے شیئر کیا تو وہ مسکرا دیں۔

''پتا ہے پتر.....! عورت کے اندر گھر بنانے کی اسے سنوارنے اور سجانے کی خواہش اس لیے نہیں ہوتی کہ وہ یہ سب کر کے کوئی آرٹ کا شاہکار تخلیق کرنا چاہتی ہے یا دوسروں سے ممتاز نظر آنا چاہتی ہے..... یہ تو اس کی فطرت کا لازمی جزو ہے۔

عورت امیر ہو یا غریب..... مکان کو گھر وہی بناتی ہے مرد تو صرف چار دیواری کھڑی کرتا ہے اور

عورت اس میں بیل بوٹے لگا کر اس کی بنیادوں میں اپنا خون پسینہ شامل کرتی ہے تب کہیں جا کر مکان گھر بنتا ہے۔"

"پتا ہے نانو..... آپ کی ان ساری باتوں میں مجھے سب سے اچھی کیا بات لگی..... پتر ویری انوسنٹ..... بالکل ایسٹرن ماؤں والا جملہ..... آپ کا پتر کہنا مجھے مزا دے گیا۔" وہ جتنے انہماک سے سن رہی تھی اتنی ہی روانی سے انکشاف بھی کیا تھا نانو کے چہرے پر بھی ہنسی کی اجلی کرنیں پھیل گئی تھیں۔

مائیں مشرق کی ہوں یا مغرب کی سب ایک جیسے جذبات رکھتی ہیں اور جو ہمیں پیارا ہوتا ہے اس کے لیے لفظوں کا چناؤ شعوری طور پر نہیں کیا جاتا بلکہ خود بخود ہو جاتا ہے جب تم زندگی میں ان مراحل سے گزرو گی تو تمہیں خود بخود لفظوں کو برتنے کا ہنر بھی آ جائے گا۔

وہ جب بھی بولتی تھیں اتنا خوبصورت اور بھرپور بولتی تھیں کہ کشمالہ پلکیں جھپکائے بغیر انہیں دیکھا اور سوچا کرتی تھی۔

کیا واقعی ساری دنیا کی مائیں دل کی ساری شدتیں یوں اپنی آنکھوں میں سمیٹ لیتی ہیں۔

کیا واقعی ماں ہونا اتنا طاقتور احساس ہے کہ اس کے سامنے دنیا کے سارے جذبے بے معنی لگتے ہیں کم مایا محسوس ہوتے ہیں..... اگر ایسا ہے تو شمائلہ کیوں ہار گئی۔ ماں کی محبت اس کے قدموں میں زنجیر بن کر کیوں نہیں لپٹی۔

نا جانے کیوں اس کا دھیان پلٹ کر اس گھر کی ایک اور ماں کی طرف چلا گیا تھا جو ممتا کی کسوٹی پر پوری اترنے کے بجائے محبت کے محاذ پر سرخرو ٹھہری تھی۔

پتا نہیں اسے بے وفا کہا جا سکتا تھا یا سچی عورت..... جس نے اپنے جذبوں کے ساتھ خیانت نہیں ہونے دی۔

نہ اپنی ذات کے ساتھ منافقت کی اور نہ کسی دوسرے کے ساتھ..... صرف ایک بار ملنے والی

زندگی میں سمجھوتہ کرنے کا عزم کر کے اپنے عظیم اور وفادار ہونے کا ثبوت دیا۔ پتا نہیں کیسے اس ماں کو جسٹی فائی کیا جا سکتا تھا وہ اپنی عادت سے مجبور تھی اس لیے انسانی نفسیات کے پرت کھولنے اور ذات کے پراسرار گوشوں کو کھوجنے میں لگی رہتی تھی۔

''ویسے نانو! یہ تو بتائیں آپ شادی ہو کر اسی گھر میں آئی تھیں یا پھر نانا جان نے بعد میں آپ کو گفٹ کیا تھا۔'' وہ ان کا ہاتھ تھام کر باغ نما لان کے بے حد ہرے بھرے گوشے میں لے آئی تھی۔ آج کل بہار جوبن پر تھی اور پھر نئے موسم کی کیاریوں کی دیکھ بھال اس بار صرف مالی نہیں کر رہا تھا کشمالہ بھی بیشتر وقت ان کی کانٹ چھانٹ میں گزار دیتی تھی۔ اسے تو نرم اور سوندھی سوندھی مٹی سے کھیلنا بھی بہت اچھا لگتا تھا نانو کی ڈانٹ کے باوجود وہ ہاتھ سے گملوں کی گڈائی کر رہی ہوتی تھی۔

''اب تو یاد بھی نہیں کہ شادی ہو کر کون سے گھر میں گئی تھی۔ میں نے اپنے ماں باپ کے گھر سے جب قدم باہر نکالا تو پھر طویل مدت تک سفر میں رہی۔ وہ یاس بھرے لہجے میں بولیں شاید ہم سفر کی یاد اتنی ہی طاقتور ہوتی ہے لمحے بھر میں حال کی رعنائیوں سے جدا کر دیتی ہے۔

کیا نانا جان ٹورسٹ تھے؟ اس نے اشتیاق سے پوچھا تو وہ مسکرا دیں۔

اپنے وقت کے جانے مانے سول انجینئر تھے..... ان دنوں خوب تعمیرات ہو رہی تھیں پہاڑ کھود کر سڑکیں بن رہی تھیں۔ ندی نالوں پر پل باندھے جا رہے تھے اور تمہارے نانا کبھی گلگت میں تو کبھی کشمیر تو کبھی کاغان میں ہوتے جب ہماری بات طے ہوئی تھی تو اس وقت مری میں تھے پھر اس کے بعد قراقرم پر کام شروع ہوا اور مجھے تو اس جگہ کا نام بھی یاد نہیں جہاں میں نے پہلی بار ان کے لیے کھانا مٹی کی ہانڈی میں لکڑی کے چولہے پر پکایا تھا۔ سارا وقت دھواں نگلتے اور آنسو بہاتے گزرا تھا۔ یادوں کی رم جھم نے ان کے سال خوردہ سفید چہرے پر بڑے انوکھے رنگ بکھیر دیئے تھے کشمالہ کو آج بہت دنوں بعد شام با مقصد اور خوشگوار ہوتی محسوس ہو رہی تھی وہ تنہائی اور اکیلے پن کے آسیب سے لڑنے والی اس بہادر

عورت کے حوصلے کو ہمیشہ سلام کرتی تھی۔

انہوں نے کئی سالوں سے بیٹی کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ بیٹا اگر ہوتا بھی تو پتا نہیں کہاں ہوتا شاید کسی دوسرے شہر میں یا کسی دوسرے ملک میں جس طرح عاشر عباس آج کل ان کے ساتھ نہیں تھا اور وہ اسے ہر وقت یاد کیا کرتی تھیں کبھی ناشتے کے وقت اور کبھی رات کے کھانے پر....."

"آپ کیوں ان کے ساتھ جاتی تھیں۔ شہر میں رہ لیتیں یا پھر اپنے پیرنٹس کے پاس....."

"جب مقدر ایک دوسرے کا دکھ درد بانٹنے کا عندیہ دے دے تو پھر مشکلیں بھی سہل ہوتی چلی جاتی ہیں۔ میں سنا کرتی تھی میری شادی اتنے بڑے آدمی سے ہوگی۔ لیکن یہ تو مجھے بعد میں پتا چلا کہ بڑا آدمی بننا صرف بڑے دل والوں کا کام ہے اور ان کے لیے کیا پہاڑ تو کیا جنگل کیا میدان تو کیا ریگستان..... ہر جگہ ایک سی....."

"گویا آپ نانا جان کی پہلے سے فین ہو چکی تھیں..... بعد میں تو بہت پیار ہو گیا ہوگا۔"

"لیکن مجھے پیار کرنا انہوں نے ہی سکھایا..... میں تو ان کی قربت سے دور بھاگتی تھی پھر وہ بڑے سلیقے کے ساتھ میری زندگی کا لازمی حصہ بنتے چلے گئے..... یہ رشتہ کمزور ہے تو کچے دھاگے جیسا اور مضبوط ایسا جیسے لوہے کی کڑیوں کو جوڑ دو..... آگ پر پگھلا کر۔"

ان کے چہرے کی شفاف رنگت دہکنے لگی تھی جیسے کوئی نویلی دلہن خلوت کے لمحوں کو سوچ کر آتشیں رنگت ہو جائے۔

"جن دنوں شمائلہ ہونے والی تھی ان دنوں ہم لوگ ایک ویران وادی میں رہ رہے تھے۔ شاید کشمیر سائیڈ پر قدرت کا سارا حسن وہاں بکھرا پڑا تھا اور زندگی بے حد مشکل محسوس ہوتی تھی۔

اول تو وہاں کوئی سڑک نہیں تھی جو کچے پکے راستے تھے ان پر چلتے چلتے دم نکل جاتا تھا ہم لوگ سرکاری رہائش گاہ میں تھے مگر باقی سہولتیں کہاں سے آتیں۔" وہ سانس لینے کو رکیں گئی رتوں کے مناظر

کسی بلیک اینڈ وائٹ فلم کی طرح دھندلے ادھورے ذہن کی اسکرین پر تھرک رہے تھے البتہ آنکھوں کی چمک سے ان لمحوں کی قدر و قیمت کا احساس بخوبی ہو رہا تھا۔

''تو کیا آپ کی پریگنینسی میں بھی نانا جان کو آپ کا خیال نہیں ہوتا تھا۔''

''نہیں بہت ہوتا تھا مگر میں بھی بہت ضدی تھی ان دنوں شاید شرم و حیا کے معیار بھی بہت مختلف ہوتے تھے۔ میں چوتھے مہینے کے بعد سے اپنے ابا کے سامنے جاتے گھبراتی تھی اور اماں سے بھی شرم آتی تھی بھائیوں سے ملنا تو دور کی بات۔'' منہ زور ہوا بھی اس وقت ان کے دوپٹے سے اٹھکھیلیاں کر رہی تھی۔

''مگر نانو یہ تو نیچر ہے اللہ کا انعام..... اس میں شرم کیسی۔'' کشمالہ نے چہرے پر آئے ہوئے بال سمیٹے۔

''بس تیری سمجھ میں نہیں آئیں گی یہ باتیں..... ہمارا وقت حیا اور سادگی میں گزر گیا جسے آج کے لوگ بیک ورڈ ہونے کا نام دے دیتے ہیں۔'' ان کے لہجے میں یکدم سرد مہری آ گئی تھی۔

''پھر کیا ہوا.....'' کشمالہ کسی تاریخ کے طالبعلم کی طرح اس سارے کہانی میں گم تھی۔

''پھر ایک دن ہم وہاں سے نکلے سارا دن کا سفر میری زندگی کا مشکل ترین لیکن قدرت کی مہربانی سے بخیر و عافیت گزر گیا۔

ان دنوں اسلام آباد میں بھی جنگلی جانوروں کا گزر ہوتا تھا نہ روشنی اور نہ آبادی..... لیکن انہوں نے بھی تہیہ کر رکھا تھا کہ مجھے قدرتی ماحول سے جدا نہیں ہونے دیں گے۔

شمائلہ کے آنے سے پہلے اس گھر کا ایک پورشن بن چکا تھا۔ میں نے حیران پریشان ہو کر ایک ایک دیوار کو چھو کر دیکھا چھت پر بھی چڑھ گئی کچھ سمجھ نہیں آیا یہ گھر مکمل ہو کر کیسے نقشے میں ڈھلے گا اس کے کتنے دروازے ہوں گے۔ بیرونی راستے اس قدر کیوں ہیں اتنے سنسان علاقہ کیا ہر دروازے کو رات کو تالا لگے گا۔ میں تو پہلی دفعہ میں ہی جھنجھلا سی گئی۔

تب تمہارے نانا نے کہا نیک بخت! یہ گھر میری تمام عمر کی محنت اور ذہانت کا صلہ ہے اور تم اس کی مالکن بھی ہو انجینئر بھی..... اس کے سکھ کو برقرار رکھنا تمہاری نوکری..... اور میں تمہارا ملازم....."

انہوں نے چپکے سے اپنی آنکھوں کی نمی سمیٹ لی تھی۔

"اور پھر شمائلہ آ گئیں....."

"کہیں نانا آپ کو چھوڑ کر واپس اپنے کام پر تو نہیں چلے گئے تھے۔" میں نے ماحول کی بشاشت بحال کرنے کی کوشش کی۔

"نہیں شاید اس بار وہ اپنے کام سے کچھ دنوں کے لیے غافل ہو گئے تھے بیٹی کی پیدائش خوشیاں منانے والا صدقہ خیرات کرنے والا حیرت میں ڈال گیا تھا لیکن انہیں کسی کی کوئی پرواہ نہیں تھی وہ تو اپنی خوشیوں میں مگن تھے۔

شمائلہ مہینے کی تھی تب یہ گھر بھی مکمل کیا تھا سچی بات ہے میں جو سوچتی تھی وہ خود بخود ہوتا چلا جاتا تھا۔" وہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ مسکرا دیں۔

"نانو! پھر تو آپ بہت لکی ہوئیں ناں..... میں نے سنا ہے عورتوں کے خوابوں کی کوئی حد نہیں ہوتی اور ان کے خواب بڑی مشکل سے پورے ہوتے ہیں۔"

"خواب چاند کی طرح ہوتے ہیں نظر تو آتے ہیں کبھی آدھے کبھی پورے مگر انہیں چھو نہیں سکتے۔ خواب ہماری پہنچ سے ہمیشہ دور ہوتے ہیں۔"

"یہ کیا بات ہوئی اس کا مطلب ہے انسان چاند کی خواہش کرے ہی نہیں۔"

"اکثر لوگ چاند کو چھونے کی آرزو میں سورج سے ہاتھ جلا بیٹھتے ہیں پھر انہیں احساس ہوتا ہے دراصل جسے وہ روشنی کا ہالہ سمجھ رہے تھے وہ تو آگ کا بگولہ بھی ہے۔"

"امیزنگ نانو جان! آپ کی باتیں تو کوئی فلاسفر ہی سمجھ سکتا ہے میری تو نہ اتنی زیادہ معلومات ہیں اور نہ ہی اردو زبان اتنی اچھی ہے۔" اس نے گہری سانس لے کر کہا تھا۔

''یہ کس نے کہا کہ تمہاری معلومات نہیں اور تمہاری زبان خراب ہے مجھے تو لگتا ہے نہیں تم دونوں ساری زندگی پردیس میں رہی ہو..... تمہارے لہجے کی خوشبو اتنی خالص اور دیسی ہے کہ دل چاہتا ہے خوب محسوس کروں۔''

انہوں نے خاصے پرزور لہجے میں سرزنش کی تو وہ بھی مسکرا دیں۔

''یہ تو میرا کوئی کمال نہیں..... ہماری ماں کا شوق اور پاپا کی محبت ہے۔ جس نے ہم دونوں کو آج آپ کی محبت سے بھی نواز دیا۔

میں یہاں آنے سے پہلے بہت پریشان تھی۔ جو پاپا کا فیملی بیک گراؤنڈ تھا اس کے حوالے سے بھی کوئی پازیٹو خیال نہیں آتا تھا آپ کے بارے میں جب وہ بتاتے تھے تو میرے ذہن میں عجیب بھاری بھرکم رعب دار قسم کی خاتون چلی آتیں جس کا سارا وقت اونچی آواز میں ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہوئے گزرا کرتا ہے۔'' وہ صاف گوئی سے بولی اس کی آئینے جیسی آنکھیں پلکوں کی جھالر میں چھپی ہوئی تھیں۔

بسنتی رنگ کی کرتی کے ساتھ اورنج رنگ کے تنگ پاجامے میں ستاروں کے کام والا بڑا سا دوپٹہ اس کے متناسب سراپے پر خوب سج رہا تھا اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ڈھلتی شام کے سارے رنگ اس کے بالوں میں سمٹ آئے ہوں۔

نانو نے دل ہی دل میں اس کی نظر اتارتے ہوئے بے اختیار ماشاء اللہ کہا تو وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔

''آپ کو برا لگا.....'' وہ بے ساختہ بولی۔

''اگر اچھا لگا تو.....'' اسی کے انداز میں استفسار کیا تو وہ جھلا سی گئی۔

''نانو میں نانا جان کی طرح انٹیلی جنٹ نہیں ہوں آپ ان کے ساتھ والا گیم میرے ساتھ نہ کھیلیں۔''

''ان کا دل چاہتا تھا ہر وقت کوئی نہ کوئی ستائشی جملہ سنتے رہیں۔''

''آپ سے یا.....ان کی اور بھی فرینڈز تھیں۔'' کشمالہ کی شرارت اچانک جاگ اٹھی تھی۔

''ہوں گی اور بھی..... شائلہ کے بعد پھر میں کبھی ان کی پوسٹنگ پر ساتھ نہیں گئی..... وہ اپنا پروجیکٹ ختم کر کے آتے..... بمشکل ہفتہ بھر ہمارے ساتھ رہتے پھر کوئی اگلا مشن ان کا منتظر ہوتا..... آرام تو ان کی قسمت میں نہ تھا اور کچھ بے چین فطرت بھی تھے۔''

آج نانو کا بس نہیں چل رہا تھا ماضی کی ہر پرت کو کھول کر دیکھیں.....اور کشمالہ کو بھی ان کا ذہنی کتھارسس کر کے بہت مزا آ رہا تھا۔

شام ڈھل چکی تھی اب تو خولہ کے آنے کا وقت بھی ہو چلا تھا..... خدیجہ نے چائے کے ساتھ اسنیکس کا اہتمام کر کے ان دونوں کو بھی اندر آنے کی دعوت دی تھی۔

''شام گہری ہو جائے تو درختوں کے نیچے نہیں بیٹھا کرتے.....'' وہ بھی کم فلاسفر نہیں تھی کشمالہ نے بمشکل ہنسی روک کر اس کا مان بڑھایا۔

''کیا کوئی مسئلہ ہو جاتا ہے خدیجہ۔''

''مسئلہ نہیں..... مسئلے میری خالہ زاد بہن کو جن چمٹ گیا تھا وہ بھی صبح و شام توت کے درخت کے نیچے بیٹھی رہتی تھی۔ اللہ نے تو شکل وصورت بھی خوب دی تھی پر اب تو ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی۔''

''خدیجہ! اس کی شادی ہو گئی کیا.....''

''کون کرے گا اس سے شادی دورے پڑتے ہیں پاگلوں جیسی باتیں کرتی ہے۔ اس پر جن عاشق ہو گیا ہے وہ کسی کا نام ہی نہیں لینے دیتا۔''

''اوہ گاڈ! ایک اور عورت جاہلانہ روایت کا شکار..... پتا نہیں اس بے چاری کے ساتھ کیا نفسیاتی پرابلم ہے اور یہ لوگ علاج کے بجائے جن کی مار مار رہے ہیں۔'' اس نے نانو کا ہاتھ تھام کر انہیں سہارا دیا اور پھر ان کے ساتھ چلتے ہوئے رسان سے کہا تو وہ بھی محض سر ہلا کر رہ گئیں۔

''خدیجہ کیا تم مجھے اپنی کزن سے ملواؤ گی۔'' اچانک ہی اسے خیال آیا کہ وہ عورت تو ایک مکمل کردار تھی پاکستانی معاشرے کی کمزور بنیادوں کو توہم پرستی میں جکڑ کر مزید کمزور کرنے والا کردار۔

شاید وہ ان کمزور بنیادوں کو اپنی معلومات سے مضبوط کرنے کی ناکام سی کوشش کرنا چاہتی تھی۔

''کیوں نہیں..... آپ کل ہی چلو..... ادھر قریب ہی تو ہے ان کا گاؤں۔'' خدیجہ کے لیے یہ ہی کافی تھا کہ کشمالہ اس کے ساتھ وقت گزارنا چاہتی تھی۔

وہ گاؤں کی سادہ سی محنت کش عورت چپکے چپکے ان دونوں گوریوں کو دیکھا کرتی تھی جو اسے بازار میں سجے شوکیس کی سب سے قیمتی گڑیا جیسی لگا کرتی تھیں۔

ان کی نیلگوں آنکھیں..... سنہرے بال..... اور بے حد نرم و نازک ہاتھ پیر بالکل کسی کبوتری کی مانند تھے کبھی تو وہ ٹکٹکی باندھ لیتی اور کبھی کام کرتے کرتے اس کے ہاتھ تھم جاتے۔

وہ اور اس کا شوہر نانو کے کل وقتی ملازم تھے جو کئی سالوں سے ان کے پاس تھے ابھی تک اولادی نعمت سے محروم تھے مگر صابر اور شاکر تھے ہفتے کی شب اپنے آبائی گھر جاتے اور ڈھیر ساری چٹپٹی خبروں کے ساتھ اتوار کی شام واپس آتے تو نانو کو ان کا صابر شاکر سامع بننا پڑتا۔ آج کل کشمالہ بھی فیض یاب ہوتی تھی۔

''ثریا کی نند کا بیٹا ہوا اور پتا ہے اسی شام اس کی بھینس نے بھی بچہ دیا۔ ایک مشکل آ گئی ہے ادھر منا ادھر کٹا..... بھینس صاحبہ کے نخرے دیکھیں شکیلہ کے بغیر نہ تو کچھ کھاتی ہے اور نہ دودھ دوہنے کے لیے تھنوں کو ہاتھ لگانے دیتی ہے۔'' وہ جب بولنے پر آتی تو بلا سوچے سمجھے بولے چلی جاتی کشمالہ کو اس کی مدد سے اپنی زبان اور بیان امپروو کرنے میں خاصی مدد مل رہی تھی۔

ایک دن اس نے بتایا تھا۔

''پتا ہے مجھے ڈیانا بہت اچھی لگتی تھی۔ میں تو بہت دن روتی رہی تھی میری سمجھ میں نہیں آتا کون ظالم اس کے پیچھے پڑ گیا تھا بھلا شہزادیوں کو بھی کوئی قتل کرتا ہے۔''

''اس کا قتل نہیں ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔'' کشمالہ نے تصحیح کی تھی۔

''آپ کو تو خبر ہی نہیں قتل کر کے ایکسیڈنٹ کا نام لگا دیا تھا۔ آپ اس وقت چھوٹی ہوں گی کہاں یاد ہوگا۔'' اس نے کوئی نوٹس نہ لیا تصحیح کا۔

''اب خیر اتنی بھی چھوٹی نہیں تھی میں ان دنوں میں انگلینڈ میں ہی تھی۔''

''آپ نے دیکھا تھا اس کو..... بالکل آپ گئی تھی نا۔'' اس کا شوق قابلِ دید تھا کشمالہ کو اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا عورتوں کے خواب واقعی چاند جیسے ہوتے ہیں۔

''ہم لوگ ان دنوں سمسٹر بریک میں ایک ہسپتال کے ساتھ سوشل ورک کر رہے تھے۔ تب وہ وہاں پر آئی اور میں نے اس سے آٹو گراف بھی لیا تھا۔''

یہ سب بتانے کے بعد کشمالہ تو خدیجہ کی نظروں میں مزید عظیم اور عالی مرتبت ہو گئی تھی اس کا بس نہیں چلتا وہ ان ہاتھوں کو چوم لیتی جنہوں نے ڈیانا کے ہاتھوں کو چھوا تھا۔ تب سے خدیجہ تو کشمالہ کی زبردست فین ہو گئی تھی البتہ خولہ اسے قدرے بے نیاز اور مغرور لگتی۔

لیکن اس بات کا اسے پورا یقین تھا کہ یہ دونوں راجہ صاحب کی سگی بیٹیاں ہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے لے پالک بچیاں بھی صورت، عادت اور مزاج میں راجہ صاحب کا پرتو ہوں۔

ضرور اس کے اندر بھی کوئی کہانی تھی۔ کبھی اسٹار پلس کے ڈراموں کا غلبہ ہوتا تو دونوں کی صورتوں سے نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کرتی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ نانو اور راجہ طارق محمود کی بات کو جھٹلایا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

''ضرور کسی بڑے خاندان کا خون ہیں..... راجہ صاحب بھی قسمت کے دھنی ہیں بیوی نہیں رہی تو کیا ہوا اولاد سے تو نوازا اللہ نے وہ بھی ایسی ستھری..... بٹیا دیکھو تو جی نہ بھرے بن ماں کا بچہ اتنا سعادت مند اور نیک اوپر سے شکل وصورت بھی اللہ نے فرصت سے بنائی۔''

"شکر کیا کر ہم اچھے لوگوں کے ملازم ہیں..... بن کہے ہمارے مسئلے جان لیتے ہیں باقی اللہ یہ کمی بھی پوری کر دے گا ورنہ جیسے اللہ نے راجہ صاحب کو نوازا ہے ہمیں بھی یتیم کو پالنے کا ثواب مل ہی جائے گا۔ پر اس کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتے۔"

اس کے مقابلے میں وہ سمجھدار اور سنجیدہ مزاج مرد تھا جسے راجہ صاحب کے ذاتی معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

خدیجہ نے تو اسے اپنی کزن سے ملوانے کا وعدہ کر لیا تھا اب وہ اس سوچ میں پڑ گئی تھی کہ مسئلے کی وجہ جاننے کے بعد اگر حل کے لیے اقدامات نہ ہو سکے تو کیا فائدہ ہوگا..... کسی کے درد کو تازہ کرنے کا۔

☆.....☆.....☆

ماورا طلحہ کا بہت خوبصورت نیا ناول

مرگِ تمنا

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

تنزیلہ ریاض کا بہت خوبصورت نیا ناول

نور القلوب

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

''منیر..... میں کچھ عرصے کے لیے چھٹی چاہتی ہوں۔ میں بہت تھک گئی ہوں مجھے کوئی شو نہیں کرنا تمہارے کسی کلچر ایونٹ کی نمائندگی نہیں کرنی اور نہ ہی ڈیلی گیشن کے ساتھ جانا ہے۔ پلیز گومی بریک.....''

وہ مہنگے برانڈ کی سگریٹ کے مرغولے بناتے ہوئے منیر کمال سے یوں مخاطب تھی جیسے دونوں کے درمیان طویل المعیاد کا کنٹریکٹ چل رہا ہو۔

نائٹ ڈریس کے بٹن بند کرتے ہوئے منیر کمال قدرے حیرت سے پلٹا تھا اور پھر پیچھے سے آ کر اسے تھام لیا۔ گو کے اس وقت دونوں کے درمیان کمرے کی تنہائی کے علاوہ کچھ نہیں تھا لیکن مدت ہوئی جذبات کا الاؤ دہکنے کے بجائے یوں سرد ہو جایا کرتا تھا جیسے اے سی کی خنکی نے اس لمحے کمرے کی وال گلاس پر اوس کے قطرے بکھیر دیے تھے۔

''کیا ہے منیر..... مجھے تنگ مت کرو۔'' اس نے نرمی سے اس کے ہاتھ پیچھے جھٹک دیئے تھے اور اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہو گئی تھی۔ دودھیا روشنی میں اس کا چہرہ چمک تو رہا تھا مگر عمر کے اثرات بھی نمایاں ہو رہے تھے منیر کمال نے غور سے اسے دیکھا..... اور نائٹ ڈریس کی ڈھیلی ڈھالی شرٹ کے بٹن دانستہ کھول کر اس کے ساتھ آ کر کھڑا ہو گیا۔

آئینہ بالکل جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ منیر کمال کے شباب اور مردانہ اوصاف میں آج بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اس کے چہرے کی سرخی گزرتے وقت کے ساتھ خوشحالی کے جام پینے کی وجہ سے بڑھ گئی تھی۔ خمار آلود آنکھوں میں اب بھی وہی نشہ تھا جو شمائلہ کو گھائل کرنے کا سبب بنا تھا اور اس کا بھرپور مضبوط جسم اب بھی اتنا ہی متاثر کن تھا کہ شمائلہ جیسی ظاہری خدوخال پر مرمٹنے والی کسی بھی عورت کو اپنے حصار میں لے سکتا تھا شمائلہ نے بے ساختہ اپنی گردن پر ہاتھ رکھ لیا تھا اسے آئینے کا سچ اگلنا بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔

اس نے ایک گہرے رنگ کی لپ اسٹک اٹھا کر خشک ہونٹوں پر مسلنا شروع کر دی۔

''جان من ہماری نظروں سے خود کو دیکھا کرو۔ تمہارے ان لبوں کا رس کبھی کم نہیں ہو سکتا۔ کہو تو چکھ کر بتا دوں۔'' وہ شوخ ہونے لگا۔

''اللہ..... کے لیے منیر! یہ فلمی جملے مت بولا کرو.....'' وہ چڑ سی گئی۔

''لیکن تمہارا منیر تو تمہیں اچھا ہی اس لیے لگتا ہے کہ جو اس کے دل میں ہوتا ہے آنکھوں میں قید نہیں کرتا بلکہ بول دیتا ہے۔'' وہ اسے چڑاتے ہوئے بولا۔

''لیکن اب وقت بہت آگے نکل چکا ہے۔''

اس نے بالوں کو کلپ کی قید سے آزاد کر کے سنوارنا شروع کیا تو منیر کمال نے برش اس کے ہاتھ سے لے لیا اور اب اس کی گھنیرے بالوں کو اپنی انگلیوں سے سنوار رہا تھا۔

''میری جان! ہمارے لیے وقت ہمیشہ ایک سا رہے گا۔ تمہیں تنہائی میں دیکھ کر منیر کمال آج بھی اتنا ہی پاگل ہو جاتا ہے جتنا پہلی بار تمہیں تنہا گوشے میں اکیلا بیٹھے دیکھ کر ہوا تھا۔ یاد ہے تمہیں ہماری پہلی ملاقات.....''

اس نے بڑی نرمی سے اس کے باغیانہ خیالات پر قابو پانا شروع کر دیا۔ وہ اس سے بریک مانگ رہی تھی اور یہ وقت اسے بریک دینے کا نہیں بلکہ کم وقت میں بہت سارے منصوبوں پر عمل درآمد کرنے کا تھا۔ ابھی تو پہلی کھیپ دبئی پہنچی تھی۔

''منیر مجھے پہلی سے آخری ساری ملاقاتیں یاد ہیں۔ تم مجھ بہلاؤ مت..... میں واقعی کچھ دنوں کے لیے ریسٹ چاہتی ہوں اس سارے ہنگامے سے.....''

اسے آج قابو کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ منیر کمال نے دونوں بازوؤں کے حلقے میں سمیٹ کر اس کے کندھے پر اپنا چہرہ جما دیا۔ اس کی گرم سانسوں کی تپش شمائلہ کی گردن جھلسانے لگی تھی۔

''''ایک تو تم نے حد سے زیادہ پی رکھی ہے۔'' اس نے ناگواری سے کہا۔

''بیگم! رات کو پی تھی۔ اب تو نشہ اتر گیا ہے البتہ میرا نشہ تو اس بوتل میں ہے۔ جو میرے سامنے بند پڑی ہے۔ ابھی تک دیکھو کس قدر صابر ہوں۔'' وہ بھاری لہجے میں گویا ہوا اور اس کے بازوؤں کی گرفت مضبوط ہونے لگی تھی شمائلہ نے کسمسا کر خود کو اس کی گرفت سے آزاد کرنے کی کوشش کی مگر وہ بھی منیر کمال تھا جو پہلی ملاقات سے لے کر آج تک اس پر مغلوب ہوتا آیا تھا اس نے تھوڑی سی حیل و حجت کے بعد اس کے کشادہ سینے میں اپنا سر چھپا لیا تھا۔ اور جیسے ہی آنکھیں موند کا ہار ماننے کا اعتراف کیا۔ ذہن کے پردے پر پہلی ملاقات کے لمحے نمودار ہونے لگے۔ اسے اپنی عمر کے سابقہ ہر دور میں لفظ کاش سے نفرت تھی اس کا یقین صرف اس بات پر تھا کہ زندگی میں کاش کچھ نہیں ہوتا اور نہ ہی ہونا چاہیے۔ یہ زندگی ہمیں بار بار تو نہیں ملتی۔ جب ہمیں ایک بار جینا ہے تو حسرت اور ملال کے ساتھ کیوں.....

اس نے اپنی کسی خواہش کو کبھی حسرت نہیں بننے دیا تھا۔ جہاں کبھی کوئی رکاوٹ ہوئی۔ حالات کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیا۔

یا تو قسمت اس پر مہربان تھی یا پھر اس کی حکمت عملی اتنی بھرپور ہوتی کہ ہار کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

لیکن آج زندگی کے ہر موڑ کا آغاز وہ لفظ کاش سے کرتی تھی.....

کاش وہ پہلی ملاقات کے بے رحم لمحے زندگی میں نہ آئے ہوتے.....

ان دنوں عاشر چار سال کا ہو چکا تھا اور وہ سکول بھی جانے لگا تھا۔ شمائلہ کی زندگی میں بھی فراغت سمٹ آئی تھی اس سے قبل بھی وہ روایتی قسم کی ماں کا کردار تو نہیں نباہ رہی تھی لیکن پھر بھی وقت تو دینا پڑتا تھا۔

اسے آج بھی اپنی زندگی کی ترجیحات سے زیادہ محبت تھی۔ اپنی مرضی سے سونا مرضی سے جاگنا..... اپنی پسند کا حلقہ احباب..... اور طارق محمود کو اپنی ملکیت تصور کرنا..... بہت سارے رویے

اسے دوسری عورتوں سے ممتاز کرتے تھے۔

طارق محمود اس کا ایسا خواب تھا جسے وہ بند آنکھوں میں چھپا کر رکھنا چاہتی تھی اسے لگتا تھا جیسے ہی آنکھیں کھولے گی یہ خواب ٹوٹ جائے گا اور شاید اس کا وہم درست بھی تھا۔

اس کے اور طارق محمود کے درمیان جھگڑے معمولی نوعیت کے ہوتے تھے لیکن انا کی سربلندی کے معاملات کبھی کبھی غیر معمولی نوعیت اختیار کر جاتے تھے۔ اس دن بھی بات زیادہ بڑی نہیں تھی..... طارق محمود نے اپنی عورت سے ایک اور بچے کی خواہش کر ڈالی تھی جو اس کے لیے طعنہ بن گئی تھی۔

''طارق! تم مرد عورت کو بے بس دیکھنا چاہتے ہو اور کوئی مسئلہ نہیں..... میں ابھی اپنی شادی شدہ زندگی کی تبدیلی کو انجوائے کرنا چاہتی تھی تمہارے ساتھ دنیا دیکھنا چاہتی تھی لیکن تم نے سوچا ہوگا عورت کے پیر میں اولاد کی زنجیر ڈال دو وہ ہر اڑان بھول جائے گی..... عورت کی صلاحیتوں کا اعتراف صرف اولاد پیدا کرنے سے نہیں ہوتا اور بھی بہت سارے کام کر سکتی ہے۔'' شمائلہ کا لہجہ اجنبیت سے بھرپور تھا طارق محمود بے یقینی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

''ہائے اماں.....!'' اس کی نظر کمرے کی چھت پر چہل قدمی کرتی چھپکلی پر پڑی تھی تب ہی ہلکی سی چیخ کے ساتھ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی تھی جیسے وہ اسی سے مخاطب ہو..... اس کی آنکھوں میں بے ساختہ آنسو چلے آئے۔ دل سے صدا تو ماں کے نام کی نکلی تھی اور موبائل پر نمبر شجاع کا چمک رہا تھا۔ اس نے قیمتی متاع کی طرح موبائل اٹھایا اور ریس کا بٹن دبا دیا۔

''اب یاد آ رہی ہے میری..... ٹائم دیکھ رہے ہیں.....'' شکایت تو جیسے ہونٹوں پر دھری تھی۔ شجاع کے لبوں پر رنجیدہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ دل ہر صبح اسے دیکھنے کو اس شدت سے مچلتا تھا کہ وہ بے قرار اپنے کمرے کی بالکونی میں کھڑا ہو جاتا اور نظریں اس کے کمرے کی کھڑکی پر جما دیتا۔

''ظالم لڑکی! موبائل کی آؤٹ گوئنگ بند تھی.....''

''مجھے نہیں پتا.....اگر صبح آپ کا فون نہیں آیا تو پھر انجام اچھا نہیں ہوگا۔'' اس کی بھیگی آنکھیں کوئی رعایت دینے کو تیار نہیں تھیں۔

''پتا ہے شجاع میرے کمرے میں ایک چھپکلی آ گئی ہے اور وہ مسلسل میری طرف آ رہی ہے۔''

''اس کی یہ ہمت میرے ہوتے تم پر نظر رکھے میں ابھی کمانڈو ایکشن کرواتا ہوں۔'' وہ ہنس پڑا تھا۔

''میں مذاق نہیں کر رہی شجاع وہ بہت موٹی ہے.....''

''میری بلی سے بھی زیادہ.....''

''کیا مطلب.....میں موٹی ہوں کیا.....''

''میں نے تو بلی کی بات کی تھی تم تو میری شیرنی ہو۔''

''شجاع!'' وہ جیسے وہ دینے جو تھی۔

''اچھا کیا کروں آ کر چھپکلی کو مار دوں بولو ابھی آ جاتا ہوں چھپکلی کو مارنے شیرنی کو گلے لگانے.....''

''بے ہودہ.....بدتمیز.....بات نہیں کریں مجھ سے.....''

''اور اگر مر گیا اس صدمے سے اور.....''

''کوئی بات نہیں میں بھی مر جاؤں گی اس خوشی میں۔''

''گویا.....ابھی سے بیویوں والا سلوک، اچھا یہ بتاؤ کھانا کھایا.....''

''آپ کھانے کی بات کر رہے ہیں میں نے ناشتا بھی نہیں کیا۔''

''صوفی میں تمہارا گلا دبا دوں گا وہیں تمہارے رشتے داروں کے سامنے اگر اس طرح کی لاپرواہی کی.....'' وہ یکدم طیش میں آ گیا تھا جو کہ صوفیہ کے لیے نئی بات ضرور تھی مگر فطرت کے برعکس نہیں تھی اس لیے سکون کی لہریں دل میں اترنے لگی۔

اس کی ہر واہ کرنے والا شجاع تھا یہ احساس تفاخر سے کہیں بڑھ کر کچھ اور تھا۔

''کیا کھانا ہے.....'' اس کی نرمی کا سبب صوفیہ کی خاموشی تھی۔

''میرا دل نہیں چاہ رہا.....'' وہ منمنائی۔

''میں کسی فاسٹ فوڈ سے ڈلیوری کروا دیتا ہوں..... بالکل نخرے نہ کرنا۔''

''بھوک لگی ہے مجھے..... میں نخرے کیوں کروں گی..... آپ بس جلدی سے بھجوا دیں۔'' یکدم سب کچھ جاگ اٹھا تھا۔ بھوک، پیاس اور بیت السکون کی یاد جب پزا اور زنگر کے بغیر شام ادھوری لگتی تھی۔

''ایڈریس لکھواؤ۔''

وہ ایڈریس لکھوا کر فون بند کر کے چھپکلی کی تلاش میں نظریں دوڑا رہی تھی کہ بیرونی دروازہ ہلکی سی آواز کے ساتھ کھل گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

بیرونی دروازے پر دستک دینا یا کمرے کے اندر آنے کی اجازت طلب کرنا یقیناً اس گھر کے اصول اور مزاج کے خلاف تھا اسی لیے نعمان عجیب و غریب حلیے میں چہرے پر مسکینیت کی انتہا لیے اس کے سامنے تھا۔

وہ پلک جھپکتے میں اٹھ کھڑی ہوئی اور دوپٹے کی تلاش میں نظریں دوڑائیں دوپٹہ قریب ہی بستر پر دھرا تھا اور وہ بھی مہا ڈھیٹ مسلسل ادے تک رہا تھا گویا اس کے یہاں ہونے کا جواز ڈھونڈ رہا ہو۔ اس کے چہرے پر اس وقت کوئی تو غیر معمولی تاثر تھا جس نے صوفیہ کے دل کی دھڑکن منتشر سی کر دی تھی دوسری طرف موبائل تو آف ہو چکا تھا اس نے بھی آف کا بٹن دبا کر تسلی کی اور پھر اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''تمہیں مجھ سے کام ہے کیا؟ اور یہ دروازہ اس لیے تو نہیں کھلا تھا کہ تم منہ اٹھائے اندر چلے آؤ..... تمہیں کسی نے تمیز نہیں سکھائی۔''

وہ اس کی موجودگی سے زیادہ اس کے حلیے سے خائف ہو رہی تھی پاجامہ نما ٹراؤزر پر سلیولیس ٹی شرٹ الجھے بکھرے ہوئے بال اور آنکھوں میں نیند کی سرخی صوفیہ کو عجیب سے خوف میں مبتلا کر گئی تھی اٹھارہ انیس سال کا یہ دبلا پتلا لڑکا اتنا بڑا طرم خان نہیں تھا کہ اسے خوفزدہ کر دیتا لیکن اس کی چھٹی حس نے خبردار کیا تھا کہ اٹھارہ انیس سال کا یہ سپوت اس وقت الکوحل کی خماری میں تھا اس کی سوجی ہوئی سرخ آنکھیں اور بدحواسی اس بات کی بھی غماز تھی کہ وہ اس دشت کی سیاہی میں ابھی ابھی کودا ہے۔

''کیا مشکل ہے تم جاتے کیوں نہیں؟''

وہ اس کے بستر پر بڑے اطمینان سے بیٹھ گیا تھا ار پکڑ کر جس پر اس کا چیخنا لازم تھا۔

''میں سونے آیا ہوں..... مجھے بہت نیند آ رہی ہے میری طبیعت ٹھیک نہیں اور میری ماں کو کوئی احساس نہیں۔''

اس کا جواب بڑا بے ساختہ تھا صوفیہ کو ہمدردی سے زیادہ کوفت نے آن گھیرا۔

''اوہ بھئی! یہ تو میرا ٹھکانہ ہے اس کو میں کمرہ بھی نہیں کہہ سکتی کبھی کوئی چادر لینے آ جاتا ہے اور کبھی کوئی پیچ کس..... اب تم آ گئے یہاں سونے..... کیا پاگل ہو گئے ہو یا میں سڑک پر چلی جاؤں.....''

اس کا لہجہ اتنا سخت اور کرخت تھا کہ اگر وہ ذرا سا بھی اپنے حواسوں میں ہوتا تو پلٹ کر اس کا ردعمل ضرور دکھاتا مگر وہ چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں تھام کر بیٹھ گیا تھا۔

''سڑک پر کیوں چلی جاؤ..... اپنے گھر چلی جاؤ..... تمہیں کس گدھے نے مشورہ دیا کہ یہاں رہنے چلی آئیں.....''

وہ اتنا مطمئن تھا کہ صوفیہ تلملا کر رہ گئی۔

''میں نے اس وقت تم سے کوئی مشورہ نہیں مانگا..... اب تم فوراً یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ تمہاری اماں آ گئیں تو مجھے سنانے کھڑی ہو جائیں گی کہ میں ان کی اولاد کو بہکا رہی ہوں۔''

اس نے بغیر کسی مروت کے وہ سب بول دیا تھا جو اس کے دل میں تھا اور شاید اس گھر کے ماحول سے مطابقت بھی رکھتا تھا کیونکہ ابھی تک سعدیہ اور نادیہ نے اس کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کرنے کی کوشش نہیں کی تھی البتہ نعمان آج دوسری بار اس کے کمرے میں آیا تھا پہلی بار اسے موبائل کی ضرورت تھی شاید کوئی ایمرجنسی تھی اور اس کے پاس بیلنس نہیں تھا..... اس بار تو وہ یوں بے تکلفی سے براجمان تھا جیسے اسی کمرے کا مکین ہو یا پھر اس کا قریبی دوست.....

''ایک بات تو بتاؤ۔ کیا تمہارے گھر والے تم سے اچھا سلوک نہیں کرتے تھے اور تم یہاں آ گئیں۔''

وہ یکدم اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مخاطب ہوا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا ان باتوں سے۔ میری مرضی میں جہاں بھی رہوں تم بار بار یہ سوال کیوں کر رہے ہو.....''

وہ الجھ ہی تو گئی تھی..... ایک تو کمرے کی حدت میں اضافہ ہو چکا تھا اور پھر اس کی باتیں دل و دماغ کی تپش میں اضافہ کر رہی تھیں۔ وہ باتھ روم جانا چاہتی تھی سارا غصہ ساری بے بسی پانی میں بہا دینا چاہتی تھی مگر وہ یوں جم کر بیٹھا ہوا تھا کہ اسے اپنے آپ سے بھی کوفت محسوس ہو رہی تھی۔

''میں کوئی سوال نہیں کر رہا..... میں ہوشیار کر رہا ہوں..... یہ لوگ دیوالیہ ہو چکے ہیں بالکل خالی..... ان کے پاس تمہیں دینے کے لیے کچھ نہیں تمہارا حصہ بھی نہیں تم خواہ مخواہ خود کو خوار کر رہی ہو جاؤ اپنے گھر..... اور مزے سے رہو۔ دیکھا ہے میں نے تمہارا گھر باہر سے۔ اس کو چھوڑ کر یہاں آنے کی کوئی تک نہیں بنتی میری اماں کو تو اپنی اولاد اچھی نہیں لگتی..... تمہیں کیا پیار دیں گی۔''

''مجھے تو تم بالکل پاگل لگ رہے ہو..... میں یہاں نہ اپنا حصہ لینے آئی ہوں اور نہ تمہاری اماں کا پیار..... میں اپنے باپ کے گھر پر رہنے آئی ہوں..... اس گھر پر میرا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کہ تم سب

لوگوں کا..... مجھے پتا ہے تم لوگوں کے پاس مجھے دینے کے لیے کچھ نہیں الٹا مجھ سے ہی مانگا جائے گا۔"

وہ تلخی کی حد تک سچ بول گئی تھی جس کے بعد نعمان کے چہرے پر مدہم سی مسکراہٹ اسے اجنبی محسوس نہیں ہوئی تھی۔

"ارے واہ! تم تو بہت سمجھدار ہو تھوڑے سے دنوں میں سب کچھ پتا چل گیا تمہیں..... پھر بھی تمہاری کوئی تو پلاننگ ہوگی نا اس گھر میں آنے کی ورنہ کوئی اتنا احمق نہیں ہوتا جو اے سی کمرے کی ٹھنڈک چھوڑ کر اس اسٹور میں رہنے لگے۔"

وہ بے تکلفی سے بولا تو صوفیہ کو اس کے چہرے کا بغور جائزہ لینا پڑا جہاں کچھ دیر پہلے بدحواسی کے ساتھ بے لگام ہونے کے تاثرات بھی بڑے واضح انداز میں درج تھے لیکن اب وہ کافی حد تک سنبھل چکا تھا اس کی آنکھوں کی سرخی بھی بتدریج کم ہو رہی تھی اور زبان کی معمولی سی لڑکھڑاہٹ بھی ختم ہو گئی تھی وہ شاید خود کو ریلیکس کرنے کے لیے اس کے پاس بیٹھا تھا اور اتنی دیر سے وہ ایک سیاہ صندوق پر چڑھ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ بہت ممکن تھا کہ یہ منظر تائی دیکھ لیتیں تو ان کے حواس ضرور مختل ہو جاتے۔ ان کے شاطر ذہن میں جو پہلا خیال آتا وہ اگر صوفیہ تک منتقل ہو جاتا تو وہ اپنی ماں کے فیصلے پر اش اش کر اٹھتی۔

نعمان تو کمرہ چھوڑنے کے موڈ میں نہیں تھا البتہ موبائل کی رنگ نے اطلاع دی تھی کہ اس کا برنچ پہنچ چکا ہے۔

وہ اپنا والٹ ہاتھ میں لے کر دروازے سے باہر نکل گئی۔ تب ہی نعمان کے تیز ذہن اور آنکھوں نے بیٹھے بیٹھے اس کے سامان کا جائزہ لینا شروع کیا۔ بڑا سا امپورٹڈ بیگ اور یقیناً اس جا لاک بھی امپورٹڈ ہوگا اس کا براؤن لیدر کا ہینڈ بیگ اور شاید کتابوں کا کارٹن..... اور تو کچھ بھی نہیں تھا۔

"گویا وہ یہاں رہنے نہیں کسی مقصد کے لیے آئی ہے لیکن میرے گھر والے تو اسے بہو بنانے کا سوچ رہے ہیں سفیر کی دولہن..... کتنا مزا آئے گا جب اس کو پتا چلے گا۔ اس نے خود ہی تو اس ایڈونچر کا حصہ بننے کی کوشش کی ہے۔"

وہ اپنی سوچوں پر خود ہی مسکرا دیا تھا رات دیر تک اسد اور عاجز کی خوشامد کرنے کے بعد اسے یہ نئی اور مہنگی برانڈ کی بوتل میسر آئی تھی جس کا نشہ ٹوٹنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ بھرپور نیند لینے کے بعد بھی کیف و سرور کی لہریں جسم و جاں کو اپنے غلبے میں لے رہی تھیں۔ اماں نے دو ہتڑ مار کر کمرے سے نہ اٹھایا ہوتا تو وہ آج شام تک مدہوشی کے عالم میں نئی دنیاؤں کی سیر کر رہا ہوتا لیکن یہاں صوفیہ کے کمرے میں آ کر اس کے ساتھ دو چار سچ بولنے کے بعد نئی بوتل کا نشہ بھی ٹوٹ گیا تھا اور اماں کی مزید پھٹکار سے بچت بھی ہو گئی تھی۔

وہ ایک بھرپور انگڑائی لے کر اٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ صوفیہ پزا ڈیل کے ساتھ اندر آ گئی۔

''زبردست بھئی..... تم تو یہاں بھی بہت مزے میں ہو..... سچ ہے پیسے والے ہر جگہ عیش کر لیتے ہیں۔''

''تم اگر فضول کی بکواس سے باز آ جاؤ تو اچھا ہو گا اور اپنے حصے کا پزا لے جاؤ پلیز یہاں بیٹھ کر مت کھانا..... ابھی ویسے بھی تمہاری بہن اور اماں کا غصہ برداشت کر کے آ رہی ہوں۔''

اس نے اپنے بستر ہر اخبار بچھا کر تمام چیزیں اہتمام سے رکھیں اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

''میرا کچھ کھانے کا موڈ نہیں ہے لیکن میں یہاں سے جاؤں گا نہیں خاصا سکون ہے یہاں پر عالیہ عظمی کے آنے کے بعد یہ گھر بالکل چڑیا گھر بن جاتا ہے اور جب تم بھی نہیں تھیں تو میں یہاں نیند پوری کر لیا کرتا تھا اب کہاں جاؤں چھت پر تو جا کر سکون لینے سے رہا.....''

وہ جھنجھلا کر بولا تب صوفیہ نے اس پتھر سے مزید سر پھوڑنے کے بجائے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے اپنی ساری توجہ سامنے رکھے پزا کی طرف مبذول کر دی بھوک تو رات سے لگی ہوئی تھی اور اس وقت من و سلوی سامنے رکھ کر وہ اپنی برداشت کا مزید امتحان نہیں لے سکتی تھی۔

''تھینکس شجاع.....''

دل کی آواز لبوں سے باہر نکلی تو نعمان نے چونک کر اسے دیکھا وہ صرف اس کے ساتھ کولڈ

ڈرنک شیئر کر رہا تھا اور نظریں کسی غیر مرئی نقطے پر جما رکھی تھیں۔

''یہ شجاع کون ہے؟''

''یہ تم اتنے پرسنل کیوں ہو رہے ہو میرا کوئی ارادہ نہیں ہے تم سے لمبی چوڑی باتیں کرنے کا..... جب تم کچھ نہیں کھا رہے تو یہ کولڈ ڈرنک باہر جا کر پی لو..... میں کمفرٹیبل نہیں ہوں تمہارے ساتھ۔''

وہ صاف گوئی میں بھی کسی کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی نعمان نے پہلی بار اس کے سامان اور دیگر اشیاء سے نظریں ہٹا کر بغور اسے دیکھا وہ بار بار اس سے خائف ہو رہی تھی مگر اس کے چہرے کا اعتماد ابھی تک اپنی جگہ برقرار تھا اس کے انداز میں بے نیازی اور بے خوفی تھی اسے کوئی پرواہ نہیں تھی کہ نعمان اس پر نظریں جمائے بیٹھا ہے اس کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ عہ اتنی نفاست اور سکون سے کھا رہی تھی کہ جیسے کسی پزاہٹ میں بیٹھی ہو حالانکہ کمرے کا درجہ حرارت اس کی خستہ حالت صوفیہ کی دلکش شخصیت کے ساتھ میل نہیں کھاتا تھا بلکہ پوری کی پوری صوفیہ اس گھر کے در و دیوار اور مکینوں کے درمیان مس فٹ دکھائی دیتی تھی ابھی عظمی اور تائی اماں کے ساتھ ہونے والی تکرار کا ہلکا سا شائبہ بھی اس کے چہرے پر نہیں تھا نعمان نے بے اختیار اس کے حوصلے کی داد دی اور کھڑا ہو گیا۔

''تم بھی تو مجھے کچھ نہیں بتا رہی ہو لیکن ایک وقت آئے گا جب تم مجھ سے ہی سب کچھ پوچھ رہی ہو گی۔''

وہ مدہم سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا تو صوفیہ نے سر، اثبات میں ہلا دیا۔

''شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔''

''اور میں کچھ بھی نہیں بتاؤں گا۔''

وہ اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔ شاید اسے اپنی اس چچازاد سے ہمدردی ہو چلی تھی یا پھر وہ کوئی ہمدردی کر لے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔

''مجھے پتا ہے..... جسے خود اپنی خبر نہ ہو وہ کسی کو کیا رستہ دکھائے گا۔''

یہ پہلی براہ راست چوٹ تھی جو نعمان کو بہت محسوس ہوئی تھی۔

''تم ٹھیک کہتی ہو ہمیں کسی کے ذاتی معاملات میں نہیں پڑنا چاہیے۔''

وہ کہہ کر رکا نہیں تھا صوفیہ نے آخری لقمہ لے کر مسکراہٹ لبوں میں ہی دبالی تھی۔

سفیر سے چھوٹی عظمی اور پھر یہ نعمان..... سفیر کے بالکل برعکس تھا شاید اس نے اپنی ماں کے مزاج اور تربیت کا گہرا اثر لیا تھا لیکن صوفیہ کو اس لمحے کے مشاہدے کی بنا پر اپنے خیال میں تبدیلی لانا پڑی تھی وہ رستہ بھٹکنے کے ابتدائی مرحلے میں تھا اس نے برائی کے چھینٹے ضرور پڑنے دیئے تھے اور انہیں روکا نہیں تھا لیکن دلدل میں چھلانگ نہیں لگائی تھی۔ دراصل جن گھروں میں بڑوں کے درمیان تفرقہ اور چپقلش ہو وہاں چھوٹوں کو سیدھے رستے پر چلنے کی تلقین کرنے والا کوئی نہیں ہوتا شاید اس گھر کی بدقسمتی بھی یہی تھی۔

☆.....☆.....☆

حُسنی حُسین کا بہت خوبصورت نیا ناول

عُسرِ یُسرا

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جارہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

عاطر شاہین کا بہت خوبصورت نیا ناول

رُوسیاہ

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جارہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

''سر آپ نے دیر کر دی شاید اب وہ یہاں دے پروگرام نہ کریں۔''

خزیمہ کی سماعتیں ان الفاظ سے بوجھل تو ہوئی تھیں مگر اب دل یہ حقیقت ماننے کو تیار نہیں تھا اس کا دل چاہ رہا تھا وہ پھر اس تھرڈ فلور کے استقبالیہ کاؤنٹر کے سامنے کھڑا ہو جائے اور پوچھے۔

''کیا میں خولہ کمال سے مل سکتا ہوں؟''

مگر اس بار اس کے دماغ نے فوراً سرزنش بھی کی تھی۔

''جس طرح کی حرکتیں تم کر رہے ہو یہ تمہاری عمر اور حیثیت کے ساتھ زیب نہیں دیتیں..... اگر تم اس سے ملنا ہی چاہتے ہو تو اپائنٹمنٹ لے کر ملو۔ بغیر کسی تعلق واسطے کے تم اس کے آفس یا اسٹوڈیو پہنچ جاؤ یہ کوئی اچھی بات نہیں۔''

وہ خود سے مخاطب تھا دل ہی دل میں۔

''ہم زندگی میں بہت ساری اچھی باتیں کرتے رہتے ہیں ایک یہ غلط بات بھی سہی اب میں کوئی لڑکی تھوڑی ہوں جو ہر قدم پھونک پھونک کر رکھوں۔''

اس نے فوراً خود کو تسلی دی تھی اور اپنی احمقانہ سوچ پر خود ہی مسکرا دیا تھا۔

صبح کی فلائٹ کینسل بھی نہیں ہو سکتی تھی اپنے مستقل ٹھکانے پر پہنچنا بے حد ضروری تھا۔

اسے وہ دن یاد آ گیا تھا جب یہاں آنے کی خبر دی گئی تھی۔

وہ کتنا جھنجھلایا تھا بے تکی باتیں سنی تھیں آفس کولیگ کی اور پھر سامعہ نے ایک نئی کہانی سنا دی..... کم از کم یہ کہانی ہی تو تھی جس کا آج تک کوئی سرا ہاتھ نہیں آیا تھا۔

سامعہ کو پتا چلے گا تو مزید طعنے سننے پڑیں گے۔ چلو وہ طعنے تو پھر برداشت کر لوں مگر اس دل کا کیا کروں جو یہاں سے جانے پر راضی نہیں اس سے ملے بغیر.....

اس نے بے بسی سے گھنیرے بال اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیے۔ وہ اپنے کمرے کی بالکونی میں

کھڑا سوچوں کے تانے بانے بُن رہا تھا یہ ایک درمیانے درجے کا ہوٹل تھا جو پورے سال اپنی بہترین لوکیشن اور مناسب سہولیات کی وجہ سے آباد رہتا تھا۔ اس کے قریب ہی خاصا مصروف بازار تھا خزیمہ کو شاپنگ اور ونڈو شاپنگ ٹائپ کی تمام سرگرمیوں سے الجھن ہوتی تھی وہ صرف ایک بار شاپنگ کرنے گیا تھا سامعہ کی ناراضی سے بچنے کے لیے ورنہ تو اس کے باقی کولیگز اور اس ہوٹل کے دیگر رہائشی اپنی اکثر شامیں بازاروں میں مٹر گشت کرتے گزارتے تھے یہ ان کے نزدیک بہترین تفریح تھی اور اس کے نزدیک وقت کا ضیاع.....

لیکن اس وقت اس کے بے چین من کو کچھ نہیں سوجھ رہا تھا سوائے وقت کے ضیاع کے.....

بالکونی میں کھڑے ہو کر گہری شام کا نظارہ کرتے کرتے وہ تھک چکا تھا۔ صبح روانگی کے لیے تمام تیاریاں بھی مکمل تھیں رات کا کھانا ایک فائیو اسٹار میں یہاں کے دوستوں اور کولیگز کے ساتھ طے ہو چکا تھا اور اس وقت دو گھنٹے گزارنے اتنے مشکل بھی نہ تھے اگر خولہ سے ملنے کی بے چینی نہ ستا رہی ہوتی وہ یکدم پلٹا۔ اپنے حلیے پر ایک طائرانہ سی نگاہ ڈالی بلیو جینز اور ڈارک بلیو لائنوں والی شرٹ میں اس کا دراز قد اور صاف رنگت جو یہاں آ کر مزید نکھر گئی تھی مقابل کو بے اختیار اپنی جانب متوجہ کرتی تھی..... وہ اپنی ذات کے حوالے سے لاپرواہ سا نوجوان تھا کہ اسے کوئی مخصوص ہیئر کٹنگ پسند تھی نہ برانڈڈ ڈریسنگ کے جنون میں مبتلا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں، کشادہ پیشانی اور شفاف رنگت والا کتابی چہرہ ان سارے لوازمات کے بغیر بھی اپنے اعتماد اور ذہانت کی دھاک بٹھا دیتا تھا وہ دراصل اتنی آسانی سے نظر انداز ہونے والی شخصیت نہیں تھی اپنے اس یقین کے باوجود خولہ کے معاملے میں اس کا اعتماد متزلزل ہو جاتا تھا۔

اب پتا نہیں اس کا اپروچ کرنے کا طریقہ غلط تھا یا جس راستے پر وہ چل نکلا وہ درست نہ تھا۔

اس وقت وہ اپنے کمرے کو لاک کر کے سیڑھیاں اترتے ہوئے یہ ہی سوچ رہا تھا۔

پتا نہیں خولہ اس کے بارے میں کیا کچھ سوچتی ہوگی کوئی لچا لفنگا یا پھر بدقماش آدمی سمجھتی ہوگی لیکن

میں نے آج تک اس کے ساتھ کوئی اخلاق سے گری ہوئی حرکت نہیں کی اور نہ ہی میں کسی وقتی احساس سے مغلوب ہو کر یہ سب کر رہا ہوں۔ میری تلاش کسی پائیدار اور دائمی رفاقت کے لیے ہے اور میرا دل کہتا ہے وہ میرے لیے ہی بنی ہے۔

نادان دل اور ہوشیار دماغ کی کشمکش جاری تھی اور وہ تیز تیز قدموں سے بغیر کسی سمت کا تعین کیے چلا جا رہا تھا۔ اسلام آباد کی سڑکوں پر مٹر گشت کرنا قدرے آسان تھا شاید لوگ پیدل چلنا پسند نہیں کرتے تھے اپنی آرام طلبی کے باعث..... یا پھر ان کے اسٹیٹس پر فرق آتا تھا بہر حال اب تک یہ اس کا مشاہدہ تھا کہ یہاں گاڑیاں زیادہ اور لوگ کم ہیں وہ یہ ہی سوچتے ہوئے ایک قدرے مصروف سڑک کی طرف مڑ گیا تھا جس کے آخری سرے سے پر رونق اور اس شہر کی مہنگی دکانوں کی لمبی قطار کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ یہ بازار عموماً غیر ملکیوں کی وجہ سے پر ہجوم اور پر رونق نظر آتا تھا۔ مست ملنگ سے فارمرز مختصر سے لباس میں جب ان گلی کوچوں کو رونق بخشتے تھے تو مقامی دکانداروں سمیت شوقین حضرات کی بھی تفریح کا لطف دوبالا ہو جاتا تھا۔ شاید اسی حوالے سے خزیمہ کے کسی آفس کولیگ نے ریمارکس پاس کیے تھے جس پر وہ لاحول پڑھ کر رہ گیا تھا۔

اب اتنی بھی کیا دیوانگی..... انگریز ہوں یا جرمن یا پھر چینی..... کیا یہ لوگ کسی دوسرے سیارے کی مخلوق ہیں یا پھر ان کے نقش و نگار الگ ہیں جو تم لوگ ٹائم پاس کرنے جاتے ہو۔

اس وقت تو اس نے ان کو خوب سرزنش کی تھی اور اس وقت وہ خود اس ہجوم کا حصہ بننے جا رہا تھا رنگ اور روشنیوں کا لامتناہی سلسلہ تھا جو اس کی تھکن اور بے چینی پر حاوی ہو رہا تھا آج اسے پہلی بار سمجھ میں آیا تھا کہ لوگ شدید تھکن اور فرسٹریشن کے وقت شاپنگ کے لیے جانے کو کیوں ترجیح دیتے ہیں۔

وہ سروس روڈ عبور کر کے ایک بڑی سی موبائل شاپ میں داخل ہو گیا کم از کم ونڈو شاپنگ کے لیے لیڈیز ایریا سے بہتر یہ جگہ تھی فوری طور پر تو نہیں لیکن کچھ دنوں کے بعد وہ موبائل چینج کرنے کا ارادہ

ضرور رکھتا تھا اور سامعہ نے بھی دو دن پہلے فرمائشی نوٹ ایس ایم ایس کی صورت میں رجسٹرڈ کروا دیا تھا۔

''میری سالگرہ پر آپ مجھے موبائل گفٹ کر رہے ہیں کیمرہ اور ایف ایم ریڈیو کے ساتھ۔''

یہ درخواست نہیں اچھا خاصا حکم ہے..... بہن اگر لاڈلی ہو اور جان سے پیاری بھی تو پھر اس کی فرمائش ٹالنا ذرا مشکل امر ہوتا ہے مختلف برانڈز کے موبائل دیکھنا اور ان کی خصوصیات پر سیر حاصل معلومات کے لیے دوسرے کسٹمرز کے ریمارکس پر غور کرنا اس وقت کا خاصا مناسب مصرف تھا وہ سامعہ کے لیے ایک موبائل سیٹ کو حتمی انتخاب بنانے ہی والا تھا کہ اس کے کانوں میں نسوانی آواز گونجی۔

''مالا! میرے خیال میں یہاں پاپا کے مطلب کا کوئی موبائل نہیں ہے اور پھر تم نے لاسٹ ٹائم بھی انہیں موبائل ہی دیا تھا۔''

وہ جو کوئی بھی تھی اردگرد کے ماحول کی پرواہ کیے بغیر خاصی بلند آواز میں بول رہی تھی خزیمہ ان کے برابر میں ہی کاؤنٹر پر کھڑا تھا وہ دونوں بہت زیادہ قریب نہیں تھیں۔ تب بھی ان کے پاس سے آنے والی مسحور کن خوشبو اس ماحول کی خوشگواریت میں اضافے کے ساتھ اپنے قیمتی ہونے کا یقین بھی دلا رہی تھی اس کا دل چاہا بے اختیار ذرا سا گردن موڑ کر ان کا سرسری سا جائزہ لے لے مگر غیر اخلاقی حرکت کی وارننگ نے فوراً محتاط رہنے کا اشارہ دیا تھا۔ وہ ہرگز بھی بہت زیادہ سنجیدہ، زاہد خشک اور صنف نازک سے کترانے والا شخص نہیں تھا مگر راہ چلتی عورت کا احترام بالکل اسی اہتمام کے ساتھ کرتا تھا جس طرح اپنے گھر کی عورت کا.....

خولہ کمال اگر اپنی آواز اور باکمال گفتگو کے سحر میں گرفتار نہ کرتی تو وہ حلفیہ کہہ سکتا تھا کہ اس کی زندگی میں کوئی عورت نہیں اور نہ ہی وہ کبھی کسی عورت کے ظاہری خال و خد کو ہوس بھری نظروں سے دیکھنے کا قصوروار ٹھہرا تھا۔

''میرے خیال میں اس بار بابا کے لیے کوئی رسٹ واچ لے لیتی ہوں کیا خیال ہے خولہ۔''

ایک اور نسوانی آواز بھرپور انگریزی لب و لہجہ کے ساتھ گونجی۔

وہ بے اختیار پلٹا اس یقین کے ساتھ کہ وہ کسی اجنبی لڑکی کو دیکھنے کی خواہش نہیں کر رہا بلکہ یہ تو خولہ کمال اس کے سامنے کھڑی ہے.....اس کی اپنی خولہ.....اس کی نظروں نے ہر قسم کی احتیاط بالائے طاق رکھ کر اپنے برابر میں کھڑی لڑکیوں کا جائزہ لیا۔

دونوں ہی فارز تھیں.....دونوں کے چہرے حسن و دلکشی کا لاجواب پیکر تھے دونوں کا لباس مشرق اور مغرب کا حسین امتزاج تھا لیکن ستم یہ کہ دونوں کے چہرے ایک دوسرے کا عکس.....لیکن ایک چہرہ تو وہی تھا.....اسٹوڈیو کے استقبالیہ والا اس جادل چاہا فوراً پوچھ لے کس نے خولہ کا نام لیا اور کون خولہ ہے.....؟

وہ دونوں رسٹ واچ لینے کا فیصلہ کر کے کاؤنٹر سے پیچھے ہٹ گئی تھیں خزیمہ ابھی تک اسی تذبذب میں تھا کہ مخاطب کرے یا نہ کرے.....کیا دنیا میں ایک ہی خولہ ہے.....ہوسکتا ہے یہ کوئی اور ہو.....لیکن اسٹوڈیو میں تو.....دماغ بھی توجیت کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا اس نے دیکھا وہ دونوں کسی بات پر بڑی دلکش ہنسی کا جلوہ دکھاتے ہوئے دروازے سے باہر نکل رہی تھیں۔

اس نے سیلز مین سے ایکس کیوز کیا اور انہیں نگاہ کے حصار میں لیتے ہوئے پیچھے لپکا۔

دل نے حوصلہ بڑھاتے ہوئے یہ بھی یقین دلایا تھا کہ اگر یہ وقت ہاتھ سے پھسل گیا تو پھر تم صبر و شکر کا کلمہ پڑھنا اور ایف ایم کی دنیا کو قصہ پارینہ سمجھ لینا۔

نہیں ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ میں خولہ کمال سے نہ تو دل لگی کر رہا ہوں نہ ہی مجھے ایک ان دیکھی لڑکی سے تفریح سوجھ رہی ہے۔

اس نے دل و دماغ کے جھگڑے پر دونوں کو باز رہنے کی تلقین کی اور اپنے اعتماد کو مضبوط کرتے ہوئے قدموں کی رفتار تیز کر دی وہ دونوں دائیں سائیڈ مڑ گئی تھیں صد شکر کہ یہاں رش بھی نہیں تھا شاید وہ کسی اعلیٰ برانڈ کی گھڑی کی تلاش میں تھیں چھوٹی سی کرتیاں اسٹریٹ ٹراؤزر اور گلے میں مفلر ٹائپ دوپٹے کے ساتھ ان کے مغربی خال و خد سنہرے بال اور نیلی پرکشش آنکھیں دلکشینکا عجیب سا امتزاج

پیش کر رہی تھیں دونوں کے ہاتھوں میں جڑاؤ کنگن اپنی چمک اور
نگینوں سے پھوٹنے والی روشنیوں کے باعث کلائی کی زینت میں اضافے کے ساتھ اپنی قدر و قیمت کا بھی بخوبی احساس دلا رہے تھے ان کے بال جس سنہری دھات کے کلپ میں جکڑے ہوئے تھے ذرا سا غور کرنے پر وہ بھی اپنی قیمت کا احساس دلا رہا تھا۔

وہ ان کے اب بہت نزدیک آ گیا تھا اور اس نے پھر سنا تھا۔

''خولہ! نانو کے لیے کچھ اور بھی لینا ہے اور پھر ان کے بیٹے کے لیے بھی۔''

''بیٹا کون؟''

وہ اس آواز کا رسیا تھا اس کی سماعتوں میں جلترنگ سے بج رہے تھے۔

''ارے بابا وہی عاشر عباس۔'' ان کی ساری گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی مگر وہ لہجے کی خوشبو آواز کی جادوگری سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔

''ایکسکیوزمی۔'' اب خود کو روکنا بے معنی تھا وہ چند قدم چل کر ان کے سامنے آ گیا تھا اس کے لبوں پر مسکراہٹ نہیں تھی بلکہ سنجیدہ چہرہ اس بات کا غماز تھا کہ وہ کوئی بہت اہم بات کرنے جا رہا ہے۔

''یس.....'' اسے خولہ نے مخاطب نہیں کیا تھا۔ خزیمہ نے اپنی نظروں کا زاویہ بدلا اور بلا جھجک پوچھ بیٹھا۔

''کیا آپ خولہ کمال ہیں.....ایف ایم۔''

خولہ اب تک ادھر ادھر دیکھ رہی تھی دانستہ اسے نظر انداز کر رہی تھی کیونکہ اسے پہچاننا مشکل تو نہیں تھا ابھی کل ہی تو وہ اپنے مہذب لہجے کے ساتھ خولہ سے ملنے کی درخواست کر رہا تھا اور آج پھر وہ سامنے کھڑا پوچھ رہا تھا۔

قسمت کچھ زیادہ ہی اس شخص پر مہربان ہے۔ اور اب اگر یہ سارا کھیل قسمت کا تھا۔ اس آنکھ

مچولی میں جیت خزیمہ عادل کے حصے میں لکھی گئی تھی تو وہ دونوں بھی کچھ نہیں کر سکتی تھیں دونوں کا تعلق جس فیلڈ سے تھا وہاں اس طرح کا تعارف حاصل کرنا کوئی اچھوتی بات نہیں تھی خولہ اس وقت بھی کشمالہ کے ساتھ کا فائدہ اٹھانا چاہتی تھی مگر مالا کو سامنے کھڑے خزیمہ عادل کے ساتھ بھرپور ہمدردی محسوس ہوئی۔

''میں کشمالہ ہوں اور یہ خولہ اور آپ.....'' بالکل پروفیشنل انداز خزیمہ کو لگا وہ کسی انٹرویو کا امیدوار ہے۔

''میں خزیمہ عادل کیا ہم لوگ کہیں بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں کافی، ڈرنک کچھ بھی۔''

اس کا مخاطب کشمالہ تھی لیکن چہرے اور آنکھوں سے عیاں ہونے والے مسرت کے رنگ دونوں کو بخوبی نظر آ رہے تھے۔

''پلیز آپ دونوں انکار نہیں کریں گی۔'' شائستہ سے انداز میں کی جانے والی درخواست کو رد کرنا کم از کم کشمالہ کے نزدیک تو ایٹی کیٹس کے خلاف تھا۔ جبکہ خولہ کے چہرے پر فطری سی الجھن اس بات کی غماز تھی کہ خزیمہ عادل اس کا عام سا فین نہیں ہے اور اس لمحے وہ جس طرح دونوں کا رستہ روکے کھڑا ہے اسے نظر انداز کرنا بھی آسان نہیں۔

''پھر کبھی سہی ابھی ہم دونوں جلدی میں ہیں۔'' پہلی بار خولہ نے براہ راست اسے مخاطب کیا تھا۔ آنکھوں میں الجھن اور بے نیازی کے تاثرات کے ساتھ۔

میں کہاں کہاں نہ پہنچا تیری دید کی لگن میں

اس کے خوشی سے چمکتے خوبرو چہرے پر صرف یہ ہی صدا تھی اپنی آواز اور سوچ سے اس کی پر سکون دنیا میں ہلچل مچانے والی یہ حسینہ معمولی لڑکی تو تھی نہیں جو اتنی آسانی سے اپنا ساتھ اور قربت کے قیمتی لمحے دینے پر آمادہ ہو جاتی اسے پتا تھا وہی سمندر سے موتی چننے کے عمل سے گزر رہا ہے جو بمشکل ہاتھ آئے گا۔ پھر پھسل جائے گا۔

''لیکن مجھے ابھی آپ سے بہت ساری باتیں کرنا ہیں میں کب سے آپ کی تلاش میں ہوں اور آپ یہ بات بہت اچھی طرح سے جانتی ہیں۔ میری تلاش لا حاصل نہیں ہے۔''

سڑک کے کنارے ایک بڑی سی گفٹ شاپ کے سامنے آتے جاتے لوگوں کی سوالیہ نظروں کو نظر انداز کرتے۔ انہیں رستہ دیتے یہ تینوں عجیب سی الجھن میں گھر گئے تھے۔ خزیمہ کو تو یقین تھا کہ وہ اپنی منزل کے سامنے کھڑا ہے اور خولہ.....

وہ ہمیشہ ان دیکھی انجانی راہوں کے سفر سے خوفزدہ رہی تھی سو اس وقت بھی اس کے چہرے کے تاثرات میں محض بے نیازی گھلی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر پہچان کا ہلکا سا عکس تھا جو کسی بھی سے معدوم ہو سکتا تھا خزیمہ کا بس نہیں چل رہا تھا وہ اس بھاگتے وقت کی ساری لگامیں کھینچ ڈالے۔

''کشمالہ جی مجھے بالکل اچھا نہیں لگ رہا یہاں اس طرح کھڑے ہونا لیکن میں یہاں میگنٹ ہو گیا ہوں کوشش کے باوجود نہ آگے جا سکتا ہوں نہ پیچھے آپ دونوں کے بغیر.....''

وہ کندھے اچکا کر اتنے مزے سے بولا تھا کہ کشمالہ کے چہرے پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی تھی اس نے خولہ کا ہاتھ تھاما.....

''چلیں مگر زیادہ دیر نہیں.....'' خولہ کے انکار کے باوجود کشمالہ کو خزیمہ عادل کا دل توڑنا اچھا نہیں لگا ویسے بھی بہت دنوں سے وہ اس شخص کے قصے سن رہی تھی اس کی ای میلز فون کالز سارا کچھ ہی خولہ اس سے شیئر کرتی تھی اب وہ آنکھوں میں زمانے بھر کی سرشاری لیے سامنے کھڑا تھا تو کیسے ممکن تھا کشمالہ کو اس کی بے چینی پر ترس نہ آتا۔

☆.....☆.....☆

ہم نے دل لگایا تھا بارشوں کے موسم میں
اک دیا جلایا تھا بارشوں کے موسم میں
کس قدر نادان ہم کاغذ کے پھولوں سے
اپنا گھر سجایا تھا بارشوں کے موسم میں

پہلے زندگی کی خوشیوں پر بے صبری اور ناشکرے پن کی کہر چھا گئی تھی پھر بے حسی کے بادل گرجتے رہے، برستے رہے اور آج بے اعتنائی بے وفائی اور بے راہ روی کی موسلا دھار بارش اس تواتر سے ہو رہی تھی کہ اس کا پورا وجود جل تھل ہو گیا تھا۔

اندر آگ اور باہر برسات..... عجیب طرح کے دوراہے پر کھڑی تھی ان کی روشن اور اجلی شخصیت.....

ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ اپنے کمرے کی گلاس ونڈو کے سامنے کھڑے بارش کی ننھی بوندوں کا نظارہ کر رہے تھے تب بے رحم وقت نے انہیں وہ منظر بھی دکھایا جو ان کی مضبوط ذات کو ریزہ ریزہ کر گیا تھا۔

شمائلہ اپنے سجے سنورے خوشبو بھرے سراپے کے ساتھ منیر کمال کی گاڑی سے اتری تھی اور بارش کے ننھے قطرے اس کے بالوں ہر ٹک گئے تھے تب ہی منیر کمال نے بڑی نزاکت اور نفاست سے ان قطروں کو اپنی انگلیوں کی پوروں پر سمیٹ لیا تھا بالکل اس طرح جیسے کبھی طارق محمود اس کے گالوں پر آئے آنسوؤں کو نرمی سے اپنی انگلیوں میں جذب کر لیا کرتے تھے۔

شمائلہ اپنی خاص نگاہ سے منیر کمال کو نوازا اور وہ کورنش بجا لایا راجہ طارق محمود اندازہ کر سکتے تھے کہ اس لمحے دونوں کے چہروں پر کون سی داستان رقم ہے۔

بہت گرمجوشی کے ساتھ منیر کمال نے اس کا نرم و نازک ہاتھ تھاما تھا جسے شمائلہ نے بڑی ادا کے ساتھ کھینچ لیا تھا اور وہ ہنستی ہوئی روش عبور کر کے اندر آ گئی تھی۔

ایک قیامت تھی جو راجہ طارق محمود کے سر سے گزر گئی تھی۔

صرف دو ہفتے ہی تو ہوئے تھے انہیں یہاں سے گئے اور وہاں جا کر بھی وہ اپنے گھر سے غافل بے نیاز رہنے والے مردوں میں سے نہیں تھے۔ روزانہ صبح و شام فون پر بات ہوتی تھی اس کی ذہنی اور جذباتی تشفی کا ہر ممکن اہتمام بھی کرتے۔ دوری میں اپنی بے چینی کا احساس دلاتے اور توقع کرتے کہ وہاں سے ایسا ہی جواب آئے مگر شمائلہ دو چار باتیں کرنے کے بعد یوں ظاہر کرنے لگتی جیسے بہت تھکی ہوئی ہو..... یا پھر بہت سارے کام نبٹانے ہوں اور وہ اپنی سادگی میں یہ جان ہی نہ پائے کہ وہ تو دراصل گریز برت رہی تھی رستہ بدلنے کا جواز ڈھونڈ رہی تھی ان سے دور جانے کی راہ ہموار کر رہی تھی۔

وہ اپنے چہرے پر سرشاری کے ان گنت رنگ لے کر کمرے میں داخل ہوئی تھی طارق محمود کھڑکی کے سامنے کھڑے تھے اس لیے فوراً نگاہ نہیں پڑی تھی اس لیے کوئی ہندی فلمی گانا گنگناتے ہوئے وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آ گئی تھی تب ہی ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اس نے خود کو دیکھنے کے بجائے راجہ طارق محمود کی پشت دیکھی گھر کے آرام دہ لباس میں وہ گلاس، ونڈو کے سامنے کھڑے تھے۔ یہ گلاس ونڈو پارکنگ اور پھر روش کا نظارہ اچھی طرح سے کراتی تھی اس کے مسکراتے لب یکدم سے سناٹے میں آ گئے وہ برق رفتاری سے پلٹی۔

طارق آپ کب آئے آپ تو شاید دو دن بعد آنے والے تھے نا۔

اس نے حسب عادت پیچھے سے اپنی بانہیں ان کے گرد حمائل کرتے ہوئے مصنوعی خوشی کا اظہار کیا۔

راجہ طارق محمود نے بہت نرمی سے اس کا وجود خود سے الگ کیا۔ خوشبوؤں میں بسا ہوا یہ نازک اندام وجود اس لمحے انہیں بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح محسوس ہوا تھا۔ اندر بھی آگ اور اب باہر بھی آگ.....

ان کا بس نہیں چل رہا تھا وہ اس ہستی اور گرہستی کو لمحوں میں خاک کر دیں مگر بعض خواہشیں بھی تو خاک ہوتی ہیں۔

وہ شمائلہ طارق محمود کو بھسم کر سکتے تھے اگر وہ ان کے جسم و جاں میں زندگی کی طرح نہ دوڑ رہی ہوتی.....

اس کے چہرے کا رنگ وروپ شگفتہ رکھنے کے لیے انہوں نے اپنی آرزوؤں کو نہ مارا ہوتا۔
خود کو تمام عمر شمائلہ طارق محمود کے نام نہ کیا ہوتا۔ وہ بہت کچھ کر سکتے تھے..... کرنا چاہتے تھے.....
مگر ہار گئے.....
قسمت سے..... محبت سے..... اس انمول چاہت سے..... جو ان کی خوش نما آنکھوں کا اولین خواب تھی۔

انہوں نے وحشت بھری نگاہ اس کے بھرپور سراپے پر ڈالی۔
سرخ رنگ کی کامدار تنگ کرتی گہرا گلہ اور سیاہ رنگ کے موتیوں کے حصار میں سرخ وسفید گردن اس پر ستم یہ وہ تنگ پاجامے میں دوپٹے سے بے نیاز نظر آ رہی تھی۔ وہ بلا کے متناسب جسم اور دلکش خدوخال کی مالک تھی چہرہ تو چہرہ اس کے جسم پر بھی نگاہیں ٹھہر جاتی تھیں۔ راجہ طارق محمود کے لیے اس سے بڑا صدمہ اور کیا ہو سکتا تھا کہ آج اس کے دلکش سراپے پر کسی غیر کی بے خود نگاہوں کا پہرہ تھا۔
وہ ہمیشہ سے خود کو بنا سنوار کر رکھتی تھی لیکن اس کا بننا سنورنا طارق محمود کو اس لیے اچھا لگتا تھا کہ وہ ان کی نگاہوں کو سیراب کرتا تھا لیکن آج وہ کسی کی اجنبی نگاہوں میں تشنگی کا باعث بنی تھی ان کا بس نہیں چل رہا تھا اپنی آنکھوں کی بینائی چھین لیں۔
''میں نے آپ کو منع کیا تھا شمائلہ کہ آپ اکیڈمی جوائن نہیں کریں گی آپ جو کام کرنے جا رہی ہیں یہ شریفوں کا وطیرہ نہیں پھر بھی آپ نے وہی کیا.....'' نگاہوں کی وحشت اور لہجے کی تھکن سے شمائلہ کے اعتماد پر کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔
طارق آپ کس زمانے کی بات کر رہے ہیں مجھے آپ سے تو اس رویے کی امید نہیں تھی یہ تو ایک healthy activity ہے لوگ تو پتا نہیں کیا، کیا ہابیز کے طور پر ایڈاپٹ کرتے ہیں..... میں تو صرف پرفارمنگ آرٹ میں انٹر ہو رہی ہوں۔ وہ بلا تکان بولتی چلی گئی تھی اور راجہ طارق محمود آنکھوں میں حیرت

کے ساتھ تاسف کے تاثرات لیے اسے یوں دیکھ رہے تھے جیسے وہ پہلی بار ان سے مل رہی ہو جیسے کوئی اجنبی عورت ان کے سامنے بیٹھی ہو چست قمیض اس کے جسم کے ہر نشیب و فراز کو نمایاں کر رہی تھی اور اسی حلیے میں وہ منیر کمال سے رقص کے اسرار و رموز سیکھ رہی تھی کیا وہ اس کی دلکشی سے گھائل ہوئے بغیر رہ سکتا تھا؟

''نہیں..... قطعی نہیں.....'' وہ بے اختیار چیخے تھے اور اس چیخ میں غصے سے زیادہ وحشت اور بے بسی نمایاں تھی۔

''شمائلہ تمہیں کیا ہو گیا ہے تم کس راستے پر چل نکلی ہو اور یہ کس مشغلے کی بات کر رہی ہو..... میں نے تمہیں کبھی نہیں روکا۔ تم نے ہر وہ کام کیا جو میرے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا تھا لیکن مجھے تمہاری خوشی ہمیشہ اپنی ذات سے زیادہ عزیز رہی تمہیں یاد ہے نا عاشر سال بھر کا نہیں تھا تم لندن چلی گئی تھیں شاید کسی گرومنگ کورس کے سلسلے..... حالانکہ وہ کوئی اتنا اہم کام نہیں تھا لیکن چونکہ تمہاری ساری فرینڈز جا رہی تھیں اور عاشر کی وجہ سے تم بھی ایگزاسٹ ہو چکی تھی تمہارے شوق کی راہ میں تمہاری مامتا بھی نہیں آئی تھی تو میں کیا کہتا۔ یاد ہے نا شمائلہ.....''

وہ جیسے شدید گھٹن میں بول رہے تھے آج ان کا بس نہیں چل رہا تھا..... ساری مردانگی کنارے پر رکھ کر دھاڑیں مار مار کے روئیں..... یہ تو وہ شمائلہ نہیں تھی جو ان کی اولین چاہت..... اور محبوب نظر تھی جس کی کوئی خامی انہیں کبھی محسوس نہیں ہوئی وہ تو شادی سے پہلے بھی ایسی ہی تھی کسی حد تک خود غرض..... اپنی ذات سے محبت کرنے والی اپنی خواہشوں کی پرستار.....

اس وقت انہیں محسوس ہوتا تھا کہ اس جیسی حسین اور منفرد عورت اگر یہ سب نہ کرے تو دوسروں سے ممتاز کیسے نظر آئے لیکن دوسروں سے منفرد نظر آنے کا جذبہ آج اسے گہری دلدل تک لے آیا تھا اور وہ بضد تھی کہ یہ پھولوں بھرا راستہ ہے۔

ان کی آنکھیں جھلسنے لگی تھیں۔

''پلیز شمائلہ..... ڈونٹ ڈو دس..... بابا اماں جی کیا سوچیں گے۔ انہیں مت دکھ دو تم جانتی ہو بابا کا مقام وہ آج جہاں بیٹھ جاتے ہیں لوگ ان کے علم سے سیراب ہونے کے لیے گھیرا ڈال لیتے ہیں تم جانتی ہو انہوں نے ہمیشہ سر اٹھا کر زندگی گزاری۔ آج بھی ان کے لفظوں کی حرارت فیصلوں کا رخ بدل دیتی ہے اور تم وہ کرنے جا رہی ہو جو ان کی عزت پر داغ لگائے گا۔''

''طارق..... یہ میری بھی تو زندگی ہے۔ کیا میرا شوق میری خواہش کوئی حیثیت نہیں رکھتی ہم ہمیشہ دوسروں کی خاطر جینے اور مرنے کی بات کرتے ہیں کیا اپنی ذات کا کوئی حق نہیں یہ تو میری ذات کا کتھارسس ہے اور میں کوئی غلط کام نہیں کر رہی ہوں جو وہ شرمندہ ہوں گے۔ وہ جانتے ہیں ان کی بیٹی اپنے اسٹیٹس کے خلاف جا کر کوئی کام نہیں کر سکتی۔'' وہ اپنی بات پر قائم تھی اس کے چہرے پر نہ تو کوئی ندامت تھی اور نہ ہی تھوڑی دیر پہلے منیر کمال کے ساتھ ربط و قربت کے تاثرات کا کوئی عکس موجود تھا۔

راجہ طارق محمود ساکت نگاہوں کے ساتھ اسے دیکھنے لگے وہ جھوٹ بول رہی تھی اس کی آنکھیں اپنے ہر فعل پر سرشار تھیں اور ستم یہ کہ وہ سچ سے گریزاں تھی ان کا بس نہیں چل رہا تھا۔

جاہل مردوں کی طرح تھپڑوں سے اس کا شاداب چہرہ مزید سرخ کر دیں۔ اس کے بالوں کو جن غیر ہاتھوں نے چھوا انہیں کاٹ ڈالیں۔ مگر وہ کچھ بھی نہیں کر سکے۔

صبر و ضبط کے جانے کتنے دریا انہوں نے عبور کیے جب عاشر کا معصوم سوالیہ چہرہ نگاہوں کے سامنے آ گیا۔

وہ خوفزدہ نظروں سے دروازے میں کھڑا تھا۔

اور ماں باپ دونوں سے پوچھ رہا تھا۔

''میرا کیا قصور ہے۔''

''میں کیوں اس گھر میں پیدا ہو گیا جہاں میرے ماں باپ ایک دوسرے کی ذات پر الزامات

سے باز نہیں آتے۔"

"جہاں میرے ماں باپ اپنی انا کی سربلندی کے لیے میری ذات کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں۔ میں کیوں آیا دنیا میں۔" اس کی آنکھیں ان گنت سوالوں کی آماجگاہ بنی ہوئی تھیں۔ اس کے معصوم نقوش کبھی ماں تو کبھی باپ کا عکس اپنے اندر سمو کر بس یہ ہی فریاد کرتے نظر آ رہے تھے۔

"ماما پلیز! بابا سے نہیں لڑو نا میں آپ کو تنگ نہیں کروں گا بہت پیار کروں گا آپ کو..... پلیز....."

وہ اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر اپنی بے چینی کا اظہار کر رہا تھا۔ ننھے ننھے ہاتھوں سے اس کے چہرے کو چھو رہا تھا۔ کبھی گردن میں منہ چھپا لیتا اور کبھی اس کی نرم آغوش میں چھپنے کی کوشش کرتا۔ مگر قدرت کے کارخانے میں پورے اہتمام سے تخلیق ہونے والی یہ ماں حیرت انگیز طور پر عورت ہونے کی ہر خوبی سے مالا مال اور ماں ہونے کے ہر وصف سے جانے کیوں محروم رہ گئی تھی۔ اس کے انداز میں ممتا کی حرارت اور بے ساختگی مفقود تھی۔ عاشر چند لمحے تک اپنی تشنگی مٹاتا رہا پھر مایوس ہو کر اس کی گود سے اتر کر سامنے رکھے فلور کشن پر ٹک گیا۔

یہ اس کی ناراضی کا اظہار تھا ماں سے بھی اور باپ سے بھی..... راجہ طارق محمود نے ایک گہری سانس لی اور بے جان قدموں کے ساتھ چلتے ہوئے عاشر عباس کے پاس آ گئے اس کے سامنے دوسرا فلور کشن رکھا۔

"کیا بابا یہاں بیٹھ جائیں سرکار....." لہجہ حتی المقدور خوشگوار بنانے کی کوشش کی۔

وہ گلابی چہرہ بدستور خفگی کی لپیٹ میں تھا البتہ گھنیری پلکوں میں چھپی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں قدرے رعایت کا اظہار کرنے کے لیے باپ سے ہم کلام ہونے لگی تھیں۔

"بابا آپ بزنس ٹور پر مت جایا کریں۔ آپ کا عاشر بہت مس کرتا ہے آپ کو....." وہ اپنے مخصوص لب و لہجے کے ساتھ بے ساختہ بولا تو راجہ طارق محمود نے تڑپ کر اسے اپنے اندر سمیٹ لیا۔ وہ

ان کے تپے سلگتے جسم و جاں کے لیے موسم سرما کی اس چمکتی ٹھنڈی برف کی طرح تھا جو خزاں آلود موسموں میں جلتی بلتی دھرتی کی ساری تپش اپنے اندر جذب کر لیتی تھی جو بے ثمر خشک کھڑے درختوں کو نئی رتوں کی نوید دیتی تھی۔

ایک لمحے کے لیے ان کے اندر بھی نئی رتوں کی نوید نے دستک دی تھی انہیں لگا تھا جو خزاں آلود لمحہ ان کی نگاہوں سے گزرا وہ شاید ان کی نگاہوں کا واہمہ ہو۔ وہ اور شمائلہ اچھے دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے الگ ہوئے ہوں۔

لیکن.....وہ دلربا سی نظر.....

وہ دلکش سے انداز میں اس نظر کی پذیرائی.....

انہوں نے عاشر کو بے ساختہ اپنی مضبوط بانہوں میں بھینچ کر آنکھیں پوری طاقت کے ساتھ بند کر لی تھیں وہ کچھ بھی نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ گھنگھروں کی تال پر اپنی عورت کا رقص نہیں دیکھنا چاہتے تھے ۔شمائلہ اس گھر کا چراغ تھی وہ اسے بجھتا دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔

انہیں پتا نہیں چلا کب ان کی سرخ ڈورے والی آنکھوں سے گرم سیال بہہ نکلا اور عاشر عباس کے نرم و ملائم بالوں میں جب ہونے لگا۔

انہیں یاد رہا تھا تو اتنا کہ شمائلہ اس لمحے اپنی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر کسی مساج کریم سے چہرے کا میک اپ اتارنے لگی تھی۔ لیکن کیا اس قیمتی کریم سے وہ نقاب بھی اتر سکتا تھا جو خود غرضی اور ہوس کی صورت اس کے دل و دماغ پر چڑھ گیا تھا۔ شاید اس کا جواب کسی کے پاس بھی نہیں۔

ہاں مگر..... وقت بہت ظالم ہے..... آئینہ دکھانے میں دیر نہیں کرتا..... اسے عادت ہے پہلے تماشا بنانے کی۔

اور پھر تماشا دکھانے کی..... وقت کے انصاف سے کوئی نہیں محفوظ رہتا اگر وقت بھی اپنی سرشت

بھول جائے، انصاف سے باز آجائے تو دنیا میں اچھائی اور برائی کا پیمانہ شاید کسی کے پاس بھی نہ رہے۔

میرے سینے میں صحرا ہے سلگتا
میری آنکھوں میں ساون کی جھڑی ہے

اس دن جو ساون ٹوٹ کر برسا تھا وہ بعد میں راجہ طارق محمود کی آنکھوں سے پیار کرنے لگا تھا..... وہ ساون آشنا آنکھیں..... دل میں اتر جاتی تھیں..... یہ احساس دلائے بغیر کے انہیں برسنے کے لیے ساون رت کا انتظار نہیں کرنا پڑتا۔

☆.....☆.....☆

وہ دونوں راجہ طارق محمود کے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھی ہوئی تھیں نانو کے چہرے پر حسب عادت بڑی شفیق سی مسکراہٹ تھی اور خدیجہ بھی کچن کی اوٹ سے اپنا پسندیدہ نظارہ دیکھنے میں مگن تھی۔ اسے ہر حال میں ان دونوں کو دیکھنا تھا آج تو پھر وہ اپنے پاپا کے ہمراہ بہت مسرور نظر آرہی تھیں۔

''ڈھیر ساری شاپنگ میں پاپا کے علاوہ نانو اور خدیجہ کا بھی حصہ ہے۔'' خولہ نے آتے ہی اعلان کیا تھا۔

''لیکن خدیجہ کو تحفہ اسی صورت میں ملے گا جب وہ بیسن کا حلوہ فٹافٹ بنائے گی۔'' نانو نے اسے ایک دفعہ بیسن اور پھر بادام کا حلوہ بنا کر کھلا دیا تھا۔ وہ میٹھی چیزیں بی رغبت سے کھاتی تھی شاید اسی لیے کشمالہ کے مقابلے میں اس کا جسم قدر فربہی مائل تھا جبکہ کشمالہ اپنی نازک طبع کے باعث ہر چیز کو کھانے کا رسک نہیں لیتی تھی۔

شاید کچھ ایسی ہی عادتیں تھیں جو دونوں کو یک دوسرے سے الگ کرتی تھیں۔

راجہ طارق محمود دونوں کی زبانی گئے دنوں کی روداد بڑے انہماک سے سن رہے تھے۔

''میری بیٹیاں بور تو نہیں ہوئیں پریشان تو نہیں کیا یہاں کے لوگوں نے۔'' ان کا اشارہ خدیجہ کی

طرف تھا جو فلور ٹیبل پر چائے کے لوازمات ترتیب دے رہی تھی وقت بے وقت چائے راجہ طارق محمود کا شوق تھا جس پر کشمالہ کو بہت تشویش ہوتی تھی۔

''پاپا! ہمیں افسوس ہے ہم لوگ یہاں پہلے کیوں نہیں آئے وہ جو منیر نیازی نے کہا ہے نا ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں اگر مزید دیر ہو جاتی تو میں بھی ایک آدھ نظم لکھ ہی لیتی۔'' خولہ نے مزے سے کہا تو ان کیوجیہہ چہرے پر دلکش سی مسکراہٹ پھیل گئی مگر آنکھیں سرشاری کے ان لمحوں میں بھی مسرتوں کے جگنوؤں سے آشنا نہیں ہوئی تھیں۔ کشمالہ نے ایک گہری سانس لے کر توجہ کا ارتکاز نانو کی طرف مبذول کر لیا جو عاشر کے نہ آنے کا شکوہ کر رہی تھیں۔

''بیٹے..... میری آنکھوں کی ٹھنڈک کو بھی لے آتے۔''

''آپ کی آنکھوں کی ضدی ٹھنڈک میرے ہاتھ تو آئے.....'' وہ ہنس پڑے ساون آشنا آنکھوں کے ساتھ۔

''میں نے تجھے کہا تھا اتنی آسانی سے نہیں مانے گا، مدتوں کا گلہ ہے جو کسی آسیب کی طرح اس کی خوشیوں سے لپٹا ہوا ہے۔ ماں باپ کے ہوتے ہوئے دونوں کی محبت سے محروم ایسا بچہ کیسے معاف کر دے تمہاری خطا..... اپنی ماں کی خطا.....''

کشمالہ پوری دلچسپی کے ساتھ عاشر نامہ سن رہی تھی۔ آخری بات پر اس نے کن اکھیوں سے ان کا چہرہ دیکھا..... جو زمانے بھر کی تھکن لمحوں میں سمیٹ لایا تھا اپنے خوبصورت نقوش میں.....

دو دن پہلے صاحبزادے آئے تھے میرے پاس تھوڑی دیر کے لیے..... اس کے ساتھ کوئی دوست بھی تھا ڈاکومنٹری پروڈیوسر۔ اس کو ہیلپ چاہیے تھی وہ کافی دیر میرے سامنے بیٹھا رہا خاموش تصویر کی طرح شاید اس کا دل ہی نہیں چاہتا وہ بھی کبھی اپنے باپ کو مخاطب کرے اس کا درد سمیٹے.....''

انہوں نے نانو سے کسی معصوم بچے کی طرح شکوہ کیا۔

''وقت سارے دکھ بھلا دیتا ہے..... وہ بے حس نہیں ناراض ہے شاکی ہے اس کے دامن میں کوئی یاد نہیں وہ بہت تہی دامن ہے وہ لڑے گا بہت دنوں تک..... لیکن تم نے ہارنا ہے بار بار..... پھر ایک دن وہ ہار گیا تو تم جیت جاؤ گے ہمیشہ کے لیے..... ابھی اسے تنگ مت کرو۔''

''میں کب تنگ کرتا ہوں..... مجھے تو خود یہ تنگی رہتی ہے کے اپنے گھر کا سکھ چین چھوڑ کر سرکاری رہائش گاہ میں پڑا ہے نہ کھانا وقت پر اور نہ سکون سے سونا نصیب ہوتا ہے۔

میں نے وہ محل اپنے لیے تو نہیں بنایا آپ جانتی ہیں اچھی طرح وہ گھر میں نے عاشر کے مزاج اور عادت کو سامنے رکھ کر بنوایا ہے اس کی ہر چیز پر عاشر کی پسند کا رنگ حاوی ہے پھر بھی وہ میرا امتحان لینے پر تلا ہے بڑی مشکل سے ایک بار سینے سے لگا تھا۔ اب کبھی ہاتھ بھی ملا لے تو بڑی بات ہے۔ وہ عاشر کو یاد کر کے خاصے مغموم سے ہو گئے تھے۔ خولہ نے ماحول کی سنجیدگی کم کرنے کے لیے خدیجہ کو آواز دی تھی کوئی نئی فرمائش کرنے کے لیے جبکہ کشمالہ کا سارا دھیان توجہ کا ہر پل صرف عاشر عباس پر مرکوز تھا۔

وہ ڈسٹرب پیرنٹس کا ان وانٹڈ چائلڈ۔ پتا نہیں عمر کے اس موڑ پر کس طرح کے ڈپریشن میں مبتلا تھا۔

وہ خاموشی میں محض نگاہوں سے کلام کرنے پر یوں دل و نگاہ کا مرکز بن گیا تھا اگر کبھی اس کے دل تک رسائی ہو گئی تو جانے کتنی آزمائشوں سے گزرنا پڑے گا۔ وہ سوچے جا رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

کاشف کیانی نے انے پروجیکٹ کی تکمیل کے لیے کشمیر کے جس پہاڑی علاقے کا انتخاب کیا تھا وہاں بارش بن بلائے مہمان کی طرح تھی وہ بڑے اہتمام کے ساتھ ہلکی ہلکی دھوپ کی مناسبت سے ٹی شرٹ اور ڈھیلا سا ٹراؤزر زیب تن کر کے کندھے پر کیمرہ لٹکائے ''شکار'' کی تلاش میں نکلتا تھا مگر ہر بار اس کا اہتمام اس کی پلاننگ دھری کی دھری رہ جاتی تھی۔

پہلے تو سورج بادشاہ کی آنکھ مچولی شروع ہوتی پھر بادلوں کی سلطنت میں جوش آتا خوب گرج

چمک کر اپنے ہونے کا احساس دلایا جاتا اس یقین کے ساتھ کہ اس بار وہ نہ برسے تو کوئی بڑا واقعہ رونما ہو جائے گا لیکن یہاں کا بڑا واقعہ کاشف کے لیے وقت بے وقت کی بارش تھی جو اس کے کام میں خلل ڈال کر خوب لطف اندوز ہوتی لیکن مایوس اور بددل وہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ جیسے ہی کہر چھانے لگتا بادلوں کی گھن گرج شروع ہوتی.....، لوگ مویشیوں کو چراہ گاہوں سے سمیٹ کر لے جاتے اور ان کے ٹھکانوں پر باندھ دیتے چھوٹی چھوٹی شفاف پانی کی ندیاں گدلے پانیوں سے بھر جاتیں تو لڑکیاں بالیاں بھی ان کی طرف رخ نہیں کرتی تھیں۔ بارش کا یہ گدلا پانی نہ تو کپڑے دھونے کے کام آتا تھا نہ ہی گھر کے استعمال کے لیے حتی کہ ان پہاڑی جانوروں کے نخرے بھی اس قدر تھے وہ بھی اس مٹیالے پانی کو پینے کی تکلیف نہیں کرتے تھے۔ کاشف کے لیے اس طرز زندگی کا مشاہدہ خصوصی دلچسپی کا محور تھا وہ زندگی کی سچی اور حقیقی تصویر اپنے کیمرے کی آنکھ میں مقید کرنا چاہتا تھا۔ جس کے لیے یہ رستہ دشوار تو تھا لیکن اس کی پُر تجسس فطرت اور حوصلہ انداز فکر کو دشواریوں سے گزرنے کا ہنر بھی خوب آتا تھا۔

وہ ندی نالوں آبشاروں اور سرسبز درختوں میں گھری جھیلوں کے مناظر عکس بند کر کے کشمیر میں سیاحت کے فروغ کے لیے کوئی کارہائے انجام دینا چاہتا تو آج یہ پروجیکٹ ابتدائی کے بجائے اختتامی مراحل میں ہوتا لیکن اسے تو زندگی کی تلاش تھی۔

اسے زندہ انسانوں کے مسئلوں سے دلچسپی تھی۔

اس کے صبر آزلمحات کا حاصل وہ انوکھے مناظر ہوتے تھے جب وہ نازک اندام عورتوں کو کئی من وزنی پتھر کی سلوں کو سر پر اٹھائے دیکھتا، وہ پتھر اٹھانے والی عورتیں اپنے گھر کی بنیادیں اس شوق کے ساتھ رکھتی تھیں کہ کاشف کو ان کی ہمت پر رشک اور اپنے ہم قبیلہ مردوں پر ترس آتا تھا۔ جو خود بھی اگر پتھر ڈھوتے تھے تو اس معاملے میں اپنی عورتوں کے ساتھ بھی مساوی سلوک کرتے تھے۔

اس نے ایک حاملہ عورت کو دو مٹکوں کے بوجھ تلے دبے دیکھا تھا۔ المونیم کے چمکتے ہوئے مٹکے

ایک دوسرے کے اوپر دھرے تھے۔ ان کے نیچے سر پر جانے کیا چیز تھی جو اپنی گولائی اور موٹائی کی وجہ سے مٹکوں کا وزن براہ راست سر تک پہنچنے سے روک رہی تھی کاشف اب اس تجسس میں مبتلا تھا کہ یہاں کی عورتیں چشموں سے پانی لانے کے لیے یہ کیا طریقہ استعمال کرتی ہیں اور اس چھوٹے سے وہیل کا موجد کون ہے جو سر کو بھاری بھر کم مٹکوں کے بوجھ سے بچاتا ہے۔

وہ کسی عمر رسیدہ عورت کی تلاش میں تھا اور اب اسے عاشر عباس کی اشد ضرورت تھی۔

☆.....☆.....☆

سرسبز درختوں میں گھرا عاشر عباس کا کاٹیج نما آفس کبھی عملے کی تنگی کا شکار رہتا تھا اور کبھی سہولیات کی عدم دستیابی کے باعث بہت سارے کام التوا میں پڑ جاتے تھے۔

آج کل وہ فنڈنگ کے لیے درخواست دینے کے ساتھ ساتھ ایک عوامی رابطہ مہم کا آغاز بھی کرنے والا تھا جس کی حکمت عملی تقریباً تیار تھی اب صرف اس کے اطلاق کے لیے عملی کاروائیوں کا آغاز باقی تھا۔ اس وقت بھی وہ مختلف رنگوں کے بینرز کا جائزہ لیتے ہوئے خاصا خوش اور مطمئن نظر آ رہا تھا تب ہی کاشف کیانی بغیر اطلاعی دستک کے اندر چلا آیا تھا۔

''حضور ولا..... جنگلوں کے مسیحا..... شجرہ حجر کے ہمنوا..... کچھ ہماری بھی التجا پر غور کیجیے ہمیں آپ کی رہنمائی اور مدد کی اشد ضرورت ہے ورنہ ہم ان پہاڑوں میں لقمہ اجل بن جائیں گے.....'' وہ اس کے آفس میں رکھے مضبوط لکڑی کے صوفوں پر تقریباً نیم دراز ہوتے ہوئے بولا تو عاشر نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

''جس سرکاری مال پر تم اپنا بوجھ بے دردی سے ڈال رہے ہو ٹوٹ جائے گا..... خاصا قدیم ہے۔''

''مجھے تم سے یہ ہی امید تھی کنجوس آدمی..... جو شخص راجہ ہاؤس کا مالک ہو..... جس کے گھر دنیا کی ہر سہولت موجود ہو..... اس سے اسی قسم کے رویے کی توقع ہو سکتی ہے..... اچھا ہے ٹوٹ جائیں نئے آ جائیں گے لکڑی کی کون سی کمی ہے تم اپنی پسند کے بنوا لینا۔'' وہ مزید پسار کر بیٹھ گیا تھا۔

''وہ تو میں بنوالوں گا لیکن وقت بے وقت تمہارے آنے کی کوئی تک ہے۔'' عاشر نے اپنی سیٹ سنبھالتے ہوئے پیون کے لیے بیل بجائی تھی۔

''میں ہر وقت یہاں ڈیرا ڈال سکتا ہوں بس مجھے ترس آتا ہے تمہاری اس صورت پر۔ خاصے لوگ تمہاری عزت کرتے ہیں..... خواہ مخواہ میری دیوانگی پر شک کریں گے۔'' وہ اسے یوں نظروں سے تول رہا تھا جیسے کوئی اپنی نئی نویلی دلہن پر شوق لٹاتا ہے۔ عاشر نے واقعی گھبرا کر رخ موڑ لیا تھا۔

''عاشر عباس سن آف راجہ طارق محمود..... ایک بات کان کھول کر سن لو..... جب تک تم راضی نہیں ہو جاتے میں تمہارا پیچھا نہیں چھوڑنے والا..... جوگ لے لوں گا..... کپڑے پھاڑ کر جنگلوں میں نکل جاؤں گا اپنی خواہش سے باز نہیں آؤں گا۔'' وہ اپنے ڈیجیٹل کیمرے کا لینس بیلنس کرتے ہوئے مضبوط لہجے اور شریر مسکراہٹ کے ساتھ بولا تو عاشر نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ پیون اندر آ چکا تھا اور حکم کا منتظر تھا..... کاشف نے ہی اسے کافی کا آرڈر کیا۔

''اپنے صاحب کے ذاتی خرچے پر کچھ کھانے کو بھی لے آ بھائی بہت بھوک لگی ہے۔''

''دو چار چٹکی زہر بھی ڈال دینا.....'' عاشر نے سر اٹھا کر کہا تھا۔

''اس کی ضرورت نہیں تمہارے صاحب کا انداز ہی کافی ہے۔'' اس بے چارے کو سوائے کافی کے کچھ نہیں سمجھ آیا تھا اس لیے سر ہلا کر باہر نکل گیا۔

''کاشف تم وقت ضائع کر رہے ہو..... تم مجھ سے وہ کام کروانا چاہتے ہو جو میں کبھی نہیں کر سکتا اور نہ ہی میں کرنا چاہتا ہوں پلیز سمجھو نا اس بات کو.....'' اس بار وہ سنجیدہ تھا۔

''تم سے کام کروانا میری ذمہ داری ہے..... بس تم ایگری ہو جاؤ..... دیکھو شہزادے..... میں نے یہ طے کر لیا ہے کہ ہم دونوں اس ڈاکومنٹری پر کام کر رہے ہیں۔ اب بہت مشکل ہے میں اپنا موڈ بدلوں..... تم کوئی ایسا اہم کام نہیں کر رہے جو متاثر ہو گا اور اگر تم نہیں مانے تو میں تمہارے فادر سے بات

کرلوں گا..... کیا بندہ ہے دیکھو تو تھکن اڑنے لگے۔"

وہ تصوراتی آنکھ سے راجہ طارق محمود کو دیکھ رہا تھا جو براؤن کلر کے سفاری سوٹ میں قیمتی خوشبو، اعلیٰ برانڈ کے جوتوں میں جب اس کے سامنے آ کر کھڑے ہوئے تھے تو وہ ایک لمحے کے لیے پلکیں جھپکانا بھول گیا تھا۔ عاشر عباس کی شخصیت کا سحر بھی کم نہیں تھا لیکن یہ بندہ تو کسی اور ہی دنیا کا لگ رہا تھا وہ بھی اس پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ علاقے میں..... اس نے اتنے پالیشڈ اور رکھ رکھاؤ والے لوگ صرف یورپ میں ہی دیکھے تھے یا پھر اس پہاڑی علاقے میں..... دیکھ کر حیرت ہوئی تھی..... یہ قدرت کا عجیب تضاد دیکھا اس نے یا تو لوگ بنیادی سہولتوں کو ترس رہے تھے یا پھر ان کو اللہ نے اتنا نوازا تھا کہ وہ کئی گھروں کی کفالت کے بعد بھی مالا مال تھے۔

"تم ان سے کوئی بات نہیں کرو گے اور نہ ہی ان کی بات ماننے کا پابند ہوں۔" وہ یکدم سنجیدہ ہو گیا تھا۔

مسکراہٹ چہرے سے اچانک غائب ہو گئی تھی۔ سفید لائنوں والی سیاہ شرٹ اور سیاہ ڈریس پینٹ میں اس کا لمبا چوڑا وجود اس چہرے کا ساتھ بالکل نہیں دے رہا تھا جس پر طفلانہ سی ضد کے رنگ بکھرے تھے خفگی اور ناراضی کے وہ رنگ..... جو معصوم بچے کو بے ساختہ گلے لگانے پر مجبور کرتے ہیں۔

"کیا تمہارا اپنے فادر کے ساتھ کوئی ڈس پیوٹ ہے۔" وہ بھی قدرے سنجیدگی کے ساتھ استفسار کر رہا تھا۔

"نہیں..... میں نے اپنے فادر کو پہلی بار دیکھا تھا اب سے چند مہینے پہلے میرا ان کے ساتھ کوئی ڈس پیوٹ کیسے ہو سکتا ہے۔" وہ گہری سانس لے کر بولا۔ تب ہی پیون دستک دے کر اندر آ گیا تھا۔

"آج کینٹین والا چھٹی پر گیا ہے..... کچھ نہیں ہے کھانے کو بس یہ بسکٹ ہی ملا ہے....." اس نے کافی اور بسکٹ کی ٹرے تپائی پر رکھتے ہوئے کہا۔

''اس کنجوس کے دفتر سے یہ بھی مل جائے تو کافی ہے۔'' کاشف کی بڑبڑاہٹ عاشر کو مسکرانے پر مجبور کر گئی تھی۔

یہ درست ہے کہ وہ کنجوس تھا مگر مسکراہٹ کے معاملے میں۔اور اگر ان تنہائیوں میں کاشف کیانی جیسا دوست میسر نہ ہوتا تو بہت ممکن تھا وہ مسکرانا بھول ہی جاتا۔

گرم گرم بھاپ اڑاتی کافی کی خوشبو کو اپنے اندر اتارتے ہوئے کاشف نے عاشر کے چہرے پر ایک گہری سی نگاہ ڈالی۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے کیا کہا تھا۔

''میرا اپنے فادر کے ساتھ کوئی ڈس پیوٹ کیسے ہو سکتا ہے۔''

''میں تو ان سے پہلی بار ملا ہوں چند مہینے پہلے ہوں۔'' اسے دونوں ہی باتیں انوکھی اور انہونی لگی تھیں۔

''عاشر ابھی تم نے کیا کہا تھا.....تم پہلی بار ملے ہو۔''

''ہاں شاید شعور آنے کے بعد میں نے ان کو قریب سے پہلی بار دیکھا ہے، اینی ویز کوئی اور بات کریں یہ اتنا اہم موضوع نہیں، تم بتاؤ آج کی کیا پروگریس ہے۔'' وہ موضوع پلٹنے کے موڈ میں تھا کاشف نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا اسے انسانی نفسیات کے پرت کھولنے کا ہنر آتا تھا اسے پتا تھا عاشر کی زندگی میں کوئی تو خلا تھا۔

☆.....☆.....☆

میں نے کہیں پڑھا تھا۔

''محبت کا اظہار بہت ضروری ہے رشتوں کو مضبوط بنانے کے لیے انہیں مطمئن کرنے کے لیے، چاہے وہ اظہار لفظوں سے ہو یا عمل سے.....محبت اظہار نہ بنے تو محبوب کی امانت بن جاتا ہے۔

خولہ میں کب تک اس امانت کی حفاظت کروں مجھے لگتا ہے میں زیادہ دنوں تک ایسا کر نہیں پاؤں گا۔''

وہ ای میل پر نظریں جمائے کسی گہری سوچ میں گم تھی۔خزیمہ عادل سے وہ سر راہ ملاقات اس

کے حافظے میں اس لیے محفوظ رہ گئی تھی کہ اس نے لمحوں میں پہچان کے مراحل طے کر کے خولہ کو مخاطب کیا تھا اب یہ اتفاق تھا یا اس کی چھٹی حس کا کرشمہ..... لیکن خولہ کو اس کی ذہانت کی داد دینی پڑی تھی..... ورنہ پہلی یا دوسری ملاقات کے بعد بہت سارے لوگ خولہ، کشمالہ الجھن میں گرفتار رہتے تھے۔

''عجیب شخص ہے..... جان کو آ گیا ہے۔''

وہ جھنجھلاہٹ میں مبتلا تھی تب ہی کشمالہ اندر چلی آئی تھی۔ آج شام ان کی روانگی متوقع تھی راجہ ہاؤس کے لیے اور اس بار نانو بھی ان کے ساتھ جا رہی تھیں۔ ایک مدت بعد وہ اپنا یہ ٹھکانہ چھوڑنے پر راضی ہوئی تھیں وہ بھی کشمالہ کے پر خلوص اصرار پر.....

کشمالہ کی اس کاوش اور کامیابی پر راجہ طارق محمود بے پناہ مسرور تھے۔ انہوں نے ڈھائی گھنٹے کے سفر کو آرام دہ بنانے کے لیے اپنی من پسند جیپ راجہ ہاؤس سے منگوائی تھی۔ حالانکہ آج کل وہ زیادہ تر کار کے ذریعے سفر کرتے تھے۔

''کیا بات ہے..... کس سوچ میں گم ہو۔'' وہ اس کے پاس آ گئی۔

''سوچ سے زیادہ تشویش میں مبتلا ہوں۔''

''کیا ہوا کوئی مسئلہ ہو گیا.....''

''مسئلہ تو فی الحال خزیمہ عادل ہے یہ میل پڑھو۔''

''انٹرسٹنگ..... بندہ تو ذہین ہے اور رومانٹک بھی..... خولہ ایسے لوگ زندگی گزارنے کے لیے بہت پرفیکٹ ہوتے ہیں۔'' کشمالہ جب سے اس سے مل کر آئی تھی اپنی اس رائے پر قائم تھی۔ خولہ نے فوراً آنکھیں دکھائی تھیں۔

''مالا تم بالکل پاگل ہو..... یہ آوازوں کے سحر میں گم ہو کر محبت اور سر راہ ملاقات پر اس کی تصدیق کرنے والے لوگ اتنے قابل اعتبار نہیں ہوتے جتنا ان کے چہرے پر لکھا ہوتا ہے.....''

''محبت کو اپنے مقررہ وقت پر ہونا ہوتا ہے چاہے وہ آواز سے ہو یا چہرے سے۔''

''اب تم بھی دینے لگو محبت پر لیکچر..... یہ محترم بھی اس سبجیکٹ میں پی ایچ ڈی لگتے ہیں میں تو بے زار ہو جاتی ہوں۔'' اس نے منہ بنا کر ان باکس میں دوسری میل چیک کرنا شروع کیں۔

''تو ٹھیک ہے اگنور کرتی رہو وہ خود ہی جان چھوڑ دے گا لیکن اس بات کا خیال رکھنا..... ہمیں زندگی میں کسی پر اعتبار تو کرنا پڑتا ہے نا اور کوئی تو ہے جو صرف ہمارے لیے بنا ہوتا ہے ہمیں اس کا انتظار ہوتا ہے۔'' کشمالہ خاصی سنجیدہ تھی خولہ ریوالونگ چیئر پر پوری کی پوری گھوم گئی۔

''مالا..... یہ تم ہو..... تمہارے پاس اتنی معلومات.....'' وہ اسے مسکراتی نگاہوں سے تول رہی تھی، کھوج رہی تھی۔

''نہیں میں تو گھاس کھاتی ہوں..... اوہ بابا تمہاری طرح لفظوں سے نہیں کھیلتی لیکن لفظوں سے آشنائی تو ہے۔

اور جب یہ ہی بات تمہارا کولیگ سفیان کہہ رہا تھا اس وقت۔''

''شاید سفیان میرے لیے نہیں بنا ہے اسے دیکھ کر میرے دل نے کوئی ہارٹ بیٹ مس نہیں کی تو میں کیسے یقین کر لیتی کہ ہمیں ساتھ رہنا ہے۔'' وہ بات کرتے ہوئے عجیب سے انداز میں مسکرائی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کوئی لمحہ ٹھہرا ہوا تھا جو خولہ کی نظروں سے اوجھل تھا وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔

''مالا، سفیان نہی، عمر نہیں، مائیکل نہیں تو پھر کون مجھے تو وہ سارے لوگ بہت سچے اور پر خلوص لگے تھے.....''

''شاید وہ یہیں کہیں ہے جسے دیکھ ک میرا دل پہلی بار دھڑکا بالکل عجیب سے انداز میں.....'' اس کی مسکراہٹ میں کسی نئے رنگ کی جھلک تھی۔

''کون..... یہاں کہاں.....؟'' خولہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا لیکن کشمالہ کی زندگی میں کچھ خاص ہو گیا تھا۔

''تمہیں خود پتا چل جائے گا میں نہیں بتاؤں گی.....'' وہ سرشاری سے بولی اور اس سے ہاتھ چھڑا کر باہر نکل گئی۔

''مالا میں تمہیں چھوڑوں گی نہیں.....تم نے اتنی بڑی بات مجھ سے چھپائی آئی ول کل یو.....'' وہ اس کے پیچھے لپکی تھی۔

''اچھا آؤ بتاؤں.....'' مالا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور سیڑھیاں اتر کو دونوں گول کمرے کے ساتھ بنے ہال میں آ گئی تھیں۔ جس کے آمنے سامنے دیواروں پر خوبصورت پینٹنگز آویزاں تھیں مگر اس کی ایک دیوار پر محض ایک تصویر تھی۔ شیشے کے فریم میں سنجیدہ چہرے والی فل سائز پورٹریٹ میں اس کا اونچا لمبا قد نگاہوں میں اتر رہا تھا کسی کا وبوائے کے انداز میں.....

❁ ❁

ناول خواب خواہش اور زندگی ابھی جاری ہے۔ مزید واقعات اگلے صفحات میں پڑھیں۔

رنگا رنگ کہانیوں سے سجا، خوبصورت اور دلکش

سوہنی ڈائجسٹ

SohniDigest.Com

اگر آپ بھی لکھ رہے ہیں اور اُردو قارئین کی تلاش میں ہیں تو اپنی کہانیاں Inpage میں کمپوز (ٹائپ) کر کے پورے اعتماد کے ساتھ سوہنی ڈائجسٹ میں بھیجئے۔ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔

ابھی sohnidigest@gmai.com پر ای میل کریں۔

قسط نمبر 4

اعلیٰ نسل کے گھوڑے کی باگ اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ اپنے مضبوط قدموں کے ساتھ چلا جا رہا تھا عقب میں سبزے کا میدان تھا جس پر اکا دکا سرو کے درخت تھے کشمالہ چند قدم چل کر اس کے سامنے آ گئی اور ساتھ کھڑے ہوتے ہوئے بے ساختہ بولی۔

''ہم کیسے لگ رہے ہیں دونوں.....''

''تم دونوں.....'' وہ بے اختیار ہنس پڑی تھی۔

اس کی آنکھوں میں تصویر کے لیے ستائش کے رنگ نہیں تھے بلکہ وہ تصویر میں جان ڈالنے والے مجسمے کو کسی پرستار کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی اس کی نیلی آنکھوں کو یہ منظر اتنا خوبصورت اور مکمل لگا کے وہ بے اختیار آگے بڑھ کر اس سے لپٹ گئی تھی۔

''مالا! مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم یہاں آ کر اس شخص سے ہار جاؤ گی۔ ہاؤ امیزنگ؟ مانا کے اسے نظر انداز کرنا آسان نہیں اس پر ایک نگاہ اتفاقاً پڑ جائے تو دل دوسری کے لیے تقاضا کرتا ہے اور آنکھیں سوال لیکن تم جانتی ہو..... یہ شخص جس ماحول میں گروم ہوا ہے۔ بلکہ مجھ سے زیادہ جانتی ہو اس گھر کا لائف اسٹائل..... تمہیں اندازہ تو ہوگا نا وہ بہت الگ مزاج کا بندہ ہے انٹرووورڈ سا۔''

لفظ خولہ کے گلابی لبوں سے یوں پھسل رہے تھے جیسے وہ کوئی رٹا ہوا اسکرپٹ بول رہی ہو، یہ ہی تو اس کا کمال تھا اسے زبان و بیان پر دسترس ریڈیو میں کام کرنے کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ یہ خداداد صلاحیت تھی جو اس کو ماں کی طرف سے ورثے میں ملی تھی۔

''ابھی تو میں صرف اسے جاننے اور اپنی فیلنگز کو سمجھنے کے مراحل میں ہوں مجھے ان دونوں کاموں میں بہت مزا آنے لگا ہے۔'' وہ ایک بار پھر تصویر کے ساتھ جا کر کھڑی ہوگئی تھی۔

اس کا چہرہ عاشر عباس کے پتھریلے چہرے پر شناسائی کے رنگ تلاش کر رہا تھا مگر وہ بلا کا خوبصورت چہرہ جانے کیوں اتنا زندگی سے شاکی تھا کہ فطرت کے انتہائی دلکش منظر کا حصہ ہونے کے باوجود وہ اپنی ہی سوچوں میں گم تھا۔

خولہ نے پہلی بار اسے اتنے مشرقی روپ میں دیکھا تھا عاشر عباس کا ذکر کرتے ہوئے اس کا چہرہ دمکنے لگا تھا خولہ کے ذہن میں سفیان اور عمر کی بے قراری کے دن آ گئے تھے وہ دونوں بہت رومانٹک تھے اور کوشش کرتے کہ کشمالہ ان کے کسی ایک جملے سے تو متاثر ہو جائے مگر اس کا سپاٹ چہرہ ہر بار ان کی ہمت پست کر دیتا اور وہ خولہ سے شکوہ کرتے تھے۔

''تمہاری بہن پلاسٹک کی گڑیا ہے بے بی۔''

آج خولہ اس کے چہرے کے رنگوں سے محظوظ ہوتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

''یہ پلاسٹک کی گڑیا کہاں چھپی ہوئی تھی۔ سفیان اور عمر دیکھ لیں تو جوگ لے لیں۔''

مگر جوگ تو اس نے لیا تھا۔

انجان اجنبی شخص سے شناسائی کا جوگ.....

نئے جذبوں سے آشنائی کا جوگ.....

خولہ نے بے ساختہ صدق دل سے دعا مانگی۔

''یارب تو اس کی آنکھوں کو ہجر آشنا مت کرنا، پاپا کی آنکھوں کی طرح۔''

وہ بے تحاشا خوشی کا اظہار کرتے ہوئے یکدم اداس ہوگئی تھی۔ آجکل پاپا بہت اداس تھے۔ وہ جتنے مضبوط خول میں محصور رہتے تھے یہاں آ کر ان کا یہ خول چٹخ رہا تھا۔ ہنستی تو کبھی ان کے چہرے کو چھو

کر نہیں گزرتی تھی یہاں تو مسکراہٹ بھی آنسوؤں میں بھیگی ہوئی ہوتی تھی۔

اور ایک عادت تو کشمالہ نے بھی ان کی چرائی تھی ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کی لڑیاں بہہ نکلتیں۔

اسے سب اکثر ٹوک دیتے۔

''مت ہنسا کرو اتنی بے رحمی سے..... تمہارے آنسو رلا دیتے ہیں۔'' اور اس لمحے اس کی نیلی جھیل سی آنکھیں قرار لوٹ لیتی تھیں خولہ چند لمحے تو اسے دیکھتی رہی اور پھر اس کا ہاتھ تھام کر برآمدے میں آ گئی۔

''مالا! یہ تو خیر اچھا ہو گیا۔ ہم صبح یہاں سے چلے بھی جائیں گے اور کچھ دنوں کے بعد وہاں سے بھی ہمیں یہاں تمام عمر نہیں رہنا..... یہ طے ہے نا..... پھر تم کیوں ان راستوں پر چلنا چاہتی ہو جس کی منزل سے باخبر نہیں۔''

''تمہیں پتا ہے ان راستوں پر کوئی جان بوجھ کر نہیں چلا کرتا اگر میں اس احساس سے نہ گزر رہی ہوتی تو مجھے خزیمہ عادل کی آنکھوں کے رنگ کبھی نہ نظر آتے جو وہ تمہیں دیکھنے کے بعد تمہاری آواز سننے کے بعد چھپا نہیں پا رہا تھا۔''

کشمالہ نے یکدم اس کا چہرہ اپنی نگاہوں کی گرفت میں لے لیا تھا۔

''ارے یار..... یہ تم کیا قصہ لے بیٹھی۔ وہ صرف فارغ آدمی ہے تم نے دیکھا نہیں اس کی ای میلز میں زمانے بھر کا فلسفہ ہوتا ہے۔''

خولہ نے ناک سے مکھی اڑائی تھی۔

''مجھے تو وہ ساری باتیں سچ لگنے لگی ہیں..... زمانے بھر کا فلسفہ ہمارے دل کی ترجمانی کبھی نہیں کرتا تم اس کو انڈر اسٹیمیٹ نہ کرو۔ ک'' شمالہ نے شرارت سے کہا تو وہ بھی دھیمے سے مسکرا دی۔

''گویا جو مادام کو ہو چلا ہے وہ سب سچ ہے اور باقی لوگ گھاس کاٹ رہے ہیں۔''

''نہیں، باقی لوگ جس سے بھاگ رہے ہیں اس کو دل کی نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کریں شاید خزیمہ کی مراد بر آئے۔''

''بالکل فضول بات مجھے وہ خاصا نان سیریس لگتا ہے اور تم جانتی ہو میں زندگی تجربات کے حوالے نہیں کر سکتی ٹھیک ورنہ ایک سے بڑھ کر ایک آزنائش دامن جکڑ لیتی ہے مجھے پہلے اپنی قسمت آزمانی ہے۔'' خولہ نے سنجیدگی سے کہا اور برآمدے کے مرمریں فرش پر پاؤں پھیلا کر بیٹھ گئی۔

''شاید ہماری ماں کا دور کوئی اور تھا..... اس وقت کی عورتیں خود کو تجربات اور قسمت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتی تھیں۔ فائٹ نہیں کرتی تھیں.....'' کشمالہ نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

''یار ایک عورت کہاں تک فائٹ کر سکتی ہے اگر اس کا سب سے اپنا ہی فریب دینے پر تل جائے تو ہمت سے زیادہ اس کا اعتبار ٹوٹتا ہے۔'' اس کی نظریں کسی انجان منظر پر جمی تھیں۔

''سارا جھگڑا ہی تو اس اعتبار کا ہے..... لیکن یہ بھی تو مت بھولو کہ اگر کوئی اعتبار توڑتا ہے تو اس سے بہت بہتر انسان اس اعتبار کے سنگریزے سمیٹ کر ایک نئے یقین کا بت بنا دیتا ہے جینے کی نئی راہ دکھانے لگتا ہے اگر ماما کو پاپا نہ ملتے تو کیا ہم دونوں آج اس مقام پر ہوتے.....''

کشمالہ نے اسے مثبت راہ دکھائی تھی اور وہ اس بات سے سو فیصد متفق تھی۔

''لیکن ہر کوئی پاپا جیسا غیر معمولی انسان نہیں ہوتا اور نہ ہی ماما جیسا خوش قسمت..... بلکہ بہت سارے لوگ منیر کمال اور شمائلہ کی طرح ہوتے ہیں۔''

''پتا ہے مالا مجھے کبھی کبھی یہ سوچ کر بھی شرم آنے لگتی ہے کہ منیر کمال ہمارا باپ ہے اور ہم جبر کی اولاد ہیں دو انسانوں کے درمیان ہونے والے سرٹیفائیڈ جبر کی اولاد۔''

تلخی نے یکدم اس کا چہرہ سرخ کر دیا تھا اور نیلی آنکھیں لہو رنگ ہونے لگی تھیں۔

''تمہیں صرف شرم آتی ہے مجھے خود سے نفرت ہونے لگتی ہے ہمارا باپ پاپا کے ہنستے بستے گھر کو آگ لگا کر آج عیش کرتا پھر رہا ہے۔''

وہ دونوں ڈھلتی شام کے سرمئی نظاروں کو اپنی آنکھوں میں جذب کرتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

کبھی کبھی وہ یوں ہی ایک دوسرے کی ہمدرد غمگسار اور دم ساز بن جایا کرتی تھیں اور اپنے مشترکہ دکھ پر دل کھول کر بولتی تھیں، روتی تھیں۔

لیکن آج انہیں پتا بھی نہیں چلا تھا کہ ان کو دل کی گہرائیوں سے خوشیوں کی دعا دینے والی نانو بھی ان کے اس درد میں حصہ ڈالنے کے لیے آ گئی تھیں۔

ان پر تو قیامت کا صدمہ گزر گیا تھا یہ حقیقت اتنی کڑوی تھی کہ انہیں چکر سے آ گئے۔ بمشکل دیوار کے سہارے لاؤنج تک پہنچی تھیں تب ہی خدیجہ فکرمندی سے آگے بڑھی تھی۔

''مجھے پانی پلاؤ۔''

''میں آپ کے لیے گلوکوز لے کر آتی ہوں۔'' وہ جلدی سے کچن کی طرف بھاگی اور نانو کی سماعتوں میں دو ناموں کی بازگشت نے کہرام سا برپا کر دیا تھا۔

منیر کمال، شمائلہ.....

شمائلہ، منیر کمال.....

ان کا بس نہیں چل رہا تھا لمحوں میں طارق کا گریبان تھام لیں اور پوچھیں۔

''تم ساری دنیا میں اتنے انوکھے کیوں پیدا ہو گئے۔ تم سے کس نے کہا ہے کہ ایک کے بعد دوسرا ستم اپنی ذات پر کرو اور زمانے بھر کا درد اپنے اندر سمیٹ لو۔''

''تو منیر کمال تم نے صرف میرے آشیانے میں نقب نہیں لگائی..... تم نے تو نجانے کتنے آنگن خاکستر کیے ہیں۔''

وہ دونوں آنکھیں بند کر کے رو پڑی تھیں اور آنسو دائیں بائیں کنپٹیوں میں جذب ہونے لگے۔

☆.....☆.....☆

وہ تو ان کا انتظار کر رہا تھا..... شاید آج رات یا پھر کل صبح ان سے ملاقات ہو جاتی..... لیکن فون پر کسی محترمہ نے اطلاع دی تھی۔

''نانو ہاسپٹل میں ہیں۔'' بس اس کے بعد اس نے کچھ سنا ہی نہیں اور نہ ہی سننے کی ہمت خود میں پا رہا تھا فون کریڈل پر ڈال کر وہ الٹے قدموں اپنے پارکنگ کمپاؤنڈ میں آیا تھا۔

مگر گاڑی تو ورکشاپ میں تھی۔ سرکاری جیپ کے ساتھ یہ ہی تو مسئلہ تھا آئے دن کام نکال لیتی تھی۔

اس کے پاس اپنے استعمال کے لیے کوئی گاڑی نہیں تھی۔ ابھی دو دن پہلے کاشف کو ضرورت پڑی تھی تب بھی اس نے معذرت کر لی تھی اور کاشف کے تصور میں راجہ ہاؤس کی امارت اور پارکنگ میں کھڑی نئے ماڈل کی گاڑیاں چلی آئی تھیں۔

''میرے بھائی تو، تو دنیا کی انوکھی مخلوق ہے..... میرے باپ کے پاس اتنا کچھ ہوتا نا کبھی ان جنگلوں میں تیرے رحم و کرم پر نہ ہوتا۔''

''راجہ صاحب کے پاس بہت کچھ ہے اور میرا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔''

عاشر نے سنجیدگی سے کہا تھا شاید اسی لیے اس مشکل میں بھی کا دھیان ان کی طرف نہیں گیا تھا بلکہ وہ کاشف کا موبائل نمبر ملا رہا تھا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد کاشف اپنی گاڑی سمیت اس کے پاس تھا۔

''مجھے اسلام آباد پہنچنا ہے فوری..... کتنے گھنٹے میں پہنچاؤ گے؟'' وہ بالکل تیار کھڑا تھا چھوٹا سا سفری بیگ ہاتھ میں تھامے..... کاشف نے ایک نظر اپنے حلیے پر ڈالی۔

''بھئی میں چینج تو کر لوں..... کل سے یہ ہی شرٹ چڑھائی ہوئی ہے۔''

''صرف دس منٹ دے رہا ہوں۔ میری الماری میں سے کچھ لے لو۔'' عاشر کی عجلت اور پریشانی اس کے چہرے سے عیاں تھی کاشف کو اندازہ تھا کہ وہ اپنی نانو کے معاملے میں بہت حساس ہے۔

''ڈونٹ وری عاشر ان شاء اللہ سب ٹھیک ہوگا۔ اس عمر میں ہاسپٹل جانا پریشانی کی بات نہیں

ہوتی اچھی بات ہے باقاعدگی سے چیک اپ ہوتا رہے۔"

کاشف نے اس کے استری شدہ کپڑوں میں سے اپنے مطلب کی شرٹ ڈھونڈ لی تھی۔ جینز اور جاگرز تو خیر اس کی شخصیت کا لازمی جزو تھے۔ واش بیسن میں دو منٹ مصروف رہنے کے بعد تیسرے منٹ میں وہ شرٹ پہن کر تیار کھڑا تھا۔

"تمہیں اندازہ نہیں وہ کتنے مضبوط اعصاب کی خاتون ہیں اور وہ ہارٹ اٹیک کی وجہ سے ہاسپٹل میں ہیں۔"

عاشر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا یہ کیسے ہو گیا اور اب اس کے پاس وہ الفاظ بھی نہیں تھے جن کی مدد سے کاشف کو سمجھائے کہ نانو نے بڑے بڑے صدمے جھیل لیے کبھی ٹوٹی نہیں آج پتا نہیں کیا ہوا ہے۔

راجہ صاحب بھی وہیں ہیں اور ان کی صاحبزادیاں بھی۔

میری ماں بھی مجھ سے ملنے کا پروگرام بنا رہی تھی۔

پتا نہیں کونسی پریشانی انہیں اتنا کمزور کر گئی۔

عاشر سوچوں میں گم تھا کاشف گاڑی مقررہ راستوں پر محتاط رفتار کے ساتھ دوڑا رہا تھا۔

ان بل کھاتی پتلی پتلی سڑکوں پر محتاط ڈرائیونگ ہر کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ عاشر نے سوچ سمجھ کر اس کا انتخاب کیا تھا۔ وہ تقریباً عادی ہو چکا تھا ان راستوں کا۔

"عاشر جاناں پریشان نہیں ہوتے اللہ بہتر کرے گا۔ ابھی تھوڑی دیر میں تم ان کے پاس ہو گے۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا وہ بالکل فٹ ہوں گی اور پھر تمہارے پاپا بھی تو ان کے پاس ہیں۔"

"ان کے ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے وہی تو ہیں اصل مسئلے کی وجہ۔" عاشر روز اول کی طرح متنفر تھا۔

"نہیں میں نہیں مانتا کہ ان جیسا کول مائنڈ آدمی کسی کی پریشانی کی وجہ بن سکتا ہے۔ تمہارا نکتہ نظر ہو سکتا ہے ٹھیک ہو مگر یہ تمہارے سوچنے کا انداز ہے۔ تمہیں حالات کو محض ایک رخ پر جا کر نہیں دیکھنا

چاہیے مجھے وہ بہت معقول آدمی لگے اور میری چہرہ شناسی یہ بھی کہتی ہے کہ وہ کسی کی حق تلفی نہیں کر سکتے۔"

"میرا حق تو کبھی دیا بھی نہیں۔" یہ بات وہ محض سوچ کر رہ گیا اور سیٹ کی پشت سے سر ٹکا دیا۔

اس وقت اسے صرف نانو کی فکر تھی۔ موبائل رابطہ بھی منقطع ہو چکا تھا۔ اس علاقے میں سروس نہیں تھی کاشف کا دھیان ڈرائیونگ کے ساتھ عاشر پر بھی تھا جو بے حد مضطرب نظر آ رہا تھا۔

اس کے لیے نانی نواسے کی محبت کا یہ انداز خاصا انوکھا تھا ورنہ وہ جس ماحول کا پروردہ تھا وہاں رشتے ضرورت اور سہولت کے مطابق برقرار رکھے جاتے تھے ورنہ اپنی دنیا ہی بہت وسیع تھی۔

☆.....☆.....☆

صوفیہ کو یقین ہو چلا تھا کہ اس گھر کے مکین اس کی ماں جو ریاش، خود مختار اور خود غرض سمجھتے ہیں اب ان تینوں خصوصیات کی مالک عورت کی بیٹی ان کے نزدیک کتنی قابل اعتبار تھی اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔

وہ جس کمرے کی مکین تھی اس کی دنوں ہفتوں صفائی کا تصور نہیں تھا اور خود وہ ڈسٹ الرجی میں مبتلا ہو چکی تھی۔ پرانے وقتوں کا بنا ہوا یہ گھر بتدریج کھنڈر میں تبدیل ہو رہا تھا لیکن اگر اس کے در و دیوار کی طرف توجہ دی جاتی تو یہ اس محلے کا سب سے اچھا گھر ہوتا کشادہ ہوادار۔

وہ فارغ تو تھی کبھی خیالوں ہی خیالوں میں اس کو، وائٹ واش کروا رہی ہوتی اور کبھی پورے گھر کا فرنیچر تبدیل ہو چکا ہوتا۔ اس دن بھی وہ لاؤنج نما ہال کمرے میں پاؤں پھیلا کر بیٹھی اپنے خیالات کی رو میں مگن کچھ وقت اچھا گزارنے کی سعی کر رہی تھی کہ تائی نے دال چاول چنتے ہوئے اسے مخاطب کر لیا۔

"صوفیہ کتنے دن ہو گئے ہیں تمہیں یہاں آئے۔" بڑا میٹھا لہجہ تھا اسے حیرت ہوئی۔

"ابھی تو صرف بیس پچیس دن ہوئے ہیں کیوں خیریت....." اسے بھی اب ان کے انداز میں گفتگو کرنی آ گئی تھی۔

''ایسے ہی پوچھ رہی تھی تمہاری طرف سے کوئی خیر خبر لینے آیا نہیں بھول گئے کیا۔''

''روز تو فون کرتے ہیں اور پھر کون سا میں کسی دوسرے گاؤں میں ہوں جو روز خیر خبر لینے آئیں گے۔''

اس کی نظریں تائی کے مضطرب چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا وہ کچھ کہنا چاہ رہی ہیں۔ آج کل ویسے بھی گھر میں مہمانوں کی آمد بڑھ چکی تھی سعدیہ کے رشتے کے سلسلے میں اسے چند ہی دنوں میں اندازہ ہو گیا تھا کہ سعدیہ ان سرگرمیوں میں خوش نہیں ہے کیونکہ اس کی دلچسپی کا محور کوئی اور تھا۔

سعدیہ اکثر و بیشتر چھت پر جا کر موبائل فون پر باتیں کرتی نظر آتی تھی اور اسے حیرت ہوتی تھی گھر کے کسی بھی فرد کو اس کے معمولات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ گھنٹوں شاپنگ کے بہانے گھر سے غائب رہتی۔ ہر وقت موبائل فون سے جڑی رہتی حالانکہ وہ کہیں جاب نہیں کرتی تھی اور کالج تو شاید اس نے دو سال پہلے فرسٹ ائیر کے دوران ہی چھوڑ دیا تھا۔

نادیہ ابھی اسکول جا رہی تھی لیکن محسوس یوں ہوتا تھا یونیورسٹی کی طالبہ ہو اسکول سے واپسی پر میک اپ کا ہر لوازم اس کے چہرے کا حصہ ہوتا۔

صوفیہ محض تاسف میں مبتلا ہو جاتی یہ سب دیکھ کر حیرت کرتی اس بات پر کہ کوئی بھی تربیت کے ان معاملات کی طرف توجہ نہیں، تائی تو عظمی اور عالیہ کو بیاہ کر فارغ تھیں اور اب سفیر کی باری تھی سو ان کے پاس عظمی اور عالیہ کی سسرالوں کے مسائل ہی بہت زیادہ تھے ویسے تو وہ گھر کی بڑی اور معتبر ہستی تھیں لیکن سعدیہ نادیہ کے ساتھ ساتھ نعمان بھی انہیں خاطر میں نہیں لاتا تھا۔

اور یہ سب دیکھ کر صوفیہ بھی ان سنی کر دیتی اس وقت بھی وہ اسی موڈ میں تھی لیکن پھر ان کا متجسس انداز اس کے تجسس میں اضافہ کر گیا۔

''تمہاری ماں کا دل لگ رہا ہے تمہارے بنا.....''

ایک اور کوشش اسے زچ کرنے کی۔

''میری ماں اپنے دل کی پرواہ نہیں کرتی آپ کو تو پتا ہے بلکہ مجھ سے بہتر جانتی ہیں۔'' وہ انہیں ان کے پسندیدہ موضوع پر لے آئی تھی۔

''ہاں کام والی عورتوں کا یہ ہی تو مسئلہ ہے نہ گھر دیکھتی ہیں نہ گھر والے بس اپنی خوشی کے لیے جیتی رہتی ہیں۔''

انہوں نے فوراً تائید کی تھی صوفیہ نے بھی سر ہلا کر ساتھ دیا تھا اسے یہ من پسند موضوع چھیڑنے کے لیے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑتی تھی۔

''تائی زندگی بھی تو ایک بار ملتی ہے اپنی خوشیوں کے لیے جینا کوئی جرم تو نہیں۔'' صوفیہ نے بآواز بلند کہا تھا سعدیہ ابھی ابھی بیرونی دروازے سے اندر داخل ہوئی تھی تھکی ہاری۔

اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں پھیلا ہوا کاجل بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

صوفیہ نے ایک نظر اس پر ڈالی اور دوسری تائی پر وہ سر جھکا کر اپنے کمرے کی طرف جانا چاہتی تھی تب ہی تائی نے اسے آواز دے دی۔

''سعدیہ آج صبح سے تیری ماں بھی غائب ہے اور تو بھی..... کہاں ہو تم دونوں.....''

''مجھے کیا پتا ماں کہاں ہے میں تو ذرا بازار تک گئی تھی۔ نئے ٹیلر نے میرے کپڑوں کی فٹنگ خراب کر دی تھی وہی بتانے گئی تھی۔'' اس کا انداز ایسا تھا کہ کوئی مزید سوال نہ کرے۔

''بھلا بازار سے کپڑے سلوانے کی ضرورت بھی کیا ہے میں سی لیتی ہوں تمہاری اماں کا ہاتھ بھی صاف ہے پھر بھی تم لوگ فضول خرچی سے باز نہیں آتیں دو ڈھائی سو میں جوڑا آ جاتا ہے تم ایک سلائی کے تھما کر آ جاتی ہو۔''

تائی کا موڈ خراب ہو چکا تھا اور سعدیہ کا اس سے بھی زیادہ۔

''ہاں آپ لوگوں کو سلائی تو آتی ہے مگر کپڑے سینا نہیں آتے ابھی ہماری عمر تھیلے پہننے کی تو ہے

نہیں۔'' اس نے لحاظ بالائے طاق رکھ دیا تھا صوفیہ نے ایک نظر اس کے چست لباس اور دوسری تائی کے دھواں دھواں چہرے پر ڈالی ان لمحوں میں مسکراہٹ ضبط کرنا خاصا مشکل کام تھا مگر وہ اس معرکے کا حصہ بننے کے بجائے اس کو دیکھنا اور سننا چاہتی تھی۔

وہ آج پہلی بار سعدیہ کو اس انداز سے سن رہی تھی سیاہ رنگ کی تنگ کرتی گھیر دار شلوار اور سرخ رنگ کا دوپٹہ اس کی سانولی رنگت پر خاصا مناسب لگ رہا تھا اس کی بڑی بڑی آنکھیں کاجل سے ہمیشہ بھری رہتی تھیں جن سے صوفیہ کو بہت الجھن ہوتی تھی۔

لیکن اب مسئلہ یہ تھا کہ وہ اسے کوئی مشورہ نہیں دے سکتی تھی ورنہ وہ خاصی معقول صورت لڑکی تھی۔ اگر وہ اپنے بالوں کو ٹرم کروا لیتی تھوڑا سا وزن کم کر لیتی اور سب سے بڑی بات اپنے چہرے کی شکنیں دور کر کے مزاج کی تلخی کم کر لیتی۔

اس وقت بھی سعدیہ نے محض ایک نظر صوفیہ پر ڈالی اور دل ہی دل میں اس کے شاہانہ انداز سے خائف ہوتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ صوفیہ سے خائف ہونا یا اسے اپنے مقابل سمجھنا اس عمر کا تقاضا تو تھا مگر اس کا تدارک ممکن نہیں تھا۔

صوفیہ یہاں بھی مہنگے بوتیک کا لباس زیب تن کر کے سیاہ بالوں کو شانوں پر بکھرائے یوں گفتگو کرتی تھی جیسے کہیں کی مہارانی ہو، اس کے ہاتھ میں ہمیشہ مہنگا موبائل ہوتا جو سعدیہ کو احساس کمتری میں مبتلا کر دیتا۔

وہ بڑی مشکلوں سے یہ کم قیمت موبائل حاصل کر پائی وہ بھی ماں سے طویل جنگ کے بعد۔

اور اب تو ایک دوسری جنگ کا، آغاز ہونے والا تھا۔

دراصل آج سے چند مہینے قبل اس کی زندگی تبدیلی کے جس رنگ سے آشنا ہوئی وہ رنگ اب اس کی شخصیت کا اعتماد بن چکا تھا اب وہ چند مہینے پہلے والی انجان سی سعدیہ نہیں تھی جو عظمی اور عالیہ کی طرح

ماں باپ کے فیصلے پر سر جھکا دیتی اور ہر کمی بیشی سے سمجھوتہ کر کے شوہر کی خدمت کر کے سسرال والوں کے دل جیتنے کی کوشش کرتی۔

سمجھوتہ تو اس نے آج تک اس گھر کے ساتھ نہیں کیا تھا جہاں وہ پیدا ہوئی تھی اور اپنی عمر کا بہترین دور گزار دیا تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا وہ اس گھٹن زدہ ماحول کو لمحوں میں الوداع کہہ کر اپنی مرضی کی دنیا بسا لیتی مگر یہ اس کی بدقسمتی اور اس کے گھر والوں کی خوش قسمتی تھی جو وہ خود میں بغاوت کی ہمت نہیں پاتی تھی۔

لیکن اب تو ہمت کا مسئلہ ہی نہیں تھا اور بغاوت کے لیے اسے جو ساتھ درکار تھا وہ بھی میسر آ گیا تھا۔

صوفیہ کو اس نے بارہا تجسس اور حیرت کے ساتھ دیکھا بھلا اس کو کیا مجبوری تھی جو وہ یہاں چلی آئی تھی اپنی خوشگوار زندگی چھوڑ کر.....

یہ بھی اس کا پکنک منانے کا ایک انداز ہوگا۔ اس کی حتمی رائے جو بھی ہو لیکن وہ اس سے حد درجہ مرعوب ہونے کے باعث بات کرنے کی ہمت بھی نہیں کرتی تھی اور کچھ صوفیہ کا محتاط انداز بڑھتے قدم روک دیتا تھا اس وقت بھی اگر صوفیہ نہ ہوتی تو تائی سے معرکہ ضرور طول پکڑتا آج کل وہ اسے حد درجہ بری لگنے لگی تھیں۔

ہر دوسرے دن کوئی نہ کوئی خاتون چلی آتیں کبھی اپنے دیور کے لیے تو کبھی بیٹا ساتھ ہوتا امیدوار بن کر اور ان حالات میں وہ اپنا پوسٹ مارٹم ہوتے دیکھ کر احتجاج بھی نہیں کر سکتی تھی بس خاموش رہ کر اچھے وقت کا انتظار کر رہی تھی۔

تائی نے ضد باندھ لی تھی جلد از جلد اس کا رشتہ پکا کر کے شادی کرنے کی اور اس گھر کے بیشتر فیصلے چونکہ تائی کی ذہانت کے مرہون منت تھے اس لیے کوئی ان کے سامنے حجت بھی نہیں کرتا تھا۔

صوفیہ کو اندازہ ہو گیا تھا آجکل ان کا من پسند موضوع کیا ہے اس لیے وہ اشارے دے کر

تفصیلات کی منتظر تھی تب ہی چچی چلی آئیں سعدیہ سے زیادہ تھکی ہاری۔

اندر اور باہر کی گرمی نے ان کا سرمئی گاؤن بھگو سا دیا تھا وہ دوپٹہ اور گاؤن جلد از جلد اتار کر پنکھے کے نیچے آ گئیں۔

''بی بی کہاں غائب کو آج دن بھر سے۔'' تائی کا لب ولہجہ خاصا متجسس تھا چچی ویسے بھی گرمی سے نڈھال تھیں بھڑک کر رہ گئیں۔

''اب ہر جگہ آپ کو بتا کر جانے سے رہی..... آپ کو کوئی کام تھا کیا جو میرے بغیر نہیں ہوا۔''

''تم کون سا کام پورا کرتی ہو جو میں تمہارا انتظار کروں گی مجھے تو فی الحال یہ بتاؤ آپا کلثوم کو کیا جواب دینا ہے وہ انتظار کر رہی ہیں ہمارے جواب کا ورنہ ان کے بیٹے کو لڑکیوں کی کمی نہیں ماشاء اللہ برسر روزگار ہے۔''

تائی دال چاول سے فراغت پا کر اب فرصت سے بیٹھ چکی تھیں۔ براؤن کلر کے ملگجے سوٹ میں ان کا بھاری وجود تخت کے بیشتر حصے پر قابض تھا۔ یہ ان کی پسندیدہ جگہ تھی بلکہ اس سرخ چادر پوش لکڑی کے مضبوط تخت کو ان کی فرمائش پر ہی لاؤنج اور کوریڈور کے درمیانے حصے میں ڈالا گیا تھا۔

یہاں وہ کچن کے ساتھ کمروں میں بپا ہونے والے ہنگامے کے بارے میں بھی باخبر رہتی تھیں۔

چاچی کو اب کچن سنبھالنا تھا رات کا کھانا برتن اور دیگر کام ان کی ذمہ داری تھے بیٹیوں کو وہ کم ہی اپنے ساتھ شامل کرتی تھیں اس جواز کے ساتھ کہ

ساری زندگی چولہا ہانڈی ہی تو کرنا ہے یہاں تو بکھیڑوں سے بچی رہیں۔

اس لمحے صوفیہ کو اپنی ماڈرن ماں کا وہ سخت لہجہ بہت یاد آیا تھا۔

جب انہوں نے اس پر دوپہر کا کھانا بنانے کی پابندی لگائی تھی۔

''اچھی لڑکیاں زندگی کے کسی بھی مقام پر دوسروں کو مایوس نہیں کرتیں چاہے وہ گول روٹی بنانے

کا مرحلہ ہی کیوں نہ ہو۔" ایک بار انہوں نے کہا تھا۔

"مگر میں اچھی لڑکی بالکل نہیں ہوں....." وہ احتجاج کرتی۔

"مگر میں اپنی بیٹی کو بہت زیادہ باصلاحیت اور منفرد دیکھنا چاہتی ہوں۔"

ان کا نرم لہجہ یادوں کی مہکتی دنیا میں لے گیا تھا لیکن اس دنیا میں جا کر رہنا اس وقت ممکن نہیں تھا سو وہ سر جھٹک کر چچی کی طرف متوجہ ہوگئی۔

جو اپنی مصروفیات گنوا رہی تھیں۔

"ایک تو سوال ہو رب جواب چھم..... تمہاری یہ عادت بری ہے..... میں نے آپا کلثوم کا پوچھا ہے۔"

"آپ بھی تو ہتھیلی پر سرسوں جماتی ہیں ذرا صبر کر لیں آنے دیں اس کے باپ کو..... میں اکیلی کیا فیصلہ کر سکتی ہوں۔" وہ بھلا کب ان سے دبتی تھیں۔

"اس کا باپ ایک ہفتے کے لیے گیا ہے اور سچ بتا دوں جلدی کچھ کر لو..... مجھے تمہاری اولاد کے ارادے کچھ ٹھیک نہیں لگتے تم تو برقعہ اور ٹوکری اٹھا کر گھر سے نکل جاتی ہو اور تمہارے پیچھے وہ بھی..... اللہ جانے روزانہ کون سا ٹیلر اس کا انتظار کرتا ہے۔" تائی نے تلخی کی انتہا کر دی تھی صوفیہ کو تو اب کسی زبردست معرکے کی امید تھی مگر حیرت انگیز طور پر چاچی نے خاموش رہ کر ان کڑوے جملوں کو پی لیا تھا۔

"آپ فکر نہ کریں اس کا باپ آ جائے تو کچھ کرتے ہیں۔ میں خود پریشان ہوں اس کی ہٹ دھرمی سے بہت تنگ کرنے لگی ہے۔"

اس معاملے میں دونوں کی رائے قدرے یکساں تھی۔ صوفیہ کے ذہن میں دو دن پہلے والا وہ منظر تازہ ہو گیا تھا۔ جب سعدیہ چھت پر کسی کے ساتھ موبائل فون پر مصروف تھی، چاچی شاید اسی کی تلاش میں اوپر آئی تھیں۔

اپنے مخصوص لہجے میں چند باتیں سنانے کے بعد انہوں نے اس سے موبائل چھیننے کی کوشش کی

ساتھ میں ہلکے پھلکے ہاتھ بھی جما دیے مگر سعدیہ بھی بھلا کی ڈھیٹ اور باہمت تھی۔

نہ موبائل ہاتھ سے چھوڑا اور نہ ان کی باتوں پر کان دھرے.....

''پولیس لگوا دوں گی تیرے اس ہوتے سوتے کے پیچھے.....تو دیکھ لینا۔'' یہ ایک ماں کی دھمکی تھی بیٹی کے لیے۔ صوفیہ نے سن کر سر پیٹ لیا۔ اس کی بدقسمتی یہ تھی کہ اس کا اسٹور نما کمرہ اسی چھت کے کونے پر تھا جہاں پر گھر کا ہر فرد ستانے یا دل کی بھڑاس نکالنے چلا آتا۔

صوفیہ کو اس دن پہلی بار موبائل فون کے بڑھتے ہوئے استعمال اور اس کی آسان دستیابی سے خوف آیا تھا۔

پتا نہیں ٹیکنالوجی کا اس قدر استعمال مسائل بڑھانے کے لیے ہے یا کم کرنے کے لیے۔

اور پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ شجاع سے اسی موضوع پر بحث کر رہی تھی۔

''دیکھو تم اس گھر میں مہمان ہو ان کے ذاتی مسئلوں میں مت الجھو۔''

''اب اگر کسی کو محبت ہو گئی ہے تو اس میں موبائل فون بے چارے کا کیا قصور.....''

''قصور موبائل فون کا نہیں ہے۔ قصور تو اس دستک کا ہوتا ہے جو کسی بھی ذریعے سے دل کی دنیا میں ہلچل مچا دیتی ہے اب تم ظالم تو نہ بنو۔''

شجاع نے اس کی کسی بھی بات پر سنجیدہ نہ ہونے کی قسم کھالی تھی اور اس نے تنگ آ کر اپنا موبائل فون ہی آف کر دیا تھا لیکن پھر آنے والے ایک دو دنوں میں اسے گھر میں ہونے والی سرگوشیوں اور سرگرمیوں سے پتا چل گیا تھا کہ اصل مسئلہ اس موبائل فون سے ہی شروع ہوا تھا۔

سعدیہ جس لڑکے کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھی وہ اس کے ایس ایم ایس مشغلے کی دریافت تھا دونوں کی دوستی موبائل فون پر ہوئی تھی اور آج بات اتنی بڑھ گئی تھی کہ وہ شادی کے لیے اس کے علاوہ کسی کا نام نہیں سننا چاہتی تھی۔

لڑکا کون تھا، کس خاندان سے تھا کیا کرتا تھا اور کس طرح کے کردار کا مالک تھا گھر والوں کے

نزدیک یہ سب سوال اہم تھے مگر سعدیہ کی ہٹ دھرمی نے گویا سب کی عقل ماؤف کر دی تھی۔

صوفیہ اس سارے قصے میں محض خاموش تماشائی تھی گو کہ اس کی موجودگی میں عموماً خاموشی ہی اختیار کی جاتی تھی شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ مسئلہ ابھی گھر کے سرپرستوں کی نظروں سے اوجھل تھا۔

تائی اور چاچی اسے اپنے انداز سے حل کرنے کی کوشش میں تھیں نعمان اور سعدیہ کے درمیان جانی دشمنی کا آغاز بھی ہو چکا تھا دراصل وہ بہت سارے دنوں سے سعدیہ کے معمولات پہ نظر رکھے ہوئے تھا بالآخر جب وہ معاملے کی تہ تک پہنچ گیا تو مفصل رپورٹ لے کر دونوں ماؤں کے سر پر سوار ہو گیا۔

''آپ لوگوں کو اندازہ بھی ہے سعدیہ کس دلدل میں جا پھنسی ہے وہ لڑکا نیچ ذات کا آوارہ مزاج لڑکا ہے۔ بس سگریٹ کے لمبے لمبے کش لے کر دوستوں میں شو مارتا رہتا ہے اور انہی دوستوں سے وہ اپنی محبت کی داستان بھی شیئر کر رہا تھا جو میں نے سن لی تھی۔''

''گویا تم بھی ان کے دوستوں میں شامل ہو۔'' صوفیہ نے سن کر سوچا تھا۔

''آپ لوگ کچھ نہیں کر پائیں گے وہ ایک دن اس گھر سے چلی جائے گی۔''

''تو کیا کریں برادری سے باہر اس کی شادی کر کے ناک کٹوالیں۔'' تائی نے تنک کر کہا تھا۔

''آپ کی برادری کون سی اتنی اعلیٰ اور دولت مند ہے جو ناک کٹ جائے گی.....'' وہ ان سے زیادہ تنک مزاج تھا چچی کا سر مزید جھک گیا سعدیہ نے اس کا سارا طنطنہ خاک میں ملا دیا تھا۔

''پسند بھی کیا تو کس کو..... گھٹیا خاندان کا بھلا ہم لوگوں سے کیا کہیں گے ہمارا داماد گانے بجانے والوں میں سے ہے۔''

انہیں تو بس یہ ہی فکر ستائے جا رہی تھی باقی اس کے روزگار اور رہن سہن سے کوئی غرض نہیں تھی۔

وہ اسٹیج پر شو وغیرہ کرتا تھا شادی بیاہ کی محفلوں میں گانے بجانے کے ساتھ اس کے چچا ابا وغیرہ کا اپنا بینڈ بھی تھا۔

جسے اب لوگ شاذ و نادر ہی شادی یا دیگر تقریبات میں انوائٹ کرتے تھے۔

نئے دور کے تقاضے بھی نئے تھے اب وقت بدلنے کے ساتھ موسیقی سننے اور بجانے کے معیار میں بھی فرق آ چکا تھا لوگ پاپ بینڈ اور راک میوزک کی طرف متوجہ تھے ان کے نزدیک لوک گیتوں اور میوزیکل دستوں کا دور ماضی کی دھول بن چکا تھا۔

جس طرح اس دیسی موسیقی کی وقعت نہیں رہی تھی اسی طرح اس سے وابستہ خاندان بھی کسمپرسی کا شکار تھے۔ ان کے گھر کے مرد اس پیشے سے جڑے ہوئے تھے اور عورتیں آج بھی اپنے گھروں میں مقید وقت بدلنے کا انتظار کر رہی تھیں۔

سعدیہ ایسی ہی ایک کم فہم عورت بننے جا رہی تھی۔ صوفیہ نے سوچا تو جانے کیوں جھرجھری سی لے کر رہ گئی بہر حال عورت ہونے کے ناتے وہ اپنی اس عم زاد سے ہمدردی کر سکتی تھی جس نے انتخاب بھی کیا تو قسمت چکمہ دے گئی۔

نعمان چھت کے ایک کونے میں بیٹھا سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا تھا بجلی نہ ہونے کے باعث صوفیہ بھی اپنے کمرے کی گھٹن سے گھبرا کر باہر نکل آئی تھی۔ آج نیچے غیر معمولی سناٹا تھا چچا رات ہی واپس آئے تھے اور صبح ہونے کے بعد گھر کے بہت سارے مسئلے ان کے گوش گزار کیے جا چکے تھے اب یہ خاموشی کسی بڑے طوفان کی اطلاع دے رہی تھی نعمان کے گھر میں موجودگی بھی یقیناً بلا جواز نہیں تھی اس نے صوفیہ کو دیکھ کر تازہ سلگایا ہوا سگریٹ مسل ڈالا اور اٹھ کر اس کے پاس آ گیا۔

☆.....☆.....☆

ہم سمجھتے ہیں محبت کے تقاضے لیکن
کیسے کوئی اس در پر بن کے سوالی جائے
یاد کرتے ہیں اسے تو یہ مجبوری ہے
حبس میں کیوں نہ بھلا تازہ ہوا لی جائے

وہ اس ستم گر کے شہر سے لوٹ آیا تھا تنہا تنہا.....دل جو اس کے دیار میں چھوڑ آیا تھا۔

دھیان کے ہر رستے پر بھی وہ چل رہی ہوتی تھی کبھی غصہ دکھا رہی ہوتی تھی اور کبھی خائف لہجے میں ساتھ چلنے کا سبب پوچھ رہی ہوتی تھی۔

اب بھلا ان ساری باتوں کے جواب میں اس کے پاس کہنے کے لیے صرف ایک لفظ ہوتا تھا محبت، محبت.....

جسے وہ زیر لب دہرا کر یوں ہونٹ بھینچ لیتا تھا جیسے کوئی گستاخی ہو گئی ہو۔

اور گستاخی تو اس دل نے کر ہی ڈالی تھی پہلے اس کی آواز کے زیر و بم میں الجھا پھر اس کے چہرے کے دلکش خال و خد پر یوں مر مٹا جیسے وہ اسی کی تو منتظر تھی اس کی آنکھوں میں بسنا چاہتی تھی صرف اسی کے خیالوں پر حکمرانی کے لیے بے چین تھی۔

مگر ان سب میں سے کچھ بھی نہیں تھا خزیمہ عادل نے خولہ کمال کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا اور اس نے پیشکش مسترد کر دی تھی۔

''میں آل ریڈی کمیٹڈ ہوں۔'' اس نے بہت مختصراً کہا تھا اور خزیمہ عادل کے دل میں چھنا کے سے ہو گئے تھے۔

''نہیں ایسا ہو نہیں سکتا۔ میں نے آپ کا انتظار کیا ہے مدتوں۔'' وہ بے اختیار ہو گیا تھا۔

''مجھے اپنے فیصلے کرنے کے لیے کسی کی مداخلت کی ضرورت نہیں میں اپنی زندگی پر ہر طرح کا حق رکھتی ہوں۔

آئی ہوپ آپ مجھے تنگ نہیں کریں گے۔'' شائستگی سے بھرپور لہجہ ابھی بھی اس کی سماعتوں میں محفوظ تھا۔

اس کے باوجود وہ اسے یہاں آنے کے بعد بھی روزانہ ای میل کرنا نہیں بھولتا تھا۔

اور وہ جب سے اپنے گھر آیا تھا سامعہ کی معنی خیز نظروں میں بس ایک ہی سوال مچل رہا تھا منہ پھٹ تو تھی مگر عمر اور رتبے کا لحاظ اسے روکے رکھتا کہ وہ خزیمہ سے خولہ کے بارے میں پوچھے جو آج کل ریڈیو پروگرام بھی نہیں کر رہی تھی۔

خزیمہ کا دل چاہتا تھا چپکے سے اس کے کانوں میں ایک بار تو یہ سرگوشی کر لے کہ تمہارا بھائی خولہ سے مل کر آیا ہے۔

لیکن یہ سننے کے بعد وہ جس انداز سے پھر کیا ہوا کا راگ الاپتی اس کا جواب خزیمہ کے پاس بالکل نہیں تھا اس لیے وہ اس کی لطیف سی چھیڑ چھاڑ مستقل نظر انداز کر رہا تھا۔

''اماں آپ سمجھا لیں سامعہ کو مجھے مستقل تنگ کر رہی ہے۔'' آفس سے واپسی پر وہ نہا دھو کر فریش موڈ کے ساتھ اماں ابا کے ساتھ ان کی مخصوص نشست پر بیٹھا تھا کہ وہ خواہ مخواہ گلا کھنکارنے لگی۔

''لائیں بھیا! سر دبا دوں۔'' پیار کا یہ انداز بھی خطرے سے خالی نہیں تھا وہ یقیناً اس کے کانوں کے قریب ہونا چاہتی تھی۔

''پہلے بھیا کے لیے آم کاٹ کر لے آؤ پھر آ کر سر دبانا، کھانے پر بالکل توجہ نہیں دیتا شکل دیکھو مرجھا کر رہ گئی ہے دوسرے شہر میں بھی کہاں اپنا خیال رکھا ہوگا۔''

''دوسرے شہر میں اس کا خیال جو رکھا ہوگا۔'' سامعہ جاتے جاتے بڑبڑائی اور وہ ایک گہری سانس لے کر اماں کی طرف متوجہ ہو گیا جو رات کے کھانے کے لیے سبزیاں کاٹ رہی تھیں۔

ابا ہمیشہ کی طرح اپنی اخباری دنیا میں مگن تھے اپنے خوبرو بیٹے پر ایک آدھ اچٹتی سی نگاہ ڈالنے کے بعد بظاہر تو اخبار میں مصروف تھے لیکن ذہن دوسری جانب پرواز کر رہا تھا۔

''اٹھائیس سال کا ہو جائے گا خزیمہ بھی۔''

''ابا آج کی اہم خبر کیا ہے.....'' وہ اپنا ذہن ہلکا کرنے کے لیے ان کی توجہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔

''خبریں تو وہی پرانی ہیں.....البتہ یہ رپورٹ دل دہلا دینے والی ہے۔''

''کون سی رپورٹ.....'' اماں متجسس ہوئیں۔

''ہندوستان آج بھی سیکولر اسٹیٹ نہیں۔'' انہوں نے سرخی پڑھی تھی۔

''پھر ظلم کر رہا ہوگا مسلمانوں پر.....'' وہ ایک گہری سانس لے کر رہ گئیں۔

''ہندوستان میں مسلمان کبھی بھی محفوظ نہیں تھے بھائی صاحب نے جب اپنا کاروبار بمبئی منتقل کیا تھا میں نے تب بھی ان کی مخالفت کی تھی مگر وہ اس زمین کو چھوڑنے کی ہمت نہیں کر سکے اکثر سوچتا ہوں کس حال میں ہوں گے وہ اور ان کے بچے.....فون پر خیریت کے دو لفظ سن کر دل خوش تو ہو جاتا ہے مگر بھائی کے دل کی بات سنے مدت بیت گئی۔''

ابا اخبار ایک طرف رکھ کر یاسیت سے کہہ رہے تھے ان کے افسردہ چہرے پر ماضی کے کربناک دنوں کا عکس لہرا رہا تھا انہوں نے قیام پاکستان کے وقت ہجرت کا دکھ نہیں جھیلا تھا اسی زمین سے دل لگانے کی کوشش کی تھی جہاں ان کے آباؤ اجداد دفن تھے مگر پھر حالات قابو سے باہر ہو گئے مسلمان جہاں کہیں بھی تھے زیر عتاب تھے تب انہوں نے ہجرت کی ٹھانی تھی اپنا ہنستا بستا گھر اور علی گڑھ یونیورسٹی میں پڑھانے کا خواب چکنا چور کر کے وہ آج سے تیس سال پہلے کراچی چلے آئے تھے۔

جس مٹی سے خمیر اٹھا ہو اسے اجنبیت کی نگاہ سے دیکھنا آسان نہیں ہوتا مگر وقت اور حالات کے تقاضے سے مجبور ہو کر انہوں نے یہ دکھ بھی سہا اور سب سے بڑی خلش تو اس بات کی تھی کہ ابھی بھی ان کا ایک بھائی اور ایک بہن ہندوستان کے شہری تھے۔ اور اس تیس سال کے عرصے میں وہ صرف ایک بار ان سے مل سکے تھے وہ بھی خود ان کی اپنی کوششوں سے ورنہ بھائی وہاں اپنی زندگی میں خاصے مگن اور مسرور تھے نئی نسل میں رشتے ناتوں کی معلومات تو تھی مگر ملنے کی چاہت اس طرح نہیں تھی جس طرح ابا کا دل اپنے بھائی یا بہن سے ملنے کے لیے ہمکتا تھا۔

کبھی کبھی تو کسی معصوم بچے کی طرح ان کی آنکھیں نم ہو جاتیں تب اماں ڈھارس بن جاتی تھیں۔

''آج آپ بھائی صاحب کو فون کر لیں.....اور تفصیلی بات کریں۔''

وہ اپنے رفیق حیات کا ملول چہرہ کبھی نہیں دیکھ سکتی تھیں فوراً خزیمہ کو کارڈلیس فون لانے کا اشارہ کیا تھا۔اس نے بھی تعمیل کی سامعہ آم پلیٹوں میں سجائے بیٹھی تھی۔

اس کا ذہن اس وقت مکمل کسی افسانوی کہانی میں الجھا ہوا تھا تیس سال بعد تایا کے بچوں سے ملاقات.....

کوئی شادی شدہ تو کوئی غیر شادی.....

کوئی بالی وڈ کا فلم پروڈیوسر اور کسی اپنے کی تلاش میں مصروف.....تایا بیٹی کی شادی کے لیے پریشان.....اس کی نظریں خزیمہ پر جا ٹھہریں ابا فون ملا رہے تھے اور وہ لاحول پڑھ کر آم کے چوکور قتلوں کی طرف متوجہ ہوگئی جو اس نے بڑی نفاست اور محنت سے کاٹے تھے۔

☆.....☆.....☆

اُم ایمان قاضی کا بہت خوبصورت نیا ناول

سانسوں کے اس سفر میں

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

ندا حسنین کا بہت خوبصورت نیا ناول

عشق نگر کے مُسافر

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

کمال ولا میں ہر طرح کی پارٹیز کا اہتمام ہوتا تھا کبھی کاک ٹیل پارٹی۔ کبھی بزنس پارٹی۔
اور کبھی تو صرف ڈانس پارٹی جس میں بے باکی کے ایسے مظاہرے دیکھنے کو ملتے تھے جو دل و نگاہ میں ہیجان برپا کر دیتے تھے لیکن شمائلہ اب بے حس ہو چکی تھی۔
دوسروں کی تھاپ پر منیر کمال کا ساتھ ضرور دیتی تھی مگر اس کے اندر کی مورنی مر چکی تھی جو اپنی قسمت پر نازاں ہو کر محبوب کی خوشنودی کے لیے دیوانہ وار ناچتی ہے۔
آج کی یہ ڈانس پارٹی سرمد احمد بخاری کے اعزاز میں رکھی گئی تھی۔ وہ مڈ ایسٹ میں کئی ہوٹلوں کا مالک تھا اور اب اس کا ٹارگٹ مارکیٹ کراچی کے ساحل تھے جہاں نئے شہر آباد کرنے کے منصوبے سرکاری فائلوں کا حصہ بن چکے تھے۔
سرمد احمد بخاری گزشتہ کئی سالوں سے منیر کمال اور شمائلہ کو شرف میزبانی بخش رہا تھا شمائلہ کو دیکھ کر اس کا کشادہ چہرہ مزید سرخ ہو کر چمکنے لگتا تھا اور اس کے مضبوط جسم میں چیونٹیوں کا رقص شروع ہو جاتا۔
وہ خوبصورت جسم اور دلکش چہروں کا شائق تھا اور ہر بار اس کی احتیاج کمال ولا میں پوری ہو جاتی۔
منیر کمال خاص طور پر اس کی آؤ بھگت کرتا تھا اور شمائلہ کو بھی خصوصی تاکید تھی۔
اس وقت بھی وہ شمائلہ کمال کا ہاتھ تھامے ڈانسنگ فلور کی طرف بڑھ رہا تھا جلتی بجھتی روشنیاں تیز میوزک اور عریاں جسم اس شب کی سیاہی میں مزید اضافہ کر رہے تھے جو کمال ولا کے وسیع و عریض بیس منٹ میں سر شام ہی اپنے پر پھیلا کر بین کرنے لگی تھی۔
''کیا بات ہے بے بی..... اتنی سست کیوں ہو رہی ہو۔'' وہ اس کے نیم عریاں شانوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مست لہجے میں بولا۔
''ناٹ فیلنگ ویل.....'' سلور نگینوں والی سیاہ میکسی میں وہ دہکتا ہوا انگارہ لگ رہی تھی لیکن سرمد احمد بخاری نے اس کی بیزاریت کو محسوس کر کے ڈانسنگ فلور کی طرف جانے کے بجائے غیر ملکی مشروبات

کے کاؤنٹر کی طرف رخ کر لیا تھا دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے منیر کمال کے سامنے سے بھی گزرے تھے مگر اس کی توجہ ایک نئی لڑکی کی جانب تھی جو ڈری سہمی کونے میں کھڑی تھی۔

''بیٹھتے ہیں کچھ دیر بہت دن ہوئے ہم نے دل کی باتیں نہیں کیں وہ تمہارا بزنس پارٹنر اپنے چکروں میں ہی الجھائے رکھتا ہے۔''

سرمد احمد بخاری نے موٹی سی گالی دے کر منیر کمال کی طرف اشارہ کیا تھا۔ جو نئے چہرے کو اس محفل کے اسرار و رموز سکھا رہا تھا۔

''کم آن سرمد..... وہ میرا شوہر ہے۔'' وہ زبردستی مسکرائی۔

''ایک آدھ کنٹریکٹ مجھ سے بھی کر لو کیا فرق پڑتا ہے ایک سے دو شوہر ہو جائیں۔''

اس کی مسکراہٹ تو بہت دلکش تھی مگر مکروہ ارادے کی وجہ سے شمائلہ کمال کے تن بدن میں کئی چھید کر گئی تھی وہ ذرا خفگی سے اسے دیکھنے لگی۔

''اچھا بھئی..... سرکار برا مان جاتے ہیں اس لیے کوئی اور بات کرتے ہیں..... یہ بتاؤ انڈیا کے ٹور کا کیا پروگرام ہے کب نکلنے کا ارادہ ہے۔'' وہ اب اس کے مہنگے کاسمیٹکس سے سجے چہرے پر فطری خوبصورتی کھوج رہا تھا۔ بلاشبہ اس کا حسن آج بھی مدہوش کر دیتا تھا۔

''میں تھک گئی ہوں سرمد کچھ دن کا آرام چاہتی ہوں صرف اپنے ساتھ رہنا چاہتی ہوں..... ان سب جھمیلوں سے دور۔'' وہ اس سے اپنے دل کی ہر بات کر لیا کرتی تھی۔

''تو ٹھیک ہے میرے ساتھ کیپ ماؤنٹ چلو..... میں ایک مہینے کا ٹرپ رکھ لیتا ہوں تفریح بھی ہو جائے گی اور بزنس بھی۔'' وہ اسے اس طرح کی آفرز دیتا رہتا تھا اور شمائلہ انکار بھی نہیں کرتی تھی۔ دونوں کی ملاقات چھ سال پہلے دوبئی کے ایک کلب میں ہوئی تھی اور بے تکلفی ہر ملاقات میں بڑھتی گئی تھی۔

''سوچتی ہوں.....'' اس کی نظریں اس ڈرے سہمے چہرے پر جمی تھیں جو شاید آج پہلی بار اس

محفل میں آئی تھی اس کا ساتھی کسی اور کے ساتھ مگن تھا اور وہ.....

''سوچو مت.....اپنے شوہر کو بتا دو فی الحال فارغ نہیں ہوا ایک لمبے ٹور پر جا رہی ہو وہ کسی اور سے کام چلا.....'' اور وہ کسی اور سے کام چلاتے دیکھ کر ہراساں تھی۔ شاید یہ اس کی زندگی کا پہلا تجربہ تھا اس لیے.....

''ہاں اسے کیا فرق پڑتا ہے اس بار اس نے بالکل تازہ مال تھائی لینڈ سے منگوایا ہے۔'' وہ خباثت کے انتہائی درجے کو چھو رہی تھی اس کے چہرے پر کاروباری مسکراہٹ تھی۔

''اچھا..... مجھے تو نظر نہیں آ رہا.....آج تو سارے دیسی نمونے وقت پاس کرنے کے لیے جمع کیے ہیں تم لوگوں نے.....اسٹینڈرڈ مین ٹین رکھو.....'' وہ گویا بے زار سا تھا ان ساری حسیناؤں سے جو اس ایک رات کے لیے جانے کتنا لمبا سفر طے کر کے یہاں پہنچی تھیں۔

''وہ تمہاری نیکسٹ پارٹی کے لیے.....رات ہی تو ان کی آمد ہوئی ہے۔''

شمائلہ اپنے گلے میں لٹکے نیکلس کی جھالروں سے کھیل رہی تھی۔ اس وقت اس پر بازار کی عورت کا گمان ہوا۔

''کہاں اسٹے ہے ان کا.....'' اس کی آنکھوں میں چمک سی جاگی تھی ہوس اور گوشت خوری کی.....

''زیادہ دور نہیں.....کہا نا مل لینا کل یا پرسوں۔'' اس نے ٹالا۔

''نہیں ابھی ملنا ہے.....'' اس کے خون میں چیونٹیاں رینگنے لگی تھیں۔

''ابھی کیسے بھئی سو گئی ہوں گی بے چاریاں۔''

''تو اٹھ جائیں گی سرمد بخاری کے لیے تم چلو تو سہی.....''

''کہا نا سرمد.....ابھی تو یہ پارٹی اپنے جوبن پر ہے اور دیکھو نا تمہاری پسند کا عربی میوزک پلے کیا گیا ہے چلو اوپر چلتے ہیں۔'' وہ اسے ٹال رہی تھی مسلسل۔

''اٹس او کے تمہارا موڈ نہیں تو نہ سہی..... میں تو تمہارا تابعدار ہوں.....'' وہ دلربائی کا مصنوعی

مظاہرہ کر رہا تھا۔ شمائلہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی ابھی تھوڑی دیر کی بات ہے وہ کسی بے جان جسم سے دل بہلا رہا ہوگا اس کے چہرے پر کئی تہوں والی نقاب چڑھی ہوئی تھی اور شمائلہ کو بھی اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ وہ کون سے نقاب سے دل بہلا رہی ہے۔ وہ تو بس اتنا جانتی تھی کہ سرمد احمد بخاری ان کا سب سے بڑا خریدار تھا اور وہ حساب کتاب میں بلا کا کھرا اور کاروباری آدمی تھا اس کے ساتھ کام کرنے کا مزا ہی اس کے پروفیشنلزم کی وجہ سے ہی آتا تھا۔

''آج تم کوئی ڈرنگ نہیں لے رہیں..... کیا پرہیز کر رہی ہو۔'' اس نے منیر کمال کو اشارہ کر کے اپنے پاس بلایا تھا اور ساتھ میں دو گلاس بھی۔

وہ تھوڑی ہی دیر میں کسی تابعدار کی طرح چلا آیا تھا۔

''سرکار آج موڈ کیوں بگڑا ہے کوئی مستی شستی نہیں ہو رہی.....'' اس کا اشارہ جلتی بجھتی روشنیوں کی طرف تھا جن کی وجہ سے ہال کی دلکش آرائش کا تاثر وحشت میں بدل رہا تھا بار روم کے اس ہال میں لذت کی ہر چیز موجود تھی بس فرق یہ تھا کہ کسی چہرے کے لیے یہ عیاشی تھی اور کسی کے لیے مجبوری..... اور عورت کی مجبوری کبھی کبھی اس کے نصیب کی سیاہ بختی بھی ہوتی ہے جو اسے اس دلدل تک لے آتی ہے جہاں جسم کے ساتھ روح بھی ہوس کی کیچڑ میں لتھڑ جاتی ہے اور پھر ناکارہ وجود اس کے فریب میں دھنستا چلا جاتا ہے۔

یہاں کتنی لڑکیاں ایسی ہی تھیں جنہیں منیر کمال نے دبئی، شارجہ میں اچھی نوکری کا لالچ دے کر بے بسی کے اس مقام تک پہنچا دیا تھا۔ جہاں سے ان کے لیے واپسی کے تمام راستے بند ہو چکے تھے..... وہ تو جینا بھی نہیں چاہتی تھیں کجا کے معزز زندگی کے خواب دیکھتیں۔

لیکن منیر کمال معزز دنیا کا نمائندہ بن کر عورتوں کی عزتوں کے سودے کرتا تھا وہ انسانوں کے اس جنگل میں عورتوں کا سب سے بڑا سوداگر تھا۔ جس نے سب سے پہلے اپنی نیک سیرت بیوی کو اس کروہ

کاروبار کا حصہ بنانے کی کوشش کی اب یہ اس کی قسمت اچھی تھی یا منیر کمال کی بدبختی جاگ گئی تھی بہر حال کچھ تو ہوا تھا ایسا جس نے عابدہ کی غیبی مدد کی اور وہ اپنے نام نہاد شوہر منیر کمال کے چنگل سے بھاگ نکلی۔

وہ پہلا دھچکا تھا جس نے منیر کمال کے اندر سوئی ہوئی وحشت اور بربریت کو جگا دیا، وہ صرف درندہ بن گیا۔

اور آج تک کئی خاندانوں کی عزتیں اس کی درندگی کا شکار ہو چکی تھیں دو بار وومین ٹریفکنگ اور ہیومن اسمگلنگ کے الزام میں اسپیشل فورسز اور پولیس کے ہتھے بھی چڑھا گر اس کی پشت پناہی اتنے مضبوط ہاتھ کر رہے تھے کہ جنگل کا قانون اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکا اور وہ شہر کے معززین میں شامل ہو کر اپنا بزنس بڑھاتا رہا۔

اس کے اور شمائلہ کے درمیان بزنس کا اول اصول یہ ہی تھا وہ دونوں ایک دوسرے کی سرگرمیوں سے لاتعلق ہی رہتے تھے ہاں مگر شمائلہ کی موجودگی اس کی ضرورت پڑنے سے مشروط تھی۔

بین الاقوامی کنسرٹ ہوں یا ثقافتی میلے، کسی میوزیکل نائٹ کا اہتمام ہو یا پھر رقص و سرور کی محفل کا ان سب کی روح رواں ملک کی مایہ باز رقاصہ شمائلہ کمال ہوتی تھی جس نے آج تک اپنے فن کے مظاہرے کے عوض عزت، دولت، شہرت اعلا رتبہ بے مثال معیار زندگی سب کچھ وافر مقدار میں حاصل کیا تھا اور ابھی بھی وہ اپنے عروج کے دور سے گزر رہی تھی۔

اور جو لوگ ان دونوں کو اس، عروج تک لائے تھے ان سے وفاداری اس تماشا گاہ کا پہلا اصول تھا اسی اصال کے تحت منیر کمال سرمد احمد بخاری کی تواضع کے لیے خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتا تھا۔

آج کی پارٹی کا مہمان خصوصی چونکہ سرمد احمد بخاری تھا اس لیے وہ معززین کے درمیان راجہ اندر بنا ہوا تھا۔ شمائلہ اسے بھرپور کمپنی دے رہی تھی جس کا سبب محض کاروباری تعلق نہیں تھا بلکہ دونوں کی

ذہنی ہم آہنگی خوب تھی مینٹل کیمسٹری ایک ہونے کی وجہ سے دونوں ایک دوسرے کی قربت سے لطف اندوز بھی ہوتے تھے جسے منیر کمال جانتے بوجھتے نظر انداز کر دیتا تھا۔

اس وقت بھی اس کی بے نیازی کا یہ ہی عالم تھا وہ ان دونوں کے ساتھ اجنبیوں کے سے انداز، میں بیٹھا ادھر ادھر کے قصے سنا رہا تھا تب سرمد احمد بخاری نے آج کی دریافت کے بارے میں استفسار کیا۔

''تم نے کہا تھا..... ہیرا چن کر لائے ہو..... کب ملواؤ گے ہمیں.....''

''آپ حکم تو کریں ہیرا آپ سے زیادہ فاصلے پر نہیں..... وہ دیکھیں۔''

منیر کمال نے معنی خیز نگاہوں کے ساتھ ایک تنہا بیٹھی لڑکی کی طرف اشارہ کیا جو اپنے ساتھی سے ناراض ہو کر بیٹھی تھی وہ پہلی بار کسی ایسی محفل میں آئی تھی۔ اس کی آنکھیں حیرت اور خوف کے مارے کبھی ساکت ہو جاتیں کبھی بند۔

وہ جس کے ساتھ نائٹ پارٹی کا مزا لینے آئی تھی وہ کسی ماہر رقاص کی طرح کبھی ایک لڑکی تو کبھی دوسری لڑکی کو اپنی بانہوں کا جھولا دے رہا ہوتا..... شاید انہی باتوں سے خائف ہو کر وہ فلور سے نیچے اتر آئی تھی سرخ رنگ کی گھیر دار فراک اور تنگ ٹراؤزر میں اس کا فربہی مائل جسم سرمد احمد بخاری کی شاطر نگاہوں نے لمحوں میں دیکھ لیا تھا اس کے چہرے پر برائے نام سا میک اپ رہ گیا تھا باقی وہ بے چینی کے سبب اپنے ہاتھوں سے صاف کر چکی تھی۔

اس کے بھرے بھرے گراز ہونٹ گہری لپ اسٹک کی چکنائی سے محروم ہو چکے تھے بس سرخ رنگ نظر آ رہا تھا۔

آنکھوں میں سراسیمگی اور چہرے پر غیر معمولی خوف کا تاثر لیے وہ خوش گپیاں کرتے مصنوعی قہقہے لگاتے میک اپ زدہ چہروں کے درمیان منفرد تو نظر آ رہی تھی مگر اس کا، اعتماد ہوا ہو چکا تھا کیونکہ وہ زندگی میں پہلی بار اس نئی دنیا کے انوکھے ماحول سے آشنا ہو رہی تھی۔ سرمد احمد بخاری چند لمحے اسے دیکھتا

رہا..... یہ تو واقعی اس کی پسند کا مال تھا وہ ایسی لڑکیوں کو بہت پسند کرتا تھا جو ڈری سہمی خوف سے چیخیں مارتی کبھی اس سے رہائی مانگ رہی ہوتیں اور کبھی اپنی نجات کے لیے اس کے مرنے کی دعا.....

اس کے لہو میں سیاہ خونخوار کتوں کی دوڑ شروع ہو چکی تھی وہ ان دونوں میاں بیوی کو چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

وہ اس سے پہلے کبھی ایسے لوگوں میں نہیں بیٹھی.....

اس نے زندگی میں پہلی بار مرد اور عورت کا یہ روپ دیکھا تھا۔

اسے ہال میں بیٹھے خوبصورت اور باوقار چہرے کسی ڈرامے کا کردار لگ رہے تھے۔

اور ڈانسنگ فلور پر ناچتے عریاں جسم کسی بے ہودہ فلم کے مناظر..... وہ جلد از جلد اس اذیت ناک ماحول سے نکلنا چاہتی تھی..... یہ اس کے چہرے پر واضح لکھا تھا۔

سرمد احمد بخاری اس کے پاس چلا آیا۔ حسب عادت اس کا کندھا چھو کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔

''ہائے..... بے بی کیا نام ہے تمہارا۔''

''جی۔'' وہ ہڑبڑا کر کھڑی ہو گئی اور متلاشی نگاہیں ڈانسنگ فلور کے ایک کونے پر جا ٹکیں۔

''میں سرمد ہوں اور تم۔'' اس بار وہ ہاتھ مصافحہ کے لیے آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

وہ ذرا سا جھجکی مگر پھر منیر کمال کے سکھائے آدابِ محفل یاد آ گئے۔ پسینے سے بھیگا ہوا ہاتھ سرمد احمد بخاری کے مضبوط ہاتھ میں دیتے ہوئے اس کے حلق سے بمشکل آواز نکلی تھی۔

''میں سعدیہ ہوں.....'' وہ جھوٹ بولنا چاہ رہی تھی مگر عادت نہیں تھی اپنی پہچان بدلنے کی اور نہ ہی آج تک اس کی ضرورت پڑی تھی۔

''گڈ..... سعدیہ تم بور ہو رہی ہو شاید اس شور ہنگامے سے آؤ میں تمہیں اچھی سی ڈرنک پلواتا ہوں۔''

وہ انتہائی ہینڈسم سوٹڈ بوٹڈ، آج کی محفل جا سب سے شاندار بندہ خود اس کے پاس چل کر آیا تھا اور اب ڈرنک کی آفر کر رہا تھا۔ اس کے اندر فطری خود نمائی کے جذبے نے جلدی سے سر ابھارا خوف کی لہر دب گئی۔

وہ ذرا سا مسکرائی ڈانسنگ فلور کی طرف دیکھا ہنوز وہی ماحول تھا۔

''کم آن..... انجوائے دا پارٹی..... لیٹس ڈانس ود می۔'' اگلی پیشکش پر وہ متحیر سی رہ گئی۔

''میں اور آپ کے ساتھ ڈانس.....'' بمشکل لہجے کی بوکھلاہٹ پر قابو پایا۔

''وائے ناٹ..... کم ود می۔'' وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولا اور اس کے قدم خود بخود اس کے ساتھ ہو لیے۔

سعدیہ رحمت اللہ باعزت، شریف اور تمام عمر روایتوں پر مر مٹنے والے گھرانے کی خواب دیکھنے والی احمق سی لڑکی کے قدم دلدل کی طرف جاتے ہوئے بار ہا لڑکھڑائے مگر اسے اپنے محبوب نما ساتھی پر اس قدر غصہ تھا کہ وہ اس کو تاؤ دلانے کے لیے سرمد احمد بخاری کا ہاتھ تھامے آگے بڑھتی چلی گئی۔

تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد آنکھوں کے آگے اندھیرا بھی چھانے لگتا حلق میں کانٹے بھی پڑنے لگتے اور ماؤف ذہن کے کسی گوشے میں پوری شدت کے ساتھ دستک بھی ہوتی۔

''یہ میں کیا کرنے جا رہی ہوں۔

مجھے یہ سب تو نہیں کرنا تھا۔

میں تو اظہر کے ساتھ آئی تھی۔

اس نے کہا تھا میں تمہیں پارٹی میں لے کر چل رہا ہوں۔

ایسی دنیا تم نے ان بند گھروں اور تنگ گلیوں میں کہاں دیکھی ہوگی۔

لیکن یہ کشادہ اور پر رونق دنیا تو.....''

اس کی چھٹی حس چیخ رہی تھی۔

کچھ غلط ہونے کا احساس مستقل دلا رہی تھی لیکن پسینے میں بھیگا ہوا اس کا ہاتھ جس شخص نے پکڑ رکھا تھا وہ لمحوں میں اس سے اتنا زیادہ مرعوب ہو گئی تھی کہ اظہر کو بھول کر اس کے ساتھ بڑھتی چلی گئی تھی۔

حالانکہ ڈانسنگ فلور پر تو اظہر بھی لے کر گیا تھا مگر اتنے مشاق اور پھرتیلے لوگوں کے درمیان اس

کے قدم ہلنا تو دور کی بات سانس لینا بھی محال لگ رہا تھا۔لیکن پتا نہیں سرمد احمد بخاری نے کہاں سے اتنی ہکت دے دی تھی کہ وہ اس کے ساتھ نا تجربہ کاری سے ہی سہی مگر موسیقی سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کرنے لگی تھی۔

دو باقی لڑکے لڑکیوں کی طرح میوزک کی ہر تال پر نہیں تھرک سکتی تھی لیکن انڈین فلموں کو شوق سے دیکھنے کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ سرمد بخاری کے پہلو میں سمٹ آنے کے بعد خود کو ملائکہ شراوت سے کم نہیں سمجھ رہی تھی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا سرمد بخاری جیسے ہینڈسم خوشبوؤں میں بسے ہوئے مرد کو اتنی ساری حسین وجمیل لڑکیوں میں وہ ہی کیوں نظر آ گئی تھی اور اپنے پاس بیٹھی میڈم کو بھی نظر انداز کر کے اس کے پاس آ گیا تھا۔

اس نے بار ہا پُر حاسد نگاہوں سے اس چمکتی دمکتی میڈم کو دیکھا تھا اور دل میں اپنی کم صورتی کا احساس پختہ ہونے کے ساتھ عجیب سی خواہش نے بھی سر ابھارا تھا۔

''کیا میں بھی اس عورت کی طرح اتنا خوبصورت لباس، اتنی قیمتی جیولری پہن سکتی ہوں۔

وہ تو بالکل کہیں کی ملکہ لگتی ہے اگر مجھے اپنی زندگی کو اپنی مرضی سے چننے کا آپشن ملے تو میں بھی ملکہ بنوں گی.....

دنیا کی ہر نعمت میرے سامنے ڈھیر ہوگی اور میں بھی اس میڈم کی طرح گردن اکڑائے سب کو حکم دیتی پھروں گی.....

اف کتنی اچھی زندگی ہوگی وہ..... نہ ابا کا خوف نہ اماں سے ڈر اور نہ تائی سے صلواتیں..... سب لوگ میرے آگے پیچھے پھریں گے اور یہ نعمان کا بچہ..... وہ تو سب سے پہلے جل جائے گا۔

میری جاسوسی کرتا ہے..... بدمعاش کہیں کا۔''

اس نے بیٹھے بیٹھے کئی خواب دیکھ لیے تھے۔

ان گنت خواہشوں کے جال بنتے بنتے وہ سرمد بخاری کے کانٹے میں یوں پھنسی کہ یہ بھی بھول گئی تھی کہ اسی فلور پر اظہر بھی ناچ رہا ہے۔ جس کے ساتھ آ کر اس نے آج اپنے گھر کے اصول توڑے تھے اپنی روایتوں کو جوتے کی نوک پر رکھا تھا۔

اپنے خاندان کی عزت کو سر بازار رسوا کرنے کا ہر خوف پس پشت ڈال کر وہ اس کا ہاتھ تھام کر نکل پڑی تھی ان دیکھے ان جانے جزیروں کو دریافت کرنے.....

گھر والوں کی نظر میں تو وہ اپنی کسی دوست کے گھر میں رات رکنے گئی ہوئی تھی لیکن ان کی شرافت اور خاندانی نجابت کا چاند جس انداز سے چڑھنے جا رہا تھا اس کے آثار ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے۔

''سنو تم کہاں سے آئی ہو؟'' سرمد بخاری نے بڑے مست بے خود لہجے میں پوچھا تھا تو وہ زمانے کے سرد و گرم سے بے نیاز اس بھولے بھالے چہرے کو بڑی پر شوق نگاہوں سے تک رہا تھا۔

اس کی گھاگ نگاہوں نے لمحوں میں جان لیا تھا کہ یہ پکا ہوا پھل ہے بڑے شوق سے جھولے میں آن گرے گا۔

اس کے نم ہاتھوں سے لپکتے شعلے، اس کے گھبرائے ہوئے چہرے پر نمی کے ننھے منے قطرے اور شرمیلی سی مسکراہٹ۔

سرمد بخاری کو اوائل جوانی کے ان دنوں میں لے گئی تھی جب وہ ہر خوبصورت چہرے کا شیدائی تھا اور ان کی معصومیت کو پامال کرنے کا عاشق۔

''میں اظہر کے ساتھ آئی ہوں۔ وہ یہ معلومات فراہم نہیں کرنا چاہتی تھی مگر جلد بازی میں منہ سے نکل گیا۔

''اظہر تمہارا بوائے فرینڈ ہے یا۔'' پتا نہیں اس کی آنکھوں میں کیسا تیکھا سا احساس تھا کہ وہ اپنے

آپ میں سمٹ سی گئی۔

لمحے پھر کے لیے شریف خون نے بھی کروٹ لی مگر پھر سرمد بخاری نے اس کی کمر کے گرد گھیرا تنگ کیا تو وہ اظہر کی بے نیازی پر کھولتے ہوئے خون کے ساتھ اس کے قریب ہوتی چلی گئی۔

"بے غیرت، ذلیل، کمینہ، عیاش....."

وہ بڑبڑائی تھی تب ہی سرمد بخاری قہقہہ مار کر کہا تھا۔

"وہ بے غیرت نہ ہوتا تو تم میرے پاس کیسے ہوتیں..... اور مجھے تو تمہاری جانے کب سے تلاش تھی....."

اس کی نگاہوں اور لہجے سے محض عامیانہ پن جھلک رہا تھا۔ مگر سعدیہ کو گہرائی میں جانے کی کیا ضرورت تھی اس کے لیے یہ ہی کافی تھا کہ وہ اظہر کو اس کی اوقات یاد دلا رہی تھی۔

"دو کوڑی کا منحوس آدمی..... مجھے یہاں رسوا کرنے لے کر آیا تھا..... میرا سودا کرنے آیا تھا میں تو اس کو وہ کر کے دکھاؤں گی کہ آئندہ وہ گھر سے نکلتے ہوئے سو بار سوچے گا۔"

وہ گاہے بگاہے اظہر کو دیکھتے ہوئے اسے کوس رہی تھی۔ اظہر نے بے نیازی کا مظاہرہ کیا تھا کہ شاید یہ اس کی نوکری کی مجبوری تھی۔

وہ ان گھنٹوں میں صرف دوسروں کو تفریح فراہم کرنے اور انہیں خوشیاں دینے کا پابند تھا۔ اس کا اپنی ذات پر حق اس وقت ختم ہو گیا تھا جب وہ اپنے ڈانس گروپ کے ساتھ اس عالیشان عمارت میں داخل ہوا تھا۔

شہر کے اب معززین کی پارٹی میں وہ آج پہلی بار آیا تھا اس سے پہلے وہ ہوٹل پارٹیز کے لیے مستقل بک تھا۔

وہاں بھی یہ ہی سب کچھ ہوتا تھا۔

جوا، شراب اور عورت.....

ان کی آڑ میں بڑے بڑے تجارتی معاہدے اور فیصلے البتہ یہاں یہ سب کچھ ایک مشہور عورت کی نگرانی میں ہو رہا تھا اسے حیرت ہو رہی تھی۔

وہ سعدیہ کو ایک کلچرل ڈانس پارٹی کی تفصیلات بتا کر یہاں لایا تھا۔

سعدیہ اس کی زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی نہیں تھی جو اس کی چکنی چپڑی باتوں میں آ کر ان محفلوں کا حصہ بنی تھی۔ اس سے پہلے بھی وہ یہ کام معقول کمیشن کے تحت کر چکا تھا۔

اس کا کام بس اتنا ہی ہوتا تھا کہ وہ معصوم سادہ لوح لڑکیوں سے دوستی کرتا پھر انہیں اپنی محبت کے دام میں گرفتار کرتا کوئی تو بہت جلد ان محفلوں کا حصہ بن جاتی اور پھر اظہر کبھی اس کی طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھتا اور کوئی سعدیہ کی طرح چکنا گھڑا ثابت ہوتی۔

اس بار سعدیہ کے ساتھ اس کا سلسلہ لمبا چلا تھا موبائل فون کے ایس ایم ایس سے بات کرنے کا عرصہ ہی خاصا طویل تھا۔ شروع شروع میں وہ بالکل گھاس نہ ڈالتی تھی اور اظہر کو بھی ضد ہو گئی تھی.....

اظہر نے پہلی بار اس کو اپنے ایک درزی دوست کی دکان پر دیکھا تھا وہ اپنے کپڑوں کا ناپ دے رہی تھی اس کا بے تکلفانہ اور پر اعتماد انداز خاصا متاثر کن تھا اس کے ذہن میں کئی پروفیشنل لڑکیوں کے متناسب جسم گھوم گئے۔

ایک بار اس کے استاد نے کہا تھا۔

"یہ کیا تو سوکھی سڑی لڑکیاں لاتا ہے ذرا موٹی تازی لایا کر گاہک خوش ہو جاتا ہے۔"

تب سے وہ اپنے استاد کی خواہش پوری کرنے کے لیے موٹی تازی گائے کی تلاش میں تھا اور یہ تلاش آج ختم ہوئی تھی سعدیہ استاد کی ہر ڈیمانڈ پر پوری اترتی تھی۔

اس کے بعد باقی کے مراحل طے کرنا مشکل ضرور تھے ناممکن نہیں۔

سعدیہ کا تعلق جس گھرانے سے تھا وہاں پردے کی پابندی کے ساتھ اور بھی بہت ساری پابندیاں تھیں۔ جن سے سعدیہ خائف تھی اس نے سب سے پہلے برقعہ اتار کر اپنے خاندان کی روایتوں سے انحراف کیا تھا۔

برقعہ اترا تو کپڑے بھی اس کی مرضی سے سلنے لگے۔

وہ تنہا بازار چلی جاتی۔

ماں اور تائی کی نہ نہ کے باوجود سہیلیوں سے ملنے کا پروگرام بن جاتا۔

ان کے گھروں پر رات کو رک جاتی۔

پتا نہیں صحبت کا اثر تھا یا مزاج ہی ایسا لے کر پیدا ہوئی تھی۔ کسی بات کو انکار کر دو وہ کر کے دم لیتی تھی۔

تعلیم کی کمی، تربیت کا فقدان، یا پھر گھر کے منتشر نظام کے اثرات.....

وہ ذہنی و اخلاقی کجی کے کسی رویے کو غلط نہیں مانتی تھی۔

اظہر کے ساتھ دوستی کرتے ہوئے بھی اس کے پاس یہ دلائل موجود تھے کہ مجھے اپنی زندگی اپنے انداز سے جینے کا حق ہے اور کسی کو پسند کرنا کوئی گناہ نہیں لیکن اس نے کسی کی اس بات کو کبھی غور سے نہیں سنا تھا کہ پسند کے لیے وہ راستہ اختیار کرنا چاہیے جو اخلاقیات کے دائرے پر پورا اترتا ہو شاید یہ سب کچھ بتانے والا کوئی تھا ہی نہیں اور نہ ہی کبھی اس پر اتنا اعتبار کیا گیا کہ وہ اپنے گھر میں کسی کو دوست سمجھ کر زندگی میں آنے والی اس نئی تبدیلی سے آگاہ کرتی۔

بہر حال کچھ بھی اس کے حق میں نہیں تھا نہ اس کے گھریلو حالات اور نہ ہی اظہر.....

اظہر کی آنکھوں میں اسے اپنا چہرہ نظر آتا تھا، وہ اسے سامنے بٹھا کر پر شوق نظروں سے تکتا رہتا تھا۔

وہ اسے بارہا یہ یقین دلا چکا تھا کہ تم میری زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی ہو اور تم میری عزت ہو، میں تمہیں اپنی دلہن بناؤں گا تمہارے سوا میں کسی کو اپنی زندگی میں شامل کرنے کا تصور نہیں کر سکتا.....

یہ سب کچھ تواتر کے ساتھ سننے کے بعد سعدیہ کو اس پر اندھا یقین ہو گیا تھا اور اس یقین کے سہارے وہ اس کے ساتھ ہر جگہ چلی جاتی تھی اس یقین کی ڈور پکڑ کر وہ آج کی اس پارٹی میں چلی آئی تھی بقول اظہر اس طرح کی گیدرنگ مقدر والوں کو ملتی ہے۔ شہر کی کریم وہاں جمع ہو گی اور ان کے سامنے مجھے پرفارم کرنا ہو گا کیا پتا کسی بڑے شو کا چانس بن جائے اور پھر دیکھنا دنوں میں ہماری قسمت بدل جائے گی اور ہم بھی وہ زندگی جئیں گے جو ان دولت مند، خوبصورت لوگوں کا مقدر ہوتی ہے۔

''میں تمہارے ان گراز ہاتھوں کو ہمیشہ اتنا ہی نرم اور شفاف دیکھنا چاہتا ہوں تمہارے اردگرد خوشیاں ہی خوشیاں ہوں میں تمہیں محروم زندگی نہیں دینا چاہتا میری جان.....

میں نے پتا نہیں کیا کیا خواب دیکھ رکھے ہیں۔ ہم شادی کے بعد یہاں نہیں رہیں گے ہم دونوں کے ستارے ملیں گے اور ہمارے مقدر جاگ جائیں گے۔''

ان گنت خوابوں کا سلسلہ تھا جو وہ بلا تکان اس کے سامنے دہرائے جاتا تھا اور سعدیہ شادی کے بعد خوش کن لمحات کے تصور میں دنیا میں ہی جنت کے مناظر ڈھونڈنے لگتی۔

دیوانی عمر کے پاگل پاگل خواب.....

جن کی تعبیر پانے کے لیے عورت کو ہمیشہ کچی عمر کی دہلیز پر کھڑے ہو کر ایک ہی جملہ سننا پڑتا ہے۔

''یہ چاؤ چونچلے شادی کے بعد کے لیے اٹھا رکھو.....''

اور پھر کبھی وہ یہ بھی سنتی ہے

''ارے اس عمر کی لڑکیاں بناؤ سنگھار کرتی اچھی نہیں لگتیں..... یہ تو اپنے مرد کے لیے اچھا لگتا ہے۔ عورت کا اصل آئینہ تو اس کے شوہر کی آنکھیں ہوتی ہیں۔''

اور پھر جب ایسے ہی خوابوں کی دنیا میں وہ من چاہا شخص لے جائے جسے دل و نگاہ نے شوہر کے طور ہر چن لیا ہو تو پھر اس کی ہر بات پر بلا سوچے سمجھے یقین کرنے کو دل چاہتا ہے۔

اسی یقین کی وجہ سے آج وہ اظہر کو طنزیہ نگاہوں کے حصار میں لیے سرمد بخاری کی بانہوں کے گھیرے میں کھڑی تھی۔

اظہر نے چند لمحے اپنی نگاہیں اس کی طرف مرکوز کی تھیں مگر پھر جلد ہی ماحول کے اثر میں چلا گیا تھا۔

شاید یہ ہی وہ لمحہ تھا جب اس کا دل گہرے پاتال میں ڈوبتا چلا گیا تھا۔

وہ کیا سوچ کر آئی تھی اور کہاں کھڑی تھی۔

اس کی عقل نے کام کرنا شروع کیا تھا تو پیروں تلے زمین بھی کھسکنا شروع ہو گئی تھی۔

کہیں تو کچھ غلط ہونے جا رہا تھا اور جو کچھ آج تک ہوا تھا وہ بھی ٹھیک نہیں تھا۔

یہ وہ اظہر نہیں تھا جو اس کے لیے پاگل تھا اس کے حسن کے قصیدے پڑھتا تھا جس کے ماں باپ اس کے گھر پر آئے تھے اور جس کے لیے اس نے گھر والوں کے ساتھ بغاوت کا آغاز کر دیا تھا۔

یہ تو کوئی گھٹیا اور کم ظرف انسان تھا۔

جس کی محبت ایک دوسرے شخص کے گھیرے میں تھی اور وہ بے نیاز بنا اپنے دھندے میں مگن تھا۔

''بے غیرت..... کہیں کا۔'' اس نے ایک موٹی سی گالی دی تھی۔

''کچھ کہا تم نے.....'' امپورٹڈ شراب کی باس اس کے نتھنوں میں بے رحمی سے گھس گئی تھی۔

''نہیں تو..... میں مزید نہیں کر سکتی..... نیچے جا کر بیٹھ جاؤں۔''

اسے ابکائیاں سی آنے لگی تھیں۔

ٹی وی اسکرین پر نظر آنے والا یہ خوبصورت ماحول جانے کیوں اتنا بدبودار تھا کہ اس جادک متلانے لگا تھا۔

وہ اظہر کی غیرت کو جگانے اپنی خودنمائی کے جذبے کو تسکین دینے کے لیے یہاں تک تو آ گئی تھی مگر اب برداشت جواب دے گئی تھی۔

اپنی رسوائی کے صدمے سے زیادہ اظہر کی بے حسی نے نڈھال کیا تھا۔

یہ وہ اظہر نہیں تھا جو ٹیلر شاپ پر گھنٹوں اس کا انتظار کرتا تھا جو میٹھی میٹھی باتیں کرتے ہوئے بڑے شوق سے اس کا ہاتھ تھامتا تھا..... جو آنکھوں میں زمانے بھر کی شوخیاں سمیٹ کر اسے دیکھتا تو وہ کیف و سرور کے انوکھے احساس سے دوچار ہو جاتی۔

کیا اس کی وارفتگیاں جھوٹی تھیں.....

کیا اس کی آنکھوں سے پھوٹتی جذبوں کی روشنیوں میں کھوٹ تھا کیا وہ ایک فریب تھا.....

اور سب سے بڑا ستم کے وہ اس فریب نظر کا شکار ہو گئی۔

وہ یہ سب سوچتے ہوئے یکدم چکرا کر سرمد بخاری کی بانہوں میں جھول گئی تھی۔

اس نے سعدیہ کو گرنے نہیں دیا تھا اور اظہر یہ منظر دیکھ چکا تھا اس لیے جان بوجھ کر رخ موڑ گیا۔

سرمد بخاری سے پہلے منیر کمال اوپر پہنچ گیا اور برا سا منہ بناتے ہوئے سعدیہ کو ہوش میں لانے کی کوشش کی مگر وہ کہاں اتنی آسانی سے ہوش میں آنے والی تھی۔

سرمد بخاری کو اس ڈری سہمی خوفزدہ لڑکی سے ہمدردی ہو چلی تھی۔

"اسے گیسٹ روم میں پہنچاؤ..... میں آتا ہوں....."

وہ منیر کمال کو حکم صادر کر کے بار روم کی طرف مڑ گیا تھا۔

ڈانسنگ فلور کی روشنیاں اب بھی اسی طرح جل بجھ رہی تھیں.....

کوئی کسی کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

سب اس بے روح دنیا میں ایک دوسرے کے گناہوں کا بوجھ بڑھا رہے تھے۔

کسی کے خواب کچلے گئے تھے.....

اور کسی کے نسلے جا رہے تھے.....

لیکن نہ کوئی شاکی تھا اور نہ ہی بے زار.....

ہاں مگر کمال ولا کے ایک جہازی سائز کمرے کے آرام دہ بستر پر آنکھیں بند کر کے پڑی سعدیہ کا ذہن ہی تاریکی میں ہچکولے نہیں کھا رہا تھا بلکہ اس کی قسمت کا ستارہ بھی تاریکیوں میں ڈوب گیا تھا۔ اس کے سورج نے روشنی کے بجائے دغا دے دیا تھا۔

وہ سوچنے سمجھنے جی صلاحیت سے قاصر آنکھوں کے کنارے سے بہتے نمکین پانی کی فراوانی پر حیران اگلے کسی بے رحم لمحے کی منتظر تھی۔

☆.....☆.....☆

اس دن اپنے بھائی سے بات کر کے بہت خوش ہوئے تھے ایک مدت بعد ان کے چہرے پر اپنوں کی طرف سے طمانیت کے رنگ بکھرے تھے۔

وہ خوشی خوشی بیوی بچوں کو بتا رہے تھے۔

"بھائی صاحب ہم سب سے ملنے کے لیے بے چین ہیں اس بار سردیوں میں وہ پاکستان آئیں گے۔"

"ابا ان کے بچے بھی آئیں گے۔" سامعہ سے صبر نہیں ہوا تھا۔

"بچے سارے اپنے گھر بار کے ہو گئے ہیں سب سے چھوٹی ارم ہے شاید اس کو لے آئیں اور پتا ہے تیری پھوپھی کا بھی پروگرام بن رہا ہے پر ابھی فائنل نہیں ہوا اس کی بیٹی کی شادی ہے عید پر..... اس کے بعد ہی کچھ سوچے گی۔"

انہوں نے تفصیل سے آگاہ کیا تو اماں کا چہرہ بھی اندرونی مسرت سے چمکنے لگا خوش تو سامعہ بھی تھی مگر زیادہ نہیں۔

کوئی افسانوی سین کری ایٹ ہونے کا چانس ہی نہیں تھا۔ وہ کچن میں برتن سمیٹتے ہوئے ایک بار پھر خولہ کے بارے میں سوچنے لگی۔

اس کی انٹرنیٹ فرینڈ خولہ اور اس کے بھائی کی اولین پسند خولہ.....

اب یہ خولہ کہاں چلی گئی۔ اور بھیا بھی تو کچھ نہیں بتاتے مگر جب سے وہاں سے آئے ہیں چپ چپ سے ہیں.....کوئی نہ کوئی بات تو ضرور ہے مگر کچھ بولیں بھی تو اور میں پوچھوں گی تو ڈانٹ لازمی.....

وہ اپنی بے لگام سوچوں کے ساتھ چائے کا کپ لے کر خزیمہ کے کمرے میں پہنچ گئی تھی۔

اس کی نظریں حسب عادت کمپیوٹر اسکرین پر جمی تھیں اور سامعہ نے بھی جلدی سے ان باکس کا جائزہ لے ڈالا تھا۔

''بھیا! ایک بات پوچھوں اب صبر نہیں ہوتا۔'' وہ واقعی مشکل میں تھی خزیمہ کے چہرے پر مدہم مسکراہٹ بکھر گئی۔

وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ سامعہ کیا پوچھے گی اور یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا پوچھنے کے بعد چپ ہو کر بیٹھ جائے گی۔

پھر نہ کوئی سوال ہوگا اور نہ ہی کہیں سے بڑبڑاہٹ سنائی دے گی۔

''پوچھو بچہ.....جو کچھ پوچھنا ہے آج پوچھو۔ کل میرے پاس ٹائم نہیں۔'' وہ فنی انداز میں بولا۔

''بھیا! آئی ایم سیریس.....'' اس نے احتجاجاً کی بورڈ پر ہاتھ مارا۔

''آئی ایم ڈیم سیریس.....ڈیئر.....''

''آپ کو پتا ہے مجھے کیا پوچھنا ہے زیادہ ڈرامے نہ کریں اور مجھے پاگل نہ بنائیں جلدی سے بتا دیں.....آپ کو خولہ کیسی لگی.....؟''

وہ بیچ کے سارے سوال گول کر کے صرف مطلب کی بات تک پہنچ گئی تھی ہمیشہ کی طرح.....اس کا مسئلہ بھی بڑا معصوم سا تھا ناقابل علاج.....

سوچتی بہت کچھ تھی اور بولتے وقت سب بھول جاتی تھی سوائے آخری لائن کے ی بھی اس کی

مہربانی تھی اگر وہ آخری بات بھی بھول جاتی تو کوئی کیا کر سکتا تھا۔

''میں تو خولہ سے نہیں ملا.....اور نہ ہی ملنے کی کوشش کی.....میں تو صرف اس کا فین ہوں اس کی اچھی آواز کا اچھی سوچ کا.....''

وہ رسانیت سے بولا اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔

''یہ کب سے ہوا؟'' سامعہ کے چہرے کو صدمے نے گھیر لیا تھا۔

''میری پگلو! یہ تو ہمیشہ سے تھا.....تم پتا نہیں کیا کہانیاں بنا لیتی ہو.....کم رسالے پڑھا کرو.....''

وہ خاصا سنجیدہ تھا سامعہ اس کے سامنے سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

''بھیا! آئی ڈونٹ بلیو.....'' اس کا اصرار خزیمہ کو بہت اچھا لگا تھا اس لیے ایک گہری سانس لے کر چائے کے کپ پر جھک گیا تھا۔

''بھیا! آپ مذاق کر رہے ہیں نا.....آپ خولہ سے ملے ہیں.....آپ نے اس کو دیکھا ہے نا.....''

وہ مان ہی نہیں سکتی تھی کہ جو کچھ ابھی خزیمہ نے کہا وہ سچ ہے اس نے اپنے خوبرو بھائی کے چہرے پر ان شوخ رنگوں کی برسات ایک بار نہیں کئی بار دیکھی تھی جو خولہ کے ذکر پر بکھر جاتی تھی۔

وہ اس سے سب کچھ چھپاتے ہوئے بھی کچھ نہیں چھپا پایا تھا۔

کبھی دھیرے سے ہنس پڑتا اور کبھی اس کو پاگل کہہ کر اپنے پاگل پن کا اعتراف بھی کر لیتا۔

لیکن آج تو وہ بالکل بدلا ہوا محسوس ہو رہا تھا بجھا ہوا تو وہ اس دن سے تھا جس دن سے اسلام آباد سے واپس آیا تھا۔

پہلے تو سامعہ سفر کی تھکان اور گھر والوں سے پہلی بار دوری کا احساس سمجھ رہی تھی اماں کا تو خیال تھا کسی نے اس کا وہاں خیال نہیں رکھا اس لیے مرجھا گیا ہے لیکن سامعہ کو آج احساس ہو رہا تھا کہ کہیں کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔

''بھیا کیا وہ کوئی حبشن یا ریڈ انڈین ہے۔''

اپنی دانست میں اس نے معلومات کا اظہار کیا تھا، بھلا اور کیا مسئلہ ہو سکتا تھا۔

اور سامعہ کے اس سوال پر خزیمہ کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

''وہ کوئی حبشن بھی ہوتی تو.....'' اس کی نگاہوں میں کومل سے روپ والی سجل سی اداوالی وہ دلربا سی لڑکی آ گئی تھی جس کو دیکھنے کے بعد اس نے سوچا تھا۔

زندگی میں اگر یہ نہیں تو کچھ نہیں، جس سے بات کرنے کے بعد اسے احساس ہوا تھا کہ اب تک جو جی لیا اس کا ملال نہیں لیکن اب تو شرط زندگی یہ ہے۔

پھر جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تو اس کا دل چاہا بھاگتا ہوا اس کے پیچھے جائے اور کہے۔

دیکھو میرا دل کہتا ہے تم ہی وہ لڑکی ہو جس کی کھوج میں، میں ایک عمر سے تھا۔ تم تو راستہ بھی ہو اور منزل بھی..... تمہیں دل نے دیکھ کر کہا کہ تم تو حاصلِ دعا ہو میں نے اتنی شدتوں سے نہ کبھی کسی کی تمنا کی اور نا ہی کسی کو اپنی سوچوں میں جگہ دی۔

تمہاری آواز کے تاروں نے دل کو چھیڑا تھا اور آج جب نگاہوں نے تمہارے سجیلے روپ کو چھوا ہے تو دل انوکھی سی ضد پہ آمادہ ہو گیا ہے۔ وہ صرف وصرف تمہاری دسترس میں جانا چاہتا ہے تمہاری رضا سے.....

مگر پھر.....

اسے جلد ہی پتا چل گیا کہ نئی نویلی چاہت کو قبولیت کا اعزاز نہ ملے تو ساری عمر کا ساون کیسے دل کی زمین پر ٹھہر جاتا ہے۔

مہربان سایہ دار بادل اپنے ساتھ کسی طوفان کی گھن گرج لے آتے ہیں اور لمحوں میں خوش رنگ خوابوں کے محل تاراج ہو جاتے ہیں۔

اس نے کہا تھا۔

''میں آل ریڈی کمیٹڈ ہوں۔'' اس کی آنکھوں اور چہرے پر یہ سب کہتے ہوئے گہری اجنبیت کے سائے تھے۔ وہ چند لمحوں کے لیے ساکت ہوا اور پھر کچھ بھی کہے بغیر پلٹا تو قدموں میں صدیوں کی تھکن اتر آئی تھی۔

وہ تو ابھی صرف میری زندگی کے دریچوں میں روشنی کی نوید بن کر اتری تھی ابھی تو اجلی خواہشوں اور گلاب خوابوں کا سلسلہ شروع ہونے کو تھا۔

اور.....

سارے خواب بکھر گئے.....

سارے روشن منظر اندھیروں کی سفاکیوں میں اتر گئے۔

شاید.....ساری غلطی اسی کی تھی وہ کیوں گماں کو حاصل سمجھ بیٹھا تھا۔

سوچ کی مضبوط طنابوں سے گروندہ بناتے ہوئے یہ بھی نہ سوچا کے تیز آندھیاں حقیقتوں کے نشان مٹا دیتی ہیں.....

یہ تو پھر انجانے خوابوں کے گھروندے تھے.....

اس نے گہری خاموشی کے بعد سر اٹھایا۔

سامعہ ابھی بھی حیران نگاہوں کے ساتھ جواب کی منتظر تھی۔

''وہ کسی کے ساتھ کمیٹڈ ہے.....''

''اوہ.....'' اس کی آنکھوں میں تاسف، الجھن اور پھر ملال کے آثار نمودار ہونے لگے۔

''بھیا! آپ اس سے ملے۔''

''ہاں میری قسمت نے مجھے اس سے ملایا سر راہ اتفاقاً.....''

''کیسی ہے وہ.....'' اس کا اشتیاق فطری تھا وہ ہنس پڑا۔

''پاگل.....اب جیسی بھی ہے ہماری کچھ نہیں ہو سکتی اس لیے یہ چیپٹر کلوز کر دو کوئی اور بات کرتے ہیں.....''

وہ خود کو سنبھال چکا تھا ان لمحوں کی تلاش سے باہر آ چکا تھا جو ذہن کے گوشے میں مستقل ڈیرا ڈال کر بیٹھ گئے تھے۔

''پھر.....'' سوچ میں ڈوبی ہوئی آواز خزیمہ کو اپنے اندر کی ترجمان لگی۔

''پھر یہ کہ..... مجھے بہت سارا کام نبٹانا ہے تم میری جان چھوڑو تا کہ میں یکسوئی کے ساتھ کچھ فائلیں مین ٹین کر سکوں اور ہاں اب یہ چیپٹر کلوز ہو چکا۔ ہم کبھی اس موضوع پر بات نہیں کریں گے اور ویسے بھی وہ ہماری دوست نہیں تھی ہم زبردستی اس کو دوست بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہے نا.....''

خزیمہ نے مدہم سی مسکراہٹ کے ساتھ گفتگو تمام کی اور کپ اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے ہلکی سی چپت اس کے سر پر لگائی تا کہ وہ صدمے سے باہر آ جائے جو اس کے چہرے سے عیاں تھا۔

دونوں بہن بھائی جذباتیت میں ایک دوسرے کا پرتو تھے۔ محبت، اپنائیت، خلوص اور سچائی جیسی صفات کے ساتھ دونوں ہی اس دور کے نایاب لوگوں میں شمار ہو سکتے تھے لیکن ابھی تک وقت اور حالات کی کسوٹی پر کسی نے ان کی یہ خصوصیات پرکھنے کی کوشش نہیں کی تھی شاید اسی لیے اپنی ذات کے اہم ہونے کے ادراک سے نہیں گزرے تھے۔

☆.....☆.....☆

عاشر اور کاشف ہاسپٹل پہنچے تو نانو کی حالت خطرے سے باہر تھی اور انہیں آئی سی یو سے پرائیویٹ روم میں منتقل کیا جا رہا تھا۔

عاشر کے لیے یہ دکھ بھی کم نہیں تھا کہ ہمیشہ اسے اپنی آغوش میں چھپانے والا یہ مہربان وجود اس وقت دوسروں کے سہارے کا محتاج تھا وہ آئی سی یو کے کھلے دروازے سے باہر آنے والی یخ بستہ ٹھنڈک

سے عجیب سا خوف محسوس کرتے ہوئے ایک ستون کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

ہاسپٹل کے اس کوریڈور میں اس وقت راجہ صاحب، کشمالہ، خولہ، کاشف اور خدیجہ سب ہی تھے مگر اسے کسی کی ضرورت نہیں تھی۔ سوائے نانو کے..... جن کے چہرے پر گہری چپ کا پہرہ تھا اور بند آنکھیں نجانے کیوں ہر احساس سے عاری محسوس ہو رہی تھیں۔

نرسز اور ڈاکٹرز نے بڑی مستعدی کے ساتھ انہیں مشینوں کی قید سے آزاد کر کے پرائیویٹ روم تک منتقل کیا تھا اور تمام لوگوں کو ریلیکس رہنے کا مشورہ دیتے ہوئے تاکید کی تھی کہ ان کے ارد گرد شور کرنے ہجوم بڑھانے کی ضرورت نہیں تب ہی سب سر جھکائے باہر آ گئے تھے بس کشمالہ ان کا ہاتھ تھام کر وہیں بیٹھی رہ گئی تھی۔

اس لمحے وہ سب سے بڑی دیوار تھی جو عاشر کو نانو کی قربت سے روک رہی تھی۔

اس کا دل چاہ رہا تھا وہ ان کے ملائم ہاتھوں کو تھام کر بیٹھ جائے ان کے خاموش چہرے سے باتیں کرے اور پوچھے کہ وہ کون سا طوفان تھا جو آپ کے حوصلوں کو امتحان میں ڈال گیا۔

''آپ کو تو عادت سی ہے آزمائشوں پر پورا اترنے کی، مگر اس بار کیوں ٹوٹ گئیں.....''

''آپ مجھے بتائیں گے نانو کو کیا ہوا تھا.....'' وہ ان سے مخاطب نہیں ہونا چاہتا تھا مگر ہار گیا۔

.....اس وقت وہی اس کرب سے نکال سکتے تھے۔

''عاشر بیٹے مجھے اندازہ ہے تمہاری تکلیف کا لیکن میں کچھ نہیں بتا سکتا کہ یہ سب کیسے ہوا مجھے تو کشمالہ نے فون کیا اور جب میں گھر پہنچا تو وہ دونوں انہیں ہاسپٹل لے کر آ چکی تھی۔''

راجہ طارق محمود کا دل چاہا کہ اپنے اس معصوم چہرے والے لمبے چوڑے بیٹے کو بانہوں میں چھپا لیں مگر وہ ان سے اس قدر فاصلے پر کھڑا ہو کر بات کر رہا تھا کہ یہ ممکن نہ تھا۔

''آپ کو تو پتا ہے نا وہ کتنی بہادر ہیں اور اس سے پہلے انہیں کبھی بلڈ پریشر کی بھی پرابلم نہیں ہوئی

وہ ماشاءاللہ سے میری یاداشت میں کبھی ڈاکٹر کے پاس نہیں گئیں اور اب یہ ہارٹ اٹیک.....'' وہ کسی طور پر مطمئن نہیں ہو پا رہا تھا۔ راجہ طارق نے اسے بغور دیکھا اور فکر مند سے ہو گئے۔

وہ نجانے کیوں بے نام سی الجھن میں مبتلا تھا کئی بار دل چاہا کسی سے پوچھ ہی لے بیگم شمائلہ کمال تو نہیں آئی تھیں مگر ہمت نہیں ہوئی۔

''آپ جانتے ہیں بیٹے اب ہماری زندگیوں میں ہونے کے لیے کچھ نیا رہا نہیں ہے گئے وقتوں میں اذیت کے سنگریزوں نے بارہا لہولہان کیا ہے۔''

ان کی آنکھوں کے کنارے سرخ ہونے لگے تھے۔ عاشر نے دانستہ رخ موڑ لیا۔ وہ ان کی بہت ساری اذیتوں کا حصہ دار اور درد کا اکلوتا گواہ تھا مگر اپنی تنہائی کے ایک، ایک لمحے میں ان کی یاد سے شکوہ کناں بھی رہا تھا اس لیے بھولتا نہیں تھا۔

''جب آپ اپنی بیٹیوں کو اپنے ہونے کا اعتبار دے سکتے تھے ان کے دکھوں میں ساتھ اور سکھوں میں اعتماد دے سکتے تھے تو میرے لیے کیوں اپنی توجہ کا ہر روزن بند کر دیا۔''

یہ تو اس نے اپنے شعور کی دہلیز پر قدم رکھنے کے بعد سوچا تھا ورنہ بچپن تو ہر آہٹ پر ان کے ہونے کا یقین ٹوٹتے گزر گیا تھا۔

''عاشر!'' انہوں نے اس کے مضبوط کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا جس کی ہتھیلی سے نکلنے والی تپش اس سرد ماحول میں اسے بہت اجنبی محسوس ہوئی تھی۔

''مجھے پتا ہے وہ تمہاری ماں بھی ہیں اور باپ بھی دوست بھی اور اس دنیا میں سب سے طاقتور رشتہ بھی.....لیکن خوشی کی خبر یہ ہے کہ ان کا اٹیک مائنر تھا اور اب وہ خطرے سے باہر ہیں اس وقت وہ دواؤں کے اثر میں پرسکون نیند سو رہی ہیں۔''

''انہیں اس حالت میں سب سے زیادہ سکون کی ضرورت ہے.....اور مجھے پتا ہے ان کا سارا

سکون میرے اس بیٹے کے پاس ہے۔"

وہ کندھے سے تھام کر اس کا رخ اپنی طرف موڑ چکے تھے عاشر نے سر جھکا کر ان کے چہرے پر آنے والی مدہم سی مسکراہٹ کو نظر انداز کیا اور جوتے کی نوک سے سفید ٹائلوں کے درمیان بچھی شیشے کی قطار کریدنے لگا۔

اس کی ہٹ دھرمی آج بھی قائم و دائم تھی اس کے چہرے پر لگا تھا وہ ان سے بہت ناراض ہے اور راجہ طارق محمود فوراً اس کی تائید بھی کرتے تھے۔

آخر وہ ان سے ناراض نہ ہو تو پھر کس سے ہو۔

"تمہارا حق بنتا ہے تم بھی مجھے اتنا ہی نظر انداز کرو جتنا میں نے کیا تم بھی مجھ سے اتنا دور رہو جتنا میں رہا لیکن میرے پیارے بیٹے..... یہ زندگی بھی تو بہت مختصر ہے۔ اس ضد میں ختم ہو گئی تو بہت سے پچھتاوے رلانے کے لیے باقی رہ جائیں گے۔"

وہ اکثر سوچتے مگر کہنے کا موقع آج ملا تھا۔ عاشر نے ایک گہری سلگتی نگاہ ان پر ڈالی اور ایک بار پھر ان کے دل کی ہر صدا نظر انداز کر کے کاشف کی طرف مُڑ گیا۔

کاشف کی مشاہداتی قوت خاصی طاقتور تھی وہ چہرہ شناسی کا دعوا تو نہیں کرتا تھا مگر گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے کے بعد وہ انسانی نفسیات کے پرت کھولنے میں خاصا لطف محسوس کرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ باپ بیٹے کے چہرے سے اندازہ لگا چکا تھا کہ دونوں کی سرد گفتگو کا موضوع کم از کم نانو نہیں ہیں۔

"کیا بات ہے عاشر..... تمہاری الجھن کا سبب صرف نانو نہیں ہیں بلکہ وہ تو اب ٹھیک ہیں۔"

کاشف نے اس کا ہاتھ تھام کر کوریڈور سے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔

اس پراسرار خاموشی میں اپنی آواز کا ارتعاش بھی سماعتوں کے لیے بوجھل محسوس ہو رہا تھا۔

کشمالہ ابھی تک نانو کے کمرے میں تھی عاشر نے ایک اچٹتی سی نگاہ اس پر ڈالی اور کاشف کا

ہاتھ چھوڑ کر واپس راجہ صاحب کے پاس آ گیا۔

''آپ اپنی بیٹی سے کہیں، وہ میری نانو کے پاس سے ہٹ جائے مجھے ان کے پاس بیٹھنا ہے۔''

اس کے انداز میں بالکل بچوں والی ضد تھی..... پاس کھڑی خولہ نے بمشکل مسکراہٹ روکی وہ جب سے آیا تھا بے حد مضطرب تھا کبھی اس کی آنکھوں میں الجھن نظر آتی کبھی خفگی اور اس وقت تو اس کی بے تحاشا خوبصورت آنکھوں میں بس ایک ہی رنگ تھا نانو سے محبت بہت گہری محبت کا رنگ.....

خولہ نے یہ منظر بہت دلچسپی سے دیکھا اور محفوظ کر لیا۔ یہ شخص کشمالہ کی اولین پسند ہی نہیں چاہت بن چکا تھا۔

اس کا چہرہ اس کے نام پر گلابی ہونے لگا تھا۔

وہ کشمالہ کی خوشی بن چکا تھا۔

خولہ بھلا کیسے اس خوشی کے چہرے پر شکنیں دیکھ سکتی تھی۔ بھاگتی ہوئی کشمالہ کے پاس آئی۔

''تم نے جس اینگری مین کی نانو پر قبضہ کیا ہے وہ باہر بہت ناراض ہو رہا ہے..... خالی کر دو اس کی یہ جگہ ورنہ تمہاری خیر نہیں۔''

خولہ کی سرگوشی نے کشمالہ کے چہرے پر دھنک سی بکھیر دی تھی اس نے مسکرا کر دروازے کے باہر دیکھا وہ نظر تو نہیں آ رہا تھا مگر اس کے ہونے کا احساس بخوبی ہو رہا تھا۔

''کہہ دو اس سے جا کر کشمالہ جس چیز پر قبضہ کر لیتی ہے اسے چھوڑتی نہیں.....''

''مالا..... وہ ٹام کروز پارٹ ٹو تمہیں اٹھا کر پھینک دے گا چل اب یہ جگہ خالی کر اس کی باری ہے۔''

یہ سرگوشی قدرے بلند ہو گئی تھی کشمالہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا۔

''ہم دونوں ساتھ بھی تو بیٹھ سکتے ہیں بزدل کہیں کا مجھ سے نہیں، کسی انہونی کے ہونے سے بھاگتا ہے۔''

وہ شرارت سے مسکرادی۔

کشمالہ کو بھی اس ضد نے نئے لطف سے دوچار کیا تھا۔

خولہ نے ایک اور یادگار منظر کو آنکھوں کے راستے ذہن کے کسی گوشے میں محفوظ کیا اور چہرے پر مصنوعی بے چارگی طاری کر کے باہر آ گئی۔

''پاپا! مالا تو وہاں سے نہیں اٹھنے والی آپ بھی چلے جائیں.....''

''بس شور نہیں کیجیے اور کوئی گڑبڑ بھی نہیں۔'' وہ معصومیت سے بولی۔

عاشر کو ان دونوں بہنوں سے کبھی بھی کوئی سروکار نہیں رہا تھا اس لیے وہ اس تردد میں پڑتا ہی نہیں تھا کہ وہ کون سی ہے خولہ یا مالا.....

اور نہ ہی کبھی اس نے دونوں کو غور سے دیکھا تھا..... ہاں مگر ایک سیدھے لمبے بالوں والی لڑکی نے اس سے پہلے بھی بانو کے پاس اس کی جگہ پر قبضہ کر لیا تھا اور پھر وہی سیدھے بالوں والی لڑکی ایک اجلی روشن صبح کو اسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

وہ راجہ صاحب کو باور کرانا چاہتا تھا کہ وہ اور ان کی دونوں بیٹیاں نانو کے زخموں کو کریدنے آئی ہیں بہتر ہے کہ وہ لوگ اپنا ٹائم پورا کریں اور واپس چلی جائیں نانو ان کی موجودگی میں ان کمفرٹیبل ہیں۔

یہ اسٹریس ہی تو تھا جو انہیں ہاسپٹل بیڈ تک لے آیا۔

اس نے بمشکل اپنے احساسات کو لبوں کے اندر دبایا اور خولہ کو اپنے پاپا کی مضبوط بانہوں میں سمٹتے ہوئے دیکھ کر اس کمرے کی طرف مڑ گیا۔

جہاں اس کی مہربان آغوش، شفیق بانہیں اس کو سمیٹ لینے سے قاصر تھیں۔

وہ چپکے سے ان کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور ان کے دودھیا چہرے پر نگاہیں جما دیں۔

''نانو! مس یو..... آئی نیڈ یو.....''

اس کے لبوں سے ان جملوں کی تکرار اتنی خوبصورت لگ رہی تھی کہ کشمالہ سانسیں روک کر اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔

سرخ و سفید رنگت کشادہ پیشانی پر اس کے ہونے کی الجھن اور اس کے چہرے کا سب سے خوبصورت حصہ اس کی آنکھیں..... ہر طرف سے بے نیاز صرف اپنی نانو پر مرکوز.....

جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ بغور اسے دیکھ رہی تھی اور اسے دیکھنا بھی تو خود پر ظلم کرنے سے کم نہیں تھا۔

کبھی دل کنپٹیوں میں دھڑکنے لگتا اور کبھی ہتھیلیوں سے شرارے نکلنے لگتے۔ اور اسی تپش کی شدت اپنے چہرے پر محسوس کر کے عاشر نے اچانک نگاہوں کا زاویہ بدلا تھا۔

لمحہ بھر کے لیے دونوں کی خاموش نظروں نے ایک دوسرے سے کلام کیا تھا مگر اس کلام میں عاشر کی الجھن سوا نیزے پر پہنچ گئی تھی اور کشمالہ کی مٹھی میں ایک اور کیف آور لمحہ مقید ہو گیا تھا۔

اس نے نگاہیں جھکا کر اس ستم لمحے سے نکلنے کی کوشش کی لیکن دل کسی طور پر دستبرداری پر آمادہ نہ تھا۔ اور آمادہ ہوتا بھی کیوں اسے تو اس کھیل میں مزا جو آنے لگا تھا۔

''کیا کوئی آیا تھا.....'' وہ سوال جو وہ کسی سے نہیں کر سکا تھا کشمالہ سے پوچھ بیٹھا تھا سامنے دیوار کو مرکز نگاہ بناتے ہوئے.....

''نہیں کوئی بھی تو نہیں آیا، ان دو تین دنوں میں..... نانو تو بالکل ٹھیک تھیں ہم لوگوں کی تیاری مکمل تھی کہ اچانک یہ ہو گیا مجھے تو یہاں پر ہاسپٹل کا بھی اندازہ نہیں تھا اور نہ سمجھ میں آ رہا تھا کہ انہیں ایک دم سے کیا ہو گیا ہے.....

پھر خولہ نے اپنے کسی کولیگ کو فون کر کے اس ہاسپٹل کے بارے میں انفارمیشن لی تب ہم یہاں پر آئے۔

آپ کے پاس ڈرائیور بھی نہیں ہے اچانک کچھ ہو جائے تو..... بہت مشکل ہو سکتی ہے۔"

وہ تو جیسے منتظر بیٹھی تھی۔

عاشر نے اس دودھیا پیکر کو پہلی مرتبہ اتنے غور سے سنا تھا وہ تیز تیز بولتے ہوئے بالکل بھی اجنبی نہیں لگ رہی تھی اور نہ ہی اس کے لب و لہجے سے کسی بیگانگی کا احساس ہو رہا تھا۔

"نانو اکیلی ہوتی ہیں..... ان کے پاس فل ٹائم ڈرائیور اور کوئی کیئر ٹیکر ضرور ہونا چاہیے۔

خدیجہ اور اس کے ہسبینڈ نے کچن سنبھال رکھا ہے صرف..... سب سے بڑی بات کہ اس کو ڈرائیونگ نہیں آتی۔"

وہ نجانے کیوں اس کی کلاس لے رہی تھی۔ عاشر کو نہ تو اس کا بہت بولنا اچھا لگ رہا تھا اور نہ ہی اس انداز سے بے تکلف ہونا۔ لیکن جو وہ کہہ رہی تھی سب سچ تھا اس لیے سننا پڑا۔

"میں نانو سے کہہ چکا ہوں ان سب کے لیے مگر وہ مانتی ہی نہیں انہیں اس طرح کی لگژریز سے کوفت ہوتی ہے۔" اس نے جانے کیوں وضاحت پیش کی۔

"مگر یہ لگژریز نہیں ہیں ضرورت ہے اس گھر کی، آپ کی موجودگی تک تو ٹھیک تھا لیکن آپ کے جانے کے بعد..... پلیز سوچیے اس کے بارے میں....."

وہ دونوں مدہم آواز میں اس مسئلے کا حل ڈھونڈ رہے تھے جو آج کی تاریخ میں وجود میں آیا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے سالوں گزر گئے تھے دونوں کو اپنے اپنے معمولات کے دائرے میں گھومتے ہوئے اس طرح کا کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا تھا جو اس کمی کی طرف متوجہ کرتا۔

اس بے وقت کی بحث سے اتنا ضرور ہوا تھا کہ نانو کی آنکھوں میں ہلکی سی جنبش ہونا شروع ہو گئی تھی اور وہ بے داری کے تکلیف دہ مرحلے سے گزرنے کی کوشش میں پھر وہاں پہنچ گئی تھیں جہاں سے اس کرب کا آغاز ہوا تھا۔

ان کے نیم بے دار ذہن میں پھر انہی دو ناموں کی تکرار شروع ہو گئی تھی جنہیں ان کا سکھ آرام کبھی اچھا نہیں لگا تھا۔

وہ منیر کمال کو صرف شمائلہ کی وجہ سے جان پائی تھیں۔

اور جب اپنی بیٹی نے تربیت، محبت، خون کا رشتہ اپنائیت..... ہر جذبے کو جوتے کی نوک پر رکھ دیا تھا تو وہ منیر کمال سے کیا شکوہ کرتیں.....

کیوں کہتیں اس سے کہ ان کے گھر کی بنیادوں کو کمزور کر کے اس کی خوشیوں پر نقب لگانے والے صرف تم ہو.....

وہ اس سے کبھی نہیں ملیں اور نہ ہی ملنے کی تمنا کبھی دل میں جاگی۔

جب شمائلہ اور طارق کے اختلاف کا آغاز ہوا تو تب بھی شمائلہ کی دوستوں نے انہیں سمجھایا تھا کہ آپ منیر کمال سے بات کریں وہ ان دونوں کی زندگی سے دور چلا جائے نکل جائے تب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

پھر بھی ان کا دل نہیں مانا تھا۔

دل مانتا بھی کیسے..... جب شمائلہ ہی اس گناہ میں برابر کی شریک تھی تو وہ ایک غیر آدمی سے اپنے گھر کی خوشیوں کی فریاد کیسے کرتیں اور آج اسی غیر آدمی کی اولاد ایک مدت بعد ان کے گھر میں موجود تھی زندگی کی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ.....

ان سے مل کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ طارق کی بے رنگ بے مقصد زندگی کے لیے قدرت کا خاص انعام ہوں..... ان دونوں کا پیار ان کی ہر ادا سے جھلکتی سعادت مندی طارق کے زخموں پر مرہم رکھا کرتی تھی مگر یہ تو انہیں آج پتا چلا تھا وہ اپنے زخموں کو کھرچنے کا سامان ساتھ لیے پھر رہا تھا۔

منیر کمال کی دونوں بیٹیاں طارق محمود کی محبت، شفقت اور توجہ سمیٹ رہی تھیں کئی دنوں سے نہیں بلکہ کئی سالوں سے.....

ان کا ذہن مکمل بیدار ہو چکا تھا مگر وہ آنکھیں کھول کر کسی تکلیف دہ منظر کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ وہ جان چکی تھیں کشمالہ ان کے پاس کھڑی ہے۔

انہیں عاشر کی خوشبو اس کی بے چین آنکھوں میں تیرتی تفکر کی لہریں سب کچھ بند آنکھوں سے بھی نظر آ رہا تھا مگر ان کا دل چاہ رہا تھا وہ کچھ دیر یونہی بند آنکھیں کیے پڑی رہیں تا کہ ذہن بھی تاریکی میں ڈوبا رہے۔

روشنی میں ہر منظر بھیانک ہو کر ان کی ہمت پست کیے دے رہا تھا۔

انہیں شمائلہ کی بے غیرتی نے نہیں، طارق کے ظرف نے اندر تک توڑ دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

راحت جبین کا بہت خوبصورت نیا ناول

تتلی جیسا پیار

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

فرح بخاری کا بہت خوبصورت نیا ناول

کنارِ خواب جو

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

کشمالہ کمرے سے جا چکی تھی اور عاشر ان کا ہاتھ تھام کر کسی چھوٹے بچے کی طرح خوفزدہ اور ان کی آغوش میں سمٹنے کے لیے بے تاب بیٹھا ہوا تھا تب ہی انہوں نے آنکھیں کھولیں اور اپنے کمزور ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھام لیا۔

''عاشر بیٹے..... میری جان..... اتنا کیوں پریشان ہے۔''

ان کی آواز میں نقاہت نمایاں تھی عاشر کے دل پر چوٹ سی پڑی وہ ان کے اس انداز کا عادی نہیں تھا۔ وہ یا تو ان کی بارعب آواز میں ڈانٹ سنتا تھا یا پھر والہانہ لہجے کی گرمی محسوس کر کے اپنے لمبے چوڑے وجود کے ساتھ ان کی آغوش میں سمٹ جاتا تھا۔

''نانو آپ نے مجھے ڈرا دیا تھا آپ کی آنکھیں بند تھیں اور میری سانسیں.....'' اس کی بے چینی اس کے ہر عضو سے عیاں تھی زبردستی مسکرا دیں دھیرے سے۔

''بوڑھی ہو گئی ہے تیری نانو تھک گئی ہے بہت..... ابھی تو اس طرح کے جھٹکوں کا آغاز ہے جانتا ہے درخت جتنا سایہ دار اور تناور ہوتا چلا جائے اندر سے بھربھرانے لگتا ہے اور پھر ایک دن تیز آندھی اسے گرا دیتی ہے۔''

''نانو پلیز..... میں ہر طرح کے طوفان کا رخ بدل سکتا ہوں جو آپ کی طرف آئے آپ بس جلدی سے چیئر اپ ہو جائیں ہم گھر چل رہے ہیں.....'' وہ اس کے سرمئی بالوں میں نرمی سے انگلیاں چلانے لگا نانو نے اس بار اذیت سے بھاگنے کے لیے نہیں بلکہ سکون کو اپنے اندر محسوس کرنے کے لیے آنکھیں موند لیں۔ ان کی تمام عمر کا حاصل۔

عاشر عباس اور اس کی ذات سے وابستہ خوشیاں اور کامیابیاں ہی تو تھیں۔ وہ اپنے سارے دکھ سارے بے درد لمحے ایک طرف رکھ کر اس کی پر اعتماد، کامیاب اور خوشگوار زندگی کے لیے جب ڈھال بنیں تو انہیں گویا جینے کا مقصد مل گیا تھا۔

طارق کہتا تھا ایک مقصد آپ کے پاس ہے۔

اور ایک مقصد کے تحت میں جی رہا ہوں۔ مجھے کسی ساتھ کی تمنا نہیں..... ہماری زندگی میں اب کسی کی گنجائش نہیں۔

ان کی آنکھوں کے کنارے بھیگنے لگے۔

''منیر کمال اللہ تمہیں ذلیل و رسوا کرے اور شمائلہ..... تم تو رسوا زندگی جی رہی ہو، مرنے سے پہلے اپنے گناہوں کی توبہ کی مہلت ملے تو گنوانا مت..... شاید کے تمہاری عاقبت سنور جائے۔''

ان کا دل بین کر رہا تھا اور آنکھیں درد کے پانی میں ڈوب کر اپنے اردگرد سے بے نیاز ہو چکی تھیں انہوں نے ذرا سا گردن گھما کر عاشر کی جانب سے رخ موڑا اور پھر مدہم سی آواز میں کہا۔

''جا اپنے باپ کو بلا لا.....''

''وہ میرے کچھ نہیں لگتے۔ آپ مت مجھے یہ کاغذی رشتہ یاد دلایا کریں۔''

''کاغذی رشتہ تو مانتا ہے نا اور پھر وہ بھی میرا بیٹا ہے اس لیے تیرا کچھ تو لگتا ہے نا۔''

''آپ ہی رکھیں ان سے ہر رشتہ اور مجھے ان سے دور.....'' وہ آج بھی اپنی ضد پر قائم تھا یا پھر یہ ضد کشمالہ اور خولہ کی موجودگی میں زور پکڑ گئی تھی وہ اس کے مزاج کا ہر رنگ سمجھتی تھیں اس لیے کسی بات پر توجہ نہ دی۔

''اچھا میں خود ہی بلا لاتی ہوں باہر ہی تو ہوگا نا.....'' انہوں نے گویا اٹھنے کی کوشش کی.....

''نانو آپ بھی.....'' وہ یکدم ان کے کندھے کو نرمی سے سہارا دیتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

''بھیجتا ہوں..... پتا ہے مجھے وہ آپ کا بہت لاڈلا بیٹا ہے بہت پیار کرتی ہیں آپ اس سے۔ میرے حصے میں تو بچا ہوا ہی آتا ہے پہلے تو وہی آپ کی زندگی ہیں۔''

کس قدر معصوم شکوے تھے اس کے ان کی نظروں میں وہ نو دس سال کا عاشر گھوم گیا جو ماں اور

باپ دونوں سے دستبردار ہونے کا اعلان کر کے ان کے پاس چلا آیا تھا۔

''مجھے صرف نانو چاہیں.....''

تب ہی اس کی خوشیوں کی خاطر طارق محمود نے یہ وقتی جدائی کا سودا منظور کر لیا تھا تا کہ وہ یکسوئی کے ساتھ اپنے تعلیمی مدارج طے کر لے۔

شمائلہ نے تو خیر اس پر حق جتانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔

اس نے راجہ طارق محمود سے آزادی مانگی تھی نئی زندگی جینے کے لیے اور راجہ طارق محمود نے..... عاشر عباس.....

سو یہ سودا بغیر کسی جھگڑے کے طے پا گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

رات قطرہ قطرہ کر کے پگھل رہی تھی۔

کمال ولا کے ایک کونے میں سعدیہ کی زندگی کی بھیانک رات اس کے اعصاب منجمد کیے دے رہی تھی اور دوسرے کونے میں دن کا سماں تھا۔

رات کا وہ سور بیت چکا تھا جب جلتی بجھتی روشنیوں میں محض ڈانس کا دور چل رہا تھا اب ساری روشنیاں گل کر دی گئی تھیں۔

ڈانس فلور اور ہال روم میں صرف لائٹس نے پر اسرار سی روشنی پھیلا رکھی تھی اور اس پر اسرار ماحول میں گانے کے بول صرف ہیجان انگیز جذبات کو نہیں بڑھا رہے تھے بلکہ ان میں واضح طور پر یہ پیغام تھا کہ اپنے اپنے مطلب کی لڑکی پکڑو اور اندھیرے میں گم ہو جاؤ.....

اف یہ اندھیرا یہ تاریکی.....کون جانتا ہے رات کی اصل تاریکی اور اس تاریکی کا بھیانک روپ ان روشن راہداریوں والے کشادہ گھروں میں کتنا واضح ہوتا ہے۔

کم از کم سعدیہ آج سے پہلے یہ سب کچھ نہیں جانتی تھی اور نہ ہی اس نے کبھی کسی فلم میں اس طرح کے مناظر کو اس انجام تک پہنچتے دیکھا تھا۔

اور انجام.....وہ تھرا اٹھی تھی۔

پوری آنکھیں کھول کر اس نے نیم تاریک کمرے میں کوئی ایسا روزن تلاش کرنے کی کوشش کی جو اسے باہر کا راستہ دکھا دیتا۔

نئی زندگی کا پتا بتا دیتا مگر.....

کمرہ ساؤنڈ پروف بھی تھا اور تمام دروازے کھڑکیاں لاکڈ تھے وہ دیوانوں کی طرح ایک ایک کونا نوچ رہی تھی۔

چیخ رہی تھی مگر اس ہنگامے میں اس کی دردناک چیخوں کی پکار کون سنتا۔

پتا نہیں آج کی اس رات نے اور کیا کیا ظلم کرنا تھا اور کون کون سے روپ دکھانے تھے۔

وہ بے بسی کی انتہا پر پہنچ کر اپنے ہی بال نوچنے لگی تھی اپنا چہرہ پیٹ پیٹ کر رونے لگی تھی۔

دراصل اظہر کا اصل روپ سامنے آجانے کے بعد اپنا پہلا روپ پہلا خواب بکھر جانے اور پھر بھرم ٹوٹ جانے کا صدمہ اتنا شدید تھا کہ وہ سرمد احمد بخاری کا ساتھ انجوائے کرنے کی سرشاری سے تھوڑی دیر پہلے کے لیے ہی محظوظ ہو پائی۔

پھر جب تصور کی آنکھ نے اسے مستقبل کا بھیانک چہرہ اور اس رات کا بدترین انجام دکھایا تو اس کی ہمت جواب دے گئی۔

اظہر کو جلانے کا حوصلہ ٹوٹ گیا۔

اس سے بدلہ لینے کی خواہش دھوئیں کے مرغولوں اور شراب کے بھبکوں میں ڈوب گئی۔

چرس اور شراب کی اس محفل میں ایک کے بعد دوسری رسم اس کے حواس مختل کیے دے رہی تھی۔

جس لمحے وہ سرمد بخاری کے کندھے سے بے ہوش ہو کر جھول گئی تھی اس لمحے اس نے اظہر کو ایک نیم برہنہ لڑکی کے ساتھ جذب ہوتے دیکھا تھا۔

وہ یہ سب نہ بھی دیکھتی تب بھی یہاں پہنچ کر جیتے جی مر گئی تھی اور یہ سب دیکھنے کے بعد اپنا انجام سوچتے ہوئے وہ اس گھر میں پہنچ گئی تھی۔

جہاں اس نے جنم لیا تھا۔ عمر کا ایک بڑا حصہ تحفظ اور وقار کے ساتھ گزرا تھا اسے اپنے گھر والوں سے بہت سی شکایتیں سہی اسے ان کمروں کی گھٹن سے خوف سہی لیکن وہ یہ ضرور جانتی تھی کہ وہاں عزتوں کا سودا نہیں ہوتا۔

اس کے باپ، چچا کی لوگ اتنی عزت کرتے تھے کہ کبھی اس محلے میں کسی نے اس پر غلط نگاہ تک نہیں ڈالی تھی۔

اور یہاں وہ سرمد احمد بخاری کی مکروہ مسکراہٹ اور پر ہوس نگاہوں کے سامنے خود کو پورے کپڑوں میں چھپا کر رکھنے کے باوجود برہنہ محسوس کر رہی تھی۔

''یا اللہ! میری مدد کر.....'' پہلی بار شاید اس نے اللہ کو اتنی شدت کے ساتھ پکارا تھا۔

''میں اگر گھر نہ پہنچی تو وہ لوگ رسوائی کا زہر پی کر زندوں میں رہیں گے اور نہ مردوں میں.....

میں کیوں اظہر کے فریب میں آ گئی.....''

وہ اپنا چہرہ پیٹ پیٹ کر رو رہی تھی اور اس کی کربناک چیخیں سننے والا سوائے رات کی تاریکی کے کوئی نہیں تھا۔

وہ تاریکی جو کبھی عیب ڈھانپ لیتی ہے اور کبھی سارے عیبوں کی سارے گناہوں کی وجہ بن جاتی ہے۔

''یا اللہ! اس رات کی صبح ہو گئی تو پھر کچھ نہ بچے گا..... میری مدد کر مجھے اس دوزخ سے باہر نکال۔''

اس نے پھر اپنا سر پیٹنا شروع کر دیا تھا۔ تب ہی جیسے دروازے پر کھٹکا سا ہوا تھا وہ سمٹ کر دیوار سے جا لگی تھی۔

شاید کوئی اندر آ رہا تھا اس نے خوفزدہ نگاہوں سے لکڑی کے مضبوط دروازے کو دیکھا تھا جس پر عجیب و غریب نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔

تب ہی دروازہ کھل گیا تھا۔

اس کے پیچھے روشنی کی مانوس سی لکیر بھی تھی جس کے تعاقب میں وہ لپکی مگر اگلے لمحے اس کے مضبوط ہاتھ اس کے سینے سے ٹکرائے تھے وہ اس کو پیچھے دھکیل کر دروازہ بند کر چکا تھا۔

''سویٹی! تم تو مجھے اچھی لگی ہو..... تمہاری آنکھیں، تمہارا گول چہرہ اور اتنا خوبصورت جسم..... نہ نہ..... تم مجھ سے بھاگ رہی ہو پاگل.....

رانی بن کر رہو گی میرے محل میں..... سویٹی.....'' یہ سرمد بخاری کے الفاظ تھے اور وہ خودکش حملہ آور کی طرح پھٹتی چلی گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

رات کا جانے کون سا پہر تھا جب اس کی آنکھ کھل گئی تھی حالانکہ کوئی بھیانک خواب بھی نہیں دیکھا تھا مگر اس وقت بجلی کا چلے جانا اور گھر رکرتے پنکھے کا ساکت ہونا کسی بھیانک خواب سے کم نہیں تھا۔

اس نے پوری آنکھیں کھول کر اندھیرے سے آشنا ہونے کی کوشش کی اور پسینے سے تر چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔

یہ اس کے باپ کا گھر تھا اس لیے بے بسی لازم تھی اگر ماں کا ہوتا تو وہ اب تک جنریٹر آن نہ ہونے کا رونا ڈال چکی ہوتی۔

اور یہاں تو کسی بھی چیز کا رونا ڈالنا نری حماقت تھا لیکن مسئلہ یہ تھا اس آزمائش میں پڑنے کا فیصلہ اس کا اپنا تھا اس لیے وہ اپنے صبر و شکر کو داد دیتے ہوئے اس اسٹور نما کمرے کی مستقل مکین بن چکی تھی۔ جس کا بیرونی دروازہ چھت پر کھلتا تھا جو وہ عدم تحفظ کے باعث بند بلکہ لاکڈ کر کے سوتی تھی۔

نعمان اکثر چھت پر ٹہلتا پایا جاتا تھا اور اسے تائی کی نظروں سے بہت خوف آتا تھا۔

پتا نہیں کیوں انہیں کسی پر بھی اعتبار نہیں ہوتا تھا صوفیہ کو ان پر ترس بھی آتا تھا اور بعض اوقات ہنسی بھی۔

گرمی اور حبس کے باعث سانس لینا محال تھا اس نے پانی کی بوتل منہ سے لگاتے ہوئے دروازے کی طرف بے چارگی سے دیکھا اس کمرے میں ہوا اور روشنی کا واحد ذریعہ یہ دروازہ ہی تو تھا۔

یہ کمرہ اپنے سائز کے حساب سے کھڑکی کا متحمل ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

وہ پانی پی کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ دروازہ کھولے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا گو کہ چھت پر بھی حبس تھا ہوا بالکل بند تھی لیکن اس کمرے کی گھٹن سے تو بہتر ہی تھا وہ اپنے موبائل کی روشنی کو سہارا بنا کر باہر آ گئی سناٹے میں صرف کتے اور بلیوں کے لڑائی جھگڑے فضا کو مرتعش کر رہے تھے۔ اس نے نیند کے بوجھل پن کو ختم کرنے کے لیے دو تین گہرے سانس لیے اور موبائل کی اسکرین کو روشن کر کے ان میسجز کا جائزہ لینے لگی جو اس کے سونے کے بعد موصول ہوئے تھے۔

سب سے آخری میسج شجاع کا تھا، وہ بے ساختہ مسکرا دی۔

''میری چڑیا کو بہت جلدی نیند آ گئی کیوں؟''

''کبھی چڑیا، کبھی بلی، کبھی بندریا..... میں انسان بھی تو ہوں۔''

اس نے جوابی پیغام ٹائپ کیا اور بھیجنے سے پہلے صرف ایک لمحے کو سوچا۔

''میں بھی تو جاگ گئی ہوں..... وہ کیوں سوتا رہے۔'' مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

اور چند لمحوں بعد ہی اس کے موبائل کی وائبریشن شروع ہو گئی تھی اسکرین پر شجاع کا نام بلنک کر رہا تھا۔

اس نے یس کا بٹن پش کیا اور موبائل کانوں سے لگا لیا۔

دوسری طرف شجاع نے لیٹے لیٹے موبائل تکیے پر رکھ کر کان اس کے قریب کر لیے تھے وہ گہری

نیند میں تھا مگر میسج بیل کی سویلی سی آواز نے شعور کے دروازے پر دستک دی تھی کہ رات کے اس پہر اس کی زندگی میں اپنی توجہ کے رنگ شامل کرنے والی صوفیہ کے علاوہ کوئی نہیں ہوسکتا۔

اس نے تقریباً بند آنکھوں سے میسج پڑھا تھا اور اب انہی بند آنکھوں میں اس کا چہرہ سمو کر وہ نیند سے بھاری بوجھل آواز میں اس سے مخاطب تھا۔

''جاناں..... آر یو او کے۔'' صوفیہ کی سماعتوں میں رس گھلنے لگا تھا۔

''یس..... آئی ایم او کے بٹ..... مجھے نیند نہیں آرہی لائٹ جو چلی گئی ہے۔''

''ارے بابا جنریٹر آن کرلو.....'' وہ جھنجھلا کر بولا۔

''کہاں سے آن کرلوں..... یہاں یہ عیاشی نہیں۔'' وہ روٹھے روٹھے لہجے میں بولی تو شجاع کے سارے ہی حواس بے دار ہوگئے۔

اس نے پوری آنکھیں کھول کر ٹائم دیکھا تین بج رہے تھے۔

وہ اے سی کی خنکی میں اچھی خاصی موٹی چادر لپیٹے پرسکون نیند کے مزے لے رہا تھا اور صوفیہ کو گرمی نے ستایا ہوا تھا۔

دل پر ایک بوجھ سا آن گرا تھا وہ چادر پرے کھسکا کر اٹھ بیٹھا۔

''صوفی! تم کہاں پر ہو..... آئی مین سب لوگ سو رہے ہیں یا جاگ رہے ہیں۔''

''مجھے کسی کا کچھ نہیں پتا میں چھت پر ہوں میرا کمرہ چھت پر ہے اور یہاں میرے علاوہ کوئی نہیں ہوتا۔''

وہ رنجیدہ سی ہو چلی تھی اور شجاع کو اس کے لہجے کی اوس اپنے اردگرد محسوس ہو رہی تھی۔

''پاگل، احمق کیوں چھت پر اکیلی سوتی ہو ان گلی محلوں کے گھر بھی کتنے ان سیکیور ہوتے ہیں..... بس کرو یہ حماقتیں، صبح پہلی فرصت میں واپس آجاؤ، میں گاڑی بھجوادوں گا۔''

وہ تشویش میں مبتلا ہوگیا تھا اور اس کا مطالبہ بھی شروع ہوگیا تھا۔

صوفیہ نے موضوع بدلنے میں ہی عافیت جانی ورنہ گاڑی پھوٹتے ہی شجاع سمیت اس گھر کے دروازے پر ہوتی جہاں ابھی اسرار کے در کھلنے باقی تھے۔

کوئی کہتا تھا اس کی ماں یہ گھر چھوڑ کر چلی گئی تھی تب اس کے باپ نے تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔

کوئی کہتا تھا بلکہ جتلاتا تھا بار بار کہ اس کی ماں ایک بے وفا عورت تھی، اپنے شوہر کی بیماری کا بوجھ نہ سنبھال سکی اور جانے کیوں اس کے باپ کی موت بھی معمہ ہی تھی انہیں کینسر تھا یا کوئی اور بیماری.....

اس سوال کا جواب کوئی بھی تسلی بخش انداز میں نہیں دیتا تھا۔

''بیماریوں کے علاج بھی ہوا کرتے ہیں مگر تمہاری ماں نے تمہارے باپ کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا ہم نہ ہوتے تو جانے کتنی بھیانک موت مرتا۔''

ایک بار تائی نے تاسف اور تلخی سے بھرپور لہجے میں کہا تھا اور وہ اندر تک سلگ گئی تھی مگر اس کے پاس اپنی ماں کی صفائی لے لیے دلائل نہیں تھے اسی لیے چپ چاپ پی گئی کسی مناسب وقت کے انتظار میں۔

وہ مناسب وقت جانے کب آنا تھا۔ تب تک وہ یہاں کی گرمی، تلخی اور بے ترتیب شب و روز پر جھنجلا جھنجلا کر ہی ختم ہو جاتی۔

اگر ان حبس آلود دنوں میں شجاع کا ساون برساتا لہجہ اس کے دل و دماغ کی تپش کم نہ کرتا تو جانے کیا ہوتا وہ یہ سب سوچ کر ہی بدحواس ہو جاتی۔

''بہت تنگ کیا ہوا ہے تم نے..... نہ سونے دیتی ہو نہ جینے دیتی ہو، دن بھر بھی دھیان تمہاری طرف لگا رہتا ہے پتا نہیں کیا کھایا ہوگا کس سے لڑائی کی ہوگی۔ پاگل کر دو تم تو مجھے.....'' وہ اپنے لہجے میں پیار بھری خفگی دانستہ لانے کی کوشش کرتا تھا بلکہ اس کے ساتھ بات کرتے ہوئے اس کے انداز میں دنیا بھر کے جذبے خود بخود سمٹ آتے تھے۔

''میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ابھی بھی میں بور ہو رہی تھی اس لیے فون کرنے کا سوچا اگر آپ

ڈسٹرب ہوئے تو سوری ویری سوری۔"

وہ سارے ترپ کے پتے کھیل کر بری الذمہ ہوگئی تھی شجاع نے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر ایک گہری سانس لی اب تو اس سے ڈھیر ساری باتیں کیے بغیر چین ہی نہیں تھا۔

"یوں کہو نا..... چین نہیں ہے میرے بنا۔" وہ دلکشی سے مسکرایا اس کے دلکش وجود کو سامنے بٹھا کر.....

"خوش فہمی سرکار یہ تو لائٹ جانے کے بعد والی بے چینی ہے۔" وہ بمشکل ہاتھ آئی تھی۔

"ذرا اپنے دل سے پوچھ کر بتاؤ فوراً....."

"شجاع کتنی بے تکی باتیں کرتے ہیں آپ..... ہر وقت دل کی گواہی....." وہ اس کے سامنے سمٹ سمٹ کر کھل جاتی تھی شاید یہ ہی اس رشتے کا مان ہوتا ہے۔

"کیوں ڈر لگتا ہے..... سچائی سے....." وہ بھی اس کا مان کبھی نہیں توڑتا تھا اس پر عیاں بھی ہوتا تھا اسے سمیٹتا بھی تھا۔

"نہیں..... آپ کے پاگل پن اور اپنی بے بسی سے ڈر لگتا ہے۔" وہ دھیرے سے بولی اور اس کی شرارت دہائی دینے لگی۔

"جب تک تمہیں خود میں جذب نہ کرلوں یہ پاگل پن تو فریاد کرے گا نا!"

"شجاع....." وہ چیخ ہی تو پڑی۔

"آپ مجھ سے اتنی فضول باتیں مت کیا کریں۔" دل کی دھڑکنوں کو اعتدال پر لا کر اس نے اپنا احتجاج رجسٹر کروایا جس کا کوئی فائدہ نہیں تھا کیوں کہ مدمقابل شجاع تھا جس کی شرارتیں کمرے کی سونی فضا سے ہم آہنگ ہو کر آدھی رات کو چڑھتے دن کا سماں پیدا کر چکی تھیں۔

وہ ادھر مکمل بیدار ہو چکا تھا پیپسی کا ٹن کھول کر منہ سے لگاتے ہوئے وہ اس کی جھنجھلاہٹ کا تصور

کر رہا تھا۔

''تو بولو نا..... رات کے اس پہر میں اپنی جاناں سے کیا سیاست پر تبصرہ کروں اتنا بے حس اور ظالم تو نہیں ہو سکتا نا۔''

وہ ایک ٹوٹی ہوئی کرسی کے کنارے پر ٹک گئی اور نظریں یوں جھکا لیں جیسے وہ اس کے سامنے ہی تو بیٹھا ہے۔

''سب جھوٹ ہے..... میں فون کروں میں ایس ایم ایس کروں تو تب یہ ڈرامے شروع ہو جاتے ہیں..... پورا دن گزر جاتا ہے خود کوئی پرواہ نہیں کرتے۔''

معمول کا شکوہ تھا معصومیت اور محبت کا اظہار اپنے اندر سمیٹے ہوئے۔

''دیکھو..... میری پرواہ کے انداز سے تم جلد ہی گھبرا جاتی ہو فون پر تو بات ہوتی نہیں تم سے کبھی قریب آ کر میں نے پرواہ شروع کر دی تو تمہاری جان مصیبت میں پڑ جائے گی۔''

''پھر ڈائیلاگ.....''

''ارے بابا..... یہ ڈائیلاگ نہیں زندگی کی عظیم سچائی ہے میرا بس چلے تو صبح سے شام کر دوں صرف تمہیں دیکھتے ہوئے یہ تو آ کر میری آنکھوں سے پوچھو کیا گزر جاتی ہے ان پر جب دل تمہیں پکارتا ہے اور تم انہیں نظر نہیں آتی ہو۔''

اس کے لفظ لفظ میں جذبوں کی شدتیں مچل رہی تھیں صوفیہ کو بہت دور بیٹھ کر بھی بخوبی احساس ہو رہا تھا اس کے کان کی لویں جھلسنے لگی تھیں۔

اس کے لہجے کی سچائی کے لیے کسی گواہی کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ صوفیہ کی بے تاب دھڑکنیں ان دو دلوں کی حکایت پر خود ہی ایمان لے آئی تھیں۔

وہ اگر اپنی بے چینیوں کا اظہار کر دیتا تھا تو اس کی فطری حیاء ان بے چینیوں پر پردے ڈال دیتی

تھی معصومانہ سی خواہش اور شکایت کی صورت میں ورنہ اس کا بھی دل چاہ رہا تھا..... گزرتی ہر رات کے لمحے کو گواہ بنا کر کہے اور بہت زور زور سے کہے۔

میرا دل چاہتا ہے اس خود ساختہ قید سے نکل بھاگوں توڑ ڈالوں اس قفس کو..... اور اپنی عمر کی ہر محرومی ہر تشنگی کو ان مضبوط بانہوں میں چھپا لوں جو صرف میری ہیں..... جنہیں قدرت نے صرف مجھے انعام کیا ہے۔

''شجاع! آئی مس یو.....''

سوچ کو احساس کو لفظوں کی طاقت نہ چاہتے ہوئے بھی عطا ہو گئی تھی اس کی مدہم مگر شدتوں سے بھرپور آواز بمشکل شجاع کی سماعتوں تک منتقل ہوئی تھی۔

''مس یو لاٹ، واپس آ جاؤ نا..... سب تمہیں بہت مس کرتے ہیں۔ میرے کمرے کی ہر چیز تمہارے بارے میں پوچھتی ہے۔ نہ کرو خود پر مجھ پر ہماری زندگی پر یہ ظلم.....''

وہ یکدم بہت بے چین ہو گیا تھا اس کی آواز میں بے قراری کے ساتھ التجا بھی تھی۔

صوفیہ کے دل کو کچھ ہوا تھا اور ذہن کے کسی گوشے سے یہ صدا بھی بلند ہوئی تھی کہ ہاں وہ ظلم تو کر رہی ہے۔

ایک لاحاصل مشقت کا انجام، سوائے بدگمانی، نفرت اور اذیت کے کچھ نہیں ہوگا۔ مگر وہ یہ اذیت اٹھانے کا سامان اپنے ہاتھوں سے کر رہی تھی۔

''بس کچھ دنوں کی بات ہے مجھے کون سا یہاں تمام عمر رہنا ہے.....''

جانے کیوں اس نے سوچا مگر بول نہ پائی۔

ابھی خود کو بہت مضبوط دکھانا تھا بہت ساری باتیں اظہار کے مرحلے سے گزرنے کے بعد آپ کی کمزوری بن جاتی ہیں۔

''ایٹ لیسٹ.....تم آفس تو آؤ نا.....تمہیں دیکھنا اب بہت ضروری ہو گیا ہے، سکون نہیں ملتا پلیز.....''

اس کی خاموشی شجاع کے حوصلے بڑھا رہی تھی اس کے لہجے میں بے چینی سے زیادہ استحقاق گھلا ہوا تھا۔

''پتا ہے شجاع میرا آفس آنا میرے مسائل میں اضافہ ہی کرے گا میں جن لوگوں کے ساتھ آج کل رہ رہی ہوں، ہر پل ایک نیا روپ نظر آ رہا ہوتا ہے ان کا.....آپ کو پتا ہے انہیں اب میرا کھانا پینا رہنا سہنا بھاری لگنے لگا ہے ہو سکتا ہے وہ مجھ سے ایک دن اس کا خرچہ بھی مانگ لیں سو اب یہاں رہنا بلکہ دھڑلے سے رہنا اپنے باپ کے حصے پر حق جتانا میری ضد بن گیا ہے جس کے لیے مجھے آپ کی ضرورت ہمیشہ رہے گی آئی مین آپ ہی مجھے مضبوط بنا سکتے ہیں۔''

اس نے شاید پہلی بار اس گھر کے ذاتی مسائل پر پہلی دفعہ بات کی تھی۔ ورنہ وہ ہمیشہ ٹالتی ہی رہتی تھی شجاع کو ان ساری باتوں کی توقع تو تھی لیکن آج اس کے منہ سے سن کر یہ اطمینان قوی ہو گیا تھا وہ حالات و واقعات کی ترتیب کو حقائق کی آنکھ سے دیکھ رہی ہے۔

کیوں کہ جو کچھ شجاع جانتا تھا وہ صوفیہ نہیں جانتی تھی لیکن وہ صوفیہ کو اپنے الفاظ میں کبھی کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا۔ تا کہ وہ ہر طرح کی بدگمانی اور احساس محرومی سے باہر نکل کر اس کی زندگی کا حصہ بنے۔

اس کے اطمینان کے لیے یہ کافی تھا کہ اب وہ اس سے اپنے چھوٹے چھوٹے مسئلے بھی شیئر کرنے لگی تھی۔

''دیکھو صوفی ہم ہمیشہ زندگی کو اپنی مرضی کے مطابق نہیں جی سکتے کبھی کبھی زندگی کو اس کی شرائط کے حوالے کر دیا جاتا ہے اور وقت ثابت کرتا ہے کہ کون سا فیصلہ درست تھا اور کس فیصلے نے ہمیں تھکا دیا۔ مجھے یقین ہے کہ تم تھکو گی نہیں بلکہ اس فیصلے کے اختتام پر سرشاری تمہارے حصے میں آئے گی اور

بالفرض تم تھکنے لگیں تو..... میں اپنے حصے کا سارا آرام تمہارے نام کر دوں گا۔

صوفی یہ جو محبت ہوتی ہے نا یہ اظہار سے زیادہ ان رویوں کی محتاج ہوتی ہے جو ہم ایک دوسرے کی زندگی کو سہل بنانے کے لیے روا رکھتے ہیں۔

پتا ہے صوفی کبھی کبھی ہم خود اپنے لیے نایاب ہوتے ہیں خود کو دستیاب نہیں ہوتے مگر یہ جو دل سے جڑے رشتے ہوتے ہیں نا یہ خود ہمک کر دامن جھکڑ لیتے ہیں اور پھر من و تو کا فرق مٹ جاتا ہے ہمارا دل فوراً گواہی دینے لگتا ہے کہ کون کس کی چاہ کر رہا ہے۔"

وہ اپنی بھاری آواز اور مضبوط لہجے میں زندگی کا ساز سنا رہا تھا۔

اس نے اپنی خوش بختی پر تشکر کے لیے بے ساختہ آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی تھی۔

یہ سچ ہی تو تھا ان دونوں کے درمیان قربتوں اور رابطوں کا تسلسل قائم ہی نہیں ہو پایا تھا مگر دل نے بارہا اس جادوئی احساس کی گواہی دی تھی کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے اندر سانس لینے لگے ہیں۔

"شجاع مجھے تو آپ کی طرح اچھی باتیں بھی نہیں آتیں مجھے تو بس اتنا پتا ہے کہ جب میں تھکنے لگتی ہوں اس ناپسندیدہ ماحول میں جھنجھلانے لگتی ہوں تو آپ کے ہونے کا احساس مجھے خوشبوؤں کی دنیا میں لے جاتا ہے۔"

وہ مدہم سے انداز میں اپنی چاہت کا یقین دلاتے ہوئے سرتاپیر پسینے سے بھیگ گئی تھی۔

وہ نہ شجاع کی طرح بہت زیادہ بول سکتی تھی اور نہ اس کی طرح جذبوں کی شدتوں کو بلاوجہ عیاں کر سکتی تھی لیکن جدائی کے اس مرحلے سے گزرتے ہوئے اتنا ضرور جان گئی تھی کہ یہ جو شوخ شنگ زندگی سے بھرپور باتیں کرنے والا دلربا سا شخص ہے وہ کسی مہرباں سایہ دار بادل کی طرح جب جب اس کی زندگی پر اپنی شدتوں کی بارش برسائے گا وہ سیراب ہونا شروع ہو جائے گی۔

اس کی ذات کا صحرا کسی نخلستان کا روپ دھار لے گا۔

وہ تھوڑی دیر پہلے جس گھٹن اور حبس سے تنگ آ کر زندگی سے بے زار ہونے کا اعلان کر رہی تھی۔

اس وقت وہی زندگی اسے بہت قیمتی اور با مقصد لگ رہی تھی۔

ہے تو پاگل پن مگر کیا کیا جائے اب تو ہو گیا نا۔

یہ ہی کچھ سوچ رہی تھی اور شجاع لفظوں میں بیان کر رہا تھا۔

وہ بے اختیار ہنس پڑی رات کے سناٹے کو توڑتی بے ریا شفاف ہنسی جیسے چاند بادل سے نکل کر چاندنی بکھیرنے لگا ہو۔ شجاع نے یہ منظر پوری جزئیات کے ساتھ محسوس کیا تھا۔

''اس کو کہتے ہیں دوریوں میں قربت کا احساس..... اب سنسان راتیں اتنا تنگ نہیں کرتیں پتا ہے کیوں.....؟''

وہ مسکرا دیا تھا اس کے تصور سے مخاطب ہو کر۔

''کیوں.....''

وہ جانتی تھی کوئی انوکھی بات ہی ہو گی۔

''''اپنی جاناں کی یادوں کا کمبل اوڑھ کر سو جاتا ہوں۔'' وہ مزے سے بولا تھا وہ ایک بار پھر ہنس پڑی تھی۔

''اب آپ یہ ڈائیلاگ بند کر دیں لائٹ تو کیا آئے گی البتہ گراؤنڈ فلور والے جاگ جائیں گے اور میری شامت آ جائے گی۔''

''بھیگی بلی..... ڈرتی ہے نا۔''

''ڈریں میرے دشمن..... یہ لوگ سامنے آ کر لڑائی نہیں کرتے اور مجھے مزا نہیں آتا چھپ چھپ کر لڑنے میں۔''

''کیا حال کے تمہاری اس کزن کا جس کی شادی کا ذکر کیا تھا تم نے.....''

''کچھ خاص حال نہیں آج وہ اپنی کسی دوست کے گھر گئی ہوئی ہے مجھ سے تو وہ بات کرتی نہیں البتہ میں نے اسے سنا تھا کسی سے بات کرتے ہوئے۔

لیکن مجھے تو کوئی گڑبڑ لگتی ہے اس لڑکے کے گھر والے آئے تھے.....اور تائی کچھ عجیب سی باتیں کر رہی تھیں۔ ہماری ذات برادری کے نہیں۔

ہمارے شریف خاندان سے ان میراثیوں کا کیا واسطہ.....

شجاع! یہ میراثی بھانڈ ٹائپ کے لوگ کیا ہم سے بہت الگ ہوتے ہیں کیا وہ ہم سے رشتے ناطے نہیں کر سکتے۔''

وہ عجیب سی کشمکش میں تھی ایک طرف سعدیہ سے ہمدردی بھی تھی اور دوسری طرف اس کی پسند اور فیصلے پر افسوس بھی۔

''دیکھو صوفی! یہ جو ذات برادری قبیلہ خاندان کا ٹیگ ہوتا ہے نا ہم اس سے مکمل طور پر انحراف نہیں کر سکتے۔ بے تحاشا ترقی اور بدلتے وقت کے ساتھ بھاگنے کے باوجود ہمیں اپنی شناخت اور اپنا نام بچانے کے لیے اس طرح کے ٹیگ کا سہارا لینا پڑتا ہے اور یہ کوئی انتہا پسندی نہیں بلکہ ہر کسی کو اپنی انفرادی حیثیت میں جینے کا حق ہے۔

اگر کوئی اپنے خاندان کی روایتوں پر ناز کرتا ہے تو کرے لیکن اسے دوسرے کو محض اس بات پر لیٹ ڈاؤن کرنے کا حق نہیں کہ وہ ان سے برتر ہے۔''

''شاید آپ ٹھیک کہتے ہیں تائی نے ان کی ٹھیک ٹھاک کلاس لے لی تھی اور ویسے بھی ان کا انداز مجھے تو ہر وقت انسلٹنگ لگ رہا ہوتا ہے۔''

''تمہیں تو کچھ نہیں کہتیں۔''

''مجھے کیا کہیں گی میں تو ان کے لیے پزل بن گئی ہوں۔'' وہ اس ادھوری کرسی پر بیٹھ کر تھک گئی

تھی جس کا احساس شجاع کو بھی ہو گیا تھا۔

''گڈ اب اگر مادام اجازت دیں تو میں صبح ہونے سے پہلے تھوڑی دیر کے لیے سو جاؤں وقت پر آفس نہ پہنچا تو میری باس مجھے کوئی بھی سزا سنا دیں گی۔''

''آپ بالکل سو سکتے ہیں کیوں کہ مجھے بھی نیند آ رہی ہے اور لائٹ بھی آ گئی۔''

''تو تم مجھے اتنی دیر سے پاگل کیوں بنا رہی تھیں۔''

''ارے بابا ابھی ابھی آئی ہے۔''

''اچھا اوکے، گڈ نائٹ، ٹیک کیئر مس یو۔'' وہ اپنی بات ہمیشہ ایسے ہی ختم کرتا تھا۔

''گڈ نائٹ ٹیک کیئر۔'' صوفیہ اس کے بعد سکون کے جھولے میں جھولنے لگتی تھی۔

☆.....☆.....☆

''دیکھو سویٹی تم اگر مجھ سے یوں بھاگو گی تو مجھے زبردستی کرنا پڑے گی پھر نہ تمہیں مزا آئے گا اور نہ میری آگ بجھے گی۔''

''میں جانتا ہوں آگ تمہارے اندر بھی لگی ہے۔ اور وہ جو تمہارا یار ہے نا کیا نام ہے اس کا..... وہ کبھی نہیں بجھا سکتا۔''

اس نے ایک موٹی سی گالی دی اور بے ہنگم انداز میں صوفے پر ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر پہلے وہ اس محفل کے سب سے خوبصورت مرد کے روپ میں اس کے سامنے آیا تھا اور اس وقت وہ اپنے بدترین روپ میں اس کے سامنے ڈھیر تھا۔

سعدیہ کا بس نہیں چل رہا تھا اس کمرے سے غائب ہو جائے۔

ہر طرح کی آسائشات اور لوازمات سے آراستہ یہ خوبصورت آرام دہ کمرہ اس وقت اسے دنیا کا بھیانک ترین روپ دکھا رہا تھا۔

وہ صرف وصرف اس لمحے اپنی آبرو بچ جانے کی دعا مانگ رہی تھی اس کا ضمیر اس کے اندر کی بزدل اور کم فہم لڑکی ابھی اتنی بھی باغی اور اخلاقی پستی کا شکار نہیں ہوئی تھی کہ اسے اپنی عزت وعظمت داؤ پر لگ جانے کا خوف نہ ہوتا۔

وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ عورت کی آبرو ہی اس کا غرور ہوتا ہے اور اگر آج یہ غرور ملیا میٹ ہو گیا تو وہ برباد ہو جائے گی۔

''پلیز آپ مجھے جانے دیں میں وہ نہیں ہوں جو آپ نے سمجھا میں تو پہلی بار ڈانس پارٹی میں آئی تھی صرف دیکھنے کے لیے۔ اظہر میرا منگیتر ہے وہ مجھ سے پیار کرتا ہے میں بھی اسے پسند کرتی ہوں ہماری شادی ہونے والی ہے دیکھو میرے ساتھ ظلم مت کرو تمہارے لیے لڑکیوں کی کمی تو نہیں۔''

اس نے اچانک چیخ کر کہا اور پھر اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی چہرے پر بے بسی، آنسو، خوف، وحشت کیا کچھ نہ تھا۔

سرمد بخاری ایک زوردار قہقہہ لگا کر کھڑا ہو گیا اور اس کا قہقہہ بھی ایسا تھا کہ سعدیہ کا دل پتے کی طرح لرزنے لگا۔

''یا اللہ! میں کس مشکل میں پھنس گئی تو ہی میری مدد فرما۔''

آج وہ بہت بے قراری سے اللہ کو یاد کر رہی تھی۔ ورنہ تو اسے اللہ سے اکثر شکوے ہی رہتے تھے یہ نہیں دیا، وہ نہیں دیا یہاں کیوں پیدا کر دیا ساری دنیا کے پاگل ہماری جھولی میں ڈال دیے۔

''دیکھیں آپ مجھے جانے دیں میں تو اب اظہر کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی آپ مجھے اچھے آدمی لگے تھے اس لیے آپ کے ساتھ بات بھی کر لی تھی پلیز میری بات سن لیں مجھے جانے دیں۔''

وہ اب مستقل یہ ہی کہہ رہی تھی۔

اس کے بے ربط جملے ہچکیوں میں ڈھل گئے تھے۔

سرمد احمد بخاری بغور اسے دیکھ رہا تھا ورنہ بہت عرصے سے وہ صرف عورت دیکھتا تھا اس کا چہرہ نہیں مگر پتا نہیں کیوں سعدیہ کے لیے اس کی نظر میں وہ ہوس اور شیطانی چمک نہیں تھی جو اس کی مردانگی کا تقاضا تھی شاید اسی لیے سعدیہ بھی اس کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑی تھی اور اس سے جان بخشی کی منت کر رہی تھی۔

''دیکھو تمہیں جانے دیا تو میرا کیا ہوگا تم جانتی نہیں ہو اس وقت میری ضرورت صرف تم ہو میری آگ صرف تم بجھا سکتی ہو میں نے تمہیں اس پورے ہال سے چنا ہے ورنہ شمائلہ تو مجھے پتا نہیں کہاں لے کر جا رہی تھی۔''

اس کے منہ سے شراب کے بھبکے اٹھ رہے تھے اور وہ اتنا زیادہ پینے کے باوجود اپنے پاؤں پر مضبوطی سے کھڑا پورے حواسوں کے ساتھ بات کر رہا تھا البتہ لفظوں کی لڑکھڑاہٹ سعدیہ کے لیے خطرے کا بگل تھی جو اس کے سر پر بج رہا تھا اور اس کے حواس مختل کیے دے رہا تھا۔

رونے سے اس کی آنکھوں کا کاجل دھل چکا تھا اب اس کی بڑی بڑی براؤن آنکھوں میں صرف خوف کے ساتھ تھے جو سرمد احمد بخاری کی برداشت کا امتحان لے رہے تھے۔

اس نے کبھی کسی کو اتنا ٹائم نہیں دیا تھا اور نہ ہی اس کاروبار میں کسی کے پاس ان صحبتوں کے لیے وقت ہوتا ہے۔ اس کاروبار میں دونوں فریق ایک دوسرے کی مصروفیات کو جانتے ہیں اس لیے سودا طے ہوا اور شناسائی ختم مگر یہاں صورتحال میں دلچسپی کا عنصر سعدیہ کی غیر کاروباری صلاحیت کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا جس کے لیے حیرت انگیز طور پر سرمد احمد بخاری جیسے خریدار کو لطف کی ایک نئی کیفیت سے گزرنا پڑ رہا تھا۔

وحشی خونخوار جانور کے ہاتھ اگر زندہ انسان لگ جائے تو پہلے مرحلے پر وہ صرف اسے بھنبھوڑتا ہے اور پھر اسے اپنے شکنجے میں کر کے اسے ستانے کا وقت بھی دیتا ہے اور ضروری تو نہیں کہ وہ اپنے مردار کا سارا گوشت ایک ہی وقت میں کھا لے۔

سرمد بخاری نے آگے بڑھ کر کمرے کی ملگجی روشنی بھی گل کر دی تھی اور سعدیہ چیخ مارتے ہوئے کسی دیوار کے سہارے جا لگی تھی اس وقت اس کی فریادیں یا تو اس کمرے کے در و دیوار سن رہے تھے یا پھر وہ خود کیونکہ سرمد بخاری کے اندر سیاہ خونخوار کتوں نے اب اپنے شکار کے لیے بھونکنا شروع کر دیا تھا۔

ملگجی روشنی گل ہوئی تو سعدیہ نے اپنی آنکھیں میچ لی تھیں اس نے جان لیا تھا اس کمرے کی تاریک رات اب اس کی پوری زندگی پر سیاہی کی چادر تان دے گی۔

وہ دیوار میں ضم ہونا چاہتی تھی اس سے پناہ مانگ رہی تھی مگر اینٹ اور پتھر کی اس مضبوط دیوار میں اس کی عافیت کا کوئی روزن نہیں تھا اس کی نادانی اور نافرمانی کے لیے سزا کا عمل اتنی جلدی شروع ہو جائے گا۔

وہ ایک بار پھر اپنی قسمت سے اپنے اللہ سے شاکی ہو چلی تھی۔

ایک طرف وہ سنگی دیوار تھی اور ایک طرف وہ سنگدل بے حس انسان جس سے اس نے شناسائی کی بڑی بھاری قیمت چکانی تھی وہ فرش پر نڈھال سے انداز میں بیٹھتی چلی گئی اور سرمد بخاری کا خوفناک سایہ اس کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گیا تھا۔

''آؤ نا جان من..... دیکھو گھبراؤ نہیں..... یہ جو ملن کی پہلی رات ہوتی ہے نا اس کا مزا ساری دنیا کی دولت دے کر بھی نہیں ملتا تم مجھ سے ڈرو مت..... میں تمہارا دوست ہوں..... تمہارا پارٹنر.....''

''میں نے ایسا کیا کیا تھا جو میرے نصیب میں بے بسی اور یہ رسوائی لکھی تھی اے اللہ تو کہاں ہے.....''

وہ ایک بار پھر چیخنا چاہتی تھی مگر اس کی آواز گھٹ کر رہ گئی سرمد بخاری کے ہاتھ اس کی چہرے اور گردن پر رینگ رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

نانو گھر آ گئی تھیں اور عاشر ان کا سایہ بن گیا تھا اس کا بس نہیں چل رہا تھا وہ انہیں ساری دنیا سے چھپا لے اور ساری دنیا میں فی الوقت کشمالہ اور خولہ سے زیادہ کوئی نہیں تھا جو نانو کی یوں خدمت اور دلبستگی پر معمور تھیں جیسے وہ ان کی سگی بیٹیاں ہی تو ہوں۔

کاشف کے لیے یہ منظر چونکا دینے والا تھا وہ عاشر اور راجہ صاحب کے اصرار پر یہاں رک گیا تھا اور سچ تو یہ تھا کہ وہ بہت دنوں کے بعد گھر کا سکھ اور چہل پہل دیکھ رہا تھا اس لیے بھی اپنا کام فی الوقت روک کر یہاں رک گیا تھا۔

کشمالہ اور خولہ ایک دوسرے کی ہمشکل، سراپا اور لب ولہجہ مغربی اور انداز و آداب مشرقی۔

اس کی قوت مشاہدہ کے لیے ایسے مظاہرے فیول کا کام دیتے تھے اس کی تخلیقی صلاحیت کو توانائی ملنا شروع ہو جاتی تھی۔

جب وہ اپنے اردگرد رنگ برنگے کرداروں کی دنیا کو دیکھتا تھا۔

''یار عاشر! تو نے مجھے کبھی نہیں بتایا تیری بہنیں بھی ہیں۔''

عاشر اس کے ساتھ نانو کے لیے میڈیسن، فروٹس وغیرہ لینے نکلا تھا دونوں نے گاڑی کے بجائے درختوں سے گھری ہوئی سڑک پر واک کرنے کو ترجیح دی تھی۔

چڑیوں کی چہچہاہٹ اور پتوں کی سرسراہٹ سے محظوظ ہوتے وہ دونوں قریبی سپر اسٹور کی طرف رواں دواں تھے۔ جب کاشف نے اپنے تجسس سے مجبور ہو کر پوچھا۔

''وہ راجہ صاحب کی بیٹیاں ہیں۔'' عاشر نے سنجیدگی سے کہا۔

''اور راجہ صاحب کا بیٹا تو ہے نا پھر وہ تیری کیا ہوئیں..... میرے خیال میں اس رشتے کو بہن ہی کہتے ہیں۔''

اس نے مسکراہٹ دبا کر پوچھا تھا۔

اسے کبھی کبھی یہ چھ فٹ دو انچ کا خوبرو جوان ڈھائی سال کا بچہ لگتا تھا وہ اس کی ڈاکومنٹری سیریز کا حصہ بنتا نہ بنتا مگر اس کا جگری دوست ضرور بن گیا تھا جس کا اظہار عاشر کی طرف سے تو نہیں ہوا تھا لیکن کاشف کے لیے اپنے دل کی شہادت ہی کافی تھی۔ ہماری چاہت ہمیشہ بدلے میں چاہت کی متمنی نہیں ہوتی یہ رشتہ فرض کی زنجیر میں بمشکل قید ہوتا ہے۔

''میں نانو کا بیٹا ہوں تمہیں ہزار دفعہ بتا چکا ہوں اور تم ہو کہ ہر دفعہ نئی کہانی لے کر بیٹھ جاتے ہو۔''

''نانو کا بیٹا کیا آسمان سے ٹپکا تھا اس کا کوئی باپ تو ہوگا نا۔'' وہ دوبدو بولا۔

''میرا اپنے باپ سے کوئی واسطہ نہیں۔'' وہی مرغے کی ایک ٹانگ کاشف بھی سنجیدہ ہو گیا۔

''یہ تمہاری خوش فہمی ہے جنہیں قدرت نے ان رشتوں کو دے کر چھین لیا ہو کبھی اب سے محرومی پوچھنا۔''

وہ جانے کیا باور کرانا چاہ رہا تھا۔

''مجھے بھی یہی لگتا ہے قدرت نے یہ رشتہ مجھے صرف اس لیے دیا تھا کہ میں دنیا میں آ جاؤں اور بس..... بلکہ مجھے ماں کا رشتہ بھی اسی لیے ملا تھا آدروائز میں ان کی خواہش یا چاہت نہیں تھا۔

کبھی کبھی حالات و واقعات کی ترتیب وہ نہیں ہوتی جو ہمارے دائرہ نگاہ میں ہوتی ہے اب دیکھو ہو سکتا ہے تمہیں یہ ٹنڈ منڈ درخت بہت پیچیدہ اور بھیانک لگے لیکن میرے لیے یہ قدرت کی صناعی کا ایک مختلف نمونہ ہے اس کی تراش خراش اتنی متوازن ہے کہ کوئی انسان نہیں کر سکتا۔

دراصل جہاں تم کھڑے ہو اور زندگی کا تجزیہ کرتے ہو وہاں سے تمہیں اس درخت کا بدنما چہرہ اور اکیلا پن نظر نہیں آ سکتا تمہاری سمت الگ اور میری سمت الگ ہو سکتی ہے میں تمہاری جگہ ہوں تو میری بھی سوچ بدل جائے۔''

''اور تم میری جگہ آنے کی کوشش نہیں کرتے کیونکہ تم اپنے مقام سے جڑے ہو اور میں اپنے..... اصل مسئلہ یہ ہے۔ لیکن برادر یہ زندگی گزارنے کا سلیقہ تو نہیں۔ سوچو اگر زندگی ہمیشہ ہماری خواہش کے

مطابق عطا کرتی رہے تو پھر زندگی کیوں کہلائے..... انسان ہمیشہ ایک ہی جیسے حالات سے گزرتا رہے تو اس کی فطرت کو دکون کیونکر ملے جو اول روز سے تبدیلی کا تقاضا کر رہی ہے ایسا نہ ہوتا تو آج بھی ہم پتوں کا لباس پہن کر پتھر سے آگ جلا کر خوش رہتے نا۔"

کاشف سے باتوں میں بھلا کون جیت سکتا تھا۔ عاشر نے ایک گہری سانس بھری اور سپر اسٹور کی طرف اشارہ کیا۔

"ہم منزل پر پہنچ گئے....." یہ کاشف کے فلسفے کا اثر تھا مگر بول کر پھر اس کے شکنجے میں آ گیا تھا۔

"نہیں ہماری منزل ابھی ہمارے گمان کی مہمان ہے وہ حقیقت کا روپ اس دن دھارے گی جب ہم راستوں کا تعین کر لیں گے۔ ہم ابھی بے سمت چل رہے ہیں۔"

وہ اس کے تھکے تھکے چہرے پر نگاہ ڈال کر بولا تھا۔ عاشر گزشتہ کئی راتوں سے جاگ رہا تھا اور سب سے بڑی بات وہ گزشتہ کئی سالوں سے لڑ رہا تھا جس کے آثار اس کے چہرے سے عیاں تھے۔

اس کو صرف ایک دفعہ راجہ طارق محمود کے سامنے بٹھانا تھا اور دونوں کو خوب کہنے اور سننے کا موقع دینا تھا اور اس کے بعد یہ بدگمانی یہ بے اعتنائی اس رشتے کے پیار اور مان میں ڈھل جاتی جوان باپ بیٹے کے درمیان سب سے بڑی سچائی تھا۔

☆.....☆.....☆

یہ اتفاق بھی تھا کہ کشمالہ، خولہ اور کاشف کے مشاغل اور دلچسپیاں ایک جیسے تھے اور تینوں کا پروفیشن بھی ایک ہی تھا اس لیے تکلف کی دیوار گرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔

اس وقت بھی کشمالہ اور کاشف ڈھلتی شام کا نظارہ کرنے کے لیے ٹیرس پر چلے آئے تھے یہاں سے اس پوش ایریا کے خوبصورت گھر اپنی ترتیب اور تعمیر کے ساتھ نگاہوں کو بہت بھلے لگتے تھے۔

کشمالہ کی اکثر شامیں اس ٹیرس پر گزرتی تھیں اور اس منظر کی کھوج میں رہتی تھیں جب کوئی محض

نگاہ غلط ڈال کر آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔

اور وہ اس نگاہ کی اسیر ہو گئی تھی۔

''ویسے کشمالہ مجھے آپ کے فیملی میٹر میں انوالو تو نہیں ہونا چاہیے لیکن کیا کروں عادت سے مجبور ہوں ایک بات پوچھوں۔'' کاشف سے برداشت نہیں ہوا تھا۔

''اوہ شیور..... کچھ لوگ ہوتے ہیں ایسے جو ہماری فیملی میں بڑی آسانی سے شامل ہو جاتے ہیں اور ان کے ساتھ اجنبیت کا احساس ہوتا ہی نہیں۔''

وہ سنہرے بالوں کو کلپ میں جکڑتے ہوئے بولی تو کاشف بھی سر ہلا کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا بلا کی خوبصورت لڑکی تھی ہر طرح سے حسن و وقار کا پیکر.....

''کیا راجہ صاحب آپ کے ریئل فادر ہیں.....'' وہ بلا تمہید پوچھ بیٹھا۔

''نو..... انہوں نے ہمیں ماں سمیت ایڈاپٹ کیا ہے۔''

وہ اتنی ہی اسٹریٹ فارورڈ تھی کاشف کو خاص حیرت نہیں ہوئی اس جواب پر کیوں کہ اس جواب کی وجہ توقع کر رہا تھا۔ برین ود بیوٹی ایسے ہی لوگوں کے لیے کہا جا رہا ہوتا ہے اس نے سوچا اور الجھنے کے لیے ایک اور سرا ڈھونڈ لیا۔

''آئی مین آپ کی مدر کے ساتھ شادی۔'' اس نے مزید کریدا۔

''لمبی کہانی ہے کبھی فرصت میں ضرور سناؤں گی ابھی آپ مجھے یہ بتائیے کیا عاشر آپ کے پروجیکٹ میں کام کرنے کے لیے راضی ہے۔''

وہ اس سے عاشر کے بارے میں جاننا چاہتی تھی کیونکہ آج کل وہی اس کے سب سے زیادہ قریب تھا نانو کے بعد۔

''وہ ابھی تک راضی نہیں ہے لیکن میں راضی کر لوں گا اسے مجھے یقین ہے۔''

''مجھے اچھا لگا آپ کا پروجیکٹ اور اس میں عاشر کو شامل کرنے کا آئیڈیا کیونکہ ہم حقائق کی تلخیوں کو فکشنائزڈ کرتے نہیں دکھائیں گے تو اسے ڈائجسٹ کرنا مشکل ہو جائے گا۔''

''ہمارا کام اگر صرف تنقید کرنا رہ گیا تو لوگوں کو بالکل میڈیا اس طرح برا لگنے لگے گا جیسے ہمیں کوئی اپنا سخت اور ظالم ٹیچر برا لگتا ہے۔''

کاشف نے بھرپور تائیدی انداز میں اسے قدرے حیرت سے دیکھا تھا۔

''آپ پہلی بار پاکستان آئی ہیں۔ کسی طور تو اس خوشگوار ماحول کا تسلسل برقرار رکھنا تھا۔''

''لیکن میں نے پاکستان اور ہندوستان کے کلچر کا مطالعہ بہت غور سے کیا ہے میں نے بے شمار پاکستانی اور ہندوستانی اسٹوریز پڑھی ہیں، ناول، ریسرچ، آرٹیکل اور بھی بہت کچھ..... اس لیے مجھے یہ زمین یہاں کے لوگ اور ان کا مزاج اجنبی نہیں لگتا اور شاید اس لیے بھی نہیں کہ میری ماں کا تعلق ہندوستان سے تھا۔''

''مگر آپ کے فیچرز تو مکمل یورپین ہیں۔'' کاشف نے بغور اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''یہ اللہ کی مرضی اور اس کی عطا ہے میرے پیرنٹس کا کوئی قصور نہیں۔'' وہ بے ساختہ بولی تو کاشف ہنس پڑا۔

''ویسے آپ تو بہت باتیں کرتے ہیں اور آپ ہنستے بھی ہیں مگر آپ کا دوست ان دونوں چیزوں سے بھاگتا ہے کیسے گزارا ہوتا ہے۔''

کوئی تو ہو جو اس کا ذکر کرے اس کا نام لے یہ جذبوں کی رو بھی کیسے کیسے حیلے بہانے ڈھونڈتی رہتی ہے۔

''دیکھیں جب ہمیں کوئی اچھا لگتا ہے پیارا لگتا ہے تو پھر یہ نہیں دیکھتے کے اسے ہم کیسے لگتے ہیں ہماری غرض بس اتنی ہوتی ہے کہ ہماری کسی بات سے اسے تکلیف نہ ہو اور وہ ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا سکون بنا رہے۔''

''اوہ..... ویری گڈ..... ویری انٹرسٹنگ..... مگر اس طرح اگر سب سوچ رہے ہوں تو یہ دنیا ہر تکلیف سے پاک ہو جائے۔''

کشمالہ نے دلکش مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو کاشف کی دلچسپی سامنے کھڑی لڑکی میں بڑھنے لگی۔

''مگر اس طرح کوئی تو سوچے کوئی تو سوچتا ہوگا اور وہ میں کیوں نہیں ہو سکتا۔''

وہ یہ بات اس وقت اسے متاثر کرنے کے لیے بالکل نہیں کہہ رہا تھا بلکہ اس کی زندگی گزارنے کے بارے میں ہمیشہ کچھ ایسی ہی رائے تھی وہ معمول کے کام نہیں کرنا چاہتا تھا۔

کشمالہ نے ایک توصیفی نگاہ اس پر ڈالی اور پھر اس کے دوست کے بارے میں سوچنے لگی۔ جو سب سے الگ تھلگ رہتا تھا اور سب کو پیارا لگتا تھا۔

اس وقت بھی وہ نانو کو یوں گھیر کر بیٹھا ہوا تھا جیسے انہیں کوئی لے جائے گا کشمالہ نے ٹیرس کی طرف آتے ہوئے ذرا سا پردہ اٹھا کر نانو کے کمرے میں جھانکا تھا اور پھر مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے اوپر آ گئی تھی۔

اسے یقین تھا وہ سب سے زیادہ اسی سے خائف ہے کیونکہ اس کے بعد اگر نانو کسی کو پکارنے لگی تھیں تو وہ کشمالہ تھی۔

کشمالہ کے چہرے پر اس لمحے بڑی من موہن سی مسکراہٹ تھی۔

کاشف نے ایک پر سوچ نگاہ اس پر ڈالی اور اپنے موبائل کی طرف متوجہ ہو گیا جس پر اس کے سینئر پروڈیوسر کی کال آ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

خولہ کافی وقت کے بعد میل باکس کے سامنے بیٹھی تھی اور وہ جانتی تھی ڈھیر ساری میلز اس کی منتظر ہوں گی۔

ہوسٹن کے دوست، پاکستانی فینز اور پھر دنیا کے ہر ملک میں اس کے نیٹ فرینڈز۔

وہ ذہنی طور پر تیار ہو کر بیٹھی تھی کہ آج بہت سارے لوگوں کو ریپلائی کرنا ہے لیکن پہلے ہی مرحلے پر اس کا ذہن قدرے بھٹک سا گیا تھا۔

سب سے اوپر خزیمہ کی تازہ میل تھی۔

ایک لمحے کو اس کا دل چاہا پڑھے بغیر ڈیلیٹ کر دے مگر اس کا سبجیکٹ اتنا پاور فل تھا کہ وہ تھم سی گئی۔

بس ایک لفظ لکھا تھا سبجیکٹ کے آگے "زندگی"

اس نے اوپن پر کلک کیا۔

اس کی آنکھوں میں محبت کا ستارہ ہو گا
ایک دن آئے گا وہ شخص ہمارا ہو گا
زندگی اب کے میرا نام نہ شامل کرنا
گر یہ طے ہے کہ یہ ہی کھیل دوبارہ ہو گا
یہ اچانک جو اجالا سا ہوا جاتا ہے
دل نے چپکے سے تیرا نام پکارا ہو گا
مجھ کو معلوم ہے جوں ہی میں قدم رکھوں گا
زندگی تیرا کوئی اور کنارہ ہو گا
کون رہتا ہے یہاں رات کے سناٹوں میں
میرے جیسا ہی کوئی ہجر کا مارا ہو گا

''اوہ نو..... کس قدر فارغ آدمی ہے..... بے وقوف.....''

وہ جھنجھلا سی گئی اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ وہ اسے کسی قسم کا ریپلائی کرے مگر اگلے ہی لمحے چیٹ باکس پر اس کی آئی ڈی بنک کر رہی تھی وہ اس وقت آنلائن تھا حیرت انگیز طور پر.....

اس کا ہاتھ بے ساختہ ماؤس پر گرفت کر کے اوپن پر کلک کر گیا۔

ایک اور شعر اس کا منتظر تھا

تم سا کیا ہوگا یہاں خواب کوئی

مجھ سا کیا ہوگا کوئی خواب طلب

''میں اپنے خوابوں کی دنیا کو اتنی آسانی سے اجڑنے تو نہیں دے سکتا نا اس لیے پھر در پر دستک دے بیٹھا جس کے اندر حسن اور باہر اجنبیت کا دربان بیٹھا ہے۔''

خولہ اتنی مشکل باتیں پڑھ کر سر تا پیر سلگ گئی تھی۔ یہ شخص اس کی زندگی میں آنے والا اپنی نوعیت کا واحد کردار تھا۔

''ہیلو مسٹر! جب ہم غلط دروازوں پر دستک دیتے ہیں تو پھر ہمیں مایوس لوٹائے جانے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔''

وہ اسے جواب دے کر پھر میل باکس کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

''میں اتنا جانتا ہوں کہ یہ دستک غلط نہیں، مجھے نہیں پتا میرا دل کیوں مجھے بار بار ایک مغرور اور سر پھری لڑکی کی چوکھٹ پر لے آتا ہے مجھے یہ بھی نہیں پتا کہ وہ میرے بارے میں کس حد تک برا سوچتی ہے لیکن مجھے یہ ضرور پتا ہے کہ اس دن سچ بولتے ہوئے اس کی آنکھیں لبوں کی جنبش سے ہم آہنگ نہیں تھیں۔''

خزیمہ کی باتیں اسے انوکھی بھی لگتی تھیں شاید یہی تجسس اسے ہمیشہ اس کے مقابل لا کھڑا کرتا تھا۔

یا پھر فطرت کا تقاضا تھا کہ چند لمحوں کے لیے ہی سہی مگر اس کی بے ربط گفتگو بے نام سی اپنائیت

کے ساتھ استحقاق کا اظہار اس کے دل کی زمین پر نقش ڈال دیتا تھا۔

وہ عمر کے بہکا دینے والے دوراہے پر تو نہیں کھڑی تھی البتہ خواب دیکھنے کی عمر کے سارے موسم اس کے منتظر تھے اور ان موسموں سے بھاگنے کی سعی کرنا حماقت ہوتی ہے البتہ سامنا کرنا اتنا آسان بھی نہیں ہوتا۔

''آپ کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے آپ اپنا اور میرا وقت ضائع کر رہے ہیں پلیز اسٹاپ دس۔''

وہ بھنا ہی تو گئی تھی یہ ٹھیک ہے کہ وہ بہت خوبصورت لفظوں کے ساتھ محبت، عشق، دوستی، خواب، رشتے اور اس طرح کے کئی موضوعات پر بلا تکان گھنٹوں تک بول سکتی تھی ایف ایم پر..... لیکن جب کبھی وہ لفظ حقیقت کا روپ دھار کر سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں تو مرد اور عورت کی تفریق کے بغیر بلا مبالغہ چھکے چھوٹ جاتے ہیں۔

سو خزیمہ کے یقین اور اعتماد پر چھکے تو اس کے بھی چھوٹ گئے تھے اور اس کا اظہار وہ غصے کے پیرائے میں ہی کر سکتی تھی۔

''میرا وقت تو میری مٹھی پر یادوں کے جگنو سجا رہا ہے اور یہ بھی جانتا ہوں اگر میرا دماغ خراب ہو گیا ہے اس کا اثر اس کے صحیح الدماغ ہونے پر ضرور ہو گا وہ لڑکی اگر بہت خوبصورت ہے تو میرے دل کی طلب بھی آئینے کی طرح شفاف ہے اسے ایک دن اپنا چہرہ اسی آئینے میں دیکھنا ہو گا۔''

اس کے ہاتھ شاید کسی مشین کی طرح چل رہے تھے کھٹ سے جواب حاضر ہوتا تھا اور اس بار حیرت انگیز طور پر خولہ کے مسحور کر دینے والے چہرے پر سجے گلابی لبوں کی کلیاں چٹک سی گئی تھیں اسے کوئی مرد جذبات کے لیے لفظوں کا خوبصورت چناؤ کرتے ہوئے پہلی بار ملا تھا۔

''یہ تو پاگل ہے.....'' اس کی بڑبڑاہٹ بیرونی دروازے سے اندر آتی ہوئی کشمالہ کے کانوں میں بھی پڑی تھی۔

''اب پھر کسی نے کچھ کہہ دیا۔''

اس نے پیچھے سے آ کر اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھا تو خولہ نے اس کے ملائم ہاتھ پر اپنا چہرہ ٹکا دیا۔

''مالا یہ بندہ تو ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گیا ہے میں ایگزاسٹ ہو رہی ہوں اس کی بکواس سے۔''

''کیا پتا وہ سچ بولتا ہو.....''

کشمالہ نے اس کے سنہرے لچھے انگلیوں سے سنوارنا شروع کر دیے تھے کمرے کے مدہم سے اجالے میں اس کے بالوں پر روشنی کا عکس شاید کسی کھڑکی یا دروازے کی جانب سے آ رہا تھا جبھی سونے کے تار سے چمکتے محسوس ہو رہے تھے۔

''یہ دیکھو.....کیا لکھا ہے اس نے۔''

اس نے کشمالہ کی توجہ کمپیوٹر اسکرین کی طرف مبذول کی جہاں نیا پیغام جگمگا رہا تھا۔

''دیکھیں میں جانتا ہوں یہ مشکل کام ہے لیکن کوئی تو یہ مشکل کام کرے گا اور آپ کو جیت لے گا وہ.....میں ایک دن یہ مشکل کام کروں گا۔''

کشمالہ بے ساختہ ہنس پڑی تھی۔

''کس قدر مشکل بات کی ہے اگر تم اس سے کوئی ریلیشن نہیں چاہتیں تو پھر اگنور کر دو مت پڑھ پڑھ کر الجھو.....''

''ہاں میں بھی یہ ہی سوچ رہی ہوں..... مجھے اس کو صرف اگنور کرنا چاہیے۔''

اس نے جیسے خود کلامی کی تھی اس احساس شرمندگی کے ساتھ کہ وہ کیوں ہر بار اس کی ای میل یا میسج کو پڑھتی ہے۔

''بند کر دو تھوڑی دیر کے لیے اور یہ بتاؤ.....ہم واپسی کا کیا کر رہے ہیں۔ تمہارا تو مسئلہ نہیں ہے لیکن میں لیٹ ہو رہی ہوں۔'' کشمالہ نے ریوالونگ چیئر قریب کی۔

''اچھا خاصا ہم اس دن پاپا کے گھر سے ہو آتے۔'' خولہ بھی اس کی طرف گھوم گئی تھی۔

''لیکن اچھا ہوا نانو کو ہمارے ہوتے ہوئے پرابلم ہوئی اور ہم نے اسے ہینڈل کر لیا راستے میں مشکل ہو جاتی تو.....'' کشمالہ نے رسانیت سے کہا۔

نانو اب کافی حد تک سنبھل گئی ہیں پھر ان کے ساتھ عاشر بھی ہیں اب بتاؤ کیا کرنا ہے۔ خولہ نے پرسوچ انداز میں کہا

''یہ جو عاشر صاحب ہیں ان کے ہونے اور نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' وہ ذکریار پر مسکرا دی تھی۔

''آپ کے صاحب جو ہوئے لیکن ان کو کب پتا چلے گا کہ وہ آپ کے صاحب بھی ہو گئے۔''

اس کی آنکھوں اور چہرے پر شرارت مچلنے لگی تھی۔

''ڈونٹ بی سیلی خولہ!''

وہ اپنی زندگی کے سارے فیصلے خود کرنے والی کشمالہ تھی پھر بھی اس کی معنی خیز بات پر سرخ سی ہو گئی تھی۔

''کیوں مالا..... کوئی تو یہ اسٹیپ اٹھائے گا نا۔ وہ تو کسی دوسرے سیارے کی مخلوق لگتا ہے لیکن تم تو اس دنیا کی ہو نا وقت ضائع کرو گی یا وقت کو قید کرو گی اس کے ساتھ جینے کے لیے۔ خولہ ہمیشہ کی جلد باز تو تھی ہی اور پھر حقوق نسواں کی بھی حامی۔''

''تم جانتی ہو یہ اس سوسائٹی کا سب سے بڑا ڈرا بیک ہے کہ ایک لڑکی لڑکے کو پروپوز کرے اسے لائف پارٹنر چن کر اس کا اظہار بھی کرے۔ یہاں پر ہمیشہ مرد کی پہل کا انتظار کیا جاتا ہے اور اس کی طرف سے پہل نہ ہو تو سارے جذبے اپنی موت آپ مر جاتے ہیں۔''

''اور تم دنیا کو سبق پڑھاتی ہو کہ غلط قسم کے رواج ختم کر کے زندگی کو اس کے حق کے ساتھ سہل انداز میں جیو لیکن خود تم اس رواج کا حصہ بننے جا رہی ہو۔ کتنی عجیب بات ہے۔''

''خولہ! میرے خیال میں یہ قبل از وقت باتیں ہیں وہ مجھے اچھا لگتا ہے آئی ایڈمٹ مجھے اس کی ضرورت ہے کیونکہ وہی مجھے اپنا رائٹ مین محسوس ہوتا ہے لیکن یہ ون وے ٹریفک ہے۔''

''اس کو ٹو وے بننے میں کتنا وقت لگتا ہے اور بنتا بھی ہے کہ نہیں..... سب باتیں طے شدہ وقت پہ بھی ہوں گی اور یہ طے شدہ وقت طے کرنا اور اس کی تصدیق ہونا ہمارا مسئلہ نہیں اس کے لیے وہ بیٹھا ہوا ہے نا! ہمارا رب..... ہماری شہ رگ سے بھی قریب تر..... ہمیں وہی دیتا ہے جس کی ہم طلب جذب دل کے ساتھ کرتے ہیں اور میں اس کے فیصلوں پر دل و جان سے بھروسہ کرتی ہوں یہ بات تم جانتی ہو۔''

کشمالہ ہر چیز کے مثبت پہلو کو مدنظر رکھا کرتی تھی۔

اس وقت اس کے لہجے میں یقین ہی یقین تھا خولہ اس کی آنکھیں بھی پڑھنے کی صلاحیت رکھتی تھی وہاں بھی کچھ ایسا ہی تاثر تھا۔ قدرے ناقابل فہم۔

''تم اس زمانے کی مخلوق نہیں ہو ورنہ معجزوں کا دور گزر چکا۔ وہ مایوس نہیں تھی لیکن کچھ کرنے اور پھر نتائج کا سامنا ہونے پر یقین رکھتی تھی۔''

''اچھا فی الحال ان باتوں کا وقت نہیں۔ اب فائنل کر لو ہم کب تک نکل رہے ہیں۔''

وہ سنجیدہ ہو گئی تھی۔

''او کے، آئی ایم ریڈی پاپا سے بات کر لو لیکن مالا کیا ہمیں کراچی نہیں جانا تھا، ہمارے شیڈول میں تو تھا نا پھر۔''

''ہم جا سکتے ہیں مگر زیادہ دنوں کے لیے نہیں.....''

''اور ہمیں مما کے ریلیٹوز سے ملنا ہے بلکہ انہیں ہم نے اب تک انفارم بھی نہیں کیا ہے۔''

''تمہیں پتا ہونا چاہیے ہمارے فادر کی فیملی اور ان کے ریلیٹوز بھی وہیں ہیں۔''

''ڈیم کیئر.....'' دونوں کا چہرہ اور لہجہ ایک ہی تاثر کا غماز تھا۔

☆.....☆.....☆

سعدیہ جب سے آئی تھی اپنی اماں کے کمرے میں تپتے وجود اور سلگتے دماغ کے ساتھ چت لیٹی ہوئی تھی۔

جو سرمد بخاری نے اس کے ساتھ کیا تھا وہ سرمد بخاری کی مرضی اور منشا کا کام تھا وہ اپنے چہرے پر ہاتھ بھر بھر کر غلاظت اور گندگی ملنے کے بعد آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے بدلے ہوئے روپ کو انجوائے کرنے والے لوگوں میں سے تھا۔

اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ یہ بدلا ہوا روپ بھیانک ہے..... یا کیف آور.....

شاید اپنے آپ میں جینے والے لوگ اپنی طمانیت کے لاکھ بہانے ڈھونڈ لیتے ہیں لیکن سعدیہ کی طمانیت، سکون اور اندر کا شریفانہ روپ تو اس وقت بھیانک رنگ میں ڈھل گیا تھا۔

جب اسے اپنے اور اظہر کے درمیان بھیانک رشتے کی حقیقت پتا چلی تھی۔

جب یہ اسے پتا چلا تھا کہ اظہر گھٹیا درجے کا وہ کاروباری آدمی ہے جو جذبوں کے نام پر جسموں کا سودا کرتا ہے۔

اس کوشش میں اس کی اپنی ہوس بھی پوری ہو جاتی ہے۔ اور سازش میں کامیابی کے بعد کمیشن بھی آجاتا ہے۔

اظہر کے بارے میں سوچ سوچ کر تو اس کی کنپٹیاں پھٹ رہی تھیں وہ جب سے گھر واپس آئی تھی سرمد بخاری کے بے رحمانہ سلوک کو بھول کر اظہر کی بے حسی اور اپنی بے وقوفی پر ماتھا پیٹ رہی تھی۔

سرمد بخاری تو پھر اتنا ظالم نہیں تھا۔ جانے کیوں وہ ایک جھرجھری سی لے کر سیدھی ہو گئی۔

اس کا چہرہ بھی سلگنے لگا تھا اور آنکھیں گزری رات کے ان واقعات کا پھر سے جائزہ لینے لگیں جو اس کے طوفانی مزاج کی ہر شدت کو روندتے چلے گئے تھے اور صبح تک بھٹی میں جلتے رہنے کے بعد وہ سب سے پہلے جو چہرہ بھولنا چاہتی تھی۔

وہ اس کے ابا کا چہرہ تھا۔

وہ ان کا سامنا نہیں کر سکتی تھی۔

اسے اپنی ماں سے خوف نہیں تھا لیکن نعمان..... اظہر کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔

وہ یکدم اٹھ کر بیٹھ گئی جیسے کسی گہرے خواب سے آنکھ کھلی ہو۔

اس نے تکیے کے نیچے سے موبائل نکالا اور اظہر کا نمبر ملانا شروع کیا وہ صبح سے یہ نمبر ملا رہی تھی مگر جواباً مکمل خاموشی تھی۔

شاید وہ اپنا نمبر بدل چکا تھا یا پھر..... وہ ساری رات ذہنی اور جسمانی مشقت کے بعد اب کسی کونے میں دھت پڑا تھا۔ وہ اس کے تصور کو جتنی گالیاں دے سکتی تھی دے رہی تھی مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

اس سے نہ گھٹن کم ہو رہی تھی اور نہ اپنی پامالی کا دکھ۔

''اظہر تجھے تو میں اپنے ہاتھوں سے دفن کروں گی منحوس تُو تو ہے بھی میرے ایک ہاتھ کی مار کتے، کمینے۔''

وہ بے بسی سے موبائل کو پٹخ کر خود سے مخاطب تھی۔ تب ہی دروازے پر ہونے والی آہٹ پر اس نے چادر منہ تک تان لی تھی۔

''اے سعدیہ! یہ کیا تو جب سے آئی ہے پڑی سو رہی ہے کیا ساری رات کی جاگی ہوئی ہے.....''

اماں نے شاید الماری کھولی تھی اور اس سے کچھ نکالا تھا وہ مزید سانس روک کر سوتی بن گئی۔

یہ تو اس کی غلط فہمی تھی کہ وہ ماں کا سامنا کر سکتی ہے..... اسے تو یہ لگ رہا تھا ان کی کھوجتی نگاہیں لمحوں میں اس کا پوسٹ مارٹم کر کے اسے سنگسار کرنے کا اعلان کر دیں گی۔

''اٹھ جا سعدیہ میں ذرا بازار تک جا رہی ہوں تو سبزی پکا لینا آج تیرے ابا کہہ گئے تھے کریلے

کھائیں گے۔ ساری زندگی کریلے کھاتے رہے اور خود کریلے پر ٹنگے رہے۔"

وہ اسے بھی آواز دے رہی تھیں اور بڑبڑا بھی رہی تھیں..... تھوڑی دیر بعد آہٹوں کا سلسلہ بند ہو گیا تھا اور اس کے دماغ پر برسنے والے ہتھوڑے بھی تھم گئے تھے۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر موبائل نکالا وہ مستقل بج رہا تھا۔

تکیے کے نیچے رکھا موبائل وائبریٹ بھی اس خوفناک انداز میں کرتا ہے کہ روح کے تار ہل جاتے ہیں۔

اس نے سوچا اور اس نامعلوم نمبر کا جائزہ لینے لگی جو دو بار مس ہو گیا تھا۔

اسی دوران موبائل پھر بجنے لگا..... اس نے چادر سے منہ نکال کر کمرے کا جائزہ لیا کوئی نہیں تھا اور دروازہ بھی بند تھا تسلی کرنے کے بعد اس نے فون ریسیو کر لیا۔ دوسری طرف کوئی اجنبی آواز تھی۔

"صاحب کہہ رہے ہیں آج آپ کب آئیں گی آپ کے لیے گاڑی کب بھیجی جائے۔"

مودبانہ انداز اور درخواست..... اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

☆.....☆.....☆

اے سی کی کولنگ اتنی زیادہ تھی کہ کمرا مصنوعی ٹھنڈ سے برفانی علاقوں کے کسی گھر کا منظر پیش کر رہا تھا۔

شمائلہ اپنے بے حس و حرکت وجود کو نرم مخملیں کمبل میں چھپائے سونے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

باہر کمرا اگر مصنوعی ٹھنڈ سے منجمد ہو رہا تھا تو شمائلہ کمال کی زندگی بھی مدت ہوئے ایسے ہی جمود کی لپیٹ میں تھی وہ کبھی کبھی اتنی بے حس و حرکت اور حرارت سے محروم ہو جاتی کہ منیر کمال کو ڈاکٹر کو کال کرنا پڑتا۔

اس وقت بھی وہ تھوڑی دیر پہلے اپنے کمرے میں آیا تھا لیکن شمائلہ کی نیند میں خلل نہ ڈالنے کے وعدے پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اپنی بوتل اور گلاس اٹھا کر باہر نکل گیا۔

یہ معاہدہ اس، وقت سے طے تھا جب شمائلہ کمال مصنوعی زندگی کے حصار سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آئی تو اسے احساس ہوا کہ منیر کمال کی قربت کو بے وقت اور بے وجہ برداشت کرنا دنیا کا غلیظ ترین کام ہے۔

تب وہ اس کی وحشت اور وجود کی گرمی میں اپنے کو خاکستر کرنے سے بچنے کے لیے چت پڑی رہتی اور منیر کمال اپنی سونے کی مرغی کو اتنے چھوٹے چھوٹے صدمے نہیں دے سکتا تھا اس لیے مسکراتے ہوئے اس سے وعدہ کر بیٹھا تھا کہ وہ کبھی اس کی نیند خراب نہیں کرے گا اور.....

اب اکثر شمائلہ گہری نیند میں ہوتی تھی۔

حالانکہ برسوں ہوئے اسے نہ گہری نیند آتی تھی اور نہ کوئی خواب اس کی پلکوں کی دہلیز پر دستک دیتا تھا۔

نیند کی گولیوں کے بغیر اسے سکون نہیں ملتا تھا اس وقت بھی پتا نہیں کیا بے چینی تھی کہ وہ نیند کی گولیاں لینے کے باوجود بے سکون سی تھی۔

دل و دماغ کو بے چینی سی لگی ہوئی تھی کمرے کا درجہ حرارت نقطہ انجماد پر تھا اور اسے گرمی لگ رہی تھی۔

اب جسم تو اس فریب میں آنے کو تیار تھا نہیں اس لیے اسے کمبل کی ضرورت تھی لیکن دل..... وہاں تک یہ ٹھنڈ پہنچ ہی نہیں پا رہی تھی۔

تب ہی اس کا موبائل بجنے لگا تھا اس نے ہاتھ بڑھا کر سائیڈ ٹیبل پر رکھا موبائل جلدی سے اٹھا لیا اس کی وائبریشن ساؤنڈ اس لمحے اس کی سماعتوں پر بم کی طرح برسی تھی۔

دوسری طرف اس کی کوئی سہیلی تھی۔ اس کی طرح فارغ اس کے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ آ گئی۔

''ہائے سونو! کیا حال ہے تیرا.....'' آواز پہچاننے کی کوشش کر کے دھیمے لہجے میں کہا۔

''میں ٹھیک ہوں..... تو سنا کیسی ہے کہاں ہے..... بالکل خبر ہی نہیں دیتی۔ جب پاکستان سے باہر چلی جاتی ہے تو نیوز پیپر سے پتا چل رہا ہوتا ہے۔ شمائلہ آج کل وہاں جلوہ افروز ہے۔''

وہ بھی اس کی طرح مکمل اداکارہ تھی شمائلہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''دیکھ تیرے میرے بیچ ایسا کچھ نہیں کہ تو میرے بارے میں اتنی بے چین ہو تو سنا تیری پارٹیز

کیسی چل رہی ہیں۔ آج کل تیری مہربانیاں کس کے ساتھ ہیں۔'' وہ اس کی بے چینی کا مزا لے کر بولی۔

''میری مہربانیاں اب کس کے ساتھ ہوتی ہیں تیرے..... تیرے شوہر کو دیکھ کر دل اب بھی ٹین ایج والی حرکتوں کے لیے پھڑکنے لگتا ہے مگر وہ ایسا پتھر آدمی ہے نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ یار تو نے اتنے سال اس کے ساتھ کیسے گزار دیے تھے۔'' وہ مصنوعی محبت اور حقیقی اشتیاق سے کہہ رہی تھی شمائلہ کو حیرت سی ہوئی۔

''منیر کمال پتھر کب سے ہو گیا۔'' اس نے سوچا اور اپنے تجسس کا اظہار بھی کر دیا۔

''ارے یار تیرے اس پالے ہوئے کی بات کون کر رہا ہے۔ میں تو تیرے سابقہ شوہر کی بات کر رہی ہوں۔'' وہ کھلکھلا کر بولی۔

''وہ جو نام ہی کا نہیں گنوں کا بھی راجہ ہے..... کس شان سے وہ اپنی گاڑی سے اترتا ہے۔ کس قدر بے نیازی سے وہ ہم سب کے سامنے سے گزر جاتا ہے..... میں تو آج بھی مر ہی جاتی ہوں ہائے۔'' اس نے ایک ٹھنڈی سی سانس لیتے ہوئے ہائے کی تھی اور شمائلہ کمال کے دل سے کراہ سی نکل گئی تھی۔

''تو جانتی ہے نا وہ اب میری زندگی میں نہیں ہے..... پھر تو کیوں اس کی مجھ سے بات کر رہی ہے۔'' نہ جانے کیوں اسے اپنی بات سچ نہیں لگی تھی اس کی سماعتیں کچھ اور سننے کی منتظر تھیں۔

''میں جانتی ہوں ڈیئر..... اب اس کی بات میں کسی اور سے کر بھی نہیں سکتی۔'' وہ جیسے اسے تصوراتی آنکھ سے دیکھ رہی تھی اور اس کے چہرے کی دل پھینک سی مسکراہٹ شمائلہ کو کھلی آنکھوں سے بھی بخوبی نظر آ رہی تھی۔

وہ بھلا ایسی عورتوں ان کے دعوت نظارہ دیتے چہرے اور مسکراہٹوں کی پھلجڑیاں بھول سکتی تھی جنہوں نے اس کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔

نفسیاتی مریض سا بنا دیا تھا۔

''کیا وہ یہاں آیا ہوا ہے.....'' اس نے جیسے ڈرتے ڈرتے خود سے سوال کیا۔

''نہیں نا میں کچھ عرصے کے لیے اسلام آباد گئی ہوئی تھی..... اور تو جانتی ہے نا وہاں کوئی بھی ایونٹ ارینج ہو اور وہ اس میں انوائیٹڈ نہ ہو..... ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا نا۔'' وہ پر جوش ہونے لگی تھی اور شمائلہ کمال کے اعصاب شل ہونا شروع ہو گئے تھے۔

''اچھا نا..... بس کر..... ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں تو بھی اب صبر شکر کر لے..... بلکہ اور کب تک اکیلی رہے گی..... ڈھونڈ لے کوئی لائف پارٹنر۔''

''پارٹنر کی مجھے کون سی کمی ہے شمائلہ! ہاں مگر لائف پارٹنر کی تلاش تو مجھے اس وقت تھی جب تمہارے ساتھ تمہارا لائف پارٹنر دیکھتی تھی۔ تم جیسے اس کی قید میں ہوتی تھیں اور اس کی نگاہیں تمہارے اردگرد حصار سا تان دیتی تھیں۔

وہ بس تمہیں دیکھتا تھا اور خوش ہوتا رہتا تھا، ایسا کوئی مجھے بھی مل جاتا تو زندگی سے گلہ نہ ہوتا..... اور تو نے اسے کھو دیا۔''

وہ سنجیدہ تھی شمائلہ کے شل ہوتے اعصاب یکدم برقی تاروں کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔

وہ لیٹی ہوئی تھی اس کی بات پر یکدم اٹھ بیٹھی اور اندر کی وحشت آنکھوں سے برسنے لگی۔

''بس کر دو سونم! تمہاری بے کار کی باتیں مجھے خواہ مخواہ ڈپریس کر رہی ہیں ہمارے راستے کبھی ایک نہیں تھے وہ مجھے اس لیے دیکھتا رہتا تھا کہ کہیں میں اس کے ہاتھ سے نہ نکل جاؤں۔ دوسرے لوگ میری تعریف نہ کریں..... اسے چھوڑ کر میری نہ پرواہ کریں..... تم نہیں جانتیں وہ بہت وہمی آدمی تھا۔''

اس کے جملوں میں کاٹ سی تھی جیسے اپنی خفت مٹا رہی ہو اس کے لہجے میں اے سی کی ساری خنکی سمٹ آئی..... سونم کو اس کی ذہنی حالت مشکوک سی لگی۔

''تم تو مجھے آج بھی پاگل پاگل ہی لگتی ہو..... جس کے ساتھ رہ رہی ہو وہ تمہیں پاگل خانے

پہنچانے کا پورا پورا انتظام کر رہا ہے ہے نا.....'' وہ بھی تلخ ہو گئی تھی۔

شمائلہ نے بے بسی سے فون کو دیکھا تھا۔

''اچھا اس وقت یہ باتیں کرنا ضروری ہیں تم کوئی اچھی بات نہیں کر سکتیں جسے سنتے ہوئے میں سو جاؤں۔'' اس نے جیسے ہار مان لی۔

''اچھا ٹھیک ہے تم سو جاؤ..... مجھے تو کچھ اور لوگوں سے بھی کام کی بات کرنی ہے میرا ٹائم تو پاس ہو ہی جائے گا۔''

اس نے جیسے شمائلہ کی ذات پر احسان کیا تھا، شمائلہ نے خوش دلی سے فون بند کیا اور آنکھیں موند کر تکیے پر یوں سر رکھ لیا جیسے کسی لمبی مسافت سے لوٹی ہو۔ گہری گہری سانسیں لے کر اس نے تھکن کا احساس کم کرنے کی کوشش کی۔

مگر جانے کیوں سانس لینا دشوار لگ رہا تھا۔ وہ بلڈ پریشر کی ٹیبلٹ بھی لے چکی تھی۔

پھر بھی سکون نہیں مل رہا تھا، جب ہی اسے اپنے سینے میں درد کی لہر سی اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی۔

اس نے چھوٹا کشن اپنے سینے کے نیچے رکھا اور الٹی ہو کر لیٹ گئی، نہ جانے کتنی دیر ایسے گزر گئی تھی، اور اس کوشش میں آنکھ بھی لگ گئی تھی۔

☆☆☆

وہ کافی دیر سے ٹی وی کے سامنے بیٹھا چینل سرچ کر رہا تھا، آج کچھ طبیعت بھی بوجھل ہو رہی تھی اور ابا کے ساتھ ائیر پورٹ بھی جانا تھا اس لیے آفس سے چھٹی کر لی تھی۔

سامعہ تیسری دفعہ چائے بنانے کے بالکل موڈ میں نہیں تھی اس لیے انار لے کر آ گئی تھی۔

''میں آپ کو اس کے دانے نکال کر دے دوں گی مگر مجھ سے اب چائے نہ مانگنا میں بتا رہی ہوں۔'' وہ دھمکی دے رہی تھی۔

''مگر کیوں آج تو ناشتے کے بعد صرف دو دفعہ چائے پی ہے یار اور وہ بھی تمہارے ہاتھ کی..... اماں کے ہاتھ کی ہوتی تو تسلی بھی ہو جاتی۔'' وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے اب مانگنا مجھ سے چائے.....'' منہ پھلا کر اس نے سارا غصہ انار کے دانوں پر اتارا اور مٹھی بھر کر اپنے منہ میں رکھ لیے..... خزیمہ کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

''اناروں پر غصہ اتارنے کا فائدہ بھی تمہیں ہی ہوگا..... میرے غصے کے دانے بھی کھا جاؤ گی۔'' وہ چینل بدلتے ہوئے بولا اور اس کے ساتھ ہی اس کے ہاتھوں کی حرکت بھی تھم گئی۔

نظریں اسکرین پر مرکوز تھیں انہوں نے بھی واپس پلٹنے سے انکار کر دیا تھا۔

منظر ہی ایسا تھا کہ اس نے بے ساختہ اس لمحے کو دعا دی جس میں وہ اس وقت اپنی زندگی کی سب سے قیمتی خوشی کو دیکھ رہا تھا۔

پھر اس نے خوشی کے تاثرات کو دل کی دیواروں میں چھپاتے ہوئے چہرے پر معمول کی مسکراہٹ لا کر سامعہ کو پکارا۔

''سامی! یہ دیکھو..... تمہاری فیورٹ خولہ۔''

خولہ کا نام اس کی سماعتوں سے ٹکرایا تو وہ کرنٹ کھا کر سیدھی ہو گئی۔

''خولہ کمال..... آر جے..... ایف ایم والی۔'' اس نے بے چینی سے کہا اور اچھل کر ٹی وی کے بالکل سامنے جا بیٹھی۔

''سامی وہ تو یہاں سے بھی صاف نظر آ رہی ہے۔'' اس نے جیسے خود سے کلام کیا اور سامعہ بھی ان سنی کر کے اس کو یوں دیکھنے اور سننے لگی جیسے وہ پلک جھپکنے پر اپنی کسی قیمتی شے سے محروم ہو جائے گی۔

وہ کسی یوتھ شو میں بطور گیسٹ شریک تھی۔ سیاہ رنگ کی شال اس کے سرخ لباس، بلونڈ بالوں اور بے پناہ شفاف رنگت پر بہت جچ رہی تھی اس کی شال کا پلو جس پر چھوٹے چھوٹے سرخ پھول اپنی

بہار دکھا رہے تھے اس کی بائیں طرف قدموں کے قریب پڑا ہوا تھا اور وہ بڑے شاہانہ انداز میں کرسی پر براجمان تھی۔ وہ ہوسٹ کی کسی بات پر مسکرائی تھی۔

اس غضب کی مسکراہٹ پر سامعہ کا دل تو دھڑکا ہی تھا، خزیمہ کے دل پر بھی قیامت کے لمحے گزر گئے تھے۔

اور یوتھ شو کا ہوسٹ اس سے سوال کر رہا تھا۔

''آپ اپنے پروگرام کے دوران جو شاعری پڑھتی ہیں سب لوگ تو اس کے سحر سے ہی نہیں نکل پاتے..... اتنا خوبصورت انداز..... یہ آپ کا اپنا ذوق ہے یا کسی کا دیا ہوا تحفہ.....

اب اسکرین پر وہی تھی اپنی بھرپور شخصیت کے سب سے خوبصورت اور نمایاں رنگ کے ساتھ..... اپنی آنکھوں میں گہرے سمندر کی نیلاہٹ سمیٹے.....

سامعہ ساکت اس کو دیکھ رہی تھی اور خزیمہ نے جانے کیوں اپنے دل کی شورش سے گھبرا کر نظریں ہی جھکالی تھیں۔

''بھیا! یہ تو بہت خوبصورت ہے پوری انگریز..... یہ تو ہمارے گھر میں..... ہمارا گھر تو اتنا چھوٹا سا ہے بھیا.....''

وہ اپنی فکروں میں مبتلا ہو گئی تھی خزیمہ کو اس لمحے اس کے معصوم چہرے پر بے پناہ پیار آیا تھا۔

اس کی آواز میں برستے موسم کی طغیانی تھی سامعہ کو لگا کہ جیسے وہ بھی کڑوے کسیلے آنسوؤں کا ذائقہ چکھ رہی ہو۔

''بھیا پھر وہ ہمیں اتنی پیاری اتنی اچھی کیوں لگی، بغیر دیکھے۔'' وہ اپنی جون میں کہہ گئی تھی اور اب تھوڑی سی شرمندہ بغور اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

وہ خزیمہ سے بہت چھوٹی تھی..... ان کے درمیان دوستانہ ماحول ضرور تھا مگر یہ اتنے پرسنل

معاملات بس خود بخود ہی ڈسکس ہونے لگے تھے۔

''بھئی! مجھے کیا پتا وہ تمہیں اتنی اچھی اور پیاری کیوں لگی.....ہم تو اس کے فین تھے آج بھی ہیں۔''

اسے اپنے جذبات چھپانے میں کمال حاصل ہو گیا تھا یہ الگ بات تنہائی میں خود کو آئینے کے سامنے کھڑا کر کے سوچتا تو چہرے پر صرف ایک ہی نام اور ایک ہی چہرہ جب ہوتا نظر آتا۔

''بھیا! یہ اتنی پیاری ہے۔'' وہ رو رہی تھی یا ہنس رہی تھی خزیمہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ البتہ اس کی دیوانگی پر پریشان ضرور ہو گیا تھا۔

''پگلی! زندگی میں ہم بہت سارے اچھے لوگوں سے ملتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب بالکل نہیں ہوتا کہ وہ ہماری قسمت میں بھی ہوں.....تم اتنی جذباتی کیوں ہو رہی ہو۔''

اس نے سامعہ کو اپنے قریب کر کے اس کے سر پر پیار کر کے لپٹا لیا تھا۔ خولہ اب بھی اسکرین پر جگمگا رہی تھی۔

اور ہوسٹ اس سے پوچھ رہا تھا۔

''آپ کی کامیابی میں کس چیز نے اہم کردار ادا کیا آپ کے اعتماد نے یا آپ کی خوبصورت شخصیت نے؟''

''آف کورس میرا اعتماد.....اب ریڈیو پر چہرہ تو نظر نہیں آتا۔'' وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''اگر آپ کے اس پروگرام کے اختتام پر پروڈیوسر صاحب آفر کریں اس شو کو ہوسٹ کرنے کی تو.....''

''میں آپ سے اچھا نہیں کر سکتی اس لیے انکار کر دوں گی۔'' وہ بے ساختہ کہتی گئی اور خزیمہ گہری سانس لے کر کھڑا ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

''یار! ایک بات تو بتا تو پیدائشی فلاسفر ہے یا ان جنگلوں میں رہنے کی وجہ سے تیری یہ حالت ہوگئی ہے۔ نہ تو ہنستا ہے نہ تفریح کرتا ہے اور اس پہ ستم یہ کہ ہمیں بھی نہیں کرنے دیتا کیوں خولہ.....'' اس نے خولہ سے تائید ضروری سمجھی تھی۔

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا۔''

وہی تو تھی اس جگہ پر اس کے ساتھ کو انجوائے کرنے والی اور اپنی مسحور کن باتوں سے انجوائے کروانے والی ورنہ کشمالہ تو کبھی اسے گھور رہی ہوتی اور کبھی خولہ کو ڈانٹ رہی ہوتی۔

وہ لوگ پہلی بار تو پزاہٹ نہیں آئے تھے اور نہ ہی پہلی بار اس پر رونق ماحول کا حصہ بنے تھے لیکن ایک دوسرے کے ساتھ گہرے بادلوں اور دھند والے موسم نے اس وقت کو یادگار سا بنا دیا تھا۔

یہ خولہ کی شرارت تھی کہ وہ کاشف کے ساتھ والی چیئر پر بیٹھ گئی تھی اور عاشر کو مجبوراً کشمالہ کے برابر میں بیٹھنا پڑا تھا اور اب دونوں کبھی عاشر کا تو کبھی کشمالہ کا نگاہوں ہی نگاہوں میں ریکارڈ لگا رہے تھے۔

اور بیٹھے بھی ایسی ہی جگہ تھے جہاں سے باہر کے سارے مناظر کا بخوبی نظارہ ہو رہا تھا اور ایسے میں عاشر کی سنجیدگی اور بے نیازی کم از کم کاشف کو بہت کھل رہی تھی۔

''تم لوگ مجھے سوچنے کے علاوہ کچھ اور بھی کر سکتے ہو نا۔'' بہت دیر کے بعد وہ بولا تھا اور جملہ اتنا معنی خیز تھا کہ کاشف بے ساختہ لمبی ہوں کر کے رہ گیا۔

''یا تو آپ بولتے نہیں.....اور بولتے ہیں تو خوش فہمی کی انتہا کر دیتے ہیں۔'' اس نے خولہ کی تائید حاصل کرنے کے لیے اپنا چہرہ گھمایا۔ وہ تو تھی ہی اس وقت اس کی پارٹی..... نیلے کنچوں میں ڈھیر ساری شوخی سمیٹ کر اسے دیکھنے لگی۔

وہ بس ایک لمحے کے لیے کنفیوژ ہوا تھا اور پھر اس نے خود کو ان تینوں کے رحم و کرم پر چھوڑنے کے بجائے اپنی لڑائی آپ لڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ کوئی اپنی ذات میں مگن رہنے والا زاہد خشک انسان بھی

ہوتا تو ان شرارتوں اور دلکش نظاروں کے ساتھ خود کو بے بس پاتا۔

وہ جس دن سے یہاں آیا ہوا تھا اسے لگ رہا تھا کے جیسے نانو کے بعد اب اس کی فکر کرنے والوں کی تعداد زیادہ ہوگئی ہے۔

راجہ صاحب کی محبت تو کندھوں پر بھاری بوجھ کی طرح دھری ہوئی ہی تھی اب کاشف اور پھر یہ دونوں وہ ابھی تک دونوں میں واضح طور پر فرق نہیں کر پاتا تھا لیکن اتنا ضرور جانتا تھا کہ اس وقت اس کے برابر میں کشمالہ بیٹھی ہے۔

وہ سنہرے بالوں والی اجنبی لڑکی جو اس اجلی صبح کا سارا روپ اپنے اندر سمیٹے اسے بڑی شناسا نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

اور وہ ہی شناسا نظریں آج کل بھی اس کا تعاقب کرتی رہتی تھیں۔

"ویسے آپ بولتے ہوئے بہت اچھے گتے ہیں..... بلکہ یوں کہنا چاہیے آپ کو بولتے رہنا چاہیے۔"

وہ ہمیشہ خوش رہتی تھی یا اس وقت اس کا چہرہ اندرونی مسرت سے چمک رہا تھا عاشر کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

البتہ کاشف بہت کچھ سمجھ کر انجان بننے کی خوب اداکاری کر رہا تھا وہ اپنے سامنے بیٹھی اس خوش ادا حسینہ کی آنکھوں میں ان مہربان ستاروں کی جگمگاہٹیں دیکھ رہا تھا۔ جنہیں عمر کے ایک خاص مقام پر جذبوں کی منہ زور آندھیاں روشنی کے ان گنت جگنو دے جاتی ہیں۔ اور پھر تمام عمر وہ آنکھیں ان جگنوؤں کی حفاظت کرتے ان کو زمانے کے سرد و گرم سے بچائے رکھنے میں لگی رہتی ہیں۔

اسے حیرت بالکل نہیں ہوئی تھی وہ جانتا تھا محبت ایسا ہی حادثہ ہے۔

زمان و مکان کی قید سے ماورا..... مکین کی شرف قبولیت اور رضا سے بے بہرہ..... اسے بس اپنے ہونے سے غرض ہوتی ہے اور جس سے ہو جائے اس کی ساری توجہ اپنی طرف سمیٹ لینے سے مطلب

.....ہے تو دیوانگی مگر زندگی کو یہ دیوانگی اچھی بھی تو بہت لگتی ہے۔

وہ چپکے سے دل ہی دل میں ہنس پڑا تھا۔

''اسی لیے تو میں بضد ہوں یہ میرے ساتھ کام کرے میری ڈاکومینٹری کو ہوسٹ کرلے.....میں ایک نئے انداز کی چیز بنانا چاہتا ہوں مگر عاشر صاحب ہیں کہ ناک پر مکھی ہی نہیں بیٹھنے دیتے۔ وہ خولہ اور کشمالہ کی طرف مدد طلب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ کشمالہ نے کاشف کو ستائشی نظروں سے دیکھا کہ گویا اسے یہ آئیڈیا بہت پسند آیا ہو۔

''کاشف! ہم یہ چیپٹر کلوز کر چکے ہیں نا تمہیں بتایا تو ہے میں اس طرح کے کام نہیں کرسکتا بالکل مس فٹ ہوں میں تمہاری ڈاکومینٹری میں۔ تم خواہ مخواہ مجھے انڈلج کروگے۔''

وہ کولڈ ڈرنک کا سپ لیتے ہوئے رسان سے بولا تو اب کافی دیر کے بعد کشمالہ کچھ بولنے کے لیے میدان میں کود پڑی۔ وہ بھی تو کاشف کے کام اور اس کی ڈیمانڈ کی نوعیت سمجھتی تھی۔

جانتی تھی کاشف کے ذہن میں کوئی اچھوتا خیال ہی پل رہا ہوگا۔ اتنے دنوں میں اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ کاشف اس پروفیشن میں صرف پیسہ کمانے کے لیے نہیں بلکہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے استعمال کے لیے آیا ہے۔

''دیکھیں عاشر! جس نظر سے کاشف آ کو دیکھ رہا ہے آپ خود کو آئینے میں اس نظر سے نہیں دیکھ سکتے..... وہ پروڈیوسر ہے ایک تخلیق کار اسے یقیناً آپ میں potential نظر آ رہا ہے اور ویسے بھی آپ اپنے پروفیشن میں رہ کر صرف earning کر سکتے ہیں جبکہ اس پروفیشن کے ذریعے دوسروں کی مدد کر سکتے ہیں۔ اپنی ذات کا کتھارسس کر سکتے ہیں۔

عاشر نے اس کی بات پر ذرا سا پلٹ کر دیکھا تھا دونوں بہنوں کو بولنے میں کمال حاصل تھا اور کشمالہ تو اس کی ذات کے کتھارسس کی بات کر رہی تھی اسی حیرت سی ہوئی تھی۔

''کیا میری ذات کے اندر کی لڑائیاں میرے چہرے پر لکھی ہوئی ہیں ہاؤ رب ش۔'' اس نے خود کو ڈپٹا۔

''لیکن مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس کا لہجہ یکدم سخت ہو گیا۔

''اوہ بابا! ضرورت مجھے آپ کی ہے اور جس کی ضرورت ہوتی ہے وہ بار بار ریکویسٹ تو کرتا ہے نا کبھی تو سنی جائے گی نا۔'' کاشف نے اس کے لہجے کی ٹھنڈک کو اپنے خوشگوار لہجے کی گرمی میں سمیٹنے کی کوشش کی خولہ پزا کھانے میں مگن تھی اچانک سر اٹھا کر بولی۔

''مالا! تم بھی تو کچھ ایسا ہی کرنا چاہتی ہو نا تم نے پاکستان آنے سے پہلے جو آئیڈیا اپروو کروایا تھا وہ دنیا کے قدیم شہروں کی تلاش سے متعلق ہے اور تم وہاں کے لوگوں پر ریسرچ کرنا چاہتی ہو..... مجھے تو لگتا ہے عاشر عباس تمہارے پروجیکٹ کے لیے زیادہ فٹ ہے۔

عاشر عباس تمہاری مدد کر سکتا ہے، زندگی کی تلاش میں.....''

وہ جتنی روانی سے بولی تھی اتنا ہی سوچ سمجھ کر بھی بولی تھی۔

اس نے جتنی سنجیدگی سے بات کی تھی اتنی ہی سنجیدگی سے سب نے سنی بھی تھی کاشف کی سوالیہ نگاہیں بے ساختہ عاشر کی طرف اٹھی تھیں وہ کچھ حیران سا خولہ کی شکل دیکھ رہا تھا۔

یہ دونوں تو صرف کمال نہیں باکمال لڑکیاں تھیں، انہیں پرواہ ہی نہیں تھی عاشر اکے بارے میں کیا سوچتا ہے ان کے ساتھ اتنا روڈ رویہ رکھتا ہے۔

بعض اوقات تو اس کی آنکھوں میں ان کے لیے واضح بے زاری ہوتی ہے اس کا بس نہیں چلتا کہہ دے چلی جاؤ یہاں سے.....

وہ کہنا چاہتا ہے مگر کہہ نہیں سکتا ہے تم لوگوں کی وجہ سے تو میں تمام عمر اپنے باپ کا انتظار کرتا رہا ہر خوشی کے موقع پر اس کی ستائش اس کا سایہ ڈھونڈتا رہا اور وہ تم دونوں پر اپنی محبت لٹاتا رہا اور جو اس کی محبت کی نشانی تھی اسے محبت سے محروم کر کے خود کو بس سزا دیتا رہا کیا وہ یہ سب باتیں بھول جائے۔

کیا وہ اس وقت کو بھول جائے جو اس نے بے یقینی کی دھند میں گزار دیا تھا۔ کیا وہ یہ باتیں سمجھتی

نہیں تھیں یا پھر سمجھتی تھیں تو انجان بن کر اس سے ہمدردی کر رہی تھیں۔

''لیکن آپ لوگ میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں۔ مجھ سے ہی یہ سب کیوں کروانا چاہتے ہیں۔ میں خوش ہوں جو کر رہا ہوں اس میں بھی میرا انٹرسٹ ہے۔ جبھی تو نانو کو چھوڑ کر اتنی دور جا بیٹھا۔

اس نے شاید پہلی بار ان کے سامنے اپنے بارے میں کوئی بات کی تھی۔

کشمالہ کے چہرے پر مسرت بھرا تاثر ہچکولے لینے لگا تھا۔ وہ بے زاری وغیرہ بھول کر اسے یوں سن رہی تھی جیسے کوئی معصوم بچے کے نت نئے سوالوں کے جواب دینے کے لیے تیار ہو۔

''میں کب کہہ رہا ہوں کہ تم خوش نہیں ہو اور میں یہ کب کہہ رہا ہوں کہ ہم تم سے کچھ زبردستی کروانا چاہتے ہیں ہم تو بس یہ چاہتے ہیں کہ.....''

وہ سانس لینے کو رکا تب ہی خولہ بول پڑی۔

''ہم تو بس یہ چاہتے ہیں کہ آپ کی یہ جو خوب صورت سی پرسنالٹی ہے اس کو لوگ اسکرین پر دیکھیں اور ہمارے انتخاب کی داد دیں۔

آئی مین پروڈیوسر صاحب کو شاباش دیں.....''

اس نے ماحول کی سنجیدگی کو کم کرنے کے لیے درمیان میں کودنا لازمی سمجھا تھا ورنہ اسے لگ رہا تھا ابھی یہ اینگری ہیرو اٹھ کر چل دے گا جو نیو بلیو کلر کی شرٹ اور بلیو جینز کی جیکٹ میں کشمالہ کے برابر بیٹھا ہوا اتنا ہینڈسم لگ رہا تھا اور کشمالہ اس کے پہلو میں سمٹی ہوئی سی بیٹھی اتنی محفوظ اور مکمل لگ رہی تھی کہ خولہ کا بس نہیں چل رہا تھا دونوں کے ہاتھ پکڑ کر ایک دوسرے کے ہاتھ میں دے دے اور کہے۔

''تم دونوں ایک دوسرے کے لیے ہی بنے ہو خبردار جو قدرت کے اس فیصلے سے ضد کی۔'' خولہ کی بات سے سب محظوظ ہوئے تھے سوائے عاشر کے۔

''تمہیں اب اتنی بیوٹی فل لڑکی نے ہینڈسم کہہ دیا ہے لہذا اسی خوشی میں ہمیں کہیں کافی پلانے لے کر چلو۔ یہاں کی سب سے بیسٹ کافی پینی ہے ہمیں! ہیں نا..... گائز.....'' کاشف نے اب کھانے

سے ہاتھ کھینچ لیے تھے۔

وہ مسکراتی نگاہوں سے کشمالہ کو دیکھ رہا تھا۔ جس کا گلابی لباس اس کی سرخ و سپید رنگت میں جذب ہو رہا تھا۔ اس کی سرخ شال کا سنہرا بارڈر اور سونے کے تاروں جیسے بال اتنا خوبصورت امتزاج پیش کر رہے تھے کہ کاشف کو اس کے برابر میں بیٹھے عاشر عباس کی بے نیازی اور بے خبری پر حیرت ہو رہی تھی جس نے اب تک توجہ کی معمولی سی نگاہ بھی اس پر نہیں ڈالی تھی جب کہ کشمالہ کو دیکھ کر تو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے آج وہ زندگی میں پہلی بار اتنی خوش ہوئی ہو۔ شاید اپنے من پسند بندے کی قربت کا احساس یوں ہی مسرور کر دیتا ہے۔

اسے اپنے اندر آنے والی تبدیلی کی خبر تو پہلے دن ہی ہو گئی تھی لیکن یہ احساس اتنا مکمل کر دیتا ہے اس کا اندازہ آج ہوا تھا جب اس کے برابر بیٹھنے کے بعد خولہ نے ایک بھرپور ستائشی نگاہ کے ساتھ دھیمے سے واؤ کہا تھا۔

''کافی تو میں پلا دوں گا لیکن اس سے پہلے والی بات .....'' وہ مسکرا دیا تھا بہت مزے سے کندھے اچکا کر اس کی مسکراہٹ بھی تو نایاب شے تھی۔

کاشف تو بھولے بسرے فیضیاب ہو ہی جاتا تھا البتہ وہ دونوں اس یادگار وقت کی مشکور تھیں۔ ورنہ اس کے چہرے پر آج تک برف ہی جمی دیکھی تھی۔ کشمالہ کہ اندر اطمینان ہلکورے لے رہا تھا۔ اس شخص کو زندگی کی رعنائیوں کی طرف لانا اتنا بھی مشکل نہیں تھا اور پھر زندگی اگر کشمالہ کے روپ میں ہو تو.....!

''یار! آج بہت کھا لیا ہے اور ابھی پینا بھی ہے.....بس اب اٹھو یہاں سے.....'' اس کا سارا زور پینے پر تھا۔ عاشر نے آنکھیں دکھائی تھیں۔

کاشف کرسی گھسیٹ کر کھڑا ہو گیا تھا خولہ نے بھی تائیدی انداز میں سر ہلا دیا تھا۔ کشمالہ بھی شال کو اپنے گرد لپیٹتے ہوئے کھڑی ہو گئی تھی۔

''اگر تم لوگ بیسٹ کافی پینا چاہتے ہو تو پھر گھر چلو۔'' عاشر نے بڑے خوشگوار لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب..... کیا اس شہر کی بیسٹ کافی خدیجہ بناتی ہے۔'' کشمالہ ہنسی۔

''نہیں اس شہر کی بیسٹ کافی عاشر بناتا ہے۔''

وہ شاید پہلی بار اس کے چہرے پر نظریں جما کر بات کر رہا تھا۔

''واؤ.....'' خولہ اور کاشف تو نعرہ بلند کر کے رہ گئے تھے۔

اور اسی شور میں دو تین ٹیبلز کے لوگ بھی ان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

تب ہی سمیع صولت کی نظر خولہ پر پڑی تھی۔ وہ اپنے کزنز کے ساتھ وہاں موجود تھا خولہ کو دیکھ کر ان کی طرف آ گیا۔

''ہائے..... سمیع آپ یہاں پر.....'' خولہ نے گرم جوشی کے ساتھ اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

سمیع کے چہرے پر بھی محسوس کی جانے والی خوشی تھی۔

''میں تو سمجھا تھا آپ شہر سے ہی نہیں ملک سے بھی چلی گئیں فون بھی اٹینڈ نہیں کیا۔'' وہ شکوہ کر رہا تھا۔ خولہ نے اس کا تفصیلی تعارف کروایا سب نے جواباً گرم جوشی کا اظہار کیا۔

''اصل میں مصروفیت ہی کچھ زیادہ ہوئی تھی ایک دو دن کے بعد ہمیں جانا تھا اس لیے پروگرام کرنے کا نہیں سوچا۔'' وہ شال نما دوپٹے کو اچھی طرح سے سمیٹتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

آناً فاناً موسم بدل گیا تھا اور ٹھنڈی ہواؤں نے سمٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''آپ بتائیے سب کیسا چل رہا ہے۔'' خولہ اس کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گئی تھی۔

''کچھ بھی ٹھیک نہیں چل رہا دراصل آپ کے حصے کا پروگرام مجھے کرنا پڑتا ہے اور میں پروگرام نیند میں کر رہا ہوتا ہوں۔

اس نے مزے سے کہا تو سب ہنس پڑے۔

''کاشف مجھے بذات خود سمیع کی آواز بہت پسند ہے۔ تمہیں اگر وائس اوور کروانا ہو تو انہیں ضرور یاد رکھنا۔''

اس نے ستائشی انداز میں کہا تو سمیع کی آنکھیں چھلک سی گئیں۔

وہ درمیانے قد کا بہت ہی شائستہ لب و لہجے میں گفتگو کرنے والا خوش مزاج نوجوان تھا اس کی عمر کے لوگوں میں انکساری کا عموماً فقدان ہوتا تھا مگر وہ انکساری کی زیادتی کے ساتھ کبھی کبھی الجھن میں ڈال دیتا تھا۔

شاید جو حادثہ اس کے ساتھ ہوا تھا وہ اس سے اس کی عمر کی جوانی چھین کر لے گیا تھا۔

خولہ کو وہ پہلے دن سے اچھا لگا تھا اور اس وقت بھی اس کے لہجے سے جھلکتی بے تکلفی و خوشی اس بات کی غماز تھی۔

عاشر اس سارے عرصے میں انہیں باتیں کرتے دیکھ کر محظوظ ہو رہا تھا شاید یونیورسٹی کے بعد وہ اب اس طرح کے ماحول کا حصہ بنا ہوا تھا اس لیے انجوائے بھی کر رہا تھا۔

''میں ان سب کو اسلام آباد کی بیسٹ کافی پلانے لے کر جا رہا ہوں۔ آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔

بالآخر وہ بہت دیر تک چپ نہ رہ سکا۔

اس نے حق میزبانی خوش نبھایا تھا۔ کشمالہ اور خولہ کو وہ بیک وقت بہت ذمہ دار اور مہربان لگا تھا۔

''پر کون سی کافی کی بات ہو رہی ہے؟'' وہ مسکرایا نظروں میں معنی خیز سی شرارت بھی تھی۔ اب پتا نہیں وہ کون سی کافی کی بات کر رہا تھا۔

''یہ ان فیکٹ اس کافی کی بات ہو رہی ہے جو عاشر اپنے ہاتھوں سے بنا کر ہمیں پلائیں گے۔''

❁ ❁

ناول خواب خواہش اور زندگی ابھی جاری ہے۔ مزید واقعات اگلے صفحات میں پڑھیں۔

قسط نمبر 5

کشمالہ بالکل غیر محسوس طریقے سے اس کے قریب کھڑی ہوگئی تھی اور اس کے لہجے میں محسوس کیا جانے والا استحقاق تھا۔

عاشر نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی حدت کا حصار اپنے اردگرد پھیلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

''میں ضرور ان ہاتھوں کی بنی ہوئی کافی سے لطف اندوز ہوتا لیکن میرا یہ جوٹولا ہے نا میرا گلا دبا دے گا۔''

اس نے اپنے کزنز کی طرف اشارہ کیا جو اب اسے آواز دے رہے تھے۔

''بہت اچھا لگا آپ سے مل کر، خولہ نے سفارش بھی کردی اس لیے ہم بہت جلدی ملیں گے۔''

کاشف نے گرمجوشی سے پھر ہاتھ ملایا اور سمیع نے ذرا سا ماتھے پر ہاتھ لے جا کر اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔

''میں آپ دونوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوا مجھے خولہ نے بتایا تھا اس کی ٹوئن سسٹر بھی ہے اب وہ اتنی زیادہ ٹوئن ہے اس کا احساس اب ہو رہا ہے۔''

وہ کشمالہ سے مخاطب تھا اور عاشر عباس غیر ارادی طور پر اسے دیکھنے لگا تھا بلکہ شاید اس نے پہلی بار دونوں کی زبردست مشابہت پر غور کیا تھا لیکن فرق کیا تھا وہ یہ نہیں جان پا رہا تھا۔

سمیع صولت ان سے رخصت ہو گیا تھا اور کاشف کیانی انہیں جلد آنے کا کہہ کر گاڑی لینے چلا گیا تھا۔ جو خاصی دور پارک کی گئی تھی۔

وہ تینوں ٹہلتے ہوئے باہر آ گئے تھے اپنے آپ میں مست خوش و خرم لوگوں کا ہجوم گاڑیوں کی قطاریں اور اس سے ذرا ہٹ کر ان تینوں کی نگاہوں کا مرکز سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے وہ ماں بچہ تھے جنہیں شاید کسی نے پیزا ابھی کھانے کے لیے دیا ہوا تھا۔

وہ اس بچے کو سردی سے بچانے کے لیے اسے اپنے سینے سے چمٹائے پیزا کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے دے رہی تھی۔

تب عاشر کی نگاہوں میں برسوں پہلے والا وہ منظر گھوم گیا تھا جب اس نے ایسے ہی کسی بچے کی مدد کرنے کے لیے اپنی ماں سے پیسے مانگے تھے تو ماں نے ایک ناراض سی نگاہ اس پر ڈالی تھی۔

''عاشر جانو! یہ گندے لوگ ہیں..... آپ ان کے پاس جانا مت..... بیمار ہو جاؤ گے۔'' اور عاشر واقعی میں ان کے گندا ہونے پر افسوس کرتا ہوا گاڑی میں بیٹھ گیا تھا۔

آج پھر اس کے سامنے وہی منظر تھا لیکن اس سے پہلے وہ اپنے بچپن کی خواہش پوری کرتا۔ کشمالہ اس منظر کا حصہ بننے کے لیے پہنچ گئی تھی اس نے بڑی نرمی سے اس بچے کے گالوں کو چھوا تھا اس کی ماں کو کچھ پیسے تھمائے تھے اور انہیں یہاں سے جانے کی تاکید کرتے ہوئے شال کا پلو سمیٹتے ہوئے واپس ان دونوں کے پاس آ گئی تھی۔

عاشر نے صرف سوچا تھا ان کے بارے میں اور وہ کر گزری تھی اسے حیرانی نہیں ہوئی تھی..... بس اچھا لگا تھا۔

دل کے کسی جھروکے پر..... ایک انجانے سے احساس نے دستک دی تھی خولہ اس سے کوئی بات کر رہی تھی اور ادھر کاشف ہارن دے رہا تھا۔

تینوں ایک دوسرے کے ساتھ چلتے ہوئے اپنی گاڑی تک آ گئے تھے۔

☆.....☆.....☆

''کتے، کمینے، ذلیل، منحوس، گھٹیا آدمی..... تمہاری ہمت کیسے ہوئی مجھے فون کرنے کی، مجھ سے بات کرنے کی تم جیسے غلیظ شخص کا میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا تم اس طرح مجھے برباد کرو گے اور میں تمہاری محبت میں اندھی ہو کر برباد ہوتی چلی جاؤں گی..... یہ تمہاری خام خیالی تھی..... اظہر۔'' اس نے موٹی سی گالی دے کر ایک گہری سانس لی تھی اور فون کو یوں گھور کر دیکھا تھا جیسے وہ اظہر ہی تو ہو۔

''میری بات تو سنو..... سعدیہ..... تم مجھ پر غلط ناراض ہو رہی ہو..... میں نے کچھ نہیں کیا..... میرا کیا قصور مجھے تو خود وہاں پہنچ کر پتا چلا کیا گڑبڑ ہے اور دیکھو میں نے تمہیں ڈانس کرنے کے لیے بھی نہیں کہا نہ ورنہ وہاں سب.....'' وہ بہت معصوم بن کر رک رک کر وضاحتیں دے رہا تھا، سعدیہ کے اندر آگ سی بھر گئی تھی۔

گزری رات کو اس نے کسی کی آگ بجھائی تھی اور اس وقت اسے اپنے اندر جو بھانبڑ جلتے محسوس ہو رہے تھے انہیں اظہر کی ذلت بھری موت ہی بجھا سکتی تھی۔

اس نے بے اختیار اسے بددعا دی تھی۔

''اللہ کرے اظہر! تم برباد ہو جاؤ اور تمہیں مر کر بھی سکون نہ ملے..... تمہارے گھر کی عزت بھی اسی طرح خاک میں مل جائے جس طرح تم نے میری عزت کو نیلام کیا ہے تم مر جاؤ اظہر..... برباد ہو جاؤ تم۔''

وہ تیز تیز بولتے ہوئے سسکنے لگی تھی۔ اس کی آنکھیں لہو رنگ ہو رہی تھیں اظہر جانے اور کیا کچھ بول رہا تھا مگر اس نے موبائل بند کر کے نفرت سے اپنی بائیں طرف تھوکا تھا اور پھر جب پلٹی تو اس کی سانسوں کا ردھم یوں ٹوٹا تھا جیسے کوئی پرانا ریکارڈ چلتے چلتے جھٹکا کھا کر تھم جائے اور پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ چلنا شروع کر دے..... پھولی سی آواز میں اس کی سانس کی ڈور بھی ایسے ہی بحال ہوئی تھی صوفیہ کی بے نیازی پر۔

اس کے سامنے صوفیہ کھڑی تھی۔ چھت کی ادھ ٹوٹی دیوار سے ٹیک لگائے بہت اطمینان سے

بظاہر تو وہ مغرب کے وقت پرندوں کی قطاروں سے محظوظ ہو رہی تھی جو اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔

لیکن یہ کیسے ممکن تھا اتنے کم فاصلے پر اس نے سعدیہ کی آواز نہ سنی ہو اس کی وحشت بھری تکرار نہ سنی ہو۔

اس کی بددعائیں کانوں میں نہ پڑی ہوں جو اس نے اظہر کا نام لے کر دی تھیں۔

اس کی نظریں خود بخود جھک گئیں۔

وہ سرعت سے اس باؤنڈری وال کو کراس کر کے سیڑھیاں اترنا چاہتی تھی کہ صوفیہ کی آواز پر تھم سی گئی۔

''سنو..... سعدیہ کیا میں تمہاری ہیلپ کر سکتی ہوں۔'' اس کا لہجہ دوستانہ آواز بے حد نرمی لیے ہوئے تھی۔ سعدیہ کے قدموں میں زنجیر سی پڑ گئی ورنہ اسے یہ لڑکی بڑی دھوکے باز اور مغرور سی لگتی تھی۔

اس کو دیکھ کر وہ ہمیشہ احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتی تھی ایک دفعہ اس نے بڑی شدت سے خواہش کی تھی کاش وہ بھی راحت چاچی کی اولاد ہوتی۔

اور آج راحت چاچی کی یہ اولاد اس کا راستہ روکے کھڑی تھی اس کی خودسری ضرور غالب آ جاتی اگر دو دن پہلے کا حادثہ اسے خالی نہ کر گیا ہوتا۔

''تم میری کیا ہیلپ کرو گی..... تم نے سن لیا نا..... میں نے اظہر سے نفرت شروع کر دی ہے مجھے اب کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''

وہ اب اس کو بے خوفی سے دیکھ رہی تھی۔ صوفیہ کے چہرے پر مدھم سی مسکراہٹ آ گئی۔

''میں نے جو سنا وہ ادھورا تھا ہم پوری بات کر سکتے ہیں۔ آؤ ادھر میرے کمرے میں چلو..... آئی مین اسٹور میں چل کر بیٹھتے ہیں۔''

صوفیہ نے چھت کے اس کونے کی طرف اشارہ کیا جہاں اس کا کمرہ تھا جسے شجاع نے حجرہ کہنا شروع کر دیا تھا۔

''مجھے کوئی پوری بات نہیں کرنا، تم شاید جانتی ہو میرا اظہر کے ساتھ چکر تھا مگر اب وہ بھی نہیں رہا۔'' وہ اس کے ساتھ چل پڑی تھی نا چاہتے ہوئے بھی۔

''کیوں.....اس نے تمہیں ہرٹ کیا ہے نا.....'' وہ اس کے روئے روئے چہرے کا بغور جائزہ لے کر بولی جہاں کسی انہونی کا کرب بھی تھا جسے صوفیہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

''مجھے نہیں پتا ہرٹ کرنا کیا ہوتا ہے لیکن اب میری زندگی میں نہیں تم چاہو تو اماں کو بتا سکتی ہو..... لیکن پلیز مجھے وہ شادی کرنے کے لئے مجبور نہ کریں۔'' سعدیہ دکھ سے زیادہ تلخی میں مبتلا تھی صوفیہ کو اس گھر کے ہر فرد کا مسئلہ یہ ہی لگا تھا۔

وہ دونوں چلتی ہوئی اندر کمرے میں آ گئی تھیں۔ صوفیہ بغور اس کی باتیں سن رہی تھی اس نے اپنی دراز کھول کر پیپسی کے ٹن نکالے اور ایک اسے تھما دیا۔

''یہ بات تو تم بھی ان کو بتا سکتی ہو..... میں تو ان سے بات ہی کہاں کرتی ہوں..... مجھے تو پتا نہیں وہ کیسے برداشت کر لیتی ہیں۔ معذرت کے ساتھ..... میں ابھی تک ان کا رویہ سمجھ نہیں پائی..... وہ ہر کسی سے ناراض رہتی ہیں..... ہے نا۔''

صوفیہ نے اس کے قریب اپنے بیٹھنے کی جگہ بنائی۔

''تم سے کس نے کہا تھا اپنے گھر کا سکھ چھوڑ کر یہاں آ جاؤ..... ہمارا گھر اور اس کے لوگ تو ایسے ہی ہیں تمہارے معیار پر کیسے پورے اتر سکتے ہیں۔'' اس نے ٹن کھولنے کی کوشش کی گرنا کام رہی۔

صوفیہ نے ٹن لے کر بڑی آسانی سے اس کا چھوٹا سا لاک نما ڈھکن ہٹایا اور پھر اسے تھما دیا۔

''کیا یہ میرا گھر نہیں ہے میں تم لوگوں کی کچھ نہیں لگتی سوچو اگر ہم سب ساتھ رہ رہے ہوتے تو آج ایک دوسرے کے بہت اچھے دوست ہوتے نا۔'' صوفیہ نے سپ لیتے ہوئے اسے بغور دیکھا۔

''دوست تو تب ہوتے جب تم ہمارے جیسی ہوتی صوفیہ! تم اس گھف کی مالکن ہو تمہارا اور ہمارا

کیا مقابلہ.....تم جب چاہو ہم سب کو اس گھر سے نکال کر باہر کر سکتی ہو شاید تمہیں یہ بات معلوم نہیں مگر میری اماں کو پتا ہے سب کچھ.....''

وہ کڑوے لہجے میں بولی تھی صوفیہ حیرت سے اس کا منہ دیکھ رہی تھی اتنی بڑی بات کتنی آسانی سے اس کے منہ سے نکل گئی تھی۔

یہ گھر صوفیہ کا تھا یا پھر اس کے باپ کا تھا یہ تو آج کی تاریخ میں اس کے لیے ایک بڑا انکشاف تھا۔اس نے سعدیہ کو مشکوک نظروں سے دیکھا۔

''کیا ہم دونوں اچھے دوست بن سکتے ہیں۔'' اسے سعدیہ پر پہلے بھی ترس آتا تھا اور آج اس احساس کی نوعیت بدل سی گئی تھی وہ واقعی توجہ اور کسی اچھے مشورے کی مستحق تھی۔

''پلیز مجھے کوئی نصیحت مت کرنا۔'' وہ بے ساختہ بولی اور پوری توجہ سے پیپسی پینے لگی۔

''ارے نہیں..... میں تمہیں کیا نصیحت کروں گی مجھے تو تمہارے مشورے کی ضرورت ہے۔ دیکھو نا جب ایک ہی گھر میں رہنا ہے تو پھر اس جھگڑے کا فائدہ۔''

صوفیہ نے مسکراتے ہوئے اس کے چہرے کا جائزہ لیا جو بلب کی روشنی میں بہت زیادہ سنہرا محسوس ہو رہا تھا اس نے اپنا پسندیدہ سیاہ رنگ پہن رکھا تھا بس آج اس کی آنکھوں میں ڈھیر سارا کاجل نہیں تھا صوفیہ سے رہا نہیں گیا۔

''تم کاجل لگایا کرو لیکن احتیاط سے تمہاری آنکھیں بغیر کاجل کے اچھی نہیں لگتیں۔''

وہ خلوص دل سے کہہ رہی تھی سعدیہ کے چہرے پہ بھی مسکراہٹ آ گئی یاس بھری انجانے خوف میں لپٹی ہوئی۔

''اب تو جیسے پوری زندگی پر کاجل پھر گیا ہے.....'' وہ افسردگی سے کہتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

اس کا موبائل مستقل وائبریٹ کر رہا تھا صوفیہ نے بھی اسے جانے دیا۔وہ سعدیہ کی ذہنی حالت

سمجھتی تھی وہ اس وقت کسی بڑے ذہنی صدمے سے گزر رہی تھی۔

آج کے لیے اتنا ہی کافی تھا وہ ایک دم اس پر اس نئی دوستی کا بوجھ نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔

''جب تم کھانا بنانے کچن میں جاؤ تو مجھے بھی بلا لینا میں تمہاری ہیلپ کروادوں گی۔''

وہ سر ہلاتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف مڑ گئی تھی اس لمحے موبائل اس کے کانوں سے لگا ہوا تھا۔ صوفیہ کے کانوں میں اس کے بے ربط جملوں کی بازگشت ہو رہی تھی۔

''تم تو اس گھر کی مالکن ہو تم جب چاہو ہم سب کو اس گھر سے نکال کر باہر کر سکتی ہو۔''

☆.....☆.....☆

نانو کی طبیعت تو بہتر ہو گئی تھی مگر ان کے چہرے کا اضمحلال کم نہیں ہو رہا تھا کشمالہ انہیں ہنسانے کی کوشش کرتی اور وہ دھندلائی آنکھوں سے محض مسکرا دیتیں۔

آج کل انہیں صرف راجہ طارق کا انتظار تھا وہ بھی لاہور جا کر پھنس گئے تھے کسی بزنس ڈیلیگیشن کے ساتھ ان کا قیام لمبا ہو گیا تھا اور یہاں جاشف سمیت سب ان کے منتظر تھے عاشر کے علاوہ۔

نانو تو اب ہر آہٹ پر ان کے بارے میں سوال کرتیں اس وقت کشمالہ ان کے پاس بیٹھی ان کی میڈیسن کا جائزہ لے رہی تھی کہ کون سی منگوانی ہیں اور کونسی اب استعمال نہیں کرنی ہیں تب ہی انہوں نے بے چین سا ہو کر پوچھا تھا۔

''یہ طارق کب تک آئے گا تم نے فون کیا تھا۔''

''جی نانو ہو سکتا ہے کل شام تک پہنچ جائیں..... مجھے خود ان کا انتظار ہے ہمیں اب کراچی بھی جانا ہے اور جانے سے پہلے پاپا سے اور عاشر عباس سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔'' وہ سنجیدگی سے بولی تو نانو کی آنکھوں میں ڈھیر سارے سوالات تحریر ہو گئے۔

''عاشر تو یہیں ہے۔''

''صرف عاشر عباس کے ہونے سے کچھ نہیں ہوگا نانو! پاپا کا ہونا بھی ضروری ہے مجھے عاشر کے سامنے ہماری پوزیشن کلیئر کرنی ہے۔

یہ سچ ہے کہ اسے پاپا نے ہمیشہ خود سے دور رکھا مگر اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں عاشر کو یہ بات ریلائز کرنی چاہیے۔''

وہ اپنے مخصوص پُرسکون ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ نانو کی آنکھیں اب سوالات نہیں کر رہی تھیں۔

انہیں اس بات پر حیرت بھی نہیں ہوئی تھی کہ کشمالہ عاشر کے رویے کی شکایت کر رہی ہے۔

انہیں فکر تو اس بات کی لاحق ہوگئی تھی کہ آنے والے وقت میں جب عاشر عباس کو یہ پتا چلے گا کہ منیر کمال ان دونوں کا اصل باپ ہے اور اس سارے فساد کے پیچھے بھی منیر کمال ہے تو تب جانے اس کا ردعمل کیا ہوگا۔

جب سے اس حقیقت کا انکشاف ان پر ہوا تھا۔ وہ تو چاہتے ہوئے بھی اپنا ردعمل ظاہر نہیں کر پا رہی تھیں۔ وہ دونوں اول دن سے ان کے دل میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہوگئی تھیں اور پھر سب سے بڑی بات ان پر منیر کمال کا سایہ تک نہیں پڑا تھا انہیں طارق محمود نے پالا تھا یہ ان کی شخصیت کے ہر رنگ سے جھلکتا تھا۔

انہیں طارق محمود سے زندگی بھر کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی تھی اس وقت بھی نہیں جب انہوں نے شمائلہ کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا تھا اس وقت بھی نہیں جب وہ عاشر کو ان کے حوالے کر کے جلاوطنی کی خود ساختہ سزا منتخب کر کے چلے گئے تھے۔

انہیں طارق کے کسی فیصلے پر کبھی کوئی اختلاف نہیں رہا سوائے اس ایک گلے کے کہ اگر وہ بھی دوسری شادی کر کے اپنا گھر آباد کر لیتے تو بہت اچھا ہوتا شام ڈھلے تھک ہار کر کم از کم سکھ کی چھاؤں میں تو جا کر بیٹھتے نا۔

اب یہ بحث قبل از وقت تھی کہ راجہ طارق محمود کے نصیب میں گھر کا سکھ ہے بھی یا نہیں۔

''نانو میں آپ کے لیے گرین ٹی لے کر آتی ہوں۔'' وہ ان کے خزنیہ چہرے پر نظر ڈال کر کھڑی ہوگئی اسے کبھی کبھی وہ خاموشی میں کلام کرتی بہت اچھی لگتی تھیں۔

کشمالہ کا دل چاہتا تھا وہ ان سے پوچھے آپ جو سوچتی ہیں بولتی کیوں نہیں لیکن پھر اس کی ہمت جواب دے جاتی تھی۔

اسے لگتا تھا ابھی اس کے پاس اتنا پرسنل ہونے کا حق نہیں ہے اور پرسنل تو وہاں بھی نہیں ہو سکتی تھی جس کو دیکھ کر اس کا دل محبت کے جذبے سے آشنا ہوا تھا اس کو دیکھنا اس کے ساتھ رہنا اور اپنے آپ کو پتھر کر لینا آجکل دنیا کا سب سے مشکل کام تھا جو وہ اپنی انا بچانے کے لیے کر رہی تھی۔

مگر اس وقت وہ نہ اپنی انا بچا پائی اور نہ فطرت کے خلاف جانے کی ہمت کر پائی اس نے کچن میں قدم رکھے تو ٹھٹک سی گئی۔

عاشر کچن ٹیبل پر سر ٹکا کر بیٹھا ہوا تھا کشمالہ کے دستک دینے پر بھی اس نے سر نہیں اٹھایا تھا تب کشمالہ کو تشویش سی ہوئی تھی۔

اس نے آگے بڑھ کر اسے آواز دی تب اس کے مضبوط وجود میں ہلکی سی جنبش ہوئی اور اس نے سر اٹھایا تھا اور ایک سرسری سی نگاہ کشمالہ پر ڈال کر بالوں میں انگلیاں پھنسالی تھیں۔

کشمالہ پریشان سی ہو کر اس کے پاس آئی تھی۔ عاشر کی آنکھیں انگارہ ہو رہی تھیں اس کا چہرہ جیسے تپ رہا ہو۔

''عاشر! آر یو او کے.....'' وہ بے ساختہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھنے لگی عاشر نے نفی میں سر ہلا کر پھر سے ٹیبل پر سر رکھ لیا۔

کشمالہ نے بڑی ہمت کر کے اسے کندھے سے پکڑ کر ہلایا اس کے جھکے ہوئے سر کو اٹھانے کی

کوشش کی۔

''عاشر! آپ یہاں کیوں بیٹھے ہو..... اندر چلیں..... آپ کو تو بخار ہو رہا ہے۔'' اس نے بدیسی زبان کا سہارا لیا اور عاشر نے بمشکل سر اٹھا کر اسے قدرے گہری آنکھوں سے دیکھا۔

ایک تو سرخ شعلہ سی آنکھیں اور پھر ان کی سلگتی نگاہ۔ وہ تو وہیں بھسم ہو گئی تھی۔

''مجھے شدید قسم کی میگرین ہو رہا ہے۔ میں چائے کے لیے آیا تھا خدیجہ بھی نظر نہیں آ رہی ہے۔'' وہ کسی معصوم بچے کی طرح اس سے شکایت کر رہا تھا۔

''میں آپ کے لیے چائے بنا دیتی ہوں آپ پلیز اس طرح یہاں مت بیٹھیں میں تو ڈر ہی گئی تھی۔'' اپنائیت بھری تشویش آنکھوں میں سمیٹے وہ چائے بنانے کچن کے مخصوص حصے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

''نہیں آپ زحمت نہ کریں میں خدیجہ کو دیکھ لیتا ہوں۔'' وہ اب اپنی انگلیوں سے سر دبا رہا تھا۔ آدھے سر کا درد اس کو توڑ کر رکھ دیتا تھا اس حالت میں اس کی آنکھیں، اس کا چہرہ بھٹی کی طرح تپنے لگتا تھا اس کا بس نہیں چلتا تھا فریج میں منہ دے کر بیٹھ جائے۔

اس وقت بھی اس نے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال کر اس سے چہرے پر مساج شروع کر دیا تھا۔

کشمالہ سے اس طرح کی نالائقیاں برداشت نہیں ہو سکتی تھیں وہ کپ ٹرے میں رکھ کر اس کی طرف چلی آئی تھی۔

''یہ کیا بچوں والی حرکتیں کر رہے ہیں آپ..... لائیں میں آپ کا سر دبا دوں..... یا پھر کسی سے دبوا لیں۔''

اس نے پانی کی بوتل اس کے ہاتھ سے لے لی تھی اس کے انداز میں اپنائیت بھرا تحکم تھا۔ زرد رنگ کے لباس میں وہ گھریلو حلیے میں اس کو ڈپٹتے ہوئے اس کچن تو کیا اس وقت عاشر عباس کی بھی مالکن لگ رہی تھی۔

''میں جو بھی کروں۔ آپ کو کیا پریشانی ہے۔''

وہ بھلا یہ کہاں برداشت کر سکتا تھا کہ کشمالہ اس پر حکم چلائے اس نے دوبارہ سے پانی کی بوتل لے کر مساج شروع کر دیا تھا۔

''ایسا نہیں ہو سکتا نا کہ آپ جو بھی کریں..... کسی کو کوئی پریشانی نہ ہو..... آپ کو اپنی پوری آنکھیں کھول کر دیکھنا چاہیے۔''

وہ اس کی سوئی سوئی آنکھوں پر چوٹ کر گئی تھی اور چائے کا بڑا سا مگ اسے تھما دیا تھا۔ عاشر کپ ہاتھ میں تھام کر اسے متحیر سا اسے دیکھ رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

ندا حسنین کا بہت خوبصورت نیا ناول

عشق نگر کے مُسافر

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

اُم ایمان قاضی کا بہت خوبصورت نیا ناول

سانسوں کے اس سفر میں

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

سعدیہ نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا، وہ اتنی بڑی گاڑی میں بیٹھے گی بلکہ گاڑی میں بیٹھنا اور پھر فائیو اسٹار ہوٹل جانا اس کی خواہشوں کے دائرے میں کبھی بھی نہیں آیا تھا۔

لیکن ستم تو یہ تھا کہ اتنی بڑی گاڑی میں بیٹھ کر بھی اسے سکون کسی پل نہ تھا گاڑی شہر کے معروف اور پوش ایریا میں جانے انجانے راستوں پر دوڑ رہی تھی۔

وہ کبھی شیشوں سے باہر دیکھنے لگتی تو کبھی روبوٹ نما ڈرائیور کو گھورنے لگتی جس کے چہرے پر کوئی تاثرات نہیں تھے لیکن وہ شکل سے اتنا وحشی اور پُر اسرار لگ رہا تھا کہ سعدیہ کی ہمت ہی نہ ہوئی کہ اس سے کچھ پوچھے۔

اپنے گھر سے ذرا فاصلے پر ایک معروف بازار کے سگنل پر یہ گاڑی آج پہلی بار اسے لینے آئی تھی۔ وہ یقیناً چور راستے سے سرمد بخاری کے حکم کی تعمیل کر رہی تھی۔ اسی لیے خوف اس کے ہر مسام سے پھوٹ رہا تھا۔

اس نے تین دن تک سرمد بخاری کا فون ریسیو نہیں کیا تھا بلکہ فون ہی بند کیا ہوا تھا اور آج صبح جب فون کھولا تو ایک ایس ایم ایس اس کا منتظر تھا کسی نامعلوم نمبر سے سرمد بخاری کا نمبر تو اس نے محفوظ کر لیا تھا اس نامعلوم نمبر نے اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا کر دیے تھے۔

اس نے اپنی آنکھوں کے آگے آتے اندھیرے کے ساتھ وہ ایس ایم ایس پڑھا تھا۔

اس ایک رات کی بھول کا اتنا بھیانک انجام بھی ہو سکتا ہے یہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

وہ تو اظہر، منیر کمال، سرمد بخاری سب کو بھول جانا چاہتی تھی اس خوفناک رات کو اپنی زندگی سے نوچ کر پھینک دینا چاہتی تھی۔ اس کمرے کو، سرمد بخاری کے ساتھ گزرے خوفناک لمحوں کو ذہن کے ہر کونے سے کھرچ دینا چاہتی تھی لیکن لگتا تھا بدقسمتی اور رسوائی نے اس کا دامن پکڑ لیا ہے۔

"قسمت اتنی بے رحم ہوتی ہے وقت اتنا سنگدل ہوتا ہے کہ اس کی نادانستگی میں ہوئی خطا کو اس کا

جرم بنا دیا۔"

وہ خوب رونے کے بعد سرمد بخاری سے اتنا ہی کہہ پائی تھی۔

تب اس نے اپنے مخصوص شیریں لہجے میں اس کو مخاطب کیا۔

"سویٹی! تم آؤ نا..... تم سے ملنا ضروری ہے۔ تمہاری کچھ چیزیں ہیں میرے پاس..... تمہارا گفٹ دینا ہے تم کو سرمد بخاری کو جو خوشی دے وہ اس کو بڑی خوشی دینا چاہتا ہے۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں..... بتاؤ گاڑی کہاں بھجوا دوں۔"

سرمد بخاری کا انداز ایسا تھا جیسے وہ اس کا دیرینہ دوست ہو۔ سعدیہ اس کی گاڑی میں بیٹھ کر ہمیشہ اس سے ملاقات کے لیے جاتی ہو اس کی آنکھوں کا اندھیرا تو چھٹ گیا تھا اپنی بے بسی پر آنسو بہانے کے بعد لیکن اب اس کا دل گہری تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔

اس نے ڈوبتے دل اور کانپتے ہاتھ پیروں کے ساتھ گاڑی سے قدم باہر نکالے تھے۔ ڈرائیور گاڑی ہوٹل انتظامیہ کے ڈرائیور کے حوالے کر کے اس کے ساتھ کھڑا تھا اور سعدیہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اتنی وسیع و عریض عمارت کے کون سے دروازے کی طرف جائے۔

تب ہی ڈرائیور نے قدم بڑھائے اور اسے بھی ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔

آگے چند قدم کے فاصلے پر باوردی گارڈز نے ان کے لیے دروازہ کھول دیا تھا سیکیورٹی چیک سے گزرنے کے بعد وہ ڈرائیور کی ہمراہی میں اندر وسیع و عریض خوب روشن لابی میں آ گئی تھی۔

اس کے چہرے پر ہونق پن اور قدموں کی لرزش سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ایسی کسی جگہ پر پہلی دفعہ آئی ہے لیکن ڈرائیور کے پُر اعتماد قدم اور انداز نے اس کی ہمت برقرار رکھی ہوئی تھی وہ ادھر ادھر دیکھتی خوش باش بے فکرے لوگوں کا جائزہ لیتی اس کے قدموں پر چل رہی تھی یہ دنیا اس کے لئے انوکھی ضرور تھی مگر کہیں اندر اس دنیا سے مقابلے کی خواہش بھی ہمکتی رہتی تھی اس لیے چہرے کا ہونق پن اب

اشتیاق اور تجسس کی ملی جلی کیفیت میں ڈھل رہا تھا۔

ڈرائیور اب لفٹ کے سامنے رک گیا تھا۔

لفٹ کے اندر جاتے ہوئے خوف نے ایک بار پھر اس کے قدموں کو منجمد کیا تھا لیکن اب شاید واپسی کی ساری راہیں مسدود ہو چکی تھیں وہ اب لفٹ سے واپس نہیں جا سکتی تھی۔ پُر رونق، پُر روشن لابی، پُر ہجوم ہال، باوردی ہوٹل اسٹاف کی میزبانی کے مظاہرے سب کچھ کہیں پیچھے رہ گیا تھا وہ لفٹ میں اس پُر اسرار چہرے والے شخص کے ساتھ اکیلی تھی جس کے منہ سے آیئے اور چلیے کے علاوہ اب تک کچھ نہیں نکلا تھا۔

لفٹ جانے کون سے فلور پر رکی تھی وہ جاننا نہیں چاہتی تھی ویسے بھی اب یہ جاننے سے اہم سرمد بخاری کا سامنا تھا جو اس طویل کوریڈور کے اطراف بنے کمروں میں سے کسی ایک میں اس کا منتظر تھا۔ اس وسیع و عریض کوریڈور کی پُر اسراری خاموشی، خوابناک سا ماحول اور اکا دکا لوگوں کی خوشگوار سی ہنسی اسے ریلیکس کرنے کے بجائے کسی کونے میں بیٹھ کر رونے پر مجبور کر رہی تھی مگر اب وقت رونے کا نہیں۔

سرمد بخاری سے خیر و عافیت مانگنے کا تھا ڈرائیور کسی ایک دروازے کے سامنے رکا تھا اور دستک دے کر اسے وہیں کھڑا چھوڑ کر واپس پلٹ گیا تھا۔

کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اس شخص کی وفاداری اور بے نیازی کے بارے میں ضرور سوچتی۔ ایک نظر بھی تو نہیں ڈالی تھی اس پر..... حالانکہ وہ سرمد بخاری کے ارادے اور اس کا مقام اچھی طرح سے جانتا تھا۔

دروازہ پہلی دستک پر ہی کھل گیا تھا سرمد بخاری جیسے اسے دیکھ کر کھل سا گیا تھا۔

"ہائے سویٹی..... بہت انتظار کروایا تم نے۔" وہ شاید اس کا نام تک نہ جانتا تھا یا پھر واقعی میں وہ اس کے لیے سویٹی تھی جبھی اتنا بے قرار ہو کر اس کی طرف بڑھا تھا سعدیہ اپنے آپ میں سمٹ کر رہ گئی تھی۔

"جناب! اب تو آپ ہماری ہو گئیں..... پھر کس بات پر اتنی دوری....." وہ اس کے گرد بازوؤں کا گھیرا تنگ کرتے ہوئے اسے صوفہ کارنر کی طرف لے آیا تھا۔ سعدیہ بمشکل سرمد بخاری کو دیکھنے

کے بعد کمرے کی وسعت طوالت اور آرائش پر نظر ڈال پائی تھی۔

کمرے میں خوابناک سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ یہ الگ بات کہ اس خوابناک روشنی میں اسے ہر چیز پیلی پیلی لگ رہی تھی حتیٰ کہ سرمد بخاری بھی..... جو زرد رنگ کی ٹی شرٹ اور بلیو جینز میں اس دن کے مقابلے میں بہت ینگ اور بے تکلف سا نظر آ رہا تھا۔ اس رات تو اس کی کلف کمرے کی تاریکی میں آ کر اتری تھی لیکن آج وہ بغیر کلف کے بہت مختلف نظر آ رہا تھا۔

''کیا بات ہے..... بہت پریشان ہو..... کیا تمہیں میرے پاس آنا اچھا نہیں لگا۔''

وہ اسے اپنے قریب کرتے ہوئے مدہم آواز میں بولا تو سعدیہ کی پلکوں پر دھرے آنسو ٹپکنا شروع ہو گئے۔

''آپ کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہیں میں آپ کے لائق نہیں..... آپ بس مجھے معاف کر دیں اور بھول جائیں اس دن کو۔'' وہ روتے روتے بمشکل بولی تھی اور سرمد بخاری نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔

''نہ نہ بے بی..... روتے نہیں..... اور رونے سے بھلا مسئلے حل ہوتے ہیں..... تم سے کس نے کہا تم میرے لائق نہیں۔ ایک مدت بعد تو مجھے محسوس ہوا کوئی ہے جس کی مجھے ضرورت ہے ورنہ میرے لیے عورتوں کی کمی تو نہیں۔''

وہ دھیرے دھیرے اسے تسلی دینے والے انداز میں تھپک رہا تھا اور اس کا مدہم لہجہ سعدیہ کے گرد اپنا حصار بن رہا تھا وہ اس کی قربت میں گھبرانے کے بجائے حیران سی اس کی باتیں سن رہی تھی اور وہ اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے بڑی اپنائیت سے کہہ رہا تھا۔

''کاجل تو لگایا کرو ان حسین آنکھوں میں..... جانتی ہو تمہاری آنکھیں ہی تو ہیں جو پاگل کر دیتی ہیں۔'' اس نے کانوں کے قریب آ کر سرگوشی کی تھی اور سعدیہ کا چہرہ تپنے لگا تھا اس کے خوف میں جھکڑے ہوئے دل کو پل بھر کے لیے سکون سا محسوس ہوا تھا۔

وہ تو بہت معمولی سی تھی بہت بے کار سی..... اسے تو کبھی کسی نے یہ احساس نہیں دلایا تھا وہ اتنی خاص ہے۔

اس کی آنکھیں حسین ہیں..... وہ کسی کے لیے باعث سکون ہو سکتی ہے کم از کم سرمد بخاری کی باتوں اور اس کے پُر شوق لہجے سے تو یہ ہی محسوس ہو رہا تھا اس نے اپنے آنسو پونچھ کر بغور اس کے چہرے کو دیکھا۔

''میں آپ کو اچھی لگتی ہوں..... کیا.....'' پتا نہیں کیسے اندر کا تجسس باہر آ گیا تھا۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

''بہت اچھی..... اس نے آنکھوں سے بھی اقرار کیا تھا۔ سعدیہ کا دل پہلی بار انوکھی سی لے پر دھڑکا تھا۔ پلکیں بوجھل سی ہو کر جھک گئی تھیں۔

''کیا کھانے کا موڈ ہے۔'' وہ ایک ہاتھ سے اس کو سمیٹتے ہوئے اور دوسرے سے انٹرکام کو تھام کر بولا تو سعدیہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''کچھ نہیں..... مجھے اب گھر جانا ہے بہت دیر ہو گئی ہے اماں کو سہیلی کے گھر جانے کا کہہ کر نکلی تھی وہ فون نہ کر دیں، وہاں پر.....'' اس کا اطمینان بحال ہو چکا تھا اب وہ اس کے حصار میں تو تھی مگر اس کی قربت کے خوف سے باہر آ چکی تھی۔

''نہیں ابھی نہیں..... پہلے ہم کچھ کھائیں گے، پھر تم اپنی پسند کی شاپنگ کرنا اور اس کے بعد.....'' وہ جیسے اس کے ضبط کا امتحان لینے کو رکا۔

''نہیں مجھے کچھ نہیں چاہیے بس آپ مجھے گھر چھوڑ دیں۔'' وہ جلدی سے بولی تو سرمد بخاری ہنس پڑا بے رحم سی ہنسی میں اس کی سادگی اور معصومیت کے لیے تمسخر بھی تھا۔

''تمہیں تو نہیں چاہیے، مجھے تو چاہیے نا اور دیکھو اب تم میری کسی بات سے انکار نہیں کرو گی میں

اپنی چیز کو ہر لحاظ سے اپنے لائق بنا کر چھوڑتا ہوں....."

وہ اس کے چہرے کو نرم انگلیوں کی حرارت سے پُر حدت بناتے ہوئے بولا تو سعدیہ ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔

اس دن وہ نشے میں تھا.....اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کی رعونت تھی.....سعدیہ کو پہلی بار مردانگی کا ادراک وحشت کے روپ میں ہوا تھا اس کا عورت پن کسی نرم و نازک ننھے سے پودے کی طرح مسل دیا گیا تھا مگر آج یہ ہی وحشت اس کے عورت پن کو سمیٹ رہی تھی اس کے ٹوٹے بکھرے وجود کو سہارا دے رہی تھی بہت نرمی، اپنائیت اور استحقاق سے۔

وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی اس دن غلطی سے غلط ہو گیا تھا یا آج غلطی کا کفارہ ادا ہو رہا تھا۔ یہ تو وہ بے حس اور بد بودار شخص نہیں تھا..... یہ تو سعدیہ کا ہمدرد اور غمگسار تھا جو اسے اپنے لائق بنانے کی اپنے جیسا بنانے کی بات کر رہا تھا۔ تب ہی اس نے وہ بات کر ڈالی جو ان لمحوں میں بہت ضروری تھی۔

"آپ مجھے وہ ویڈیو ٹیپ کب دیں گے۔" اس کی آواز مدہم تھی۔

"کون سی ویڈیو ٹیپ.....ڈیئر....." وہ انجان تھا یا انجان بننے کی اداکاری کر رہا تھا سعدیہ سمجھ نہیں پائی۔

"وہی.....جو اس دن....." وہ ان لمحوں کو یاد کرنے سے بھی خوفزدہ تھی۔

"کون سی ٹیپ.....سویٹی.....میرے پاس تو کوئی ایسی چیز نہیں، تم مجھے پسند آ گئی ہو.....میں تمہیں کسی ویڈیو ٹیپ سے بلیک میل نہیں کروں گا۔

بلکہ اٹھا کر لے جاؤں گا.....تم مجھے اتنا کمزور سمجھتی ہو۔" وہ سچائی سے کہہ رہا تھا اور سعدیہ کا تنفس تیز ہونے لگا تھا۔

"تو پھر وہ ایس ایم ایس.....کس کا تھا۔" وہ اب اس ایس ایم ایس کو ڈیلیٹ کرنے پر پچھتا رہی

تھی۔ سرمد بخاری بھی حیران ہو گیا تھا۔

''آئی نیور ایس ایم ایس یو..... سویٹی۔'' وہ اب اس کے سامنے کاؤچ پر آ بیٹھا تھا اور اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے، سعدیہ کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا تھا۔

''آپ مجھے گھر چھوڑ دیں..... پلیز.....'' وہ پھر سے رونے کو تیار تھی۔

''میں بالکل تمہیں گھر چھوڑ دوں گا پہلے یہ بتاؤ..... میرے ساتھ دبئی کب چل رہی ہو۔''

وہ اس کے ہاتھوں کو نرمی سے دبا کر بولا اس کی نظریں سعدیہ کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں جس پر آنسوؤں کی نمی کے ساتھ خوف کا بڑا انوکھا سا امتزاج ہلکورے لے رہا تھا۔ اس کی یہ ہی ادا تو سرمد بخاری کے دل کو بھا گئی تھی۔

وہ بے اختیار اس کے قریب چلا آیا تھا اور دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام لیا تھا۔

''ہم بہت جلد دبئی چل رہے ہیں..... پھر کوئی ٹینشن نہیں ہو گی۔''

وہ بہت سکون سے کہہ رہا تھا اور سعدیہ کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا آ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

کمال ولا میں دن کا آغاز سورج نکلنے سے مشروط نہیں ہوتا تھا۔ شمائلہ بے کیف نیند اور بوجھل رات کے عذاب سے جب جان چھڑا لیتی کمال ولا میں زندگی بھاگنے دوڑنے لگتی۔

اس کی ملازمائیں اپنی مصروفیات بھول کر ولا کی دیکھ بھال میں یوں جت جاتیں جیسے ان سے زیادہ وفادار اور محنتی کوئی ہے ہی نہیں اور شمائلہ کب سوتی ہے کب اس کی آنکھوں میں جنبش ہوتی ہے وہ بستر چھوڑنے کو پر تولتی ہے ان ساری باتوں کی خبر شکیلہ کو تو کسی ریڈار سسٹم کی طرح ہو جاتی تھی۔

اس وقت بھی شمائلہ نے اپنا بوجھل سر دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے انٹرکام کی طرف نگاہ کی ہی تھی کہ شکیلہ اندر آ گئی۔

اسے دستک دینے کی عادت نہیں تھی اور شمائلہ کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کون آیا اور کب گیا..... سوائے منیر کمال کے۔

''بیگم صاحبہ! آج آدھا دن ختم ہو گیا ہے آپ کو اسی کمرے میں پڑے پڑے کیا بات ہے طبیعت ٹھیک نہیں ہے موبائل بھی آپ کا بند پڑا ہے۔

ڈرائنگ روم میں وہ سرمد صاحب بیٹھے ہیں وہ تو ادھر ہی آنے کو بے تاب تھے بڑی مشکل سے روکا ہے میں نے۔''

شکیلہ حسبِ عادت نان اسٹاپ شروع تھی۔اس کے ہاتھوں کی حرکت زبان سے بھی زیادہ تھی۔

اس دوران اس نے بیشتر بکھری ہوئی چیزیں سمیٹ ڈالی تھیں منہ کا زاویہ بگاڑتے ہوئے بوتل اور گلاس سگریٹ کے پیکٹ اور ایش ٹرے وغیرہ کو ڈریسنگ ٹیبل سے گاربیج ڈرم میں منتقل کیا تھا۔

یہ مخصوص قسم کا کوڑے دان شکیلہ اپنی نگرانی میں ہی صاف کرواتی تھی۔

''کب آیا سرمد.....''

شکیلہ نے لمبی سی انگڑائی لیتے ہوئے نائٹ ڈریس کی ڈوریاں ٹائٹ کیں اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لینے لگی۔

آج کل جانے کیوں چہرہ مرجھایا ہوا رہتا تھا۔آنکھوں کی چمک اب بھاری پپوٹوں میں چھپ جاتی تھی اور گلاب رنگت میں زردی سی گھلنے لگی تھی۔

اس نے ایک بے زار سی نگاہ اپنے سراپے پر ڈالی اور سگریٹ کا پیکٹ اٹھا لیا۔

''بیگم صاحبہ! ہر چیز سے پہلے یہ دھواں اپنے اندر مت اتارا کریں دیکھیں اپنی حالت کیا بنا لی ہے.....'' وہ لاڈ سے بولی۔

''تم کچھ پلاؤ گی نہیں تو..... یہ ہی کچھ کرنا پڑے گا۔'' اس نے سگریٹ سلگا لیا تھا شکیلہ بھاری

پردے ہٹا کر روشنی کو اندر آنے کی دعوت دیتے ہوئے اس کے پاس آ گئی تھی۔

''جوس یہیں لے آؤں یا چائے۔'' وہ اسے عقیدت سے دیکھ رہی تھی۔

''نہ جوس نہ چائے..... آج اچھا سا ناشتا بناؤ چائے پراٹھا ٹائپ کا..... ہری مرچیں ڈال کر آملیٹ بھی.....''

شمائلہ کے چہرے پر چمک سی آ گئی تھی۔ شکیلہ کے چہرے پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی۔

''میں نے تم سے سرمد کا پوچھا تھا، کب آیا تھا وہ۔''

شمائلہ ایک ہاتھ میں سگریٹ اور دوسرے ہاتھ میں برش لیے اپنے سنہری بالوں کی لٹوں کو سنوار رہی تھی۔

''کافی دیر ہو گئی آئے ہوئے ان کی اور صاحب کی کافی دیر تک تکرار ہوتی رہی پھر صاحب تو اٹھ کر چلے گئے وہ آپ کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔''

شکیلہ نے رازدانہ انداز میں کہا تو شمائلہ کے ماتھے پر بل سے پڑ گئے۔

''صاحب تمہارے جا چکے ہیں یا ابھی گھر میں ہی ہیں۔''

اس نے بے زاری سے پوچھا اور برش ڈریسنگ ٹیبل پر ڈال کر سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دیا۔

''صاحب تو کب کے گئے۔'' شکیلہ نے ایش ٹرے دوبارہ خالی کی اور سوالیہ نظروں سے شمائلہ کو دیکھنے لگی جیسے اگلے حکم کی منتظر ہو اور ویسے بھی شمائلہ اس سے اپنے سارے راز شیئر کر لیتی تھی اس سے مشورہ مانگ لیتی تھی اس لیے شکیلہ کو اپنی اہمیت کا پتا تھا وہ منیر کمال کے بارے میں خبریں دیتے ہوئے پُر اسرار انداز اختیار کر لیتی تھی تا کہ شمائلہ کا تجسس برقرار رہے۔

یہ الگ بات کہ شکیلہ اس بات سے بے خبر تھی کہ اب منیر کمال کی فکر مند گھلنا، اس کے مسئلوں پر پریشان ہونا اس کی پریشانیوں کو سمیٹ لینے کے لیے خود پریشانی میں مبتلا ہونا شمائلہ کی زندگی میں ثانوی

حیثیت اختیار کر گیا تھا۔

اب تو اس کے ذہن میں کوئی نئی کہانی چل رہا تھی جس کے لیے اسے منیر کمال سے تو کم از کم چھٹکارا چاہیے تھا اور اس کہانی کی بنت میں سرمد بخاری اس کا سب سے بڑا مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔

وہ اس کے سچے قدردانوں میں سے تھا اس میں کوئی شک کی بات نہیں تھی۔

شمائلہ کے چہرے پر گہری سوچ کے سائے تھے واش روم کا رخ کرنے سے پہلے اس نے شکیلہ کو جانے کا اشارہ کیا تھا۔

''تم ناشتا لگواؤ میں آتی ہوں۔'' شکیلہ سر ہلا کر چلی گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

شام کی سیاہی اب رات کی تاریکی میں ڈھلنے کو بے تاب تھی آج کل تو اداس اور بوجھل شام کے بعد طویل رات کے سائے خوامخواہ تھکا دیتے تھے صوفیہ کو اس گھر کے لوگوں کا مزاج اور معمولات اچھی طرح سمجھ آ چکے تھے اس لیے اب وہ کڑھتی نہیں تھی بلکہ انجوائے کرتی تھی۔

تایا گھر میں قدم رکھتے تو تائی کی نہ ختم ہونے والی کہانیاں ایک تسلسل کے ساتھ شروع ہو جاتیں۔

صوفیہ چونکہ زیادہ تر اسی پورشن میں رہتی تھی اس لیے بڑے مست انداز میں ان کی باتوں سے محظوظ ہوتی تھی۔

تائی آج کل بہت ساری باتوں پر پریشان تھیں۔

گھر کے بجٹ میں تنگی تو خیر ان کا من پسند موضوع تھا جو کبھی خارج نہیں ہوتا تھا لیکن آج کل دو نئے موضوعات پر ان کی زیادہ توجہ مرکوز تھی سعدیہ کا رشتہ اور سفیر کی شادی۔

صوفیہ کو یوں لگتا تھا جیسے سعدیہ کی شادی کے لیے لڑکے کی تلاش جاری کے اور سفیر کی بس شادی

ہونا باقی ہے۔

باقی ان کے لیے گھر میں سب ٹھیک تھا۔

نعمان کیا کرتا ہے کب آتا ہے اور کب جاتا ہے کوئی ٹینشن نہیں اور ایسے میں اگر صوفیہ اپنی معلومات میں اضافے کے لیے کوئی قصہ چھیڑ دیتی تو تائی منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے فوراً اپنا لہجہ بدل دیتیں۔

صوفیہ انہیں جاسوس لگتی تھی۔

نہ انہیں کبھی صوفیہ کی ماں سے ہمدردی رہی تھی اور نہ اب صوفیہ کے حصے میں کوئی ایسا اعزاز آیا تھا۔

اس لیے وقتاً فوقتاً تایا پر عتاب نازل ہوتا رہتا تھا جو صوفیہ کو یہاں لا کر گویا بھول ہی گئے تھے۔

''سفیر کے ابا ایک بات تو بتاؤ کب تک ہم اس لڑکی کے نخرے اٹھائیں گے پوری نواب زادی ہے باورچی خانے میں مجال ہے جو گھس کر دیکھ لے کوئی کام پڑا ہے کچھ دھونا دھلانا ہے اے میری مدد ہی کر دے بابا ایسی کام چور لڑکی ہے کہ میری تو جان جل جاتی ہے ہر وقت ڈبے میں کچھ منگا کر کھاتی رہتی ہے کوئی دروازے پر آتا ہے اور دے کر چلا جاتا ہے۔

اے اتنے پیسے میں تو گھر چل جاتا ہے میں پوچھتی ہوں کے کس ارادے سے اس کو یہاں بلایا تھا اور وہ ہے مہارانیوں کی طرح عیش کر رہی ہے۔''

تایا اپنے بستر پر ذرا سا نیم دراز ہوئے تھے تب ہی تائی ان کا گھٹنا پکڑ کر بغیر سانس لیے شروع ہو گئی تھیں۔

''اگر تم اس وقت میری ٹانگیں دبا دو تو۔'' تایا نے ایک گہری سانس لے کر التجائیہ انداز میں کہا تھا مگر تائی نے عرصہ ہوا ایسے چونچلے کرنے سے صاف انکار کر دینے کی عادت پختہ کر لی تھی۔

''اے رہنے بھی دو اب یہ چونچلے۔''

ان کا مخصوص جملہ ہوتا تھا تایا جی جان سے سلگ کر رہ جاتے تھے مگر بے بس تھے۔ یہ چونچلے تو

شادی کے شروع دنوں میں انہوں نے بیوی کے خوب اٹھائے تھے بس وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔

''کبھی تم میری باتوں پر دھیان نہیں دیتے اس لیے نقصان اٹھاتے ہو، یہ راحت کی بیٹی ہے اتنی آسانی سے ہاتھ نہیں آنے کی۔ دفتر وہ نہیں جاتی گھر میں ذرا کچھ خرچ کرنے کا کہہ دو صاف انکار اور خود خوب عیاشی کرتی ہے۔

اب تو میں دیکھ رہی ہوں آج کل سعدیہ بھی اس کے پاس ہی گھسی رہتی ہے مجھے اس لڑکی پر ذرا بھی بھروسہ نہیں جو کرنا ہے جلدی کر لو یہ کسی بھی وقت سامان باندھ کر چلتی بنے گی اور ہم دیکھتے رہ جائیں گے اور اس کی ماں تو انتظار کر رہی ہوگی ایک نئے تماشے کا۔''

انہیں راحت بیگم سے کبھی ہمدردی نہیں رہی تھی اور صوفیہ سے تو خیر سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

راحت بیگم سے روایتی چپقلش، جلاپا اور مقابلہ تو تھا ہی اصل اختلاف تو اس دن شروع ہوا تھا جب ندیم شاہ نے ان کی بہن سے منگنی توڑ کر راحت بیگم سے شادی کا اعلان کیا تھا۔

دونوں بہنوں کو دونوں بھائیوں سے بیاہنا ہے یہ بات دونوں خاندانوں میں جانے کب سے طے تھی جسے ندیم شاہ خاطر میں نہ لاتے ہوئے وہ کر بیٹھے تھے جس کے بعد سارا عتاب راحت بیگم کے حصے میں آیا تھا۔

راحت بیگم سے شادی ندیم شاہ کا قطعی ذاتی فیصلہ تھا جس پر اس گھر کا کوئی فرد آج تک خوش نہیں ہوا تھا سوائے اماں کے۔

ندیم شاہ نے یہ فیصلہ راحت سے پہلی ملاقات میں ہی کر لیا تھا۔ دراصل دونوں کی ملاقات ایک سیمینار میں ہوئی تھی۔ پھر اس ملاقات کا ثمر وہ خوبصورت دن تھے جب ندیم شاہ نے اپنی کمپنی چھوڑ کر زارا ٹیکسٹائل مل میں جاب حاصل کی جہاں راحت بیگم پہلے سے ڈیزائننگ کا شعبہ سنبھال کر بیٹھی ہوئی تھیں۔

''تم جانتی ہو نا یہ سب کچھ میں نے کس کے لیے اور کیوں کیا ہے۔''

ندیم شاہ کی بولتی آنکھوں میں بے تکلفی کے ساتھ اور بہت سارے رنگ بھی تھے۔ سادہ سے چہرے والی راحت کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''کیا مطلب..... کہیں آپ مجھ پر کوئی الزام تو نہیں رکھنے والے۔'' وہ بے ساختہ بول اٹھیں گلابی چہرہ سرخ ہو چلا تھا اپنی ہی بات پر۔

''آپ الزام کی بات کرتی ہیں ہم تو سزا سنانے کے موڈ میں ہیں وہ بھی اپنی من پسند آپ قبول کریں نہ کریں ہم تو اپنے دل کی کریں گے۔''

وہ ان کے آفس میں سارے تکلفات بالائے طاق رکھ کر یوں براجمان تھے جیسے رتوں کی شناسائی ہو۔

محض چند ملاقاتیں اور فون پر کچھ باتوں کا یہ انجام۔

وہ حیران تو تھیں مگر اب پریشانی بھی لازم تھی۔ دل کے کسی کونے میں یہ احساس بھی جڑیں مضبوط کر رہا تھا کہ اگر ندیم شاہ سچ نہ ہوتا تو یہ سب کیوں کرتا۔

بہر حال جاب سوئچ کرنے کا فیصلہ اتنا آسان نہیں ہوتا۔ ندیم شاہ نے تین روزہ سیمینار کے دوسرے دن ان سے کہا تھا۔

''آپ فکر نہ کریں مادام میں بہت جلد آپ کے آفس میں ہوں گا اپنے بوریا بستر سمیت یہ میرا آپ سے پکا والا وعدہ ہے۔''

ندیم شاہ کی سنہری آنکھوں میں جگر جگر کرتی روشنی راحت کے دل کی دنیا تلپٹ کر گئی تھی۔

انہوں نے حیران نظروں سے بغور اس بلا کے پُر اعتماد اور نڈر مرد کو دیکھا تھا جس کی آنکھوں پہلی ملاقات میں ہی کلام شروع کر دیا تھا۔

تیسری ملاقات میں تو دل کی ساری باتیں چہرے پر رقم تھیں۔

''مگر ہمارے آفس میں آپ کے لیے جگہ نہیں ہوگی۔''

انہوں نے اپنا اعتماد بحال کر کے بات بنائی تھی ندیم شاہ کے چہرے پر مسکراہٹ گہری ہوگئی تھی۔

''آپ آفس کی بات کرتی ہیں میں تو کچھ اور سوچ کر بیٹھا ہوا ہوں۔'' راحت نے سٹپٹا کر اپنے مقابل کھڑے شخص کو دیکھا، لہجے کی نرمی کو بالائے طاق رکھ کر چہرے پر زمانے بھر کی سختی لانے کی کوشش کی جو کہ ناکام رہی۔

''ندیم صاحب! میرے خیال میں بہت فضول گفتگو ہوگئی اب چلیں اندر۔'' وہ دونوں لابی میں تھے چھوٹی سی ناک والا معصوم سا چہرہ اور بے حد مدہم لہجہ بھلا ندیم شاہ پر کہاں اثر انداز ہوسکتا تھا۔

''بالکل..... آپ کی بات ٹالنا ممکن نہیں، لیکن میری بات یاد رکھیے گا۔'' وہ پلٹ کر بولے تھے قدموں کا رخ اندرونی دروازے کی طرف تھا راحت نے گھور کر دیکھا۔

چوڑی پشت، مضبوط سراپا اور پُر وقار چال ندیم شاہ سے متاثر ہونا فطری امر تھا۔

اس کے دل کی دھڑکنیں منتشر ہوگئیں۔ اور پھر سیمینار کے اختتام تک وہ غائب دماغ ہی رہیں۔

عمر کے اس حصے میں جب آنکھیں روپہلے خوابوں کی راہ تک رہی ہوتی ہیں ایسے میں کوئی خوابوں کا سوداگر پلکوں کی باڑ توڑ کر اندر آنے کو بے تاب ہو جائے تو پھر ساری حفاظتی تدبیریں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔

ہوا تو راحت کے ساتھ بھی یہی تھا لیکن اصل آزمائش تو اس وقت شروع ہوئی تھی جب ندیم شاہ نے ساری احتیاط اور تمہید بالائے طاق رکھ کر انہیں اپنی زندگی میں شامل کرنے کا عندیہ دیا تھا۔

''پتا ہے راحت میں اب تم سے دستبردار نہیں ہوسکتا تم جس طرح میرے دل و دماغ پر قابض ہو گئی ہو اگر میں نے تمہیں اپنی زندگی میں شامل نہیں کیا تو میں نے روح زندگی جی نہیں پاؤں گا، میں کسی اور سے انصاف نہیں کر پاؤں گا میں پروین کو وہ سب نہیں دے پاؤں گا جو اس کا حق ہے۔

راحت! تمہیں میرا ساتھ دینا ہوگا مجھے مضبوط کرنا ہوگا۔ پلیز ایک بار مجھے اس بات کا یقین دلا دو تم ہر حال میں میرا ساتھ دو گی مجھے تنہا نہیں کرو گی۔"

راحت کو کبھی امید نہیں تھی کہ اتنی جلدی یہ شخص اس کے سامنے بیٹھا اپنے دل کی پرت پرت کھول رہا ہوگا اور سب سے بڑی بات وہ شناسائی کے اول روز سے ان پر یوں ہی حق جتا رہے تھے اسی استحقاق سے بات کر رہے تھے جو راحت کی قوت مدافعت پر حاوی ہونے کے لیے کافی ہوتا۔

"بولو نا راحت تم خاموش کیوں ہو، کیا میں تمہارے قابل نہیں کیا میں تمہیں خوشی نہیں دے سکتا۔ مجھے کیوں لگتا ہے تم صرف میری ہو میرے لیے دنیا میں آئی ہو بولو نا پلیز..... جواب دو....." بے چینی لہجے سے عیاں تھی۔

"تم میری ضد نہیں خواہش ہو میں تمہیں حاصل نہیں کرنا چاہتا تمہیں پانا چاہتا ہوں تم پر اپنا حق چاہتا ہوں۔"

ان کی بے قراری اور لہجے کی مضبوطی راحت کو سن کر گئی تھی وہ جھکے سر کے ساتھ بیٹھیں اندر ہی اندر کانپ رہی تھیں۔

ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اس والہانہ پن پر خوشی منائیں اپنی قسمت کی تابندگی پر شکر ادا کریں یا پھر اس منظر سے ہی غائب ہو جائیں جہاں ندیم شاہ نے انہیں محصور کر دیا تھا۔

بہت دیر بعد انہوں نے جھکا سر اٹھایا تھا وہ بھی ندیم شاہ کے بے حد اصرار پر تو آنکھوں میں ڈھیر سارا پانی جمع تھا اور وہ ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کی یلغار سے پریشان ہو گئے تھے۔

"یہ کیا ہے بھئی! میں نے کہا میرا ساتھ دو تم آنسوؤں کی بارش میں مجھے بھی پگھلانے لگیں۔ دس از ناٹ فیئر۔"

انہوں نے ہاتھ بڑھا کر ان کے بہت سارے نمکین موتی اپنے ہاتھوں میں سمیٹ لیے تھے یہ

پہلا موقع تھا جب وہ راحت کے اتنا قریب آئے تھے۔ وہ کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹی تھیں۔

لنچ ٹائم میں آفس بھی تقریباً خالی تھا اور ان کا کمرہ قدرے الگ تھا ورنہ سبز دروازے کے پیچھے ہونے والی اس کاروائی میں کوئی نا کوئی ضرور شریک ہو جاتا۔

لمس کی حدت کیا ہوتی ہے۔ احساس کی دہلیز پر کتنی طاقتور دھمک ہوتی ہے اس کا اندازہ راحت کو ان خاموش لمحوں میں ہی ہوا تھا جب ندیم شاہ نے ان کے آنسو سمیٹ کر پوروں کو لبوں سے لگا لیا تھا۔

''دیوانگی کی بھی حد ہوتی ہے ندیم!'' بہت دیر بعد ان کے لبوں سے بے ساختہ یہ ہی نکلا تھا۔ جس پر ندیم شاہ کا چھت پھاڑ قہقہہ کمرے کی فضا کو مرتعش کر گیا تھا۔

''شکر ہے تم نے مانا تو میں تمہارا دیوانہ ہوں۔ لیکن راحت یہ سچ ہے میں تمہیں ڈھیر سارا پیار دے سکتا ہوں ان گنت خوشیاں دے سکتا ہوں لیکن میں تمہیں اپنے گھر میں وہ مقام نہیں دے سکتا جس کی تم مستحق ہو۔'' وہ اگلے ہی لمحے کڑوا سچ راحت کی سماعتوں میں منتقل کر رہے تھے۔

''جو مقام تمہارا میرے دل میں ہے، وہ میرے گھر میں نہیں ہوگا۔ یہ سب سے بڑا سچ ہے کیا تم اس سچ کے ساتھ مجھے قبول کر سکتی ہو۔ پلیز مجھے ابھی جواب چاہیے میں پل صراط سے گزرنا چاہتا ہوں، ابھی اسی وقت۔'' ندیم شاہ نے اپنا ہاتھ ان کی طرف بڑھا دیا تھا اور سیاہ گھور آنکھیں راحت کے چہرے پر جما دی تھیں۔

''راحت! مجھے تمہارا جواب چاہیے۔''

سیاہ گھور آنکھوں میں انوکھی سی ضد کے شعلے لپک رہے تھے راحت نے ان شعلوں کی لپک پہ نظریں جھکا دی تھیں۔

مضبوط ہتھیلی اب بھی نرم و نازک ہاتھ کی منتظر تھی۔

راحت نے اپنی ہار پر سر تسلیم خم کرتے ہوئے اپنا ہاتھ ندیم شاہ کے مضبوط ہاتھ میں تھما دیا اور اسی

لمحے کاتبِ تقدیر نے ان دونوں کی قسمت میں ایک دوسرے کی قربت کی خوشیاں بھی لکھ دی تھیں لیکن بے پناہ آزمائشوں کے سائے میں۔

ندیم شاہ کے گھر سے کوئی راحت کے گھر جانے کو تیار نہیں تھا گھر میں مخالفتوں کا پہاڑ کھڑا ہو چکا تھا۔ انہیں دنوں میں ندیم شاہ نے اپنے پلاٹ پر چھوٹے سے گھر کی تعمیر بھی شروع کر رکھی تھی۔

سب کو یوں لگتا تھا جیسے یہ راحت کی ایما پر ہو رہا ہے اور راحت نے اس گھر میں آنے سے پہلے ہی ہر چیز پر قبضہ جما لیا ہے۔

ندیم شاہ کے بڑے بھائی عظیم شاہ اور ان کی بیوی نسرین اس محاذ میں پیش پیش تھے۔

''اماں! آپ لوگوں نے پروین کا رشتہ اپنی خوشی سے کیا تھا ہم نے منتیں نہیں کی تھیں آج تک وہ ندیم کے نام پر بیٹھی تھی بتایئے کون بیاہنے آئے گا اس کو لوگوں کو تو پتا ہے کہ اس کا ندیم سے بیاہ طے ہے اور ندیم کے کارنامے دیکھیں لڑکی بھی پسند کر لی اپنی منگ کو چھوڑ کر۔''

نسرین کو تو دلائل کے ساتھ بے تکی باتیں منوانے کا بھی کمال حاصل تھا یہ تو پھر اس کی بہن کا مسئلہ تھا دن رات اس مسئلے پر گھر میں محفل جمی رہتی۔

ندیم شاہ بھی ضد کے پکے تھے راحت سے دستبرداری زندگی سے دستبرداری تھی یہ وہ اعلان کر چکے تھے نسرین کو اس ان دیکھی لڑکی سے شدید نفرت محسوس ہوتی جو ان کی بہن کی خوشیوں کی قاتل بن بیٹھی تھی۔

انجانے میں ہی سہی لیکن راحت سے یہ گناہ سرزد ہو چکا تھا جس کا کفارہ آسان نہیں تھا۔ بہت دنوں تک بحث و مباحثہ چلتا رہا۔ نسرین روٹھ کر میکے چلی گئیں عظیم شاہ کو اپنا بھائی اپنی خوشیوں کا دشمن لگا۔ اماں کی پریشانی میں اضافہ ہوتا تو وہ رونے بیٹھ جاتیں۔

''ندیم تو ہی میرے سفید سر کی لاج رکھ لے اس عمر میں تیری خاطر اس نسرین کے ہاتھوں پر سوار

ہونا پڑ رہا ہے تو ہی احساس کر لے اپنی بوڑھی ماں کا۔"

"اماں! میں سب کر لوں لیکن پروین سے شادی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ عظیم بھائی کی طرح خود کو گروی رکھ دوں۔ اپنی پوری زندگی کا تماشا بنا دوں آپ بتائیں کیا آپ گھر میں نسرین بھابھی جیسی کسی دوسری کی گنجائش دیکھتی ہیں۔"

وہ اماں کو الگ لے کر بیٹھے تو پھر قائل کر کے ہی چھوڑا۔

اماں بغور اپنے خوبرو لائق فائق بیٹے کو دیکھتی رہیں۔ تصور کی آنکھ سے سانولی سلونی فربہی مائل پروین کو بھی ان کے پہلو میں لا کھڑا کیا۔ کچھ بھی تو ٹھیک نہیں لگا۔

شکل وصورت تو اللہ کی دین ہوتی ہے لیکن کچھ لوگ اس نعمت کی قدر کرنے کے بجائے اپنے افعال سے اس کو بگاڑنے کا بھرپور اہتمام کرتے ہیں نسرین اور پروین اس معاملے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتی رہتی تھیں۔

"اماں! راحت بہت اچھی ہے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ بہت بڑے گھر کی ہے اتنا بڑا عہدہ ہے اس کے پاس اپنے گھر میں سب کی لاڈلی ہے مگر آپ اس کو دیکھیں گی تو حیران رہ جائیں غرور نام کو نہیں ہے اس میں اور نہ ہی نخرہ آپ ایک بار اس سے مل تو لیں۔

دیکھیں میرا آپ سے وعدہ ہے اماں! اگر وہ آپ کو اچھی نہ لگی آپ کا دل مطمئن نہ ہوا تو پھر آپ کا فیصلہ سر آنکھوں پر۔" وہ تصور کی آنکھ سے راحت کو دیکھ رہے تھے چہرے پر روشنی سی بکھر گئی تھی۔

ندیم شاہ کے پُر یقین لہجے نے اماں کو بھی تجسس میں ڈال دیا تھا۔ آخر ان کے سمجھدار بیٹے نے ایسا کون سا گوہر نایاب ڈھونڈ لیا تھا جس کے لیے وہ اتنا پُر یقین اور بے خوف تھا۔

ماؤں کا دل تو اولاد کے وعدوں پہ ہمیشہ ایمان لے آتا ہے ان کی خوشیوں کے لیے موم ہو جاتا ہے وہ بھی ندیم شاہ کے سامنے کمزور پڑ گئی تھیں اور کسی کو بھی بتائے بغیر ایک دن راحت کے گھر پہنچ گئیں۔

ندیم شاہ نے انہیں گھر کا دروازہ دکھا کر راحت کو فون کر دیا راحت نے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ ساری رام کہانی اپنی بڑی بھابھی کی سماعتوں میں منتقل کی تھی۔ جواباً انہوں نے نرم گرم نظروں سے تواضع کرنے کے بعد سرزنش کی تھی۔

''پہلے بتایا ہوتا ایسے تھوڑی ہوتا ہے آناً فاناً جاؤ جا کر شکل درست کرو میں دیکھتی ہوں انہیں۔''

انہیں یقین تھا راحت کی بھولی صورت نازک اندام سراپا اور متوحش پری جیسے انداز کسی کو بھی پاگل بنا سکتے ہیں۔

ندیم شاہ نے تو ماں کو بھیجنے میں کافی دن لگا دیئے تھے۔

اماں راحت کی بھابھی سے مل کر ہی شانت ہو گئی تھیں بیرونی دروازے سے راہداری اور اندر ڈرائینگ روم تک سارے منظر ان کی نظروں میں محفوظ ہو گئے تھے۔ صاف ستھرا طریقے سلیقے سے سجا گھر اور شائستہ مزاج راحت کی بھابھی انہیں پہلی نظر میں اچھی لگی تھیں۔

اب انتظار اس گوہر نایاب کا نہیں تھا بلکہ اس گھڑی کا تھا جب وہ اپنے بیٹے کے لیے دست سوال دراز کرتیں۔

راحت سے ملنے کے بعد بیٹے کا پُر یقین لہجہ اس کی بے قراری اچھی طرح سمجھ آ گئی تھی انہوں نے بڑے بیٹے بہو کسی سے بھی مشورہ کرنا ضروری نہ سمجھا۔

جب سر شام راحت کے بھائیوں بھابھیوں سے مل کر واپسی کا قصد کیا رود بے لفظوں میں رشتے کی بات کرنے کے بجائے صرف اتنا کہا۔

''کل میں اپنے بیٹے کے ساتھ آؤں گی آپ لوگ اس سے مل لینا راحت تو خیر آج سے میری بیٹی ہے۔''

اس کے ہاتھ میں پانچ سو کا نوٹ تھما کر وہ بڑے مسرور لہجے میں گویا ہوئی تھیں۔ راحت پر تو سکتہ

طاری ہوا تھا۔ ان کے بھائی بھابھیاں بھی ساکت رہ گئے تھے۔ بڑی بھابھی نے ذرا سا سر ہلا کر ان کے اس اقدام کی تائید کی سب نے انہیں دیکھا اور چپ ہو گئے۔

اماں کو اس گھر کی ایک اور ادا پسند آ گئی راحت تو رفو چکر ہو ہی چکی تھی۔

اماں نے جاتے جاتے ان کے بڑے بھائی کے پاس رک کر کہا۔

''آپ کو ندیم اچھا لگے تو اپنا بھائی بنا لینا ہو سکتا ہے ہماری حیثیت آپ کے ہم پلہ نہ ہو لیکن میرا بیٹا بہت قابل ہے آپ کی بہن کو ہمیشہ خوش رکھے گا۔''

اماں کے لہجے میں اس قدر یقین تھا کہ کوئی کچھ بول ہی نہیں سکا۔

ویسے بھی اب ندیم شاہ سے ملنا ضروری ہو گیا تھا۔ راحت کے چہرے پر پھیلتے رنگوں نے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ امی ابا کی وفات کے بعد انہوں نے راحت کو ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھا تھا۔

ایک تو وہ سعادت مند اور صابر تھیں پھر سب سے چھوٹی سب کی محبت راحت کے حصے میں آئی تھی لیکن ان ساری رعایتوں نے انہیں بگاڑا نہیں تھا۔

اماں نے ایک ہی گہری نگاہ میں بھانپ لیا تھا کہ راحت ہی ان کے بیٹے کے لیے بہترین ساتھ ہے ان کا بیٹا بھی تو خاندان بھر سے الگ تھا۔

اعلیٰ تعلیم یافتہ، مہذب، شائستہ اور بذلہ سنج۔

خاندانی مسئلے مسائل سے دور اپنی الگ دنیا میں مگن۔

راحت کا ساتھ تو اس کی زندگی مزید سنوار دیتا جبکہ پروین کا نہ تو مزاج ملتا تھا اور نہ ہی عادتیں۔ پڑھائی لکھائی سے کوسوں دور رہنے والی پروین ہرگز بھی ان کے بیٹے کے لائق نہیں تھی۔

انہیں افسوس بھی ہوا اپنے مرحوم شوہر کے فیصلے سے روگردانی کرتے ہوئے مگر زندہ لوگوں کی خواہشوں اور خوشیوں کو مردہ فیصلوں پر قربان نہیں کیا جا سکتا تھا۔

سو وہ جو ندیم شاہ اور راحت کو بہت مشکل لگ رہا تھا خاص طور پر ندیم شاہ کو لگتا تھا راحت سے ان کی شادی کسی معجزے سے کم نہیں ہوگی لیکن اماں کی بروقت تدبیر سے یہ معجزہ رونما ہو ہی گیا۔

جب اماں راضی ہوگئی تھیں راحت انہیں پسند آ گئی تھی تو پھر ندیم شاہ کو کسی کی کوئی پرواہ نہیں تھی ایسا ہی حال راحت کا بھی تھا انہیں طمانیت اس بات کی تھی کہ من پسند ساتھی گھر والوں کی رضامندی سے مل گیا۔

زندگی یکدم اتنی مکمل اور خوبصورت ہو جائے گی اس کا تو انہیں اندازہ ہی نہیں تھا وقت کی کوکھ میں اتنے خوبصورت فیصلے کا ثمر پھل پھول رہا تھا۔ یہ تو اب پتا چلا تھا۔

ندیم شاہ انہیں رخصت کروا کر اس گھر میں لے گئے تھے جو ابھی تعمیر کے مراحل میں تھا لیکن راحت کے لیے یہ بہت تھا۔

کہ وہ اپنے گھر میں آئی تھیں اس گھر میں جو صرف اور صرف ندیم شاہ اور ان کا تھا۔

جس کی بنیادیں ندیم شاہ کی ذاتی کمائی سے رکھی گئی تھیں انہیں یقین تھا دونوں کی محنت اور رفاقت اس عام سے مکان کو بھی محل بنا دے گی۔ اماں ان کے ساتھ تھیں۔

انہیں دنوں ندیم شاہ کے چھوٹے بھائی فہیم کا دبئی جانے کا پروگرام بن گیا طے یہ پایا کہ فہیم کے دبئی جانے سے شادی کر دی جائے۔ نسرین کو ایک بار پھر امید ہو چلی تھی کہ ندیم نہ سہی فہیم پروین سے شادی کر لے گا۔

پروین جو پہلے ندیم کے غم میں رویا کرتی تھی بہن نے اس کی توجہ کا دھارا فہیم کی طرف منتقل کر دیا تھا اب یہ پروین کی بدقسمتی ہی تھی کہ فہیم نے بھی اس سے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔

''میرا انتظار نہ کیا جائے بھابھی! آپ پروین کی شادی کہیں اور کروا دیں میرا کوئی پتا نہیں کب لوٹوں آپ اس کا، وقت مت ضائع کریں۔''

اس نے بڑے رسان سے کہا۔

نسرین کا بس نہیں چل رہا تھا اپنے دونوں بھائیوں کو گولی مار دیں جنہوں نے ان کے اور ان کی بہن کے خوابوں کو بکھیر کر رکھ دیا تھا۔

پروین اب فہیم سے توقعات وابستہ کر چکی تھی۔ اس کے انکار پر اتنی دلبرداشتہ ہوئی کہ فنائل کی آدھی بوتل پی کر ہسپتال پہنچ گئی۔

خودکشی کی ناکام کوشش یقیناً سوالیہ نشان بن جاتی ہے۔ پروین کی زندگی خراب ہونے میں ان بچکانہ فیصلوں کا ہاتھ تھا جنہیں حرفِ آخر سمجھ لیا جاتا ہے۔ لیکن نسرین کے نزدیک یہ سارے گناہ راحت اور ندیم شاہ کے کھاتے میں جاتے تھے جس کے لئے وہ رو رو کر ہاتھ پھیلا پھیلا کر دہائی دیتی تھیں۔

''راحت! تو نے میری بہن کو رلایا تو بھی خوشی کو ترسے گی۔'' اماں تو یہ سن کر کانپ جاتی تھیں اور راحت کے پورے بدن میں خوف کی لہر سی سرائیت کر جاتی۔

وہ کوشش کرتیں کہ نسرین سے سامنا کم ہو لیکن رشتہ داری ایسی تھی کہ یہ ممکن نہ تھا۔

پھر اماں کی کوشش ہوتی کہ کسی طرح یہ اختلافات کی خلیج ختم ہو جائے۔

دونوں بھائیوں میں بھی دوری قائم تھی اور اس کھینچا تانی میں اماں کو سب سے زیادہ تکلیف ہوتی تھی۔

جب وہ ایک بیٹے کے گھر سے دوسرے کے گھر میں رخصت ہوتیں۔

وہ کسی ایک جگہ ٹھکانہ مستقل کرنا چاہتی تھیں لیکن یہاں عظیم شاہ کی ضدی طبیعت جیت گئی تھی۔

''اماں! آپ میرے پاس رہیں گی۔ بس میں نے کہہ دیا نا۔'' ان دنوں اتفاق سے راحت اور نسرین دونوں کے گھر میں خوشی کی خبر متوقع تھی۔

اماں کا دل راحت میں اٹکا رہتا وہ اکیلی تھیں ان کا پہلا موقع تھا پھر ان کی خبر گیری کرنے کے لیے کوئی پاس نہیں ندیم شاہ بھی رات گئے تک کاموں میں مصروف رہتے۔

ادھر نسرین اور عظیم کی ضد۔

''اماں! آپ کو اب فیصلہ کرنا ہوگا میں یا ندیم..... یہ روز روز کا آنا جانا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ انہیں اگر آپ کا اتنا ہی درد ہے تو یہاں آ کر ملیں ندیم اب اتنی بڑی ہستی ہو گیا ہے جو ماں اس سے ملنے جائے بڑا ہی زعم ہے اپنے گھر کا اگر اتنا ہی آپ کا خیال ہوتا تو اس گھر کے لیے بھی کچھ کر لیتا۔

دیواروں کا پلاسٹر تک اکھڑ رہا ہے اور وہ ہے کہ نئے گھر کے چکر میں یہ بھی بھول گیا کہ اس گھر میں اس کا بھی حصہ ہے آخر کو ساری عمر یہاں رہا ہے میں نے کمایا تو سب نے کھایا ہے کچھ تو حق ادا کرے وہ.....''

عظیم کبھی کبھی اتنے ہی سفاک ہو جاتے اماں کی تھکی ہوئی آنکھوں میں نمی پھیل جاتی چہرہ کرب کی تصویر بن جاتا انہوں نے تربیت میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔

''تو اماں! اس میں کون سا جھوٹ ہے ساری عمر عظیم نے کھلایا پلایا اب جب کہ وہ خود کسی لائق ہوا تو اپنا گھر بسا کر بیٹھ گیا۔

ایک دھیلا بھی اس گھر پر خرچ کیا ہو تو بتائیں بس اپنے کمرے کو ہی سجاتا رہتا تھا۔'' نسرین کے کاٹ دار لہجے نے انہیں بالکل ہی نڈھال کر دیا تھا۔

ندیم اور راحت کی شادی کے بعد ان کے لیے ایسے ہی محاذ کھلے ہوئے تھے۔ جو دن وہ راحت کے سنگ سکھ اور طمانیت سے گزارتیں ان کا خراج یہاں اپنے گھر میں آ کر ادا کرنا پڑتا۔

جہاں بیٹا بہو کے ساتھ مل کر اجنبیت کے اتنے وار کرتا۔ کہ وہ اندر تک کرچی کرچی ہو جاتیں۔

انہیں ندیم شاہ کے فیصلے اور سمجھداری پر سجدہ شکر ادا کرنے کا دل چاہتا ورنہ نسرین جیسی پروین تو اس گھر کو، ویران کھنڈر بنا دیتی۔

ایسے ہی گرجتے برستے دن ندیم شاہ نے اماں کے آنسو اور بھائی بھابھی کی بے حسی کا مظاہرہ دیکھا تو ایک عجیب سا فیصلہ کر بیٹھے۔

''راحت! آج تک تم مجھے بغیر کہے دیتی آئی ہو۔ پتا نہیں کیسے جان لیتی ہو میرے دل میں کیا ہے تم نے اتنے تھوڑے سے دنوں میں اماں کو اتنا آرام دیا ہے کہ وہ اب تمہارے بنا بے سکون رہتی ہیں۔ وہ دو حصوں میں بٹ گئی ہیں۔

بڑے بھائی اپنے عظیم ہونے کا حق جتا رہے ہیں وہ اماں کو پابند کر چکے ہیں وہ اب ہمارے پاس نہیں آئیں گی۔ آئیں بھی تو کم وقت کے لیے اور پھر دنوں کی سنیں گی اب ان میں اتنی طاقت نہیں ہے میں ان کی تکلیف کا باعث نہیں بننا چاہتا۔

وہ تم سے بہت پیار کرتی ہیں۔ میں ان سے ان کا پیار دور نہیں کرنا چاہتا جتنی خوشیاں انہوں نے مجھے دیں تمہاری صورت میں، میں اس کا ایک حصہ تو لوٹانا چاہتا ہوں۔ کیا تم میرا ساتھ دو گی؟'' وہ بے ساختہ ان کا چہرہ ہاتھوں میں تھام کر پوچھ رہے تھے راحت کا سر ہمیشہ کی طرح اقرار میں ہل گیا۔

''کیا آپ کے اس گھر میں میری جگہ ہو گی؟'' ان کے سوال میں ہی جواب چھپا تھا۔

ندیم شاہ کی آنکھوں میں جگنو دمکنے لگے۔

''انہیں تو لگ رہا تھا جیسے راحت کو راضی کرنا سب سے مشکل کام ہو گا۔ وہ کسی بھی صورت اپنے خوابوں کی اس جنت کو نہیں چھوڑیں گی مگر وہ تو بن کہے ہی ندیم شاہ کے دل کی جان گئی تھیں۔

انہوں نے بے اختیار انہیں اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔

ماں بننے کا حسن اور ندیم شاہ کی والہانہ قربت کا احساس راحت کے چہرے پر روشنی سی بکھیرے رکھتا۔

ان کی آنکھیں جگر جگر کرتی رہتیں فراغت کے لمحوں میں وہ ندیم شاہ کے ساتھ بزنس کے معاملات کو اپنے علم اور معلومات کے مطابق شیئر کرنے بیٹھ جاتیں۔ ندیم شاہ نے جاب کے ساتھ ساتھ پاور لومز کے کارخانے میں اپنے ایک دوست کے ساتھ انویسٹ منٹ کی تھی۔

زندگی اتنی سہل اور پُر مسرت گزر رہی تھی کہ اس میں ندیم شاہ کی یہ چھوٹی سی خواہش بڑی سی قربانی

کے نام پر بالکل بھی بھاری نہیں لگی۔

ایک ہی دن میں اپنا ہلکا پھلکا سامان سمیٹ لیا واپس آنے کے ارادے سے۔

باقی کی تمام چیزیں ایک کمرے میں بند کر دی گئیں چونکہ تعمیر کا کام بھی چل رہا تھا اس لیے بھائیوں اور بھابھیوں کو بھی ان کا فیصلہ درست لگا۔

''تمہاری حالت ایسی نہیں ہے کہ تم اوپر نیچے بھاگ دوڑ کرو یہاں رہو گی تو سکون سے نہیں بیٹھو گی اچھا ہے ساس اور جیٹھانی کے تجربوں کا بھی فائدہ ہوگا ویسے بھی ان دنوں میں بزرگوں کی موجودگی نعمت محسوس ہوتی ہے۔ بہت حوصلہ دیتے ہیں وہ۔'' بڑی بھابھی نے کہا تھا۔

''آپ میری جیٹھانی کو تو بزرگ نہیں کہہ رہیں ایسا غضب نہ کیجیے گا بھابھی! آگ لگ جائے گی شہر میں یہ سن کر۔''

راحت کی بات پر وہ بھی ہنس پڑی تھیں۔

''اپنا خیال خود رکھنا تمہارے اس گھر میں ہمارا آنا ذرا مشکل ہی ہے وہاں تم اکیلی تھیں اور بات تھی یہاں بھرا پرا گھر ہے۔ اچھا نہیں لگتا ہر وقت بیٹی کے سر پر سوار رہو اس لیے کوئی مسئلہ ہو فوراً فون کر دینا۔''

انہوں نے گلے لگاتے ہوئے ڈھیر سارا پیار کیا تھا۔

''بھئی! یہ نیک کام کرنے کے لئے ہم ہیں نا! آپ کیوں تکلیف کرتی ہیں۔''

ندیم شاہ کی معنی خیز نگاہیں بیوی کو اپنی بانہوں میں سمونے کا اشارہ کر رہی تھیں۔

''بہت فضول ہیں آپ.....'' وہ پھر اپنی بھابھی کی آڑ میں ہو گئی تھی بھابھی نے ندیم شاہ کو خوب گھور کر دیکھا تھا پھر یکدم سنجیدہ ہو گئی تھیں۔

''کیا بات ہے ندیم! آپ کی نیند پوری نہیں ہو رہی کھانا وقت پر نہیں مل رہا یا کام بہت ہو رہا ہے چہرہ دیکھیں بالکل مرجھایا ہوا لگ رہا ہے۔''

راحت کے ناطے ندیم شاہ عزیز تو تھے ہی کچھ ان کا مزاج بھی ایسا تھا وہ اب اسی گھر کا فرد محسوس ہوتے تھے۔

''ہائے بھابھی! شکر ہے میری توانائی کے جانے کا کسی کو احساس تو ہوا آپ کو نظر نہیں آ رہا ساری فریشنیس ادھر منتقل ہو گئی ہے۔''

اشارہ راحت کی طرف تھا اب ان کا نظروں سے سرزنش کرنا لازم تھا۔

''میں مذاق نہیں کر رہی نہ سننا چاہتی ہوں۔ کام کا بھوت سر پر سوار مت کرو اپنی صحت کا خیال کرو۔ نیند پوری کرنا بہت ضروری ہے۔'' بھابھی نے صدق دل سے مشورہ دیا تھا۔

''دن کو دفتر میں حاضری رات کو ان کے دربار میں..... اب بندہ کیا کیا کرے بھابھی!'' وہ ساری بات چٹکیوں میں اڑا کر بھابھی کو زچ کر رہے تھے۔

اور پھر بھابھی کے خدشات صحیح نکلے آنے والے چند دنوں میں شدید قسم کا موسمی بخار اور گلے میں انفیکشن ان پر حملہ آور ہوا۔

راحت کی اپنی حالت قابلِ رحم تھی ایسے میں ندیم شاہ کی پٹی سے لگے رہنا نسرین کی تو تلوؤں سے لگتی تھی سر پر جا کر بجھتی تھی۔

''اماں! یہ تماشا کب تک چلے گا آپ کی نازک مزاج بہو کی مہمان نوازی کب تک ختم ہو گی۔ مجھ سے اس حالت میں گھر کے سارے کام نہیں ہوتے وہ مہارانی تو شوہر کی خدمت کے بہانے اوپر سے نیچے آتی ہی نہیں آپ ہی اسے سمجھاؤ میں نے کچھ کہا تو آپ کو بھی برا لگے گا۔''

وہ اپنی بات بھی کہہ جاتیں اور صاف بچ بھی نکلتیں راحت کے کانوں میں بارہا اس گولہ باری کی آواز سنائی دیتی مگر ندیم شاہ نے اتنی اچھی منظر کشی کی ہوئی تھی یہاں کے روز و شب کی کہ وہ بیشتر وقت خاموش ہی رہتیں۔

انہیں امید تھی یہ سب کچھ تو سہنا پڑے گا۔

اماں خوش تھیں ندیم شاہ اماں کی خوشی میں مطمئن تھے تو وہ بھی بہت حد تک خوش اور مطمئن نظر آنے کی کوشش کرتیں۔

یہ الگ بات کہ اس گھر کا ماحول اور مزاج ان کی نازک مزاج، نفیس طبیعت سے ذرا بھی میل نہیں کھاتا تھا۔

کچن میں چھوٹے بڑے کا کروچ مٹر گشت کرتے رہتے اور نسرین ایک ہاتھ انہیں جماتی تھیں دوسرے سے آٹا گوندھنے میں مصروف ہو جاتیں۔ راحت کا تو دل متلا جاتا۔

روٹی بازار سے منگوانے کا ارادہ کر کے چپکے سے اوپر چلی جاتیں۔

''ندیم! آپ نے بھی مجھے اچھی سزا دی ہے۔'' وہ ان کے کندھے سے لگ کر سرگوشی کے انداز میں کہتیں۔

''اب کیا ہوا میری نخریلی دلہن کے ساتھ۔'' وہ بھی انہی لوگوں میں سے تھے کون کہہ سکتا تھا ان کی تو ہر ادا ہی الگ تھی۔

نہ پان نہ سگریٹ نہ ہی کوئی اور شوق جبکہ عظیم بھائی خود بھی پان سے شغف فرماتے اور ان کی دیکھا دیکھی یہ شوق نسرین میں بھی منتقل ہو گیا تھا۔

راحت بس حیرت سے ان کے سرخ منہ کو تکا کرتیں اور سب سے بڑا ستم یہ کہ وہ پیک کہیں بھی اگل دیتیں۔

راحت ایک الجھن سے نکلتیں تو دوسری میں پھنس جاتیں۔

بچوں کی پرواہ کسے فارغ وقت میں وی سی آر پر فلموں کی تفریح اور فون پر پروین سے گپ شپ۔

پروین کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی تھی لیکن اس کے ساتھ ماں بننے کے سارے مراحل یوں

بیان ہو رہے ہوتے جیسے وہ کہیں کی لیڈی ہیلتھ ورکر ہو۔

''ندیم! ہم اماں کو لے کر واپس چلتے ہیں نا! پتا ہے مجھے اپنا کمرہ بہت یاد آتا ہے۔''

وہ کبھی کبھی سونے سے پہلے فرمائش کرتیں اپنے چھوٹے سے کمرے کو انہوں نے یہاں بھی سوئٹ روم بنا دیا تھا۔

''بس تھوڑے دنوں کی بات ہے یہ صاحبزادے دنیا میں آجائیں پھر چلیں گے۔''

''صاحبزادی کیوں نہیں.....'' وہ شرما سی جاتیں۔

''ہم نہیں چاہتے کہ آپ سی مورت کوئی دوسری ہو۔'' وہ ان کی چھوٹی سی ناک کھینچ کر کہتے۔ راحت پر نثار ہونے کا کوئی موقع وہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے اور راحت کو بھی ان کی اتنی عادت پڑ گئی تھی کہ بیت السکون میں دل ہی نہیں لگتا تھا۔

''ندیم! یہ کیا بات ہوئی بیٹیاں تو رحمت ہوتی ہیں رزق کا وسیلہ ہوتی ہیں بیٹیوں کا کوئی نعم البدل نہیں۔'' وہ مطمئن سے انداز میں کہتیں۔

''بس بیٹیوں کی قسمت سے ڈر لگتا ہے میری بیٹی پیدا ضرور اس گھر میں ہو مگر اس کی تربیت بیت السکون جیسے کسی گھر میں ہو یہ میری دعا ہے۔''

''ہم اس گھر کو بھی تو بیت السکون بنا سکتے ہیں نا۔''

''تمہارا جذبہ قابلِ قدر ہے لیکن کچھ چیزوں کو ٹھیک کرنے کے لیے آپ کا جذبہ اور خدمات اس وقت دھری کی دھری رہ جاتی ہیں جب ضد اور سرکشی مزاج کی نرمی پر حاوی ہو جائے۔

بھابھی کا مسئلہ یہ ہی ہے بھابھی ہم سب سے خفا ہیں اس لیے وہ ہماری طبیعتوں کے برخلاف کام کر کے خوشی محسوس کرتی ہیں وہ تمہیں اذیت نہیں خود کو سکون دے رہی ہوتی ہیں۔

تم اذیت محسوس کرو گی تو ان کا کام پورا ہو جائے گا مست رہا کرو اپنے آپ میں۔'' ندیم شاہ ان

کے مزاج کے ساتھی تھے منٹوں میں شانت کر دیتے۔

''عجیب بات کرتے ہیں ہر بات اگنور تو نہیں ہو سکتی کل عالیہ بغیر دوپٹے کے جانے گلی میں کیا کھیل رہی تھی اچھل اچھل کر میں نے اسے پیار سے سمجھایا احساس دلایا کہ وہ اب بڑی ہو رہی ہے اس بات پر بھی ان کی امی جان ناراض ہو گئیں۔

سفیر سارا دن چھت پر پتنگ اڑاتا رہتا ہے کوئی پرواہ نہیں ایسے تو بچے نہیں پلتے مجھے دکھ ہوتا ہے ان کے فیوچر کا سوچ کر۔''

وہ اپنی حساس فطرت سے مجبور تھیں ندیم شاہ جانتے تھے یہ فطرت نہیں بدل سکتی اس لیے چپ چاپ ان کے چھوٹے چھوٹے گلے شکوے سنتے رہتے۔

راحت نے فارغ وقت میں عالیہ اور سفیر کو پڑھانا شروع کر دیا تھا، جس کے لیے الٹا ہی الزام گلے پڑ گیا تھا۔

''نہ بھئی! میرے بچوں کو اپنے رنگ میں مت رنگو تمہاری ضدیں تو پوری کرنے والے تھے میری بیٹی کی کوئی نہیں سنے گا تمہارے نقش قدم پر چلنے لگی تو۔'' کاری وار تھا راحت کو ضبط کے کڑے مرحلے سے گزرنا پڑا۔

اسی رات وہ صبر و ضبط کی ڈھیر ساری منزلوں سے گزر کر ایک بیٹی کی ماں بن گئی تھیں۔

تندرست سی بچی ماں اور باپ کے خوبصورت چہروں کا عکس تھی۔ ماں کی طرح تحمل مزاج رات دن سوتی رہتی۔

''آئے ہائے اس کی بچی ہے یا پتھر ہمارے بچے تو ایسے نہ ہوئے سارا دن ساری رات سوتی رہتی ہے اور یہ پڑی اینڈتی رہتی ہے۔''

نسرین کا تبصرہ اماں کو بہت بھاری گزرتا تھا مگر جھگڑے کی طوالت سے بہتر خاموشی تھی۔

وہ راحت اور ان کی بیٹی کا خود خیال رکھتیں راحت کا کھانا اپنی نگرانی میں بنواتیں اس میں کوئی شک نہیں کہ راحت نے ان کی ساری توجہ سمیٹ لی تھی اور ان کی بیٹی صوفیہ کے حصے میں دادی کا سب سے زیادہ پیار آیا تھا۔

نسرین کو یہ بات کسی طور ہضم نہیں ہو رہی تھی ردعمل کے طور پر گھر میں کوئی نہ کوئی ہنگامہ مچا رہتا۔

کبھی میاں بیوی میں جھگڑا کبھی اماں سے تلخی اور کبھی بچوں پر غصہ اتارنا راحت حتی المقدور بے نیاز رہنے کی کوشش کرتے ہوئے جلد از جلد اپنے گھر جانے کی دعا کرتی رہتیں۔

ندیم شاہ کا پاور لومز کا بزنس اب چل پڑا تھا مل میں ترقی اور تنخواہ میں بھی اضافہ ہوا تھا۔

وہ اپنی بیٹی کو قسمت کی کنجی کہتے جس کے آنے کے بعد ان کی زندگی کا دھارا ہی بدل گیا تھا دن بھر کام رات گئے بیوی اور بیٹی کے ناز نخرے..... خوبصورت شب و روز تھے وقت بھاگا چلا جا رہا تھا۔

صوفیہ کے بعد اماں کو نسرین نے بھی پوتی کا تحفہ دیا تھا صوفیہ اور عظمی ہم عمر تھیں۔

سفیر کو اپنے بہن گندی لگتی اور وہ صوفیہ سے کھیلنے پہنچ جاتا۔

''چاچی! صوفیہ اتنی لال لال کیوں ہے اور اس کے پاس سے کتنی خوشبو آتی ہے نا۔'' وہ اس کے قریب گھس کر معصومیت سے کہتا۔

''آپ بھی نہا کر آ جاؤ میں خوشبو آپ کو بھی لگا دوں گی، دیکھو نا آپ نے کل سے یہ ہی کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ خوشبو گندے کپڑوں سے ناراض ہو جاتی ہے نا۔''

''اسی لیے عظمی کے پاس خوشبو نہیں آتی، میں ابھی نہا کر آتا ہوں آپ بس اس کو سلانا نہیں۔''

وہ ذرا شرمسار ہو جاتا اور جاتے جاتے تاکید کرنا نہ بھولتا عالیہ اور سفیر کو اپنی صاف ستھری نکھری نکھری چاچی بہت اچھی لگتی تھیں۔ وہ اکثر اپنی ماں کو ٹوک دیتے اور چاچی جیسا بننے کی فرمائش شروع کر دیتے۔

''امی! آپ بھی چاچی جیسی ساڑھی پہنا کریں نا۔'' عالیہ فرمائش کرتی اور نسرین کے ہاتھ کا بھاری دھموکا اس کی کمر دہری کر دیتا۔

''زیادہ چاچی کی لاڈلی نہ بن..... سب جانتی ہوں اس کے کرتوت مجھے تو ندیم پر بھی حیرت ہوتی ہے پتا نہیں غیرت کہاں گروی رکھ دی بیوی کو لے کر دوستوں میں اس دھڑلے سے پھرتا ہے جیسے ان کے سگے ہی تو ہوں وہ۔''

عالیہ کی سمجھ میں یہ باتیں تو نہیں آتی تھیں لیکن یاداشت میں ضرور محفوظ ہو جاتی تھیں۔

اسے راحت کا پہناوا ان کی ہلکی پھلکی تیاری، خوشبوؤں میں بسی صوفیہ، صاف ستھری ڈھیر ساری چیزوں سے آراستہ کمرا ندیم چاچا کی شوخیاں اور مزے مزے کی باتیں سب کچھ بہت اچھا لگتا تھا۔

کہیں لاشعور میں وہ ان دونوں کی زندگی کا موازنہ اپنے امی ابا کی روکھی پھیکی زندگی سے بھی کر رہی ہوتی جس میں شوخیاں تو درکنار آپس کی بات چیت بھی جھگڑے پر ہی ختم ہوتی تھی۔

اسے بعض اوقات اپنی امی کا چیخ چیخ کر بولنا بھی بہت برا لگتا۔

صوفیہ کے ناز نخرے عالیہ کو عجیب سے احساس محرومی میں دھکیلنے لگے تھے۔ وہ کبھی کبھی اس کی چیزیں چھپا لیتی جس پر چچی کی جھنجھلاہٹ لطف دیتی دل چاہتا اسے بستر سے نیچے گرا دے اور وہ خوب روئے مگر چاچی اس سے پل بھر کے لیے بھی غافل نہیں رہتی تھیں۔

اسے غصہ آتا رہتا ایک دن تو اس نے صوفیہ کی نئی فراک پر سیرپ کی بوتل انڈیل دی تھی۔

اس کے اگلے دن راحت نے صوفیہ کے لیے ڈھیر ساری شاپنگ کی اور ساتھ میں عالیہ، سفیر عظمی کے لیے بھی ڈھیر ساری چیزیں خرید لیں۔

نسرین کو توجہ کا یہ انداز بری طرح کھلا تھا۔

چیزیں بھی رکھ لی تھیں اور دل کی تنگی زبان پر بھی آ گئی تھی۔ راحت ہمیشہ ان کے لیے کچھ نہ کچھ

خرید لیتی اور جواباً سنتی تھیں۔

''اماں! اپنی بہو سے بولو میرے بچوں پر ترس نہ کھایا کرے، مانتی ہوں میں پیسے والی ہے یہ راحت لیکن میرے بچوں کو خراب نہ کرے کل کو ان کی فرمائشیں کون پوری کرے گا۔

آپ کا بیٹا تو دال روٹی مشکل سے پوری کرتا ہے۔ یہ تو کاروباری لوگ ہیں ترقی کریں گے آگے جائیں گے اور میرے بچے خواہمخواہ دل چھوٹا کر کے دکھی ہوں گے۔''

اماں حیرت سے نسرین کی شکل دیکھ رہی تھیں۔ دال روٹی والی بات کسی صورت ہضم نہیں ہوئی تھی۔ عظیم شاہ کا ہول سیل کا کاروبار اچھا چل رہا تھا۔

گھر میں روزانہ ایک وقت لازم گوشت پکتا تھا اب اس کا ذائقہ دل کو نہ لگتا تھا اس کا قصور کسی پر عائد نہیں ہوسکتا تھا سوائے پھوہڑپن کے۔

گھر میں ہر چیز وافر مقدار سے آتی تھی لیکن پھوہڑپن سے استعمال ہونے کی وجہ سے مہینے کے آخر میں ڈبے خالی ہو جاتے تھے۔

ایک وقت کا کھانا راحت کی ذمہ داری تھی اور ایک وقت کا نسرین پکاتی تھیں۔ اماں راحت کے ہاتھ کا پکا اپنے لیے بچا کر رکھ لیتی تھیں اب یہ ہی حرکت عالیہ بھی کرتی تھی۔

''چاچی اتنے مزے کی چیزیں بناتی ہیں پتا ہے میں نے ان کے کمرے میں کافی بھی پی تھی اور چاکلیٹ والا دودھ بھی۔'' عالیہ راحت کی جاسوسی پر مامور رہتی تھی۔ نسرین سن گن لینے کے بعد سلگ کر رہ جاتیں۔

راحت یہ چھوٹے چھوٹے کام الیکٹرک کیٹل پر کر لیتی تھی اس بات پر نسرین نے ایک دن واویلا کر دیا تھا۔

''میں پوچھتی ہوں مہینے بھر کا چینی دودھ کیسے ختم ہو جاتا ہے اب پتا چلا یہ مہارانی کمرے میں لے

جاتی ہیں۔

ہم نے تو کبھی الگ ہونے کی بات نہیں کی (گھر میں دوسرا کچن ہوتا تو) اور آپ کی لاڈلی ابھی سے برتن الگ لیے بیٹھی ہے۔" انہوں نے گویا انکشاف کیا تھا۔

راحت حیران پریشان یہ ساری تکرار سن رہی تھیں بظاہر مخاطب اماں تھیں لیکن سنایا صرف راحت کو جا رہا تھا۔ اس لمحے ندیم شاہ کی آمد مزید بدمزگی کا باعث بنی تھی۔

"بھابھی! آپ کو اس طرح کی باتیں زیب نہیں دیتیں گھر میں جو کچھ آتا ہے اس کے لیے میں برابر کی رقم دیتا ہوں اس گھر کی ہر چیز پر راحت کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کہ آپ کا، آپ یہ فضول قسم کی باتیں کر کے گھر کا ماحول مت خراب کریں۔"

وہ بہت دنوں بعد بولے تھے اماں اور راحت تو چپ ہو گئی تھیں البتہ نسرین نے دو بدو جواب دے کر معاملے کو خاصا طول دے دیا تھا۔

عظیم شاہ کی آمد پر پھر ہنگامہ کھڑا ہوا۔ نسرین بضد تھیں کہ انہیں الگ کر دیا جائے۔

راحت کی بے وقت کی عیاشیوں کی وجہ سے میرے بچے خراب ہو رہے ہیں۔

وہ بھی دور کی کوڑی لائی تھیں۔

"سفیر کے ابا! مجھ سے اب یہ ناانصافی برداشت نہیں ہوتی تم اور تمہارے گھر والوں نے شروع دن سے میرا حق مارا ہے ان لوگوں کی وجہ سے میری بہن اب تک گھر بیٹھی ہے اس ندیم نے اس کی زندگی تماشا بنا دی اور یہ خود عیاشی کرتا پھر رہا ہے۔"

بیوی اس کی خود کو ملکہ سمجھتی ہے بچی کو نوکرانی کی گود میں دے کر خود عیش کرتی پھر رہی ہے۔" ان کے شکوے بڑے عجیب و غریب تھے راحت اور ندیم شاہ کو صرف و صرف ان پر ترس آ رہا تھا۔

کچھ لوگ ہوتے ہیں جو اپنی ناشکری اور فطری ضد کے باعث قابلِ رحم بن جاتے ہیں۔

نسرین بھی اس وقت انہی لوگوں میں شامل ہوگئی تھیں۔

اماں سے یہ بے سروپا باتیں برداشت نہیں ہوئیں۔

سارا غصہ اپنی طبیعت پر اتارا رات تک ان کی حالت اتنی خراب ہوگئی تھی کہ انہیں ایمرجنسی میں لے کر جانا پڑا۔

''جب سے تمہاری شادی ہوئی ہے..... اس گھر کا آرام رخصت ہوگیا ہے۔'' یہ عظیم شاہ کے الفاظ تھے جو ندیم شاہ کے سر پر بم کی طرح پھٹے تھے۔

''میری وجہ سے بھائی صاحب۔'' انہیں گہری چوٹ پہنچی تھی۔

''تو اور کیا تمہاری خاطر اماں نے ہم سب کو ناراض کیا اب پچھتاتی ہیں۔'' یہ ایک اور پٹاخہ تھا اماں ہسپتال کے ایمرجنسی بیڈ پر تھیں اور عظیم بھائی انہیں لتاڑ رہے تھے۔

ندیم شاہ ایک گہری سانس لے کر اماں کی طرف چلے گئے اس رات انہوں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ اماں کو لے کر واپس اپنے گھر چلے جائیں گے اب عظیم شاہ کی ناراضگی اور دوری کی انہیں کوئی پرواہ نہیں تھی لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

☆.....☆.....☆

کمال ولا کے در و دیوار کو مصنوعی قہقہوں اور بے معنی گفتگو سنتے رہنے کی عادت تھی۔ اس وقت بھی سرمد بخاری کے بے ساختہ قہقہوں اور معنی خیز جملوں نے شمائلہ کی کوفت کسی حد تک کم کردی تھی۔

وہ رات سے جس الجھن میں تھی اب اس کا سرا ڈھونڈنے کے لیے سرمد بخاری کے پاس آبیٹھی تھی۔

شکیلہ نے دیسی قسم کا ناشتا بھی ٹیبل پر لگا دیا تھا۔

''تم یہ سب کچھ کب سے کھانے لگیں۔'' سرمد بخاری کو حیرت ہوئی تھی۔

''میں یہ سب کچھ کبھی کبھی کھانا چاہتی ہوں۔ میرا بھی دل چاہتا ہے اصل زندگی کے مزے لوٹوں

روزانہ اٹالین چائنز اور کانٹینینٹل کھانے کھا کر میری طبیعت اکتا گئی ہے۔'' وہ بڑے بڑے نوالے لے رہی تھی پراٹھے کے۔

''بہت بھوک لگی ہے کیا.....'' سرمد بخاری ہنس پڑا تھا۔

''تم نہیں مٹا سکتے میری فکر مت کرو۔ تم بتاؤ منیر سے کس بات پر جھگڑا ہوا ہے۔''

''ارے یار اس کی کیا اوقات مجھ سے جھگڑا کر لے..... چیونٹی کے پر نکل جائیں تو وہ یونہی اڑنے لگتی ہے نہ برسات دیکھتی ہے اور نہ رات۔'' سرمد بخاری نے چائے کا کپ لبوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

''تو پھر..... پر کاٹ دوں کیا۔'' شمائلہ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''تم نے ہی اسے بہت ڈھیل دے رکھی ہے مانا تمہارا لائف پارٹنر کم بزنس پارٹنر ہے لیکن اس کا یہ مطلب بالکل نہیں کہ وہ سارے اختیار اپنے ہاتھ میں لے لے۔ کہتا ہے اس بار بنکاک کی ڈیل میں اسے سیونٹی پرسنٹ چاہیے اس نے بہت محنت کی ہے۔

ابے سالے! تو نے کیا محنت کی ہے وہاں بے روزگاری اتنی ہے کہ عورتیں خود ساتھ ہو جاتی ہیں۔'' اس نے تلخی سے کہا تو شمائلہ نے بھی تائید میں سر ہلا دیا۔

''اچھا چھوڑو اس بکواس کو مجھے یہ بتاؤ تمہاری واپسی کب تک ہے۔'' شمائلہ آملیٹ کے ٹکڑے کر کے کانٹے سے کھا رہی تھی۔

''شاید اسی ہفتے کیوں تمہیں کوئی کام ہے۔''

''ہاں مجھے کام بھی ہے اور تمہاری ہیلپ بلکہ مشورہ چاہیے۔''

شمائلہ کے چلتے ہاتھ رک گئے تھے اس کے چہرے پر گہری سوچ تھی اور آنکھیں سرمد بخاری کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

''بولو..... غلام خدمت کے لیے حاضر ہے۔'' وہ شوخی سے بولا تھا۔

''مجھے بچہ چاہیے۔'' وہ اچانک بولی تھی بے حد سنجیدگی سے۔

''واٹ..... تمہیں بچہ چاہیے لیکن منیر کمال تو۔''

وہ پتا نہیں کیا کہنے والا تھا۔ شمائلہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے توقف کرنے کو کہا۔

''اوہ جسٹ اسٹاپ اٹ۔ اس وقت منیر کمال کا کوئی ذکر نہیں اس معاملے سے منیر کمال کا کوئی تعلق نہیں تم جانتے ہو اس کی خصلت اور تم یہ بھی جانتے ہو وہ مجھے مضبوط نہیں کرنا چاہتا۔'' شمائلہ نے کڑوے لہجے میں کہا۔

''تم نے عجیب سا سوال کیا ہے تمہیں پتا تو ہے میں عورتوں کا کاروبار کرتا ہوں بچوں کا نہیں میرے پاس تو۔

اس نے کندھے اچکا کر نرمی سے کہا۔

البتہ اس کے چہرے پر شرارت کے رنگ تھے۔

''ویسے بھی اس عمر میں تم بچہ پالو گی کچھ اچھا نہیں لگے گا۔''

وہ بدستور غیر سنجیدہ تھا شمائلہ احتجاجاً چیخ اٹھی۔

''سرمد! میں بہت سنجیدہ ہوں میں سو نہیں پاتی آج کل..... میرے اندر ہلچل مچی رہتی ہے چھوٹے سے بچے کی قلقاریاں مجھے بے چین رکھتی ہیں تم نہیں جانتے عورت کی تکمیل ماں بننے کے بعد ہی ہوتی ہے۔''

سرمد کو اس کے منہ سے یہ فلسفہ بہت عجیب سا لگ رہا تھا لیکن وہ چونکہ شمائلہ کا سچا دوست تھا اس لیے اب سنجیدہ ہو گیا تھا۔

''شمائلہ! تمہارا تو ایک بیٹا تھا نا..... پہلے شوہر سے اسے تم اپنی مرضی سے باپ کے پاس چھوڑ آئی تھیں۔''

وہ اس کے الفاظ اسے یاد دلا رہا تھا۔

''ہاں میں عاشر عباس کو اس کے باپ کے حوالے کر آئی تھی، کیوں کہ منیر کمال کے دل میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی اور اس وقت مجھے منیر کمال کے سوا کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ اس نے مجھے ہپناٹائز کیا ہوا تھا۔

تم جانتے ہو سرمد وہ اپنی بیوی اور دو پیاری پیاری بیٹیوں کو پردیس میں رلنے کے لیے چھوڑ کر خود بھاگ آیا تھا۔

اس پر شاید کوئی کیس تھا۔

جس شخص کو اپنی بیٹیوں کی پرواہ نہ ہو تم اس سے کیا توقع رکھتے ہو۔''

شمائلہ نے گویا زہر اگلا تھا سرمد بخاری کو زیادہ حیرت نہیں ہوئی تھی منیر کمال سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔

وہ انسان کے روپ میں ٹھیک ٹھاک قسم کا بھیڑیا تھا۔ سرمد بخاری کے اپنے قول کی تصدیق ہو گئی تھی۔

''اس کی بیٹیاں اب کس کے پاس ہیں۔'' وہ پُر تجسس ہوا۔

''مجھے نہیں پتا بہت پہلے اس نے مجھے ان کے بارے میں بتایا تھا اس وقت شاید اس کے پاس کچھ تصویریں بھی تھیں پھر اس نے کبھی ذکر نہیں کیا۔''

شمائلہ کے چہرے پر وحشت کا رقص شروع ہو چکا تھا۔ اس کی ویران آنکھوں میں پچھتاوے اور بے بسی کے سائے گہرے ہونے لگے تھے۔

''سرمد! تم نہیں سمجھو گے میں کیا چاہتی ہوں میں خود بھی نہیں جانتی کیا چاہتی ہوں..... بس ایک ہوک سی اٹھتی ہے اور دل چاہتا ہے کوئی میری گود میں ہمک رہا ہو میں اس کو چھوؤں، محسوس کروں اس سے کھیلوں یہ خالی پن مجھے مار دے گا سرمد!''

آج شمائلہ کمال بالکل بدلے ہوئے روپ میں تھی سرمد بخاری نے ایک گہری سانس لی پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھایا۔

''منیر کمال کی ڈور تمہارے ہاتھ میں ہے تم جب چاہو۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''نہیں مجھے منیر کمال کا بچہ نہیں چاہیے مجھے ماں بننا ہے.....لیکن منیر کمال کا خون نہیں۔'' وہ گویا پھٹ پڑی تھی۔

اس کے چہرے کا تناؤ لفظوں کی صورت باہر نکل گیا تھا۔

وہ اس وقت منیر کمال سے نفرت کی انتہا پر تھی۔ سرمد کی حیرت فطری تھی۔

اسے اچھی طرح پتا تھا شمائلہ کمال نے یہ شادی کن حالات میں کی تھی وہ اس ساری رام کہانی سے واقف تھا جو شمائلہ طارق اور منیر کمال کی مثلث کے درمیان تھی۔

''تمہارا بیٹا تو اب کافی بڑا ہو گیا ہو گا کیا تم چاہتی ہو وہ تمہارے پاس آ جائے۔'' وہ اس بے وقت وحشت کا سرا ڈھونڈ رہا تھا۔ شمائلہ کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔

''وہ کبھی میرے پاس نہیں آئے گا وہ مجھ سے بات کرنے کا روادار نہیں ہے وہ طارق محمود کی اولاد ہے اسی کیطرح ضدی اور سخت جان۔''

''لیکن اسے تم سے ہمدردی ہونی چاہیے تم ایک کرپٹ شخص کے ساتھ کس طرح رہ سکتی تھیں اس کا باپ اچھا آدمی ہوتا تو تمہیں طلاق دے کر دوسری شادی کیوں کر لیتا۔'' سرمد بخاری نے رسان سے کہا۔

''لیکن اسے اپنے باپ سے ہمدردی ہو گی کیونکہ اس کا باپ ایک کرپٹ آدمی نہیں تھا اس کا باپ اچھا آدمی تھا اس نے مجھے طلاق نہیں دی تھی میں نے خلع کا دعوا دائر کرنے کا سوچا تھا اور وہ ہار گیا تھا۔

وہ کرپٹ آدمی نہیں تھا اس پر تو لڑکیاں مرتی تھیں اور وہ میرے لیے پاگل تھا۔''

شمائلہ جیسے کسی ٹرانس میں آ گئی تھی اس کی آنکھیں دور کسی منظر میں کھوئی ہوئی تھیں اور زبان سچ اگل رہی تھی سرمد بخاری کو اب شدید حیرت نے آن گھیرا تھا۔

''لیکن تم نے تو کہا تھا۔''

''وہ میں نے جھوٹ بولا تھا۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر بولی تھی۔

''سچ بہت عجیب ہے جاننے کی کوشش مت کرو مجھے کسی طرح عاشر سے ملا دو مجھے میرا بیٹا چاہیے۔'' اب اسے عاشر چاہیے تھا سرمد بخاری سر تھام کر بیٹھ گیا تھا۔

شکیلہ اس بحث کے دوران برتن سمیٹ کر جا چکی تھی۔

جو کچھ اس کی سماعتوں سے ٹکرایا تھا اس میں عاشر عباس کا اضافہ حیران کن تھا۔

ورنہ اسے تو یہ پتا تھا کہ شمائلہ نے طارق محمود کو اس لیے چھوڑ دیا تھا کہ وہ باپ بننے کی صلاحیت سے محروم تھا شمائلہ کی نفسانی خواہشات کو پورا نہیں کر سکتا تھا۔

لیکن یہ عاشر عباس کون تھا اور کہاں سے آ گیا تھا؟

شکیلہ کے دماغ میں گھنٹیاں سی بجنا شروع ہو گئی تھیں۔

''تمہارے پاس عاشر عباس کا پرسنل نمبر ہے۔'' سرمد بخاری نے اپنا موبائل نکالتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں ہے تو..... اس سے کیا ہو گا؟'' وہ اضطراب اور مایوسی کی ملی جلی کیفیت میں تھی۔

سرمد بخاری نے اچھا دوست ہونے کا حق ادا کرنا شروع کر دیا تھا۔

شمائلہ کو عاشر کا نمبر حیرت انگیز طور پر زبانی یاد تھا سرمد بخاری نے اسے فیڈ کرتے ہوئے ڈائل بھی کر لیا تھا اور موبائل کا اسپیکر آن کر کے شمائلہ کی طرف مسکراتی نظروں سے دیکھا۔

''آواز سننا چاہتی ہو اپنے بیٹے کی۔''

''وہ تو میری آواز نہیں سننا چاہتا میں کیا بات کروں گی اس سے سرمد!'' وہ بے بسی سے بولی۔

دوسری طرف بیل جا رہی تھی اور عاشر عباس واش روم میں تھا کاشف نے آ کر اس کا فعن اٹھایا تھا اسکرین پر صرف نمبر آ رہا تھا کسی کا نام نہیں تھا اس لیے موبائل بند کر کے رکھ دیا۔

شمائلہ کمال کے چہرے پر مایوسی کے سائے لہرا گئے تھے بڑا قیمتی لمحہ ہوتا جب عاشر عباس کی آواز

اس کی سماعتوں سے ٹکراتی مگر اس کی قسمت میں یہ لمحہ نہیں تھا۔

''فکر مت کرو کچھ کرتے ہیں مجھے اچھا لگتا ہے جب تم مجھ پر بھروسہ کرتی ہو اپنا آپ کھول دیتی ہو میرے سامنے۔''

سرمد بخاری اپنی کرسی سے اٹھ کر اس کے پاس آ گیا تھا اور کندھے سے تھام کر تسلی دی تھی۔

''مجھے اب منیر کمال کے ساتھ نہیں رہنا میں اس سے جان چھڑانا چاہتی ہوں۔ پلیز ہیلپ می.....'' وہ اس کے دونوں ہاتھ تھام کر التجائیہ انداز میں بولی۔

''اوکے کرتے ہیں منیر کمال کا بھی کچھ..... فی الحال تم تیاری کرو کچھ دن میرے ساتھ دبئی میں گزارو تمہاری فرسٹریشن یہاں رہ کر کم نہیں ہونی تمہیں چینج چاہیے۔'' سرمد بخاری نے نرمی سے اس کے بال سہلاتے ہوئے مشورہ دیا۔

''آئی ایم سیریس سرمد مجھے اب منیر کے ساتھ نہیں رہنا کچے گوشت کی بو آتی ہے مجھے اس سے.....'' وہ جیسے رو دینے کو تھی سرمد کو شمائلہ کا یہ نیا روپ الجھا رہا تھا۔

وہ اس کی زندگی کی واحد عورت تھی جسے وہ دل سے عزت دیتا تھا۔ مگر آج پہلی بار اس پر ترس آ رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

کاشف کو کراچی کی قدیم عمارات کی تصویر کشی کرنا تھی خولہ اور کشمالہ بھی کراچی جانے کے لیے تیار تھیں اور اب تینوں عاشر کو ساتھ لے جانے کے لیے بضد تھے کاشف اس کو راضی کرنے کے لیے اس کے کمبل میں گھس کر بیٹھا ہوا تھا۔ عاشر اپنے بال اور چہرا تولیے سے خشک کرتے ہوئے واش روم سے باہر نکلا تھا۔

''تیرا فون بج رہا تھا بہت دیر دے unknown نمبر ہے کال پک کر کے دیکھ لے۔'' موبائل کی طرف اشارہ کیا تو عاشر ان سنی کر کے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آ گیا۔

کولڈ کریم کا مساج کرتے ہوئے وہ آج تین دن کے بعد خاصا فریش محسوس ہو رہا تھا۔

میگرین کے ساتھ اسے بخار بھی ہو جاتا تھا اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑا رہتا تھا ان تین دنوں میں کشمالہ کی بے چینی قابلِ دید تھی اس کا بس نہیں چلتا تھا اس کا سارا درد اپنے اندر سمیٹ لے۔

اور شاید اسی لیے دل نے اس کے ساتھ کراچی جانے کی ضد بھی کر لی تھی۔ اب یہ اتفاق ہی تھا. کہ کاشف کا پروگرام بھی بن گیا تھا۔

مشکل مرحلہ تو عاشر کو منانا تھا جو واپس میر پور جانے کے لیے پر تول رہا تھا۔

''اوہ بھئی میری نوکری کا مسئلہ ہے چھٹی نہیں ملے گی۔''

اس نے قطعاً انکار کر دیا تھا۔

''بھلا میرا کراچی میں کیا کام۔''

''آپ کی چھٹی کا کوئی مسئلہ نہیں ہے کراچی میں جو کام ہم کریں گے وہ آپ بھی کر لینا کیوں خولہ۔'' گزری رات وہ تینوں اس کی خیریت دریافت کرنے اس لے کمرے میں جمع تھے۔

''کم از کم ہم دونوں تو آپ کے اس شہر میں بالکل اجنبی ہوں گے اگر آپ ہمیں کمپنی دیں گے تو اچھا ہو جائے گا۔''

خولہ فوراً سے بیشتر تائید کرتی تھی۔ کشمالہ حسب عادت خاموش کبھی کبھی ایک نگاہ عاشر پر ڈال لیتی تھی۔ جو اپنے لمبے چوڑے وجود کو سینے تک کمبل میں چھپائے ان کی بے سروپا باتوں پر زچ ہو رہا تھا۔

اس بحث کا کوئی حاصل نہیں تھا تب ہی کشمالہ نے گفتگو سمیٹی تھی۔

''چلیں ہم عاشر کو آج کی رات سوچنے کا ٹائم دیتے ہیں۔ کل شام تک یہ ہمیں پازیٹو جواب دے دیں تو اچھا ہو گا ورنہ ہم.....'' وہ بھی جاتے جاتے دھمکی پر اتر آئی تھی عاشر نے چونک کر اسے دیکھا وہ تو ہر بات دھمکی کے انداز میں کرتی تھی۔

صبح ناشتے کے وقت بھی وہ اس کے کمرے میں خدیجہ کے ساتھ موجود تھی۔

''آج آپ کو یہ سب کچھ کھانا پڑے گا۔ بیمار ہونے کا مطلب بالکل یہ نہیں ہوتا کہ بندہ بھوک ہڑتال پر چلا جائے رات کو بھی صپ نے کچھ نہیں کھایا تھا چلیں فوراً شروع ہو جائیں۔''

عاشر کو اس کی کمرے میں موجودگی ہی ناگوار گزری تھی کجا کہ اس کا حکمیہ انداز وہ چند لمحے اسے اور پھر ٹرے کو دیکھتا رہا۔

''خدیجہ آپ یہ سب لے کر چلیں میں ناشتا نانو کے ساتھ کروں گا۔'' اس نے کشمالہ کی ضد کسی صورت پوری نہیں کرنا تھی وہ حیران تو ہوئی تھی مگر جانتی تھی اس کے سامنے انوکھا لاڈلا ہے کھیلنے کو چاند بھی مانگ سکتا ہے اور اب اس چاند کے سامنے کاشف کی پھر سے حاضری تھی۔

''عاشر! میں کل کے ٹکٹس کنفرم کروا رہا ہوں۔ طارق انکل نے بھی Go head دے دیا ہے پلیز اب انکار مت کرنا۔''

کاشف اب اسے اطلاع دے رہا تھا وہ برش ڈریسنگ ٹیبل پر پٹخ کر اس کے پاس آ گیا۔

''میں نہیں جانا چاہتا پھر کیوں زبردستی کر رہے ہو تم لوگ..... پلیز تنگ مت کرو مجھے.....''

نازک مزاج بھی تو تھا نا۔

''میں پاپا سے بات کرتی ہوں..... وہ بضد ہیں کہ ہم لوگ یہاں ہی شفٹ ہو جائیں اور عاشر کی بد گمانی کا یہ عالم ہے۔ میرے خیال میں پاپا کو ہی فیصلہ بدلنا ہوگا اور انہیں ہمارے ساتھ واپس یو کے چلنا ہوگا۔''

وہ جذباتی باتیں بہت کم کرتی تھی اس وقت اس کا لہجہ گہری سنجیدگی کا غماز تھا۔

طارق محمود اب ان دونوں کو اکیلے واپس نہیں بھیجنا چاہتے تھے ایسا ہی خیال نانو کا بھی تھا لیکن اصل مسئلہ ان دونوں کا یہاں رکنا نہیں بلکہ عاشر کی باپ سے دوری اور بدگمانی تھی۔

جو ان دونوں کی موجودگی میں کسی صورت کم نہیں ہو سکتی تھی۔

نانو اور طارق دونوں ہی دوراہے پر کھڑے تھے

بظاہر یہ بات چھوٹی سی تھی لیکن نانو جانتی تھیں اس کے جواب میں عاشر کا ردعمل کیا ہوگا۔

''پاپا اگر ہماری وجہ سے آپ کا اور عاشر کا ڈس پیوٹ بڑھ رہا ہے تو پلیز آپ ہمیں جانے کی اجازت دے دیں۔ ہمارا کراچی جانا بھی اتنا اہم نہیں ہے۔ ہماری وجہ سے آپ دونوں کی دوریاں بڑھ رہی ہیں۔

عاشر کو لگتا ہے کہ ہم نے آپ کو چھین لیا تھا اور شاید وہ ٹھیک بھی سوچتا ہے آپ پلیز اس کا خیال کریں ہمیں آپ نے اتنا مضبوط کر دیا ہے اب کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔''

کشمالہ طارق محمود کے گھٹنے پر سر رکھے اپنے مخصوص ٹھہرے ہوئے انداز میں بول رہی تھی۔

طارق محمود کا ہاتھ حسب عادت اس کے بال سہلا رہا تھا اور اپنے کمرے کی طرف جاتے عاشر عباس کو یہ منظر اتنا ناگوار گزرا تھا کہ اس نے سارا غصہ کمرے کے دروازے پر اتارا تھا۔

کاشف کہیں باہر گیا ہوا تھا اور عاشر اس کا انتظار کیے بغیر اپنا سامان سمیٹ کر واپس میر پور جانے کو تیار ہو گیا تھا۔

''نانو! میں نہیں رہنا چاہتا یہاں پر جب یہ لوگ چلے جائیں گے میں تب چھٹی لے لوں گا۔''

وہ اس طرح ضد کرتا نہیں تھا نانو کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اچانک اسے ہوا کیا ہے۔

''اچھا چلو..... موڈ ٹھیک کرو میں طارق سے بات کرتی ہوں۔ اس بار اپنے باپ سے پوچھ کر جاؤ اسے تمہاری فکر رہتی ہے۔''

''میری ماں بھی آپ ہیں اور باپ بھی..... مجھے کسی سے کچھ نہیں پوچھنا۔ آپ ان لوگوں سے کہہ دیں پلیز ہماری زندگیوں سے چلے جائیں، ہم لوگ ان کے بغیر بھی بہت خوش تھے کوئی ادھورا پن نہیں تھا زندگی میں۔''

آج اسے جانے کیا ہوا تھا بہت دنوں کے بعد اس کے اندر کا تناؤ باہر آ رہا تھا۔

اس کے چہرے پر بے قراری اور آنکھوں میں الجھن سی تھی۔

نانو نے بغور اسے دیکھا اور کھڑی ہو گئیں۔

''اچھا ٹھیک ہے میں طارق سے بات کرتی ہوں تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں اس گرجتے برستے موسم میں جانا ہے تو وہ لوگ جائیں۔'' انہوں نے گویا اس کے دل کی بات کی تھی۔

عاشر کے چہرے پر طمانیت بھری مسکراہٹ آ گئی تھی۔

''یہ ہوئی نا بہادری والی بات۔'' اس کا موبائل بج رہا تھا۔

اس نے بٹن پش کر کے موبائل کان سے لگایا تو شمائلہ کمال کی محبت بھری آواز اس کی سماعتوں کو چھو گئی اس نے محض سلام کیا تھا اور وہ کہہ رہی تھی۔

''عاشر بیٹے کیسے ہو میں شمائلہ بات کر رہی ہوں۔''

☆.....☆.....☆

وہ رات ندیم شاہ اور راحت کے لیے زندگی کی بھیانک رات ثابت ہوئی تھی۔

خوشی اور مسرت کی رنگ برنگی تتلیاں اڑ کر کسی انجان منڈیر پر جا بیٹھی تھیں اور ان کے در و دیوار پر موت کے بھیانک سائے لرزنے لگے تھے۔

اماں نے ساری رات تکلیف کے عالم میں گزاری تھی اور صبح کی اذانوں سے پہلے انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہتے ہوئے آنکھیں موند لی تھیں۔

ندیم شاہ اماں کے ساتھ تھے۔

عظیم شاہ اپنی بیوی کی مزاج پرسی کرنے واپس گھر آ چکے تھے جو نہ جانے کون کون سے دکھوں اور زیادتیوں کو یاد کر کے بار بار بے ہوش ہو رہی تھیں۔

راحت کو اماں کی فکر تو تھی لیکن نسرین نے بھی کم پریشان نہیں کیا ہوا تھا بچے الگ پریشان آدھی رات کو کہیں سہم کر کونے میں سمٹ گئے تھے۔ اور وہیں بیٹھے بیٹھے انہیں نیند بھی آ گئی تھی۔

عظمی روتے روتے سو گئی تھی۔

اس بھگدڑ کے عالم میں رات کب گزر گئی تھی پتا بھی نہیں چلا تھا راحت صوفیہ کو فیڈ کروا کر وضو کے لیے باتھ روم کی جانب بڑھ گئی تھیں کمرے میں رکھا فون بجنے لگا تھا صبح کے سناٹے میں فون کی گھنٹی نے یکدم عجیب سی وحشت کا طبل بجایا تھا۔ آخری فون شاید ندیم شاہ نے آدھی رات کو کیا تھا جب اماں کو آئی سی یو سے روم میں منتقل کیا گیا تھا۔ وہ دوپٹہ بیڈ پر ڈال کر فون کی طرف بے قراری سے لپکی تھیں فون کی گھنٹی کی آواز بھی کم تھی لیکن ریسیور اٹھا کر کانوں سے لگاتے ہوئے ان کے دل کو انجانے سے خوف نے جکڑ لیا تھا۔

انہوں نے سرگوشی کے عالم میں ہیلو کہا تھا اور ندیم شاہ کی بکھری ہوئی صدا سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔

"راحت..... عظیم بھائی کو بھیج دو میرے اندر اتنی ہمت نہیں ہے کہ میں اپنی ماں کا جنازہ اکیلے اٹھا سکوں۔"

سسکیوں اور تلخیوں کا ملا جلا امتزاج اس صدا میں لپٹا ہوا تھا۔

"ندیم! آپ کیا کہہ رہے ہیں ابھی تو اماں ٹھیک تھیں آپ نے کہا تھا کہ وہ آئی سی یو سے باہر آ گئی ہیں۔"

راحت رندھی ہوئی آواز میں بس اتنا ہی کہہ سکی تھیں آنسوؤں کا پھندا گلے میں اٹک گیا تھا.....

نگاہوں کے سامنے اماں کا مضمحل مگر مہربان چہرہ گھوم گیا تھا۔

پہلے دن سے لے کر گزری شام کے اس آخری لمحے تک جب اماں پوری طرح ہوش و حواس میں تھیں جب جب راحت نے ان کی طرف مڑ کر دیکھا تھا وہ انہیں نگاہوں ہی نگاہوں میں صبر حوصلے اور بہادری کی تلقین کر رہی تھیں وہ انہیں بار بار سمجھاتی تھیں کہ تمہارا نسرین کے ساتھ کوئی میل نہیں تم جھگڑے

میں کبھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔

وہ حوصلہ طاقت دینے والی مہربان ہستی کی ہمدرد نگاہیں تاریکی میں ڈوب گئی تھیں وہ آخری لمحوں میں ان سے بات بھی نہیں کر پائی تھیں۔

دوسری طرف سے ندیم شاہ کی آواز ان کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔

''راحت عظیم بھائی کو بھیج دو۔''

اس کے بعد ادھر بھی خاموشی چھا گئی تھی راحت نے ریسیور کریڈل پر ڈال کر بمشکل خود کو بے اختیار ہونے سے روکا اور دھندلائی ہوئی آنکھوں سے دوپٹہ سر پر لیتے ہوئے باہر کی طرف قدم بڑھائے۔

اس کے بعد شام تک اماں منوں مٹی تلے جا سوئیں۔ سب ایک دوسرے کے گلے سے بھی لگے مل کر آنسو بھی بہائے۔

فہیم ان کے درمیان نہیں تھا فون پر اس سے ہمدردی بھی کی اپنا دکھ کہا اس کا درد بانٹا۔

رشتہ دار، عزیز، دوست، احباب تعزیت کے لیے آئے گئے وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا اماں کے بغیر پہلی رات ندیم شاہ اور راحت دونوں کے لیے قیامت کا دکھ لائی تھی ان دونوں کو یہ محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اس چھت تلے یکدم اجنبی ہو گئے ہوں۔ یہ گھر ان کا نہ رہا ہو اس کے در و دیوار سے وہ ربط ٹوٹ گیا ہو جو اماں کے ہوتے ہوئے پوری شدت سے محسوس ہوتا تھا۔ نیند دونوں کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

صوفیہ بھی بے چین سی تھی۔

آج پہلی بار وہ راحت کو تنگ کر رہی تھی اور اپنے مقررہ وقت پر سونے کے بجائے پوری آنکھیں کھولے کبھی چھت کو گھورنے لگتی تو کبھی ماں باپ کو جیسے اسے بھی ان دونوں کے دکھ کی خبر ہو چلی ہو۔

''ندیم آپ ادھر صوفیہ کے پاس ہی لیٹ جائیں میں آپ کا سر دبا دیتی ہوں۔''

راحت نے ندیم شاہ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ان کے مضمحل چہرے اور سرخ آنکھوں کو دیکھا۔

ندیم شاہ نے انہیں اپنے ساتھ لگاتے ہوئے ان کے سر پر اپنا چہرہ ٹکا دیا تھا۔

''اماں! ہم سب سے تنگ آ گئی تھیں ناں۔''

''ہم نے تو اماں کی ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش کی اگر پھر بھی کوئی کوتاہی ہو گئی ہے تو معافی دے دیں وہ۔''

''پتا ہے تم سے وہ بہت خوش تھیں آئی سی یو سے باہر آنے کے بعد تھوڑی دیر کے لیے وہ ہوش میں آئیں تو سب سے زیادہ تمہاری فکر تھی۔''

ندیم شاہ نے غیر شعوری طور پر راحت کو اپنے بانہوں کے حصار میں لے لیا تھا اور راحت دھیرے دھیرے ان کی پشت کو دبا رہی تھیں۔

ندیم شاہ کو راحت کے ملائم ہاتھوں سے اپنی کمر، گردن اور کندھے دبوانا بہت اچھا لگتا تھا وہ اکثر فرمائش کرتے تھے اور پھر تھوڑی سی دیر بعد ان کے دونوں ہاتھ اپنے لبوں سے لگا لیتے تھے۔

''میری جاناں کے لمس کی حرارت ہی میری ساری تھکن سمیٹ لیتی ہے میں اسے زیادہ مشکل میں نہیں ڈال سکتا نا۔''

تب راحت کے چہرے پر نرم سی مسکراہٹ بکھر جاتی اور وہ بڑی عقیدت سے اپنے سرتاج کو دیکھنے لگتی تھیں جو واقعتاً سر کا تاج کہلائے جانے کے لائق تھے۔

''آپ جانتے ہیں ندیم اگر اماں نہ ہوتیں تو میں کبھی بھی یہاں نہ رہ پاتی نسرین بھابھی کی نگاہوں سے ڈر لگتا ہے ان کی زبان کے گھاؤ تو دور کی بات ہے برداشت کرنا۔'' وہ ان کے سینے سے لگیں دھیرے دھیرے اپنا خوف بیان کرتے ہوئے معصوم سی بچی کی طرح لگ رہی تھیں بالکل اس ننھی سی صوفیہ کی طرح جو اپنی جگہ پر لیٹی دونوں کو ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھی۔

''اماں کو احساس تھا تم ان کی وجہ سے اس سمجھوتے پر آمادہ ہوئی ہو وہ مجھ سے ہمیشہ کہتی تھیں کہ

عورت کے اندر اپنے گھر کو سجانے سنوارنے کی خواہش بہت طاقتور ہوتی ہے اور اس کے لیے وہ ساری دنیا سے ٹکرا جاتی ہے کیا یہ سچ ہے راحت۔"

وہ اچانک اپنی محبوب بیوی کے چہرے کو ہاتھوں میں لے کر ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے تھے راحت کی سرخ سوجی ہوئی آنکھیں قربت کے احساس سے بوجھل تو تھیں ہی اماں کی بات کا مفہوم سمجھ کر بے ساختہ چھلک پڑیں۔

"موت برحق ہے میں جانتی ہوں اماں لیکن مجھے ابھی آپ کی ضرورت تھی صوفیہ کو آپ کی قربت اور شفقت کی ضرورت تھی ابھی تو میں نے آپ سے زندگی کو برتنا سیکھا تھا اور آپ نے بیچ راستے میں چھوڑ دیا۔"

وہ ایک بار پھر ندیم شاہ سے لپٹ کر ڈھیر سارا رو دی تھیں۔

"آج رو لو لیکن کل سے اپنے آپ کو سمیٹ لینا..... ابھی بہت سارے محاذ باقی ہیں۔"

ندیم شاہ انہیں تسلی دیتے ہوئے خود کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے تھے۔

☆.....☆.....☆

وہ شمائلہ کمال کا نمبر نہیں پہچانتا تھا اس نے کبھی اس نمبر کو اپنے سیل فون میں محفوظ کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی تھی تب ہی وہ اسے اوکے کرنے کی حماقت کر بیٹھا۔

شمائلہ کی آواز سن کر اس نے موبائل ہی سوئچ آف کر دیا تھا۔ وہ جانتا تھا اب شمائلہ کمال کو قرار نہیں آتا اور عاشر کو شمائلہ کمال کی بے قراری سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ شمائلہ اسے اکثر فون کرتی اور وہ ہمیشہ اس کا فون کاٹ دیتا تھا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا آج جبکہ وہ اپنے قدموں پر کھڑا ہو چکا ہے اس کے لمبے چوڑے وجود میں ہر طرح کے حالات سے لڑنے اور مقابلہ کرنے کی طاقت مجتمع ہو چکی ہے تو یہ ماں باپ اسے سمیٹنے

اس کو اپنی بانہوں میں لینے اور اس کی تنہائی دور کرنے کے متمنی نظر آتے ہیں۔

ایک طرف راجہ طارق محمود ہیں وہ آج اسے اپنی تنہائی کا مداوا کہتے ہیں۔ اسے سینے سے لگا کر پیار کرنے کو بے قرار ہیں اس کے مضبوط وجود میں انہیں اپنا آپ نظر آتا ہے۔

''واہ راجہ صاحب! واہ کیا کہنے آپ کے۔''

ماں دل کے ہاتھوں مجبور ہو گئی تھی آپ کی عقل مندانا کا تقاضا یہ تھا کہ اس کا رستہ نہ روکا جائے لیکن اس سودے بازی میں میرا کیا قصور تھا؟

میں نے کیوں یہ بن باس کاٹا۔ مجھے تو ماں باپ دونوں کی اشد ضرورت تھی جن کے ماں باپ مر جاتے ہیں اللہ ان کو صبر اور قوت دے دیتا ہے۔

میرے تو ماں باپ زندہ تھے بس مجھے مردہ تصور کر کے اپنی زندگی کی خوشیوں میں مگن ہو گئے تھے۔ آج اگر انہیں احساس ہو رہا ہے کہ عاشر نام کا کوئی وجود بھی ان کے بے رحم رشتے کی سوغات کے طور پر دنیا میں آیا تھا۔

دیکھیں تو سہی ہمارے بنا اس پر کیا بیتی؟

واہ محترمہ شمائلہ کمال صاحبہ ملک کی نامور رقاصہ اور اداکارہ.....

کیا خوب شہرت کمائی ہے آپ نے اور آپ مجھے اپنا بیٹا بنانے کو مجھے گلے لگانے کو بے چین ہیں۔

اس کے پُر سوچ چہرے پر تناؤ کی لکیریں پھیل گئی تھیں وہ موبائل کے ساتھ کھیلتے ہوئے مسلسل سوچوں میں گم تھا۔

وہ عموماً ماضی کی تلخیوں کو اپنے ذہن پر سوار نہیں کرتا تھا لیکن کبھی کبھی کوئی بات ذہن میں پوری جزئیات کے ساتھ تازہ ہو جاتی تو وہ بہت تلخ ہو جاتا بالکل اپنے تلخ ماضی کی طرح جب اس کے سمجھدار پڑھے لکھے ماں باپ دن کے اجالے میں مہذب باوقار اور بے حد نفیس طرزِ زندگی کے ساتھ بے شمار

لوگوں کے لیے باعث تفاخر ہوتے اور شام ہوتے ہی جب وہ دونوں بھرپور دن گزارنے کے بعد اپنے گھر کو لوٹتے تو ان کے چہرے پر عجیب سا کھنچاؤ اور تلخی در آتی۔

وہ اپنی عمر کے ابتدائی دور سے ہی انسانی رویوں کو چہرے پر آئے تاثرات کو پڑھنے کا عادی ہو گیا تھا۔

وہ عموماً ڈائننگ ٹیبل پر ماں باپ کے چہرے کے تاثرات سے ماحول کی نرمی گرمی کا اندازہ لگا لیتا تھا ویسے بھی اسے کبھی کبھی اس سعادت کا موقع ملتا تھا کہ وہ ان دونوں کے ساتھ کھانا کھائے ورنہ تو اس کی آیا اتنی مستعد تھی کہ مقررہ وقت پر اس کو کھانا کھلا کر کمرے میں پہنچا دیا کرتی تھی۔

اس کے بعد سونا یا نہ سونا اس کے اپنے اختیار میں ہوتا تھا لیکن وہ اپنے سارے فرائض پوری دیانتداری سے پورے کرتی تھی۔

اس رات بھی وہ اسے اپنے حساب سے سلا کر کمرے سے باہر چلی گئی تھی لیکن بہت زیادہ شور اور چیخ و پکار کی آواز پر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ نائٹ بلب کی مدہم روشنی میں کمرے کے سارے کھلونے اور بیئرز ویسے بھی خوف زدہ کر رہے تھے۔

اس نے آنکھیں اور کان بند کر کے آوازوں سے بچنے کی کوشش کی لیکن شور تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

وہ اٹھ کر دروازہ کھولنے پر مجبور ہو گیا اس کا کمرہ لاؤنج سے ذرا فاصلے پر تھا اور آج جنگ و جدل کا مرکز لاؤنج کا وسیع میدان تھا اس نے ڈرتے ڈرتے اپنے کمرے سے باہر قدم رکھا اور لاؤنج سے ملحقہ ڈائننگ ہال کے پردے کو تھام کر کھڑا ہو گیا۔

قیمتی یا خوبصورت چیزیں اس کا ذہن تعین نہیں کر پا رہا تھا لیکن اتنا ضرور جانتا تھا کہ یہ تمام چیزیں اس کے باپ نے بڑے شوق سے خریدی تھیں وہ ہر چھ مہینے کے بعد اپنے کمرے کا انٹریئر تبدیل کرتے تھے اور خوب خوشی کا اظہار بھی کرتے تھے کہ ان کا گھر کتنا اچھا لگ رہا ہے۔

اس وقت گھر کباڑ خانہ لگ رہا تھا راجہ طارق محمود ایک صوفے پر کمال اطمینان سے بیٹھے تھے اور

شمائلہ چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینک رہی تھیں ان پر جیسے وحشت سی سوار تھی دورہ سا پڑا ہوا تھا انہیں۔

عاشر کی آنکھیں ساکت ہوگئی تھیں اس نے کم از کم یہ مظاہرہ پہلی بار دیکھا تھا۔

''طارق! تم مجھے جانوروں کی طرح کھونٹے سے باندھ کر نہیں رکھ سکتے میں انسان ہوں مجھے بھی حق ہے وہ زندگی جینے کا جو تم جی رہے ہو تم زمانے بھر میں گھومتے پھرو عیاشیاں کرو اور مجھے تم نے اس گھر سے نہ نکلنے کا حکم دیا ہوا ہے۔''

انہوں نے چھوٹا سا ٹیبل کلاک اٹھا کر دیوار پر دے مارا تھا وہ انٹیک پیس تھا اس لیے ٹوٹنے سے تو محفوظ رہا البتہ آواز بہت زور کی آئی تھی۔

''میں نے تمہیں تمہاری بے ہودہ حرکتوں سے روکا ہے شمائلہ میں اتنا بے غیرت مرد نہیں ہوں کہ تمہیں منیر کمال کے ساتھ.....'' اس کے بعد وہ چپ ہو گئے تھے کیونکہ شمائلہ نے ان کی بات کاٹ دی تھی۔

''منیر، منیر، منیر..... کتنی چھوٹی ذہنیت ہے تمہاری کتنے کم نظر ہو تم اگر مجھے تمہاری اس فطرت کا پہلے سے پتا ہوتا تو میں کبھی بھی تم سے شادی نہ کرتی لیکن میری بھی تو آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے تھے تمہاری محبت کے.....

''مجھے یوں لگتا تھا تم میرے جیسے ہو، میری طرح سوچتے ہو تم دنیا بھر میں گھومتے پھرتے ہو تمہاری سوچ عام مردوں جیسی نہیں ہوگی جو اپنی بیویوں کو بس اپنا غلام سمجھتے ہیں۔'' وہ جیسے گہرے صدمے میں تھی۔

''تو کیا میں اپنی بیوی کو دوسروں کا تر نوالہ بننے کی اجازت دے دوں میں اسے محفلوں کی رونق بنا کر خود ایک کونے میں بیٹھا رہوں اور یہ دیکھوں کہ کون سا مرد اس کو کس نظر سے دیکھ رہا ہے اور کون مجھ پر ترس کھا رہا ہے۔

ہاؤ امیزنگ شمائلہ، تمہاری سوچ، تمہارے باغیانہ خیالات اور تمہاری عیاش فطرت مجھے رسوا

کرنے پر تلی ہوئی ہے اور میں اتنا بے بس ہوں کہ تمہیں چھوڑ بھی نہیں سکتا کیونکہ تم جن ماں باپ کی بیٹی ہو انہوں نے مجھے اس مقام تک پہنچایا ہے۔"

راجہ طارق محمود کی بے بسی قابل دید تھی ان کی آنکھوں سے سرخ رنگ بہہ رہا تھا۔ عاشر نے کبھی اتنی سرخ اور پانی میں ڈوبی ہوئی آنکھیں نہیں دیکھی تھیں۔ اس کا ننھا سا دل دہل کر رہ گیا۔

"بہت اچھے طارق محمود! تم مجھ پر ترس کھا رہے ہو تمہیں میرے ماں باپ کی وجہ سے مجھ پر رحم آتا ہے اس شادی کے لیے بھی تو انہوں نے تمہیں مجبور کیا ہوگا نا۔

ہاں ظاہر ہے مجھ سے پیار ہوتا میرا خیال ہوتا تو میری خواہشوں کے آگے دیوار نہ بنتے ڈانس اکیڈمی جوائن کرنا میرا شوق ہی تو تھا تم نے اسے میری عیاش فطرت بنا دیا اور اپنا تمہیں پتا بھی نہیں جب تک چار چھ عورتوں کا جمگھٹا تمہارے ارد گرد نہ ہو تمہیں مزا ہی نہیں آتا۔

سال کے چھ مہینے تم گھر سے باہر رہتے ہو مجھے کیا پتا تم کس کس کے ساتھ عیاشی کرتے ہو تم جیسے مرد کو ایک رات عورت نہ ملے تو وہ بپھر جاتا ہے۔" شمائلہ کا لہجہ حد درجہ زہریلا تھا راجہ طارق محمود کو جیسے سانپ نے ڈس لیا تھا وہ تڑپ کر اٹھے تھے اور شمائلہ کو بازو سے تھام کر اپنے مدمقابل کیا تھا۔ یہ وہ شمائلہ تو نہ تھی جس سے شادی کرنے پر ان کے دل نے بہت مجبور کیا تھا۔

"شمائلہ! تم میری محبت میری چاہت کو اپنے ساتھ میری دیوانگی کو ہوس کا نام دے رہی ہو تم میرا جیون ہو میں تمہیں اپنی بانہوں میں لے کر سکون محسوس کرتا ہوں اپنی ساری تھکن اتارتا ہوں تم قربت کے ان لمحوں کو میری نفسانی خواہش سمجھتی رہی ہو۔ تم مجھے عورت کے آگے بے بس مرد سمجھتی ہو۔"

راجہ طارق محمود کی آواز پھٹ رہی تھی ان کے چہرے پر وحشت کا رقص تھا اور وہ خون آلود نگاہوں سے اس عورت کو دیکھ رہے تھے جو آج ان کی مردانگی کا امتحان لے رہی تھی جو ان کی بے حساب محبت کو ہوس کا نام دے رہی تھی جس سے انہوں نے بے تحاشا پیار کیا تھا جس کے ایک ایک انگ کو انہوں نے

محبت اور عقیدت سے بار ہا چھوا تھا۔

وہ انہیں نفسانی خواہشات کا مارا ہوا مرد کہہ رہی تھی۔

پتا نہیں شمائلہ کو کیا چاہیے تھا طارق محمود کی محبت کو تو اس نے نفس کا نام دے دیا تھا۔

جانے منیر کمال نے اس کی تسکین کے لیے کون سا جادوئی منتر پڑھ کر پھونکا تھا کہ وہ گزرے سالوں کی چاہت سے منحرف ہو گئی تھی۔

بس کر دو طارق یہ ڈھکوسلے عورت پر حکمرانی کا شوق تو تمہیں شروع سے ہی تھا تم مجھے ہمیشہ اپنے کنٹرول میں کرنا چاہتے تھے چاہے وہ کسی بھی طریقے سے ہو تم جانتے ہو میں کیا ہوں اور کیا کر سکتی ہوں اس لیے تمہیں میری ہابیز سے خوف آتا ہے کہیں میں تم سے زیادہ باعزت اور اہم نہ بن جاؤں کہیں لوگ تمہیں میرے نام سے نہ جاننے لگیں۔"

وہ عجیب سی باتیں کر رہی تھی بے ربط سے انداز میں اس کا چہرہ اس کے لفظوں کا ساتھ نہیں دے رہا تھا وہ بے خوف بھی تھی بے بس بھی۔

اس کے لہجے میں خودسری بھی تھی اور نادانی بھی اس کی آنکھیں پتھر ہو رہی تھیں اور ان میں کسی قسم کی شناسائی بھی نہ تھی۔

پتا نہیں وہ یکدم ایسی کیوں ہو گئی تھی۔

راجہ طارق محمود کے ہاتھ میں وہ سرا نہیں آ رہا تھا جس کی وجہ سے شمائلہ اور ان کے درمیان اتنے طویل فاصلوں کی دیوار بن گئی تھی۔ اچھی بھلی زندگی تھی وہ ضدیں کرتی تھی لیکن یوں آپے سے باہر نہ ہوتی تھی جانے کیوں آج وہ بہت طاقتور محسوس ہو رہی تھی۔

"کیا چاہتی ہو روز روز تماشا کرنے کے بجائے صرف ایک بار میری شہ رگ کاٹ دو میں نے تمہیں رشتے کا مان اور محبت اپنی بساط سے بڑھ کر دی ہے اپنا آپ گروی نہیں رکھا جو تم جب تک چاہو

اپنی مرضی سے استعمال کرتی رہو۔" ان کے لہجے میں برف کی سی کاٹ تھی۔

"جو تم نے مجھے دیا وہ میرا حق تھا تم نے مجھ پر کوئی احسان نہیں کیا لیکن جو تم نے مجھے نہیں دیا وہ میری ذات کا مان ہے، میرے ہونے کی شناخت ہے میرا اپنا آپ ہے جو تمہاری ذات میں مدغم ہو کر کہیں ختم ہی ہو گیا۔

میں تمہاری خاطر خود کو مٹا سکتی تمہیں بھی اپنا نام اور مقام عزیز ہے تو مجھے کیوں نہیں ہو سکتا تم شمائلہ کو مارنا چاہتے ہو اور میں اسے نئی زندگی دینا چاہتی ہوں۔" وہ نخوت سے بولی تھی۔

راجہ طارق محمود نے اس سارے وقت میں پہلی بار اس سے شدید نفرت محسوس کی تھی۔ اتنی شدید نفرت کہ وہ اس کی طرف نگاہ کرنے کو بھی اپنی تذلیل سمجھ رہے تھے۔

"میں جانتا ہوں شمائلہ! تمہیں کیا چاہیے تمہارا نفس تمہاری فطرت کا ناشکرا پن اور تمہارے اندر کی کم ظرف عورت تم سے وہ سب کچھ کروانا چاہ رہی ہے جو بازار کی عورتوں کا وطیرہ ہوتا ہے میں تمہاری تربیت کو دوش نہیں دے سکتا میں تمہارے خون کو الزام نہیں دے سکتا لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں تم جیسی عورتیں اپنی تخلیق کے مقصد سے بے پرواہ ہوتی ہیں۔"

وہ ٹوٹے ہوئے مگر زہریلے لہجے میں کہتے ہوئے صوفے پر ڈھے سے گئے تھے۔

شمائلہ بھی شاید مزاحمت کرتے کرتے تھک چکی تھی اسی لیے اتنے کڑے محاسبے پر چیخنے چلانے کی بجائے بڑے تحمل سے مسکرا دی تھی۔

"بہت خوب! آ گئے نا اپنے ٹریک پر میں جانتی تھی تم مردوں کے پاس آخری ہتھیار یہ ہی ہوتا ہے جہاں عورت مضبوط ہونے لگے تم اسے بازاری ہونے کا طعنہ دے کر فارغ کر دیتے ہو جہاں عورت تم لوگوں سے دو قدم آگے نکل جائے تم اسے اپنی ذلت سمجھنے لگتے ہو۔ ویری فنی! طارق محمود مجھے اپنے آپ پر ترس آ رہا ہے حیرت ہو رہی ہے کہ میں نے اتنے سال تمہارے اشاروں پر ناچتے ہوئے کیسے گزار دیے۔

میں تمہارے ساتھ بزنس کرنا چاہتی تھی تب تمہیں مسئلہ تھا۔

میں کہیں نوکری کرنا چاہتی تھی تب تم نے کہا صرف گھر میں پڑے پڑے بوڑھی ہو جاؤ۔ یہ جس کلب میں تم بہت عزت سے آتے جاتے ہو اپنی بزنس کلاس کے ساتھ عیاشی کرتے ہو یہ سب میری وجہ سے ہے مسٹر طارق۔

تم بھول گئے ہو طارق محمود اس وقت، جب تمہیں میری ضرورت تھی، تمہیں میرا ساتھ اچھا لگتا تھا تمہیں کلب میں میری موجودگی سے سکون ملتا تھا اور آج تمہیں میرے ساتھ وہی جگہ کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔" وہ فطری رعونت تکبر سے کہتے ہوئے طارق محمود کو مضحکہ خیز انداز سے دیکھ رہی تھی۔

"اس لیے کہ میں لوگوں کی کاٹ دار نظریں نہیں برداشت کر سکتا میں نہیں برداشت کر سکتا کہ لوگ تمسخرانہ نظروں سے مجھے دیکھیں اور سرگوشی کریں کہ اس کی بیوی کا منیر کمال کے ساتھ معاشقہ چل رہا ہے میں نہیں برداشت کر سکتا کہ جہاں کل تک میرا سر سب سے اونچا ہوتا تھا لوگ مجھے تمہاری وجہ سے تفاخر اور رشک سے دیکھتے تھے وہی لوگ مجھ سے ہمدردی کریں اور کہیں کہ۔

مسٹر طارق! شمائلہ کو سمجھایئے اس کا منیر کمال سے بہت زیادہ دوستانہ کہیں آپ کی فیملی لائف کو ڈسٹرب نہ کر دے۔"

وہ جیسے رو دینے کو تھے تو آنکھیں بے بسی کے باعث ساکت تھیں اور لب مشینی انداز میں ہل رہے تھے۔

"اور تم لوگوں کی باتوں میں آ گئے تم نہیں جانتے جو لوگ یہ باتیں کرتے ہیں ان کے اپنے اندر کتنی غلاظت بھری ہوئی ہے۔

ان کی اپنی سوچ کتنی گھٹیا ہے تمہاری غیر موجودگی میں وہ کس کس طرح مجھے لبھانے کی کوشش کرتے رہے ہیں ان کی آنکھوں میں تمہارے لیے احترام اور میرے لیے کس طرح کی دعوت ہوتی ہے

کیا میں نہیں جانتی تم ان سب کی باتوں میں آ کر مجھ پر زندگی کی خوشیاں تنگ کرنے چلے ہو مجھے گھر میں قید کرنے پر تلے ہوئے ہو طارق۔

یہ کہاں کا انصاف ہے بتاؤ نا۔'' وہ جیسے عدالت کے کٹہرے میں کھڑی تھی طارق محمود کو احساس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اپنی بیوی سے مخاطب ہیں جو آج تک انہیں محبوب تھی۔

''جب تم جانتی ہو وہ دنیا اتنی گندی ہے ہمارے قابل نہیں ہے پھر بھی تم اس کے لیے اپنی جنت سے باغی ہو رہی ہو میں تمہیں انہی غلیظ نظروں سے بچانا چاہتا ہوں تم سمجھتی کیوں نہیں ہو شمائلہ وہ ہماری دنیا نہیں ہے۔

کلب، پارٹیز، ڈسکو پارٹیز یہ سب کچھ ہمارے لئے نہیں ہے۔

میں تنگ نظر نہیں ہوں مجھے اپنی عورت کی عصمت اس کی آبرو اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے اس کا پاکیزہ شفاف لیکن ڈھکا ہوا بدن میرا مان ہے تم میرا مان کیوں توڑ رہی ہو۔

تم وہ دیوار کیوں توڑ رہی ہو جو رشتوں کے تقدس کو پامال ہونے سے بچاتی ہے۔ وہ آج بھی اپنی محبوب بیوی پر میلی نظر برداشت نہیں کر سکتے تھے شمائلہ کو محبت کا یہ انداز شک و تنگ نظری لگتا تھا۔

میں ایسا کچھ نہیں کر رہی منیر کمال میرا ڈانس انسٹرکٹر ہے وہ ایک اچھا آدمی ہے اسے لٹریچر اور آرٹ کی سمجھ ہے۔

وہ میٹرلائزڈ نہیں ہے میں اگر اس سے بات کر کے خوش ہو جاتی ہوں تو تمہیں اپنی کنزرویٹو سوچ سے باہر نکلنا ہوگا میں رشتوں کا تقدس پامال نہیں کر رہی بلکہ تم اول دن سے مجھ پر شک کر رہے ہو اور تمہیں پتا ہے شک رشتوں کا حسن پامال کر دیتا ہے۔''

وہ ابھی تک اپنی بات پر قائم تھی جس کے لیے اس کے پاس مضبوط دلائل بھی تھے۔

''اونہہ شک..... میں شک کر رہا ہوں، ساری دنیا ایک بات کا اعلان کر رہی ہے اور میں شک کر

رہا ہوں ساری دنیا کہہ رہی ہے کہ تمہارا منیر کمال کے ساتھ افیئر ہے اور میں شک کر رہا ہوں۔'' وہ جیسے پھٹ پڑے تھے سارا ضبط اس کی ڈھٹائی اور بے بسی پر بہہ نکلا تھا۔

وہ اتنی سفاک اور اتنی بے رحم ہو سکتی ہے اتنی گری ہوئی بات کر سکتی ہے راجہ طارق محمود کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ اگر ان کی خالہ کی بیٹی نہ ہوتی تو ان لمحوں میں ضرور قتل ہو چکی ہوتی یا اس گھر کہ تہہ خانے میں قید ہو چکی ہوتی لیکن دکھ تو اس بات کا تھا وہ ان کی ماں جیسی خالہ کی اکلوتی اور بہت نازوں سے پلی ہوئی بیٹی تھی اور وہی ناز انہوں نے بھی اٹھائے تھے شادی کے اول دن سے..... جس کا خمیازہ اس انداز سے بھگتنا پڑ رہا تھا کہ انہیں اپنے آپ سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔

سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ان سے غلطی کہاں سرزد ہوئی تھی ان کی آنکھوں پر کب اور کیسے غفلت کی پٹی بندھ گئی تھی اور اتنا بڑا خسارہ ان کا مقدر بن گیا تھا۔

''شمائلہ طارق محمود! طلاق تو میں نہیں دوں گا چاہے تم اس گھر کی دیواروں سے سر پٹخ کر خود کو لہولہان کر لو تم جب اس گھر سے باہر میری اجازت کے بغیر نہیں نکل سکتیں۔ اگر تم نے ایسا کیا تو میں تمہیں گولی مار کر خودکشی کر لوں گا۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں۔''

وہ اپنے سخت مضبوط لہجے میں کہہ کر اپنے کمرے کی طرف مڑ گئے تھے۔

اور شمائلہ نے بھاگ کر ان کا گریبان پکڑ لیا تھا۔

اگلے ہی لمحے وہ ان کا سینہ، چہرہ اپنے لمبے ناخنوں سے زخمی کر چکی تھی اور طارق محمود کسی دیوار کی طرح اس کے سامنے کھڑے تھے۔

''تم مجھ پر ظلم نہیں کر سکتے تم مجھے قید میں نہیں ڈال سکتے، میں تم پر کیس کر دوں گی جس بے جا کا میں تمہیں کورٹ لے جاؤں گی۔

تم شوہر نہیں جلاد ہو ایک ظالم اور شکی شخص جس نے میری زندگی اجیرن کر دی ہے میں تمہیں کبھی

معاف نہیں کروں گی۔"

وہ چیختے ہوئے ان کا چہرہ اور سینہ پیٹے جا رہی تھی۔

"تم نفسیاتی مریضہ بن چکی ہو مجھے تم پر صرف ترس آ رہا ہے مجھے خالہ جان سے بات کرنے دو پھر جو دل چاہے کرتی پھرنا میری طرف سے اجازت ہے۔"

اس لمحے ان کا ضبط کمال کا تھا انہوں نے بہت نرمی سے اس کے دونوں ہاتھ پیچھے دھکیلے تب ہی عاشر کی سہمی ہوئی آواز ان کے کانوں میں پڑی تھی۔

"بابا....." وہ حیران ہو کر پلٹے، عاشر بھاری پردے کے پیچھے سے نکل کر بھاگتا ہوا ان کے پاس آ گیا اور اپنی ماں کو چھوڑ کر ان سے لپٹ گیا۔

"بابا آپ کو چوٹ لگی ہے۔" وہ ان کے چہرے پر ہاتھ پھیرتا ہوا تفکر سے پوچھ رہا تھا۔

"نہیں بابا کی جان چوٹ تو ماما کو لگی ہے دیکھیں نا ان کی ساری بینگلز ٹوٹ گئیں۔" انہوں نے عاشر کو گود میں لے کر پیار کیا اس کی خوفزدہ آنکھوں میں نرمی سے دیکھا اپنے وجود کی حرارت اس کے اندر منتقل کرتے ہوئے ایک سرد سی نگاہ شمائلہ پر ڈالی جو تھک ہار کر صوفے پر یوں نڈھال پڑی تھی جیسے سب سے زیادہ ظلم تو اسی کے ساتھ ہوا۔

اس لمحے اسے عاشر عباس کی تکلیف اور اس کی خوفزدہ صورت سے کوئی سروکار نہیں تھا عاشر اس کی مرضی کے خلاف دنیا میں آیا تھا اس لیے وہ اسے اپنی آزادی میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھا کرتی تھی۔

اور آج وہی عاشر اسے اپنی زندگی کی سب سے بڑی ضرورت محسوس ہونے لگا تھا۔ وقت کیسے کیسے تماشے اپنے دامن میں سمیٹ کر لاتا ہے۔

عاشر نے دھندلائی آنکھوں سے سامنے کا منظر دیکھنے کی کوشش کی شاید کسی نے دروازے پر دستک دی تھی۔

اس نے جلدی سے اپنی آنکھیں صاف کیں اور ماضی کی وہ خوفناک رات ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتے ہوئے دروازے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ دروازہ لاکڈ تھا پھر دستک ہوئی تھی اسے اٹھ کر کھولنا پڑا۔ سامنے کشمالہ کھڑی تھی۔

☆.....☆.....☆

آج پھر سرمد بخاری نے سعدیہ کے لیے گاڑی بھجوادی تھی۔

صبح ہی اس کا فون آ گیا تھا۔

''ہائے سویٹی! ہاؤ آر یو..... رات کو مجھے یاد کیا تھا یا نہیں۔'' وہ بہت بشاش لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

سعدیہ نا چاہتے ہوئے بھی اس سے بات کرنے پر مجبور ہو گئی۔

رات کو اسے نہ یاد کرتی تو کیا کرتی کسی پل بھی تو اسے وہ بھیانک رات سکون نہیں لینے دیتی تھی جو اس کی عصمت کو پامال کر گئی تھی۔

اور اس پامالی کا صدمہ اس وقت سوا ہو جاتا تھا جب وہ منحوس ایس ایم ایس اس کے موبائل کی اسکرین پر آن وارد ہوتا جس میں کسی ویڈیو ٹیپ کا تذکرہ تھا۔

وہ کبھی موبائل سوئچ آف کرتی کبھی اپنی وحشت سے تنگ آ کر اسے آن کرتی کبھی اسے اپنی الماری کے دراز میں لاک کر دیتی۔ عجیب عجیب حرکتیں کر رہی تھی وہ ان دنوں۔

ایک پل کی نادانی نے عجیب سے دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا ایسے میں سرمد بخاری کا اپنائیت بھرا لہجہ اپنا کام کر رہا تھا۔

''مجھے پتا ہے تم نے یاد تو کیا ہے مگر اقرار نہیں کرو گی، شرمیلی لڑکی ہو میں سوچتا ہوں تم دلہن بن کر کتنی حسین لگو گی میری دولہن۔''

وہ گھاگ آدمی تھا جانتا تھا کن پتوں کے ساتھ کب کھیلنے میں لطف آتا ہے۔

سعدیہ کی تو آواز ہی گلے میں دب گئی تھی اس سے تو بولا ہی نہیں گیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

سرمد بخاری اسے دلہن بنانے پر آمادہ تھا یہ کوئی معمولی بات تھی پہلے اسے پسند کیا اس کے ہونے کا احساس دلایا اور اب وہ کہہ رہا تھا کہ سعدیہ دلہن بن کر کتنی خوبصورت لگے گی۔ اس کی گھگھی نہ بندھتی تو کیا ہوتا۔

''ارے بابا اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے یہ جو میں تمہارے لیے اتنا پاگل ہو رہا ہوں اس کی کوئی تو وجہ ہوگی نا، چلو اب پریشان نہیں ہوتے شام کو ملتے ہیں تو بہت ساری باتیں کریں گے۔''

وہ خود ہی سب کچھ بول رہا تھا اور شاید خود ہی سن بھی رہا تھا سعدیہ کو پھر اس نے وقت اور مقام بتا کر فون بند کر دیا تھا اس کے فون بند کرتے ہی موبائل اسکرین پر چھوٹا سا لفافہ جگمگانے لگا تھا۔

یہ وہی منحوس نمبر تھا جو اسے سونے نہیں دیتا تھا اور نہ ہی سرمد بخاری کی باتوں پر خوش ہونے دیتا تھا۔

وہ اپنی بے قراری کم کرنے کے لیے چھت پر چلی آئی تھی اب اسے چھت پر آنا اور صوفیہ کے ساتھ باتیں کرنے میں بھی مزا آنے لگا تھا۔

صوفیہ بھی اپنی بوریت دور کرنے کے لیے اس کی منتظر سی ہوتی تھی۔

لیکن اس وقت صوفیہ اپنے کمرے میں نہیں تھی اسے مایوسی ہوئی وہ واپس پلٹنا چاہتی تھی کے بستر پر رکھے صوفیہ کے موبائل نے اس کے قدم جکڑ لیے۔

صوفیہ اسے بتا چکی تھی کہ یہ موبائل ہی نہیں پورا کمپیوٹر ہے اس کے ذریعے صوفیہ سب سے رابطے میں رہتی تھی۔

صوفیہ نے اسے یہ بھی بتایا تھا کہ یہ موبائل اسے کسی نے تحفے میں دیا تھا تو کیا صوفیہ کو بھی کوئی قیمتی موبائل دے سکتا ہے اس نے وہیں کھڑے کھڑے موبائل کے کچھ بٹن پریس کیے۔

بھلا اتنے سارے آپشنز میں سے وہ کیسے یہ جان سکتی تھی کہ موبائل گفٹ کرنے والے کی تصویر

بھی کسی البم میں محفوظ ہے۔

اس کا تجسس بٹن پریس کرنے پر مجبور کر رہا تھا تب ہی دروازے پر کھٹکا ہوا اور صوفیہ اندر آ گئی تھی اس کے ہاتھ میں حسبِ معمول پزا کے دو ڈبے تھے ساتھ میں ایک پیکٹ میں کولڈ ڈرنک بھی۔

''ارے تم یہاں میں تمہیں نیچے ڈھونڈ کر آ رہی ہوں آ جاؤ لنچ کرتے ہیں میں نے آج تمہارے لیے بھی پزا آرڈر کیا تھا چلو جلدی سے شروع ہو جاؤ بہت بھوک لگی ہے۔''

صوفیہ نے پزا کا ڈبہ کھولتے ہوئے ایک اس کے سامنے رکھا اور اس کے ہاتھ سے موبائل لیتے ہوئے نرمی سے پوچھا۔

''کیا کسی کا فون آیا تھا؟''

''نہیں فون تو نہیں آیا تھا مجھے اچھا لگ رہا تھا اس لیے دیکھنے بیٹھ گئی۔''

صوفیہ کو اس کی سادگی اچھی لگی تھی مسکراتے ہوئے موبائل کو دیکھا اور اس سے بولی۔

''اگر شجاع نے مجھے گفٹ نہ کیا ہوتا تو یہ موبائل میں ضرور تمہیں دے دیتی ہم عجیب و غریب کزنز ہیں آج تک ایک دوسرے کو کچھ گفٹ نہیں کیا چلو آج چلتے ہیں بازار آج تم میری طرف سے شاپنگ کرنا جو دل چاہے۔''

صوفیہ نے پزا کا بائٹ لیتے ہوئے دوستانہ انداز میں کہا۔

سعدیہ نے بغور اسے دیکھا اس کے چہرے پر کوئی تکبر نہیں تھا بس دوستانہ سی مسکراہٹ تھی یلو اور گرین کنٹراسٹ کے سوٹ میں اس کا چہرہ اتنا روشن محسوس ہو رہا تھا کہ سعدیہ اپنی فطرت کے برخلاف اسے بغور دیکھنے لگی۔

''کیا ہوا ہم دونوں شاپنگ نہیں کر سکتے۔'' وہ اس کی محویت پر حیران تھی۔

''یہ شجاع کون ہے جس نے تمہیں موبائل گفٹ کیا ہے۔'' سعدیہ نے اچانک پوچھ کر صوفیہ کو

حیران کر دیا تھا گویا وہ اس وقت سے یہ سوچ رہی تھی۔

''میرا سب سے اچھا دوست میرا کزن جو مجھے سب سے زیادہ سمجھتا ہے۔'' صوفیہ کو سوچنے کی ضرورت نہیں تھی کہ شجاع کون ہے البتہ اس کے ذکر پر صوفیہ کا چہرہ جن ستاروں سے بھر گیا تھا وہ سعدیہ کی آنکھوں سے اوجھل نہیں رہ سکے تھے وہ بے ساختہ مسکرا دی اپنی بات مکمل کر کے، سعدیہ کا تجسس مزید بڑھ گیا تھا۔

''کیا وہ بہت خوبصورت ہے۔''

''مرد خوبصورت نہیں ہوتے بلکہ ان کا خوبصورت ہونا ضروری بھی نہیں ہوتا، وہ اسمارٹ ہوتے ہیں ڈیشنگ ہوتے ہیں اور سب سے بڑی بات اگر وہ بہادر ہوں تو عورت اپنا دل ہار دیتی ہے ویسے یہ میری رائے ہے ضروری نہیں کہ ہر کوئی اس سے اتفاق کرے۔''

صوفیہ نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا تو سعدیہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔'' وہ پزا کھاتے ہوئے سنجیدگی سے بولی تب صوفیہ نے بغور اس کا چہرہ دیکھا جہاں کچھ دن پہلے والا اضمحلال نہیں تھا البتہ آنکھوں کے حلقے گہرے ہو رہے تھے۔

''کیا بات ہے تم کچھ پریشان ہو، کسی الجھن میں ہو دیکھو دکھ سکھ کہنے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔'' صوفیہ نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا مگر وہاں ہنوز ایک ہی کیفیت تھی سوچ میں ڈوبی ہوئی پرملال آنکھیں اور چہرے پر نے نام سی تھکن۔

''میں تمہیں سب کچھ ضرور بتاؤں گی مگر آج نہیں، ابھی تو میں خود اس معمے کو حل کر رہی ہوں کہ دلدل میں پھنس گئی ہوں یا دلدل سے نکل آئی ہوں۔''

اس نے بڑی گہری بات کی تھی صوفیہ کو اس سے اتنی دانشمندی کی امید نہیں تھی مگر کبھی کبھی ہم جو دیکھ رہے ہوتے ہیں حقیقت اس کے برعکس ہی ہوتی ہے۔

''صوفیہ کو اب احساس ہو رہا تھا کہ اس نے شاید سعدیہ کے بارے میں رائے دیتے ہوئے جلد بازی سے کام لیا ہے۔''

وہ دونوں پزا ختم کر چکی تھیں صوفیہ کا موبائل خوبصورت سی دھن بجا رہا تھا اس کے لبوں پر مدہم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''بے چین.....'' اس نے موبائل کان سے لگاتے ہوئے کہا سعدیہ بغور اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی جہاں پھر سے ستاروں کی برسات اتر آئی تھی۔

''صوفیہ میں شام کو تمہیں پک کر لوں گا تیار رہنا مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔'' شجاع نے چھوٹتے ہی اس سے کہا تھا۔

''لیکن شجاع میں تو سعدیہ کے ساتھ شاپنگ کا پروگرام بنا رہی ہوں میں آج تو فارغ نہیں ہوں۔''

اس نے سعدیہ کو دیکھتے ہوئے کہا سعدیہ اپنے نام پر نفی میں سر ہلانے لگی صوفیہ نے بھی اشارے سے پوچھا تھا۔

''کیوں.....؟''

''گڈ! اب تمہارے لیے سعدیہ مجھ سے زیادہ اہم ہو گئی ہے ٹھیک ہے تم اس کے ساتھ جا کر شاپنگ کرو مجھ سے بات مت کرنا۔''

اس نے کھٹاک سے فون بند کر دیا تھا صوفیہ نے خائف سی نگاہ اپنے سیل فون پر ڈالی۔

''اس کے ساتھ یہ ہی مسئلہ ہے ذرا سی خلاف مزاج بات برداشت نہیں ہوتی صاحب کو۔'' وہ مسکرا دی تھی جانتی تھی ابھی تھوڑی دیر بعد دھمکی بھرا فون آ رہا ہوگا۔

''تم ابھی اسے فون کرو اور بتاؤ کہ ہم شام کو شاپنگ کے لیے نہیں جا رہے اصل میں آج میں

تمہارے ساتھ نہیں جا سکوں گی مجھے ضروری کام سے جانا ہے تم میری وجہ سے اپنے دوست کو ناراض مت کرو۔"

سعدیہ نے موبائل اٹھا کر اس کے ہاتھ میں تھمایا تھا اور خود کھڑی ہو گئی تھی۔

"ہم شاپنگ کے لیے کل چلیں گے آج شام کو شاید عالیہ باجی بھی آئیں اس لیے مشکل ہو گا۔"

صوفیہ نے اس کی بات پر سر ہلاتے ہوئے میسج باکس کھول لیا تھا۔

سعدیہ اس کی توجہ سیل فون کی طرف مبذول دیکھ کر باہر آ گئی تھی۔

سرمد بخاری کی گاڑی ایک گھنٹے بعد آ جاتی اور اسے اپنی تیاری کے لیے کم از کم ایک گھنٹہ درکار تھا۔

سرمد بخاری کے شاطر دماغ کا جادو چل گیا تھا اس کے نادان دل نے خواب بننے شروع کر دیے تھے۔

☆.....☆.....☆

راحت جبیں کا بہت خوبصورت نیا ناول

زندگی ہم تجھے گزاریں گے

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

ندا حسنین کا بہت خوبصورت نیا ناول

قربت ہجر میں محبت

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

''منیر پلیز میں اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتی میں نے تمہیں بتا دیا تھا اب مجھے آرام کرنے دو تمہارا کاروبار smooth ہو گیا ہے میں نے سرمد بخاری جیسا بزنس پارٹنر بھی تمہیں دے دیا ہے اب پلیز مجھ سے مزید ڈیمانڈ مت کرو میں تھک گئی ہوں۔''

وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی سگریٹ کے کش لیتے ہوئے بال سنوار رہی تھی تب منیر کمال نے پیچھے سے آ کر اسے بازوؤں کے گھیرے میں لیا تھا۔

آج بہت دنوں کے بعد دونوں کا اپنے بیڈ روم میں آمنا سامنا ہوا تھا ورنہ تو مشترکہ بیڈ روم کا تصور تقریباً ختم ہی ہو چکا تھا۔ اسے منیر کمال سے کچے گوشت کی بو آتی تھی اور منیر کمال کو اس کے سرد وجود سے الفت کا اقرار کبھی بھی نہیں تھا۔

اس نے ایک بھرپور گرمجوش عورت کو اس وقت اپنی زندگی میں شامل کیا جب دونوں طرف جذبات کا دریا روانی سے بہہ رہا تھا۔ آج نہ وہ جذبات رہے تھے نہ ان کے جھانسے میں آنے والی نادان شمائلہ کا وجود باقی رہا تھا لیکن منیر کمال کا مقصد اب بھی پورا ہو سکتا تھا لوگ آج بھی شمائلہ کمال کو ایک نگاہ دیکھنے کو بے چین رہتے تھے اس کے نام پر پورا پورا شو بک جاتا تھا اور اس کے شائقین کوئی عام لوگ نہیں ہوتے تھے بلکہ وہ امرا کا شوق تھی رؤسا ہوں یا سیاسی مہرے محض ایک شام اس کے نام کرنے کے لیے لاکھوں لٹا دیتے تھے منیر کمال کو اس سے زیادہ کچھ چاہیے بھی نہیں تھا۔

وہ اس وقت بھی اس کو نئی دہلی میں ہونے والے کلچرل فیسٹیول کے لیے راضی کر رہا تھا جس کے لیے شمائلہ کو خاص طور پر مدعو کیا گیا تھا۔

''پلیز شمی! تم یہ شو مس مت کرو۔ تمہیں پتا ہے اس کا ہمیں بہت فائدہ ہوگا۔'' وہ ہمیشہ اپنی گفتگو کا آغاز اتنی ہی لجاجت سے کرتا تھا یہ الگ بات کہ اختتام تک وہ دھاڑنے لگتا تھا۔

''منیر! تمہیں اور کتنی دولت کی ہوس ہے تمہارا کاروبار دن دگنی ترقی کر رہا ہے کیونکہ لوگوں کی

مجبوریوں کی فہرست طویل ہوگئی ہے انسان اپنی بھوک کے ہاتھوں مجبور ہے اسی لیے تم جیسے دلالوں کا نشانہ بن جاتا ہے تم کیوں اپنے کاروبار کی فکر کرتے ہو۔"

شمائلہ اسے اکثر آئینہ دکھاتی رہتی تھی اور وہ مکروہ سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کے سارے زہریلے جملے اپنے اندر اتارتے ہوئے کسی اور وقت میں حساب بے باک کرنے کا ارادہ کر کے خاموش ہو جاتا تھا شاید ایک چھت کے نیچے رہنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ دونوں ایک دوسرے کی کڑوی کسیلی برداشت کرتے رہتے تھے۔

اور یہ سمجھوتہ شمائلہ کو راجہ طارق محمود کے ساتھ گوارا نہ تھا وہاں وہ دوبدو مقابلہ کرتی تھی جواباً طارق محمود کو گہری چپ کا لبادہ اوڑھنا پڑتا تھا۔

یہاں گہری چپ شمائلہ کو اختیار کرنا پڑتی تھی کیونکہ اس کا دل ہی نہیں چاہتا تھا وہ منیر کمال سے بحث کرے اس وقت بھی وہ اسے مکمل نظر انداز کرنے کے موڈ میں تھی مگر منیر کمال بھی اپنے نام کا ایک تھا۔

"تمہیں سرمد پر بہت بھروسہ ہے نا یاد رکھنا ایک دن وہ شخص ہم دونوں کو لائن میں لگا دے گا جب تک وہ دبئی میں تھا ٹھیک تھا لیکن یہاں آ کر اس کا دماغ کسی اور ہی ڈگر پر چلنے لگا ہے آج کل وہ نئے بندے ڈھونڈ رہا ہے۔"

منیر کمال اس کے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا تھا۔

"یہ تم جانو اور سرمد بخاری فی الحال میں کوئی کام کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں میں کچھ دنوں کے لیے اس سارے ماحول سے نکلنا چاہتی ہوں میں نے سوچا تھا میں عاشر کے پاس جاؤں گی میرپور لیکن اب میں نے دبئی جانے کا پروگرام بنا لیا ہے پلیز تم مجھے روکنا مت۔"

وہ برش ٹیبل پر پٹخ کر قطعیت سے کہتے ہوئے کھڑی ہوگئی عاشر کے نام پر منیر کمال کے چہرے پر حیرت کے کئی رنگ اترے تھے۔

''تم..... عاشر کے پاس یومین طارق محمود کے بیٹے کے پاس جانے کی بات کر رہی ہو آر یو ان سینس۔'' منیر کمال نے تمسخر اڑایا تھا۔

''وہ میرا بھی بیٹا ہے تم جانتے ہو یہ بات میں نے اسے تمہاری خاطر چھوڑ دیا تھا اس کا مطلب یہ نہیں میں اسے بھول گئی ہوں یا میرا اس سے ساتھ رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔'' وہ گویا خود کو تسلی دے رہی تھی منیر کمال بے ساختہ ہنس پڑا۔

''شمائلہ تم اتنی احمق تو ہو نہیں جتنی بچکانہ باتیں تم آج کر رہی ہو تمہارا کیا خیال ہے عاشر تمہارے گلے سے لگے گا تمہارے آنسو پونچھے گا تمہیں پیار کرے گا بھول ہے تمہاری تم جیسی مائیں جانے کیوں زندگی کی کسوٹی پر کھری اترنے کے بجائے اکثر ہار جاتی ہیں۔''

''اوہ شٹ سپ منیر تم اب مجھے لفظوں کے فریب میں نہیں الجھا سکتے گزر گیا وہ وقت جب شمائلہ تمہاری کہی ان کہی پر ایمان لے آتی تھی۔''

''عاشر کو مجھے کس طرح منانا ہے اسے واپس اپنا بنانا ہے یہ میرا ہیڈک ہے تم ان چکروں میں نہ پڑو تو بہتر ہے۔''

اس کے انداز میں آج بھی نخوت تھی منیر کمال کو اس پر ترس آ رہا تھا۔

''یہ عورت پاگل ہو گئی ہے۔'' وہ سوچ رہا تھا اور گہری نظروں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

کافی وقت گزر گیا تھا مگر اس کے کروفر میں کوئی کمی نہیں آئی تھی اور اب ایک نئی کہانی کا پلاٹ وہ بُن رہی تھی جس میں وہ ایک بار پھر دماغ سے زیادہ دل کی تابع تھی۔

''مجھے تم سے ہمدردی ہے اینی وے کب کر رہی ہو عاشر کے ساتھ پہلی ملاقات۔'' منیر کمال نے اس کے بالوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے پوچھا تھا وہ اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے سگریٹ کے پیکٹ کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

''کام کی بات کرلیں۔'' شمائلہ کو اسکے ناز و انداز ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے اب۔

''تم نے خود ہی تو منع کر دیا کام کی بات نہیں کرنا۔'' وہ اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آ گیا تھا جہاں دونوں کا عکس ایک دوسرے سے مدمقابل تھا۔

''بہت سعادت مند ہو تم تو.....'' وہ سلگ کر بولی تھی۔

''ہاں تو اور کیا تمہیں دکھی کر کے میں تھوڑی خوش رہ سکتا ہوں۔

تم جو ہو ساری تھکن سمیٹنے کے لیے..... چلو آج آؤٹنگ کے لیے چلتے ہیں بہت دن ہو گئے ہم لوگوں نے اکیلے ڈنر نہیں کیا۔'' وہ اسے گہری نگاہوں سے تک رہا تھا۔ شمائلہ کا سیل فون بج رہا تھا وہ اس کی نظروں سے خائف سی ہو کر موبائل کی طرف متوجہ ہو گئی۔

دوسری طرف سرمد بخاری تھا۔

''شمائلہ میری گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے ان فیکٹ میری گاڑی سے ہوا ہے۔ وہ صاحب تو شاید دنیا سے رخصت ہو گئے البتہ میرے ساتھ جو محترمہ تھیں وہ ہاسپٹل میں ہیں مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہو گی پلیز کم۔''

وہ عجلت میں تھا۔

''تم تو ٹھیک ہو نا کس ہاسپٹل میں ہو۔'' شمائلہ کے چہرے پر تفکر سا پھیل گیا تھا۔

''ہاں میں ٹھیک ہوں میری سائیڈ بالکل سیف تھی تم آ رہی ہو نا۔'' بہت زیادہ شور سا تھا اس کے اردگرد شمائلہ نے بڑی مشکل سے اس ہسپتال کا نام نوٹ کیا اور فون بند کر کے منیر کمال کی طرف مُڑ گئی۔

''سرمد کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے تم چل رہے ہو میرے ساتھ۔''

''ہم چل کر کیا کریں گے۔'' اس نے بے نیازی سے پوچھا شمائلہ نے متاسف نگاہ اس پر ڈالی۔

''وہ اس شہر میں ہمارا مہمان ہے تم بھول رہے ہو یہ بات اگر اس کی گاڑی سے کسی کا ایکسیڈنٹ

ہو گیا ہو تو سوچو مصیبت ہم پر بھی آئے گی۔"

شمائلہ نے جلدی سے اپنے بال سنوارے تھے اور مفلر نما دوپٹہ کندھے پر ڈال کر ہیڈ بیگ اٹھا لیا تھا۔

☆.....☆.....☆

"کیا میں تھوڑی دیر کے لیے کمرے میں بیٹھ سکتی ہوں۔"

اس نے اتنے سہل انداز میں اندر آتے ہوئے پوچھا تھا کہ عاشر ایک لمحے کے لیے چپ سا ہو گیا تھا۔

"آپ کو مجھ سے کوئی کام ہے۔" وہ مکمل اندر آ چکی تھی اور کمرے کا دروازہ خود بخود بند بھی ہو چکا تھا۔

"کیا آپ میرا کام کریں گے۔" وہ بے تکلفانہ انداز میں بیڈ کے کنارے پر ٹکتے ہوئے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی عاشر کو اس کا اندر آنا پھر بیڈ پر یوں سکون سے بیٹھنا اور پھر اتنے اطمینان سے بات کرنا سب ہی کچھ کھل رہا تھا مگر وہ تھوڑی دیر پہلے جس فریم آف مائنڈ میں تھا وہاں سے باہر آنے کے بعد سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کس طرح ری ایکٹ کرے۔

وہ تھوڑی دیر پہلے تخیل کے پردے پر عورت کا بڑا معتبر روپ دیکھ رہا تھا وہ عورت جو بیوی بھی تھی اور ماں بھی مگر اسے احساس نہیں تھا کہ اس معتبر روپ کا تقاضا کیا ہے۔

عورت کا معتبر روپ.....وہ کافی دیر سے یہ ہی سوچ رہا تھا۔

اور اب کشمالہ اس کے سامنے بیٹھی تھی چھوٹی سی کرتی ہر گھریلو سے حلیے میں دوپٹہ شانے پر پھیلائے ٹخنے سے اونچے ٹراؤزر کے نیچے ڈھیر ساری پٹیوں والی سینڈل میں۔

عاشر نے نا چاہتے ہوئے بھی اس کا جائزہ لے لیا تھا۔

وہ اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک ہے اب۔"

اس نے گویا تمہید باندھی تھی۔

''میری طبیعت کی آپ فکر نہ کریں میں ٹھیک ہوں۔''

وہ کھڑکی کے پردے سمیٹ کر کھڑا ہو گیا تھا اور ڈوبتے سورج کی بنفشی، نارنجی روشنی گلاس ونڈو کے پرے اپنے رنگ بکھیر رہی تھی۔

کشمالہ بھی اس کے پاس آ گئی۔

''عاشر مجھے آپ کی فل اٹین شن کے ساتھ آپ کا تھوڑا سا وقت چاہیے میں جانتی ہوں میرے پاس ایسا کوئی حق نہیں کہ میں زبردستی کروں لیکن میں ریکویسٹ تو کر سکتی ہوں ایک مہذب انسان سوچے سمجھے بغیر ریکویسٹ کو ریجیکٹ نہیں کر سکتا۔''

آخر میں اس کا لہجہ خود بخود دھیما ہو گیا تھا جیسے وہ مہذب انسان پر دل میں مسکرا رہی ہو عاشر نے مجبوراً پلٹ کر دیکھا اور چند قدم چلتے ہوئے اپنے بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گیا۔

کشمالہ اس کی تقلید میں منتظر تھی کہ وہ اسے بیٹھنے کے لئے کہے گا۔

عاشر نے اپنے بیڈ کے سامنے رکھی ہوئی اسٹڈی ٹیبل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے استفہامیہ انداز اختیار کیا تھا۔

توبہ ہے کس قدر خودسر اور بے حس آدمی ہے۔ وہ دل ہی دل میں کڑھ کر رہ گئی تھی مگر اس دل نے مجبوری کی زنجیر بھی توڑ ڈالی ہوئی تھی اس سے بات بھی کرنی ہے اس کی توجہ بھی حاصل کرنی ہے اس کا حصار بھی توڑنا ہے اور اس کے دل کی مسند پر پورے وقار کے ساتھ براجمان بھی ہونا ہے۔

اب یہ ساری خواہشیں بغیر مشقت کے پوری تو ہو نہیں سکتی تھیں لیکن مشقت کی نوعیت مختلف تھی۔

وہ عاشر کی غلط فہمیاں دور کرنے آئی تھی وہ اسے خولہ کمال اور کشمالہ کمال کی وہ حقیقت بتانے آئی تھی جو آج تک اس نے کسی کو نہیں بتائی تھی۔

''عاشر آپ کو پاپا سے بہت سی شکایتیں ہیں میں جانتی ہوں۔ پاپا نے وہ سارا وقت ہمارے

ساتھ گزارا جو آپ کا حق تھا جو صرف وصرف آپ کا تھا۔ لیکن اس میں پاپا کا کیا قصور تھا وہ تو خود فرار کی کیفیت میں تھے بھاگ رہے تھے اور بھاگتے بھاگتے انہیں ہم مل گئے کیونکہ ہمارا بھی کوئی ٹھکانہ نہیں تھا ہم دونوں ہماری ماں شاخ سے ٹوٹے پتوں کی طرح تھے ہوا ہمیں اپنی مرضی سے اڑائے جا رہی تھی۔

تب پاپا نے اس منہ زور ہوا کے آگے دیوار بن کر ہمیں سمیٹا ہمیں تو خود بھی نہیں پتا چلا کب وہ ہماری زندگی کا لازمی حصہ بنتے چلے گئے کہ آج ان کے بغیر سانس لینا دشوار لگتا ہے۔"

وہ اپنے مخصوص لہجے میں بلا تکان بولتی چلی گئی تھی عاشر نے بے ساختہ اسے ٹوکا تھا۔

"آپ یہ ساری باتیں مجھ سے کیوں کر رہی ہیں میں آپ کی پائیوگرافی میں بالکل بھی انٹرسٹڈ نہیں ہوں آپ کو نہیں لگتا جو باتیں آپ مجھ سے کر رہی ہیں ان کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں آپ صرف اپنا وقت ضائع کر رہی ہیں۔"

وہ ذرا سا بھی اپنے لہجے میں مروت نہیں لا پایا تھا کشمالہ چند لمحوں کے لیے ساکت ہو گئی تھی۔

اس دل کو بھی نادانی کے لیے یہ ہی شخص ملا تھا وہ اپنی ذات میں مضبوط اور بے خوف نہ ہوتی تو اس وقت دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیتی۔

"عاشر وقت آپ ضائع کر رہے ہیں اپنے پاپا کا اپنا اور نانو کا..... جو خوشیاں ان لمحوں میں آپ کا مقدر بن سکتی ہیں انہیں آپ محض اپنی ایگو کو بچانے کے لیے نظر انداز کر رہے ہیں۔ یہ تو زندگی گزارنے کا طریقہ نہیں ہوتا۔" وہ یکدم تلخ ہو گئی تھی۔

"گویا اب آپ مجھے سکھائیں گی زندگی کیسے گزاری جائے۔"

وہ بھی اس کی طرح تلخ ہو گیا تھا۔

"جی بالکل ایک چیز غلط ہوتے دیکھ رہی ہوں اس پر خاموش رہنا میری فطرت کے خلاف ہے آپ کو صرف پاپا سے شکایتیں ہیں آپ نے کبھی ان کے پاس بیٹھ کر اپنی شکایتیں ان سے کہیں کبھی ان

سے اپنا آپ شیئر کیا۔"

اسے اپنا لب ولہجہ بدلنا پڑا تھا مقابل عاشر جیسا ضدی شخص تھا جو اسے ہاتھوں سے پکڑ کر کمرے سے باہر نکال سکتا تھا۔

"یہ سب کرنے کے لیے آپ کافی نہیں میری تو انہیں کبھی بھی ضرورت نہیں تھی۔" بمشکل اس نے اپنی ذات کے حوالے سے کوئی بات کی تھی کشمالہ کو اپنی کامیابی کی امید ہو چلی تھی وہ اس پتھر پر مسلسل پانی کی بوند ٹپکانا چاہتی تھی۔

"یہ آپ کی سوچ ہے کہ انہیں آپ کی ضرورت نہیں تھی آپ اپنے بارے میں اتنا نہیں جانتے ہوں گے جتنا کہ میں جانتی ہوں آپ کے بارے میں، یہ سب مجھ پر الہام نہیں ہوا بچپن سے آپ کی باتیں آپ کی عادتیں آپ کی شرارتیں سن رہی ہوں پاپا کے منہ سے۔

جب انہیں آپ کی یاد تنگ کرتی تھی تو آپ کی تصویروں کا البم کھول کر بیٹھ جاتے تھے مجھے وہ تصویریں ازبر ہیں عاشر عباس صاحب!

آپ کے پالتو کتے کا نام شیری تھا آپ کی فیورٹ ٹوائے کار کا کلر بلو اور ریڈ تھا آپ کو بلیاں اچھی نہیں لگتی تھیں۔ یہ سب باتیں میں جانتی ہوں اس لیے کہ پاپا ایک پل کے لیے بھی آپ سے غافل نہیں ہوتے تھے۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔

وہ خلافِ معمول تیز اور سخت لہجے میں بول رہی تھی عاشر لمحے بھر کے لیے حیران ہوا تھا لیکن اپنے جذبات پر کنٹرول کے معاملے میں وہ راجہ طارق محمود سے بھی دو ہاتھ آگے تھا اس لیے جلد ہی سنبھل گیا۔

"اور کیا کیا جانتی ہیں آپ میرے بارے میں....." وہ یکدم کشمالہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھ بیٹھا تھا۔

کشمالہ کو اس کا یہ انداز اجنبی تو لگا تھا مگر دل کی دنیا زیر وزبر ہو گئی تھی۔

''آپ کیا جاننا چاہتے ہیں یہ ہی کہ آپ جس خود ساختہ خول میں قید ہیں جو سزا اپنے بابا کو دے رہے ہیں اس کا آپ کے پاس کوئی جواز نہیں ہے۔''

''آپ انہیں غلط سمجھتے ہیں اور میری نظر میں غلط آپ دونوں کے ساتھ ہوا آپ دونوں کے ساتھ ظلم تو شمائلہ صاحبہ نے کیا ہے اور آپ.....''

''ول یو شٹ اپ پلیز.....'' وہ یکدم اس کی بات کاٹتے ہوئے چیخ پڑا تھا۔

''ریلیکس.....ریلیکس میرا مقصد آپ کو ہرٹ کرنا بالکل نہیں تھا لیکن حقیقت تو یہ ہی ہے۔'' وہ اپنی بات پر شرمندہ سی بے ساختہ اس کی کلائی تھام کر تسلی دینے پر مجبور ہو گئی تھی عاشر نے ایک برہم نظر اس پر ڈالی اور دوسری اپنے ہاتھ پر جو اگلے لمحے نرم و ملائم ہاتھ کے لمس سے محروم ہو گیا تھا۔

''آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا کسی کے پرسنل معاملات کو ڈسکس کرنے کا اسے ہرٹ کرنے کا۔''

اس کی موٹی موٹی آنکھوں کے سرخ ڈورے نمایاں ہو گئے تھے کشمالہ کا دل چاہا وہ پانی سے بھرے ہوئے ان کٹوروں کو ہتھیلیوں میں چھپا لے مگر ایک جذباتیت کے بعد دوسری حماقت کی گنجائش نہیں تھی سو صبر کے ساتھ اسے یوں دیکھنے لگی جیسے کوئی ضدی بچہ روٹھنے کے بعد منانے کا انتظار کر رہا ہو۔

''کیا آپ اپنی ڈکشنری سے لفظ کسی مٹا نہیں سکتے۔'' اس نے بہت ضبط کے ساتھ بڑی نرمی سے پوچھا تھا۔

''پھر کیا ہوگا۔'' وہ تڑخ کر بولا تھا۔

''پھر پاپا ہوں گے میں.....'' وہ روانی میں بات مکمل کرتے کرتے رک گئی تھی۔

''پھر آپ کی زندگی بہت سہل ہو جائے گی۔ آپ پاپا کے پاس آ کر تو دیکھیں وہ بہت اکیلے ہیں انہیں آپ کی ضرورت ہے۔

ہم دونوں تو آپ کی جگہ کبھی نہیں لے سکتے اور ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ ہماری وجہ سے پاپا آپ

سے دور رہیں آپ پلیز ہماری وجہ سے انہیں ہرٹ نہ کریں۔" وہ جیسے رو دینے کو تھی۔

عاشر عباس کی پلکوں میں جنبش سی ہوئی تھی وہ ایک بار پھر سامنے بیٹھی عورت کے معتبر روپ میں الجھ کر رہ گیا تھا کیا سچ ہے کیا جھوٹ کون حقیقت ہے کون فریب..... اس کا فیصلہ وقت کرتا ہے انسان کی اپنی پرکھ حتمی کیوں نہیں ہوتی۔ وہ سوچ رہا تھا۔

کشمالہ بے چین نظروں سے اس کے ردعمل کی منتظر تھی۔

"ایک سوال ہے آپ سے....." وہ پورے اعتماد کے ساتھ اب اس سے مخاطب تھا جذبات کا شائبہ تک نہ تھا اس کے چہرے پر۔

"اگر ماں باپ اپنے فیصلوں کی تھکن اولاد کی گود میں ڈال دیں۔

اگر کوئی عاشر عباس ماں باپ کے ہوتے ہوئے بھی ان کے پیار اور لاڈ کو ترسے اور اگر ماں باپ اپنے عاشر عباس کی خاطر کوئی بھی سمجھوتہ نہ کریں۔

اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کے لیے اسے اپنے فطری حق سے محروم کر دیں تو ایسے میں کیا کرنا چاہیے عاشر عباس کو۔

فرض کریں آپ میری جگہ ہوتیں تو کیا اپنے ماں باپ کو اتنی آسانی سے معاف کر دیتیں۔"

اس کا مضبوط لہجہ کشمالہ کا اعتماد متزلزل کر گیا تھا۔ وہ یکدم نفی میں سر ہلا کر رہ گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

شاید اس سے زیادہ کربناک لمحہ اور کوئی نہیں ہو سکتا جب انسان کو اپنی موت کی خبر ملے اور وہ باریک ریزوں میں بکھرتا چلا جائے۔

ایسی ہی ایک خبر کا متن سعدیہ رحمت اللہ بن گئی تھی۔

فہیم شاہ کی اکلوتی لاڈلی بیٹی سعدیہ جس کا نام رکھتے ہوئے انہوں نے خاص طور پر رحمت اللہ کا

اضافہ کیا تھا اور پھر تمام کاغذوں میں اس کا اندراج اسی نام سے کیا گیا۔

آج وہی سعدیہ رحمت اللہ رات سے گھر نہیں آئی تھی اور تنی ہوئی گردنوں والے عظیم شاہ اور فہیم شاہ کو گویا سانپ سونگھ گیا تھا۔

ناشتے یا کھانے پر ایک ساتھ بیٹھنے کی روایت تو اس گھر میں تھی ہی نہیں وہ تو جب صبح سے دوپہر اور پھر شام ہوگئی تو چاچی کو تشویش نے آن گھیرا۔

سعدیہ گزری شام کو سہیلی کے گھر جانے کا کہہ کر گئی تھی اور پھر اس نے رات کو اسی سہیلی کے گھر رکنے کی اطلاع بھی دی تھی لیکن اس کا یہ مطلب بالکل نہیں تھا کہ اس کو دوسرے دن بھی شام تک اس کے گھر رہنے کی اجازت مل گئی تھی۔

شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے چاچی نے اس کی سہیلی کا نمبر ملا لیا تھا۔ کیونکہ سعدیہ کا نمبر بند تھا تب سہیلی کے انکشاف پر ان کے پاؤں تلے زمین ہی نہیں رہی تھی اور وہ وہیں سر تھام کر بیٹھ گئی تھیں۔

''سعدیہ سے میری ملاقات پچھلے سے پچھلے ہفتے ہوئی تھی۔'' لاابالی سی آواز اب بھی ان کے کانوں میں گونج رہی تھی انہیں تصدیق کرنے کی ہمت نہ ہوئی کہ میں سعدیہ رحمت اللہ کا پوچھ رہی ہوں۔

کیوں کہ وہ مزید کہہ رہی تھی آنٹی میں خود کل سے سعدیہ کا نمبر ٹرائی کر رہی ہوں وہ میرا سوٹ لے کر گئی تھی اب تک نہیں دیا۔

چاچی کی تو گویا سانسیں رک گئی تھیں فون بند کر کے وہ مرے مرے قدموں سے تائی کے پاس آئی تھیں۔

''کیا ہوا چہرے پر ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں اللہ خیر کوئی بری خبر سن لی۔'' آلو کی قتلیاں کاٹتے ہوئے وہ چاچی کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔

''اے بی بی بولو بھی.....'' تائی کے ہاتھ سے چھری پھسل گئی تھی ان کا چہرہ دیکھ کر۔

''کیا بولوں..... سمجھ نہیں آ رہا سعدیہ کا کہاں پتا کروں کل گئی تھی افشاں کے گھر..... ابھی اس کو فون کر رہی ہوں تو نمبر بند ہے۔''

''کس کا افشاں کا۔'' انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں ابرو اچکائے۔

''نہیں سعدیہ کا اور افشاں کے گھر پر وہ نہیں ہے۔'' چاچی نے جلدی سے نگاہیں جھکا لیں۔

بھاوج کی نظروں کو وہ ویسے بھی ایکسرے مشین کہتی تھیں۔

''اے کیا کہہ رہی ہو تم بی بی۔ تمہارا مطلب ہے سعدیہ اس کے گھر نہیں گئی تو پھر کہاں گئی فون بھی اس کا بند ہے موا دوسرا موبائل بھی ملا لو پتا نہیں کتنے تو اس کے نمبر ہیں۔''

انہوں نے ہر تشویش انداز اپنایا۔

''ملا لیے دونوں تینوں نمبر..... سمجھ میں نہیں آ رہا کس سے پوچھوں۔''

چاچی کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا اور تائی کی کھوجتی نگاہوں میں ان گنت سوال تھے تب ہی انہوں نے اٹھ کر تایا کا نمبر ملا لیا تھا۔

''سفیر کے ابا! ذرا سنو تو.....'' وہ سانس لیے بغیر گویا ہوئی تھیں۔

اور پھر تھوڑی دیر کے بعد گھر کا نقشہ ہی بدل چکا تھا۔

پہلی فرصت میں اس کی تمام سہیلیوں کے نمبر ڈائل کیے گئے جن کا نتیجہ حسبِ توقع تھا۔ کسی کو بھی سعدیہ کے بارے میں کوئی خبر نہیں تھی۔

نعمان تھوڑی دیر پہلے گھر آیا تھا اور یہ سب سننے کے بعد تمتماتے ہوئے چہرے کے ساتھ چھت پر آیا تھا۔ صوفیہ صبح سے اپنے کمرے میں بند تھی نعمان نے زوردار دستک دی۔

صوفیہ تپے ہوئے چہرے کے ساتھ دروازے تک آئی تھی۔

''کیا بدتمیزی ہے تم سکون سے دروازہ ناک نہیں کر سکتے۔''

وہ شاید نماز پڑھتے ہوئے باہر آئی تھی اس نے دوپٹہ اچھی طرح سے لپیٹ رکھا تھا اس کے چہرے پر آئے غصے کو نظر انداز کر کے نعمان نے بے بسی سے دروازے پر ہاتھ رکھ کر اسے مخاطب کیا۔

''آپ کو پتا ہے نیچے کیا ہنگامہ مچا ہوا ہے۔'' وہ بے چین نظر آ رہا تھا۔

''کیا ہنگامہ..... کونسا ہنگامہ..... مجھے تو کوئی آواز نہیں آ رہی۔ سکون ہے فی الحال تو ایک تم ہی بے سکون ہو..... مجھے نماز پوری کرنی ہے کوئی کام ہے تو بولو۔''

''ویری گڈ آپ اس گھر میں ہوتے ہوئے بھی بے خبر ہیں کہ سعدیہ کل سے گھر نہیں آئی اور ابھی بھی اس کا پتا نہیں چل رہا۔''

وہ زہریلے لہجے میں گویا ہوا پتا نہیں اسے سعدیہ سے کیا بیر تھا۔

''کیا مطلب..... سعدیہ گھر کیوں نہیں آئی وہ اپنی فرینڈ کے گھر گئی ہے نا آ جائے گی اس میں اتنا شور مچانے کی کیا ضرورت ہے۔''

صوفیہ نے اپنی قوت سوچ کے مطابق کہا تھا۔

اسی لیے نعمان کے چہرے پر پھیلنے والی طنزیہ مسکراہٹ سمجھ نہیں آئی تھی۔

''وہ اپنی فرینڈ کے گھر ہی تو نہیں گئی..... اس کا کہیں کچھ پتا نہیں چل رہا موبائل بھی بند ہے۔''

اس بار اس کے لہجے میں ٹھنڈک تھی جسم و جاں میں اترنے والی عجیب سی ٹھنڈک۔

صوفیہ کے جسم میں بھی عجیب سی سنسنی دوڑ گئی اس کی نگاہوں کے سامنے سعدیہ کا پریشان چہرہ اور پراسراری بے چینی والے انداز لہرا گئے صوفیہ نے اسے شاپنگ کی آفر کی تھی سعدیہ نے انکار کر دیا تھا۔

وہ اس وقت کسی الجھن میں تھی صوفیہ کے ذہن میں بہت سے پل تازہ ہو گئے۔

''تم نیچے چلو میں نماز ختم کر کے آتی ہوں۔'' اسے اب نعمان کی نگاہوں سے خوف آ رہا تھا نعمان اس کے پلٹنے پر چھت کے دوسرے سرے پر آ گیا تھا۔ اس نے موبائل نکال کر سب سے پہلے اپنے ایک

دوست کا نمبر ڈائل کیا تھا جو اظہر کا بھی دوست تھا۔

فی الوقت اس کے ذہن میں اظہر کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔

''میں تو پہلے ہی کہتی تھی لگام دو اس کی حرکتوں کو مگر کوئی سنے، اس کے باوا تایا کو شوق تھا ہر رشتے میں کیڑے نکالنے کا ارے جوان اولاد کا کوئی بھروسہ ہے۔''

تائی نے فکر و پریشانی کا اظہار کرنے کے لیے بڑا مناسب جواز ڈھونڈا تھا کہ ان کی تو کوئی سنتا نہیں۔

چاچی کی آنکھیں برسنا شروع ہو گئی تھیں انہوں نے بڑی شکایتی نگاہوں سے جیٹھانی کے تیور نوٹ کیے تھے۔

لیکن کیا کرتیں سعدیہ نے جو کیا تھا اس کے بعد سر اونچا کر کے پلٹ کر جواب دینے کی ہمت ہی نہیں رہی تھی۔

گھر کے مردوں کی نظروں میں سارا قصور ان دو عورتوں کا تھا خصوصاً ماں کا، تایا کا تعلق تو مردوں کے اس قبیلے سے تھا جن کے نزدیک ہر چھوٹے بڑے جرم کی قصوروار عورت ہوتی ہے۔ اس لیے وہ عورت کو عزت اور اہمیت دینے کے قائل نہیں تھے۔ یہ لگ بات کے ان کے نصیب میں تائی جیسی عورت تھی جو ان کے کسی فرمان کو خاطر میں نہیں لاتی تھیں۔

''بات اس حد تک پہنچی ہے میں کیسے مانوں تم دونوں عورتوں کو پتا نہیں تھا۔ زمانے بھر کی خبریں تم رکھو اور گھر میں اتنا کچھ ہو جائے میں مان ہی نہیں سکتا۔'' وہ روایتی بے حسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے برس رہے تھے۔ فہیم شاہ کی ہمت پہلے ہی جواب دے چکی تھی۔

''سفیر کے ابا ہمیں کیوں دوش دیتے ہو میں نے تو سارا کچھ بتا دیا تھا یہ بیٹھے ہیں اس کے اماں باوا پوچھو ان سے کتنا سمجھایا بچی کے دل کی بات مان لو تم لوگ شجرہ نسب لے کر بیٹھ گئے وہ بھی آج کے دور میں۔

چھوٹی چھوٹی سی تھیں عالیہ عظمی گھر داری سے لگا دیا تھا اللہ کا احسان ہے آج اپنے گھر میں آباد

ہیں۔'' وہ ہاتھ جھاڑ کر کھڑی ہوگئی تھیں تائی نے بڑے انوکھے انداز میں مرہم رکھا تھا۔

صوفیہ چند لمحے پہلے ہی اندر آئی تھی تائی کی آخری بات پر وہ حیران نگاہوں سے اس گھر کے مردوں کا جائزہ لے رہی تھی ان کے فکر میں غلطاں چہروں کو دیکھ رہی تھی جو کسی غیبی امداد کے منتظر تھے۔

تائی اپنے جاہ وجلال کا مظاہرہ کر رہی تھیں وہ اسے دیکھ کر لمحے بھر کے لیے خاموش ہوگئی تھیں۔

صوفیہ سب کو نظر انداز کر کے اس عورت کے پاس چلی آئی تھی جو اس وقت سعدیہ کی ماں ہونے کی گناہ گار تھی سب کی نگاہیں اس پر جمی تھیں۔

''چاچی۔'' صوفیہ نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''پریشان ہونے والی بات تو ہے لیکن اس طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے سے کیا ہوگا آپ لوگ اسے ڈھونڈتے کیوں نہیں۔'' اس نے تصویر کا مثبت پہلو دکھا کر سب کو حیران کر دیا تھا۔

''کہاں سے ڈھونڈیں اسے منہ کالا کر کے چلی گئی ہے اتنی آسانی سے تو نہیں ہاتھ آئے گی۔ تایا کے انداز میں حد درجہ حقارت تھی صوفیہ نے ایک افسوس بھری نگاہ ان پر ڈالی اور اپنے چاچا کی طرف اس امید کے ساتھ دیکھا کہ شاید وہ کچھ اور سوچ رہے ہوں مگر وہ حسب عادت سر جھکائے کسی گہری سوچ میں گم تھے۔

انہیں کبوتر کی طرح آنکھیں میچ کر خطرے سے بچنے کی عادت تھی اسی لیے ان کی اولادیں بے ثمر درختوں کی طرح بس بڑی ہوتی چلی گئی تھیں لیکن ان کی مثبت سمت کا تعین ابھی تک نہیں ہو سکا تھا۔

صوفیہ نے باری باری سب کو دیکھا سفیر کی لاتعلقی پر خون کھول سا گیا تھا۔ گویا اس کا اس سارے قصے میں کوئی قصور نہیں وہ بس منتظر نظروں سے اپنے بڑوں کو دیکھ رہا تھا اگلے فرمان کے لیے۔

اسے گہرے رنج نے آن گھیرا۔

''میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا کہ آپ سب لوگ اتنا نیگیٹو ہی کیوں سوچ رہے ہیں کسی کا گھر سے غائب ہو جانے کا مطلب کیا صرف یہ ہی ہوتا ہے کہ وہ.....'' وہ اچانک پھٹ پڑی تھی لیکن دل پر اتنا

بوجھ آپڑا تھا کہ اپنا جملہ مکمل نہیں کر سکی تھی۔

''تو بی بی! کیا ہوتا ہے مطلب..... بتاؤ نا تم بھی..... سمجھدار قابل ماں کی پڑھی لکھی بیٹی ہو دن دیہاڑے لڑکی گھر سے غائب ہو جائے تو کیا اس کے جانے کا جشن منائیں۔''

تائی تڑپ کر بولی تھیں صوفیہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا اسے ہمیشہ ماں کی بیٹی ہونے کا طعنہ ضرور ملتا تھا جانے کیوں۔

''آپ اس کے جانے کا جشن نہ منائیں آپ اس کے مرنے کا سوگ بھی تو منا سکتے ہیں ہو سکتا ہے وہ اس گھر سے نکلنے کے بعد کسی ایکسیڈنٹ میں مر گئی ہو آپ لوگوں کے نزدیک لڑکی کے غائب ہونے کا مطلب ہمیشہ ایک ہی کیوں ہوتا ہے۔''

وہ پہلے تو صرف پھٹ پڑی تھی اور اب پلٹ کر تائی کے مقابل آ گئی تھی اس کی آنکھوں سے شرارے پھوٹ رہے تھے۔

اس کا چہرہ بالکل اپنی ماں جیسا تھا مگر یہ آنکھیں یو بہو ندیم شاہ کی تھیں۔

تائی کے جسم میں خوف کی لہر سی دوڑ گئی۔

راحت اپنی لیاقت اور خود اعتمادی کے بل بوتے پر ہمیشہ انہیں پسپا کر دیتی تھی۔

''زیادہ سبق پڑھانے کی کوشش مت کرو جن باتوں کا تمہیں نہیں پتا ان میں مت الجھو تو بہتر رہے گا یہ اتنی چھوٹی بات نہیں جتنی کہ تم سمجھ رہی ہو۔''

تایا اپنی بیوی اور ندیم شاہ کی بیٹی کو مقابل دیکھ کر پریشانی کے عالم میں آگے بڑھے تھے اور صوفیہ کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھ کر ٹھنڈے ٹھار لہجے میں کہا تھا صوفیہ نے وہ ہاتھ بڑی بے دردی سے جھٹک دیا تھا۔

''بہت شکریہ آپ لوگوں کے مشورے کا آپ لوگ اگر اس کی گمشدگی کی رپورٹ نہیں کرنا چاہتے

تو مت کریں لیکن مجھے نہیں روک سکتے میں اس کی رپورٹ بھی کروں گی اور سارے اسپتال بھی چیک کروں گی ابھی..... سفیر کیا آپ میرے ساتھ چلیں گے۔"

وہ تایا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے خوفی سے بولی تھی اور جملے کے اختتام پر اس کا مخاطب سفیر تھا جو اس کی بات سن کر گڑبڑا گیا تھا جیسے وہ کسی ایسے اقدام سے واقف ہی ہو۔

صوفیہ کو سفیر پر اکثر و بیشتر غصہ آتا رہتا تھا جو اپنے بڑوں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنا رہتا تھا اسے اپنی زندگی بدلنے آگے بڑھنے سے کوئی سروکار نہیں تھا اس وقت بھی اس سارے معاملے میں اس کی خاموشی اس بات کی غماز تھی کہ وہ اپنے باپ اور چچا کے احکامات سے متفق ہے۔

صوفیہ چند لمحے اس کے جواب کی منتظر رہی پھر پلٹ کر دروازے کی جانب قدم بڑھا دیئے گویا وہ جو کہہ چکی تھی اب اس پر عمل کرنے کا ارادہ تھا۔ تایا نے خطرناک تیوروں سے اسے دیکھا۔

"روکو اسے ہمارے گھر کی لڑکی گئی ہے کوئی چوری نہیں ہوئی جس کی وہ رپورٹ درج کروانے جا رہی ہے۔"

ان کا مخاطب تائی تھیں جو صوفیہ کی جرات مندی پر حیران سی کبھی ایک تو کبھی دوسرا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔

انہیں راحت کی بیٹی سے ہر ردعمل کی توقع تھی وہ تو یہ سوچ رہی تھیں کہ ان کے شوہر نامدار اس طوفان کو کیسے روکیں گے۔

صوفیہ کے بڑھتے قدم نعمان نے روک دیے تھے۔

"سنو صوفیہ!" وہ اس کے سامنے دروازے میں ہی کھڑا تھا۔

"میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں لیکن تم اس بات کو نظر انداز مت کرنا کہ اظہر بھی کل سے اپنے گھر پر نہیں ہے اور اس کے گھر والوں کا کہنا ہے کہ وہ کسی پروگرام کے لیے لاہور گیا ہے۔"

نعمان نے مدہم آواز اور خشک لہجے میں اپنی بات مکمل کی تھی سب ہونق سے اس کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔

چاچی کی پشیمان نگاہیں اب خوف زدہ ہوگئی تھیں۔

انہیں سعدیہ سے کسی ایسی حماقت کی توقع نہیں تھی۔ صوفیہ کی باتوں سے ان کا بھی حوصلہ بڑھا تھا ڈھارس سی ہوئی تھی کہ شاید ایسا بالکل نہ ہو جو پورا گھر بیٹھا سوچ رہا ہے اور سارے قصور ان کے کھاتے میں ڈال رہا ہے۔

مگر نعمسن کی اطلاع نے تو پورے جسم میں سراسیمگی سی دوڑا دی تھی۔

وہ رونا بھی چاہتی تھیں اور سب کی نگاہوں سے چھپنا بھی چاہتی تھیں مگر اس گھر میں تو ایسا ممکن نہ تھا۔

"تم دونوں یہیں رک جاؤ کوئی کہیں نہیں جائے گا عزت کا جنازہ نکلنا تھا نکل گیا مجھے سوچنے دو۔"

تایا کی گرجدار آواز نے صوفیہ اور نعمان دونوں کو رکنے پر تو مجبور کیا تھا لیکن صوفیہ کے ارادوں پر کوئی فرق نہیں پڑا تھا وہ جلد از جلد شجاع سے رابطہ کر کے اس مسئلے کا حل ڈھونڈنا چاہتی تھی نہ جانے کیوں اس کا دل بار بار اس بات کی دہائی دے رہا تھا کہ بات وہ نہیں جو سب کا گمان ہے۔

اصل حقیقت تو کچھ اور ہے جس کی تہہ تک پہنچنا بہت ضروری ہے۔

"دیکھیں آپ لوگوں کے سوچنے سے اور مزید دیر کرنے سے کوئی بڑا نقصان ہو جائے گا۔ ایٹ لئسٹ ہمیں ہسپتال تو چیک کرنے چاہئیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ اتنی بہادر ضرور ہے کہ اپنے کہیں بھی جانے کی اطلاع دے دے۔ آپ لوگ پلیز تھوڑا سا پازیٹو ہو کر سوچیں پلیز بغیر تصدیق کے فرد جرم عائد مت کریں۔"

صوفیہ میں نہ جانے کہاں سے اتنی بہادری آ گئی تھی کہ وہ اس مسئلے پر اپنے دلائل دے رہی تھی۔

(اس کی ماں بھی ہر بات پر ثبوت مانگتی تھی) تائی کے چہرے کے تاثرات بگڑ گئے تھے اور تایا حیران سے اس کا چہرہ دیکھ رہے تھے کتنی نڈر تھی وہ اپنے باپ کی طرح۔

انہیں ایک لمحے کو یوں لگا جیسے ندیم چاہ سامنے کھڑا ہو اور کسی بات پر اڑ گیا ہو وہ بالکل اسی کا پرتو تھی بے خوف بے لوث.....

''ذلالت، بے غیرتی، بزدلی کو تم بہادری کا نام دے رہی ہو افسوس ہے اولاد کو پڑھانے لکھانے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ ماں باپ کو غلط اور خود کو عقل کل سمجھنے لگے بھائی صاحب ٹھیک کہتے ہیں آپ، ہمیں اب سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہوگا۔ جو جگ ہنسائی مقدر میں لکھی جا چکی ہے اس کو ٹالا تو نہیں جا سکتا۔''

اس سارے وقت میں پہلی بار چاچا کی زبان کھلی تھی اور صوفیہ مزید ملال میں گھر گئی تھی۔ سب کو اپنی جگ ہنسائی کی فکر تھی اس کی زندگی سے کسی کو کوئی غرض نہیں تھی جس نے عمر عزیز کے کئی سال اس گھر کی بے اعتبار گھٹن زدہ فضا میں گزار دیے تھے۔

''جو چاہیں کریں..... لیکن جلدی کریں۔'' چاچی کو بھی اپنا آپ ثابت کرنے کا حوصلہ ملا تھا۔

صوفیہ نے ایک نظر نعمان پر ڈالی وہ منتظر نگاہوں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا اور سفیر ان دونوں کو۔

''تمہارے پاس گاڑی یا بائیک ہے۔'' صوفیہ نے نعمان سے پوچھا تھا تب سفیر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا اس کی نظروں کا محور صوفیہ تھی جو عام سے گھریلو حلیے میں ان سب کے درمیان بہت الگ اور منفرد محسوس ہو رہی تھی میرے خیال میں اسپتالوں کا چکر لگانا لازمی ہے میں اور صوفیہ وہاں جاتے ہیں تم صرف اظہر کے گھر والوں اور اس کے دوستوں پر نظر رکھو پہلی فرصت میں اظہر کا ٹھکانہ معلوم کرو لاہور میں۔

صوفیہ کی ہٹ دھرمی اور نعمان کی دلچسپی کا اتنا تو فائدہ ہوا تھا کے سفیر کے بے حس و حرکت وجود میں ہلچل سی ہوئی تھی اور پہلی بار وہ اس منظر نامے میں اپنی موجودگی کا احساس دلا رہا تھا وہ ایک گہری سانس لے کر اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف مڑ گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

''یہ کیا مصیبت گلے سے لٹکائی ہے تم نے۔'' شمائلہ کمال سرمد بخاری پر برس رہی تھی اور وہ ڈھٹائی سے مسکرا رہا تھا۔

''دیکھو ڈیئر کچھ مصیبتیں اتنی حسین اور باکمال ہوتی ہیں کہ ان کا بوجھ پھولوں سے بھی ہلکا محسوس

ہوتا ہے اور تم تو جانتی ہو صنفِ نازک ہمیشہ سے میری کمزوری رہی ہے میں اسے کبھی مایوس نہیں کرتا۔"

وہ ایک آنکھ ہلکے سے دباتے ہوئے اپنے مخصوص لہجے میں بولا تو شمائلہ اسے گھور کر رہ گئی وہ کل رات سے اس کے ساتھ تھی اور اب تھک سی گئی تھی۔

گزری رات کے حادثے میں سرمد بخاری کو معمولی چوٹیں آئی تھیں اس نے کسی مشتاق کھلاڑی کی طرح دروازے سے کود کر خود کو بچا لیا تھا اور اس کے ساتھ بیٹھی سعدیہ قلابازی کھا کر الٹنے والی گاڑی کی زد میں اس بری طرح سے آئی تھی کہ اب تک اسے ہوش نہیں آیا تھا۔

ٹانگ اور پسلیوں میں فریکچر کے ساتھ سر پر آنے والی چوٹ کے باعث وہ تقریباً کوما کی حالت میں تھی ڈاکٹرز نے امید تو ظاہر کی تھی کہ اگر وہ اگلے چند گھنٹوں میں ہوش میں آ گئی تو ٹھیک رہے گا ورنہ کوما کا دورانیہ طویل بھی ہو سکتا تھا۔

اس کا پورا وجود فی الوقت پٹیوں اور مانیٹرنگ مشینوں کے رحم و کرم پر تھا جب کہ سرمد بخاری کو ڈسچارج کر دیا تھا۔

حادثے کے فوراً بعد سرمد نے شمائلہ کو اطلاع دی تھی وہ اپنی ساری مصروفیات ترک کر کے اس کے پاس آ گئی تھی سرمد بخاری کی گاڑی سے ٹکرانے والا شخص بھی شدید زخمی تھا اور اسی پرائیویٹ ہسپتال میں زیرِ علاج تھا۔

جہاں سرمد بخاری جیسے لوگ ہی آ سکتے ہیں۔

اس کے ساتھ سرمد بخاری یہ ہمدردی نہ کرتا تو اتنے زخموں کے بعد اس کی زندگی کے دن تو گنے جا چکے تھے۔

تم تو ڈسچارج ہو گئے اب اپنی لیلیٰ کا کیا کرو گے جلدی کوئی فیصلہ کرو بغیر کسی مرض کے اسپتال کی فضا میں رہنا سب سے مشکل کام ہے۔

شمائلہ کی نازک مزاجی عود کر آئی تھی سرمد بخاری سعدیہ کے لیے فکر مند سا تھا مخصوص عورتانہ فطرت کے باعث شمائلہ کو توجہ کا انداز بالکل نہیں بھایا تھا۔

حالانکہ سرمد بخاری جس قماش اور کاروبار کا آدمی تھا اس میں تو دن رات جسموں کے سودے ہوتے تھے اور شمائلہ باقاعدہ ان کی حصے دار تھی لیکن سرمد بخاری کے لیے اس کی جذباتیت اپنی جگہ برقرار تھی وہ اس کا بہترین دوست ہی نہیں غمگسار اور ہمراز بھی تھا۔

وہ کبھی کبھی بھرپور انداز میں اس کی ذہنی اور جسمانی تشفی کا اہتمام کرتا تھا۔ تب شمائلہ بہت مسرور اور مطمئن ہو جاتی تھی۔

اسے یقین تھا کہ اگر سرمد بخاری نہ ہوتا تو شاید منیر کمال سے تنگ آ کر خودکشی کر چکی ہوتی یا کسی دوسرے ملک میں روپوش ہو چکی ہوتی۔

''تم بتاؤ نا کیا کیا جائے اس سالی کے تو گھر والے اب تک بھاگ جانے کا سوگ منا چکے ہوں گے اور یہ یہاں بے خبر پڑی ہے۔'' وہ دونوں اسپتال کے کیفے ٹیریا میں چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

''ایسا کرو اس کے گھر والوں کو انفارم کر دو۔'' شمائلہ نے سنجیدگی سے مشورہ دیا اسے اسپتال کے بیڈ پر پڑی اس نوعمر لڑکی سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔

''کون سے گھر والوں کو انفارم کروں جان من مجھے تو نہیں پتا یہ کہاں رہتی ہے میرا ڈرائیور اسے پک کرنے جاتا تھا پھر اس کے گھر والوں کا اگر کوئی کانٹیکٹ نمبر ہوتا بھی تو میں کیوں اپنے گلے میں یہ گھنٹی باندھوں تمہیں پتا ہے ناں مڈل کلاس لوگوں کے ایشوز کا۔'' وہ اس وقت بے رحم اور موقع پرست نظر آ رہا تھا شمائلہ نے قدرے اطمینان کا سانس لیا اسے انسانوں میں اچھے اوصاف ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے۔

''منیر کو پتا ہوگا وہ تمام معلومات جمع کر کے اپنے مشن کا آغاز کرتا ہے اور یہ تو وہی لڑکی ہے نا جو ہماری پارٹی میں بے ہوش ہو گئی تھی۔ تم بھی پتا نہیں کس کے چکر میں پڑے ہو۔''

شمائلہ کی نخوت اور تضحیک کا انداز سرمد بخاری کے لیے نیا نہیں تھا۔

''کاروباری آدمی ہوں سرکار! گھاٹے کا سودا کبھی نہیں کرتا میں نے اس کو دبئ چلنے کے لیے راضی بھی کر لیا تھا تمہیں پتا ہے پروفیشنل لڑکی کے نخرے اور ڈیمانڈز اور مجھے اپنے کلب کے لیے ہمیشہ فریش مال چاہیے۔''

سرمد بخاری کے چہرے پر کمینی سی مسکراہٹ رقصاں تھی شمائلہ نے اپنی نظریں اس کے چہرے پر جما دیں۔کل کے ایکسیڈنٹ کے بعد وہ مضمحل سا نظر آ رہا تھا۔

''لیکن اب تو یہ مال سرے سے ہی خراب ہو گیا، سودا کیا کرو گے۔'' شمائلہ چائے کا کپ ساسر میں رکھتے ہوئے اس کے انداز میں بولی تو وہ ہنس پڑا۔

''نہ جی! تھوڑا ٹائم لگے گا مگر ٹھیک ہو جائے گی اور ویسے بھی یار تھوڑا بہت تو انسان کا دل میرے اندر بھی ہے۔اس حالت میں اسے سڑک پر تو نہیں پھینکا جا سکتا تھا نا۔''

وہ اس کے چہرے پر نظریں جما کر بولا شمائلہ اپنی کیفیت چھپانے میں کامیاب ہو بھی گئی ہو سرمد بخاری عورتوں کی مخصوص حاسدانہ فطرت سے بخوبی واقف تھا۔

چند سال پہلے اس نے دوسری شادی کی تھی اور دونوں کی زندگی اس لحاظ سے بہت مزے میں گزر رہی تھی کہ وہ امریکہ میں مقیم تھی اپنے بچے کے ساتھ جبکہ سرمد بخاری کاروبار کے سلسلے میں زیادہ تر دبئ میں رہتا تھا یا پھر پاکستان میں شمائلہ کے ساتھ۔

''ٹھیک ہے پھر تم خدمت خلق جاری رکھو اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرو میں چلتی ہوں گاڑی کی ضرورت ہے تو ڈرائیور کے ساتھ بھجوا دیتی ہوں۔'' وہ اپنا ہینڈ بیگ لے کر کھڑی ہو گئی اس کے چہرے پر بے زاریت کی لکیریں بہت واضح تھیں۔سرمد نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''ایسا نہیں کرتے..... میں جانتا ہوں تم میرے دل پر تنہا راج کرنا چاہتی ہو اس میں بالکل

انسان نہیں بسنے دینا چاہتیں۔"

کیفے ٹیریا میں معمول کا رش تھا شمائلہ نے جز بز سا ہو کر ہاتھ چھڑا لیا، وہ شرارت سے مسکرا دیا۔

"بکواس مت کرو..... چلو میرے ساتھ گھر اور اپنے کسی بندے کی ڈیوٹی لگا دو اس کی دیکھ بھال کرنا تمہارا کام نہیں ہے' وہ جب ہوش میں آ گئی تو تمہیں انفارم کر دیا جائے گا' آخر کو ہسپتال کا بل بھی تمہارے ذمے ہے۔" وہ حتمی انداز میں کہتے ہوئے کیفے ٹیریا سے باہر نکلنے کو بے تاب تھی۔

"اب چلو بھی..... سخت بوریت والا ماحول ہے یہ۔" شمائلہ کے لہجے کا تناؤ برقرار تھا، سید بخاری نے چند لمحے کا توقف کیا اور پھر موبائل فون کی طرف متوجہ ہو گیا۔

شمائلہ نے صحیح کہا تھا وہ اپنے کسی با اعتماد بندے کی ڈیوٹی بھی تو لگا سکتا تھا اور پھر کسی نرس کی خدمات بھی لی جا سکتی تھیں۔

پیسے والے آدمی کے لیے کبھی بھی کوئی مشکل مسئلہ نہیں بنتی مسئلے تو سارے غربت کی گود میں پلتے ہیں جو انسان سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی چھین لیتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

نانو کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا کشمالہ دبے پاؤں ان کے کمرے میں چلی آئی تھی وہ جائے نماز پر بیٹھی تسبیح میں مصروف تھیں ایک نظر کشمالہ پر ڈال کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کر کے وہ اپنا وظیفہ مکمل کرنے لگی تھیں' کشمالہ عقیدت سے انہیں دیکھ رہی تھی آسمانی رنگ کے سوٹ میں گلابی رنگت والا مہربان چہرہ اپنے اندر ڈھیر سارے کرب چھپائے ہمیشہ اپنے رب کا شکر گزار نظر آتا تھا۔

کشمالہ کو ان کی استقامت اور حوصلے پر رشک آتا تھا اس نے کبھی رشتوں کو ان کے اصل روپ میں نہیں دیکھا تھا بس نام ہی سنا تھا اور اب جب ان میں سے کچھ رشتے مجسم ہو کر سامنے آئے تھے تو اسے احساس ہوا تھا کہ وہ دونوں بہنیں کتنی بدنصیب تھیں جو ایک مدت محبت کے اصلی رنگوں سے محروم رہی تھیں۔

ڈھیر سارے دوست احباب، کولیگ، ساتھی اس ایک رشتے کا نعم البدل تو ہو ہی نہیں سکتے تھے جو نانو کے روپ میں انہیں ملا تھا اس کا دل تشکر کے جذبات سے لبریز ہو گیا تھا۔

وہ چپکے سے اٹھ کر نانو کے پاس چلی آئی اور ان کے برابر میں بیٹھ کر یوں مگن سی ہو گئی جیسے خود بھی کسی وظیفے میں مصروف ہو۔

نانو نے تسبیح ختم کر کے جائے نماز سمیٹتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ سر اٹھانے کے بجائے اسی انداز میں ان کے کندھے سے آ لگی۔

تھوڑی ہی دیر میں اس کی ہلکی ہلکی سسکیاں نانو کی سماعتوں سے ٹکرانے لگی تھیں۔

''یہ کیا بچے..... تم رو رہی ہو۔'' نانو نے اس سارے عرصے میں اسے پہلی بار روتے دیکھا تھا بلکہ وہ تو کبھی انہیں افسردہ اور پریشان بھی نہیں نظر آئی تھی۔ اسے اپنی بانہوں میں سمیٹتے ہوئے انہوں نے حیرانی سے پوچھا۔

''بس یوں ہی آپ پر پیار آ رہا تھا۔'' وہ بے ساختہ بولی اور بھیگی آنکھوں سے انہیں دیکھنے لگی۔

گابی ڈوروں والی نیلی آنکھوں میں نانو کے لیے اتنا پیار تھا کہ وہ بے اختیار اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں سمیٹ کر چومنے پر مجبور ہو گئیں، یہ لڑکی اول دن سے انہیں اپنے دل کے پاس محسوس ہوئی تھی۔

''پیار تو مجھے بھی تم پر آ رہا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ میں بھی رونا شروع کر دوں' بتاؤ نا۔'' وہ اسے خفگی سے دیکھنے لگیں اس لمحے انہیں یاد بھی نہیں تھا کہ وہ منیر کمال کی بیٹی ہے۔

''اور جب ہم دونوں روئیں گے تو ہمیں چپ کون کروائے گا۔'' انہوں نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا تو وہ بھی مسکرا دی۔

''اب بتاؤ..... کیا ہوا' بے موسم کی برسات سے مجھے کوئی انسیت نہیں۔'' نانو اس کا ہاتھ تھام کر محبت سے پوچھ رہی تھیں۔ کشمالہ کے نین مزید نیر بہانے لگے تھے۔ اسے تو اب پتا چلا تھا محبت اور قربت آنسوؤں کی روانی کا باعث بن جاتی ہے۔

''ارے بچے! کچھ بولو بھی تو ہوا کیا ہے۔ طارق نے کچھ کہا ہے' عاشر سے کوئی بات ہوئی ہے وہ تو ہے ہی بدتمیز پہلے دن سے تم لوگوں سے خائف ہے دیکھو اس کی باتوں کا برا مت منایا کرو۔'' نانو تو گھبرا ہی گئی تھیں۔

کشمالہ نے جلدی سے آنسو پونچھ کر خود پر قابو کیا۔ ورنہ دل تھا کہ بے قابو ہوئے جا رہا تھا۔

پتا نہیں کس کس دکھ پر آج روئے چلا جا رہا تھا۔ کون کون سے درد اس کو نظر آ رہے تھے کوئی کمی سی تھی جو رونے پر مجبور کر رہی تھی۔

''نانو! کسی نے کچھ نہیں کہا میں سوچ رہی تھی پاپا سے کچھ پوچھوں مگر وہ فون پر بزی تھے تو میں آپ کے پاس آ گئی۔'' وہ انہیں مزید پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے جلدی سے خود کو سنبھال لیا۔

ویسے بھی ہسپتال سے آنے کے بعد سب ان کا بہت خیال رکھتے تھے۔

حتی الامکان کوشش کرتے تھے کہ ان کے مزاج کے خلاف کوئی بات نہ ہو وہ اب عمر کے جس حصے میں تھیں وہاں دل صدموں کا تو متحمل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

''ان آنسوؤں کا کوئی تو سبب ہو گا کیا ماں یاد آ رہی ہے۔'' انہوں نے نرمی سے بال سہلاتے ہوئے پوچھا۔

''ماں جیسی آپ مل تو گئیں اب وہ یاد نہیں آتیں' البتہ.....'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

(باپ کو یاد کرنے کا کوئی فائدہ نہیں' اس کے بارے میں جان گئیں تو میں آپ سے شرمندہ ہو جاؤں گی)

''ہاں بولو نا.....رک کیوں گئیں.....'' انہوں نے اصرار کیا اپنی سوچوں کو جھٹک کر کشمالہ آس بھری نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگی۔

''نانو! ایسا کیا ہوا تھا جو شمائلہ آپ کی' عاشر کی اور پاپا کی زندگی سے چلی گئیں اور پھر آج تک

پلٹ نہ سکیں۔"

انہیں شاید اس کے چہرے پر یہ سب پہلے سے لکھا نظر آ رہا تھا اس لیے اس کے تجسس پر اچنبھا نہیں ہوا تھا۔

"وہ پلٹنا بھی چاہے تو اس گھر کے دروازے اس کے باپ نے بند کیے تھے میں کبھی نہیں کھولوں گی۔"

کشمالہ کی بات پر ایک گہرا سانس لے کر انہوں نے روانی سے کہا تو وہ درے حیران سی اسرار کی اس دنیا میں اڑنے کے لیے راستہ ڈھونڈنے لگی۔

"نانو! میں نے کہیں پڑھا تھا عورت اپنا گھر کبھی نہیں توڑنا چاہتی' جب تک گھر کے در و دیوار اس کے لیے اجنبی نہ ہو جائیں وہ ہر حال میں سمجھوتہ کرتی ہے مگر جب اس کی عزت پر بن آئے تو پھر حالات بدل جاتے ہیں۔"

وہ بمشکل لفظ مجتمع کر کے بولی اس کے پاس جرح کے لیے بہت کچھ تھا مگر وہ نانو کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"تم نے ٹھیک پڑھا تھا..... عورت ہر حال میں سمجھوتہ کرتی ہے۔ لیکن ایک اور طاقتور چیز ہوتی ہے جس سے ہر انسان ہار جاتا ہے مات کھا لیتا ہے اور وہ ہے انسان کا نفس..... پتا ہے نفس پاگل کتے کی طرح ہوتا ہے کتا اپنے جس مالک کے لیے وفاداری کی انتہا کر دیتا ہے پھر اسی مالک کو بے لگام ہونے کے بعد کاٹ بھی ڈالتا ہے پاگل جو ہو جاتا ہے اور سب سے زیادہ نقصان اسی کا ہوتا ہے۔ جو اس پاگل کتے کو گولی مارنے کے بجائے زندہ چھوڑ دیتا ہے۔

پتا ہے بچے! جب نفس عقل پر غالب آ جائے اور جذبات کی بھوک اس کی طاقت بن جائے تو انسان اچھائی برائی، گناہ و ثواب کے سارے فرق مٹا دیتا ہے۔" وہ اپنی ہی دھن میں بولے جا رہی تھیں اور کشمالہ بے خبری میں انہیں دیکھے جا رہی تھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا نفس کے آگے شمائلہ نے گھٹنے

ٹیک دیئے تھے یا طارق محمود نے۔

''نانو! ایک چیز ہوتی ہے فطرت اور ایک چیز ہوتی ہے تربیت، دونوں میں کون طاقت ور ہوتا ہے کس پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔'' وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھی۔

دونوں میں سے کسی پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا جب تک نفس کو کچلنا نہ آئے اور اس آزمائش میں ہر انسان کھرا نہیں اتر سکتا بہت مشکل ہوتا ہے نفس کی شکست کے لیے جذبات کا خون کرنا۔'' نانو کی آنکھوں میں ملال کی پرچھائیاں لہرا رہی تھیں۔ کشمالہ کو خود پر غصہ بھی آیا۔ خواہ مخواہ ان کے زخم کریدنے بیٹھ گئی تھی مگر یہ ضروری بھی بہت تھا۔

''نانو! شمائلہ تو آپ کی بیٹی تھی.....'' اس نے جھجک کر ان کا جملہ مکمل کیا۔

''ہاں، اسی لیے اس کی فطرت جانتی تھی، اس لیے کبھی طارق کو قصوروار ٹھہرانے کا دل نہیں چاہا جانتی تھی میری بیٹی کے نفس کا منہ زور کتا کہاں تک اسے رسوا کرسکتا ہے اس کی ذات کے شفاف شیشے کو گھن لگا سکتا ہے۔'' انہوں نے سرد مہری کی حد کردی تھی بے رحم آواز تلخ لہجہ کشمالہ کو اجنبی لگا تھا۔

نانو اس وقت کسی اور ہی کیفیت میں تھیں، وہ بالکل روبوٹک انداز میں بول رہی تھیں کشمالہ ناسمجھی کے عالم میں ان کو مستقل حیران نظروں سے دیکھ رہی تھی تب ہی وہ مسکرا دیں اس کی مسکراہٹ کے پردے میں کتنے طوفانوں کی آہٹ تھی کشمالہ کو صاف نظر آرہا تھا۔

☆.....☆.....☆

درد کے چاند کو راتوں کا ستم سہنے دو
وقت کی آنکھ سے کچھ اور لہو بہنے دو
اب میرے طرزِ مخاطب سے پریشاں کیوں ہو
میں نہ کہتا تھا کہ یارو! مجھے چپ رہنے دو

اس دن شمائلہ بہت دنوں کے بعد ان سے ملنے آئی تھی دونوں کے درمیان گزشتہ کچھ مہینوں سے سرد مہری کا آغاز ہو چکا تھا۔

ماں اپنی تربیت سے شرمندہ تھی اور بیٹی اپنی فطرت کے بے لگام گھوڑے کے آگے مجبور.....

وہ اسے سمجھانے کا مرحلہ ترک کرتے کرتے ہر بار اپنا ارادہ بدل دیتی تھیں انہیں امید نہیں تھی کہ ان کی اکلوتی اولاد اس حد تک آزمائش کا باعث ہوگی۔

''امی! آپ اپنے الفاظ میں طارق کو سمجھائیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ میں اس کی غلام نہیں ہوں جو خواہ مخواہ پہرے لگاتا ہے۔ بیوی ہوں اس کی۔''

نیوی بلیو کلر کی ساڑھی پر ڈیپ گلے اور بے حد چھوٹی آستینوں والا بلاؤز ان کی لاڈلی اور بے تحاشا خوبصورت بیٹی نے زیب تن کیا ہوا تھا لیکن ستم یہ تھا کہ اس لمحے ان کی اپنی نگاہیں جھکی جا رہی تھیں۔

''تم پر پہرے تو طارق کو بہت پہلے لگانے چاہیے تھے۔ شکر ہے اسے اب عقل آ گئی۔ تم اس حلیے میں غیر مردوں کی نظروں کا امتحان بنو گی تو اس کی غیرت جاگے گی نہیں تو کیا ہوگا۔''

ماں کے لہجے میں بیٹی کے باغیانہ انداز کے لیے کوئی نرمی اور ستائش نہیں تھی انہوں نے جب شمائلہ کو طارق کے سنگ سرخ عروسی جوڑے میں نظر اتار کر رخصت کیا تھا تو اس وقت دل کی گہرائیوں سے دعا کی تھی کہ ان کی سہاگن بیٹی ہمیشہ اپنے شوہر کے لیے یونہی سجتی سنورتی رہے اور ان دونوں کو ایک دوسرے کے قرب میں سکون ملتا رہے۔

مگر یہ کیا، لگتا تھا دعائیں خلاء میں معلق ہو گئی تھیں اور ان کی بیٹی اپنے رنگ و روپ کو گھن لگانے پر تل گئی تھی۔

طارق اور شمائلہ کے درمیان ذہنی فاصلہ تو شادی کے اوائل دنوں سے ہی محسوس ہو رہا تھا لیکن انہیں یہ بھی اندازہ تھا کہ طارق بہت متحمل مزاج اور شمائلہ نادان ہے۔ طارق کا ساتھ اس کی قربت شمائلہ کی

طبیعت کا لاابالی پن ختم کر دے گی مگر ایسا ہوا نہیں تھا۔ طارق کی مردانگی اور شمائلہ کی نسوانیت کے درمیان مفاہمت کے بجائے جنگ کا آغاز ہو گیا تھا۔

وہ دونوں جب ہنی مون سے واپس آئے تھے تو شمائلہ کا منہ پھولا ہوا تھا۔

''امی طارق کا بس چلے تو مجھے ٹاٹ کا پردہ پہنا دے توبہ ہے اس کے ساتھ بازار جانا تو ایک مشکل ہے لڑنے کھڑا ہو جاتا تھا ہر کسی سے۔''

وہ اونچی آواز میں تبصرہ کر رہی تھی بیگم محبّ عالم کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

''اپنی عورت کے معاملے میں حساس مرد ایسے ہی ہوتے ہیں۔'' انہوں نے نرمی سے سمجھایا۔

''مگر مجھے یہ سب برداشت نہیں ہے' اب میں ہر وقت ناک کی سیدھ میں دیکھ کر تو نہیں چل سکتی۔'' وہ ذہنی دوریوں کا اسی دن اعلان کر چکی تھی بیگم محبّ عالم کو یقین تھا کہ جس قدر طارق شمائلہ سے محبت کرتا ہے وقت کے ساتھ اس کی شدت میں اضافہ رشتے کی ڈور کو مضبوط کرے گا لیکن محض چند سالوں بعد وہ ان سے کہہ رہی تھی۔

''مجھے طارق جیسے جذباتی اور شکی آدمی کے ساتھ نہیں رہنا میں اپنی زندگی جینا چاہتی ہوں۔''

بیگم محبّ عالم ساکت نگاہوں سے اپنی بیٹی کا دلکش چہرہ دیکھ رہی تھیں جس کی معصومیت وقت گزرنے کے ساتھ ختم ہو چکی تھی۔

اب وہ ایک پر اعتماد، مضبوط اور بے خوف عورت کا چہرہ تھا۔ جس کی نگاہوں میں فطری حیاء کے بجائے اپنے ہونے کا زعم ہلکورے لے رہا تھا۔

''تمہیں کس نے روکا ہے جینے سے تمہیں اندازہ ہے جو بات تم سوچ رہی ہو وہ ہماری نسلوں میں کبھی نہیں ہوئی تم طارق سے الگ ہونا چاہتی ہو جانتی ہو اس بات کا مطلب.....''

انہیں اپنی آواز ہی اجنبی محسوس ہو رہی تھی شمائلہ کے چہرے پر تو ملال کا کوئی رنگ نہیں تھا۔

''ہاں میں جانتی ہوں اس بات کا مطلب لیکن امی یہ میری زندگی ہے مجھے خود کو نسلوں کی روایتوں پر قربان نہیں کرنا مجھے زندگی ایک بار ملی ہے اور یہ زندگی میں ایک ایسے شخص کے ساتھ بالکل نہیں گزار سکتی جو اپنے آگے سب کو کیڑے مکوڑے سمجھتا ہے جس کے پاس اپنی عیاشیوں کے لیے وقت ہی وقت ہے لیکن بیوی بچہ گھر میں قید ہو کر رہیں۔

جو خود تو ساری دنیا گھومے پھرے اور بیوی صرف وقت ضرورت کام آئے۔

میں نے اس سے کہا تھا مجھے اپنے ساتھ بزنس میں شامل کر لو مجھے کوئی نوکری کرنے دو مگر نہیں.....اس کی غیرت فوراً جاگ جاتی ہے.....''

شمائلہ کے لہجے میں قطعاً کوئی لحاظ اور مروت نہیں تھی۔ کہیں سے بھی نہیں لگ رہا تھا کہ یہ وہی شمائلہ ہے جو نوعمری کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی طارق کے گھن گانے لگی تھی۔

جسے طارق اپنے خوابوں کا شہزادہ لگتا تھا۔

جس کے لیے وہ اپنی ساری کزنز سے جھگڑ پڑتی تھی۔

جو کسی کو بھی طارق کا نام نہیں لینے دیتی تھیں۔

اسے طارق ہمیشہ سے ہی اپنی ملکیت لگتا تھا اور آج وہ کتنے اطمینان سے اس ملکیت سے دستبردار ہونے کو تیار تھی۔ بیگم محبّ عالم نے سر پیٹ لیا تھا۔

یہ تو ان کی تربیت نہیں تھی ان کا خون نہیں تھی۔ یہ تو کوئی اور شمائلہ تھی جو ہر طرح کا لحاظ و مروت ختم کر کے کسی انجانے رشتے کا روپ لیے ان کے سامنے تھی۔

ساڑھی کا پلو ڈھلک کر اس کی گود میں آن گرا تھا جسم کے نشیب و فراز چست بلاؤز سے بے حد نمایاں ہو رہے تھے' ماں کی آنکھیں شرم سے جھک گئی تھیں مگر بیٹی کو حیاء نہیں آئی تھی وہ اسی کروفر کے ساتھ کھڑی ہو گئی تھی۔

''مجھے عاشر کے سکول بھی جانا ہے آپ طارق کو بلا کر اپنے الفاظ میں اسے سمجھائیں۔'' اس نے نفیس سا پرس تھام کر کہا۔

نیوی بلیو ساڑھی کے باریک پلو سے اس کا شفاف بدن مرمری بلب کی طرح جگمگا رہا تھا۔

یہ سب شوہر کے لیے ہوتا ہے اس کے سامنے ہوتا تب تو بہت اچھا تھا مگر گھر سے عاشر کے سکول تک جانے کتنی پُر ہوس نگاہیں..... اس کے وجود کی دلکشی سے سے محظوظ ہوتیں اس کا احساس اسے قطعاً نہیں تھا بیگم محبّ عالم کے لہجے میں تحکم سا آ گیا۔

''بہتر ہے تم سکول جانے سے پہلے اپنی کوئی شال لے لو یا کوئی ڈھنگ کا قمیض شلوار پہن لو' تمہارے کپڑے پریس ہوئے رکھے ہیں۔''

''اوہو امی آپ بھی کیا دقیانوسی باتیں کرتی ہیں' جس سوسائٹی میں آپ کا داماد اٹھتا بیٹھتا ہے وہاں یہ معمول کی بات ہے۔''

''سوسائٹی میں اٹھنے بیٹھنے کا یہ مطلب بالکل نہیں کہ انسان اپنی قدریں بھول جائے اپنے اصل سے شرمندہ ہونے لگے۔ بدلو اپنے آپ کو تمہارے چلن اس گھر کی آبرو ہیں، تمہارے باپ کی شہر بھر میں عزت ہے۔ لوگ ان کے پاس بیٹھ کر تہذیب سیکھتے ہیں اور تم اس تہذیب کو دقیانوسیت کہہ رہی ہو جاؤ آئندہ میرے سامنے یہ رونا مت لے کر آنا، طارق صحیح کر رہا ہے تمہارے ساتھ۔''

انہیں اچانک بہت سارا غصہ آ گیا تھا شمائلہ چند لمحے کھڑی دیکھتی رہی اور پھر پلٹ کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی اور بیگم محبّ عالم کو یوں محسوس ہوا جیسے ان کا دل کھائی میں جا گرا ہو۔

☆.....☆.....☆

یہ تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک دن وہ اپنی بیٹی کے بارے میں یہ سب کچھ سنیں گی انہیں تو طارق سے شرم آ رہی تھی جو سر جھکائے بیٹھا شمائلہ کے کارنامے گنوا رہا تھا۔

''ڈانس اکیڈمی، تمہارا مطلب ہے وہ رقص کی تربیت لے رہی ہے، وہ طوائفوں والے شوق اپنا رہی ہے اور تم اسے لگام دینے کے بجائے مجھ سے آ کر معافی مانگ رہے ہو۔'' وہ الٹا طارق پر ہی برس پڑی تھیں۔

''خالہ جان! آپ بتائیے میں کیا کروں کیسے اسے سمجھاؤں شادی سے اب تک میں نے اس کی ہر چھوٹی بڑی خواہش پوری کی ہے۔

آپ جانتی ہیں اس سے شادی کے بعد ہی میں نے بزنس میں اتنی ترقی کی ہے۔ میں نے اس کے نام پر عالیشان گھر بنوایا، میں اس کے ساتھ ہر جگہ گھومنے گیا، اس نے کہا میں جم جاؤ گی میں نے کہا بالکل جاؤ بندہ فٹ رہتا ہے۔

اس نے کہا مجھے یہ کورس کرنا ہے' وہ کورس کرنا ہے میں نے کبھی نہیں روکا خالہ جان! خالہ جان! آپ جانتی ہیں عاشر بھی من چاہا سودا نہ تھا پھر میں نے دوبارہ تقاضا کیا تو اس نے نہیں مانا۔

میں کیا کروں میں کیسے باندھوں اس رشتے کی ڈور میں، وہ جانے کیوں مجھ سے متنفر ہو گئی ہے۔ ہر بات پر شک ہر بات طنز یہ میرا دل چاہتا ہے خود کہیں گھر سے چلا جاؤں۔'' وہ تو رو دینے والی کیفیت میں تھا۔

بیگم محبّ عالم تھوڑے دن پہلے بیٹی کی شکایتوں کی لمبی فہرست سن رہی تھیں اور آج داماد فریاد کر رہا تھا۔

ان کی تو عقل ہی ماؤف ہو گئی تھی کہ اس سارے تنازعے میں وہ کس کا ساتھ دیں اور کس کو عقل کی راہ دینے کی کوشش کریں۔

طارق کی سب باتیں اپنی جگہ درست غلط شمائلہ بھی نہیں لگتی تھی۔ طارق فطرتاً پوزیسو ضرور تھا یہ تو انھیں بھی پتا تھا لیکن اس کا یہ مطلب بالکل نہیں تھا کہ وہ شمائلہ کو گھر میں قید رکھتا تھا۔

آئے دن تو ان کے گھر میں بزنس گیدرنگز اور پارٹیاں ہوتی رہتی تھیں خود وہ دونوں کہیں نا کہیں جاتے رہتے تھے پھر کہاں سے وہ شکی اور ظالم تھا۔ یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی اس نے کبھی شمائلہ پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ الٹا شمائلہ کی عادت تھی کہ وہ غصے میں آ کر چیزیں توڑنا شروع ہو جاتی تھی۔

طارق کے بازو اور سینے پر اکثر شمائلہ کے ناخنوں کے نشانات ہوتے تھے جو اس بات کا ثبوت ہوتے تھے کہ وہ اکثر اس پر خونخوار بلی کی طرح جھپٹ پڑتی تھی۔

طارق اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے اس کو بازوؤں میں سمیٹ لیتا تھا۔ اسے رونے نہیں دیتا تھا۔ یہ ساری عادتیں تو طارق کی شخصیت کا حصہ تھیں۔ طارق کو انہوں نے خود پالا تھا۔ اتنا تو وہ جانتی تھیں کہ آگ اور پانی کا یہ ملاپ کس کو اذیت سے دوچار کرتا ہوگا۔

''وہ کہتی ہے میں نوکری کروں گی..... اب آپ ہی بتائیے خالہ جان! میں کس کے لیے یہ سب کر رہا ہوں دن رات کی محنت اپنے بیوی بچے کو سکھ دینے کے لیے ان کی ہر خواہش پوری کرنے کے لیے ہی تو کر رہا ہوں لیکن اسے لگتا ہے کہ مجھے اس کی ترقی سے جیلسی ہے۔''

وہ بے بسی سے اپنا سر ہاتھوں میں جھکڑ کر بولا۔ بیگم محبّ عالم تو خاموش اس کی صورت تک رہی تھیں۔

اتنا سب کچھ ہو چکا تھا اور ہونے جا رہا تھا، انہیں آج پتا چلا تھا طارق آج پہلی بار اتنا کھل کر بولا تھا ورنہ شمائلہ تو آئے دن شکایتیں کرتی رہتی تھی۔ جس پر طارق دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ ٹالنے والے انداز میں کہتا تھا۔

خالہ جان! آپ کو پتا تو ہے یہ مشرق اور مغرب کی جوڑی ہے ایک دوسرے کو اتنی آسانی سے جیتنے تو نہیں دیں گے۔''

''مگر طارق..... رشتے ہار جیت کے جذبے سے نہیں اپنائیت اور ایک دوسرے کی خوبیوں وفاؤں کو تسلیم کرنے کے جذبے سے مضبوط ہوتے ہیں ورنہ کھوکھلے رشتے تو بوجھ بن جاتے ہیں۔''

طارق اکثر ان کی باتوں پر ایک گہری آہ بھر کر خاموش ہو جاتا تھا جس پر انہیں محسوس ہوتا تھا وہ ان کی بات کو سمجھنا ہی نہیں چاہتا لیکن سمجھ میں تو آج آیا تھا کہ وہ جس اذیت سے گزرتا تھا اس میں دوسرے کی بات خواہ مخواہ کا ڈھکوسلا ہی لگتا ہے۔ انہوں نے بے اختیار اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی تھی۔

''دیکھو طارق! تم میرے بیٹے ہو میں نے شمائلہ کو پیدا کیا ہے اور تمہیں پالا ہے میں تم دونوں کے بارے میں اتنا جانتی ہوں نا تم لوگ خود بھی اس سے باخبر نہیں ہو مائیں اولاد کے اندر اتر جاتی ہیں میں نے کبھی شمائلہ سے بے جا لاڈ نہیں کیا اور نہ ہی اب اس کی حوصلہ افزائی کرتی ہوں۔

میں جانتی ہوں اس کی فطرت میں سرکشی ہے اسے وہ راستہ بہت پسند آتا ہے جس پر چلنا دشوار ہو جسے احتیاطاً چھوڑ دینا چاہیے۔''

''خالہ جان! میں نے ان سارے راستوں پر اس کے ساتھ چلنے کی کوشش کی ہے اس گرنے نہیں دیا ہے۔ آگے بڑھ کر سہارا دیا ہے محض اس لیے کہ وہ میری احتیاط کو میری کمزوری نہ سمجھے۔''

وہ بے ساختہ ان کی بات کاٹ کر بولا اب جبکہ پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا تو یہ ساری باتیں بے معنی لگ رہی تھیں۔

''تمہیں پتا ہے ناں ان ساری باتوں کا اگر اس کے باپ کو پتا لگ جائے تو وہ اس کے ساتھ ہم دونوں کو بھی گولی مار دیں گے۔'' وہ عجیب مشکل میں گھر گئی تھیں۔

''میں جانتا ہوں اسی لیے میں نے کوشش کی تھی کہ ان سارے معاملات کو خود ہینڈل کر لوں میں نے تو یہ بھی سوچا تھا کچھ عرصے کے لیے لندن چلا جاتا ہوں شمائلہ اور عاشر کو لے کر لیکن پھر آپ دونوں بھی تو اکیلے ہیں۔''

''ہماری فکر تم بالکل نہ کرو ہم اکیلے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ تمہارے گھر کا تماشا بنتا رہے تم جس طرح ہو سکے اپنا گھر بچاؤ، اپنی خوشیوں کو ہماری فکر میں خراب مت کرو۔

کیا ہو جائے گا بیٹیاں بیاہ کر اکثر ملک سے باہر چلی جاتی ہیں، بیٹے الگ گھر لے لیتے ہیں، وہ ماں باپ مر تو نہیں جاتے' زندہ رہتے ہیں نا اور ہم دونوں تو ابھی اپنا سب کچھ خود کر سکتے ہیں ہماری فکر چھوڑ دو اور اپنے بیوی بچے کو اس ماحول سے نکالو سب سے بہترین حل یہ ہی ہے کہ وہ فی الحال اس ماحول سے دور چلی جائے بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔''

بیگم محبّ عالم کے چہرے پر اطمینان پھیلنے لگا تھا طارق نے ایک گہری سانس لے کر انہیں دیکھا اور کھڑا ہو گیا۔

''اب آپ پریشان مت ہوں آپ بھی تو ہر چیز دل سے لگا کر بیٹھ جاتی ہیں۔ آپ بس عاشر کو اپنے پاس بلوا لیا کریں۔ ہمارے جھگڑوں میں اس کی شخصیت تباہ ہو رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اسے آپ کی تربیت اور محبت سمیٹتی رہے.....''

''اونہہ میری تربیت اور محبت میری اپنی اولاد نے لاج تو رکھی نہیں اس کی اولاد پر کیا اثر کرے گی خیر اللہ کی جو مرضی عاشر کو سکول کے بعد اب میرے پاس چھوڑ جایا کرو۔'' ان کے چہرے پر تھکن کے آثار بہت واضح تھے۔ طارق کو اب ان کی فکر ستا رہی تھی اس نے ماں کے روپ میں اپنی خالہ کو دیکھا تھا وہ انہیں کبھی دکھ نہیں دے سکتا تھا مگر قسمت درپے تھی کہ ان کی سگی اولاد ان کے لیے آزمائش بنی رہے۔

صرف دو دن کے بعد انہوں نے سنا تھا کہ.....

شمائلہ منیر کمال کے ساتھ لاہور چلی گئی ہے، طارق کے روکنے، منع کرنے اور پابندی لگانے کے باوجود.....

(پیار سے سمجھانا تو بے سود ٹھہرا تھا)

منیر کمال کی اکیڈمی کے لڑکے لڑکیاں لاہور کے کسی کلچرل شو میں حصہ لے رہے تھے اور شمائلہ انہیں لیڈ کر رہی تھی ایک ہفتے کے اس پروگرام میں مختلف نوعیت کے رقص اور ڈرامے پیش ہونا تھا۔ جن میں منیر کمال پیش پیش تھا۔

شمائلہ کو پہلی بار اپنے آپ کو ثابت کرنے کا موقع مل رہا تھا۔ شادی شدہ اور ایک بچے کی ماں ہونے کے باوجود وہ منیر کمال کے پرانے شاگردوں کو پیچھے چھوڑ گئی تھی اس کا لچک دار جسم اور تازہ ادا سے بھرپور انداز ابا قاعدہ اعضاء شاعری کا عکاس ہوتے تھے۔

منیر کمال کی ستائش بھری نگاہیں، ساتھی فنکاروں کے تعریفی جملے اور گلیمر سے بھرپور زندگی نے شمائلہ کو وہ سب کرنے پر مجبور کر دیا تھا جس کا محبّ عالم کے گھر میں تصور تک نہیں تھا۔

انہیں پہلی بار پتہ چلا تھا کہ ان کے گھر کی رحمت اب عوامی نگاہوں کی ملکیت ہو گئی تھی۔

وہ ساکت سے اپنی رفیق حیات کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ جن کے چہرے پر زلزلے کے آثار اس قدر واضح تھے کہ چند لمحوں کے لیے ان کے لب ہل ہی نہیں سکے۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے شمائلہ اتنا بڑا قدم اٹھا لے، اس کی ہمت کیسے ہوئی شوہر کی رضا کے بغیر گھر سے باہر نکلنے کی۔"

"اس نے ائیر پورٹ سے فون کیا ہے طارق کا تو آپ کو پتا ہے شمائلہ نے اس کی زندگی اجیرن کی ہوئی ہے اور وہ کچھ بولتا ہی نہیں۔"

انہیں اس وقت طارق ہی کمزور لگا تھا۔

شمائلہ سے تو شاید نفرت سی محسوس ہو رہی تھی۔

"نہیں طارق کا کوئی قصور نہیں، عیب ہماری اولاد میں ہے اسے کیوں دوشی ٹھہراتی ہو..... میں بات کرتا ہوں شمائلہ سے اسے فوراً واپس آنا ہوگا ورنہ اس کے بعد اس کی ہماری زندگیوں میں کوئی جگہ نہیں۔"

وہ گرجتے برستے فون کی طرف بڑھ گئے تھے۔ دوسری طرف دروازے پر طارق محمود عاشر کے ساتھ کھڑا تھا۔

❁ ❁

ناول **خواب خواہش اور زندگی** ابھی جاری ہے۔ مزید واقعات اگلے صفحات میں پڑھیں۔

قسط نمبر 6

شمائلہ واپس نہیں آئی تھی البتہ اس ہفتے کے سارے اخباروں میں لاہور کے کلچرل شو کو نمایاں کوریج ملی تھی۔ مختلف میگزینز میں شمائلہ اور اس کا گروپ سرورق پر شائع ہوا تھا یہ تمام میگزین اور اخبارات محبّ عالم کی لائبریری میں رکھے تھے، طارق ان کے سامنے سر جھکائے بیٹھا تھا۔

''میں باضابطہ طور پر اپنی اس بیٹی کی سرپرستی سے دستبردار ہوتا ہوں۔ تم جو فیصلہ کرو ہم نہیں روکیں گے۔'' ان کی نظریں ایک اسٹیج رقاصہ کے نمایاں خدوخال پر جمی تھیں۔ جو چوڑی دار پاجامے اور چست پشواز میں خوب واضح ہو رہے تھے اور ستم بالائے ستم اس کے پاؤں میں گھنگھرو کی پازیب بھی بندھی ہوئی تھی۔

رشتوں کی بیڑیاں توڑ کر عیاشی کے گھنگھرو باندھ کر ہر خاص و عام کو محظوظ کرنے والی یہ حسین رقاصہ کوئی اور نہیں محبّ عالم کی بیٹی اور راجہ طارق محمود کی من پسند بیوی تھی۔

انہوں نے اگلے لمحے تمام اخبارات اور میگزینز تار تار کر دیے تھے۔ طارق نے بمشکل انہیں روکا تھا۔ ورنہ شاید وہ اپنے آپ کو بھی نقصان پہنچا بیٹھتے۔

شمائلہ اس کلچرل ایونٹ میں شرکت کے بعد خوش و خرم واپس آئی تھی راجہ طارق محمود نے تو اپنے گھر کے دروازے کھول دیے تھے لیکن محبّ عالم نے اپنی ذات تک آنے والے ہر راستے کو بند کر کے گوشہ نشینی کی راہ اختیار کر لی تھی۔

اب ان کے دروازے شائلہ کے لیے ہی نہیں ان کی علمی وادبی شخصیت سے فیض اٹھانے والے ہر بندے کے لیے بند ہو چکے تھے۔

☆.....☆.....☆

طویل مشقت کے اختتام پر ان دونوں کے سر جھکے ہوئے تھے اور وہ خالی ہاتھ گھر میں داخل ہوئے تھے سب کی نگاہیں گویا ان کی منتظر تھیں صوفیہ کے چہرے پر تھکن سے زیادہ مایوسی اور پریشانی نمایاں تھی بلکہ سفیر اب اس ساری صورتحال سے بیزار نظر آ رہا تھا۔

آدھی رات کا وقت تھا اور گھر کا ہر فرد جاگ رہا تھا کچن میں کھانا پتیلیوں میں رکھا تھا اور روٹیوں کا ہاٹ پاٹ خالی تھا نہ تو کسی نے پکانے کی ہمت کی تھی نہ کسی کو بھوک لگی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے آج شام ہی اس گھر سے کسی نے رخت سفر باندھا تھا۔

صوفیہ دھیرے دھیرے پانی کھ گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے انہیں بتا رہی تھی۔

''ہم نے سارے ہاسپٹلز دیکھ لیے گورنمنٹ، سیمی پرائیویٹ سب ہی جگہ گئے کہیں کچھ پتا نہیں چلا۔''

''وہ کہیں ہو گی تو پتا چلے گا..... نعمان ٹھیک کہتا ہے یہ اظہر کے علاوہ کسی کا کارنامہ نہیں ہو سکتا ہمیں اظہر کے خلاف رپورٹ کرنی چاہیے۔''

''بے وقوفی کی باتیں مت کرو پولیس میں رپورٹ کا مطلب ہے اپنے ہاتھوں سے اپنے اشتہار لگا دیں۔ اگر وہ نا ہنجار اپنی خوشی کے ساتھ اس کے پاس گئی ہے تو پولیس کیا تیر مار لے گی۔

آج کل تو ہر اخبار، ہر چینل ایسے چٹخاروں کی تلاش میں ہوتا ہے کل کو وہ کسی این جی او کا سہارا لے کر ہمارے خلاف کھڑی ہو جائے گی تب ہم کس کو الزام دیں گے بتاؤ تم لوگ.....''

تایا نے پہلی بار دھیمے اور ہارے ہوئے لہجے میں قدرے عقل کی بات کی تھی۔

''پھر تو میری مانیں اظہر کے گھر والوں سے بات کریں..... اور اسے واپس لا کر عزت سے

رخصت کر دیں، کالک تو مل چکی اب مزید کیا بھلائی سوچیں ہم اس کے لیے۔"

تائی نے بھی لقمہ ضروری سمجھا تھا فہیم شاہ کے وجود میں بھی جنبش ہوئی تھی چاچی نے آس طلب نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

"وہ ہمارے لیے مر چکی ہے اس کے لیے رونے اور اس کی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں آج نہیں تو کل لوگوں کو پتا چل ہی جائے گا کہ اس گھر میں کیا تماشا ہو چکا ہے ہم میں سے کوئی اظہر کے گھر والوں سے بات نہیں کرے گا البتہ اظہر کی زندگی کی خیر نہیں اب اس کا اور سعدیہ کا جنازہ ایک ساتھ اٹھے گا یہ میرا آپ سب سے وعدہ ہے۔"

فہیم شاہ کی غیرت وحمیت اتنے خطرناک انداز میں بیدار ہوئی تھی کہ صوفیہ ہونق سی انہیں دیکھتی رہ گئی تھی۔

"اللہ کرے سعدیہ تم جہاں رہو محفوظ و مامون رہو اپنے ظالم گھر والوں کے ہاتھ کبھی نہ لگو....."

اس نے صدق دل سے دعا مانگی اور چاچی کے پاس چلی آئی جو دھواں دھار رو رہی تھیں۔

☆.....☆.....☆

سعدیہ کی گمشدگی کو ایک دن گزر گیا تھا چچی تو پچھاڑیں کھا رہی تھیں البتہ گھر والوں کے چہروں پر کمال کا سکتہ طاری تھا۔

کوئی کسی سے بات کرنے، مشورہ دینے یا پھر ہمدردی کرنے کا روادار نہیں تھا پھر بھی یہ بات گھر کی چار دیواری کا حصار توڑ کر باہر نکل گئی تھی۔

اور لوگوں کو ایسے موقع پر ہمدردی جتانے کا خاص شوق ہوتا ہے سو اس شوق کی تکمیل کے لیے خواتین نے گھر میں جھانکنا شروع کر دیا تھا اور پہلے تو دبے لفظوں میں استفسار کیا تھا پھر چچی کی غمناک صورت اور بہتے آنسوؤں نے ان کی سرگوشی کو اونچے سروں میں بدل دیا تھا۔

''کوئی تو بات ہے جو تم لوگ ہم سے چھپا رہے ہو دیکھو محلے داری کا معاملہ ہے کل کلاں بات اچھلے گی تو سارے جگ کو پتا چلے گا ہم بھی بیٹیوں والے ہیں عزت تو سب کی سانجھی ہوتی ہے۔

صفدر کے ابا کہہ رہے تھے سارا محلہ تم لوگوں کے ساتھ ہے بس اس موئے لڑکے کا پتا بتا دو جس کی پٹی پڑھ کر سعدیہ ایسی غلطی کر بیٹھی۔''

خالہ زیتون کو بظاہر کچھ نہیں پتا تھا مگر باخبر اتنی تھیں ان سے کوئی بات چھپی ہوئی نہیں تھی۔

ان کا چہرہ تو غم واندوہ کی تصویر بنا ہوا تھا لیکن آنکھیں پُر اسرار انداز میں گھر کے کونے کھدرے تلاش کر رہی تھیں گویا سعدیہ کو قتل کر کے کہیں دفنا دیا گیا ہو۔

چچی نے ایک تلملاتی ہوئی نگاہ خالہ زیتون پر ڈالی جن کو وہ عام حالات میں مجبوراً ہی سلام کا جواب دیتی تھیں۔

اس وقت وہ ہمدردی کی آڑ میں تاک تاک کر حملے کر رہی تھیں اور چچی کبھی ان کو تو کبھی گھر کے داخلی دروازے کو گھورنے لگتیں۔

''دیکھو زیتون محلے داری کا معاملہ ہم بھی جانتے ہیں سعدیہ کوئی ہم سے پوچھ کر نہیں گئی جو ہمیں پتا ہوگا کہ وہ اس وقت کہاں ہے اور کس کے ساتھ ہے۔''

''یہ بات تم بھی جانتی ہو اچھی طرح، جوان اولاد کو گھر میں قید کر کے نہیں رکھا جا سکتا میں نے تمہاری بیٹیوں کی زطان بھی دیکھی ہے زیادہ اس مسئلے کو اچھالو گی تو سوچ لو گند تمہارے گھر تک بھی جائے گی۔''

تائی کو لحاظ اور مروت سے کوئی سروکار نہیں تھا وہ خالہ زیتون کی بیٹیوں کے کرتوت بھی کہہ دیتیں تو کیا فرق پڑتا۔

خالہ زیتون ان کو اچھی طرح جانتی تھیں بلکہ دونوں خواتین ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتی تھیں سالہا سال ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کے باوجود دلوں کی عداوت موقع ملتے ہی ضرور عیاں ہو جاتی تھی۔

دونوں گھروں کی دیواریں ملی ہوئی ہونے کی وجہ سے کچھ چھپا بھی نہیں رہتا ہے۔اس لیے ہمدردی اور پڑوسیوں کے حقوق کی آڑ میں ایک دوسرے کے لتے لینے کا موقع ہاتھ سے کوئی جانے نہیں دیتا تھا۔

''آئے ہائے نسرین! تم تو صدا کی میری دشمن ہو میری بیٹیوں کا کیا قصور جو انہیں گھسیٹ رہی ہو تمہارا گھر کا معاملہ ہے تم خود نبٹو ہمیں کیا ضرورت ہے تم سے ہمدردی کرنے کی۔''

وہ کپڑے جھاڑ کر کھڑی ہو گئیں ان کے چہرے پر خطرناک قسم کے تاثرات تھے چچی کا دل غیر معمولی انداز میں دھڑکنا شروع ہو گیا انہیں یقین تھا محلے کے جس گھر کو کچھ نہیں بھی پتا ہو گا وہاں تھوڑی دیر کے بعد سعدیہ کے نام کا ان کے عزت دار گھر کا ریکارڈ بجنا شروع ہو جائے گا۔

یہ محلّہ اور اس کی تنگ راہداریوں والے گھر برسوں سے ایسے ہی تھے نہ کسی نے کشادہ گھر بنانے کی کوشش کی تھی نہ ہی سوچ بدلنے کی۔ایک دوسرے کے گھر کی خبر رکھنے والے یہ تمام محلے دار برے نہ سہی مگر اچھے بھی نہیں تھے۔

ان کے ساتھ بنا کر رکھنے کے لیے حقیقتاً دل پر پتھر رکھنا پڑتا تھا اور اس وقت تو معاملہ بھی ایسا تھا کہ سارے پتھر اس گھر کو ہی سنبھال رکھنے تھے جو آ چکے تھے اور جو آنے والے تھے۔

چچی نے آگے بڑھ کر خالہ زیتون کا ہاتھ تھاما!

''خالہ غصہ کیوں ہوتی ہو کیا تمہارے گھر کا معاملہ ہم سے الگ ہو سکتا ہے جو تم ہمیں الگ کر رہی ہو ہم تو اتنے پریشان ہیں کہ کچھ سمجھائی نہیں دے رہا کیا کریں۔

معاملہ بیٹی کا ہے تم بھی جانتی ہو کسی سے کہہ سکتے ہیں نہ مدد مانگ سکتے ہیں۔''

وہ شرمسار سی تھیں خالہ زیتون کے سینے پر اوس کے قطرے پڑنے لگے۔

''تو یوں صاف صاف کہو نا کہ سعدیہ گھر سے چلی گئی ہے یہ تمہاری بھاوج تو پہیلیاں بجھوانے کے لیے بیٹھی ہے۔''

انہوں نے ایک کٹیلی سی نگاہ تائی پر ڈالی جو اپنے پان دان میں سے چھالیہ تلاش کر رہی تھیں۔

''میرے منہ نہ ہی لگو تو بہتر ہے۔''

وہ بھی سوا سیر تھیں خالہ، زیتون اس بار پُر طیش انداز میں باہر نکلنے کے بجائے چچی کے پاس جم کر بیٹھ گئی تھیں۔

''اب ذرا کھل کر بتاؤ کب گئی ہے اور کون مردود ہے جس نے یہ ہمت کی۔''

انہیں پوری کہانی جاننے سے دلچسپی تھی چچی بے بسی سے اپنے بال نوچ کر رہ گئیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا خود پر مٹی کا تیل ڈال کر آگ لگا لیں کم از کم ان کھوج لگاتی نگاہوں سے تو چھٹکارا ملتا۔

''خالہ زیتون وہ کسی کے ساتھ گئی نہیں ہے بس ناراض ہو کر اپنی لاہور والی خالہ کے گھر چلی گئی ہے ابھی ان کا فون آیا تھا اصل میں ہماری سعدیہ ضدی بھی تو بہت ہے نا، چچا نے اسے کسی بات پر ڈانٹ دیا تھا۔''

اس سے پہلے کے چچی کچھ کہتیں صوفیہ نے اچانک اتنے اعتماد اور روانی سے یہ ساری کہانی بیان کی تھی کہ ایک لمحے کو تائی بھی گڑ بڑا کر رہ گئیں۔

صوفیہ انہیں نگاہوں ہی نگاہوں میں خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے چچی کے پاس اور خالہ زیتون کے سامنے پورے اہتمام سے بیٹھ گئی تھی۔

چچی کی نگاہوں میں سوال کے ساتھ حیرت بھی تھی وہ نظر انداز کر گئی۔

''آپ اپنی بہن کو فون کر لیں..... وہ بھی ناراض ہو رہی تھیں چلیں ابھی۔'' اس نے انہیں ہاتھ سے پکڑ کر اٹھایا۔

خالہ زیتون حق دق سی صورتحال کو بدلتے ہوئے دیکھ رہی تھیں وہ تو کسی دلچسپ مزے دار چٹخارے دار کہانی کی تلاش میں بیٹھی تھیں لیکن یہاں صوفیہ نے تو لمحوں میں ان کے اشتیاق پر پانی پھیر دیا تھا۔

انہیں یہ بھی یقین تھا کہ صوفیہ کی باتوں میں اتنی صداقت نہیں ہے لیکن لمحے ہاتھ سے نکل گئے تھے صوفیہ کسی جلاد کی طرح محسوس ہو رہی تھی انہیں مجبوراً اس جگہ سے اٹھنا پڑا جہاں تھوڑی دیر پہلے وہ پھسکڑا مار کر بیٹھی تھیں۔

صوفیہ کی نگاہوں میں صاف صاف لکھا تھا کہ وہ یہاں سے چلی جائیں سو اب انہیں جانا ہی تھا کیونکہ تائی اور چچی بھی ان کی طرف متوجہ نہیں تھیں چچی کے چہرے ہر تو ہلکا سا اطمینان ہلکورے لے رہا تھا جبکہ تائی متجسس انداز میں صوفیہ کو دیکھ رہی تھیں۔

جیسے اس کے لفظوں کی صداقت کو پرکھ رہی ہوں۔

خالہ زیتون کے جانے کے بعد صوفیہ نے ان دونوں کو مخاطب کیا تھا۔

''میری یہ سمجھ میں نہیں آتا آپ ہر آئے گئے کو کیوں منہ لگا لیتی ہیں سعدیہ ہے نہیں ہے یہ ہمارے گھر کا مسئلہ ہے ہمیں کوئی ضرورت نہیں کسی دوسرے کے سامنے صفائیاں پیش کرنے کی۔''

وہ ٹھیک ٹھاک غصے میں تھی۔

''لگانا پڑتا ہے بی بی! ہم محلے والوں سے کٹ کر نہیں رہ سکتے کل کو یہ خبر گھر سے باہر نکلتی ہے اور ہم صفائیاں ہی دیتے رہے تو محلے والے ہمارا ناطقہ بند کر دیں گے ہمارا جینا حرام کر دیں گے خاندان برادری کے کچھ اصول ہوتے ہیں سب کو ساتھ لے کر چلنا پڑتا ہے۔''

تائی نے تو اچھا خاصا لیکچر دے دیا تھا صوفیہ کے چہرے پر بے شمار شکنیں نمودار ہونے لگیں اسے اس گھر کے اصول وضابطے سمجھنے کے لیے ہی یہ سارا بن باس مول لینا پڑا تھا اور یہ نئے دن اس پر انکشاف ہوتا تھا کہ اس گھر میں راحت بیگم طویل عرصے تک کیوں نہیں رہ پائیں۔

''معذرت کے ساتھ تائی! آپ جس دور کی باتیں کرتی ہیں اسے گزرے صدیاں بیت گئیں کل اس گھر میں سعدیہ کو مارنے کا فیصلہ ہو رہا تھا آج محلے والوں کی پنچایت کی باتیں ہو رہی ہیں کیا آپ

لوگوں کی اپنی کوئی زندگی بھی ہے یہاں کسی کو اپنی مرضی سے جینے کا حق نہیں۔"

اس نے آخری لمحے میں خاص طور پر چچی کو دیکھا تھا جن کی بیٹی بے جا ضد اور گھٹن زدہ ماحول سے فرار حاصل کرنا چاہتی تھی جسے اس گھر میں رہنا اس لیے مشکل لگتا تھا کہ نہ ماں نہ باپ کوئی بھی اس کا اچھا دوست نہیں تھا۔

تائی کو اس لمحے وہ بالکل اپنی ماں جیسی لگی تھی زندگی بدلنے کی باتیں کرنے والی یہ الگ بات کہ وہ عورت زندگی کی سازش کا شکار ہوگئی۔ زندگی بدلی ضرور مگر محرومیوں کے ساتھ۔

"اچھا چھوڑو ان باتوں کو تم یہ بتاؤ سعدیہ نے تمہیں فون کیا ہے۔" چچی کی آنکھوں میں موہوم سی امید تھی انہیں بھی لگتا تھا سعدیہ ضد میں ہی آ کر کہیں چلی گئی ہے۔

"سعدیہ نے مجھے تو فون نہیں کیا لیکن مجھے یقین ہے وہ ضرور فون کرے گی میں تو ان خاتون کی باتوں سے بے زار ہوگئی تھی۔ ہمارے لیے زندگی موت کا مسئلہ بنا ہوا ہے اور انہیں تفریح سوجھ رہی ہے۔ اس لیے میں نے ان کو بھگا دیا۔

آپ پلیز لوگوں کو کہانی سنانے مت بیٹھ جائیں یہ لوگ تماشا دیکھنے کے شوقین ہوتے ہیں انہیں کسی سے ہمدردی نہیں ہوتی پلیز۔"

اس کی آنکھوں کی گیلی سطح پر التجا ہلکورے لے رہی تھی ملگجے سے نیوی بلیو سوٹ میں تھکے تھکے چہرے والی صوفیہ چچی کو اس لمحے اپنی سب سے بڑی ہمدرد محسوس ہوئی۔

وہ اتنے سارے دنوں سے یہاں تھی انہوں نے کبھی اس پر توجہ کی نظر نہیں ڈالی تھی صبح اکثر وہ اس کے لیے ناشتا بنانا بھول جاتیں۔

جب وہ آئی تھی تو انہیں بھی اس کا یہاں آنا بہت بوجھ محسوس ہوا تھا۔

لڑکوں کے گھر میں لڑکی ذات کا بوجھ..... خواہ مخواہ کی ذمہ داری ان کے دونوں بیٹے بھی بڑے ہو

رہے تھے۔

چچی نے بے اختیار آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔

''اللہ نے راحت کو کتنی سمجھدار بیٹی دی ہے۔''

''آپ ٹھیک کہتی ہیں لیکن میری ماں نے اپنی سمجھداری میرے اندر نہ ڈالی ہوتی تو کوئی فائدہ نہیں تھا میرا دنیا میں آنے کا۔''

اس کا چہرہ مبہم سی مسکراہٹ سے چمکنے لگا تائی کے لیے محبت اور لگاوٹ کا یہ مظاہرہ بالکل بھی قابلِ قبول نہیں تھا سو مداخلت لازمی تھی۔

''بتا دیا ہوگا تم نے اپنی ماں کو سعدیہ چلی گئی خوش ہوگئی ہوگی۔''

پان کی تازہ گلوری منہ میں رکھتے ہوئے انہوں نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا تو صوفیہ کے چہرے پر طنزیہ سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

''میری ماں کے پاس خوش ہونے کے لیے اور باتوں کی کمی ہے کیا اور ویسے بھی ان کی سوچ اتنی گھٹیا نہیں ہے۔''

وہ پہلے بھی کسی کو معاف نہیں کرتی تھی لیکن ان کے درمیان رہ کر مزید منہ پھٹ ہوگئی تھی۔ ہر بات کا نپا تلا جواب حاضر ہوتا تھا۔

''ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو اسے بھلا کیا کمی خوشیوں کی ہم تو ندیم کو سمجھا سمجھا کر تھک گئے تھے رشتہ داری اپنے جیسے لوگوں میں کرو ویسے بھی عورت کا دماغ اگر ساتویں آسمان پر ہو تو مرد کی کوئی اوقات ہی نہیں ہوتی ہے وہ بے چارا گھن چکر بن کر رہ جاتا ہے۔''

بہت دنوں کے بعد انہوں نے ماضی کی دیوار پر ہتھوڑا سا مارا تھا اور صوفیہ اس سوراخ میں سے دوسری طرف دیکھنے کی کوشش کرنے لگی تھی تبھی چاچی نے اس کا ہاتھ تھام کر اندر کی جانب قدم بڑھا دیے تھے۔

''کبھی تو خاموش رہا کریں آپ لوگوں کے اسی گھمنڈ نے آج یہ دن دکھایا ہے۔''

صوفیہ نے جاتے جاتے کہا تھا تائی کو تو خیر کرنٹ لگا ہی تھا چچی کو بھی اس کے لفظوں کی سنگینی کا احساس شدت سے ہوا تھا۔

''تو کیا سعدیہ کسی مکافات عمل کی لپیٹ میں آ گئی؟''

کوئی نامعلوم سا احساس ان کے دل میں نیزے کی طرح گڑ گیا تھا۔

انہوں نے کن انکھیوں سے صوفیہ کے چہرے کو دیکھا وہاں کوئی تجسس کوئی بے چینی نہیں تھی۔ وہ بس سعدیہ کے لیے پریشان تھی۔

یہ بے چینی تو ان کے اپنے اندر بڑی سرعت سے جاگی تھی۔ انہیں بہت کچھ یاد آ رہا تھا راحت کے وہ الفاظ بھی..... جب اس نے صوفیہ کے مستقبل کے لیے اس گھر کے ہر فرد کو واسطہ دیا تھا کہ وہ اسے ندیم شاہ کی زندگی سے الگ نہ کریں۔ لیکن ان کی کسی نے نہیں سنی تھی اور ندیم شاہ.....!

☆.....☆.....☆

رات کا جانے کون سا پہر تھا جب وہ اپنے تر بتر وجود کے ساتھ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی بجلی کے بریک ڈاؤن یا کسی اور وجہ سے اس کے کمرے کا اے سی بند ہو چکا تھا۔

وہ خاصا موٹا کمبل لیے بغیر سوتی نہیں تھی سو اس وقت.....

نیلے رنگ کا نائٹ ڈریس اس کے پسینہ پسینہ جسم کے ساتھ لپٹ چکا تھا۔

اس نے کمبل ایک طرف پھینکتے ہوئے سائیڈ ٹیبل پر رکھے لیمپ کو روشن کرنے کی کوشش کی مگر روشنی ہوتی تو اس کی آنکھیں کھلتیں نا۔

کبھی کبھی باہر کی روشنی کو بھی اندر کی تاریکی نگل لیتی ہے اور وہ تو اب برملا اس بات کا اقرار کرتی تھی کہ اس کی روح اتنی تاریک ہو چکی ہے کہ ڈراؤنے خوابوں کے علاوہ کچھ نہیں نظر آتا۔

اوہ ہاں.....ڈراؤنا خواب.....ابھی کسی خواب کی وجہ سے تو اس کی آنکھ اچانک کھل گئی تھی ورنہ وہ اتنا کچھ کھا پی کر سوئی تھی کہ آنکھ کھلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا مگر خواب اتنا بھیانک نہیں..... بلکہ انوکھا تھا کہ وہ تسلسل کے ساتھ اس کو دیکھتے رہنے کی کوشش میں بے زار ہو گئی تھی۔

اس نے ایک گہری سانس لے کر سائیڈ ٹیبل پر پھر ہاتھ مارا، موبائل کی اسکرین روشن کر کے اس نے سگریٹ سلگانے کے لیے لائٹر تلاش کیا۔

لائٹر وہاں ہوتا تو ملتا اس نے سگریٹ کا پیکٹ دیوار پہ دے مارنے کے بعد اپنا سر بیڈ کراؤن پر ٹکا دیا تھا۔

سونے سے پہلے دو پیگ پینے کے باوجود اس کے سر میں شدید درد اور ذہن بوجھل ہو رہا تھا۔ اب تو سکون آور ادویات بھی کام نہیں کرتی تھیں۔

اے سی ابھی بھی بند تھا شاید کسی نے جنریٹر بھی آن نہیں کیا تھا اس کا دل چاہا ابھی اٹھ کر پورے کمال ولا کو آگ لگا دے۔

آگ کا مقابلہ تو آگ ہی کر سکتی ہے۔

اس کا دل چاہا کہ کھولتے ہوئے دماغ کو بیڈ کراؤن کے ساتھ پورے شدت سے ٹکرا دے مگر وہ فطرتاً اتنی بزدل اور کمزور ہو چلی تھی کہ اب اسے اس طرح کی حرکتوں سے بہت خوف محسوس ہوتا تھا۔

وہ اپنے زخمی ہونے سے، بیمار ہونے سے اور شاید مرنے سے بھی بہت ڈرنے لگی تھی ورنہ راجہ طارق محمود کی دلربا بیوی کی حیثیت سے وہ بارہا اپنا سر دیوار سے ٹکرا دیتی تھی تا کہ وہ اپنی ساری مصروفیات ترک کر کے صرف اس کا سر اپنی گود میں رکھ کر بیٹھا رہے وہ اپنی ضد منوانے کے لیے یا غصے کا اظہار کرنے کے لیے بڑے آرام سے تیز چھری اپنی نبض ہر رکھ لیتی تھی تب طارق محمود بے قرار ہو کر اسے سمیٹ لیتے تھے اور پھر اس کو اپنی بانہوں میں چھپا کر چپکے سے سرگوشی کرتے تھے۔

جو دل چاہے کرو خود کو تکلیف مت دیا کرو۔ میری جان نکل جاتی ہے۔

نیند کی گولیاں کھانے کی دھمکی دینے کے علاوہ چھت سے کودنے کی دھمکی دینا تو معمول کی بات تھی۔ یہ تو طارق محمود کا ہی حوصلہ تھا کہ وہ اس کے ہر عمل کو سہہ جاتے تھے یہ سوچ کر کے وہ ان کی زندگی سے الگ تو نہیں۔

شاید اسی لیے وہ جب ان کی زندگی سے الگ ہوئی تو اسے اپنی زندگی کی قدر و قیمت کا احساس ہوا۔

اسے پتا چلا کہ اگر وہ گہری کھائی میں بھی کود رہی ہوگی تو کوئی ادے بچانے والا نہیں ہوگا۔

اور منیر کمال تو شاید دھکا دینے کے بعد ہاتھ جھاڑتا ہوا واپس ہو جائے گا وہ جھرجھری سی لے کر کھڑی ہوگئی۔

رات کے اس پہر یہ سوچوں کا عفریت جانے کیوں آن لپٹا تھا اس نے بوجھل قدموں کے ساتھ آگے آ کر کھڑکی کے پردے ہٹائے۔ شیشے کے اس پار بھی اندھیرا ہی تھا۔

اسے ایک مدت بعد عاشر خواب میں نظر آیا تھا، اور اتنا ہی نظر آیا تھا جتنا وہ چھوڑ کر آئی تھی گھنیرے بالوں سے ڈھکا ہوا سر جھکائے وہ تو بس چلتا ہی جا رہا تھا۔

''اف یہ اندھیرا تو جان لے لے گا، پلیز عاشر رک جاؤ..... آگے مت جاؤ.....''

وہ اسے پوری شدت سے پکارتی ہے، مگر وہ اس کی پہنچ سے اتنا دور جا چکا ہوتا ہے کہ اس تک شاید اس کی آواز نہیں پہنچی۔

وہ بے اختیار اس تاریک سڑک پر اس کے پیچھے بھاگتی ہے۔

اسے پکارتی ہے تب ہی اس کا سفید آنچل کسی چیز میں اٹک کر پھٹ جاتا ہے وہ اس کی پرواہ کیے بغیر عاشر کی طرف بھاگتی ہے جو کسی معدوم ہوتے روشنی کے نقطے کی طرح اس کی آنکھوں سے اوجھل ہوئے جا رہا ہوتا ہے۔

''عاشر.....'' وہ پھر پکارتی ہے اسے اپنی صدا کسی بازگشت سی سنائی دیتی ہے۔ وہ لڑکھڑا کر گرتی ہے کیونکہ آنکھوں کے آگے سوائے دھند کے کچھ نہیں ہوتا۔

تب ہی اس کا ذہن بے دار ہو جاتا ہے اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی ہے۔

''عاشر میرے بیٹے! وہ بے اختیار رونے لگتی ہے۔''

''تم مجھے اب خواب میں آ کر تنگ کرو گے۔ میری بے روح مامتا سے احتساب کرو گے۔''

اس کی آنکھوں کا پانی اوس کے قطروں کی طرح شیشے کی ٹھنڈی دیوار سے بہنے لگتا ہے۔

''عاشر مجھے تم بہت یاد آتے ہو..... پلیز میرے پاس آ جاؤ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔''

''اور جب عاشر کو تمہاری ضرورت تھی۔'' اس کے ذہن پر جیسے کوئی نوکیلا پتھر چھید کرتا ہے۔

''میری قسمت میں یہ سب لکھا تھا۔ تمہاری قسمت میں یہ دوری لکھی تھی۔'' وہ یکدم خود کو احتساب کے کٹہرے سے باہر لے آتی ہے اور سزا کے کٹہرے میں قسمت کو کھڑا کر دیتی ہے۔

تب ہی آسمان کی وسعتوں میں چھپی ہوئی تقدیر اس کی چالاکی پر مسکرا دیتی ہے۔

واہ ری عورت! تجھے زندگی نے سب سے زیادہ اعزاز بخشے۔ ماں، بہن، بیٹی، بیوی اور پھر عورت ہونے کا اعزاز۔

زندگی سے زندگی کو تخلیق کرنے کا اعزاز!

کیا کچھ نہیں تیرے پاس مگر زندگی سے فریب کرتے ہوئے قسمت کو دوش دینے کی ادا بھی صرف تیرے ہی حصے میں آئی ہے۔

رات کے آخری پہر آوازوں کے ہجوم سے گھبر کر اس نے عاشر کا موبائل نمبر ملا لیا تھا۔

کتنے سکون سے موبائل بند کر کے سو رہا تھا اسے یہ فکر اور پرواہ ہی نہیں تھی کہ رات کے کسی پہر اس کی ماں بے چین ہو کر اسے فون کر سکتی ہے۔

لیکن وہ اس بات کی پرواہ کیوں کرتا ماں نے کون سا اس کی پرواہ کی تھی۔

کیا ماں اس کی پرواہ کرنے کے لیے آدھی رات کو کبھی اٹھ کر بیٹھ جاتی تھی؟ کبھی نہیں.....

کیا ماں اسے اپنے سینے سے لپٹا کر کبھی لیٹی؟

شاید کبھی نہیں۔

کیا ماں نے اپنی ساڑھی کے لچکیلے بے شکن پلو کی پرواہ کیے بغیر اسے بے اختیار اسے بانہوں میں سمیٹا اس کے ماتھے، چہرے، گالوں پر والہانہ پیار کی مہر ثبت کی؟ شاید کبھی نہیں ..... پھر کیسے وہ آج بدلے میں وہ سب کچھ چاہتی تھی اور اس نے کبھی دیا نہیں تھا۔

اس کے اندر مستقل تکرار ہو رہی تھی۔ آج ایک مدت کے بعد اس کے دل و دماغ میں جنگ سی چھڑی ہوئی تھی۔ جس کی وجہ کم از کم اس کے نزدیک رات کا یہ خوفناک تاریک پہر، لائٹ کا بے وقت چلے جانا، جنریٹر کا آن نہ ہونا اور شاید اس کے پسندیدہ مشروب کی بوتل کا خالی ہونا تھا۔

وہ ان سب کو موردالزام ٹھہراتے اپنی کمزوری پر کلستی واپس اپنے بستر پر چلی آئی تھی۔

وہ یہ سب کرتے ہوئے وقت کے انصاف اور تقدیر کے کٹہرے کو یکسر نظر انداز کر گئی تھی۔

اس کی سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا تھا کہ وقت اپنے فیصلوں سے ٹکرانے والوں کو ضوب امتحانوں سے آشنا کرتا ہے ان کے ساتھ کبھی ہنستا ہے اور کبھی روتا ہے لیکن ان کے پچھتاوے ختم کرنے کے لیے کوئی مدد نہیں کرتا۔

☆.....☆.....☆

''نانو یہ مما کہاں چلی گئیں میں ان کو فون کرتا ہوں وہ جلدی سے چلی آئیں۔ میری برتھ ڈے بھی تو آنے والی ہے نا۔ پپا کو بھی یاد نہیں شاید۔''

وہ ان کی گود میں سر رکھے لیٹا ہوا تھا، جوس کی بوتل کبھی تکیے پر تو کبھی اس کے منہ میں اوندھی ہو جاتی۔

وہ بے تحاشا باتونی تھا خاص طور پر اپنی نانی کے ساتھ، زمانے بھر لے قصے سنانے کے لیے ہر وقت تیار۔

وہ بھی تو اس کی خاص دوست تھیں تمام فرمائشیں پوری کرتی تھیں بس یہ ماں والی فرمائش کچھ بس سے باہر ہو چلی تھی۔

اس کے گھنیرے بالوں میں گردش کرتا ہاتھ اچانک ہی تھم گیا تھا۔

شمائلہ کو لاہور گے ایک ہفتہ ہو چلا تھا۔

اس کی صرف اتنی خیر خبر تھی جس کا شہرہ شہر بھر میں تھا۔ باقی وہ کچھ نہیں جانتی تھیں کہ شمائلہ کہاں ہے۔ کب آئے گی اور آئے گی بھی یا وہاں سے کسی اور پروگرام کی مہمان بننے چلی جائے گی۔

گلیمر اور رنگ و بو کی جس دنیا کا آسیب اسے اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا اس کے بعد بیگم محبّ عالم کے لیے یہ اندازہ لگانا قطعاً کوئی مشکل کام نہیں تھا کہ شمائلہ کی اگلی مسافت کیا ہوگی اور اس کی زندگی کا ہر پڑاؤ اب انگاروں سے دہکنے لگا تھا۔

انہوں نے عاشر عباس کی سوال کرتی نگاہوں کو نظر انداز کرنے لے بجائے اپنے حوصلوں کو مجتمع کیا۔

''پتا ہے عاشی! اب میں تمہیں نہیں جانے دوں گی تم چلے جاتے ہو تو میں اداس ہو جاتی ہوں ناں چھوڑو اپنی مما پپا کو اب بس تم اپنی نانو کے بیٹے ہو ٹھیک ہے نا۔''

انہوں نے اس کے پھولے پھولے گالوں پر نرمی سے بوسہ دیتے ہوئے رشتے کی مضبوطی کا یقین دلایا۔

''مگر نانو! پھر پپا کو رات کو ٹھنڈک کون دے گا۔'' وہ اس کے معصومیت بھرے استفسار پر نہال سی ہو گئی تھیں۔

''اگر انہیں اپنی ٹھنڈک لینی ہوگی تو روز ملنے آجایا کریں گے۔ ہم تو اپنے دل جا سکون کبھی ان کو

نہیں دیں گے۔"

"ویسے نانو! یہ سکون کیا ہوتا ہے مما ایک دن پپا سے کہہ رہی تھیں کہ....." وہ اپنے مخصوص پُر تجسس انداز میں کہتے کہتے رک گیا.....

"کیا کہہ رہی تھیں..... بولو نا....." انہوں نے اصرار کیا۔

دل پر انجانا سا بوجھ عاشر سے کچھ سنے بغیر ہی آن پڑا تھا۔

"پتا نہیں مما ہر وقت پپا کو کہتی رہتی ہیں میرا سکون دے دو پہلے میں بہت سکون سے تھی۔"

وہ جیسے اپنے ذہن پر زور دیتے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا تو نانو کے چہرے پر تھکن آمیز سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"پاگل ہے تمہاری مما..... تم ان دونوں کی باتیں بالکل نہ سنا کرو..... کان بند کر لیا کرو۔"

نا"نو میں تو اپنے روم میں چھپ جاتا ہوں پھر بھی مجھے آواز آجاتی ہے۔" اس نے جوس کی بوتل کو گیند بنا کر کیچ کرتے ہوئے اقرار کیا۔

"اسی لیے تو اب ان کے پاس تمہیں نہیں جانے دوں گی۔ انہیں تو احساس نہیں کہ ان کی بے سروپا باتوں کا بچے کی سوچ پر کیا اثر ہوگا۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

عاشر نے ان کی چادر کا پلو تھام لیا تھا۔

"نانو! آپ مما کو فون تو کریں نا، کیا وہ میری برتھ ڈے مس کر دیں گی۔" اس کی آنکھوں میں ماں سے محبت کا سچ ہلکورے لے رہا تھا۔

ان کے دل پر چوٹ سی پڑی تھی۔

"کیسی ظالم ماں تھی ان کی بیٹی! اس پھول جیسے بچے کی آنکھوں میں مچلتے احساس کی زبان کو آج تک نہ سمجھ پائی تھی۔"

کتنے مزے سے اپنی زندگی میں مگن تھی اور وہ اس کی توجہ کا منتظر تھا۔

''تم اپنے سارے فرینڈز کو انوائٹ کر لو اس بار تمہاری برتھ ڈے پارٹی نانوا رینج کریں گی۔ کسی بڑے سے ہوٹل میں''

''اور مما پپا.....''

اس کا کیا ہے ہر لمحے نئی زندگی لیتی رہتی ہے۔

''وہ دونوں نہیں آئیں گے ان کی punish ہے یہ.....''

وہ ان کی بات پر کھلکھلا کر ہنس پڑا تھا۔

☆.....☆.....☆

نائلہ طارق کا بہت خوبصورت نیا ناول

ہوش رُبا

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

مریم جہانگیر کا بہت خوبصورت نیا ناول

محبت اب اور نہیں

کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
مکمل ناول پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

ایسا تو اس کی زندگی میں کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ گہری نیند سے بے دار ہو اور صبح کی تازگی اپنے اندر سمونے کے لیے گہری سانس لے تو ڈھیر سارے گلابوں کی خوشبو اس کی سانسوں کو معطر کر جائے۔

وہ جھٹکا کھا کر اپنے بستر سے اٹھا تھا اور حیران پریشان اپنے اردگرد پھیلے پھولوں کو دیکھ رہا تھا جو مختلف بوکیز کی صورت اس کی اسٹڈی ٹیبل، سائیڈ ٹیبل، بک شیلف گلاس ونڈو کے سامنے بنے شیڈ واور کونے میں رکھے بڑے سے پیتل کے گلدان میں سجے تھے۔

''یا اللہ میں اتنا بے خبر سوتا رہا اور یہاں یہ سب کچھ ہوتا رہا۔''

وہ پریشان سے زیادہ حیران تھا اپنی بے خبری اور مست الست نیند پر۔

اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھے بوکے کا جائزہ لیا۔

''ضرور یہ کاشف کی کارستانی ہوگی تو کیا وہ آ گیا لیکن وہ ہے کہاں؟''

اس نے ایک ساتھ ڈھیر ساری باتیں سوچی تھیں اور بوکے میں کسی قسم کا ثبوت نہیں تھا جو اس واقعے پر روشنی ڈالتا۔

کاشف کی کراچی سے آج واپسی متوقع تھی لیکن وہ اتنا صابر کب سے ہو گیا جو چھپا بیٹھا ہے۔

اس سے پہلے باقی بوکیز کا جائزہ لیا جاتا اس نے واش روم جانا مناسب سمجھا اب بے چینی کے ساتھ پیٹ میں بھی درد شروع ہو چکا تھا۔

ہاتھ منہ دھو کر بالوں کو ہاتھوں سے سنوارتے ہوئے وہ پھولوں کو بھول کر اپنے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔

شیو اور بال دونوں خاصے بڑھ چکے تھے کل نانو نے بھی احساس دلایا تھا تب اسے ان کے پیچھے سے ایک اور مدہم مگر مضبوط آواز بھی آئی تھی۔

''Awsome کچھ دن اور چلیں گے۔''

اس نے بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس وقت تو نظروں کا زاویہ بدل لیا تھا لیکن اس وقت سوچ کا دھارا بہت اچانک ست اسی آواز کی طرف منتقل ہو گیا تھا۔

''تو کیا یہ کارستانی کشمالہ صاحبہ کی ہے۔''

وہ تیزی سے پلٹا تھا دروازہ کھول کر باہر آیا تو پھول ہی نہیں پھول والی بھی سامنے کشن کے سہارے بڑے استحقاق سے صوفے پر براجمان تھی۔

سرخ رنگ کے کرتا شلوار میں اس کی سنہری رنگت زرد گلابوں کی طرح بے حد نمایاں محسوس ہو رہی تھی۔

''نانو آپ کو مس کر رہی تھیں میں نے سوچا آپ کو جگا دوں دروازہ ناک کیا تو خود بخود کھل گیا۔''

اس نے بڑے مزے سے وضاحت کی تھی عاشر کی نظر پھر پھولوں پر چلی گئی۔

''میں صبح نماز کے بعد دروازہ کھول دیتا ہوں نانو کو اگر کام ہوتا ہے وہ میرے کمرے میں آ کر یہاں میرے پاس لیٹ جاتی ہیں اور میرے جاگنے کی منتظر ہوتی ہیں آج انہوں نے آپ کو کیسے بھیج دیا حیرت کی بات ہے.....'' وہ کندھے اچکا کر ڈریسنگ ٹیبل کی طرف آ گیا سب کچھ نک سک سے درست تھا پھر بھی.....وہ ستائشی انداز میں دیکھنے لگی اس کو۔

وہ ذرا بھی پھولوں کی شوخی و خوشبو سے متاثر نہیں لگ رہا تھا۔ کشمالہ دل ہی دل میں اپنے حوصلے کو داد دینے لگی جس نے اپنی آزمائش کے لیے اس آہنی مرد کو چنا تھا۔

''یہ تو آپ نانو سے ہی پوچھیے گا لیکن کیا میرے آنے سے آپ ڈسٹرب ہو گئے ہیں۔'' اس نے معصومیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے پھولوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔

''کیا رات کو کوئی آیا تھا۔'' سوال سے زیادہ لہجہ اہم تھا کچھ جتانے والا اپنا آپ منوانے والا عاشر چند قدم چل کر اس کے سامنے آ گیا وہ یکدم کھڑی ہو گئی اس کے لمبے چوڑے وجود کے مقابل اپنے آپ

کو کمزور اور بے بس محسوس کرتے ہوئے۔

لیکن ملال اس لیے نہیں ہو رہا تھا کہ وہ پہلے دن سے اس کے مضبوط وجود کو اپنا سائبان مان چکی تھی اس لیے اس وقت بھی اطمینان کی پُر کیف لہریں غیر محسوس طریقے سے رگ و پے میں سرائیت کر گئی تھیں۔

''دیکھیں کشمالہ مجھے بالکل عادت نہیں ہے اپنی زندگی میں کسی کی مداخلت کی سوائے نانو کے میں کسی کا حکم یا تشویش برداشت نہیں کر سکتا۔''

عاشر اپنے ٹھنڈے ٹھار لہجے میں وہ سب کچھ اسے باور کرانے کی کوشش کر رہا تھا جو پچھلے کئی دنوں سے وہ محسوس کر رہا تھا۔ بلکہ پہلی ملاقات سے آج تک بہت کچھ محسوس ہوا تھا جسے نظر انداز کرنے میں مشکل تو ہو رہی تھی مگر ایسا کرنا بہت ضروری تھا۔

کشمالہ یا کوئی اور..... ابھی اس کی زندگی میں کسی کی گنجائش نہیں تھی۔

ابھی وہ خود منتشر کسی پناہ کی تلاش میں تھا کسی کو کیا سہارا دے سکتا تھا اور پھر کشمالہ۔

ہرگز نہیں..... یہ ہی تو وہ زنجیریں تھیں جو راجہ طارق محمود یعنی اس کے سگے باپ کو اس تک آنے سے روکتی تھیں۔

وہ بھلا کیسے اس زنجیر کو اپنے گلے کا ہار بنا لیتا۔

اس نے ایک سرد سی نگاہ کشمالہ پر ڈالتے ہوئے اپنے تنفر کا اظہار کیا اور پلٹ کر پھولوں کی طرف اشارہ کیا۔

وہ جان چکا تھا اچھی طرح یہ کشمالہ کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔

''آپ یہ سب لے جا سکتی ہیں۔ مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا۔'' اس سے زیادہ کشمالہ کی برداشت نہیں تھی۔

وہ اسے بہت سخت جملے کہنا چاہتی تھی اس کے غرور کو اپنے وقار سے توڑنا چاہتی تھی مگر اچانک ہی

نانو کی بہت ساری کہی ان کہی باتیں ذہن کے کسی گوشے سے عود کر سامنے آ گئی تھیں۔

''عاشر کا اپنی ماں پر اعتبار نہیں رہا تو وہ کسی غیر عورت کو کیسے مان دے گا؟ اس نے ماں باپ کی لڑائیوں کو منطقی انجام تک پہنچتے دیکھا تھا وہ بچپن میں جوان ہو گیا تھا اور جوانی وہ بڑھاپے کی طرح گزار رہا ہے پتا نہیں کیا ہو گا میرے بچے کا۔''

کشمالہ کی سماعتوں میں نانو کی آواز اور آنکھوں کے سامنے ان کا نم چہرہ گھوم رہا تھا۔

وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی وہ جاتے جاتے پلٹ گئی۔

وہ اپنے سامنے کھڑے اس بے پناہ مضبوط شخص پر برستے برستے خاموش ہو گئی۔

اور ایسا تو زندگی میں پہلی ہی بار ہوا تھا جب اس نے اپنے مزاج اور دماغ کی مرضی کے خلاف کچھ کام کیے تھے بغیر پچھتاوے اور تھکن کے دل تھا کہ اس کے حوصلوں کی دیوار کو توانائی دیے جا رہا تھا۔

وہ بے ساختہ مسکرا دی۔

ضبط کے کڑے مراحل اس کا چہرہ سرخ کر گئے تھے۔

جان تو عاشر بھی گیا تھا وہ یہ ریاضت کیوں کر رہی ہے.....!

کشمالہ کو اس سمندر میں اترنے کے لیے کتنے دریاؤں کو عبور کرنا تھا اندازہ اسے بھی اچھی طرح ہو چکا تھا۔

''ہیپی برتھ ڈے ٹو یو.....عاشر عباس!''

اس نے ذرا توقف کر کے اس کی نظروں کی سرد مہری اور بے حسی کی پرواہ بالکل نہ کرتے ہوئے پورے جذب سے کہا لہجہ بے حد دوستانہ تھا۔

تب چونک کر اس نے کلینڈر کی طرف دیکھا۔

''۸ مارچ۔''

''اوہ.....تو یہ قصہ تھا.....'' سرخ گلابوں کی خوشبو سے کمرہ اب تک مہک رہا تھا۔

''عاشر صاحب! اگر آج کسی کی بھی سالگرہ ہوتی اس گھر میں تو..... میں اس کا اہتمام ایسے ہی کرتی پھولوں سے زیادہ کوئی چیز قیمتی نہیں خوشی کے اظہار کے لیے۔ آج کے دن آپ کا دنیا میں آنا ہم سب کے لیے خوشی اور سکون کا باعث ہے۔''

وہ بالکل اس طرح بول رہی تھی جیسے ریڈیو پر خبریں پڑھ رہی ہو عاشر کے چہرے پر بھولی بھٹکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

یہ مشینی انداز اور جملے عاشر کی سرد مہری اور بے حسی کے جواب میں تھے۔

وہ کھلکھلا کر ہنستا یا اس کی باتوں پر قہقہہ لگاتے ہوئے اسے اپنی مسرتوں میں شامل ہونے کی نوید دیتا یہ تو کشمالہ کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا بن گئی تھی۔

''تھینکس.....'' بمشکل عاشر کے لبوں سے نکلا تھا اب پھر مسکرانے کی باری کشمالہ کی تھی۔

''میں نے کہا نا عاشر کہ یہ اہتمام آپ کے لیے نہیں ہے آج کسی کی بھی سالگرہ ہوتی تو ایسا ہی ہوتا۔ مجھے اس گھر کے سناٹے اس میں پھیلے ہوئے جمود سے وحشت سی ہونے لگی ہے میرا دل چاہتا ہے جس طرح اس گھر میں قیمتی چیزوں کی بہتات ہے اسی طرح اس کے در و دیوار زندگی کے بھاگتے دوڑتے ہنستے مسکراتے لمحوں سے آشنا ہو جائیں۔ مسکرانے میں کنجوسی، بات کرنے میں کنجوسی، خوش ہونے میں کنجوسی..... یہ بھی کوئی زندگی ہے۔''

وہ اب اس کے مقابل نہیں کھڑی تھی نہ ہی اس کی نظروں کے حصار میں تھی۔ اس لیے جم کر بول رہی تھی۔

''کوئی تو میری مدد کرے اس جمود کو توڑنے میں بہت مشکل سے زندگی ملتی ہے جینے کے لیے اسے اذیت ناک بنانے کے بجائے آسان بنانا چاہیے.....'' بہت دنوں بعد اسے کھل کر بولنے کا موقع ملا تھا۔

عاشر چند لمحے اس کی پشت پر پھیلے سنہری بالوں کو دیکھتا رہا اور پھر بڑی سنجیدگی سے گویا ہوا۔

''آپ واپس کب جا رہی ہیں؟''

''واپس..... مجھے واپس کہاں جانا ہے۔''

وہ اسے اب مکمل بے بس کرنے کا ارادہ کر چکی تھی تھوڑی دیر پہلے والی عزت افزائی کا بدلہ تو ہو چکا تھا اب تھوڑا سا اور حساب کتاب باقی تھا۔

نانو اور خولہ بازار تک گئی تھیں اور ان کی غیر موجودگی میں اسے اتنی لمبی چوڑی بحث کا موقع مل گیا تھا جس کے لیے وہ اس خوشگوار صبح کی بے حد مشکور تھی۔

خدیجہ اور اس کے شوہر کی بھی شکر گزار تھی جس کی مدد سے یہ پھولوں کا ڈھیر یہاں تک پہنچا تھا اور اب شام کو کیک سیلبریشن کا پروگرام پکا تھا۔ کاشف بھی تھوڑی دیر میں پہنچنے والا تھا جبکہ طارق محمود تو شام کی تقریب کے مہمان خصوصی تھے۔

اس نے سوچ لیا تھا اس گھر کے سکوت پر ضرب لگانے کے لیے پہل تو کہیں سے کرنی پڑے گی۔

لہو روتی آنکھوں میں مسرتوں کے دیپ تو جلانے پڑیں گے چاہے اس کے لیے اسے اپنی انا کی شکست برداشت کرنی پڑے۔

سو وہ اس وقت بھی یہ ہی کر رہی تھی۔

کمرہ بھینی بھینی خوشبو سے مہک رہا تھا عاشر کی قربت اور اسے اپنے ہونے کا احساس دلانے کے لیے یہ لمحے اتنے قیمتی تھے کہ وہ ان کی طوالت کی دعا دل کی گہرائیوں سے کرنے لگی۔

اسی لیے شریر سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھ بیٹھی۔ عاشر اپنے موبائل کی طرف متوجہ تھا۔

''ویسے میرے جانے سے آپ کو کیا فائدہ ہوگا۔''

''آپ کے جانے سے آپ کا فائدہ ہو جائے گا۔''

وہ اسی کے انداز میں جواب دے کر دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

''ویسے اب فائدے نقصان کی پرواہ کسے ہے۔'' پتا نہیں یہ بڑبڑاہٹ تھی یا آواز مدہم بہر حال وہ بمشکل سن پایا۔

ایک الجھن آمیز کیفیت اس کے ذہن کی دیواروں سے لپٹی تو مگر وہ نظر انداز کر کے کمرے سے باہر نکل گیا۔

ناشتے کا ٹائم نکلا جا رہا تھا اور آج اسے ناشتے کے علاوہ بھی بہت سارے کام کرنے تھے۔ سب سے پہلے اپنے ہیڈ آفس حاضری دینی تھی جہاں سے اس کی پوسٹنگ کے آرڈر آ گئے تھے۔

اسے حیرت ہوئی تھی اتنی جلدی یہ کیسے فیصلہ ہو گیا وہ تو ابھی مزید مظفر آباد میں رہنا چاہتا تھا مگر۔

وہ ساری سوچوں کو جھٹکتے ہوئے ناشتے کی ٹیبل پر پہنچ گیا تھا خدیجہ نے اس کی پسند کا ناشتا بنا رکھا تھا فروٹ یوگرٹ کا اضافہ بھی تھا۔

اسے پتا تھا اس طرح کے اضافے اب کشمالہ کی مرضی سے ہوتے ہیں اس کا کچن میں گھر میں اور شاید اب اس کی زندگی میں بھی عمل دخل شروع ہو چکا تھا۔

عاشر نے غیر محسوس طریقے سے فروٹ یوگرٹ باؤل پرے کھسکا دیا لیکن وہ نہیں جانتا تھا کشمالہ اتنی آسانی سے اس کی زندگی سے باہر نہیں ہو گی۔

وہ رغبت سے ناشتا کر رہا تھا تب ہی اس کے ٹراؤزر کی جیب میں پڑا موبائل بجنے لگا۔

کوئی نامعلوم نمبر تھا حسبِ عادت سوئچ آن کرتے ہوئے سلام کیا تو دوسری طرف سے نڈھال مضمحل سی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

وہ نسوانی آواز اسے سالگرہ کی مبارکباد دے رہی تھی۔

''کیا آپ کو پتا ہے میں آج کتنے سال کا ہو گیا۔''

پتا نہیں اس کے دل میں کیا آئی وہ یکدم پوچھ بیٹھا..... آگے خاموشی کا وقفہ سا آ گیا تھا۔

شاید شمائلہ کمال اپنے بیٹے کی عمر کے سال انگلیوں پر گن رہی تھی۔ اس کے چہرے پر استہزائیہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"دیکھیں یہ کام آپ کے بس کی بات نہیں کیوں خود کو پریشان کرتی ہیں آپ کو مجھ سے الگ ہوئے انیس سال سال ہو چکے اور میں ستائیس سال کا ہو چکا ہوں وقت آپ کے ہاتھ سے کب کا نکل چکا۔"

اس نے اپنی ساری اذیت شمائلہ کمال کی طرف منتقل کرتے ہوئے فون بند کر دیا تھا اور پھر اسے سوئچ آف کرتے ہوئے ٹراؤزر کی جیب میں ڈال دیا تھا۔

شمائلہ کمال آج کل اس سے مستقل رابطے کی کوششوں میں تھی۔ کبھی وہ فون بند کر دیتا کبھی وہ ریسیو کر لیتا مگر ہر بار اس کی سوچ میں تلخی اور دل کا بوجھ بڑھتا ہی رہتا۔

ماں باپ..... جب ان لفظوں سے وابستہ ذمہ داری کا احساس نانو نے ایک عرصے سے اپنی ذات سے وابستہ کر رکھا تھا تو پھر وہ کیسے ان دونوں کو اس رشتے کا اعزاز سونپ دیتا۔

عاشر کو لگتا تھا جیسے وہ کچھ عرصے سے کسی ڈرامائی دنیا میں رہ رہا ہے.....

وہ سر جھٹک کر چائے پینا چاہتا تھا مگر زندگی کی تلخی ہر ذائقے پر حاوی ہو چکی تھی اوپر سے فروٹ یوگرٹ کے لیے اصرار کرنے والی بھی اس کے سامنے آ گئی تھی۔ وہ تپ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

"آپ سب لوگ کیوں میری زندگی میں انٹرفیئر کر رہے ہیں۔" وہ چیخا نہیں تھا لیکن دھاڑا ضرور تھا کشمالہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"سب لوگ....." اسے حیرت سی ہوئی وہ اپنی بھڑاس محض ایک جملے میں نکال کر جا چکا تھا کشمالہ کو مزید حیرت ہوئی تھی وہ سر تھام کر ایک ڈائننگ چیئر پر بیٹھی ہی تھی کہ خدیجہ سرگوشی کے انداز میں قریب آ کر بولی۔

''ابھی کوئی فون آیا تھا پہلے ان پر غصہ کیا اور پھر آپ کو دیکھ کر غصہ آ گیا ہوگا۔''

خدیجہ کا آخری جملہ مسکراہٹ میں چھپا ہوا تھا کشمالہ نے اسے گھور کر دیکھنا لازمی سمجھا اور فروٹ یوگرٹ کا باؤل لے کر ڈائننگ ہال میں رکھے اتی وی کے سامنے لے کر بیٹھ گئی۔

☆.....☆.....☆

اسے بڑی شدت سے مسکن کی یاد آ رہی تھی دل چاہ رہا تھا یہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنی پُر سکون دنیا میں پلٹ جائے۔

جہاں زندگی تھی۔

خوشیاں تھیں۔

اور خوشیاں بانٹنے والے لوگ بھی تھے۔

ڈھیر سارے دن ہو گئے تھے شجاع کو بھی دیکھے ہوئے وہ اس سے بہت زیادہ ناراض تھا اور یہ ناراضی حق بجانب بھی تھی۔

صوفیہ نے دوبارہ اس سے ملنے کا وعدہ کیا دونوں بار وعدہ وعدہ ہی رہا۔

تایا چچا اب جس مسئلے میں الجھے ہوئے تھے اس کا دور دور تک حل ہونے کا امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔ سعدیہ. کی گمشدگی معمہ بنتی جا رہی تھی۔

اظہر کے گھر والوں سے خفیہ مذاکرات ہو چکے تھے وہ پہلے لاہور اور اب اسلام آباد میں کوئی شو کر رہا تھا اس کے گھر والوں نے وہی سلوک کیا تھا جو ایسے وقعے پہ لڑکے کے گھر والے کرتے ہیں۔

ان کا اس سارے معاملے سے قطعاً کوئی واسطہ نہیں تھا اور ویسے بھی ان کو کورٹ کچہری میں گھسیٹنا ان کے گھر پر پولیس بھجوانا خود ان کے لیے باعثِ شرم تھا وہ نیم فنکار خستہ حال گھرانہ تایا کے نزدیک اس قابل بھی نہیں تھا کہ ان کے ساتھ دشمنی کا اشتہار لگتا۔

اسے اب حقیقتاً اس گھر کے در و دیوار اور اس کے مکینوں سے وحشت ہونے لگی تھی اس نے اب تک تو مسکن میں اس واقعے کی اطلاع نہیں دی تھی لیکن اب برداشت سے باہر ہو چکا تھا۔

شجاع فون نہیں اٹھا رہا تھا کل رات سے وہ مستقل اس کا نمبر ٹرائی کر رہی تھی جواباً بزی ٹیون آ جاتی۔

وہ فی الوقت اسے منانے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے راحت بیگم کا نمبر پریس کرنے لگی۔

دوسری ہی بیل کے بعد ان کی آواز صوفیہ کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

''صوفی! کیسی ہو میری جان..... اتنے دن ہو گئے صورت بھی نہیں دکھائی۔'' وہ بھی بے قرار تھیں صوفیہ کے چہرے پر ڈھیر سارے رنگ بکھر گئے سکون ہی سکون وحشت کے اس ماحول میں پھیل گیا تھا۔

''امی میں آنا تو چاہ رہی تھی پر پتا ہے یہاں پر ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔'' وہ ذرا جھجک کر بولی۔

اسے ماں کی نصیحتیں اور اپنا اس گھر سے رشتے کا احساس دلانا دونوں ہی سرمشار سا کر گئے تھے۔

''کیا ہوا بیٹے تم ٹھیک تو ہو ناں اور گھر میں سب خیریت ہے۔''

''امی میں بھی ٹھیک ہوں گھر میں بھی خیریت ہے بس سعدیہ کا نہیں پتا چل رہا وہ کس حال میں ہے وہ بغیر بتائے کہیں چلی گئی ہے۔'' وہ ڈرتے ڈرتے بول رہی تھی۔

''بغیر بتائے چلی گئی..... مگر کہاں تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔''

راحت بیگم تو پریشانی کے عالم میں اپنی کرسی سے کھڑی ہو گئی تھیں۔

''امی بتا تو رہی ہوں وہ.....''

اس نے دھیرے دھیرے ساری کہانی انہیں سنائی اور اپنے دل و ذہن پر رکھا بوجھ قدرے ہلکا کیا۔

''دیکھو صوفی! ان حالات میں وہاں کیا ہو رہا ہو گا میں سمجھ سکتی ہوں تم بس فوراً آ جاؤ..... میں شجاع کو ابھی بھیج رہی ہوں۔ اب تم وہاں نہیں رہو گی۔''

راحت بیگم کا چہرہ تپ رہا تھا اور لہجہ یکدم جلالی سا ہو گیا تھا صوفیہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اسے کیوں فوراً واپسی کی تاکید کی جا رہی تھی۔

''امی یہاں پر سب بہت پریشان ہیں چچی تو ہر وقت روتی رہتی ہیں اور پھر ان کے نیبر ز تو اتنے ظالم ہیں کہ ہر کوئی.....''

''میں جانتی ہوں کون کتنا پریشان ہوگا بس میں نے تم سے جو کہا ہے وہ کرو، ایک بار تمہاری ضد مان لی تھی اس بار یہ میرا حکم ہے تم آج ہی واپس آ رہی ہو۔ تمہارا گھر وہ نہیں. ہے اتنے دنوں میں تمہیں اندازہ ہو گیا ہوگا۔''

''مگر امی سعدیہ نے تو کہا تھا یہ گھر میرا ہے۔''

''سعدیہ کو کیا پتا..... اور پھر تمہیں اپنی ماں سے بحث کرنے کے سوا کچھ نہیں آتا.....'' وہ ٹھیک ٹھاک جلال میں تھیں صوفیہ تصور کی آنکھ سے دیکھ رہی تھی۔

''امی! آج تو نہیں..... چلیں میں کل آپ سے ملنے آؤں گی پھر.....'' اس نے جلدی سے کہا۔

''پھر وہی بات..... آج اور ابھی اسی وقت..... شجاع آ رہا ہے تم تیار ہو جاؤ۔'' وہ کچھ سننے کی روادار نہیں تھیں۔

''مگر امی..... چاچا چاچی کو میری۔'' وہ عادتاً محبت پر آمادہ تھی۔

''چپ کرو..... تم نہیں جانتیں ان لوگوں کو..... ایک کا گناہ دوسرے کے سر تھوپنے میں ماہر ہیں وہ لوگ..... اب مجھ سے بالکل سوال مت کرنا۔''

انہوں نے سختی سے کہہ کر اسے رونے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ بے ساختہ ہچکیوں سے رونے لگی تھی سر پہلے ہی بوجھل تھا اوپر سے ماں کی ڈانٹ۔

''سوال بھی نہ کروں..... کچھ پوچھوں بھی نہ..... اور سب کی باتیں سنتی رہوں تمہاری ماں یہ..... تمہاری ماں وہ..... تمہارا باپ مظلوم تمہاری ماں ظالم..... امی آپ نے بھی مجھے پلاسٹک کی گڑیا سمجھ رکھا ہے چابی سے چلنے والی۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے میں کتنا لڑتی ہوں آپ کی خاطر ان سب سے۔''

اس کی ہچکیاں انہیں موم کر گئیں۔

''میری پاگل بیٹی تمہارے لڑنے سے گیا وقت واپس نہیں آئے گا جو بیت گیا وہ مقدر تھا۔'' وہ بھی شاید رو رہی تھیں۔

''دعا کرو سعدیہ جہاں ہو خیریت سے ہو اللہ نہ کرے وہ کسی مشکل میں ہو احمق لڑکی تھی..... انگاروں سے بھاگی اور شعلوں کی لپیٹ میں آ گئی اللہ اس کی رہنمائی کرے۔'' راحت بیگم کے لفظوں نے اسے بھی طاقت دی تھی۔

''امی اگر وہ واپس آئی تو۔''

''ہاں مجھے پتا ہے اگر وہ واپس آ گئی تو یہ لوگ اسے مار دیں گے اس کا گھر سے باہر رہنا وہ بھی رات گزار دینا ناقابلِ معافی جرم ہے۔''

ان کا لہجہ کرب میں ڈوب رہا تھا۔

صوفیہ کا بے اختیار دل چاہا ابھی ان سے جا کر لپٹ جائے۔

''امی! آپ شجاع کو کب تک بھیجیں گی۔'' اس نے دھیرے سے پوچھا وہ بس اب ان سے ملنے کو بے چین تھی۔

راحت بیگم ایک گہری سانس لے کر انٹرکام کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

شجاع تھوڑی دیر پہلے ہی آفس آیا تھا راحت بیگم اس سے بات کر رہی تھیں۔

اور صوفیہ اس کی کیفیت سے محظوظ ہو رہی تھی۔

''امی کا حکم کبھی نہیں ٹال سکتا.....'' اس نے آنسو پونچھ کر مسکراتے ہوئے موبائل بند کر دیا۔

ابھی مسکن جانے کی تیاری بھی تو کرنا تھی۔ شجاع کا اسے پتا تھا امی کی بات سنتے ہی اٹھ کھڑا ہو گا۔

☆.....☆.....☆

آئی سی یونٹ کی پُر اسرار خاموشی ٹک ٹک کرتی مشینوں کی آواز اور سفید پٹیوں میں جکڑا اپنا وجود سعدیہ کو عجیب سی وحشت میں مبتلا کر رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ان بیڑیوں سے آزاد ہو کر کسی دریا میں چھلانگ لگا دے۔

جہاں کم از کم اندر کی آگ کو تو سکون ملتا۔

وہ جب سے ہوش میں آئی تھی یونہی چیخ و پکار میں لگی ہوئی تھی۔

اس کی ایک ٹانگ پر پلاسٹر چڑھا تھا اور دوسری پٹیوں کی لپیٹ میں تھی۔

''مجھے کھول دو..... یہاں سے جانے دو..... مجھے گھر جانا ہے..... میں یہاں نہیں رہنا چاہتی۔''

لیکن اس کی پکار کوئی نہیں سن رہا تھا۔ نرس نے پیشہ ورانہ انداز میں اسے ڈانٹ دیا تھا اور سرمد بخاری کی طرف سے بھیجی گئی بھاری بھرکم عورت کبھی تو اسے تسلی دینے لگتی اور کبھی ڈانٹ کر چپ کروا دیتی اس بار تو اسے بھی غصہ آ گیا تھا۔

''کیوں روتی ہے بی بی! اور میری بھی نوکری کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ چپ کر کے پڑی رہ جب تک تیرے زخم نہیں بھر جاتے تو ٹھیک نہیں ہو جاتی یہاں سے نہیں جا پائے گی۔''

اس کے انداز میں تلخی نہیں تنبیہہ تھی سعدیہ بے بسی سے اپنا ہاتھ کاٹ کر رہ گئی۔

سر اور ماتھے کے زخم تقریباً خشک ہو گئے تھے لیکن درد کی ٹیسیں ابھی بھی نڈھال کر رہی تھیں اس سے بڑا درد جو رگ و پے میں سرائیت کر گیا تھا وہ گھر والوں کی رسوائی اور اپنی ذلت کا تھا۔

اس کی نظریں ایک بار پھر بھٹک کر کلینڈر پر چلی گئی تھیں جو عین اس کے سامنے والی دیوار پر آویزاں تھا۔

جانے کتنی تاریخیں گزر گئی تھیں یہ اب اسے یاد نہیں آ رہا تھا لیکن اتنا اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ یہ ظالم وقت اس سے گھر کا سائبان چھین کر پاتال کی گہرائیوں میں اتار لے گیا تھا۔

جہاں سے واپسی کی ساری راہیں مسدود ہو چکی تھیں۔

وہ آنکھیں بند کرتی تو تایا کی خون آلود آنکھیں، ماں کی سرد غصیلی نگاہیں، باپ کا دھاڑتا لہجہ، سفیر اور نعمان کی ملامتی کوستی نگاہیں دونوں چھوٹے بھائیوں کی پھٹکار دماغ میں دھماکوں کی صورت برسنے لگتی۔

اس کا بس نہیں چل رہا تھا وہ سرمد بخاری کو گولی مار دیتی جس کی وجہ سے وہ آج حالت نزع میں تھی۔

نہ موت آ رہی تھی نہ جینے کی امنگ بے دار ہو رہی تھی۔

''اف..... میں کیوں اس دن اس منحوس شخص کی گاڑی میں بیٹھی۔

یا اللہ سب لوگ میرے بارے میں کتنا برا سوچ رہے ہوں گے..... عشرت اچانک گھر سے غائب ہوئی تھی تو سب نے کتنا واویلا کیا تھا۔

کیا اسے بھی سب گالیاں دے رہے ہوں گے، امی ابا تو خاص طور پر.....''

وہ اچانک تکیے میں منہ گھسا کر زور زور سے رونے لگی تھی اس کی آواز پورے یونٹ میں گونج رہی تھی۔

''کیا ہوا بہت درد ہو رہا ہے کیا.....''

نرس تیزی سے اس کے پاس آئی تھی۔ وہ ایک بڑے آدمی کی مریضہ تھی سو اس کا خاص طور پر خیال رکھنے کی تاکید بھی کی گئی تھی۔

اب وہ جو کر رہی تھی اس پر ان سب کی نوکری خطرے میں پڑتی نظر آ رہی تھی۔

''ہاں مجھے بہت درد ہو رہا ہے مجھے زہر کا انجیکشن دے دو مجھے باہر نکالو اس قید سے۔'' وہ اپنے حواس کھونے لگی تھی نرس نے اسے سکون آور انجیکشن لگا دیا تھا۔ تاکہ وہ سو جائے اور یہ شور تو کم ہو۔

''یہ تمہارے مالک کی بیوی ہے کیا۔''

نرس نے سرگوشی میں اس عورت سے پوچھا تھا جو حکم کی تابعداری میں خاموش بیٹھی رہتی اور بھلا

اسے کرنا بھی کیا تھا سعدیہ سے کون سا اسے ہمدردی تھی جو وہ اس کا دکھ بانٹنے کی کوشش کرتی۔

''مالک کی بیوی ہو یا کوئی اور.....ہم تو اپنی نوکری کرتے ہیں اور گھر چلے جاتے ہیں تم بھی ان کے چکروں میں مت پڑو۔''

وہ اپنی بڑی بڑی سرخ آنکھیں نکال کر بولی تو نرس خاموشی سے واپس پلٹ گئی۔

اور پھر سرمد بخاری کو دیکھ کر مزید خاموش رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

وہ کھڑے کھڑے آیا تھا، سعدیہ اس وقت غنودگی میں تھی ڈاکٹر سے صورتحال معلوم کرنے کے بعد خدمت پر مامور عورت کو کچھ ہدایات کی تھیں اور پھر مزید وقت ضائع کیے بغیر واپس چلا گیا تھا۔

اسے جلدی تھی یا وہ رکنا نہیں چاہتا تھا نرس اندازہ نہیں لگا پائی البتہ سعدیہ کے دل میں ہمدردی کے سوتے ضرور پھوٹ پڑے تھے۔

☆.....☆.....☆

''سرمد تم کب تک اس لڑکی کے لیے خوار ہوتے رہو گے۔ تمہیں پتا ہے ہمارے دو بندے پولیس کسٹڈی میں ہیں۔ جب تک ان کی زبانیں بند ہیں خیر ہے۔''

منیر کمال.....اس کے مقابل بیٹھا خاصا تناؤ میں تھا۔ وہ بہت دنوں بعد دونوں آمنے سامنے تھے ورنہ یہ سارے کام شمائلہ کے ذریعے ہوتے تھے۔

''تم نے اب تک ان کی زبانیں بند نہیں کیں.....'' سرمد بخاری کو ان کے تناؤ سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ اپنے اصول یاد رکھتا تھا۔

''میری طرف سے زبان بند کروانے سے کیا ہوتا ہے۔ تم جانتے ہو ہیومن رائٹس والے کتنا شور مچانے لگے ہیں اور انہوں نے پولیس کو بھی بھتہ دیا ہوتا ہے۔'' منیر کمال کے لبوں پر مخصوص گالی تھی۔

''ابے سالے تو کیا تیرے پاس بھتے کی کمی ہے ہیومن رائٹس اور پولیس دونوں کے منہ بند کر

دے۔اس میں پریشانی کی کیا بات ہے تو جانتا نہیں ان این جی اوز سے کیسے نبٹنا ہے۔"

سرمد بخاری اس کی طرف استہزائیہ مسکراہٹ سے دیکھ رہا تھا۔

"میں تو جانتا ہوں ان سے کیسے نبٹنا ہے لیکن اس بار ڈھاکہ سے آنے والی کھیپ ہمارے لیے مہنگی پڑ گئی ہے اس سالی نے ہم سے بھاگ کر پناہ بھی مانگی ہے تو ان لوگوں سے جنہیں پاکستانی روپے کی ضرورت ہی نہیں ان کی ساری فنڈنگ جرمنی سے ہو رہی ہے اور میرا تو شروع دن سے ان سے اختلاف ہے۔"

"یار تیرا تو ہر کسی کے ساتھ اختلاف ہی رہتا ہے چل ٹھیک ہے زیادہ پریشان نہ ہو۔ سرمد بخاری اس کے ہوتے تیرا کچھ نہیں بگڑتا کچھ دنوں کے لیے شہر سے باہر چلا جا۔"

میری فکر مت کر تو جانتا ہے میری پہنچ کو۔

سرمد بخاری کے چہرے پر ہنوز اطمینان تھا وہ ان چھوٹے چھوٹے مسئلوں پر کبھی نہیں سوچا کرتا تھا۔ وہ جس کاروبار سے منسلک تھا اس میں اس کے تعلقات پولیس کے محکمے سے نہیں بلکہ اس محکمے کو چلانے والے آقاؤں سے براہ راست تھے۔

"میرا کام تھا تجھے آگاہ کرنا..... میں آج شام نکل رہا ہوں اسلام آباد کے لیے سنا ہے وہاں بھی اس بار اچھا مال آیا ہے ایک پارٹی کو باہر بھجوانا ہے۔"

"میں نے سوچا ہے بہت ہڈ حرامی کر لی اب ذرا صاف ستھرا کام کیا جائے۔" وہ آنکھ دبا کر بولا۔

"بس کر دے تو صاف ستھرا کام کرے گا..... تیرے تو خون میں کمینگی دوڑتی ہے۔"

سرمد بخاری اسے کبھی عزت کے لائق نہیں سمجھتا تھا نہ بحیثیت بزنس پارٹنر اور نہ ہی شمائلہ کے شوہر کے طور پر۔

"میرے تو خون میں دوڑتی ہے تیرا تو ماس بھی اسی سے بنا ہے۔" منیر کمال کہاں ادھار رکھتا تھا۔

"ایسا نہ ہوتا تو تم لوگ کب کی جیل کی ہوا کھا رہے ہوتے..... چل چھوڑ اس بکواس کو..... شمائلہ

کہاں ہے نظر نہیں آ رہی۔"

"بخار ہو رہا ہے اسے.....سو رہی ہوگی۔"

"کب سوئی ہے ابھی تو میری اس طرف آتے ہوئے بات ہوئی ہے ناراض ہو رہی تھی کہ میں نے اس کی کیئر کرنا چھوڑ دی۔"

وہ موبائل سے اس کا نمبر ڈائل کرتے ہوئے کمینی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا تو منیر کمال کے لہجے میں کڑواہٹ سی گھل گئی۔

"ارے ڈرامے کرنے لگی ہے اب بہت.....کبھی یہ بہانہ کبھی وہ بہانہ ویسے بھی اس کا وقت گزر گیا۔"

سرمد بخاری نے قدرے حیرت سے منیر کمال کو دیکھا تھا شمائلہ کمال کا نام نہاد شوہر کس قدر غلیظ مرد تھا۔

گو کے برائی کی دلدل میں سرمد بخاری بھی گردن تک پھنسا ہوا تھا لیکن وہ جس کے ساتھ مخلص ہونے کا تہیہ کر لیتا پھر اسے دھوکا نہیں دیتا تھا شاید اسی لیے وہ صبح تک شمائلہ کا بہترین دوست اور ہمدرد و غمگسار تھا۔

سعدیہ کی ایک اچھے ہاسپٹل میں ٹریٹمنٹ کی بھی یہی وجہ تھی۔

منیر کمال کے عزائم اس کی بے سروپا باتیں اور اس کی شاطر آنکھوں میں ہلکورے لینے والی غیر انسانی چمک اسے کہیں سے بھی انسانوں کے زمرے میں نہیں لاتی تھی۔ مرد کہنا تو سراسر مردانگی کی توہین تھی۔

سرمد بخاری بے زار سا ہو کر اس کے پاس سے اٹھ گیا تھا اب اس کا رخ شمائلہ کے کمرے کی طرف تھا۔

کمال ولا میں سرمد بخاری کو ہر طرح کے حقوق حاصل تھے مالکانہ حقوق سمیت۔

منیر کمال محض دانت پیس کر رہ گیا سرمد بخاری کی پشت پر گڑی منیر کمال کی نظروں میں اس کے

دل کی کدورت بڑی واضح انداز میں لکھی ہوئی تھی۔

''تم دونوں کب تک رنگ رلیاں مناؤ گے..... کی نا کوئی انتظام تو کرنا پڑے گا۔'' اب اسے اپنی کماؤ بیوی کی ضرورت نہیں تھی یہ اس کے چہرے پر لکھا تھا۔

☆.....☆.....☆

''محترمہ جب آپ تیار ہو جائیں تو مجھے بیل کر دیجیئے گا میں آپ کے گھر کے قریب ہی ہوں۔''

شجاع..... صوفیہ کے ساتھ بالکل وہی سلوک کر رہا تھا جس کی وہ توقع کر رہی تھی وہ فون بند کر چکا تھا اس کے چہرے پر بڑی اجلی سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

کیسی ہوتی ہے یہ دل سے جڑے رشتوں کی ناز برداری کبھی سارے فاصلے مٹا کر سینے کے اندر سمونے کو دل چاہتا تھا اور کبھی ان ہی فاصلوں کو طول دے کر بے قراری کے مظاہرے دیکھنے میں بھی لطف آتا ہے۔

سفید اور سرخ رنگ کے اسٹائلش سے سوٹ میں وہ آج بہت دنوں کے بعد خود پر دھیان دیتے ہوئے میچنگ ٹاپس اور چوڑیاں تلاش کر رہی تھی جیولری باکس سے ٹاپس تو مل گئے تھے البتہ چوڑیوں کے بجائے انعم کے گفٹ کیے ہوئے کڑے اس سوٹ سے میچنگ ہو رہے تھے سو اس نے وہی پہن لیے تھے۔

اپنی ضرورت کی چیزیں اور کپڑے بیگ میں سمیٹ کر وہ ہلکی پھلکی تیاری ہے ساتھ گیلے بالوں کو پنکھے کی ہوا میں خشک کر رہی تھی۔

تب ہی موبائل کی بیل بج اٹھی۔

''میں آپ کا نوکر ہرگز نہیں ہوں آپ پہلی فرصت میں باہر آجائیں۔''

دوسری طرف شجاع تھا۔

''باہر آجاؤں..... یہ کیا بات ہوئی۔'' اس نے قدرے حیرت سے کہا۔

''جی باہر میں اندر آؤں گا تو شاید آپ کی فیملی کو ناگوار گزرے۔''

''اور میں اس طرح آپ کے ساتھ چلی گئی تو سعدیہ کے ساتھ میرے لیے بھی قتل کا فتوی جاری ہو جائے گا۔ ایٹ لیسٹ آپ میری تائی اور چچی کو اپنی شکل تو دیکھا دیں۔''

اس نے التجائیہ انداز میں کہا۔

جس طرح کی کشیدہ فضا اس وقت ہو چکی تھی ایسے میں اس کا گھر سے باہر نکلنا بھی فساد کا باعث بن سکتا تھا۔

''دیکھیں بی بی! جن لوگوں نے اعتبار نہیں کرنا ہوتا وہ کسی بھی حال میں نہیں کرتے۔ میں آپ کا انتظار کر رہا ہوں آپ اپنی آنٹی کو انفارم کر کے آجائیں۔''

وہ تو سچ مچ اچھا خاصا ناراض ہو گیا تھا صوفیہ نے گھور کر موبائل کو دیکھا جس کی اسکرین پر کال اینڈ کے الفاظ جگمگا رہے تھے۔

''ایک تو یہ نازک مزاج صاحب..... میری قسمت میں لکھے تھے۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے اپنے کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے بیگ ہاتھ میں تھام کر نیچے آ گئی تھی جہاں تائی حسب عادت اپنی پسندیدہ نشست پر براجمان تھیں اور چاچی کچن میں کھڑ پڑ کر رہی تھیں۔

سعدیہ کے مسئلے پر مذاکرات کے لیے آج عالیہ اور عظمی نے بھی آنا تھا۔

سوتائی انہی کے استقبال کے لیے چاول چن رہی تھیں آہٹ پر نظریں اٹھا کر اسے دیکھا تو حیران سی رہ گئیں۔

''میں اپنی امی کے پاس جا رہی ہوں۔'' اس نے تائی کی سوالیہ نگاہوں کے جواب میں چھوٹتے ہی کہا۔

''کیوں بھئی یہ بیٹھے بٹھائے تمہیں کیا سوجھی پورا گھر سعدیہ کے لیے پریشان ہے اور تمہیں تفریح

سوجھ رہی ہے۔"

انہوں نے چاول کا تھال ایک طرف کرتے ہوئے بڑی گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لیا تھا۔

"ایک تو کمبخت خوبصورت ہے اوپر سے پہننے اوڑھنے کا سلیقہ بھی خوب ہے میرے سفیر کے تو دن پھر جائیں گے مگر اس کے باوا کو فرصت ہی نہیں بھاوج سے رشتہ مانگنے کی۔"

وہ نہ جانے کیوں سوچوں میں گم ہو گئی تھیں۔ صوفیہ نے بے ساختہ پکارا۔

"تائی میں جا رہی ہوں۔"

"ارے بی بی اپنے تایا کو بتا کر جاؤ ہمارا تمہارے اوپر کیا اختیار اور یہ تم جا کس کے ساتھ رہی ہو۔"

وہ جس سوال کی منتظر تھی وہ بالآخر پوچھ ہی لیا گیا تھا اس نے گہری سانس لی اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی گیلری کے کھلے دروازے سے نعمان کے ساتھ شجاع اندر داخل ہوا تھا۔

"یہ میرے ساتھ جا رہی ہے....."

تائی کی پاٹ دار آواز گلی میں سنی جا سکتی تھی اس میں کوئی دو رائے نہیں تھی۔ سو اس کی بچت ہو گئی۔

"ارے بھیا تم کون ہو اس کے ہم نے تمہیں کبھی نہیں دیکھا۔" بجائے اس کے وہ شجاع کو مہمانوں والا پروٹوکول دیتیں اسے بیٹھنے کے لیے کہتیں۔

انہوں نے لیڈی انسپکٹر کی طرح پوچھ گچھ شروع کر دی تھی شجاع نے ایک طائرانہ نگاہ اس گھر کے در و دیوار پر ڈالی تاسف اور حیرت کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ وہ صوفیہ کو دیکھنے لگا جو اس ساری سچویشن میں شجاع کی آمد پر پچھتا رہی تھی۔

اسے یقیناً نعمان اندر لے کر آیا تھا اب اسے یقین تھا وہ تائی کے اول جلول حلیے اور بے سروپا سوالوں پر ضرور سیخ پا ہو جائے گا۔

"یہ صوفیہ کا کزن ہے آپ کو کہاں سے نظر آ جاتا پہلی بار اسے لینے آیا ہے۔" بالآخر نعمان نے

مشکل آسان کی تھی۔

''صوفیہ کا کزن.....کون سا کزن.....میں ایسے کیسے جوان لڑکی کو اس کے تایا کی اجازت کے بغیر کسی غیر کے ساتھ بھیج دوں نہ بھیا پہلے ہی اس گھر میں بہت تماشے ہو چکے۔''

یہ ایک نیا ڈرامہ شروع ہو گیا تھا صوفیہ کو پتا تھا تائی اپنی عادت سے مجبور تھیں انہیں کوئی نہیں سمجھا سکتا تھا۔

''اماں! زیادہ چخ چخ مت کرو جانے دو صوفیہ کو ابا کو میں بتا دوں گا ویسے بھی وہ اپنے گھر جا رہی ہے۔''

نعمان کو صوفیہ سے بھی ہمدردی تھی اور شجاع کے سامنے ماں کے رویے پر شرمندگی بھی ہو رہی تھی۔

شجاع ابھی تک ہال کمرے میں دروازے کے نزدیک ہی کھڑا تھا نعمان نے اسے کرسی پیش کی تو اس نے بیٹھنے سے معذرت کر لی وہ بس صوفیہ کو دیکھ رہا تھا منتظر نگاہوں سے۔

جو عجیب مخمصے میں پھنس گئی تھی۔

تائی سے کوئی بعید نہیں تھا وہ تایا چچا کے سامنے کوئی بھی کہانی بیان کر سکتی تھیں اس فن میں انہیں ویسے بھی کمال حاصل تھا ایسے موقعے پر صوفیہ کو اپنے باپ کے سگے بھائیوں سے خاصی ہمدردی ہو چکی تھی اصولی اختلاف کے باوجود۔

''ارے بیٹا بیٹھو تو.....کھڑے کیوں ہو.....'' چاچی نے کچن سے آ کر ماحول کا تناؤ کم کرنے کی کوشش کی۔

''نہیں بس اب چلیں گے چلو صوفی۔''

اس نے جس استحقاق سے اسے پکارا تھا نعمان کو خاص حیرت نہیں ہوئی البتہ تائی کا ماتھا ضرور ٹھنک گیا تھا۔

''دیکھو بی بی میں تو تمہیں اس پرائے لڑکے کے ساتھ نہیں بھیج سکتی ہمیں تو نہیں پتا یہ کون ہے

تمہارے کون سے ماموں کا بچہ ہے ہم تو تمہاری ماں کے سوا کسی کو نہیں جانتے۔"

وہ رنگ میں بھنگ ڈال رہی تھیں بھرپور انداز سے چاچی نے ان کے تیور دیکھ کر سر پیٹ لیا تھا اور شجاع کا پارہ ہائی ہو چکا تھا۔

"دیکھیں خاتون! یہ جو لڑکی آپ کے گھر میں رہ رہی ہے نا! آپ کو اس کی فکر میں دبلا ہونے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں یہ پہلے بھی میری ذمہ داری تھی اور آج بھی میری ذمہ داری ہے میں اسے گھر لے جاؤں یا سمندر پار کوئی مجھ سے نہیں پوچھ سکتا۔"

"ہائیں یہ کیا کہہ رہے ہو تم....."

ماتھا ایسے ہی تو نہیں ٹھنکا تھا صوفیہ کے چہرے کا اطمینان مزید تاؤ دلا گیا تھا اسے تو یہ سب سننے کے بعد خاصا سکون سا محسوس ہوا تھا وہ اس شجر سے بے سبب تو نہیں لپٹ گئی تھی کوئی تو خاص بات تھی جس نے شجاع کو اس کی مضبوط ڈھال بنا دیا تھا۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں..... آسان لفظوں میں وضاحت کر دوں..... یہ لڑکی میری منگیتر ہے اس کی ماں اور میرا باپ ہمارے بچپن میں یہ فیصلہ کر چکے تھے۔" اب وہ مزے لے رہا تھا تائی کی کیفیت سے وہ تو جیسے زلزلے کی زد میں تھیں۔

صوفیہ نے قدرے حیران نگاہوں سے شجاع کو دیکھنے کے بعد نعمان کو دیکھا جو نجانے کیوں اس ساری سچویشن سے محظوظ ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بڑی بے ساختہ سی مسکراہٹ تھی۔

"جاؤ صوفیہ میں ابا کو بتا دوں گا اور شجاع بھائی آپ دونوں کی جوڑی بڑی زبردست ہے مجھے بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔"

اس نے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ بڑھایا تھا شجاع کو وہ حلیے سے خاصا معقول اور اور مزاجاً قابلِ قبول لگا تھا۔

''وہ تو اس ساری صورتحال کو مزید انجوائے کرنا چاہتی تھی..... بار بار شجاع کے منہ سے سننا چاہتی تھی کہ یہ جو لڑکی ہے نا..... پہلے اور اب ہمیشہ سے میری ذمہ داری ہے۔ صرف میری ذمہ داری کوئی اس کی فکر نہ کرے۔''

اس نے اپنے لمبے چوڑے مضبوط منگیتر کو پورے مان اور اعتماد سے دیکھا اور ساتھ ہو لی۔

صوفیہ کو یقین تھا اب اس سارے قصے میں سعدیہ کا تذکرہ نیچے چلا جائے گا اور وہ سرفہرست ہو گی۔ لیکن اسے کوئی پرواہ نہیں تھی اس نے کونسا اب یہاں واپس آنا تھا اور ان کے درمیان رہ کر اپنی توانائیاں بے مصرف سوچوں پر صرف کرنی تھیں۔

وہ تو جاتے جاتے ان خوبصورت لمحوں کو مزید انجوائے کرنا چاہتی تھی جب شجاع ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر اسے سب کے سامنے صرف اپنی ذمہ داری کہہ رہا تھا۔

اس نے خاص طور پر چاچی کے گلے لگ کر انہیں تسلی دی۔ ان کی نگاہوں میں انجانی سی حسرت ہلکورے لے رہی تھی۔ وہ کیا سوچ رہی تھیں صوفیہ بخوبی جانتی تھی۔

''دیکھو لڑکی یہ چونچلے اور ڈرامے بند کرو..... تم اپنے تایا کو جانتی ہو نا ان کی مرضی کے بغیر اس گھر سے گئیں تو اچھا نہیں ہوگا۔''

تائی کی آواز میں تحکم اور لہجے میں دھمکی تھی صوفیہ کے قدم تو تھمے ہی تھے شجاع بھی پیچھے پلٹنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

شب کی اپنی پرچھائیں ہے
دن کے اپنے تیور ہیں
کچھ یادیں ہیں کچھ باتیں ہیں

اپنے اپنے روز و شب کہ سب ہیں قیدی

روز و شب کے ان سارے

منظر ناموں میں

جو چہرہ سب سے اجلا ہے

وہ تیرا ہے

وہ بھولتا نہیں تھا کسی بھی حیلے بہانے سے اپنی موجودگی کا احساس دلانے سے، کبھی کوئی پیغام شرارت سے بھرپور، دوستی کی دعوت دیتا۔

کبھی کسی غزل کا ادھورا شعر کبھی نامکمل مصرع اور کبھی صرف سلامتی کی دعا!

بلا ناغہ اس کے میلنگ باکس میں ہوتی تھی۔

خولہ اس ملاقات کو اتفاق نہیں مانتی تھی جو خزیمہ کے ساتھ بازار کے ہجوم میں ہوئی تھی۔ لیکن اس ملاقات سے آج تک وہ اسے باقاعدگی سے یاد کرتا تھا۔ خولہ غیر شعوری طور پر اس ملاقات کے حوالے سے اسے یاد کرنے لگی تھی کیونکہ وہ اپنی موجودگی کا احساس دلاتا تھا۔

اور اس پر مسلط ہونے کی کوشش بھی نہیں کرتا تھا۔

خولہ کو حیرت اور تجسس دراصل اس کے اتنے متحمل رویے پر تھا۔

خولہ نے اسے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ کمیٹڈ ہے اس کے باوجود اس کے احساسات سے جھلکتی شدت اس کے لفظوں میں چلتی محبت ہنوز تھی۔

وہ پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ اس سے رابطہ رکھے ہوئے تھا جیسے جلد یا بدیر اسے اپنے جذبوں کی قبولیت کا پورا یقین ہو۔

خولہ نے زچ ہو کر اسے لکھا تھا۔

''آپ کے پاس اور کوئی مشغلہ نہیں ہے۔'' اور وہ اپنے میلنگ باکس کو دیکھ کر جھوم سا گیا تھا۔

تب ہی تھوڑی دیر کے بعد وہ آنلائن تھا اس کے لیے یہ ہی کافی تھا کہ کسی طور تو سرد مہری کی برف پگھلی تھی۔ کچھ تو اس نے لفظوں کی صورت اس کے نام بھیجا تھا۔

''میں جسے زندگی کا حق سمجھتا ہوں آپ اسے مشغلہ کہتی ہیں یہ مشغلہ ترک تو کر دوں اگر سانس لینا چھوڑ جاؤں۔'' اس کے چیٹ باکس میں ٹائپ ہوا تھا۔

''اف کیا بکواس ہے یہ۔'' خولہ نے جھنجھلا کر کی بورڈ پر انگلیاں چلائیں۔ روانی میں وہ کیا لکھ رہی تھی اس نے غور نہیں کیا تھا البتہ خزیمہ کے چہرے پر مسکراہٹ سی بکھر گئی تھی۔

اسے اپنے دل میں بسنے والی اس لڑکی کی بے بسی اور جھنجھلاہٹ نے قدرے اپنائیت کا احساس دلایا تھا۔

''کیا سچ لکھنا اور سچ کا سامنا کرنا بکواس ہوتا ہے۔ میں تو جو محسوس کرتا ہوں اس کا اظہار بھی کرتا ہوں اور آپ جو محسوس کرتی ہیں اس کے برعکس لکھ کر کیوں خود کو تکلیف دیتی ہیں۔'' بہت دنوں بعد بھڑاس نکالنے کا موقع ہاتھ آیا تھا۔

''دیکھیں مسٹر! میں کیا کرتی ہوں کیا نہیں یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے میں نے آپ کو سمجھایا ہے کہ مجھے اس طرح کے ریلیشن میں کوئی انٹرسٹ نہیں میں اور میری زندگی پبلک فگر ہرگز نہیں کہ کوئی بھی منہ اٹھا کر میری ذاتی زندگی میں مداخلت کرنے چلا آئے۔''

وہ بھی کافی غصے میں تھی خزیمہ کے لیے یہ ہی کافی تھا وہ آنلائن تھی۔

اپنے غصے اور تنفر کا اظہار کر رہی تھی۔

یہ تو اسے اچھی طرح پتا تھا لڑکیاں مخالف سمت سے آنے والی ہوا کہ ڈر سے اپنے دل کی ساری کھڑکیاں اور دروازے مضبوطی سے بند کر دیتی ہیں اب یہ تو ہوا کی شدت اور منہ زوری پر منحصر ہوتا ہے

کہ وہ بڑی کھڑکیاں اور دروازے چھوڑ کر چھوٹی چھوٹی درزوں سے بھی اندر داخل ہو جاتی ہے۔

''دیکھیں محترمہ میں نہ آپ کا پرستار ہوں اور نہ ہی آپ سے آٹوگراف لے کر خوش ہونا چاہتا ہوں نہ میں آپ سے دل لگی کرنا چاہتا ہوں اور نہ ہی فضول قسم کی فرینڈ شپ سیدھی سی بات ہے میں آپ کو اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔''

میں اتنا جانتا ہوں آپ کی کمٹمنٹ دنیا کے کسی بھی کونے میں کیوں نہ ہو آپ کو اس دنیا میں صرف میرے لیے بھیجا گیا ہے میرا وجدان کہتا ہے کہ بہت جلد آپ کو میرے جذبوں کی صداقت کا یقین آ جائے گا۔''

خولہ پوری آنکھیں وا کیے خزیمہ کے اقرار اور استحقاق سے سجی تحریر پڑھ رہی تھی۔

اب اسے حیرت سے زیادہ پریشانی نے آن گھیرا تھا۔

سچا عاشق اور جان دینے والا محبوب پاگل دیوانہ ٹائپ کے کریکٹر اسے کہانیوں میں بھی اچھے نہیں لگتے تھے وہ تو ان سب لوگوں کو سمجھایا کرتی تھی جو کشمالہ پر دل و جان نچھاور کرنے کو تیار رہتے تھے اور اس کی نگاہ التفات سے محرومی کا گلہ خولہ سے کرتے تھے۔

یہاں تو خزیمہ نے سب کو مات دے دی تھی۔ بن دیکھے بن جانے وہ اس کو اپنی زندگی میں شامل کرنے کا عزم کیے بیٹھا تھا۔

''نہ وہ دوستی کرنا چاہتا ہے نہ وہ دل لگی کرنا چاہتا ہے تو پھر کیا چاہتا ہے وہ.....''

اس نے خزیمہ کا سارا غصہ بھی کشمالہ پر اتارا تھا جو اس کی لال بھبھوکا شکل دیکھ کر ہنس پڑی تھی۔

سرخ گلابوں سے ڈائننگ ٹیبل کی آرائش کرتے ہوئے اس کا سارا دھیان عاشر عباس کی طرف تھا جو آج شام کی سرپرائز پارٹی کا مہمانِ خصوصی تھا تب ہی خولہ اپنی الجھن لیے آ گئی تھی۔

وہ اس کے اقرار نامے کا جواب اپنے جلال نامے سے دینا چاہتی تھی کہ لائٹ چلی گئی اور اسے

کمپیوٹر آف کرنا پڑا۔ کمپیوٹر آف کر کے وہ کشمالہ کی تلاش میں نیچے آئی تو ڈائننگ ہال کا منظر ہی بدلا ہوا تھا۔

ہر طرف تازہ پھولوں سے ڈیکوریشن اور سیٹنگ بھی بدلی ہوئی تھی خدیجہ کا جوش و خروش بھی دیدنی تھا۔

عاشر عباس کو کیا پسند ہے اور کیا ناپسند وہ معلومات پہنچا رہی تھی۔

اسے ایک لمحے کو خزیمہ کا پاگل پن نظر انداز کر کے اپنی بے تحاشا ذہین اور باصلاحیت بہن کے پاگل پن پر غور کرنا پڑا۔

''سمپل! وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔''

''وہی جو تم عاشر عباس سے کرنا چاہتی ہو۔'' اس نے تیکھے انداز میں کہا۔

''سچ تو یہ ہی ہے۔''

وہ جیسے ہارے ہوئے لہجے میں بولی خدیجہ زیادہ دور تو نہیں تھی اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ یہ تو وہ چپکے چپکے سوچا کرتی تھی اور شاید نانو بھی۔

انہیں بھی کشمالہ بہت پیاری لگتی ہے ایک دفعہ تو کہا بھی تھا۔

''عاشر کے نصیب میں جانے کیا لکھا ہے لیکن یہ بچی میرے دل میں بس گئی ہے۔''

وہ ان دونوں کے سامنے تو بے نیاز نظر آ رہی تھی لیکن دل تھا کہ کدکڑے لگاتا پھر رہا تھا۔

''اس گھر میں شادی.....'' وہ تصور کی آنکھ سے دیکھ رہی تھی اور خولہ کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

''مالا تم بالکل پاگل ہو.....ہم جسے جانتے نہیں سمجھتے نہیں جس کے گھر والوں سے واقف نہیں اس سے شادی کیسے کر سکتے ہیں ایک اجنبی آدمی کیسے زندگی میں شامل کیا جا سکتا ہے۔''

''جانو! پر دل کے رشتے ایسے ہی ہوتے ہیں کہیں اوپر طے ہو جاتے ہیں بس زمین پر تو یہ دریافت ہوتے ہیں۔ اور احساس ہی نہیں ہوتا کہ ایک پل میں کوئی بالکل اجنبی سب سے زیادہ اپنا لگنے لگتا ہے۔''

''پتا ہے کبھی کبھی ساری زندگی ساتھ رہنے والے ایک دوسرے کے بارے میں وہ سب نہیں محسوس کر پاتے جس کا دل تقاضا کرتا ہے۔''

''وہ تو قسمت کی بات ہے جو دل میں اترنے والا دل کی ساری ضدیں پوری کرنے والا اجنبی راستوں پر مل جائے جیسے مجھے عاشر عباس اپنی طرف بلاتا ہے اس طرح تو کسی اور نے جرات کی ہی نہیں میں چاہتے ہوئے بھی خود کو اس کے بارے میں سوچنے سے نہیں روک پاتی۔''

وہ گلاب اور گیندے کے حسین امتزاج سے کارنر ٹیبل کو سجاتے ہوئے خوابناک لہجے میں بول رہی تھی اس کی آخری بات پر خولہ نے چونک کر دیکھا۔

''کیا ایسا ہوتا ہے کہ ہم نا چاہتے ہوئے بھی کسی کے بارے میں سوچنے لگتے ہیں وہ ہماری زندگی میں شامل ہونے لگتا ہے۔'' وہ اسی کے انداز میں آ کر پوچھنے لگی۔

''کیوں کہ ہمارے اندر اترنے کی کوشش کرنے والا سچ ہوتا ہے پھر نہ کوئی جھوٹ اس کا راستہ روکتا ہے اور نہ ہی کوئی فریب کام آتا ہے۔''

کشمالہ کا لہجہ پُر یقین تھا وہ واقعی میں بہت بدل گئی تھی یا پھر سوچ کا نیا راستہ دریافت ہوا تھا تو یہ تبدیلی خولہ کو محسوس ہو رہی تھی۔

''مالا! ہم سچ جھوٹ کی پہچان ہی تو نہیں کر پاتے، پھر ہار جاتے ہیں رسوا ہوتے ہیں روتے ہیں۔''

وہ تھکے تھکے لہجے میں بولی کوئی تھکن زدہ عورت اس کے اندر احتجاج کر رہی تھی۔

''ہمیں اپنے اگلے پل میں سانس لینے کی اجازت ملے گی یا نہیں پھر بھی ہم زندگی کو خوب سے خوب تر جینے کے لیے اہتمام کرتے رہتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جب تک ہم بساط نہیں بچھائیں گے ہار جیت کا مزا کیسے اٹھائیں گے ہمیں اعتبار کرنا پڑے گا کسی پر تو یہ زندگی تنہا نہیں گزرتی۔''

ان کی بہت ساری باتیں انگریزی میں ہو رہی تھیں اس لیے خدیجہ کی دلچسپی بھی ختم ہو گئی تھی ویسے

بھی اسے جو سننا تھا وہ بہت پہلے کہا جا چکا تھا۔

اب وہ دونوں کسی عالمی مسئلے پر مباحثہ کر رہی تھیں خدیجہ کو اس سے کوئی غرض نہیں تھی اسے تو بس شام کا انتظار تھا جب وہ اس خوبصورت جوڑی کو ایک دوسرے کے آمنے سامنے دیکھنے کا لطف لینا چاہتی تھی۔

''خولہ! ایک بات کہوں۔'' کشمالہ کی گہری نیلگوں آنکھوں میں کوئی اسرار سا تھا۔

''اگر تم خزیمہ کے بارے میں سوچنا چاہتی ہو تو..... سوچو..... خود کو روکو مت کیا پتا وہی تمہارے لیے بنا ہو اور اس کی وجہ سے تم نے اتنا لمبا سفر طے کیا ہو تمہیں پتا ہے نا ہم کبھی بھی پاکستان نہیں آنا چاہتے تھے پاپا ہمیشہ اصرار کرتے تھے لیکن ہمیں ڈر لگتا تھا ہمارا باپ بھی تو یہیں رہتا ہے ہمیں دنیا میں لانے کا ذمہ دار ہماری ماں کی خوشیوں اور زندگی کا قاتل۔''

''لیکن پھر ہمیں پتا بھی نہیں چلا اور ہم دونوں یہاں آ گئے جہاں سب کے سب ہمارے لیے اجنبی تھے بالکل اجنبی سوائے پاپا کہ اور اب ایسا لگتا ہے کہ یہ سب اپنے ہی تو ہیں ان کے پاس رہنے کو دل چاہنے لگا ہے اب دل کہتا ہے کہیں تو ٹھہرا جائے سکھ کی چھاؤں میں۔''

''ہم سوچتے تھے پتا نہیں کیسے رہ پائیں گے لیکن اب سوچیں تو حیرانی سی ہوتی ہے اب یہاں سے جانا مشکل لگتا ہے۔'' اس کی گفتگو کا تسلسل یکدم خولہ نے توڑا تھا۔

''نہیں مجھے مشکل نہیں لگتا میں نہیں رہنا چاہتی یہاں پر..... میں بہت دنوں سے سوچ رہی ہوں اس بارے میں۔''

''پتا ہے مالا! میں نے یہاں ہر لوگوں کو دوہری زندگی گزارتے ہوئے دیکھا مجھے تکلیف ہوئی ہے اس منافقانہ رویے سے تمہیں پتا ہے میں نے ریڈیو جانا کیوں چھوڑا مجھے ثمرہ کے رویے سے تکلیف ہوئی تھی تم ملی تھی نا سمیع صولت سے کتنا زبردست بندہ ہے نیٹ اور اسٹریٹ فارورڈ..... وہ تو ثمرہ کو پسند کرتا ہے ثمرہ بھی انوالو ہے لیکن اسے اپنے سچ اور اپنی محبت پر یقین نہیں شاید۔ اسے مجھ سے پرابلم شروع

ہوگئی تھی وہ باقاعدہ طنز کرنے لگی تھی۔ سمیع صولت پر اور مجھ سے اس شخص کی پریشانی دیکھی نہ گئی۔"

خولہ کا ذاتی انتشار باہر آ رہا تھا وہ جانیبکب سے اس الجھن میں تھی حالانکہ یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا لیکن وہ اپنی حساس طبیعت سے مجبور تھی اس کا دل چاہتا تھا وہ اپنی ذات سے کبھی کسی کو تکلیف نہ پہنچائے اس کی ذات کا کبھی تماشا نہ بنے لوگ اس کی غیر موجودگی میں اول تو ذکر ہی نہ کریں اگر کریں بھی تو بہت اچھے الفاظ میں اس کی سوچ میں جتنی وسعت تھی اتنا ہی وہ دوسروں کو شفاف دیکھنا چاہتی تھی اور یہاں پر ہی کشمالہ کا اس سے اختلاف شروع ہو جاتا تھا۔

"دیکھو خولہ! ثمرہ جیسے لوگ ہیوسٹن میں بھی ہیں اور لندن میں بھی ہم اپنے آپ کو درست کر سکتے ہیں دوسروں کو نہیں بدل سکتے تمہیں ریڈیو چھوڑنے کے بجائے وہیں پر رہ کر یہ ثابت کرنا چاہیے تھا کہ تم غلط نہیں تھیں غلاظت ثمرہ کی سوچوں اور دل میں ہے جو اس کے اور سمیع صولت کے رشتے کو خراب کر رہی ہے۔"

کشمالہ پھولوں کو ایک جانب کر کے مکمل اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔

"تمہیں پتا تو ہے میں اس جگہ کو چھوڑ دیتی ہوں جہاں ان کمفرٹیبل ہوتی ہوں۔"

اس نے اپنی کمزوری کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

"یہ ہی تو نہیں ہونا چاہیے جگہ بنانا پڑتی ہے شاید ہمیں بھی یہاں جگہ بنانی پڑے گی اپنے فیوچر کے لیے پاپا کے لیے تمام عمر انہوں نے ہمارا خیال رکھا ہے اور اب ہم ان کی خوشی کو نظر انداز کر دیں۔"

کشمالہ نے سنجیدگی سے کہا تو خولہ کے چہرے پر مسکراہٹ سی پھیل گئی افسردگی کے پردے میں چھپی ہوئی مسکراہٹ کشمالہ کو بخوبی نظر آ گئی تھی۔

"پھر تمہارے اور میرے راستے الگ ہو جائیں گے مجھے پتا ہے تم یہاں رہ سکتی ہو اور پھر اب تمہارے پاس یہاں رہنے کا ریزن بھی ہے۔ تمہیں عاشر عباس سے محبت ہوگئی ہے اور محبت اپنے ہونے کو منوا لیتی ہے۔"

''تم چاہو بھی تو اب اس حصار سے نہیں نکل سکتیں اور میں ایسی کوئی زنجیر جان بوجھ کر نہیں ڈال سکتی یہاں نانو کی گود میں سر رکھ کر دل کی بات کہہ دینے اور اس گھر سے باہر نکل کر جینے میں بہت فرق ہے بڑی مشکل ہے یہاں کی زندگی اور ویسے بھی تمہاری طرح کا میرے پاس کوئی ریزن نہیں ہے یہاں رہنے کا۔''

''میں نہیں جانتی خزیمہ کون ہے کیا ہے اس کے گھر والے کیسے ہیں اور مجھے کیا کیا سمجھوتے کرنے پڑیں گے۔ میں نے دیکھا ہے یہاں کے لوگ دوسروں کی زندگی کو مشکل بنا کر سکون میں ہوتے ہیں۔''

وہ اداس سے لہجے میں بولی حالانکہ کشمالہ نے ہمیشہ نوٹ کیا تھا خزیمہ سے چیٹنگ کے بعد وہ ڈسٹرب تو ہو جاتی تھی مگر ڈپریس نہیں۔

''کیا ہوا ہے خولہ..... تم کچھ پریشان ہو۔'' کشمالہ نے بغور اس کا چہرہ دیکھا اور اس کے الجھے ہوئے بالوں کے لچھے ہاتھوں سے سنوارنے لگی۔

''کچھ نہیں یار پتا نہیں کیوں میں نے دو تین بار مما کو خواب میں دیکھا ہے ایک ہیولہ سا ہے جو مجھ سے باتیں کرتا ہے اور پھر اپنی بات مکمل کیے بغیر غائب ہو جاتا ہے اور مجھے اپنی ہی آواز سنائی دیتی ہے کہ مما آپ کہاں چلی گئیں میں نے مما کو کبھی خواب میں نہیں دیکھا کبھی بھی نہیں۔

اب یہاں آ کر وہ مجھے بہت یاد آتی ہیں مجھے یوں لگتا ہے جیسے انہیں ہمارے یہاں آنے سے تکلیف ہوتی ہے وہ ہمیں منیر کمسل سے چھپانا چاہتی تھیں اور ہم اس کے ہی شہر میں بیٹھے ہیں تمہیں نہیں لگتا وہ ہمیں ڈھونڈتا تو ہوگا۔''

خولہ کی باتیں اتنی معنی خیز اور پُر اسرار سی تھیں کہ ایک لمحے کو یہ سب سوچ کر کشمالہ کا دل بھی غیر معمولی انداز میں دھڑکنے لگا۔

کشمالہ کی یاداشت میں ماں کا بڑا پاکیزہ اور دلکش چہرہ محفوظ تھا اور منیر کمسل ادی دلکشی کی قیمت وصول کرنے کے لیے ان کی ماں کی پاکیزگی کو بازار میں بیچنا چاہتا تھا وہ اتنا ظالم اور شکی تھا کہ اسے اپنی

بچیوں کی دودھ پلاتی ماں کے اس تقدس کی بھی پرواہ نہیں تھی جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ ایک انسان کے رزق کا ذریعہ دوسرے انسان کو بناتا ہے۔

ایک رات وہ نشے میں دھت اپنے جیسے چار پانچ بد ہیت مردوں کے ساتھ اپنی بیوی کے کمرے میں کسی وحشی جانور کی طرح گھسا تھا وہ شاید جوئے میں اپنی بیوی ہار گیا تھا یا اس کی حسین بیوی کی قیمت بڑھ گئی تھی۔

کچھ تو ایسا تھا کہ خریدار گھر تک چلے آئے تھے اور منیر کمال کو احساس تک نہیں تھا کہ وہ کیا کرنے چلا ہے۔

شراب نے اس کی عقل کو ماؤف کر دیا تھا اور جب تعقل کے دروازے بند ہو جائیں تو غیرت اور محبت مارے گھٹن کے خود بخود مر جاتی ہے۔

''مریم اٹھ!'' اس نے اپنی بیوی کو آواز دی تھی جو کمبل سر تک تانے اس قیامت سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''میں کہتا ہوں اٹھ آج تجھے کہیں جانے کو نہیں کہہ رہا۔ چل جلدی کر سب کو فارغ کر۔'' وہ اپنے مخصوص لہجے میں کہہ کر اس کے بستر کی جانب بڑھا۔

اس نے آگے بڑھ کر کمبل کھینچا تھا اور کمبل میں چھپی ہوئی ماں عیاں ہو گئی تھی۔

ننھی سی بچی نے بھی اپنی ماں کی پامالی کو محسوس کیا تھا اسی لیے وہ سینے سے منہ لگائے دودھ پیتے ہوئے کسی غیر معمولی پن کا احساس کرتے ہوئے بے ساختہ چیخ اٹھی اس کی معصوم سی چیخ اور مریم کی بے بسی کی صدا اس لمحے شاید آسمان تک گئی تھی۔

تب ہی انہی چار مردوں میں سے ایک کو یہ منظر عجیب سے خوف میں مبتلا کر گیا۔

دودھ پلاتی ماں کے جسم سے وہ اپنی ہوس پوری کرنے آئے تھے جب کہ اس کا جسم تو اس لمحے

عبادت میں مصروف تھا۔

ایک بچی اس کے پہلو میں تھی اور دوسری سینے سے لگی ہوئی تھی۔

اور وہ ہولناک انداز میں کبھی اپنی بچیوں کو اور کبھی ان کے باپ کو دیکھ رہی تھی سب کچھ اتنی تیزی میں ہوا تھا کہ وہ منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکال پائی تھی۔

"سالی تیرے نخرے ختم نہیں ہوتے تجھے ان چڑیلوں کے ساتھ دفن کر دوں گا اگر میری بات نہ مانی۔"

منیر کمال دھاڑا تھا اور دوسری بچی نے کسمسا کر انگڑائیاں لی تھیں۔ تب وہی مرد آگے بڑھا تھا جسے دودھ پلاتی ماں نے عجیب سے خوف میں مبتلا کیا تھا۔

آگے آ کر اس نے سب سے پہلے کمبل اٹھ کر مریم اور اس کی بچیوں پر ڈالا تھا وہ تینوں اس کمبل کی پناہ میں آ گئی تھیں تب ہی اس نے منیر کمال کو باہر نکلنے کا اشارہ کیا تھا اور اپنے ساتھ آئے باقی تینوں کو.....

ان کی دشمنی تو منیر کمال سے تھی وہ تو اسے برباد کرنا چاہتے ہیں انہیں اس بات کا بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنا غلیظ دشمن ہے کہ اپنا گھر اپنے بیوی بچے بھی اپنی ہوس اور ذلالت کی بھینٹ چڑھانے کو تیار رہتا ہے۔

انہیں اب ایک ایسے شخص سے دشمنی کا اعلان کرتے ہوئے بھی شرم آ رہی تھی مریم اور اس کی بچیاں تو کمبل کی پناہ میں آ گئی تھیں اور منیر کمال حیرانی سے کبھی ایک کا تو کبھی دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگتا۔

لاؤنج سے ملحقہ کمرے کا منظر ان چاروں کی نگاہوں میں بھی تھا۔

"کیا چاہتے ہو تم لوگ۔" وہ الجھے ہوئے انداز میں پوچھ بیٹھا۔

"ہم اب تمہاری موت چاہتے ہیں تمہارے زندہ رہنے کا خمیازہ بہت سارے لوگ بھگت رہے ہیں اب اور یہ سلسلہ نہیں چلے گا۔"

یہ وہی شخص تھا جس نے مریم پر کمبل ڈالا تھا شاید انسانی عقل کے لیے حیرت کا مقام یہ ہی ہوتا

ہے جب لمحوں میں دل پلٹ جاتے ہیں اور ایک شیطان صفت انسان اپنی فطرت سے باز آجاتا ہے ایسا کوئی لمحہ اس لمبے تڑنگے کرخت آدمی کی زندگی میں بھی آیا تھا جب وہ اس کی لپیٹ میں آکر جی جان سے کانپ گیا تھا۔

اسے زندگی میں بڑے سے بڑے گینگسٹر اور کرپٹ آدمی کا سامنا رہا اس کے اپنے کئی بار اور جوئے کے اڈے چل رہے تھے مختصر لباس والی عورتیں اور ان کی بے حجابی پر ستائش کے جملے پھنکنا اس کا روز کا معمول تھا لیکن آج پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اسے ایک ماں کی بے حجابی نے آزمائش میں ڈال دیا تھا۔

اسے خود بھی نہیں پتا چلا کہ اس نے کب مریم کی بے بسی کو کمبل کی آڑ میں چھپا لیا اور اب وہ منیر کمال کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''تم بہت زیادہ بکواس نہیں کر رہے تمہیں آم کھانے سے مطلب ہے یا پیڑ گننے سے۔'' منیر کمال کا نشہ آہستہ آہستہ اتر رہا تھا نشہ نہ بھی چڑھا ہوتا تب بھی اب وہ مریم سے نجات چاہتا تھا۔

''دیکھو منیر! تم بہت سستے میں چھوٹنا چاہتے ہو جبکہ ایسا ہوگا نہیں تم ایک ایسی عورت کا سودا کر رہے ہو جو ناچنا تو دور کی بات بار میں کھڑی تک نہیں ہو سکتی۔''

اس اجنبی آدمی نے شاید مریم کا دفاع کیا تھا۔

''اعجاز الدین! وہ کیا کر سکتی ہے اور کیا نہیں تمہارا مسئلہ نہیں ہے وہ میری بیوی ہے اور میرا حکم کبھی نہیں ٹال سکتی تمہیں اگر یہ سودا منظور ہے تو ٹھیک ورنہ اور کچھ نہیں ہے میرے پاس تمہارے مال کی قیمت چکانے کے لیے۔''

منیر کمال کی آواز مریم کے کانوں میں سیسہ بن کر پگھل رہی تھی۔

اور اس کا دل کمبل کے اندر چڑیا کے بچے کی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا وہ نیم تاریکی میں کبھی بیٹیوں کا چہرہ دیکھنے لگتی کبھی کمبل کی اوٹ سے کھلے دروازے کے باہر کا منظر۔

''یا اللہ تو رحیم کریم ہے غفور ہے تو میری عزت بچانے والا ہے تو میری بچیوں کی حفاظت کرنے والا ہے۔''

وہ اپنی حسین پریوں کو گود میں بھینچ کر بیٹھی تھی پھر بھی کسی پل چین نہیں آ رہا تھا اسے یوں لگ رہا تھا ہر گزرتا پل اسے ان بچیوں سے دور لے کر جا رہا ہے جن کا باپ شرم و غیرت کو گروی رکھ کر ہر رشتے کو پامال کر چکا تھا۔

اللہ جانے وہ ایسا کیوں تھا وہ بار بار سوچتی مگر جواب نہ ملتا اور جواب مل بھی جاتا تو کیا کر لیتی اس اجنبی دیس میں اس کا پرسان حال سوائے رب کی ذات کے کوئی اپنا نہ تھا۔

ماں باپ انڈیا میں تو بھائی پاکستان میں اب تو ان سے ملے بھی سالوں گزر گئے تھے شادی کے تین ماہ بعد اسے کراچی ائیر پورٹ پر بھائی بھابھی اور دیگر رشتے داروں نے ان کہے انجانے خدشوں کے ساتھ منیر کمال کے ساتھ رخصت کر دیا تھا اس کے بعد ان سے رابطے کی صورت منیر کمال نے باقی نہ رہنے دی تھی اور یہ ہی حال ماں باپ کے ساتھ رابطے کا تھا۔

ہر دوسرے مہینے رہائش بدلتی تھی اسے تو یہ بھی پتا نہیں تھا کہ آج وہ کس محلے اور کس علاقے میں آباد ہے اور لندن کے اس مضافاتی علاقے میں کوئی پاکستانی رہتا بھی ہے یا نہیں۔

یہ تو پہلی بار اس نے منیر کمال کو ان آدمیوں کے ساتھ اردو میں بات کرتے دیکھا تھا۔

اور نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی نظریں اس لمبے تڑنگے بندے کی طرف اٹھ گئی تھیں جس کو منیر کمال نے اعجاز الدین کے نام سے پکارا تھا گو کہ وہ منیر کمال سے الگ ذات نہیں تھا لیکن اس وقت وہ مریم کے لیے نیکی کا فرشتہ ثابت ہوا تھا۔

وہ اپنی حیران آنکھوں سے اس منظر کے اندر اتر کر اپنے لیے عاقبت کا سامان ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی۔

یہ شخص جو اپنے بار کے لیے مجھے پسند کرنے آیا تھا کیا مجھے منیر کمال کے جہنم سے نجات دلا سکتا ہے۔ یکدم ہی ایک سوچ اس کے ذہن سے لپٹی تھی۔

''کیا میں اس سے مدد مانگوں.....'' وہ مانوس سے لہجے میں بات کر رہا تھا۔

''دیکھو منیر! تم نے مجھے دس عورتیں دینے کا وعدہ کیا تھا اور بدلے میں تم مجھ سے اب تک بیس کی قیمت ہتھیا چکے ہو۔''

''مجھے تم پر ترس آجاتا ہے اور تم ہر بار میرے ہاتھوں قتل ہونے سے بچ جاتے ہو دیکھو اس بار میرے ساتھ ڈرامے بازی بند کرو ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔''

وہ اب غصے سے دھاڑ رہا تھا جس کا منیر کمال پر کوئی اثر نہیں تھا۔

''تم ان تینوں کو لے جاؤ۔''

ایک تو نشہ اور پھر پکڑے جانے کا خوف وہ اعجاز الدین یا دوسرے بروکروں کی طرح با اثر اور پُر اعتماد نہیں تھا اس لیے کمزور پڑ گیا مریم کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا اس نے قہر آلود نگاہوں سے اپنے مجازی خدا کو دیکھا جس کے ساتھ نکاح کے بول پڑھ لینے کے بعد اس کی ماں نے خاص طور پر اسے تاکید کی تھی کہ وہ اب مرتے دم تک صرف اپنے شوہر کی فرمانبردار اور وفادار ہوگی۔

کیا وہ عہد اس فرمانبرداری اور وفاداری کے لیے تھا۔ وہ دونوں بچیوں کو بستر پر ڈال کر آندھی کی طرح ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی لیکن اس کی نظریں صرف منیر کمال پر جمی تھیں۔

اس کا مخاطب اس کمرے کا وہ بے حس نفوس تھا جس نے اس کی کفالت کا وعدہ بھری برادری کے سامنے اور ایک پاک شرعی رشتے میں بندھ کر کیا تھا۔ مگر وہ انسان تو حیوانیت کے بھی نچلے درجے پر جا پہنچا تھا اس طرح کا سلوک تو جانور بھی نہیں کرتے انہیں بھی اپنی اولاد کو سرد و گرم سے بچانے کا ہنر آتا ہے مگر یہ کیسا انسان تھا جو اپنے ہی خون اور اپنی عزت کو سر بازار نیلام کر رہا تھا۔

مریم نے تڑپ کر اس کا گریبان پکڑ لیا تھا۔ اس کے دھان پان سے وجود اور پتلے پتلے ہاتھوں میں اللہ جانے کہاں سے اتنی طاقت آ گئی تھی کہ وہ منیر کمال کا پورا وجود جھنجھوڑتے ہوئے خوب زور زور سے چیخی تھی۔

کیا اس دن کے لیے لوگ بیٹیوں کی شادی کرتے ہیں وہ زمانہ اچھا تھا جب انہیں زندہ دفن کرتے رہتے تھے انہیں پتا ہوتا تھا کہ کوئی تم جیسا درندہ ان کی قسمت کے چیتھڑے اڑائے گا اسے بہتر ہے وہ خود ہی انہیں دفن کر دیں۔

''منیر کمال! ڈرو اللہ کے عذاب سے بیٹیوں کی ہائے لگ گئی تو کوڑھی بن کر بھیک مانگو گے کوئی پناہ نہیں دے گا۔''

وہ بولتے بولتے نیچے زمین پر گر پڑی تھی کیونکہ منیر کمال نے اپنا گریبان چھڑاتے ہوئے زور کا دھکا دیا تھا تب اعجاز الدین نے آگے بڑھ کر بازو سے تھام کر اسے اٹھایا تھا نیلے رنگ کے شلوار قمیض میں دوپٹے سے بے نیاز وہ منحنی سا وجود صدمے سے کانپ رہا تھا۔ اس کا بے حد گورا چہرہ اور نیلی آنکھیں آنسوؤں میں ڈوب کر بھی منیر کمال کا دل نہ موڑ پائی تھیں۔

وہ ہنوز منہ موڑے گالیاں بک رہا تھا کبھی اعجاز الدین کو اور کبھی مریم بنت ذاکر حسین کو جسے آج یقین ہو چلا تھا کہ اگر اللہ اپنے بندوں سے ناراض ہو جائے تو پھر انہیں منیر کمال جیسا بنا دیتا ہے۔

ان پر خیر کے سب دروازے بند کر کے صرف ایک دروازہ کھولتا ہے کسے جہنم کا دروازہ کہتے ہیں۔

''منیر کمال! مجھے یہ سودا منظور ہے حوالے کرو اپنی بیوی اور بچیوں کو اور ابھی ابھی مجھے اسٹامپ پیپر پر لکھ کر دو اس کے بعد تم مجھے اپنی منحوس صورت کبھی نہیں دکھاؤ گے نیچ انسان!''

اعجاز الدین کے الفاظ نے پورے گھر کی چھت مریم کے سر پر گرا دی تھی پہلے ہی صدمہ کم تھا کہ ایک اور قیامت..... وہ پسپا ہو کر اعجاز الدین کے بازوؤں میں جھول گئی تھی۔ اس نے اپنے آدمیوں کو

اشارہ کر کے دونوں بچیوں کو اٹھانے کا کہا۔

''ان کا چھوٹا موٹا سامان بھی لے لو۔'' وہ ان کا باپ تھا یا نہیں لیکن بچیوں کی ضروریات سے بخوبی واقف تھا۔

مریم بے ہوشی کی حالت میں اب صوفے پر پڑی تھی منیر کمال کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا وہ شاید جان بچ جانے اور مصیبت ٹل جانے کے نشے میں چور ہو گیا تھا کیونکہ آنے والے چند دنوں میں وہ اب اس شہر سے تو کیا اس ملک سے بھی بھاگنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

اس کی دبئی کے کسی شیخ کے ساتھ بڑی اچھی کاروباری ڈیل ہوئی تھی وہ اب یہ چھوٹے موٹے دھندے اور دلالی کے کام کرنے کے بجائے کوئی بڑا کاروبار کرنا چاہتا تھا اور اس سارے لی کاروائی کے دوران اسے اپنے سے وابستہ یہ تینوں نفوس بھاری بوجھ محسوس ہو رہے تھے۔

مریم وہ عورت نہیں تھی جو اس کی برائیوں میں شریک ہو کر اسے سہارا دیتی۔

وہ نمازی پرہیز گار اور اسے ہر وقت راہ راست پر چلنے کا لیکچر دینے والی عورت تھی جس سے وہ از حد بے زار ہو چکا تھا۔

وہ اسے اللہ سے ڈرانے والی عورت تھی۔

اسے قانون کی دھمکیاں بھی دیتی تھی اور شاید اس کے خلاف گواہیاں بھی جمع کر رہی تھی۔

وہ کمزور اور نفس کے ہاتھوں مغلوب ہونے والی عورت نہیں تھی جو منیر کمال کی دھمکیوں سے مغلوب ہو کر اپنی دنیا اور آخرت خراب کر ڈالتی۔

منیر کمال نے اس کا سب سے رابطہ بند کر رکھا تھا ان کے گھر میں فون تک نہیں تھا اور خط و کتابت کے لیے گھر سے باہر نکلنا پڑتا تھا۔ جس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اسے لندن آئے ہوئے دو سال ہو چکے تھے ان دو سالوں میں اس نے لندن کے چند ہاسپٹل

اور ایک آدھ ڈیپارٹمنٹل اسٹور ہی دیکھا تھا۔ وہ ایسے فلیٹ میں مقیم تھی جہاں سے باہر کی روشنی اندر آنے کا کوئی راستہ نہیں رکھا تھا۔

اسے یہ سب اور اتنی بدحال زندگی بالکل بھی عجیب نہیں لگتی تھی نہ ہی غصہ آتا تھا وہ تو ہمیشہ یہ سوچتی تھی کہ اللہ نے اس تکلیف میں مبتلا کر کے اسے کسی بڑے عذاب سے محفوظ رکھا ہے۔ ورنہ وہ منیر کمال جیسے بدفطرت اور بدنیت آدمی کو بڑی آسانی سے قتل کر کے اپنی عاقبت خراب کر سکتی تھی کیونکہ بظاہر مہذب اور ہمدرد نظر آنے والا یہ دوغلا انسان اول دن سے اس کے لیے کتنا کریہہ اور بدقماش تھا یہ وہ ہی جانتی تھی۔

شادی کی پہلی رات اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے کمرے میں دوستوں کو بھیج دے اور پھر مذاق کہہ کر قصے کو کوئی اور رنگ دے دے تو آپ ایسے شخص سے کیا امید رکھیں گے۔

جو تنہائی میں آپ پر ذہنی تشدد کے ساتھ جسمانی تشدد کے بہانے بھی ڈھونڈے تو کیا ایسا مجازی خدا پرستش کے لائق ہو سکتا ہے۔

اور پھر ایک ایسا شخص جس کے اپنی بھابھی اور نہ جانے کتنی عورتوں کے ساتھ جسمانی تعلقات ہوں کیا ایسے مرد کے ساتھ زندگی گزاری جا سکتی ہے یہ تو وہ اس کے ذاتی فعل تھے جن سے مریم کا براہ راست واسطہ تھا۔

باہر کی دنیا میں وہ کیا کرتا ہے اس کا کاروبار کیا ہے۔ کردار کیا ہے یہ تو مریم کے دائرہ اختیار سے باہر کی بات تھی۔

وہ اپنی زندگی کے ساتھ برا ہونے کی حد تک اپنی حق تلفی کی وجہ سے تو احتجاج کر سکتی تھی نا!

اس نے جب بھی احتجاج کیا تھا اسے منیر کمال کے سخت ہاتھ کا وار سہنا پڑا تھا پہلی بار جب اس نے منیر کمال کے اس رویے کی شکایت اپنے گھر والوں سے کی تو کسی نے بھی خاص نوٹس نہیں لیا تھا وہی روایتی سی نصیحت عورت کو صبر کرنا پڑتا ہے نباہ کرنا پڑتا ہے۔

مریم اس کی یہ باتیں سن کر سوجان سے کانپ جاتی تھی لیکن اس کی بات کا کوئی ثبوت نہیں ہوتا یہ باتیں اپنے گھر والوں پر ثابت کرنے کے لیے۔

اس کی بہنوں اور بھابھیوں کے نزدیک وہ کم عمر تھی کم فہم تھی نکاح کے بعد مرد اور عورت کے درمیان استوار ہونے والے تعلقات کی خوبصورتی اور نزاکتوں کو نہیں سمجھتی تھی اس لیے اس طرح کی باتیں کرتی تھی اور مریم یہ سب سن کر صبر کے گھونٹ پی کر رہ گئی تھی۔

وہ ان کو یہ نہیں باور کرا سکتی تھی کہ کم عمری اور کم فہمی ہونے کے باوجود وہ اپنی عورت ہونے کی قدر و قیمت سے بخوبی واقف ہے وہ جانتی ہے ایک جسم دوسرے کی روح اور احساسات پر کچوکے کیسے لگاتا ہے۔

ہوس اور من کی گرمی سے سلگتا تن..... کتنے مختلف ہوتے ہیں دونوں ایک دوسرے سے۔

مگر کوئی اس کی بات سنتا تو سمجھتا۔

وہ سب کی نظر میں کم فہم ہی رہی اور منیر کمال اسے لندن لے آیا جہاں آتے ہوئے اس نے سوچا تھا کہ شاید اب اس کی قسمت کے ستارے بھی موافق سمت میں سفر کرنے لگیں۔

کہتے ہیں کہ سفر وسیلہ ظفر ہوتا ہے۔

لیکن یہ سفر بھی منیر کمال کے لیے وسیلہ ظفر ثابت ہوا اسے اپنے جیسے بدقماش لوگوں کی ٹولی مل گئی مریم کا عرصہ حیات تنگی سے گزرنے لگا۔ وہ اب اسے ان راستوں پر چلانا چاہتا تھا جن کا انجام مریم کے لیے حرام موت کے سوا کچھ نہ تھا۔

پہلی بار جب اس نے منیر کمال کا ساتھ دینے اور طوائفیت کی راہ اپنانے سے انکار کیا تھا تو اس کی کوکھ کا سکھ اس سے چھین لیا گیا تھا۔ منیر کمال نے اس پر اتنا جسمانی تشدد کیا تھا کہ اندر کا درد لہو کی صورت بہہ نکلا تھا۔

کئی دن تک وہ بستر سے اٹھنے کے قابل نہ تھی روتی دھوتی اپنی کم مائیگی کا ماتم کرتی رہی وہ تو ماں بننے جا رہی تھی مگر اب اس کے اندر صرف سناٹے راج کر رہے تھے زندگی کا احساس دلاتا کوئی جذبہ اپنی موت آپ مر گیا تھا۔

پھر اس طرح کے حادثے اس پر بارہا گزرے۔ وہ سہہ گئی۔

شاید عورت کے جنم کے لیے جو چکنی مٹی تیار ہوتی ہے۔ اس میں ایک نہیں کئی آزمائشیں ایک ساتھ جمع کر دی جاتی ہیں۔

اب یہ آزمائش نہیں تو اور کیا تھا کہ وہ کسی اجنبی اعجاز الدین کے حوالے کر دی گئی تھی محض اس لیے کے منیر کمال کے پاس ہر جانے کے طور پر ادا کرنے کے لیے اس سے زیادہ قیمتی کوئی چیز نہیں تھی۔

یا پھر اس لیے کہ اس کا وجود اور آگاہ ہوتا شعور اب منیر کمال کو کھٹکنے لگا تھا وہ اپنے جرم چھپانے کے لیے اسے راستے سے ہٹا دینا چاہتا تھا اور اس کے ساتھ ان معصوم پریوں کی صورت سے بھی بے زار تھا جو اس کا اپنا خون تھیں۔ جنہیں دیکھ کر قدرت کی صناعی پر پیار آتا تھا اور منیر کمال کا کٹھور دل انہیں اپنے راستے کی دیوار سمجھتا تھا۔

یہ قدرت کی ستم ظریفی نہیں تو اور کیا تھا مگر کاتب تقدیر کے فیصلے ہمیشہ وہ نہیں ہوتے جن کی توقع انسانی فہم کر رہا ہوتا ہے۔ کچھ غیر متوقع طور پر بھی ہو جاتا ہے تب یقین آتا ہے کہ اللہ بڑا بے نیاز ہے وہ اپنے بندوں سے کبھی غافل نہیں ہوتا۔

☆.....☆.....☆

"بائی داوے آپ کیا کر لیں گی۔"

شجاع نے تائی کی آواز کے اتار چڑھاؤ کا جواب اپنے ٹھنڈے ٹھار لہجے سے دیا تھا۔ صوفیہ نے اسے ہمیشہ بہت پرسکون اور مدہم لہجے میں ہی سنا تھا اس لیے وہ کوئی اندازہ نہیں کر سکتی تھی کہ اس وقت وہ

کس موڈ میں ہے اور اس کا اگلا ردعمل کیا ہوگا۔

''اے لڑکے.....تم میرے منہ مت لگو ہمارا تمہارا کوئی واسطہ نہیں۔'' وہ یکا یک اپنا بھاری بھرکم وجود لے کر کھڑی ہوگئی تھیں اور اب ان کا مخاطب صرف صوفیہ تھی۔

''سنو لڑکی! یہ تماشے بار بار اس گھر میں نہیں چلیں گے جس کا جو دل چاہتا ہے کرتا ہے جدھر دل کرتا ہے منہ اٹھا کر چلتا بنتا ہے۔

بڑے دھوکے کھا لیے ہم نے۔'' انہوں نے ایک گہری سانس لی۔

''اب پھر سے وہی تماشے شروع ہو جائیں یہ ہماری غیرت کو گوارا نہیں۔''

وہ بالکل نئے پُر جلال انداز میں کہہ رہی تھیں صوفیہ کو نا چاہتے ہوئے بھی ان کی طرف سنجیدگی سے متوجہ ہونا پڑا۔

''کون سے تماشے تائی آپ لوگ اگر سعدیہ کے جانے کو تماشا کہہ رہے ہیں تو کہیں نہ کہیں اس کی ذمہ داری آپ سب پر عائد ہوتی ہے لڑکیوں کو کالج آپ نے نہیں جانے دیا کہ خودسر ہو جائیں گی ان کو اعتماد اور اعتبار اس لیے نہیں دیا کہ اپنے فیصلے خود کرنے لگیں گی اور آپ کو مشکل ہو جائے گی۔''

اس سے پہلے وہ کچھ اور کہتی تائی نے آگے بڑھ کر اسے روک دیا۔

''چپ کر جا لڑکی! آگے ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو زبان گدی سے کھینچ لوں گی تو ابھی جانتی نہیں مجھے۔''

ان کے الفاظ تھے کہ برقی تاریں جو وہاں کھڑے ہر نفوس سے لپٹ گئی تھیں۔

شجاع کا ضبط جواب دے گیا تھا نعمان نے آگے بڑھ کر ماں کو تھاما۔

''کیسی فضول باتیں کر رہی ہو اماں تم بھی.....لمحوں میں ہماری عزت دو کوڑی کی کر کے رکھ دی صوفیہ کو اپنے گھر جانا ہے جانے دو تم کاہے کو ٹانگیں اڑا رہی ہو۔''

شجاع نعمان کی باتیں سن کر مزید حیرت میں گھر گیا تھا..... اگر صوفیہ ہاتھ کے اشارے سے نہ روکتی تو وہ ان کی ساری باتوں کا جواب دینے والا تھا۔

لیکن اگلے لمحے اسے یہ بھی خیال آیا تھا کہ کیا فرق رہ جائے گا ایک جاہل عورت اور اس میں.....

''اے ہٹو..... تم اپنی بکواس بند کرو..... بڑی ہمدردی ہے تمہیں اس صوفیہ سے۔'' تائی نے لفظ صوفیہ کو یوں چبایا تھا جیسے اس کا کچومر نکال رہی ہوں۔

شجاع اب ایک لمحہ بھی مزید نہیں رک سکتا تھا۔ اس نے صوفیہ کا ہاتھ مضبوطی سے تھاما تھا۔

''میرے ہاتھ سے کوئی ضائع ہو جائے گا صوفی چلو نکلو یہاں سے اب تمہارا یہاں رہنا ایک پل کے لیے بھی ٹھیک نہیں۔''

نعمان کی نظروں میں دونوں کے لیے الوداعی تاثرات تھے۔ چچی کے لیے تائی کا مقابلہ کرنا آسان نہیں تھا ویسے بھی ان کی بیٹی گھر سے بھاگ گئی تھی ان کا بولنا ایک نئی قیامت کو آواز دینے کے مترادف تھا۔

صوفیہ نے شجاع کی معیت میں قدم آگے بڑھائے ہی تھے کہ پھر پیچھے سے تائی کی پاٹ دار آواز سنائی دی تھی۔

''تمہاری ماں کو بھی خودسری کا خمار لے ڈوبا بڑا ناز تھا اسے اپنی تعلیم پر اپنے اونچے خاندان پر اور گھمنڈ کرتی تھی کہ ندیم شاہ اس کے بغیر سانس بھی نہیں لے سکتا۔'' ان کے منہ سے شعلے نکل رہے تھے۔

''اور میں جانتا ہوں آپ نے ندیم شاہ کے ساتھ کیا کیا اور میں یہ بھی جانتا ہوں راحت بیگم کو اس گھر سے نکلنے پر کس نے مجبور کیا۔

اور میں یہ بھی جانتا ہوں جب راحت بیگم پر الزام ثابت نہیں ہو سکا تھا تو ندیم شاہ نے شدید ڈپریشن میں آ کر خودکشی کر لی تھی زہر کھا کر کیونکہ وہ راحت بیگم سے شرمسار ہی نہیں اپنی کم عقلی پر نادم بھی تھا۔''

شجاع نے بغیر سانس لیے کچھ اس انداز میں تابڑ توڑ حملے کیے تھے کہ سب کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ اور پتا ہے میں اس شخص کو بھی جانتا ہوں۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا تائی کی ایک زوردار چیخ بلند ہوئی تھی۔

''ہائے میرے ربا! میرا دم گھٹ رہا ہے۔'' وہ اپنا سر پکڑ کر قریبی صوفے پر گر گئی تھیں۔

چچی نے جلدی سے آگے بڑھ کر انہیں سہارا دیا تھا۔

نعمان کو یہ سارا کچھ ڈرامہ لگ رہا تھا۔ وہ پورے اطمینان کے ساتھ صوفیہ اور شجاع کی طرف مڑا۔

''آپ لوگ جاؤ..... سب ٹھیک ہے میری اماں کو عادت ہے اس طرح کے ڈرامے کرنے کی۔''

''جاؤ صوفیہ گڈ لک..... تمہارا واقعی یہاں رہنا ٹھیک نہیں کسی بھی دن تمہارا زبردستی سفیر بھائی کے ساتھ نکاح ہو جائے گا تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا۔ ہم لوگ خاصے خطرناک لوگ ہیں۔''

وہ اس گھر کا عجیب و غریب فرد تھا صوفیہ کو قدم قدم پر حیران کرنے والا اسے اپنے غیر معمولی طرز عمل سے چونکانے والا۔ اس بار تو شجاع بھی اسے قدرے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ملگجی سی نیلی ٹی شرٹ، سیاہ رنگ کی پینٹ اور گردن سے نیچے جاتے ہوئے لمبے بال اس پر ستم وہ زنجیر نما چین گلے میں اور سرخ رنگ کا بینڈ ہاتھ میں باندھے وہ دبلا پتلا لڑکا جانے کیوں اسے اس گھر کا فرد نہیں لگا۔

اس نے آگے بڑھ کر نعمان کا ہاتھ تھاما دوسرے ہاتھ سے گلے لگاتے ہوئے شکریہ ادا کیا..... وہ مسکراتی نگاہوں سے صوفیہ کو دیکھ رہا تھا جس کے پاس اب متجسس ہونے کو کچھ نہیں بچا تھا۔

شجاع نے بتایا تھا اس کے باپ نے خودکشی کی تھی اور اس بات پر تائی کو غش آ گئے تھے۔

نہ جانے کیوں اسے بھی مزید کچھ جاننے کی تمنا نہیں رہی تھی عجیب سا خوف رگ و پے میں اتر گیا اور وہی کیفیت اس کے چہرے پر بھی رقم تھی چاچی سے ملنے کے بعد اس نے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔

تائی ہنوز اپنا دل تھامے یوں اوندھی پڑی تھیں جیسے بہت بڑا صدمہ دل پر گزر گیا ہو۔

لمحوں میں منظر بدلا تھا صوفیہ اور شجاع جا چکے تھے نعمان نے چھت کی راہ لی تھی آج صوفیہ والا کمرہ خالی تھا اس نے قدرے سکھ کا سانس لیا وہ اپنے سگریٹ کے پیکٹ کو تھپکتا ہوا سیڑھیاں چڑھ گیا۔

چچی تائی کے لیے گلوکوز بنا رہی تھیں اور تائی اب سیدھی چت لیٹی چھت کو بڑی خوفناک نظروں سے گھور رہی تھیں۔

پہلے راحت اور اب اس کی بیٹی۔ انہیں رہ رہ کر اپنی شکست کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ دلی رنج کا ناٹک بھول کر اپنے شوہر کو فون کرنے چل دی تھیں۔

صوفیہ ہاتھ سے نکل جائے ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔

انہیں لمبے چوڑے وجیہہ سے شجاع سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ بالکل ویسی ہی نفرت جو انہیں راحت سے محسوس ہوئی تھی اپنی بہن کی بنجر سی زندگی دیکھ کر۔

کچھ لوگ زندگی سے کبھی مطمئن نہیں ہوتے۔ حرص، حسد اور تکبر تینوں ہی وہ بد صفات ہیں جو انسانیت کو گھن لگا دیتی ہیں ساری زندگی نا آسودگی کا رونا رونے والی نسرین کا اصل مسئلہ اس کی حرص تھی جو اس کے ہر اوصاف کو مٹاتی چلی گئی تھی۔ اور آج یہ عورت محض اپنے خالی پن پر نازاں تھی۔

☆.....☆.....☆

جو سود و زیاں کی فکر کرے
وہ عشق نہیں مجبوری ہے
میں تجھ کو کتنا چاہتا ہوں
یہ کہنا غیر ضروری ہے

کاشف نے لہک لہک کر شعر پڑھا تھا اور کشمالہ نے گھور کر اسے دیکھا البتہ خولہ کی معنی خیز نگاہیں عاشر کے پاس سے گھوم پھر کر کاشف تک پہنچی تھیں۔

''آپ اگر واہ واہ کر دیتے تو کیا بگڑ جاتا آپ کا سرکار.....''

وہ آج شام سے ہی ان کے نرغے میں تھا کاشف نے اسے بمشکل فریش ہونے کی اجازت دی تھی۔

واش روم سے باہر نکلا تو کاشف نے اس کا از سر نو جائزہ لیا تھا۔

شہد رنگ کی ٹی شرٹ اور ڈارک براؤن رنگ کی پینٹ میں وہ ہمیشہ کی طرح دل میں اتر رہا تھا گیلے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ جب ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے آ کر کھڑا ہوا تھا تو کاشف نے بھی اپنا رخ اسی کی طرف موڑ لیا۔ شرٹ کا کلر آنکھوں کے آئینوں میں جذب ہو کر آج ایک نیا رنگ دے رہا تھا۔

کاشف بے ساختہ بول اٹھا تھا۔

''ارے تو گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا ہے آئی مین تیری آنکھیں حد ہو گئی ابھی اندر گیا تھا تو یہ اچھی خاصی کالی تھیں۔''

وہ اسے بچوں کی طرح سہلاتے ہوئے یوں تنقیدی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جیسے وہ اپنی بارات لے جانے کے لیے تیار ہو رہا ہو۔

''بائی داوے آپ میرا دماغ کب تک کھائیں گے۔'' اس کی رکھائی بھی گوارا تھی کاشف بے ساختہ مسکرا دیا۔

''جب تک آپ اچھی طرح تیار ہو کر میرے ساتھ نیچے نہیں چلیں گے۔''

وہ ہشاش بشاش تھا ایک تھکن آمیز سفر کے بعد عاشر نے رشک بھری نظروں سے اسے دیکھا اور اپنا موبائل آف کر کے رکھ دیا جو مستقل وائبریٹ کر رہا تھا۔

''آج کل تیرے فون اور ایس ایم ایس کچھ زیادہ نہیں آنے لگے خیر تو ہے۔'' وہ واقعتاً جاسوس نگاہوں سے کبھی موبائل تو کبھی اسے دیکھ رہا تھا۔

''تجھے جاسوسی کے سوا کوئی کام ہے۔''

''تیری جاسوسی تو ثواب کا کام ہے میں کسی کا دل نہیں ٹوٹتے دیکھ سکتا۔'' وہ بے ساختہ بولا تھا اور عاشر نے انجان بنتے ہوئے اپنے بیڈ کی طرف قدم بڑھائے۔

''میں تھوڑا آرام کرلوں یار بہت تھک گیا ہوں یہ کاغذی کاروائیاں تو جان لے لیتی ہیں۔'' وہ بیڈ پر بیٹھنا چاہتا تھا کاشف نے ہاتھ تھام لیا۔

''اوہ بھئی صاحب! وہ منکر نکیر نیچے آپ کا انتظار کر رہی ہیں مجھے اکیلے تو وہ کسی صورت گوارا نہیں کریں گی۔ سنا ہے پارٹی آپ کے اعزاز میں ہے اسی بہانے ہماری قدر و قیمت میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔''

وہ اپنے بال سنوارتے ہوئے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اس سے مخاطب تھا۔

''بہت فضول بولتے ہو..... میں نہیں جا رہا ادھر ادھر اور یہ گھر میں بیٹھے بٹھائے پارٹی کی کیا تک ہے۔''

''کبھی کبھی پارٹی بغیر تک کے بھی ہوتی ہے سکوت میں ہلچل مچانے کے لیے، زندگی میں شور و غل مچانے کے لیے تاکہ ذہن کی تھکن اترے اس گھر کو اشد ضرورت ہے شور و غل کی، زندگی سے بھرپور ہنگامے کی آئیڈیا تو کشمالہ کا تھا البتہ میں اور خولہ زیادہ ایکسائیٹڈ تھے خولہ کے ریڈیو فرینڈز بھی ہوں گے اب تو منہ سوجا کر نہ بیٹھے رہنا۔ دیکھنا سب لوگ کیسے ہنستے ہیں تو بھی ہنس لینا۔'' کاشف سنجیدگی کی پٹڑی سے اترتے ہوئے دیر بھی نہیں لگاتا تھا عاشر نے اس کی گدی پر مضبوطی سے ہاتھ جما دیا۔

''کیا تو مجھے پاگل واگل سمجھتا ہے۔'' عاشر ملامتی نگاہوں سے گھور رہا تھا۔

''ارے نہیں بھئی! تو تو پاگل کر دینے والی شے ہے تجھے پاگل سمجھنے کی حماقت میں بھلا کر سکتا ہوں۔'' وہ بمشکل گردن سیدھی کر کے بولا۔

''پھر بکواس کی تجھے ڈاکومنٹری نہیں کوئی رومینٹک فلم پروڈیوس کرنی چاہیے ہر وقت.....

ڈائیلاگ....."

"اوہ گویا محترم سمجھتے ہیں کہ رومینس نام کی کوئی چیز بھی اپنا وجود رکھتی ہے اللہ کا شکر ہے ورنہ مجھے بڑی ہمدردی محسوس ہوتی تھی.....اس معصوم....."

عاشر کی تنبیہہ سے بھرپور نگاہوں نے کاشف کی زبان کو بریک لگائے تھے عاشر کو یقین تھا وہ اسے یہاں سے لے جائے بغیر ٹلنے والا نہیں تھا۔

اور اب نیچے آ کر وہ صوفے کی پشت پر اپنا بازو پھیلائے یوں براجمان تھا جیسے اس سارے قصے سے اس کا کوئی سروکار نہ ہو خولہ اپنے دوستوں کے ساتھ بزی ہو چلی تھی کشمالہ سب کی آؤ بھگت کے ساتھ انتظامات کا جائزہ بھی لے رہی تھی۔

خدیجہ کی خواہش پوری ہو گئی تھی۔ اب وہ ہال کمرے میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے اور یہ اتفاق حسین بھی ہو گیا تھا۔

یہ گولڈن براؤن بالوں والی لڑکی نے جو جدید اسٹائل کا لباس زیب تن کیا تھا وہ بھی ڈارک اور لائٹ براؤن کے امتزاج کے ساتھ تھا بالکل عاشر عباس کے ملبوس کی طرح۔

ہلکی پھلکی تیاری اور گلے میں پرل کی مالا سجائے کشمالہ نظر لگ جانے کی حد تک پیاری لگ رہی تھی۔

خدیجہ کا بس نہیں چل رہا تھا اس تیاری پر وہ اسے کہیں چھپا لیتی۔ نانو نے تو خاص طور پر دونوں کو بلا کر دم کیا تھا نظر اتاری تھی۔

"آپ یہ کیوں کرتی ہیں نانو۔" خولہ اکثر الجھ جاتی تھی۔

"کیا پتا میری ہی نظر لگ جائے ان چڑیوں کو.....نظر کسی پیار کرنے والے کی تو لگتی ہے۔"

انہوں نے دم کرتے ہوئے بڑے میٹھے اور پر شفیق لہجے میں کہا تھا۔

"بس یہ ہی باتیں تو باندھ لیتی ہیں۔" خولہ نے مسکرا کر کشمالہ کو دیکھا تھا تب نانو کے چہرے پر

بھی مدہم سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

''میرے بچو اگر مجھے باندھنا آتا ہوتا تو اس کو نہ باندھ لیتی۔ جسے بائیس سال اپنے ہاتھوں سے نکھارا، سنوارا۔''

کچھ دکھ راکھ کی طرح ہوتے ہیں جب کریدو سلگنے لگتے ہیں کشمالہ نے فوراً سے بیشتر ان کے گلے میں بانہیں ڈال دی تھیں۔

''نانو! آج اداس ہونے کی نہیں ہو رہی آپ آپ نے اور میں نے بہت ضروری کام کرنا ہے، یاد ہے نا..... پاپا کو میں نے فون کر دیا ہے وہ بس آنے ہی والے ہیں۔''

خولہ کو اس ضروری کام کا بالکل نہیں پتا تھا جو عہ دونوں کرنے والی تھیں اس لیے اس نے سوالیہ نگاہوں سے کشمالہ کو دیکھا تھا۔

''سب پتا چل جائے گا..... ابھی ذرا نانو کو تیاری میں مدد دو میں کچن دیکھ لوں۔''

''یہ ٹھیک ہے آج تو میں نانو کا میک اپ بھی کروں گی۔''

خولہ وارڈ روب کی طرف بڑھ گئی تھی نانو نے مدد طلب نظروں سے کشمالہ کی طرف دیکھا ہے۔

''تنگ کر رہی ہے آپ کو..... بھلا آپ کو کسی آرٹیفیشل لک کی ضرورت ہے۔''

وہ ان کو تسلی دے کر بیرونی کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ اسے یقین تھا آج تو اس گھر کی خوشیوں پر جمی برف پگھل جائے گی۔ بس تھوڑی توجہ اور تھوڑی محنت اس برف کے پتلے پر کرنی پڑے گی۔ جو بے نیازی کی ساری حدیں عبور کرنے کے باوجود اپنی آنکھوں میں اترنے والے ان اولین احساسات کو نہیں چھپا سکتا تھا جو کشمالہ کو دیکھ کر بے اختیار ہی امڈ آئے تھے۔

عاشر کے دل نے بس ایک لمحے کو یہ بے اختیاری دکھائی تھی۔ کشمالہ کو اس گستاخی کی خبر نہ ہوتی یہ بھلا کیسے ممکن تھا سر تسلیم خم تو تھا ہی نظریں بھی جھک گئی تھیں۔

انا پرست ہے یہ جانتے ہیں ہم لیکن
وہ خود بلائے گا اس بات کا یقین بھی ہے

وہ کاشف کی کسی بات پر کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔ آج کے دن کے لیے وہ صرف کاشف کی ممنون تھی جو ان دونوں کے درمیان پل بنا ہوا تھا۔

''عاشر عباس میں تم پر مسلط نہیں ہونا چاہتی میں تو تمہارے اندر اترنا چاہتی ہوں میں تمہاری دریافت بننا چاہتی ہوں بالکل اسی طرح جیسے تم میرے اندر بس گئے ہو میں تمہیں نہ بھی دیکھوں تب بھی تمہارا طاقت ور حصار مجھے مکمل کیے رکھتا ہے بھلا کیسے ممکن ہے میری شدتیں تمہاری سرد مہری میں دراڑ نہ ڈالیں۔''

وہ سب کو اسٹرابری شیک سرو کرتے ہوئے سوچ صرف عاشر کو رہی تھی۔

اس کی نشست و برخاست، اس کی مسکراہٹ، اس کا بھاری لب و لہجہ اس محفل میں سب سے نمایاں تھا خولہ نے جب اپنے دوستوں سے تعارف کروایا تھا تب بھی بے شمار ستائشہ نظروں نے خولہ کو دیکھا تھا۔

اس نے بے ساختہ تصحیح کی تھی۔

''نہ بابا! یہ میرے لیے نہیں اس کی قسمت اتنی بھی خراب نہیں۔''

''یہ کیا بات ہوئی آپ تو وہ چمکتا ستارہ ہیں جس کی قسمت میں سج گیا وہ مالا مال ہو گیا۔''

سمیع صولت نے حاضرین محفل کی جانب دیکھتے ہوئے تائید چاہی۔ کاشف عاشر کے ساتھ ذرا فاصلے پر تھا تب بھی داد دیے بغیر نہیں رہ سکا۔

آج سمیع صولت کے ساتھ ثمرہ نہیں تھی۔ وہ بہت ریلیکس اور مطمئن سا پارٹی انجوائے کر رہا تھا۔ خولہ نے خاص طور پر ثمرہ کو انوائیٹ کیا تھا۔ اس کے گھر ہر فون کیا تھا کیونکہ ایگزیمز کی وجہ سے وہ آجکل ریڈیو پروگرام نہیں کر رہی تھی تب بھی وہ نہیں آئی تھی خولہ کو تو افسوس ہوا تھا البتہ سمیع نے شکر کی سانس لی تھی۔

ویسے بھی اب ان دونوں کے درمیان بہت کچھ نہیں رہا تھا شاید بات محض دوست اور کولیگ ہونے پر آ کر ختم کو گئی تھی۔ غلط فہمیاں عموماً فاصلوں کو جنم دیتی ہیں اور فاصلے رشتوں کو کمزور کرتے رہتے ہیں سمیع صولت تو اپنے ادھورے وجود کے ساتھ ویسے بھی کسی ایسے رشتے کا بوجھ نہیں اٹھانا چاہتا تھا جو اس کے لیے تکلیف کا باعث بنتا اور دوسرے کو بھی راحت سے محروم رکھتا۔

''مالا! تمہیں پتا ہونا چاہیے عاشر کو اسٹرابری شیک پسند نہیں ہے۔'' کاشف نے اس کے قریب آ کر سرگوشی کی تھی۔

''کاشف! کوئی کچھ بتاتا ہے تو پتا چلتا ہے۔ اینی وے فریش لائم جوس بھی ریڈی ہے۔ ایک تو موصوف کی پسند ناپسند بھی مشکل میں ڈال دیتی ہے۔'' وہ جھنجھلا سی گئی تھی۔

''اور اپنی پسند کے بارے میں کیا خیال ہے..... خود کو جو مشکل میں ڈال کر بیٹھ گئی ہو..... اگر تھک گئیں تو۔''

''جو تھکن دے گا..... وہی سمیٹے گا بھی..... یہ میرا یقین ہے۔'' اس نے مضبوط لہجے میں کہہ کر خدیجہ کو آواز دی تھی۔

اس کے سامنے کشن ڈال کر بیٹھنے کی جگہ بنائی تھی حالانکہ..... واسع نے برابر والا صوفہ خالی کر کے بیٹھنے کی جگہ بھی دی تھی۔

''نہیں میں ان قدموں میں بیٹھ کر فیض یاب ہونا چاہتا ہوں۔''

ہاتھ ارم کے سامنے پھیلا دیے تھے وہ اس بے تکلف اجنبی کے پھیلے ہوئے ہاتھوں کو دیکھ کر ٹھیک ٹھاک پزل ہو گئی تھی۔ سرخیاں چھلکاتے مضبوط مردانہ ہاتھ دیکھنے کا اسے کوئی تجربہ نہیں تھا۔

کاشف کا شوق دیدنی تھا باقی سب بھی کم نہیں تھے اپنی اپنی جگہ پر مہذب انداز کا مظاہرہ کرتے ہوئے تھک گئے تھے موقع ملتے ہی گزار قالین پر گول دائرہ بنا کر بیٹھ گئے تھے اور ارم ان کے درمیان میں

صوفے پر براجمان اس نئی افتاد پر سر پکڑ کر رہ گئی تھی۔

''چلو ارم شروع ہو جاؤ ہم بھی تو سنیں محترم کا اگلا سفر کون سی دنیا کا ہے۔''

خولہ کو بھی یہ سرگرمی بڑی مزے دار لگی تھی نانو کے اس وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں ایک مدت بعد ہنگامہ مچا تھا ایسی بہاریں اس گھر میں صرف شمائلہ کے دور میں ہوا کرتی تھیں۔

پھر اس کے بعد یہ ڈرائنگ روم طارق محمود نے اس وقت کھولا تھا جب محبّ عالم اس دنیا سے رخصت ہوئے تھے اور پھر گزشتہ سال اس کا پورا انٹریئر بدلوانے کے لیے۔ اور یہ ہمت کشمالہ نے کی تھی کہ پورا ڈرائنگ روم تازہ پھولوں کی رنگ و خوشبو سے مہکا دیا تھا۔

ویسے بھی وہ جدت پسند تھی۔ اس نے اس گھر کا انٹریئر بدلنے کا پورا تہیہ کیا ہوا تھا شاید اس کی وجہ یل بھی تھی کہ نانو کے خوابوں کا یہ محل اب اسے اپنے خوابوں کا مسکن لگتا تھا اپنا گھر لگتا تھا۔

وہ سب سے الگ بیٹھے عاشر کی طرف چلی آئی جس کا سارا دھیان ٹی وی اسکرین پر تھا۔

''عاشر آپ کو تو بھوک لگ رہی ہو گی لیکن ہم پپا کا انتظار کر رہے ہیں۔'' اس نے وال کلاک پر نظر ڈالتے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا عاشر کا دھیان اب کہ اس کی طرف نہیں تھا وہ اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی تھی ٹی وی پر پروگرام آ رہا تھا۔

''میں نہ سہی..... پروگرام ہی سہی کسی کو تو یہ شخص توجہ سے دیکھتا ہے۔''

وہ بے ساختہ سوچ کر رہ گئی اپنی سوچ پر ہنسی بھی آئی۔

کشمالہ کیا تھیں تم اور کیا ہو گئیں دنیا بھر کی سیاسیات پر دھواں دھار بحث کرنے والی کشمالہ اس وقت ارم گیلانی کو ہاتھ دکھا کر اپنے مستقبل کا حال جاننا چاہتی تھی وہ سننا چاہتی تھی کہ اس کے ہاتھ کی لکیروں میں عاشر کا نام کتنی بار لکھا ہے۔

بین الاقوامی میڈیا میں اپنی ذہانت اور صلاحیت کی بنا پر نام اور مقام بنانے والی کشمالہ کو اب نہ

اپنے کیریئر کی فکر تھی اور نہ ہی اسے وہ رنگ و روشنیوں کی گلیمر دنیا یاد رہی تھی۔

محبت کی زنجیر نے تو اس کی دنیا ہی پلٹ دی تھی۔ آزاد پرندوں کی مانند زندگی گزر رہی تھی اب تک نہ کوئی حد باندھنے والا نہ کوئی روکنے ٹوکنے والا ہر فیصلے کا اختیار اپنے ہاتھ میں رکھنے والی کشمالہ اب بضد تھی کہ رشتے اسے اپنی قید میں جکڑ لیں اور اسے یہ بھی یقین تھا کہ اس راہ گزر پر اسے بہت کچھ کھونا پڑے گا بڑی بھاری قیمت ادا کرنے کے بعد رفاقت کا خواب شرمندہ تعبیر ہوگا۔ شاید خولہ بھی اس کی لپیٹ میں آ جائے۔ لیکن حقیقت وہی تھی کہ اسے نارسائی کا دکھ گوارا نہیں تھا اسے عاشر عباس سے دوری گوارا نہیں تھی۔

اس کی سوچوں کا تسلسل خولہ کی آواز نے توڑا تھا۔ خولہ اور کاشف ان دونوں کو بھی اپنی طرف بلا رہے تھے۔

''مالا! آؤ نا..... میں تو اس سال بھی کنوارا رہوں گا اب دیکھتے ہیں عاشر کی قسمت کب جاگتی ہے۔'' وہ شرارت بھرے لہجے میں گویا ہوا اور آنکھوں سے اشارہ بھی کیا۔

عاشر کے چہرے پر تو، صاف لکھا تھا میں تم لوگوں کی فضولیات سے دور ہی اچھا..... تب وہ سب کے سب اٹھ کر ان دونوں کے پاس آ گئے۔ اس بار گھیرا ڈالا گیا عاشر کے گرد جو اچانک اس افتاد پر سنبھل ہی نہیں سکا اور گھیرا تنگ کر دیا گیا۔

کاشف نے اس کے برابر بیٹھ کر پہلے تو ٹی وی کی آواز بند کی پھر ریموٹ ایک طرف رکھ کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر ارم کے سامنے پھیلا دیئے۔

''مشکل ٹارگٹ ہے..... اب پڑھو تو جانیں۔''

''مشکلوں سے تو کھیلنے میں ہی مزا آتا ہے کیوں ارم!''

خولہ بھی مزے لے رہی تھی۔ کشمالہ کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے بیٹھی خولہ کے چہرے پر دلچسپی کا ہر

رنگ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ ارم کیا بولے گی ان سب کی ملی بھگت ہی تو تھی عاشر پر حملہ کرنے کی۔

ارم نے واقعی اتنا مشکل اور اتنا مضبوط ہاتھ پہلی بار دیکھا تھا خولہ نے اسے اشارہ کیا تھا۔

''اب بولو بھی۔'' سمیع نے آواز لگائی تھی۔

''نہیں ان کی باتیں میں تم سب لوگوں کو نہیں بتاؤں گی۔'' وہ تو عاشر کا ہاتھ دیکھتے ہی بدل گئی تھی سب نے خوب شور مچایا تھا۔

''نہیں میں سچ کہہ رہی ہوں کچھ ہاتھ ایسے ہوتے ہیں جن کو پڑھنا مشکل بھی ہوتا ہے اور دلچسپ بھی۔ مجھے ان کے ہاتھ کے پرنٹ چاہیے ہوں گے۔ میں اپنے نانا جان کے ساتھ اسٹڈی کروں گی۔''

وہ تو خاصی سنجیدہ تھی سب کے متجسس چہروں پر حیرت سی پھیل گئی۔

''آر یو سیریس.....''

سب سے پہلے خولہ نے پوچھا اس نے ہی تو یہ ساری کہانی ترتیب دی تھی۔

''یس یار آئی ایم سیریس.....''

اس نے نظریں عاشر کے ہاتھوں سے ہٹالی تھیں۔ عاشر نے سکھ کا سانس لیا تھا چہرے پر بڑی معصوم اور بہت کچھ جتانے والی مسکراہٹ آئی تھی اور نظریں بے اختیار کشمالہ سے جا ملی تھیں۔

جیسے کہہ رہی ہوں۔

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجیے

اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

اور اب جب دریا میں اتر گئے تھے تو پار تو جانا ہی تھا کیوں کہ واپسی کی ساری کشتیاں تو پہلے ہی جلا ڈالی تھیں۔

''یار تم بھی ناپوری ڈرامہ لڑکی ہو۔'' کاشف از حد مایوس ہوا تھا۔

''چلو ایسا کرتے ہیں کشمالہ کا دیکھتے ہیں۔خولہ کا تو میں نے پہلے بھی دیکھا تھا۔''

بالآخر ارم نے ہی نئی صلاح دی عاشر نے اس کا چپکے سے شکریہ بھی ادا کیا تھا اس شرط کے ساتھ کے وہ اسے ہینڈ پرنٹس ضرور دے گا۔

سب کی منتظر نگاہیں کشمالہ اور ارم پر جمی تھیں۔

''میرا خیال ہے مجھے کشمالہ کا ہاتھ بھی نانا جان سے ڈسکس کرنا پڑے گا۔''

وہ بہت مزے سے بولی تھی چہرے پر بھرپور شرارت کے رنگ تھے۔فرح نے ایک چھوٹا کمفرٹ اسے دے مارا تھا سب نے خوب شور مچایا تھا عاشر بھی اس ہنگامے پر ہنس پڑا تھا۔

''تم بہت خراب ہو ارم.....''

''اچھا چلو کچھ کوشش کرتے ہیں۔''سب کے احتجاج پر اس نے احسان کیا تھا۔

''آپ کی شہرت کی لکیر بہت زبردست ہے ماشاءاللہ۔''

اس نے پہلا انکشاف کیا ہجوم میں خوب شور مچا تھا۔

''شہرت کی لائن کو چھوڑ و محبت کی لائن پر آؤ۔'' کاشف نے بے چینی سے کہا۔

''او کے وہ بھی دیکھ لیتے ہیں مگر.....ایسی باتیں بتاتے تھوڑی ہیں۔''

ارم نے اس کے ہاتھوں کا جائزہ لیتے ہوئے ماہر پامسٹ کی طرح کہا کشمالہ کے چہرے پر بھی تجسس نمایاں تھا۔

''آپ کا رائٹ مین بہت ڈیشنگ ہوگا۔''اس نے یہ انکشاف کر کے ہلچل سی مچادی تھی۔سب کی نظریں غیر ارادی طور پر ہی لیکن عاشر عباس کی طرف اٹھی تھیں جو دانستہ اس ہنگامے سے بے نیاز نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''ان کا رائٹ مین آپ کو کیسے نظر آ گیا تصویریں بھی دیکھتی ہیں آپ لکیروں میں۔''

''جی بالکل آپ کی دلہن کا تعلق کسی افریقی ملک سے ہوگا۔''

''کیوں آپ کیپ ماؤنٹ جانے والی ہیں۔''

بے ساختہ جواب آیا تھا ارم نے پہلے اسے گھورا اور کشمالہ کی آنکھوں کو غور سے دیکھا۔

''ویسے میں فیس ریڈنگ بھی کر لیتی ہوں۔''

''مجھے یقین ہے آپ کا ڈیشنگ مین آپ کو ضرور ملے گا۔''

باقی کی بات اس نے بے حد سرگوشی کے انداز میں کی تھی جسے صرف کشمالہ ہی سن پائی تھی اور کاشف باوجود کوشش کے اس اعزاز سے محروم رہا تھا۔

''اس بے ایمانی پر میں واک آؤٹ کرتا ہوں۔'' اگلے لمحے اس نے اعلان کیا تھا۔

تب ہی عاشر کے قریب رکھے ٹیلی فون کی بیل بجنے لگی تھی۔

اس نے ذرا سا ہاتھ بڑھا کر فون اٹھا لیا تھا فون جس کسی کا بھی تھا لیکن عاشر کی آواز پر پورے کمرے میں یکدم سکوت سا چھا گیا تھا۔

''جی آپ مجھے بتا سکتے ہیں میں عاشر عباس بات کر رہا ہوں راجہ طارق محمود کا.....'' اس نے ذرا سا توقف کیا تھا۔

''بیٹا۔'' ایک گہری سانس لے کر کہا تو کشمالہ کے سر پر رکھا ڈھیر سارا بوجھ اتر سا گیا۔

''وہ اسپتال میں ہیں مگر کیوں؟'' اس کے تشویش بھرے لہجے نے کشمالہ کے قدموں سے جان سی نکال دی تھی۔ وہ سب کے درمیان سے اٹھ کر تیزی سے اس صوفے کی طرف بڑھی جس پر عاشر عباس بیٹھا تھا۔

اس نے بے ساختہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر عاشر کے کان سے لگے ریسیور سے اپنا کان بھی لگا دیا۔

اس کی یہ حرکت اتنی بے اختیار سی تھی خولہ کو دوہرے خوف نے بالکل ساکت سا کر دیا کشمالہ نے بھی کچھ سن لیا تھا اس کے چہرے کا رنگ بدل سا گیا تھا۔

''ٹھیک ہے میں آتا ہوں۔'' عاشر نے کہہ کر فون رکھا پلٹ کر اپنے سب سے قریب کھڑی کشمالہ کو دیکھا اور کھڑا ہو گیا۔

''وہ پمز میں ہیں کار ایکسیڈنٹ۔''

اس سے آگے جانے کیوں اس کی اپنی آواز دب دی گئی تھی کاشف اور خولہ سمیت ڈرائنگ روم میں موجود ہر شخص کی نظریں عاشر عباس پر جمی تھیں اور کشمالہ اس سے لپٹ کر بے اختیار رونے لگی تھی۔

عاشر عباس کی گاڑی پمز کی طرف رواں دواں تھی کشمالہ اور کاشف اس کے ساتھ تھے خولہ گھر پر رک گئی تھی نانو کو سنبھالنے کے لیے جو یہ سب کچھ سنتے ہی دل پکڑ کر بیٹھ گئی تھیں۔

''میرے طارق کو کچھ ہو جائے اس سے پہلے مجھے موت کیوں نہ آ جائے۔''

ان کی آنکھوں سے جھڑی سی لگ گئی تھی خولہ نے اپنے دوستوں کے ساتھ بمشکل انہیں سمیٹا اور خود بھی رونے بیٹھ گئی۔

عاشر کو کبھی اس طرح کی صورتحال کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا وہ ساکت نظروں سے سب کو دیکھ رہا تھا جن کے فق چہرے راجہ طارق محمود کی خیریت جاننے کے لیے بے چین تھے۔

اور اس کے اپنے کانوں میں وہ مردانہ آواز گونج رہی تھی جس نے حادثے کی خبر دیتے ہوئے صرف اتنا کہا تھا کہ وہ شدید زخمی ہیں اور انہیں فوری ٹریٹمنٹ کے لیے ڈاکٹر آپریشن تھیٹر منتقل کر رہے ہیں۔

حادثہ کیسے ہوا گاڑیوں کی ٹکر کس کی غلطی سے ہوئی یہ لمبی بحث ہے فی الحال آپ لوگ ان کی زندگی کے لیے دعا کریں۔

یہ دوسرا جھٹکا تھا جو عاشر، کشمالہ اور کاشف کو ایمبر جنسی کے گیٹ پر لگا تھا وہ اجنبی آدمی جس کا

دایاں بازو گردن کا نچلا حصہ خراشوں کے باعث پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا بڑے مطمئن انداز میں انہیں بھی تسلی دے رہا تھا۔

شکل وصورت اور پہناوے سے خوش حال نظر آنے والا یہ شخص اس سارے قصے کا ذمہ دار تھا اور اب آ کے پرسکون لہجے میں اپنی غلطی کا اعتراف کر رہا تھا۔ان تینوں کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

''حادثہ میری کیب سے ہوا میں نے ہائر کی تھی میرا ڈرائیور جلدی میں تھا شاید میری وجہ سے کیوں کہ مجھے ایک میٹنگ میں جانا تھا۔''

''اور وہ ڈرائیور.....'' کاشف کے منہ سے بمشکل نکلا۔

''وہ بھی OT میں زخمی حالت میں ہے میں نے ہی فون کیا تھا آپ کے گھر ان کے والٹ کی ڈائری میں house کے ساتھ یہ ہی پہلا نمبر لکھا تھا۔''

اس شخص کا اطمینان قابل دید تھا اور یہ سب جاننے کے بعد کشمالہ بدحواسی میں پورے ایمرجنسی وارڈ کا چکر لگا کر پلٹی تھی۔تب کاشف نے اس کا ہاتھ تھام کر تسلی دی۔

''ایسے بھلا پریشان ہوتے ہیں اللہ کارساز ہے نا۔وہ اوٹی میں ہیں اس وقت شکر کرو بروقت ٹریٹمنٹ مل گیا ورنہ سوچو۔اگر یہ صاحب انہیں ہسپتال نہ پہنچاتے تو بہت برا ہوتا نا۔''

''کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟'' کاشف نے کشمالہ کو تسلی دیتے ہوئے پلٹ کر اس شخص سے پوچھا۔

جواب کاریڈور میں رکھے سنگی بینچ پر بیٹھا انہی کی طرف دیکھ رہا تھا اس کی آنکھوں میں بے چینی ہلکورے لے رہی تھی لیکن شاید اسے خود پر بہت کنٹرول تھا تب ہی وہ کاشف کے سوال پر مسکراتے ہوئے بولا۔

''منیر کمال کہتے ہیں مجھے اسلام آباد میں رہتا نہیں آتا جاتا رہتا ہوں۔''

وہ اپنی بات مکمل کر چکا تھا کشمالہ اس سے پہلے وہ جگہ چھوڑ کر ذرا آگے جا چکی تھی ورنہ یہ سب سننے

کے بعد وہ بھی راجہ طارق محمود کی طرح کسی اسپتال بیڈ پر پڑی ہوتی کم از کم اس تکلیف دہ صورتحال میں اس کے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ منیر کمال کو اپنے سامنے دیکھ کر یہ صدمہ ضبط کے ساتھ برداشت کر جائے۔

''منیر صاحب! آپ سے ملاقات رہے گی یقیناً۔''

کاشف نے خاصی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا تھا اور عاشر نے بے اختیار پلٹ کر اور کچھ کھوجتی نگاہوں سے اس خوش پوشاک شخص کو دیکھا تھا۔

وہ مستقل اتنی دیر سے کچھ ورد کر رہی تھی دوپٹہ سر پر لپیٹے اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں عجیب سا خوف اور بے چارگی ہلکورے لے رہی تھی۔

تھوڑی دیر پہلے وہ اس کے ساتھ لپٹ کر رو رہی تھی اس نے بے ساختہ اسے پکارا اور شاید پہلی دفعہ اس کا نام پکارا تھا اس قدر روانی سے۔

''کشمالہ!''

''جی بولیے۔'' وہ پھر سے آنسو بھر لائی تھی آنکھوں میں۔

''ایک تو عورتوں کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہی آنسو ہیں۔'' اس نے جھنجھلا کر سوچا اور پھر قدرے تپ کر اسے مخاطب کیا۔

''پلیز آپ یہاں بیٹھ جائیں آپ کے اسٹریس لینے سے کیا وہ ٹھیک ہو جائیں گے جو ہونا تھا وہ کو چکا۔''

پتا نہیں کس بات کی جھنجھلاہٹ اور غصہ اس پر اتار رہا تھا۔ اندر اوٹی میں مشینوں کے رحم و کرم پر پڑا شخص کشمالہ کا سگا نہیں محض پالنے والا باپ تھا لیکن عاشر عباس کی رگوں میں تو اس کا خون دوڑ رہا تھا پھر کیسے ممکن نہ تھا کہ اس کے احساسات پر جمی بے حسی کی برف نہ پگھلتی۔

وہ اپنے باپ کے لیے پریشان نہ ہوتا۔

وہ اس کی خیر و عافیت کی تمنا نہ کرتا۔

کشمالہ اس کی جھنجھلاہٹ پر قدرے اطمینان کا سانس لے کر قریبی بینچ پر بیٹھ گئی تھی اوٹی کے باہر بیٹھ کر اپنے پیاروں کی زندگی کی عافیت اور خیر کی دعا کرنا شاید دنیا کا سب سے مشکل کام ہوتا ہے اور وہ اس وقت یہ مشکل کام کر رہی تھی صدق دل سے۔

اس سرد اور خاموش ماحول میں جتنے بھی لوگ اس کاریڈور میں موجود تھے ان کے چہروں پر تقریباً ایک جیسے تاثرات تھے۔

اس کے دل سے صرف ایک ہی دعا نکل رہی تھی۔

''یا اللہ! تو سب کو اپنی امان میں رکھنا۔''

کاشف منیر کمال کو رخصت کر کے ان دونوں کے پاس آ گیا تھا۔

''کوئی خبر ملی۔''

''نہیں.....بس افراتفری سی ہے ایک ڈاکٹر باہر آیا تھا پر بات نہیں ہو سکی۔'' عاشر کی نظریں بھی اب اوٹی کے دروازے پر جمی تھیں۔

''نانو کو فون کر کے خیریت لے لو اور ان کو تسلی دے دو۔ خولہ ان کی وجہ سے بہت اپ سیٹ ہے۔''

کاشف نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی دینے والے انداز میں کہا تو وہ سر ہلا کر رہ گیا۔

کاشف جب سے اس کے ساتھ تھا ہر مشکل وقت میں ڈھال بن جاتا تھا۔ جب نانو بیمار ہوئی تھیں تب بھی اور آج بھی۔ وہ اس کی طرف مشکور نظروں سے دیکھنے لگا۔

تب کاشف نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

''تو، تو میری جان ہے تیری تکلیف، تیری مشکل گھڑی مجھ سے الگ نہیں میں یہاں سے چلا بھی گیا تو تجھ سے الگ نہیں ہوں گا یاد رکھنا۔''

وہ سرگوشی کر رہا تھا عاشر کو اس کے مضبوط بازوؤں کا سہارا اور وجود کی پر خلوص حدت سکون سا

دے گئی تھی۔

حالانکہ وہ مستقل اس کوشش میں تھا کہ راجہ طارق محمود کے لیے پریشان نہیں ہوگا وہ کون سے اس کے لیے پریشان ہوتے رہے ہیں۔

انہوں نے بھلا کب اس کی جسمانی تکلیف کو اپنے ہاتھوں کی پوروں میں سمیٹا تھا۔

وہ بھلا کیوں ان کے لیے اپنی توانائی خرچ کرے گا مگر ان سب سوچوں کی تہہ میں اس ضدی خودسر اور لاڈلے بیٹے کے جذبات بھی چھپے ہوئے تھے جو بار بار سطح پر آ کر اس کے ارادوں کو متزلزل کر رہے تھے۔

''تم لاکھ اس شخص کو خود سے دور کرو مگر فطرت سے بغاوت نہیں کر سکتے۔'' اس کے اندر سے آواز اٹھی تھی تب ہی کاشف نے اسے پکارا تھا۔

''عاشر میرے دوست یہ جو آزمائش ہوتی ہے نا رب کا انعام ہوتی ہے انسان اپنے آپ کو ہر کسوٹی پر پرکھ کر کندن بن جاتا ہے خود کو جان لیتا ہے اس حد تک کہ کبھی مات نہیں کھاتا۔

یکے بعد دیگرے تیرے حوصلے کی آزمائشیں اللہ کی تجھ سے محبت کا ثبوت ہیں خود کو مضبوط رکھ زندگی کا حق ادا ہو جائے گا۔''

کاشف کبھی کبھی سنجیدہ ہوتا تھا لیکن جب سنجیدگی میں لفظوں کا سہارا لیتا تھا تو پھر دل جیت لیتا تھا۔

میں ٹھیک ہوں یار مجھے نانو کی فکر ہے میں ذرا ان کو فون کرتا ہوں تم کوشش کرو اندر کی صورتحال کا پتا چلے آخر کوئی تو کچھ بتائے انہیں ہوا کیا ہے کس حالت میں ہیں وہ۔

وہ اس سے بات کرنے کے بعد ذرا فاصلے پر چلا گیا تھا تب ہی اوٹی کا دروازہ کھلا تھا کشمالہ اور کاشف بے تاب ہو کر ڈاکٹر کی طرف بڑھے تھے وہ کوئی جونیئر ڈاکٹر تھا جس نے چھوٹتے ہی کہا تھا۔

''طارق محمود کے ساتھ آپ لوگ ہیں فوراً بلڈ کا انتظام کیجیے اس گروپ میں۔'' اس نے ایک سلپ ان کی طرف بڑھا دی تھی۔ اور پھر اندر غائب ہو گیا تھا۔

''تم یہیں بیٹھو میں اور عاشر کچھ کرتے ہیں اور دیکھو پریشان نہیں ہونا انہیں کچھ نہیں ہوگا وہ ہم

سب کی دعاؤں کے حصار میں ہیں۔"

کاشف نے سلپ اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"اٹس او کے..... تم لوگ جلدی کرو میں یہیں پر ہوں میری بیڈ لک ہے کہ میرا بلڈ گروپ ان سے میچ نہیں کرتا ورنہ میں..... میں....." وہ پھر سے رونے کو تیار تھی۔

"پلیز مالا! تم تو بہادر بنو۔"

"میں ٹھیک ہوں جاؤ تم لوگ....." وہ اوٹی کی گلاس وال کی طرف چلی گئی تھی جہاں سے اسے اندر کچھ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن اسے یقین تھا اندر زندگی ہلکورے لے رہی تھی۔ بے شک اس کا ردھم دھیما ہے مگر تسلسل برقرار ہے۔

☆.....☆.....☆

ماورا طلحہ کا بہت خوبصورت نیا ناول

مرگِ تمنا

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

تنزیلہ ریاض کا بہت خوبصورت نیا ناول

نور القلوب

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

وہ درد کی طویل رات تھی جو بیتنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ مریم اپنی دونوں بچیوں کو بلی کی طرح اپنے پنجوں میں دبوچے اعجاز الدین کی گاڑی میں بیٹھی تھی۔ اس کے برابر میں اعجاز الدین کے دو بندے بھی بیٹھے تھے تب ہی وہ سانس لینے میں دشواری سی بھی محسوس کر رہی تھی البتہ کھلی آنکھوں سے روشن رات کو دیکھتے ہوئے بے ساختہ سسک پڑی تھی۔

یہ تو اس نے پہلی بار دیکھا تھا رات کی تاریکی میں اتنا روشن دن ہر چیز جگمگا رہی تھی اس کی آنکھیں ہی نہیں کھل رہی تھیں وہ لوگ اسے پتا نہیں کہاں لے کر جا رہے تھے اس کے ساتھ کیا سلوک کرنے والے تھے یہ اسے بالکل نہیں پتا تھا لیکن اسے اتنا ضرور علم تھا کہ اس نے یہ دنیا پہلی بار دیکھی ہے۔

وہ بھاگتے دوڑتے خوش و خرم چہرے اور برقی قمقموں سے سجی سنگی عمارتیں زندگی اتنی خوبصورت بھی ہو سکتی ہے اس کا احساس آج اس لمحے ہو رہا تھا ورنہ اس نے جو دن منیر کمال کے ساتھ گزارے تھے وہ تو کالے پانی کی سزا تھی۔

وہ روتی پھر خود ہی چپ ہو جاتی پھر کچھ یاد آتا پھر رونے لگتی اس کی سسکیاں اعجاز الدین کے کانوں تک بخوبی پہنچ رہی تھیں۔

"دیکھو خاتون! میں تمہیں تمہاری رضا سے اس کمینے شخص کے چنگل سے نکال کر لایا ہوں مجھے نہیں پتا اس کی سزا مجھے کیا بھگتنی پڑے گی اور وہ حرامزادہ ہوش میں آنے کے بعد کس طرح اپنی کھال سے باہر آتا ہے میں نہیں جانتا لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں۔

میں تمہیں اس دلدل سے صرف اس لیے نکال کر لے آیا کہ میں ایک ماں کی اتنی پامالی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

میں بہت شیطان صفت ہوں عورت کو جوتی کی نوک پر رکھتا ہوں لیکن جب تک ماں زندہ رہی اس کا حکم نہیں ٹالا۔

میں یہ بھی نہیں جانتا کہ تم نے میرے ساتھ آنے کا فیصلہ کیوں کیا تم اس کی قید سے رہائی چاہتی تھیں یا اسے سزا دینا چاہتی تھیں بات کوئی بھی ہو لیکن اتنا سمجھ لو مجھے تم سے لمحے بھر میں ہمدردی ہو چلی تھی۔

میں اگر تمہیں وہاں اس حالت میں چھوڑ کر چلا آتا تو شاید ساری عمر سینے پر بوجھ دھرا رہتا اپنی ہوس مٹانے کے لیے میرے بجائے کل کوئی اور تمہارے پاس آ جاتا بہر حال میرا ضمیر مجھے کچوکے لگاتا رہتا۔اب تم اس موت کے کنوئیں سے باہر نکل آئی ہو۔

مجھے یہ بتاؤ تم نے کہاں جانا ہے اس شہر میں کون ہے تمہارا جو منیر کمال کے شر سے محفوظ رکھ سکے۔

یا پھر تم پاکستان واپس جانا چاہتی ہو۔"

وہ ایک ہی سانس میں بہت ساری باتیں بہت سارے فیصلے سنا گیا تھا۔

مریم سانس روکے اسے سن رہی تھی۔

یہ شخص شکلاً جتنا خوفناک اور ظالم تھا فطرتاً اتنا ہی نرم مزاج اور ہمدرد محسوس ہو رہا تھا۔

مریم تو خود بھی نہیں جانتی تھی کہ وہ اس کے ساتھ کیوں چلی آئی ابھی تو خود اسے اپنے آپ سے یہ جواب درکار تھا کہ اس نے کس امید اور کس یقین کے ساتھ اندھے کنویں سے نکل کر گہری کھائی میں چھلانگ لگا ڈالی تھی۔

یہ اجنبی شخص تو اس کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا ہے جب منیر کمال نے اسے عزت اور اعتبار کے قابل نہیں سمجھا تو وہ کیوں اعجاز الدین پر اعتبار کر بیٹھی۔

وہ یکدم پھٹ پڑی تھی اعجاز الدین نے قدرے حیرت سے پیچھے مڑ کر دیکھا گویا اس کا اندازہ مریم کے بارے میں درست تھا۔

وہ کوئی عام سی عورت نہیں تھی جو حالات کے گرداب میں پھنس کر اپنے حوصلے کھو بیٹھتی۔

اس نے بہت سوچ سمجھ کر اور بڑے مناسب وقت میں منیر کمال سے چھٹکارا حاصل کیا تھا۔

''میرا پاکستان میں کوئی نہیں ہے جو ہیں میں ان کے پاس جانا نہیں چاہتی شاید مجھے کوئی بھی صحیح نہیں سمجھے گا کیونکہ مجھے پہلے بھی غلط کہا گیا اور میری غلطی کی سزا مجھے اس صورت میں ملی کہ منیر کے ساتھ مجھے یہاں آنا پڑا۔''

وہ اب رو نہیں رہی تھی بلکہ بڑی دبنگ آواز میں اپنا فیصلہ سنا رہی تھی۔

اعجاز الدین نے اپنے آدمی کو گاڑی ایک ریسٹورنٹ کے سامنے روکنے کا اشارہ کیا۔

''تم کچھ کھاؤ گی۔ تمہیں بھوک لگی ہوگی۔ تمہاری بچیوں کے لیے کچھ لے لوں۔''

''نہیں مجھے کچھ نہیں چاہیے اور میری بچیاں تو ابھی صرف دودھ پیتی ہیں۔''

اس نے کشمالہ کے ماتھے پر پیار کرتے ہوئے کہا جو اس کے دائیں ہاتھ پر سر ٹکائے بڑے سکون سے سو رہی تھی اور خولہ اس کی گود میں گھسی گہری نیند کے مزے لے رہی تھی۔

مریم کو پتا تھا ابھی تھوڑی دیر کے بعد دونوں کو ایک ساتھ بھوک لگے گی تب وہ کیا کرے گی وہ جلد از جلد اس سفر کا اختتام چاہتی تھی۔

''پھر میں ان کے لیے دودھ لے لوں کیوں کے میرے گھر میں ایسی کوئی چیز تمہیں نہیں ملے گی۔ میں بے کار سا آدمی ہوں ایک ویران سا گھر ہے میرا جس میں گئے ہوئے بھی ہفتے گزر جاتے ہیں اور اس وقت میں صرف تمہیں وہیں لے جا سکتا ہوں پھر صبح سوچیں گے کرنا کیا ہے۔''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا اور اپنے آدمی کو اترنے کا اشارہ کیا۔

''نہیں دودھ کی بھی ضرورت نہیں ہے آپ لوگ پلیز ابھی چلیں یہاں سے آپ لوگ نہیں جانتے منیر کو وہ زیادہ دیر نشے میں نہیں رہتا اور جب اس کا نشہ ٹوٹے گا تو..... جانے کیا ہوگا۔''

گاڑی کی مدہم روشنی میں اس کا خوف زدہ چہرہ واضح طور پر زردی لیے ہوئے تھا۔

اس کی آنکھوں میں کوئی تاثر نہیں تھا سوائے اپنی بے بسی اور کم مائیگی کے اعجاز الدین کو اس پر

ڈھیر سارا ترس آیا تھا۔

''کتنے ظالم ماں باپ ہوتے ہیں اپنی ہیرے جیسی بیٹیوں کو اس یقین کے ساتھ اجنبی کے ہمراہ پردیس روانہ کر دیتے ہیں کہ وہاں جا کر ان کے سارے دلدر دور ہو جائیں گے اور پھر وفاداری نبھانے کا واسطہ بھی دیتے ہیں۔

اول تو شکایت سنتے نہیں اور اگر سن لیں تو اس کا ازالہ اس لیے نہیں کرتے ایک بیٹی کے ماتھے پر اگر طلاق کا ٹیکا لگا تو دوسری کا بھی مستقبل تاریک ہو جائے گا۔ اف کتنی مشکل زندگی ہوتی ہے شکر ہے اللہ نے مجھے اولاد نہیں دی۔''

گاڑی پھر سے انجان راستے پر رواں دواں ہو گئی تھی اعجاز الدین نے اپنی طبیعت کے برخلاف مریم کی باتیں سنی تھی۔ اس کے ساتھ ایک مدت سے کام کرنے والے تینوں بندے اعجاز الدین کے اس نئے روپ سے پہلی بار مل رہے تھے۔

وہ حیران تھے کہ آخر اس عورت میں ایسا کیا ہے جو اعجاز الدین کا دل اس حد تک موم ہو گیا ہے کہ وہ اسے اپنے گھر لے کر جا رہا ہے۔

''باس! سوچ لو ابھی بھی خود کو کسی مشکل میں مت ڈالو منیر ایک بار پہلے بھی تم پر حملہ کر چکا ہے۔''

وہ بے ہنگم سا آدمی اپنی بھاری آواز میں اسے خبردار کر رہا تھا مریم کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔

''منیر پہلے بھی حملہ کر چکا ہے اس شخص پر..... اتنے طاقتور شخص پر..... اس کے باوجود وہ آج ان کے ساتھ نئی سودے بازی کرنے چلا تھا کتنی عجیب دنیا ہے۔'' اس کے رونگٹے کھڑے ہونا شروع ہو گئے تھے۔

''پتا نہیں میں جو کر بیٹھی ہوں اس کا انجام کیا ہو گا لیکن میں ایسا نہ کرتی تو کیا کرتی کہاں جاتی کیا ان لوگوں کی.....''

اس نے خوفزدہ نگاہوں سے آگے پیچھے دیکھا اور پھر ہر خوف پر وہ طاقت ور احساس حاوی ہو گیا

تھا جو اس کے سینے سے لپٹا ہوا تھا گاڑی ایک شاندار سے کاٹیج ہاؤس کے پھاٹک سے اندر داخل ہو گئی۔

نہ اسے ان جگہوں کے نام پتا تھے اور نہ ہی وہ جاننا چاہتی تھی وہ تو بس پناہ چاہتی تھی کسی ایسی جگہ پر جہاں منیر کمال کے شر سے وہ اپنی بچیوں سمیت محفوظ رہ سکے۔

شاید کچھ دعائیں قبولیت کے لمحے میں مانگی جاتی ہیں اسی لیے فوراً قبول ہو جاتی ہیں اعجاز الدین نے اس کی طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے بڑی نرمی سے پکارا تھا۔

''شاید تمہارا نام مریم ہے لیکن کیا تمہیں سسٹر بلا سکتا ہوں۔ جنگلی سا آدمی ہوں معلوم نہیں چھوٹی بہنوں کو کیسے مخاطب کرتے ہیں۔''

سچ اس کے لہجے سے جھلک رہا تھا مریم کو اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا یہ شخص جو اس کی عصمت پر وار کرنے آیا تھا اب اس کے سر پر دوپٹے کا پلو ڈالتے ہوئے اس کی عصمت کا محافظ بن گیا تھا۔ اس سے زیادہ انوکھا واقعہ شاید اس کی زندگی میں کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے خولہ کو اپنی گود میں لیتے ہوئے اپنے آدمیوں کو مخاطب کیا تھا۔

''تم لوگ میری فکر مت کرو بس نظر رکھنا اس ذلیل آدمی پر تم جانتے ہو وہ اپنی آخری حد تک جائے گا۔ مجھے ہر صورت ان بچیوں کی زندگی کی حفاظت کرنا ہے۔ او کے ٹیک کیئر کل ملتے ہیں۔''

خولہ اعجاز الدین کی گود میں تھی اور کشمالہ مریم کی۔ اعجاز الدین کے آدمیوں نے پورے سفر سے لے کر اب تک ایک نگاہ غلط بھی مریم پر نہ ڈالی تھی لیکن اس وقت ان میں سے ایک کبھی کشمالہ تو کبھی خولہ کو دیکھ رہا تھا۔

''ویری اسٹرینج..... نو ڈیفرینس۔''

حیرت اور شوق اس کے چہرے سے عیاں تھا۔

مریم نے اعجاز الدین کے برابر میں کھڑے ہو کر خوف کو اتنا محفوظ اور مامون سمجھ لیا تھا کہ اس

لے ریمارکس پر بے ساختہ مدہم سا مسکرا دی تھی۔

''یہ پانچ منٹ پہلے دنیا میں آئی تھی۔'' مریم نے کشمالہ کی طرف اشارہ کیا کاٹیج کی روش پر کھڑے کھڑے سب ہی اس سفر کی تھکن زائل کر رہے تھے اعجاز الدین کو محسوس ہو رہا تھا کہ آج اس نے کوئی معرکہ سر کر لیا ہے۔ اور ایک کامیاب مہم جو اپنی منزل پر پہنچ کر جس قدر مطمئن ہوتا ہے ایسے ہی جذبات اس وقت اس کے تھے۔

کل کیا ہوگا اور آنے والے دنوں میں وہ مریم کے ساتھ کیا کرے گا اس کے بارے میں ابھی سوچنا نہیں چاہتا تھا۔

☆.....☆.....☆

حالانکہ اب تو کسی کو یاد بھی نہیں تھا اور نہ کوئی یاد رکھنا چاہتا تھا کہ وہ کن حالات میں یہاں سے گئی ہے اور کتنی بدگمانیاں سمیٹ کر لائی ہے اب تو سب کو بس اس بات کی خوشی اور تسلی ہو گئی تھی کہ وہ بخیر و عافیت واپس لوٹ آئی تھی۔

راحت بیگم کو اپنے سسرالیوں پر رتی برابر اعتبار نہیں تھا انہیں ہر لمحے یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ وہ لوگ صوفیہ کو کوئی نقصان نہ پہنچا دیں پھر اپنی تربیت پر اعتبار بھی تھا کہ صوفیہ کو کوئی اتنی آسانی سے بے وقوف نہیں بنا سکتا ادھر صوفیہ کمرہ بند کیے پڑی تھی ادھر راحت بیگم کی عظیم شاہ سے کمرہ بند میٹنگ چل رہی تھی۔

عجیب بات یہ تھی کہ اس ہنگامی ملاقات کا مطالبہ عظیم شاہ نے کیا تھا اور اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ عظیم شاہ نے بیٹھتے ہی راحت بیگم سے صوفیہ کا ہاتھ مانگا تھا سفیر کے لیے۔

میں تمہارے پاس بہت پہلے سے آنا چاہتا تھا مگر سفیر کا ایکسیڈنٹ پھر کاروباری حالات.....بس موقع ہی نہیں ملا اور میں ہر بات بھلا کر تعلقات کی تجدید کے لیے آیا ہوں مجھے یقین ہے تم بھی رشتے مضبوط کرو گی۔

کیا ڈھٹائی تھی اور کتنا عمدہ لفظوں کا انتخاب تھا راحت بیگم تو دل ہی دل میں عش عش کر اٹھی تھیں۔

کچھ لوگ کتنے ثابت قدم ہوتے ہیں زندگی بھر غلط کو صحیح ثابت کرنے کی تگ و دو میں اپنا مقام اور مرتبہ بھی بھول جاتے ہیں۔

آپ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں ہمارے رشتے میں برسوں پہلے بچا کیا تھا جسے آپ اب مضبوط کرنے آئے ہیں۔

راحت بیگم کا ضبط قابلِ دید تھا انہوں نے اپنی ٹیبل پر رکھے سارے فون بند کر دیے تھے۔

استقبالیہ کلرک کو بھی ہدایت کر دی تھی کہ اس وقت کوئی اندر نہ آئے شجاع بھی نہیں۔

''نہ میں ماضی کریدنے آیا ہوں اور نہ ہی میں تمہارے دکھوں کا مداوا کر سکتا ہوں میں جانتا ہوں مقدر نے تمہیں بڑی گہری چوٹ لگائی ہے۔''

عظیم شاہ کی چشمے کے پیچھے سے جھانکتی آنکھیں راحت بیگم کو سر تا پیر ٹٹول رہی تھیں اور یہ ہی تو وہ لمحہ تھا جب ان کا ضبط جواب دے گیا وہ پھٹ ہی تو پڑی تھیں۔

''مجھے مقدر نے تو گہری چوٹ نہیں لگائی میرا مقدر تو ندیم شاہ تھا میری قسمت کا روشن ستارہ۔

آپ واقعی میرے دکھوں کا مداوا نہیں کر سکتے عظیم شاہ صاحب! کیوں کہ میرے مقدر کو بھٹی میں جھونکا آپ نے میری خوشیوں کو آگ لگائی آپ نے بدگمانی کا بیج بویا آپ نے۔

ندیم شاہ کو خودکشی پر مجبور کیا آپ نے..... میں کیسے بھول جاؤں ان لمحوں کا کرب جب آپ رات رات بھر میرے کمرے کے باہر پہرہ دیا کرتے تھے۔

اس لیے نہیں کہ آپ میری حفاظت کرتے تھے اس لیے نہیں کہ میں آپ کے گھر کی عزت ہوں بلکہ اس لیے کہ آپ موقع سے فائدہ اٹھا کر میری عزت پامال کر دیں اور آپ کی بیوی سارے جگ میں ڈھنڈورا پیٹ کر میری عزت کا جنازہ نکال دے۔

بولو نا عظیم شاہ..... اس لیے تم میرا سایہ بن گئے تھے کہ مجھے رسوا کر سکو میرے کردار پر دھبہ لگا سکو۔"

راحت بیگم کے الفاظ تھے کہ زلزلے کی گڑگڑاہٹ..... عظیم شاہ کے دل و دماغ کی دنیا ملیا میٹ ہو گئی تھی وہ کھڑے ہونے کی کوشش میں زمین بوس ہو گئے تھے

ان کے منہ سے اتنا بھی نہیں نکل سکا کہ راحت بس کرو..... انہیں محسوس ہو رہا تھا جیسے ان کے دل و دماغ، زبان ہر چیز پر تشنج کا حملہ ہو گیا ہو۔

"خاموش کیوں ہو عظیم شاہ! ندیم شاہ کے بڑے معتبر اور سگے بھائی..... کیا کوئی اس طرح اپنے بھائی کا گلا کاٹ کر اس کا کچا گوشت کھاتا ہے۔"

راحت بیگم کی زبان، آنکھیں، چہرہ..... آج سب ہی شعلے اگل رہے تھے۔

بلا کی کم گو راحت بیگم بولی بھی تھیں تو کیا..... عظیم شاہ کی آنکھیں حیرت اور صدمے سے ابل پڑی تھیں انہوں نے اپنا چشمہ اتار کر دور پھینکا تھا اور پوری قوت سے ٹیبل پر مکا مار کر اس کی گلاس ٹاپ میں دراڑ سی ڈال دی تھی۔

"بکواس بند کرو عورت۔ میں تمہیں عزت اور احترام دینے آیا تھا مگر تم تو آج بھی غرور اور تکبر کی ماری ہوئی کم نصیب عورت ہو جس کا نہ گھر بار رہا نہ گھر والا..... پھر بھی وہ خود کو اونچا اور عظمت کا پیکر ثابت کرنے کے لیے مجھ پر الزام لگا رہی ہے۔

میرے کردار کو آلودہ کر رہی ہے اپنی بدکرداری اور بے وفائی چھپانے کے لیے میں جانتا نہیں تیرے تعلقات کس کس سے تھے کہو تو نام گنوا دوں۔" وہ کف اڑانے لگے تھے شدت جذبات سے ان کی آواز لڑکھڑانے لگی تھی۔

"سچ کسی نے کہا ہے عورت کی تعلیم اور آزادی تباہی کے سوا کچھ نہیں لاتی۔"

مجال ہے ان کے چہرے پر کوئی ندامت آئی ہو راحت نے بے اختیار ہاتھ اٹھا کر تالی بجائی اور

داد دینے والے انداز میں مسکراتے ہوئے کلینڈر کی طرف اشارہ کیا۔

''میں جانتی ہوں عظیم شاہ جیسے لوگ اکثر اپنا ماضی بھول جاتے ہیں اپنے اعمال پر شرمندہ نہیں ہوتے کیونکہ انہیں اپنی عاقبت کی فکر نہیں ہوتی۔''

''تو کون ہوتی ہے مجھے میری عاقبت کی فکر کرانے والی تجھے اپنی آخرت کی فکر ہونی چاہیے بد کردار عورت کا مقدر جہنم ہے جانتی ہے نا۔''

''اور بد کردار مرد..... جو بہتان لگانا جانتا ہو، جو غیبت کرتا ہو جسے رشتوں میں رخنہ ڈالنے کا ہنر آتا ہے اس مرد کے لیے کیا سزا مقرر کی ہے شریعت نے صرف عورت کی سزائیں اور اس کے گناہ کیوں یاد رہتے ہیں مردوں کو.....

انہیں اپنا بھیانک چہرہ آئینے میں نظر کیوں نہیں آتا۔''

ان کی سپاٹ آواز میں سوائے نفرت کے کوئی تاثر نہیں تھا عظیم شاہ کے تن بدن سے شرارے سے پھوٹنے لگے تھے۔ وہ کیا خواہش لے کر آئے تھے اور کس قدر انکساری کے جامے میں آئے تھے لمحوں میں راحت بیگم نے نقاب کھینچ لی تھی۔

''بکواس بند کرو تم جیسی عورتیں گھر نہیں بساتیں کوٹھے سجاتی ہیں راحت بیگم یہ ہی دکھ ندیم شاہ کو خودکشی کرنے پر مجبور کر گیا۔ میرا تو بھائی تھا مجھے اس کی جوان موت کا دکھ نہیں ہے کیا۔ مت منہ کھلوا میرا ورنہ گلا دبا دوں گا۔''

عظیم شاہ کا اصل روپ سامنے آنے میں دیر نہیں لگی تھی اس بار تو گلا دبانے کی دھمکی دی تھی اور ندیم شاہ کی دفعہ وہ یہ کر گزرے تھے۔

راحت بیگم کے دل کی شریانیں اب سکڑنے لگی تھیں۔

''میری جان چھوڑ دو..... مجھ پر اور میری بیٹی پر رحم کھاؤ..... چلے جاؤ چلے جاؤ۔'' وہ چیخ اٹھی تھیں۔

''رحم ہی تو کھا رہا تھا تم ہر تمہاری بیٹی پر جس کی ماں کا کردار اچھا نہ ہو اس بیٹی کا کیا بھروسہ میں نے تو بھائی کا خون سمجھ کر رشتہ ڈالا تھا کہ شاید وہ تمہارے سائے سے محفوظ رہے گی اپنوں کے درمیان ہو گی تو ماں کی بدنامی کا خمیازہ نہیں بھگتے گی مگر تمہاری طرح اس کی بھی قسمت خراب ہے۔

پچھتاؤ گی..... ساری عمر اسے کوئی بیاہنے نہیں آئے گا۔''

''یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے عظیم شاہ کے صوفیہ کو کون بیاہنے آئے گا آئندہ اپنے ناپاک ارادے لے کر اس علاقے کی حدود میں قدم بھی مت رکھنا اور اپنی بیوی کو بھی سمجھا دینا کہ اس کا سازشوں کا دور گزر چکا اس کی کینہ فطرت اور حسد نے کئی گھر اجاڑ دیئے۔ بہتر ہے وہ صبح و شام اپنے گناہوں کی معافی مانگا کرے۔''

اپنی بات مکمل کرتے ہوئے راحت بیگم نے سرخ چہرے پر آئے نمکین قطرے صاف کیے اور انٹرکام کا بٹن دبا دیا گھنٹی شجاع کے کمرے میں بجی تھی۔ وہ لمحہ ضائع کیے بغیر اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

راحت بیگم کے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر محض ایک لمحے کا توقف کیا اندر بالکل سناٹا تھا وہ دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔

اندر کا ماحول محاذ جنگ کا منظر پیش کر رہا تھا یا پھر طوفان گزرنے کے بعد کی خاموشی کا۔ وہ سمجھ نہیں پایا۔

''شجاع! انہیں باہر کا راستہ دکھا دو۔'' راحت بیگم کا لہجہ قطعیت لیے ہوئے تھا۔

''اوہ تو تم ہو..... ہماری لڑکی کو گھر سے بھگانے والے۔''

انہوں نے سرعت سے پلٹ کر شجاع کا گریبان پکڑ لیا تھا شجاع کے لیے یہ اتنا غیر متوقع حملہ تھا کہ وہ سنبھلنے کی کوشش میں لڑکھڑا کر قریبی کرسی کا سہارا لینے پر مجبور ہو گیا۔

شجاع کے گریبان میں ہاتھ ڈالنا عظیم شاہ کی طاقت کا مظاہرہ نہیں بلکہ حماقت کا عملی نمونہ تھا۔

راحت بیگم اپنے سیکورٹی گارڈز کو کال کر کے اندر بلا چکی تھیں۔

''اس شخص نے ہم دونوں پر حملہ کیا ہے فی الحال تو تم سنبھالو اسے میں پولیس کو کال کرتی ہوں۔''

عظیم شاہ جھاگ اڑاتے ہوئے راحت اور شجاع کو مغلظات بک رہے تھے گارڈ کھینچتے ہوئے اس اونچے لمبے شخص کو باہر لے جا رہا تھا جس کی عقل ہمیشہ جذبات کے تابع رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

آج سعدیہ کے ڈسچارج ہونے کا امکان تھا اس کے زخم بھر چکے تھے لیکن ایک ٹانگ پر ہنوز پلاسٹر چڑھا تھا دوسری بھی اس حالت میں نہیں تھی کہ وہ اس کے سہارے کھڑی ہوتی یا اپنی کوشش سے اٹھ بیٹھتی۔

چلنے پھرنے اور خود کو حرکت دینے کے لیے اسے ہر وقت اللہ رکھی کو آواز دینی پڑتی جو ہسپتال کے باقی سارے اسٹاف کی طرح اس سے بے زار آ چکی تھی۔

عجیب ماتمی صورت والی لڑکی تھی سرمد بخاری کے آنے پر بھی واویلا اور اس کے جانے کے بعد بھی فریادیں۔

اس کے ساتھ مسئلہ کیا تھا اور سرمد بخاری اس کا کون تھا بہت حد تک یہ کہانی سب کی سمجھ میں آ چکی تھی سب دیکھتے اور محسوس کرتے تھے کہ سرمد بخاری کی آنکھوں میں اس کے لیے ہمدردی ہوتی ہے اور سعدیہ اسے نفرت بھری نگاہوں سے گھور رہی ہوتی ہے۔

جب وہ چند لمحے اس کی خیر و عافیت دریافت کرنے کے بعد چلا جاتا تو تب وہ رونے پیٹنے شور مچانے لگتی کبھی اپنی پٹیاں نوچ کر پھینک دیتی کبھی پلاسٹر والی ٹانگ کو ہک سے نکال کر پوری طاقت سے حرکت دینے کی کوشش کرتی۔

ان حرکتوں کی وجہ سے اس نے اپنے علاج کو طول دے دیا تھا ایک زخم بھرتا تو دوسرے کی پٹی کھل جاتی۔

اللہ رکھی بھی بس بے زاری کے عالم میں اپنا فرض نبھا رہی تھی۔ ہسپتال، اسٹاف اور ڈاکٹر کے لیے بھی یہ یہ مریضہ ناقابلِ برداشت ہو چکی تھی مگر ان کا فائدہ اسی میں تھا کہ وہ چپ چاپ یہ کام کیے جاتے کیوں کہ اتنی مہنگی مریضہ کو کوئی اتنی آسانی سے ڈسچارج نہیں کرتا۔

سرمد بخاری تمام فرمائشیں اور مطالبے بڑی خندہ پیشانی سے پورے کرتا تھا اور بلا حیل و حجت چیک پر سائن کر کے سعدیہ کی ساری بدتمیزیوں کا مداوا کر دیتا تھا۔

''سنو ہم لوگ یہاں سے کب جائیں گے؟'' آج صبح سے وہ قدرے سکون میں تھی۔

اسے امید تھی کہ رہائی مل جائے گی مگر یہ پلاسٹر کا عذاب اور اللہ رکھی کے سہارے کے بغیر تو وہ ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتی تھی۔

''اللہ تمہارا بیڑہ غرق کرے اظہر! غارت کرے اللہ تمہیں۔ جہنم میں جلو۔'' ایک دم ہی وہ پٹڑی سے اترتی تھی۔

اللہ رکھی نے بے زاری سے اسے دیکھا اور اپنی کوفت چھپانے کے لیے رخ موڑ کر بیٹھ گئی۔ سرمد بخاری اس نوکری کا بھاری معاوضہ دے رہا تھا اسے کیا ضرورت تھی سعدیہ سے بیر لینے کی۔

''میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں ہم لوگ کب جائیں گے یہاں سے۔'' وہ تلخی سے بولی۔

''مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہو مجھے کیا پتا میں کوئی ڈاکٹر ہوں کیا اور ویسے بھی تم اپنے ساتھ ظلم خود کر رہی ہو خود کو ٹھیک تو ہونے دو اس حالت میں تم گھر جا کر کرو گی بھی کیا۔''

اللہ رکھی نے صاف گوئی سے اس کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''گھر.....'' وہ جیسے کسی گہرے خواب سے بیدار ہو گئی تھی۔

''تمہیں پتا ہے میرا تو گھر ہی نہیں ہے میرے تو گھر والے بھی نہیں ہیں میں کہاں جاؤں گی یہاں سے نکل کر۔''

وہ جیسے کسی ٹرانس میں آ کر بولی۔ اللہ رکھی کی ساری حسیات بے دار ہو گئی تھیں۔

اسے بھی تجسس ہو رہا تھا اصل کہانی سعدیہ کے منہ سے سننے کا۔

''کیوں صاحب کا گھر..... تمہارا گھر نہیں.....'' وہ چالاکی سے پوچھنے لگی۔

''کون سے صاحب۔'' وہ جیسے کسی نشہ آور دوا کے زیر اثر تھی۔

''ارے سرمد صاحب.....'' اللہ رکھی نے تپ کر کہا عجیب لڑکی تھی کبھی کسی اظہر کو گالیاں دے رہی ہوتی تو کبھی سرمد بخاری کو صلواتیں سنا رہی ہوتی اللہ جانے اصل قصہ کیا تھا مگر جو بھی تھا دلچسپ تھا۔

''میرا تو تمہارے سرمد صاحب سے کوئی واسطہ نہیں میں تو ان کو جانتی بھی نہیں۔'' اس پر واقعی کسی دوا کا اثر ہو چکا تھا اللہ رکھی ذرا قریب کھسک کر سرگوشی میں بولی۔

''تو یہ اظہر کون ہے؟''

''مجھے کیا پتا اظہر کون ہے میں تو کبھی اس کے ساتھ نہیں گئی۔'' اللہ رکھی کا دماغ بھک سے اڑ گیا تھا نہ وہ سرمد بخاری کو جانتی تھی نہ اظہر سے کوئی واسطہ تھا گالیاں ان کو ایسے دیتی تھی جیسے اس کے ملازم ہوں۔

''یا اللہ یہ ماجرا کیا ہے۔''

''بی بی! تمہارا تو دماغ چل گیا ہے۔ اللہ جانے کس گناہ کی پاداش میں یہاں پہنچی ہے۔'' اللہ رکھی نے سوچا ضرور مگر کہہ نہ سکی۔ کیوں کہ ابھی کریدنے کے لیے بہت کچھ باقی تھا۔

''اچھا بات سنو.....اب تمہارا کوئی گھر نہیں تو تم یہاں سے جانے کی باتیں کیوں کرتی ہو۔ کہاں جاؤ گی یہاں سے نکل کر اس حالت میں۔''

''کہیں بھی چلی جاؤں گی مگر گھر نہیں جاؤں گی گھر والے تو کب کے مجھے دفنا چکے ہوں گے۔'' وہ گہرے دکھ سے دوچار تھی اس کی سیاہ آنکھوں کے حلقے بھی ان دنوں میں گہرے ہو گئے تھے۔ چہرے پر زردی سی گھلی رہتی تھی ہر وقت.....!

''کیوں تم نے ایسا کیا کیا ہے مجھے بتاؤ میں شاید تمہاری کوئی مدد کر سکوں۔''

اللہ رکھی بھی خاموش رہ رہ کر تھک گئی تھی اس لیے تنہائی اور بند کمرے کا فائدہ اٹھا کر اس راز سے پردہ اٹھانے کے درپے ہو گئی تھی جس کے تجسس نے اسے اول دن سے بے چین رکھا ہوا تھا۔

دیکھو میں نے ایسا کچھ نہیں کیا ہے مجھے تو پتا بھی نہیں یہ ایکسیڈنٹ کیسے ہوا۔ وہ یکدم چیخ پڑی۔

اس کا ہسٹریائی انداز اللہ رکھی کے لیے نیا نہیں تھا وہ بہت دنوں سے یہ ہی کر رہی تھی بولتے بولتے چیخنے لگتی۔ چیختے چیختے رونے لگتی۔

''کچھ تو ہوا ہوگا۔ اللہ رکھی نے اکسایا کسی ماہر نفسیات کی طرح۔''

''نہیں کچھ نہیں ہوا تھا بس تم چلی جاؤ یہاں سے دیکھو سرمد صاحب کو کچھ نہیں بتانا ورنہ وہ مجھے گھر چھوڑ آئیں گے اور گھر والے تو مجھے مار دیں گے۔''

اللہ رکھی نے اپنی نفسیات پر لعنت بھیجی تھی اور ہاتھ جھاڑ کر کھڑی ہوگئی اسے پورا یقین تھا سعدیہ کے دماغ میں کوئی خلل ہے وہ پاگل ہو چکی ہے یا پھر پاگل پن کی دہلیز پر کھڑی ہے بے چاری۔

''میں تمہارے لیے کھانا نکالتی ہوں۔''

اسے خود بھی بھوک لگ رہی تھی وہ اپنی چادر کا پلو کندھے پر ڈالتے ہوئے سائیڈ ٹیبل کی طرف مڑی ہی تھی کہ دروازے پر دستک دے کر سرمد بخاری اندر آ گیا تھا۔ اس نے ہمیشہ کی طرح پُر جوش لہجے میں سلام کرتے ہوئے سعدیہ سے خیریت دریافت کی۔

''کیا حال ہے بے بی۔'' سعدیہ نے اس کی آمد پر رخ موڑ لیا تھا اللہ رکھی خاموش قدموں کے ساتھ باہر چلی گئی تھی۔

''ارے یار تم کیوں مجھ سے اتنی ناراض ہو جاتی ہو نا اس حادثے میں میرا کوئی قصور نہیں میں نے بھلا کب چاہا تھا تم یوں مریض بن کر میرے سامنے پڑی رہو۔''

سرمد بخاری اپنا دل کھول کر کیسے تمہارے سامنے رکھے کہ وہ تمہارے لیے کتنا پریشان ہے۔

وہ اس کے پاس بیٹھ گیا تھا اور اس کے الجھے ہوئے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے فکر مندی سے بولا۔

''دیکھو تمہیں پتا ہے نا مجھے کتنے ضروری کام نبٹانے تھے دبئی میں لیکن میں تمہیں اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔''

سچائی اس کے چہرے سے عیاں تھی سعدیہ کی ویران آنکھوں میں یکدم پانی سا بھر گیا۔

وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔

''پتا ہے سعدیہ..... میں نے اپنا آدمی تمہارے علاقے میں بھیجا تھا تمہیں یہ جان کر افسوس ہوگا کہ وہاں کسی کو سعدیہ کی ضرورت نہیں کیونکہ ان کی نظر میں تم اظہر کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی ہو کیونکہ وہ بھی آجکل شہر سے باہر ہے تمہارے گھر والوں نے اظہت کو دھمکیاں بھی دی ہیں تمہارے تایا کا فیصلہ ہے تم دونوں کو گولی مار دی جائے۔

فرض کیا میں تمہیں اس حالت میں لے بھی جاؤں ایکسیڈنٹ کا ثبوت بھی پیش کر دوں تب بھی تم سمجھ سکتی ہو اس گھر میں تمہارا کیا مقام ہوگا۔

اس محلے میں لوگ تمہارے لیے کیا کیا باتیں نہیں کریں گے۔

مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے اگر تم اپنے گھر جانا چاہتی ہو اور وہاں سے میرے ساتھ رخصت ہونا چاہتی ہو یہ تو میرے لیے خوشی کی بات ہوگی جان من! لیکن اس بات کی ضمانت کون دے گا کہ وہ لوگ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے اور تمہیں میری دلہن بنا دیں گے کیونکہ میں تو اب تم سے دور نہیں رہ سکتا میں تو تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔''

وہ اس کے ہاتھ کو ہولے سے دبا کر بولا اس کا دوسرا ہاتھ سعدیہ کے بالوں میں سرسرا رہا تھا اور وہ ابھی کچھ دیر پہلے جس اذیت سے دوچار تھی اب اس کی تکلیف کم کونا شروع ہو گئی تھی نہ جانے کیوں گرم پانی آنکھوں کے کناروں سے پھسل کر سفید تکیے میں جذب ہونے لگا۔

''کیا تم اس لیے رو رہی ہو کہ میں نے تمہیں قید کیا ہوا ہے۔'' وہ بڑی معصومیت سے پوچھ رہا تھا مسکراتی نگاہیں اس کے نڈھال چہرے پر جمی تھیں جانے کیوں سرمد بخاری کو اس کے ساتھ دلی لگاؤ ہو گیا تھا عجیب سی کشش محسوس ہوئی تھی۔

''نہیں میں اپنی بے بسی پر رو رہی ہوں پتا نہیں میں چل پاؤں گی بھی یا نہیں۔'' اب اس کے

رونے میں شدت آ گئی تھی۔

''یہ کیا بے وقوفی ہے سعدیہ تم کیوں نہیں چل پاؤ گی احمق لڑکی! ایسا کچھ تھوڑی ہوا ہے۔ تین ہفتے بعد تمہارا پلاسٹر کھل جائے گا اور آج تم یہاں سے ڈسچارج ہو جاؤ گی۔

میرا آدمی تمہیں میرے فارم ہاؤس پر لے جائے گا پھر اس کے بعد تمہارا ٹریٹمنٹ دبئی میں ہو گا ہم دو تین دن میں یہاں سے نکل جائیں گے۔''

وہ تو سب کچھ طے کیے بیٹھا تھا سعدیہ کا ذہن ماؤف ہونے لگا اس نے ادھ کھلی آنکھوں کے ساتھ سرمد بخاری کو بغور دیکھنے کی کوشش کی مگر سب کچھ دھندلا گیا تھا اس کے مسکراتے نقوش گڈمڈ سے ہو گئے تھے۔

''میں اس ایکسیڈنٹ میں مر گئی ہوتی کاش.....'' اس کے لبوں سے سرگوشی کی صورت میں جو نکلا تھا وہ سرمد بخاری کو بالکل اچھا نہیں لگا تھا اس لڑکی کے ساتھ دل لگی کرتے کرتے وہ تو اس سے اچھا خاصا دل لگا بیٹھا تھا۔

''واہ رے سرمد بخاری تیرا بھی جواب نہیں کیا اسٹیمنا دیا ہے اللہ نے تجھے۔'' وہ خود پر ہنس رہا تھا سعدیہ کے آنسو پونچھتے ہوئے۔

''دیکھو جانِ من اب رونے سے کیا فائدہ جو ہونا تھا وہ ہو گیا میں نے تمہارے گھر کی اصل تصویر تمہارے سامنے رکھی ہے اگر تم جانا چاہتی ہو تو میں تمہیں چھوڑ کر آتا ہوں دیکھو میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں مجھے تم بہت عزیز ہو گئی ہو میں تمہیں کسی بھی قیمت پر کھونا نہیں چاہتا۔''

''میرے اندر اب بچا کیا ہے جیتے جی مر گئی ہوں۔ کیا منہ لے کر گھر جاؤں گی میری کون سنے گا اور میری کون مانے گا یا اللہ! تو مجھے اٹھا کیوں نہیں لیتا۔''

اس کا اضطراب آخری حدوں کو چھو رہا تھا سرمد بخاری اس کی باتیں سن کر شاطرانہ انداز میں مسکرایا تھا یہ ہی تو وہ چاہ رہا تھا کہ وہ خود اپنے گھر جانے کا خیال اپنے دل سے نکال دے اور اس کوشش میں وہ کافی

حد تک کامیاب بھی ہو گیا تھا۔

اس سے ہمدردی اور دل لگی اپنی جگہ لیکن وہ کامیاب بزنس مین تھا کامیاب ڈیل کرنے کے لیے اپنی ساری توانائیاں خرچ کر دیتا تھا۔

سعدیہ کو آج ڈسچارج کروانگ کے بعد وہ اسے اپنے فارم ہاؤس پر لے کر جا رہا تھا یہ فیصلہ اس نے شمائلہ کی وجہ سے کیا تھا کیوں کہ وہ بلاوجہ سعدیہ سے خائف ہو رہی تھی اس نے تو اول دن ہی کہہ دیا تھا کہ سرمد بخاری کیوں ایک معذور لڑکی کو اپنے لیے مسئلہ بنا رہا ہے حوالے کر دے کسی دارالامان کے یا پھر کسی بروکر کو تھما دے مگر یہ واحد فیصلہ تھا جو سرمد نے شمائلہ سے اختلاف کر کے کیا تھا اسی لیے وہ سعدیہ کو شمائلہ کی نظروں سے اوجھل رکھنا چاہ رہا تھا۔

❁ ❁

ناول خواب خواہش اور زندگی ابھی جاری ہے۔ مزید واقعات اگلے صفحات میں پڑھیں۔

رنگا رنگ کہانیوں سے سجا، خوبصورت اور دلکش

سوہنی ڈائجسٹ

SohniDigest.Com

اگر آپ بھی لکھ رہے ہیں اور اُردو قارئین کی تلاش میں ہیں تو اپنی کہانیاں Inpage میں کمپوز (ٹائپ) کر کے پورے اعتماد کے ساتھ سوہنی ڈائجسٹ میں بھیجیے۔ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔

ابھی sohnidigest@gmai.com پر ای میل کریں۔

قسط نمبر 7

راجہ طارق محمود کو اوٹی سے آئی سی یو میں منتقل کر دیا گیا تھا ان کی حالت خطرے سے باہر نہیں تھی ڈاکٹرز کے خیال میں اگلے چھ گھنٹے ان کے لیے بہت اہم تھے کیونکہ سر پر لگنے والی چوٹ کے باعث انہیں ابھی تک ہوش نہیں آیا تھا۔

"کشمالہ! اب آپ گھر جاؤ میں اور کاشف یہاں پر ہیں۔"

عاشر نے آئی سی یو کے دروازے کے باہر بیٹھی کشمالہ کے ستے ہوئے چہرے پر فکر مندی سی نگاہ ڈالی۔

ان لوگوں کو ہسپتال آئے ہوئے چھ گھنٹے سے زائد تو ہو چکے تھے اور وہ تب سے اسی پوزیشن میں بیٹھی یا تو رو رہی تھی یا پھر گلاس وال کے دوسری طرف نگاہیں جما کر کھڑی ہو جاتی۔ اس کی دونوں حالتیں ہی تشویش میں مبتلا کرنے والی تھیں۔

"مجھے گھر جا کر بالکل سکون نہیں ملے گا جب تک پاپا کو ہوش نہیں آ جاتا آپ پلیز مجھے جانے کے لیے مت کہیں۔"

اس نے عاشر کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔ ایک تو آنکھیں سمندر پھر ان کی طغیانی کا جان لیوا منظر.....

وہ نظریں چرانے پر مجبور اس لیے ہوا تھا کہ ادے ہمیشہ اپنا آپ پوری سچائی کے ساتھ اس کی آنکھوں میں نظر آتا تھا۔

اس وقت بھی وہ پریشان نہیں تھی ذہنی طور پر بہت الجھی ہوئی تھی مگر عاشر جب سے خون دے کر آیا تھا وہ اسے جب بھی دیکھتی عقیدت مندی کے تاثرات چہرے اور آنکھوں میں سمٹ آتے۔

عاشر جانتا تھا اس نے جو بھی کیا انسانیت کے ناتے کیا کوئی بھی ہوتا وہ اس کے لیے یہ ہی کرتا۔

مالا! عاشر ٹھیک کہہ رہا ہے اب دیکھو نا اس طرح بیٹھے بیٹھے تمہاری اپنی طبیعت خراب ہو جائے گی سمجھنے کی کوشش کرو میں تمہیں ڈراپ کر دیتا ہوں صبح ہوتے ہی آ جانا۔

''نہیں میں نہیں جاؤں گی مجھے کچھ نہیں ہوگا میں بہت چھوٹی سی تھی جب ماما ہاسپٹلائز تھیں اور میں پوری رات بیٹھی رہتی تھی ان کے پاس۔''

افسردہ چہرے پر لمحے بھر کو مسکراہٹ آئی تھی۔

''وہ کیوں ہاسپٹلائز تھیں۔''

آئی سی یو کے کوریڈور کی پراسرار اور خنک سی فضا میں یہ باتیں اس وقت بہت بھلی محسوس ہوئی تھیں۔

''وہ کینسر پیشنٹ تھیں ان کا کیسنر بالکل لاسٹ اسٹیج پر ڈائیگنوس ہوا تھا صرف ایک مہینہ ہاسپٹلائزر ہیں۔''

وہ اپنی ماں کا ذکر کر رہی تھی اور وہ بھی اس لمحے کا جب ان کی تکلیف کا مداوا کوئی نہیں کر سکتا تھا عاشر اور کاشف بالکل چپ ہو گئے تھے۔

''لیکن میری مما بہت بہادر تھیں انہیں پہلے سے پتا تھا ڈاکٹرز نے جب انہیں زندگی سے بالکل مایوس بھی کر دیا تھا تب بھی وہ اداس نہیں ہوتی تھیں مجھے یاد ہے ہلکا ہلکا۔ اپنی زندگی کے لاسٹ ڈیز میں انہوں نے ڈھیر ساری شاپنگ کی ہمارے لیے، پاپا کی فیورٹ ڈشز بنائیں ہم پکنک منانے گئے اور پھر اتنا سب کچھ کرنے کے بعد وہ ایک دن چپکے سے چلی گئیں۔''

وہ دل کی آنکھ سے اپنی ماں کو دیکھ رہی تھی ان سے باتیں کر رہی تھی عاشر کے چہرے پر حسرت سی

بکھر گئی اس نے ماں جیسے معتبر رشتے کو اپنے مفادات کے لیے بدلتے دیکھا تھا اس لیے تکلیف سی محسوس ہوئی تھی یہ سب دن کر۔

''اتنی بہادر مما کی بیٹی..... بالکل بھی بہادر نہیں، بچوں کی طرح رو رہی ہے آنکھیں دیکھی ہیں اپنی، سوجا ہوا غبارہ.....''

کاشف نے ماحول پر چھائی ہوئی یاسیت کم کرنے کی کوشش کی تھی۔ عاشر بھی مسکرا دیا تھا یہ ہو ہی نہیں سکتا کاشف جس ماحول کا حصہ ہو وہاں ہلچل نہ مچے اسے ماحول کو اپنے تابع کرنے کا ہنر بخوبی آتا تھا۔

کشمالہ نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا تھا کہ اس موقع پر عاشر کے ساتھ کاشف تھا جو پوری صورتحال کو سنبھالے ہوئے تھا ورنہ عاشر تو کسی بھی لمحے اپنے سابقہ دور میں جا سکتا تھا۔

جہاں اس سے بات کرنے کے لیے سو بار سوچنا پڑتا تھا۔

یہ تو طے تھا جب تک راجہ طارق محمود کو ہوش نہیں آجاتا کشمالہ وہاں سے جانے کو تیار نہیں تھی یہ ہی حال کاشف کا تھا البتہ عاشر کے تیور اچانک ہی بدلے تھے اور وہ تھوڑی دیر کوریڈور میں ٹہلنے کے بعد ان سے مخاطب ہوا تھا۔

''مجھے صبح ضروری کام سے جانا ہے اس لیے ابھی میں جا رہا ہوں۔ راجہ صاحب کو ہوش آجائے تو نانو کو انفارم کر دینا پہلی فرصت میں کاشف.....''

اس کی اطلاع پر حیران تو دونوں ہوئے تھے البتہ کشمالہ کا ردعمل فوری سامنے آیا تھا۔

''کیا پاپا سے بھی زیادہ اہم کام ہے آپ کی زندگی میں۔''

وہ تنک کر بولی تھی اس کے مقابل آتے ہوئے۔

''پاپا وہ آپ کے ہیں اور آپ یہاں موجود ہیں۔ پھر آپ کی ہیلپ کے لیے کاشف بھی ہے مجھے نانو کی فکر ہے۔ میری تو کل کائنات ہیں وہ.....''

وہ پل بھر میں زمانے بھر کی سختی اور نخوت اپنے چہرے پر لے آیا تھا۔ کشمالہ ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔

''اگر آپ نانو کی وجہ سے جانا چاہتے ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ اس بار آپ کی زیادتی نا قابلِ برداشت ہے۔''

''بہت جلدی آپ کی برداشت جواب دے گئی میری ہمت کو داد نہیں دیں گی میں کب سے بہت ساری زیادتیاں برداشت کر رہا ہوں۔''

وہ انتہائی صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پلٹ کر کوریڈور کے بیرونی دروازے کی طرف چل پڑا تھا۔

کشمالہ کی نظریں اس کی شاہانہ چال اور بے حد شاندار جسمانی ساخت پر جم سی گئی تھیں۔ جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا تھا کشمالہ کی نظروں نے اس کا تعاقب کیا تھا اور دل نے اس کے بدل جانے کی دعا مانگی تھی۔

وہ اس شخص کے ساتھ زندگی جینا چاہتی تھی مگر وہ کسی اڑیل گھوڑے کی طرح بھاگا ہی چلا جا رہا تھا بے سمت بے لگام.....

☆.....☆.....☆

راجہ طارق محمود کو بارہ گھنٹے کے بعد بھی ہوش نہیں آیا تھا۔ ڈاکٹرز کی ٹیم نے مشترکہ فیصلے کے بعد ان کا کیس نیورو سرجن کی ٹیم کے حوالے کر دیا تھا۔ ان کے خدشات اپنی جگہ درست سہی لیکن کوئی بھی اس بات کو ماننے کے لیے راضی نہیں تھا کہ وہ کوما کی حالت میں بھی جا سکتے ہیں۔

نانو پہلے تو ان کے ہوش میں آنے کی منتظر تھیں لیکن اب ان کی حالت بھی بگڑ رہی تھی۔

کشمالہ خولہ کے لیے آزمائش کے یہ لمحے سکڑنے کے بجائے پھیلتے ہی جا رہے تھے۔ ساری ذمہ

داری کاشف پر آ گئی تھی یا پھر ان دونوں پر..... جو اس سارے سسٹم سے ناواقفیت کے باوجود کبھی ایک ڈاکٹر کے روم میں تو کبھی کسی لیبارٹری کے سامنے کھڑے ہو کر رپورٹس کا انتظار کر رہی تھیں۔

راجہ طارق محمود کے ضروری ٹیسٹ کیے جا رہے تھے تب نانو بھی ہسپتال بیڈ پر آ گئی تھیں۔

کشمالہ کا تو بس نہیں چل رہا تھا دھاڑیں مار مار کر روئے عاشر خود بھی غائب تھا موبائل بھی بند تھا۔

اسے وہ ظالم اور ضدی تو لگتا تھا لیکن وہ اتنا بے رحم اور بے حس بھی ہو سکتا ہے۔ یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ کاشف کو بس اتنا پتا تھا کہ وہ صبح سویرے کہیں گیا ہے اور اس کی گاڑی بھی گھر پر ہی کھڑی تھی۔

''خدیجہ! جیسے ہی عاشر گھر پہنچے مجھے انفارم کر دینا۔'' اس نے گھر فون کرنے کے بعد موبائل پٹختے ہوئے بے بسی سے کہا تھا۔

''مالا! تمہارے غصہ کرنے سے نہ عاشر آ جائے گا اور نہ ہی پاپا کو ہوش آئے گا۔ ہمیں اس وقت پاپا کی فکر ہونی چاہیے مجھے تو اس ہسپتال سے بھی پرابلم ہے کیا ایسا نہیں سکتا کہ ہم پاپا کو کسی دوسرے ہسپتال میں شفٹ کر دیں۔''

''تمہیں پتا ہے پاپا اس حالت میں کہیں شفٹ نہیں ہو سکتے۔ وہ وینٹی لیٹر پر ہیں ان کی پلس pulse چیک کرو بالکل بھی پراپر نہیں ہے۔''

کشمالہ آئی سی یو کی مشینوں میں جکڑے راجہ طارق محمود کے چہرے کو بغور دیکھ رہی تھی انہیں جو زیادہ چوٹ آئی تھی اس نے سر کے اوپر والا حصہ بری طرح متاثر کیا تھا۔

ان کے چہرے پر چیرے انگیز طور پر معمولی خراشیں آئی تھیں اور باقی کمر کے اوپری حصے پر لپٹی ہوئی سفید پٹیاں بتا رہی تھیں کہ ایکسیڈنٹ کی نوعیت معمولی نہیں تھی۔

اللہ کو ان کی زندگی منظور تھی کشمالہ نے دل سے اس اجنبی آدمی کو دعا دی تھی جس نے پاپا کو سڑک سے اٹھا کر ہاسپٹل تک پہنچایا تھا وہ اگر ایکسیڈنٹ کے بعد ان کی گاڑی کو چھوڑ کر چلا جاتا ان کے زخمی وجود

کی خبر نہ لیتا تو شاید اس وقت بہت برا ہو چکا ہوتا۔ وہ بار بار اس انجان آدمی کے لیے مشکور ہو رہی تھی۔

وہ آئی سی یو کے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے اسی اجنبی کے بارے میں سوچ رہی تھی تب ہی اس کو کسی نے مخاطب کیا تھا۔

''ایکسکیوز می.....! کیا آپ راجہ طارق محمود کے ساتھ ہیں دراصل میری گاڑی سے ان کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ کیا میں ان کی خیریت معلوم کر سکتا ہوں۔''

وہ زخمی آدمی کشمالہ کو مجبور کر رہا تھا کہ وہ ہاسپٹل کا پروٹوکول بالائے طاق رکھ کر اس وقت سارا غصہ ساری فرسٹریشن اس پر نکال دے جس کی کوتاہی نے انہیں یہ وقت دکھایا تھا۔ عجیب آدمی تھا پولیس کیس سے بھی خوف زدہ نہیں تھا۔

کشمالہ کے بس میں ہوتا تو سب سے پہلے اسے ڈرائیور سمیت اندر کروا دیتی۔

''وہ ٹھیک نہیں ہیں انہیں ابھی تک ہوش نہیں آیا اینی وے آپ کا شکریہ ہمارا جو نقصان ہونا تھا ہو گیا آپ سامنے آ کر ہماری تکلیف میں اضافہ نہ کریں۔''

خاص برٹش لہجے میں انگریزی بولتے ہوئے وہ پریشان چہرے والی لڑکی منیر کمال کی کینہ توز نگاہوں کو چمکنے پر مجبور کر گئی تھی۔

''مجھے منیر کمال کہتے ہیں میرے لائق کوئی خدمت، اگر میں آپ کے کام آسکوں تو پلیز.....''

نہ اس نے توقف کیا تھا اور نہ ہی کشمالہ نے پلکیں جھپکی تھیں۔

''واٹ منیر کمال.....'' اسے زوردار جھٹکا لگا تھا کسی برقی تار کا۔

☆.....☆.....☆

''نہ خود چین سے رہتی ہو نہ کسی کو آرام کرنے دیتی ہو تمہاری زندگی کا کوئی اور مقصد بھی ہے سوائے پرابلمز کھڑی کرنے کے۔''

وہ اس کے سر پر کھڑا اسے لتاڑ رہا تھا۔ شجاع کی پہلی ہی آواز پر اس نے دروازہ کھول دیا تھا ورنہ اس سے پہلے سب اس کا دروازہ بجا بجا کر مایوس واپس پلٹ گئے تھے شجاع کی آواز پر بھی دروازہ نہ کھولتی تو پھر سے ثابت کر دیتی کہ اتنا سب کچھ ہونے کے بعد اس کی عقل ٹھکانے نہیں آئی۔ اب عقل ٹھکانے تو آئی تھی مگر ملال اور رنج نے اندر تک توڑ دیا تھا۔

''میں نے کسی کو کوئی پرابلم نہیں دی اور آپ کا بھی شکریہ میں جانتی ہوں اگر آپ نہ آتے تو شاید بہت برا ہوتا۔''

اس نے ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھا تھا شجاع نے بمشکل خود پر ضبط کے پہرے بٹھائے تھے۔ راحت بیگم یا کوئی اور کسی بھی وقت اندر آ سکتا تھا وہ جذبات کے ہاتھوں اتنی جلدی سب پر عیاں نہیں نہیں ہونا چاہتا تھا۔

''میرے آنے سے تو اور بھی برا ہو گیا ہے تم اپنے سگے عزیزوں سے جدا ہو گئیں سفیر سے تمہاری شادی ہوتے ہوتے رہ گئی لیکن فکر نہ کرو آئے تھے تمہارے تایا پھوپھی جان نے ہاں کر دی ہے انہیں بہت جلد تم اپنے خوابوں کی جنت میں واپس چلی جاؤ گی فکر نہ کرو.....''

اف کس قدر طنز کر رہا تھا وہ گھریلو سی ٹی شرٹ اور شارٹس میں آنکھیں ماتھے پر رکھے وہ شجاع نہیں وارثِ جیل لگ رہا تھا صوفیہ تڑپ کر بیڈ سے اتری تھی آدھی جان تو بخار کی وجہ سے نکلی ہوئی تھی اور باقی کی کسر اس وقت شجاع نے پوری کر دی تھی۔

''کیا کہہ رہے ہیں آپ..... آپ کو اپنے الفاظ کی تلخی کا اندازہ ہے۔ آپ کی ان ساری باتوں سے مجھے ہارٹ اٹیک بھی ہو سکتا ہے۔''

روتی ہوئی آنکھیں ستا ہوا چہرہ اور اس پر ستم بہت کچھ جتاتا ہوا لہجہ..... شجاع کی مشکل تو سوا ہو گئی تھی۔ ایک تو اتنے دنوں کے بعد دیکھا تھا پھر اتنے قریب آ کر کھڑی ہو گئی تھی آنکھوں میں شجاع کی

زندگی ہونے کا مان لیے۔

''ہارٹ اٹیک تو مجھے ہو جائے گا تم اگر اپنی ضد سے باز نہ آئیں اور تم نے خود کو بدلنے کی کوشش نہ کی تو.....'' وہ رخ بدل کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''میں نے کوئی ضد نہیں کی تھی سب نے مجھے اپنی مرضی اور خوشی سے جانے کی اجازت دی اور آپ نے بھی مجھے نہیں روکا تھا یاد ہے آپ کو۔''

کمال ڈھٹائی تھی وہ بے ساختہ مسکرا کر رہ گیا وہ اس کو ڈانٹنے آیا تھا اپنا غصہ ٹھنڈا کرنے آیا تھا لیکن یہاں تو الٹا ہی معاملہ ہو گیا تھا وہ تو اس کی کوتاہیاں گنوانے بیٹھ گئی تھی۔

''میں کیوں نہیں روکتا کیا لگتی ہو میری۔''

اس کو اپنے اندر سمونے کی تمنا تو پوری ہو نہیں سکتی تھی سو لفظوں سے جذبات کی طغیانی پر بند باندھے جا سکتے تھے۔

''آپ نے خود ہی تو تائی کو بتایا ہے پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟'' اپنے سوال پر اب خود ہی محظوظ ہو رہا تھا وہ..... صوفیہ بے بسی سے ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔

''ضروری ہے جو بات میں نے تائی کو بتائی وہ سب سچ بھی ہو میں تو تمہیں اس مشکل سے بچانا چاہتا تھا جو تمہارے سر پر منڈلا رہی تھی۔''

''دیکھیں آپ نے جو کہنا ہے صاف صاف کہیں میری طبیعت ویسے ہی ٹھیک نہیں اوپر سے آپ کی باتیں.....''

پھر سے دھمکی آمیز لہجہ عود کر آ گیا تھا لجاجت اور نرمی بس چند لمحے کی مہمان تھی۔

''کیا ہوا تمہاری طبیعت کو.....'' تشویش بجا تھی۔

''کچھ نہیں ہوا بس آپ جائیں۔'' وہ اسے پیچھے دھکیلتے ہوئے واپس اپنے بیڈ پر آ گئی تھی ناراض

چہرہ لیے۔

سچ ہے لڑکیاں تمام عمر محبت کا اقرار سنتی رہیں تب بھی مطمئن نہیں ہوتیں۔ محبت بھرے لفظوں کی تاثیر پانی جیسی ہے نہ پیاس بجھتی ہے نہ طلب ختم ہوتی ہے۔

شجاع کو اس کا ہاتھ گرم سا محسوس ہوا تھا وہ ساری شرارت اور تنگ کرنے کا ہر ارادہ ترک کر کے اس کے پاس آ گیا اور اس کے تپتے چہرے کو اپنے ہاتھ سے چھوتے پریشان ہو گیا۔

اب یہ بخار کس خوشی میں چڑھا لیا۔

''بس سارے قصور میرے ہیں۔ مجھے کیا پتا بخار کیوں ہوتا ہے؟'' وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر غصے سے بولی تھی۔

''اور تمہیں دیکھ کر جو مجھے بخار ہو جاتا ہے اس کا بھی نہیں پتا ہو گا تمہیں ہے نا۔'' دل کی ساری شدتیں آنکھوں میں سمٹ آئی تھیں اس سے پہلے عملی اظہار کی صورت شجاع کوئی کارنامہ انجام دیتا انعم کی آواز نے سارا طلسم ہی توڑ دیا۔

''اوہ تو ہمارے لیے دروازے پر تالے لگے تھے ان کے لیے دل کے دروازے بھی کھلے ہیں۔'' اس کی آواز کے ساتھ سب کے سب سیلابی ریلے کی صورت اندر چلے آئے تھے خوب شور مچاتے ہوئے۔

''بھئی اگر رونمائی کا کوئی مسئلہ تھا تو بتا دیا ہوتا۔''

یہ آواز محسن کی تھی شجاع نے اٹھ کر اس کی گردن دبوچ لی تھی۔ انعم اور عائزہ نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔

''پھوپھی جان نے فیصلہ کر لیا ہے کل نکاح ہو رہا ہے تم دونوں کا۔'' سرگوشی تھی کہ آبِ حیات کے قطرے وہ عائزہ کے اندر چھپ سی گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

''مریم.....'' اسے شاید کسی نے آواز دی تھی۔

''مریم مجھے پتا ہوتا کہ اعجاز الدین سے تیری پرانی یاری ہے تو میں تجھے کب کا اس کے حوالے کر کے تیری قیمت وصول کر چکا ہوتا مگر..... بے غیرت عورت تو نے میری عزت کا ایک پل کو بھی خیال نہیں کیا اور چلی گئی۔''

''دیکھ میں نہ کہتا تھا تو اپنی پارسائی کا ڈھونگ کرتی ہے میں تو تیری رگ رگ سے واقف ہوں۔''

آوازوں کا شور..... منیر کمال کی چیخ و پکار..... اس کے بے ہنگم قہقہے جانے کیا کچھ تھا جو مریم کی بے خواب آنکھوں کے بند ہوتے ہی کمرے کے ملگجے اجالے میں شیطانی رقص شروع کر دیتا۔

اعجاز الدین کے گھر کے اس بڑے سے آرام دہ کمرے میں رات گزارنا شاید اس کی تقدیر کے کسی پرت پر ہمیشہ سے لکھا ہوا تھا مگر اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ منیر کمال کے تکلیف دہ سناٹے سے اتنی دور اور قدرے محفوظ چھت کے نیچے ہے۔ اسے منیر کمال کے خوف کا بھوت پل پل آ کر ڈرا رہا تھا وہ آنکھ بند کرتی تو لگتا کسی نے گردن دبوچ لی ہے۔

وہ آنکھیں کھولتی تو سامنے کی دیوار پر آویزاں تصویر سے منیر کمال کا ہیولہ اس پر حملہ کرنے کو لپکتا۔

وہ بے قرار ہو کر خولہ اور کشمالہ کو اپنے ساتھ لگا لیتی جو کافی دیر جاگنے کے بعد اب پر سکون نیند سو رہی تھیں۔

وہ سونا نہیں چاہتی تھی مگر مریم..... مریم کی صداؤں سے بھی بچنا چاہتی تھی۔ ایک دفعہ منیر کمال نے اس کی شہ رگ پر چھری رکھ دی تھی۔ پھل کاٹنے والی تیز دھار چھری سے حملہ اس دن ہوا تھا جب منیر کمال نے برابر والے کمرے میں ایک عورت کے ساتھ شب گزارنے کے بعد مریم سے حقوق طلب کیے تھے۔ وہ سمجھ نہیں پائی تھی کہ اس مرد کی ہوس کی حد کیا ہے۔ اس نے احتجاجاً اپنے کمرے کا دروازہ بند کرنے کی کوشش کی تھی تب منیر کمال کچن سے جا کر چھری لے آیا تھا مریم کو یقین تھا اس کی موت منیر کمال

کے ہاتھوں جب بھی ہوئی چھری سے ہی ہوگی یہ اس کا پسندیدہ ہتھیار تھا۔

''منیر تم تھکتے کیوں نہیں ہو۔'' وہ بے بسی کی آخری حد پر پہنچ کر رو پڑی تھی۔

''تو نے کب میری تھکن اتاری ہے۔ تیرے اندر عورت والی کوئی خوبی ہو تو میری تھکن اترے تیرا وجود تو مجھے قبر پر لگی ہوئی سلیب لگتا ہے مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں قبر کے اندر اتر گیا ہوں۔''

کبھی کبھی جب اس نے ایک حد تک نشہ کیا ہوتا تھا تو اس کی باتوں میں تدبر کا رنگ اتر آتا تھا۔

مریم کے اندر تک نیزے کی انی کی طرح کوئی چیز چھید کرتی چلی گئی تھی وہ ہمیشہ اپنے بارے میں یہ سنتی تھی مگر اس دن خاموش نہ رہ سکی تھی۔

''تم نے میرے وجود کو بیوی ہونے کا مان دیا ہوتا تو میرے احساسات کی موت نہ ہوتی منیر! تم نے مجھے طوائف سمجھ کر استعمال نہ کیا ہوتا تو میرا وجود تمہارے کسی کام آتا۔

تم کیا جانو عورت کی اپنے مرد کے ہاتھوں پامالی طرح زندہ درگور کر دیتی ہے۔ تم ٹھیک کہتے ہو منیر..... میں تمہاری تھکن کبھی نہیں اتار سکتی۔

میرا وجود تمہاری ہوس بڑھا دیتا ہے اور تمہارا وجود میری فطرت کے لیے سزا بن گیا ہے۔''

''بکواس کرتی ہے مجھے سبق پڑھاتی ہے..... کون سکھاتا ہے تجھے یہ فلسفہ.....'' اسے ایک لات پڑی تھی چھری کے بجائے اور وہ دوہری ہو گئی تھی۔

''زندگی سب سکھا دیتی ہے۔'' اس نے اپنی چیخ دبا کر کہا تھا۔

''تیری زندگی کا گلہ گھٹنا پڑے گا مجھے حرافہ عورت سب سمجھتا ہوں تیری چالاکیاں تو سمجھتی ہے تیری ان حرکتوں پر تجھے طلاق دے دوں گا اور تو اپنے چاہنے والے کے پاس چلی جائے گی نہیں تجھے میں ساری زندگی اس بے وفائی کی سزا دوں گا۔

تجھے میرے پاس سے بدبو آتی ہے نا۔ میں تجھے بھی بدبودار کر دوں گا تجھے اپنے آپ سے گھن

آئے گی۔"

وہ آپے سے باہر ہو گیا تھا اس کی آواز سن کر برابر والے کمرے سے وہ نیم برہنہ عورت برآمد ہوئی تھی جس کے چہرے پر حیرت کے ساتھ تجسس بھی تھا مریم کے لیے وہ نیا چہرہ تھا اس کی آنکھوں میں بے ساختہ ہمدردی کے تاثرات ابھرے تھے اور وہ مریم کو بچانے کی خاطر بے اختیار منیر کمال کے سامنے دیوار بن کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"واٹ دا ہیل آف دس۔"

اس نے انگریزی میں مغلظات بکنا شروع کر دی تھیں منیر کمال کے لیے یہ دوہرا حملہ تھا ابھی مریم کے لفظ ہی ذہن پر ہتھوڑے برسا رہے تھے پھر یہ شروع ہو گئی تھی۔

وہ منیر کمال کی دوست تھی یا کوئی پیشہ ور عورت..... مریم اس کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگا پائی تھی نہ ہی مریم کو اس بات سے سروکار تھا کہ رات کے اس پہر وہ اس شرمناک حلیے میں اس کے شوہر کو قربت فراہم کر رہی تھی وہ تو اس لمحے اس کی دل و جان سے مشکور تھی جس کی بروقت مداخلت سے اس کی جان بخشی ہوئی تھی ورنہ منیر کمال تو مار مار کے اس کی جان لے لیتا۔

وہ منیر کمال کو گھسیٹتے ہوئے دوسرے کمرے میں لے گئی تھی اور مریم کتنی دیر تک فرش پر بے سدھ پڑی ان کی تکرار سنتی رہی۔

اس کی آج تک سمجھ نہیں آیا تھا بظاہر اتنا مہذب اور خوش شکل نظر آنے والا منیر کمال کس بات پر اپنے خول سے باہر آتا ہے۔ اور اس جیسی کمزور عورت پر تشدد کر کے انسان سے درندہ بن جاتا ہے۔

کوئی نفسیاتی گرہ ضرور تھی جس کو مریم اکثر سلجھانے کی کوشش کرتی مگر سرا ہاتھ نہ آتا۔

منیر نفس کی آگ بجھانے پر آتا تو انتہا کر دیتا مریم کو ادھ موا کر کے چھوڑتا وہ اسے مارنے پر آتا تو تب بھی تھکا ہارا پیچھے ہٹتا وہ ہر حال میں انتہا پر پہنچ کر دم لیتا اس کے پاس درمیانی کوئی راستہ نہیں تھا۔

تب اکثر مریم سوچتی اگر اس شخص کو پیار کرنا آتا تو یہ تب بھی پاگل کر دیتا اور یہ سوچ کر وہ ہمیشہ دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیتی۔

اسے زندگی میں جتنا سکھ آنسو بہانے سے ملتا تھا اتنا تو شاید ماں کے گلے لگنے سے بھی نہیں ملا۔

آنکھوں کے گرد گہرے ہوتے سیاہ حلقوں سے اب اسے انسیت ہو چلی تھی وہ جس دن روتی نہیں تھی اس دن بے چین رہتی۔

روح اور جسم پر گہرے گھاؤ لگنے کے بعد بھی وہ زندگی کے لیے لڑ رہی تھی وہ زندہ رہنا چاہتی تھی شاید اس کی وجہ دو دو زندگیاں تھیں جنہیں اس کے وجود سے جنم لینا تھا جب اس نے جڑواں بیٹیوں کو جنم دیا تھا اس دن بھی وہ تقدیر کی اس کرم نوازی پر رو پڑی تھی۔

منیر کمال دو بیٹیوں کا باپ بن گیا تھا۔

اچانک ہی آنسوؤں کے درمیان اس کے چہرے پر امید کی مسکراہٹ جگمگانے لگی تھی شاید میرے رب نے یہ انعام اسی لیے دیا ہو کہ منیر کمال کی عورت کے وجود سے کھیلنے کی لت ختم ہو جائے۔

اسے بیٹی کا رشتہ پلٹنے پر مجبور کر دے گناہ کی دلدل سے باہر نکال کر لے آئے مگر ایسا نہیں ہوا تھا اس نے سرے سے بیٹیوں کو اپنا ماننے سے ہی انکار کر دیا تھا۔

"تو عورت ہے یا کتیا..... پیدا بھی کیں تو ایک ساتھ دو۔"

پتا ہے میں وہ کیا کہنے والا تھا مریم نے گھبرا کے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے وہ کچھ نہیں سننا چاہتی تھی اس لمحے۔

اسے قدرت نے اتنے بڑے انعام سے نوازا تھا۔ ماں کے رتبے پر فائز کیا تھا اس کے دکھوں کو بانٹنے والیاں بھیج دی تھیں وہ اس وقت نہ کوئی بدفال منہ سے نکالنا چاہتی تھی اور نہ سننا چاہتی تھی۔

اس نے ہاسپٹل کا بل اپنی جمع پونجی سے ادا کیا تھا اور ٹیکسی کر کے اس مسافر خانے میں چلی آئی تھی

جہاں پتا نہیں اس کا قیام کتنے دن کا تھا۔

☆.....☆.....☆

ہر رات کی طرح اس نے اعجاز الدین کے گھر کی پہلی رات بھی روتے اور منیر کمال کے بھوت سے ڈرتے ہوئے گزار دی تھی۔

اسے آنکھ بند کرنے پر لگتا تھا جیسے وہ ابھی چھری لے کر آ جائے گا اس بار تو وہ واقعی سنگسار کیے جانے کے قابل تھی کیوں کہ وہ ایک غیر مرد کے ساتھ آ گئی تھی اپنے شوہر کو چھوڑ کر اس کا گھر چھوڑ کر۔

اب تو اس کے گناہوں کی فہرست بھی طویل ہو گئی تھی اب تو اسے یقین تھا اس جرم کی سزا سوائے موت کے کچھ نہیں۔

منیر کمال سے بچ گئی تو اس کے گھر والے مار ڈالیں گے اب شاید روئے زمین پر اس کا کوئی محفوظ ٹھکانہ نہیں تھا۔

سوائے اعجاز الدین کے اس گھر کے جس کا تلخ سچ بھی ذہن و دل کو ناگوار نہیں گزرا تھا۔

پورے سفر کے دوران نجانے کیوں اس کا وجود سایہ بنا رہا اور اب اس کا یہ گھر محفوظ پناہ گاہ اس نے گیلی آنکھوں سے کھڑکی کے باہر دیکھنے کی کوشش کی نیلگوں آسمان کا اجلا پن صبح کی نوید دے رہا تھا وہ بے ساختہ اٹھ کھڑی ہوئی یہ وقت تو رب کے حضور سر جھکانے کا اور اس کا شکریہ ادا کرنے کا تھا۔

بہت دن ہو گئے تھے اس نے اپنے رب سے نہ کوئی شکوہ کیا تھا اور نہ کچھ مانگا تھا مکمل ناراضی چل رہی تھی یہ اس کا واحد پسندیدہ کام تھا جو وہ پورے اہتمام کے ساتھ کرتی تھی اور یہ وہ واحد ذات تھی جس کے ساتھ وہ ناراض بھی ہوتی تھی اور شکایتیں بھی کرتی تھی آج تو نہ شکایت کرنے کا موقع تھا اور نہ ناراض ہونے کا آج تو بہت ساری باتیں کرنی تھیں رہنمائی طلب کرنی تھی اور ہمت بھی۔

اس کے قدموں میں پھرتی سی بھر گئی اور وہ سب کچھ بھول کر وضو کرنے چل دی۔

نجات کا یہ واحد راستہ تھا جو اسے منیر کمال کی بھیانک آوازوں سے دور لے جا سکتا تھا اس کی سوچوں کو منیر کمال کے بھوت سے آزاد کر سکتا تھا۔

وہ ملحقہ واش روم میں وضو کرنے گئی تھی۔ لیکن غسل کر کے باہر آئی تھی ذہن و دل پر چھایا غبار کم ہونا شروع ہوا تھا تو زندگی کی احتیاجات نے سر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔

اس گھر میں جائے نماز کی چیز شاید ہی دستیاب ہوتی اس نے کمرے کا ایک کونا منتخب کر کے گرد آلود قالین پر کھڑے ہو کر اندازے سے قبلے کے رخ کا تعین کر کے نیت باندھ لی۔

اندر وہ اپنے رب سے ہمکلام تھی اور باہر آہستہ آہستہ اندھیرا چھٹ رہا تھا۔ رات کے راہی نے رخت سفر باندھ لیا تھا اور طویل دن طلوع ہونے کو تھا۔

اعجاز الدین صبح کی سیر کا عادی تھا اس کی آنکھ اپنے مقررہ وقت پر بغیر کسی تگ و دو کے کھل جاتی تھی۔

اس وقت بھی وہ فریش ہونے کے بعد آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بال بناتے ہوئے یکدم کچھ یاد آنے پر ٹھٹک کر رک گیا تھا۔

''مریم.....'' اس کے لب بے آواز ہلے۔

''ہاں منیر کمال کی بیوی مریم۔''

دو ڈھائی گھنٹے کی مختصر سی نیند میں محو ہو جانے والے منظر تازہ ہونا شروع ہو گئے تھے۔

رات اس نے ایک معرکہ سر انجام دیا تھا منیر کمال جیسے شاطر انسان کو بڑی بری چوٹ پہنچائی تھی۔

''زخمی کتے کی طرح تلملا رہا ہوگا بھونک رہا ہوگا۔''

ایک موٹی سی گالی دے کر وہ قدرے اطمینان سے مسکرا دیا۔

''تو اب کبھی چین کی نیند نہیں سوئے گا پتر ے۔'' اس کے چہرے پر چمک سی آ گئی تھی۔

''مجھے مریم کا کچھ کرنا ہوگا منیر کو برباد کرنے کا اس سے اچھا موقع کبھی نہیں ملے گا۔''

وہ جاگنگ شوز کے تسمے باندھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

اپنے کاٹیج سے باہر نکلنے کے بعد اس کی منزل قریبی پارک تھا جو طویل جاگنگ ٹریکس کی وجہ سے بہت سارے لوگوں کی پسندیدہ جگہ تھا اور خصوصاً اس علاقے میں ایشیائی کمیونٹی زیادہ آباد تھی اس لیے پارک میں ہم زبان لوگوں سے ملنے کی خوشی صبح کی سیر کا لطف دوبالا کر دیتی تھی۔

اس نے اپنی پسندیدہ دھن گنگناتے ہوئے ٹریک پر چلنا شروع کیا تھا تب مانوس سی آواز نے اس کا تعاقب کیا وہ مسکراتے ہوئے پلٹ گیا۔

''کیا حال ہے طارق صاحب!''

''میں بالکل ٹھیک..... تم سناؤ کل نہیں آئے تھے۔''

ان کے سرخ چہرے میں صبح کی ساری تازگی سمٹی ہوئی تھی اعجاز الدین نے ہمیشہ کی طرح ستائشی نگاہ ڈالی اور ہاتھ تھام کر ہم قدم ہو گیا۔

''کل یہاں نہیں تھا میں..... آپ کو تو پتا ہے میرا دوسرا ٹھکانہ..... کبھی کبھی وہاں بھی صبح ہو جاتی ہے۔''

وہ اپنا مخصوص قہقہہ لگاتے ہوئے بولا تو راجہ طارق محمود بھی مسکرا دیے۔

انہیں اعجاز الدین کے کاروبار اس کی ذاتی صفات سے کبھی کوئی سروکار نہیں رہا تھا انہیں اس کا ساتھ اچھا لگتا تھا اس کی بے فکری سے بھرپور باتیں مست قہقہے پرسکون سا کر دیتے تھے۔

ان دونوں کی پہلی ملاقات اس بار میں ہوئی تھی جس کا مالک اعجاز الدین تھا۔

اعجاز الدین کے بار میں صبح و شام اور پھر رات گئے تک لوگوں کی آمد جاری رہتی تھی وہاں ہر یر طرح کے لوگوں کے لیے تفریح دستیاب تھی اور وہاں پر ہر طبقے کے لوگ آتے تھے انہی میں راجہ طارق محمود بھی تھے جو اکثر اپنے کاروباری دوستوں کے ساتھ وہاں آتے تھے یہ بزنس میٹنگ کئی گھنٹے تک جاری رہتی تھی یہ لوگ ہمیشہ اپنے لیے مخصوص ٹیبل کا انتخاب کرتے تھے۔ پینے پلانے کا شغل بھی کرتے

لیکن کبھی اپنے جامے سے باہر نہیں آتے جیسا کہ وہاں کے اکثر کلائنٹس کا حال ہوتا تھا۔

اعجاز الدین کو اپنے بار کے ہر کونے گوشے کی خبر رکھنا پڑتی تھی وہ کبھی کسی کو ناخوش نہیں کرتا تھا لیکن اسے حیرت ہوتی تھی سب سے زیادہ خوشحال، باوقار پوری محفل کی نگاہ کا مرکز بننے والے راجہ طارق محمود کی کوئی ڈیمانڈ ہی نہیں ہوتی تھی۔

وہ جب دوستوں کے درمیان ہوتے تب بھی ان کی شرارتوں پر مسکرانے پر اکتفا کرتے اور جب سے وہ اکیلے آنے لگے تھے تب بھی ان کی بے نیازی قائم تھی ان کی ٹیبل پر صرف ایک گلاس پڑا ہوتا جسے وہ دھیرے دھیرے ختم کرتے آنکھوں کی سرخی کو سگریٹ کے دھوئیں سے چھپانے کی کوشش کرتے اور پھر رنگ وخوشبو کی اس دنیا کا ہر جلوہ نظر انداز کرتے ہوئے مضبوط قدموں کے ساتھ باہر چلے جاتے۔

اعجاز الدین کے بار میں اتنا منفرد کردار آئے اور وہ اسے تجسس میں مبتلا نہ کرے یہ کیسے ممکن تھا۔ تجسس کی یہ انتہا ہی دونوں کے درمیان اجنبیت ختم کرنے کا باعث بنی تھی۔

اعجاز الدین نے اپنے بار کی سب سے حسین اور نوخیز تتلی بھی انہیں آفر کی تھی مگر ان کا ضبط نہ ٹوٹا تھا۔

تب بھی انہوں نے اپنی بے پناہ سرخ آنکھیں اٹھا کر اس نوخیز تتلی سے پوچھا تھا۔

آپ کچھ لیں گی۔ جس پر اسے حیرت سی ہوئی تھی۔

اسے دیکھ کر تو لوگ پینا بھول جاتے تھے لیکن ان آنکھوں میں تو کوئی تاثر ہی نہیں ابھرا تھا وہ بھی اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی تھی۔ تب انہوں نے ویٹر کو بلا کر ڈرنک آرڈر کی تھی اور اپنے سامنے رکھے گلاس سے کھیلنا شروع کر دیا تھا۔

وہ کافی دیر وہاں بیٹھی رہی تھی اپنے باس کے حکم کے مطابق کسی نئے حکم کے انتظار میں مگر اس کی وقعت تو اس گلاس سے بھی کم تھی جس کو وہ سامنے رکھے خود میں گم تھے۔

اگلے دن وہ اعجاز الدین کے حکم پر مزید ہتھیاروں سے لیس ہو کر آئی تھی اس کا خوبصورت مگر مہین

لبادہ اس کی دلکشی کے ہر رنگ کو عیاں کر رہا تھا۔

وہ کسی ٹیبل کے پاس نہیں رکی تھی سیدھی راجہ طارق محمود کی ٹیبل پر چلی آئی تھی۔

اسے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں لمحے بھر کو شناسائی کی چمک آئی اور پھر معدوم ہو گئی۔

وہ بھرپور مسکراہٹ اور قاتل ادا کے ساتھ ان کے سامنے بیٹھ گئی تھی آج تو اعجاز الدین نے بھی یقین دلایا تھا کہ تمہیں دیکھ کر وہ برف کا آدمی پگھل جائے گا۔ مگر پگھلنا تو دور کی بات انہوں نے اپنی بے نیازی سے اس کے اندر کا سارا طنطنہ ختم کر دیا تھا۔

وہ اس سبکی کا بدلہ لینا چاہتی تھی آج وہ آرڈر کرنا چاہتی تھی اس نے ویٹر کو اشارہ کر کے ان کو مخاطب کیا تھا۔

''کیا لیں گے آپ؟''

''نہیں میرے لیے یہ کافی ہے۔'' اشارہ گلاس کی طرف تھا وہ تلملائی تو تھی مگر یہ وقت ہتھے سے اکھڑنے کا نہیں تھا۔

''آپ سے ایک بات پوچھوں۔'' جواباً استفہامیہ نگاہیں اٹھی تھیں۔

''اچھا چلیں چھوڑیں پوچھتی نہیں بتاتی ہوں۔ میرا نام سوزانے ہے ابھی کچھ ہی دن ہوئے ہیں مجھے یہاں آئے ہوئے آپ کو پتا ہے یہ جو اتنی ساری ٹیبل سجی ہوئی ہیں یہ لوگ میرے نگاہِ التفات کے لیے قرض دار ہو چکے ہیں اور میں ان سب کو چھوڑ کر صرف آپ کے پاس آ جاتی ہوں۔

پتا ہے کیوں؟''

اس نے توقف کیا شاید وہ تھک گئی تھی اپنا آپ منوانے کی کوشش میں۔

''آپ یہ ساری باتیں مجھے کیوں بتا رہی ہیں۔''

''میں یہ پوچھنے کا حق تو رکھتی ہوں نا۔ آپ مجھے مسلسل نظر انداز کر رہے ہیں کیوں.....؟''

وہ بالآخر اپنے مطلب کی بات پر آ گئی تھی۔

راجہ طارق محمود کے چہرے پر مدہم سی مسکراہٹ آ گئی۔

''کیا واقعی میں آپ کو نظر انداز کر رہا ہوں۔''

پہلی بار انہوں نے اپنی نگاہوں کے حصار میں لے کر سوال کیا تھا جس پر اس کے اندر کی دنیا لمحوں میں اتھل پتھل ہو گئی تھی۔

''صرف نظر انداز نہیں انسلٹ کر رہے ہیں۔'' اس نے بے حد گاڑھی انگریزی میں اپنا موقف بیان کیا تھا۔

''آپ اپنا وقت ضائع کر رہی ہیں مس!''

''ہاں آپ بھی اپنا وقت ضائع کر کے پچھتائیں گے۔''

اب اس کے چہرے پر بہت زیادہ پیشہ ورانہ مسکراہٹ تھی۔ راجہ طارق محمود کا ہاتھ بے اختیار اپنے والٹ کی طرف چلا گیا تھا۔

''دیکھو تم میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔''

راجہ طارق محمود کی اس بات پر وہ بھپرا اٹھی تھی اس نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر کے ٹیبل پر پٹخا تھا اس سے پہلے کہ وہ انہیں کچھ کہتی انہوں نے اس کے وقت کی قیمت ٹیبل پر رکھ دی اور کھڑے ہو گئے تھے۔

''تم میں کوئی نئی بات نہیں ہے تم بھی تو عورت ہو۔''

یہ کہہ کر وہ رکے نہیں تھے اس نوخیز تتلی سمیت وہاں کی ہر چیز دھندلا گئی تھی۔ اعجاز الدین کے لیے بڑا حیرت ناک منظر تھا اب اسے اگلے دن کا انتظار تھا اور پھر اس کا یہ انتظار کئی ہفتوں پر محیط ہو گیا تھا۔

اس کی نگاہیں روزانہ اس ٹیبل تک جاتی تھیں اور مایوس لوٹ آتیں۔

پتا نہیں کیوں اسے اپنے بار کا یہ گوشہ ادھورا سا محسوس ہوتا تھا اسی الجھن کے ساتھ وہ سوزانے پر بھی برس پڑا تھا۔

''تم نے اسے عام سا گاہک سمجھ لیا تھا کیا مجھے تم سے اس حماقت کی توقع نہیں تھی۔''

وہ بھی بھری بیٹھی تھی۔

''مجھے کچھ مت کہو..... بار بار اس کے پاس جانے سے میری جو بے عزتی ہوئی ہے اس کا ہی دکھ کم نہیں ہو رہا تھا۔'' وہ اب بھی راجہ طارق محمود کی آنکھیں یاد کر کے بے چین سی ہو گئی تھی۔

''بائی داوے اس نے تمہیں کہا کیا تھا جو تم نے ساری رات پینے میں گزار دی تھی۔''

اعجاز الدین کا تجسس برقرار تھا۔

''اس نے مجھے میری اوقات یاد دلا دی تھی۔ اس نے مجھے لمحوں میں آسمان سے زمین پر لا پٹخا تھا۔'' اس کے خوبصورت چہرے پر کوفت اور بے زاریت کے رنگ مچل گئے۔

''اب بک بھی چکو۔'' اعجاز الدین نے جھنجھوڑ کر کہا تو وہ تلخی سے مسکرا دی۔

''اس نے کہا تھا..... تم بھی تو عورت ہی ہو۔''

''یہ کیا بات ہوئی..... عورت ہی تو ہو کوئی بکری تو نہیں۔'' وہ اپنا مخصوص قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

''تم نہیں سمجھو گے اعجاز الدین..... طوائف کو عورت ہونے کی گالی دینے کا مطلب.....

طوائف ایک جسم کا نام ہے بے روح جسم کا نام اور عورت تو روح ہوتی ہے پاکیزہ، شفاف، معطر روح۔ جس کا ہر روپ محبت اور معصومیت سے بھرپور ہوتا ہے اور طوائف کا صرف ایک روپ ہوتا ہے۔ بس طوائف.....

مرد طوائف کو عورت سمجھنے لگے تو پھر دکھ کس بات کا پھر جھگڑا کس بات کا اعجاز الدین..... لیکن تم ان باتوں میں مت الجھا کرو۔ کام کی بات کرو میں بہت بور ہو رہی ہوں۔''

وہ راجہ طارق محمود کو اپنی سوچوں سے جھٹک دینا چاہتی تھی اس لیے اعجاز الدین کیطرف متوجہ ہو گئی اور وہ اس کی طرف بالکل بھی متوجہ نہیں تھا بلکہ اس کی نظریں قطار میں چلتے ہوئے ایک شخص کا تعاقب کر رہی تھیں وہی مخصوص مردانہ چال، بے نیازانہ انداز.....

ایک لمحے کو سوزانے کے دل کی دھڑکن بھی منتشر ہوئی تھی۔

وہ آج پھر اس شخص کے ہاتھوں بے عزت ہونے کو تیار تھی جبکہ اعجاز الدین کے چہرے پر مسرت کی چمک آ گئی تھی۔

''ارے یہ تو وہی ہے۔'' اس نے کسی نئی نویلی محبوبہ کی طرح خوشی کا اظہار کیا اور سوزانے کو فاتحانہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

''دیکھا میں نہ کہتا تھا تمہارے سحر سے کوئی نہیں بچ سکتا۔''

''تمہاری بھول ہے۔'' اس کی آنکھوں میں خواب تو اترے تھے مگر یقین نہیں۔

اس کے بار روم کا ادھورا پن مکمل ہو گیا تھا سرخ اور نیلی چیک کی شرٹ میں ملبوس بندے نے جب اپنی مخصوص ٹیبل سنبھالی تو اعجاز الدین کا چہرہ کھل اٹھا۔

یہ ٹیبل اب صرف راجہ طارق محمود کے لیے ریزرو تھی جتنے دن وہ یہاں نہیں آئے تھے تب بھی اعجاز الدین نے اس پر ریزرو کا ٹیگ لگائے رکھا۔

اور آج بار روم کا سجا ہوا یہ گوشہ سوزانے کو سب سے زیادہ جگمگاتا محسوس ہو رہا تھا لیکن اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا اس ٹیبل تک جانے کا جب کہ اعجاز الدین کو خود ہی موقع مل گیا تھا۔

راجہ طارق محمود نے اپنی نشست سنبھالنے کے بعد سافٹ ڈرنک کے ساتھ اپنی مخصوص برانڈ کا آرڈر دیا تھا۔

اتفاق سے آج بار روم میں ان کی پسندیدہ برانڈ دستیاب نہیں تھی جس پر کاؤنٹر مین نے انہیں

دوسری برانڈ آفر کی تھی۔

''نہیں میری ایک ہی برانڈ ہے۔'' اپنی مخصوص دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ کہتے ہوئے سافٹ ڈرنک کا گلاس تھام لیا تھا۔

تب اعجاز الدین بے چین سا ان کی ٹیبل تک پہنچا تھا۔

''میں معذرت چاہتا ہوں مال شارٹ ہے آج۔'' وہ اردو میں مخاطب تھا راجہ طارق محمود نے کوئی بات نہیں کہہ کر اسے بیٹھنے کی آفر کی تھی۔

''آپ کا آنا مجھے اچھا لگتا ہے۔ مجھے عادت سی ہوگئی تھی اس جگہ پر دیکھنے کی آپ کو..... بہت دنوں بعد آئے۔''

''میں شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔'' مختصر سا جواب اعجاز الدین کی پر تجسس فطرت کی تسلی نہیں کر سکا تھا۔

''تنہا آتے ہو تنہا چلے جاتے ہو کیوں؟'' وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔

''آپ سے کس نے کہا میں تنہا آتا ہوں میں تو یہاں اپنے ساتھ آتا ہوں خود سے ملتا ہوں اور چلا جاتا ہوں۔''

وہی مدہم مسکراہٹ۔

ان کا فلسفہ اعجاز الدین کے اندر تک اتر گیا تھا وہ گہری سانس لے کر انہیں دیکھنے لگا۔

''اس ہجوم میں خود سے ملاقات..... مشکل امر ہے۔''

''مجھے بھی تمہاری اس جگہ سے لگاؤ سا ہو گیا ہے۔ پتا نہیں کیوں میں پہلی بار یہاں جب دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا تب بھی خود کو بہت پر سکون محسوس کیا تھا۔'' وہ سچائی سے گویا ہوئے۔

''یہ تو آپ کی کرم نوازی ہے میں نے اپنے بار کی سب سے حسین عورت آپ کی تفریح کے لیے بھیجی وہ بھی آپ نے قابلِ اعتنا نہ جانی۔''

''ستائش اپنی جگہ کاروبار اپنی جگہ۔''

''حسن وہ جو پردے میں ہو مجھے بازار میں سجا حسن مائل نہیں کرتا اور ویسے بھی میری زندگی کی واحد تفریح یہ آدھا گلاس ہے۔ تم آئندہ اور کوئی زحمت نہ کرنا۔''

وہ اپنے مخصوص گہرے لہجے میں بولے تو اعجاز الدین کو یقین ہو گیا کہ یہ شخص اس صدی کا سب سے بڑا روگی ہے اب یہ روگ حالات نے دیا تھا یا کسی عورت کی وجہ سے لگا تھا وہ فیصلہ نہیں کر سکا تھا۔

''آپ کو کسی کی ضرورت نہیں حیرت ہے۔'' اس نے کندھے اچکا کر کہا تو راجہ طارق محمود کے چہرے پر مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

''میں نے کہا نا میں یہاں اپنے آپ سے ملنے آتا ہوں مجھے اپنے وجود کی گہرائی میں اترنے کے لیے اس آدھے گلاس کی ضرورت ہوتی ہے اور بس۔''

نہ اس شخص نے بلاوجہ کی بے رخی برتی تھی نہ بے نیازی کا مظاہرہ کیا تھا شاید جو کچھ بھی دل میں تھا انہیں سادہ سے الفاظ میں اس کے گوش گزار کر دیا تھا اب نہ کوئی سوال باقی بچا اور نہ تجسس برقرار رہا تھا۔

''اگر آپ چاہتے ہیں میں یہاں آتا رہوں تو میرے لیے کسی کو تکلیف مت دینا مجھ سے عورت کی تذلیل برداشت نہیں ہوتی۔''

یہ ایک اور سنجیدہ بات تھی جو اعجاز الدین کے دل پر نقش ہو گئی اور پھر وہ اس ٹیبل سے تو اٹھ آیا تھا مگر اپنا دل وہیں چھوڑ آیا تھا۔

سوزانے نے سنا تو پاگلوں کی طرح ہنسی تھی۔

''تم بھی اعجاز الدین..... تم بھی پاگل ہو گئے۔''

''کچھ ہے ایسا اس میں..... شاید جادوگر ہے وہ شخص۔''

اور پھر بہت دنوں کے بعد جب اعجاز الدین کی ملاقات پارک میں راجہ طارق محمود سے ہوئی تو اسے یقین ہو گیا یہ شخص واقعی جادوگر ہے۔

اسے پہلے کبھی پارک کی فضا اتنی دلفریب اور پُر رونق محسوس نہیں ہوئی تھی۔ رات کو بار اور صبح جاگنگ ٹریک۔ ملاقاتوں کا سلسلہ طویل ہوا تھا لیکن اسرار کے پردے میں بہت سارے سوالوں کے جواب چھپے ہوئے تھے۔

نہ راجہ طارق محمود نے جاننے کی کوشش کی تھی کہ اعجاز الدین کون ہے کیا فیملی اسٹیٹس ہے اور نہ اعجاز الدین کی ہمت ہوئی تھی کہ راجہ طارق محمود کا دکھ ہی پوچھ لے ان کی آنکھوں میں ہر وقت براجمان رہنے والی سرخی کی وجہ ہی جان لے۔ لیکن آج اس نے سلام دعا کے بعد پہلا سوال ہی فیملی کے بارے میں پوچھا تھا۔

''آر یو فیملی مین۔''

''یس آئی ایم..... لیکن میری فیملی پاکستان میں ہوتی ہے یہاں میرے ساتھ کوئی نہیں۔''

انہوں نے تیز قدموں سے چلتے ہوئے جواب دیا تو اعجاز الدین کے پُر سوچ چہرے پر مایوسی سی اتر آئی۔

''کیا بات ہے کچھ پریشان ہو۔ وہ رک کر ایک بینچ پر بیٹھ گئے تھے۔'' اعجاز الدین نے بھی خود کو ان کے برابر میں گراتے ہوئے ایک گہری سانس خارج کی۔

''پریشان تو نہیں ہوں لیکن ایک مسئلے میں الجھ گیا ہوں۔ کسی کی زندگی کا سوال ہے۔''

''کیا میں تمہارا پرابلم شیئر کر سکتا ہوں۔'' انہوں نے پورے خلوص کے ساتھ پوچھا تو وہ مسکرا دیا۔

''میرے خیال میں آپ کے علاوہ اور کوئی ہے بھی نہیں جس سے میں اپنا یہ مسئلہ شیئر کروں۔ آج کا ناشتا میرے گھر پر ہو جائے پھر وہیں پر بات کرتے ہیں۔''

وہ ان کا ہاتھ تھام کر کھڑا ہو گیا تھا راجہ طارق محمود نے بھی قدرے توقف کے بعد اثبات میں سر ہلا کر رضامندی کا اظہار کیا تھا اور دونوں جاگنگ ٹریک پر دوڑنا شروع ہو گئے تھے۔

☆.....☆.....☆

''منیر کمال.....'' وہ دو قدم بدک کر پیچھے ہو گئی تھی اس نے بمشکل اپنے چہرے پر آنے والے زلزلے کے آثار چھپائے تھے یہ یقیناً وہی شخص تھا جو ان دونوں کو دنیا میں لانے کا سبب بنا تھا اور پھر.....

وہ اس سے آگے کچھ نہیں سوچنا چاہتی تھی نہ ہی وہ اس شخص پر دوسری نظر ڈالنا چاہتی اس کی نظر میں اس وقت دنیا کا سب سے اہم کام اپنے روحانی باپ کو ہوش میں لانے کی تگ و دو کرنا تھا جو اس شخص کی گاڑی سے ہونے والے ایکسیڈنٹ کے نتیجے میں کوما کی حالت میں چلا گیا تھا۔

وہ منیر کمال کو قدرے حیران کر کے آئی سی یو کی طرف چلی گئی تھی جہاں راجہ طارق محمود کا بے حس و حرکت وجود مشینوں کے حصار میں تھا اور ان کے وجیہہ چہرے پر گہری نیند والا سکون تھا جیسے انہیں کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ وہ بس اپنے کمرے میں سر تک چادر لپیٹے سو رہے ہیں مگر یہ کشمالہ بخوبی جانتی تھی انہیں کبھی اتنی پرسکون نیند نہیں آئی تھی۔ سوتے ہوئے بھی ان کی آنکھوں کے کنارے اکثر گیلے ہو جاتے تھے اور ان کے چہرے پر کسی اندرونی تکلیف کے آثار ہلکورے لینے لگتے تھے۔ اس وقت تو وہ گویا ہر تکلیف ہر درد سے آزاد ہو چکے تھے۔ سانسوں کا رشتہ باقی تھا باقی ان کی زندگی دعاؤں کی مرہون منت تھی۔

کشمالہ ان کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ کر بے ساختہ روئے جا رہی تھی تب ہی کاشف نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

''ڈاکٹرز بالکل بھی مایوس نہیں ہیں انہیں سو فیصد یقین ہے چھوٹے سے آپریشن کے بعد وہ مکمل اور فوراً ہوش میں آ جائیں گے اس کوما کا دورانیہ لمبا نہیں ہو گا تم بالکل فکر نہ کرو۔''

وہ اس کے آنسو پونچھتے ہوئے رسان سے کہہ رہا تھا۔ آپریشن کے لفظ نے کشمالہ کی رہی سہی ہمت بھی پست کر دی تھی۔

''مگر آپریشن کیوں ہو گا تمہیں پتا ہے نا سر کے آپریشن کا مطلب۔''

''بالکل مائنر سا آپریشن ہو گا تمہیں پتا ہے نا ایکسیڈنٹ میں سب سے زیادہ چوٹ ان کے سر کو

پہنچی ہے۔ سوچو نا شیشے کی کرچیاں اگر سر کی ہڈی توڑ کر اندر پیوست ہو جاتیں تو..... میرے خیال میں ہمیں فوراً ڈی سیشن (فیصلہ) لینا ہوگا دیر کرنا ان کے لیے زیادہ نقصان دہ ہے۔"

کاشف اسے فیصلہ کرنے پر مجبور کر رہا تھا یقیناً اس کی ڈاکٹرز کے ساتھ ملاقات ہو چکی تھی۔

خولہ نانو کے پاس تھی جو دوسرے وارڈ میں تھیں ان کا بی پی کنٹرول میں نہیں آ رہا تھا اور اس ساری صورتحال میں عاشر سرے سے غائب تھا۔

"رات کو وہ نانو کی فکر میں ہاسپٹل سے چلا گیا تھا اور اب نانو ہاسپٹل میں تھیں اور اس کا کہیں اتا پتا نہیں تھا۔"

کشمالہ کا بس نہیں چل رہا تھا وہ اس لمحے سامنے آ جاتا تو شاید شوٹ کر دیتی، اس نے کاشف کی طرف بے بسی سے دیکھا اور پھر سے عاشر کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ جہاں سے ایک ہی جواب آ رہا تھا۔

"پاور ڈ آف۔"

"لیکن ہم اس کا کب تک انتظار کریں گے جلد یا بدیر آپریشن تو لازمی ہے۔"

کاشف قطعیت سے کہہ کر اپنے سیل سے خولہ کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

"تم تھوڑی دیر کے لیے یہاں آ جاؤ اٹس ارجنٹ۔"

"پتا نہیں کاشف مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے پاپا کو کچھ ہو گیا تو میں بھی زندہ نہیں رہ پاؤں گی۔"

آنسو تو اس کی پلکوں پر دھرے تھے وہ پھر سے رونے لگی تھی تب خولہ نے آ کر اسے گلے سے لگا لیا تھا۔

بظاہر کشمالہ بہت مضبوط اور بولڈ نظر آتی تھی لیکن اس حادثے میں اس کا ایک نیا روپ سامنے آیا تھا۔ بات بات پر رونے والی کمزور دل لڑکی جس کی جان راجہ طارق محمود میں اٹکی ہوئی تھی۔ اس کے مقابلے میں خولہ کا حوصلہ زیادہ تھا وہ نانو کے پاس بھی مستعد تھی اور یہاں بھی آ کر اسے سنبھال رہی تھی۔

کاشف کے لیے تو یہ زندگی کا انوکھا ہی امتحان تھا نہ خون کا رشتہ نہ کوئی قرابت داری مگر گزشتہ کئی

مہینوں سے ساتھ رہنے کی وجہ سے یہ لوگ اس کے لیے ہر رشتے سے اہم کو گئے تھے۔

عاشر کے ساتھ جذباتی وابستگی اور بے لوث محبت نے اس سے وابستہ ہر رشتے کو اہم بنا دیا تھا اس کا بس نہیں چل رہا تھا وہ جادو کی چھڑی گھما کر راجہ طارق محمود کو ٹھیک کر دیتا اور کشمالہ کے آنسو سمیٹ لیتا۔

اس نازک اندام حساس لڑکی کے دکھ بھی تو چھوٹے نہیں تھے ہر دکھ کے سرے پر عاشر کھڑا تھا اور یہ پاگل اس کٹھور آدمی سے محبت کر بیٹھی تھی۔

''مالا! ہم میں سے کوئی بھی یہ نہیں چاہتا کہ ہم عاشر کے بغیر کوئی فیصلہ کریں لیکن اس وقت اہم بات یہ ہے کہ پاپا کا پراپر علاج شروع ہو جائے۔ دیکھو عاشر کے انتظار میں وقت ضائع ہوگا۔

اول تو اسے خود احساس ہونا چاہیے میں اس جیسے آدمی کو اتنا غیر ذمہ دار اور بے حس نہیں سمجھتی تھی۔'' خولہ اس سے الجھ پڑی تھی وہ بے بسی سے ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔

غلط تو نہیں کہہ رہی تھی وہ.....

اس امتحان کے وقت میں بھی عاشر نے اپنی انا کا جھنڈا سر بلند رکھا ہوا تھا وہ گئے وقتوں کی بے اعتنائیوں کا بدلہ لے رہا تھا یا کوئی اور بات تھی لیکن کشمالہ دوہری اذیت سے دوچار ہو گئی تھی اس کا دکھ سوا ہو گیا تھا۔

''ہو سکتا ہے وہ خود کسی مشکل میں پھنس گیا ہو۔''

کاشف نے ماحول کا تناؤ اور کشمالہ کی اذیت کم کرنے کی کوشش کی۔

''وہ بھی پتا چل ہی جائے گا فی الحال یہاں سے چلو اور پاپا کے بارے میں سوچو نانو کو دیکھو ان کی حالت کسی طور نہیں سنبھل رہی۔''

خولہ نے قدرے غصے سے اس بحث کو سمیٹنے کی کوشش کی تھی تب ہی ڈاکٹرز کی پوری ٹیم آئی سی یو کے دروازے سے اندر داخل ہوئی تھی۔

خولہ نے کشمالہ کو تھام لیا تھا کاشف کی پوری توجہ ڈاکٹرز کی طرف تھی۔

وہ راجہ طارق محمود کی ایم آر آئی رپورٹ پر ڈسکشن کر رہے تھے۔

"اگر چوٹ صرف سر کی کھوپڑی کو لگتی تو اتنا مسئلہ نہیں تھا لیکن برین سے بیک بون تک جانے والے نروز بھی ڈیمج ہوئے ہیں۔"

ان میں سے ایک دوسرے کو بتا رہا تھا خولہ اور کشمالہ دونوں کے لیے مزید انکشاف نا قابلِ برداشت تھا۔ وہ دونوں روتی ہوئی آئی سی یو کے دروازے سے باہر نکل گئی تھیں۔

کاشف نے اپنی زندگی میں خود کو اتنا بے بس کبھی محسوس نہیں کیا تھا جتنا کہ وہ اس وقت لمحہ بہ لمحہ ایک نئے امتحان سے گزر رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

حُسنی حُسین کا بہت خوبصورت نیا ناول

عُسرِ یُسرا

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

عاطر شاہین کا بہت خوبصورت نیا ناول

رُوسیاہ

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

''آپ کیوں میری برداشت کا امتحان لینے چلی آئیں میرا آپ سے کوئی رشتہ نہیں ہے میں کسی ایسی عورت کو نہیں جانتا جس کا نام شمائلہ کمال ہے۔''

وہ پی سی کی لابی میں شمائلہ کمال کے مقابل بیٹھا اپنے ٹھنڈے ٹھار لہجے میں کہہ رہا تھا اور شمائلہ سپنے جواں سال سجیلے بیٹے کو میز کے دوسرے طرف بیٹھی حسرت سے تک رہی تھی۔

وہ اس سے ملنے تو آ گیا تھا مگر اس کے لہجے اور چہرے پر جو برف کی تہہ جمی تھی وہ مامتا چھلکتے لہجے اور محبت سے لبریز آنکھوں سے بھی نہ پگھلی تھی۔

''میں تمہاری ماما ہوں بیٹا اور تم میرے عاشر ہو جسے میری نادانی نے مجھ سے جدا کر دیا تھا لیکن میرا یقین کرو میں زندگی کا کوئی پل تمہاری یاد کے بغیر نہیں گزار سکی، جہاں رہی کہیں بھی گئی تم میری آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوتے تھے۔''

اب پتا نہیں یہ سچ تھا یا جھوٹ لیکن عاشر کے چہرے پر معصومانہ سی مسکراہٹ بکھر گئی جیسے کوئی چھوٹا بچہ اپنی ماں کھ بہلاوے پر بے ساختہ مسکرا دے۔

''خیر چھوڑیں اس بحث کو میں ان جذباتی باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔ میں جانتا ہوں آپ میری ماں ہیں۔ لیکن یہ ہم دونوں جانتے ہیں میری ماں ہونے کا اصل دکھ تو نانو نے اٹھایا ہے۔

عمر کے اس حصے میں جب انہیں آرام کی ضرورت تھی سکون چاہیے تھا وہ میرے لیے صبح سویرے جاگتیں میرے کپڑوں کی فکر، میرے کھانے کی فکر مجرے صبح و شام کی فکر.....

لیکن آپ نہیں سمجھیں گی آپ تو شاید اس تجربے سے گزری ہی نہیں کہ اولاد کیسے پالی جاتی ہے۔''

وہ تلخی کی حد تک سچ بول گیا تھا شمائلہ کا چہرہ تاریک سا ہو گیا۔

وہ اس لمحے اچھی طرح آگاہ ہو گئی تھی کہ مامتا بھرے تمام تر جذباتی ہتھکنڈے آزمانے کے باوجود عاشر عباس کو اپنی طرف مائل کرنا دنیا کا سب سے مشکل کام ہے کیونکہ وہ صرف اس جیسی جذباتی

اور عاقبت نااندیش کا بیٹا نہیں تھا۔ بلکہ اس کی رگوں میں راجہ طارق محمود جیسے مضبوط اور ضدی مرد کا خون بھی دوڑ رہا تھا جس نے اپنی ضد میں آ کر شمائلہ جیسی حسین اور مضبوط زنجیر لمحوں میں اتار پھینکی تھی اور پھر آج تک پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔

''وہ کیسی ہیں؟'' وہ شاید انہیں اب ماں پکارنے سے بھی خوفزدہ تھی اس لیے نظریں جھکا کر ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''صبح تک تو بالکل ٹھیک نہیں تھیں..... خولہ انہیں ہاسپٹل لے گئی تھی۔'' اس نے مشینی انداز میں جواب دیا تو وہ بے چین سی ہوگئی۔

''کیا ہوا ہے انہیں ہاسپٹل میں کیوں ہیں اور یہ خولہ کون ہے؟''

ان تینوں سوالوں میں سب سے اہم آخری سوال تھا سارا زور خولہ پر تھا (کہیں عاشر نے شادی تو نہیں کر لی) اسے جھٹکا سا لگا تھا۔

''آپ کیوں ان تفصیلات میں جانا چاہتی ہیں دیکھیں میرا بہت سارا وقت آپ کی تلاش اور پھر اس ملاقات میں ضائع ہو چکا ہے مجھے اب نانو کے پاس جانا ہے آپ کچھ لیں گی کیا۔''

وہ انتہائی عجلت میں تھا اس کے چہرے پر اب صرف بیزاری تھی۔ شمائلہ کو حیرت ہوئی تھی وہ تو سوچ کر آئی تھی اس کے سامنے روئے دھوئے گی اپنی تنہائی اور اکیلے پن کا دکھ سنائے گی اسے بھینچ کر گلے سے لگائے گی پیار کرے گی وَر ساتھ لے آئے گی آخر کو وہ اس کی ماں ہے پالا نہیں جنم تو دیا ہے نا..... لیکن عاشر کی عجلت، بے نیازی اور سرسری سے انداز گفتگو نے سارے ارمانوں پر پانی ہی پھیر دیا تھا اس کی تو ہر تمنا دھری کی دھری رہ گئی تھی۔

وہ تو اسے اپنے ساتھ لے جانے آئی تھی مگر یہاں وہ ایک دوسرے سے بات کرنے کا روادار نہیں تھا اتنی مشقتوں کے بعد تو وہ ملنے پر آمادہ ہوا تھا۔

اس نے فون پر اپنے بیمار ہونے کا ڈرامہ کر کے اسے پی سی تک بلایا تھا اور جب اسے سامنے دیکھ کف وہ بے ساختہ کھل اٹھی تھی بیماری کا بہانہ بھی بھول گئی تھی تب عاشر کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات اسے واضح نظر آئے تھے جنہیں ذہن سے جھٹک کر وہ اس سے لپٹنے کے لیے پاس چلی آئی تھی مگر عاشر جینز کی جیبوں میں ہاتھ دبائے اس کے اشتیاق پر سرد مہری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ٹیبل کے دوسری طرف جا کر کھڑا ہو گیا تھا اور یہ دیوار اب تک قائم تھی۔

شمائلہ کا سارا اشتیاق اور محبت اب جھنجھلاہٹ میں بدل گئی تھی.

''عاشر! تم میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہو۔''

''پتا نہیں کون کس کے ساتھ زیادتی کر رہا ہے لیکن میں اس وقت آپ کی وجہ سے نانو کے ساتھ زیادتی نہیں کر سکتا۔''

وہ یکدم کھڑا ہو گیا تھا شمائلہ نے بے ساختہ آگے بڑھ کر اپنے جوان بیٹے کے ہاتھ تھام لیے تھے۔

پی سی کی لابی میں کافی سارے لوگ تھے جنہیں ان دونوں سے زیادہ خود سے سروکار تھا مگر عاشر عباس کے لیے بھرے بازار میں لگاوٹ کا یہ مظاہرہ فطرت کے عین خلاف تھا۔

سلیولیس بلاؤز والی فیروزی رنگ کی سادہ سی ساڑھی میں ہلکا سا زیور پہنے اور چہرے پر معمول کے مطابق میک اپ کے ٹچز کے ساتھ وہ بظاہر عاشر کی ماں بننے کے تمام اوصاف سے مالا مال ہو کر آئی تھی۔

آنکھوں میں تھکن اور ملال کے رنگ چہرے پر افسردہ سی مسکراہٹ اور لہجے میں مامتا سے بھرپور شیرینی وہ ہر طرح سے عاشر کا دل جیتنے اور اس کے دل میں اترنے کی تگ و دو کر رہی تھی کیونکہ اپنے ذرائع استعمال کر کے اس نے یہ تو جان لیا تھا کہ عاشر آج بھی اپنے باپ سے کوسوں فاصلے پر کھڑا ہے دونوں کے درمیان اجنبیت کی دیوار ہنوز قائم ہے۔

اب وہ ان فاصلوں کا فائدہ اٹھا کر اپنے لیے راہ ہموار کرنا چاہتی تھی کیونکہ عمر کے اس موڑ پر اس

کے اندر ماں بننے کی جس طلب نے انگڑائی لی تھی اسے پورا کرنے کے لیے سب سے پہلے تو عاشر کو اپنی بانہوں میں سمیٹنا تھا۔

اس کے سیاہ گھنیرے بالوں کو سہلاتے ہوئے اسے اپنی گود میں سلانا تھا اس کے ماتھے پر پیار کی مہر ثبت کر کے برسوں کی پیاس بجھانی تھی مگر یہ ساری خواہشیں پوری کرنے کے لیے اس کے ذہن نے جو جال بنا تھا اس میں خلوص کے رنگ ڈالنے کے بجائے فطری ریا اور چالاکی سے کام لیا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ عاشر نے اس کی کسی بات کا کوئی سنجیدہ جواب نہیں دیا تھا اور نہ ہی اس کے چہرے پر اپنی ماں سے ملنے کے بعد کسی قسم کے تاثرات نے جنم لیا تھا۔

''تم مجھے بتاتے کیوں نہیں ہو کیوں ہاسپٹلائز ہیں اماں؟'' وہ عاشر کے دو قدم پیچھے چلے جانے پر ذرا سنبھل کر کھڑی ہو گئی تھی اور عاشر مزید سمٹ گیا تھا۔

''اس لیے ہاسپٹلائز ہیں کہ ان کا بھانجا..... ہاں بھانجا ہی کہتے ہیں نا بہن کے بیٹے کو..... وہ آئی سی یو میں ہیں۔ ظاہر ہے اس عمر میں وہ اب کوئی صدمہ نہیں جھیل سکتیں ویسے بھی ایک اٹیک کے بعد انسان کی ول پاور ختم ہونے لگتی ہے۔''

وہ یہ سب کہتے ہوئے بالکل مشینی انسان لگ رہا تھا۔

بے تاثر آنکھیں، سپاٹ چہرہ

''یو مین طارق ہاسپٹلائز ہے.....'' رشتے بے شک وقت کے بھنور میں پھنس چکے تھے مگر ان کی بازگشت تو باقی تھی۔

''جی..... راجہ صاحب کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے..... خاصی چوٹیں آئی ہیں۔'' عاشر کا سابقہ انداز برقرار تھا۔ شمائلہ کو دل ہی دل میں کمینی سی خوشی ہوئی تھی۔

عاشر مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں میرا بیٹا میرا شہزادہ بہت جلد میرے ساتھ ہوگا اس نے دل ہی

دل میں سوچا اور تفکر کا اظہار کرتے ہوئے عاشر کے ساتھ ہاسپٹل چلنے کا ارادہ کرلیا۔

''میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔''

''میں نہیں آپ کو لے جانا چاہتا۔''

''مگر کیوں مجھے اماں سے ملنا ہے۔''

''کیوں کا جواب سمپل سا ہے میں نانو کو تندرست دیکھنا چاہتا ہوں۔''

اس نے صاف گوئی کی انتہا کردی تھی شمائلہ کے چہرے پر تاریک سا سایہ لہرایا تھا جس پر اس نے افسردگی کا پردہ ڈال کر اپنے مضبوط ہونے کا اعلان کیا تھا۔

''نہیں ایسا نہیں ہوسکتا..... آج اتنی مدت بعد اگر اماں نے مجھے دیکھ کر رخ موڑ لیا تو میں مر جاؤں گی۔'' شمائلہ کی آنکھیں نم ہونے لگیں عاشر طنزاً مسکرادیا۔

''آج اتنی مدت بعد آپ کو اماں کی یاد ستائی حیرت ہے..... آپ کیوں اپنا قیمتی وقت ضائع کر رہی ہیں آپ کے کچھ اہم اپائنٹمنٹس ہوں گے جنہیں آپ ہماری وجہ سے نظر انداز کرنا چاہتی ہیں..... نہیں پلیز ایسا نہ کریں۔''

کاشف کے ساتھ رہنے کا فائدہ یہ ہوا تھا کہ وہ اب بلا توقف بولتا تھا۔

تابڑ توڑ حملے کرتا تھا اور دوسرے کو لاجواب کردیتا تھا۔

''ایسا تو نہیں ہے جانو..... میں اپنے سارے کام چھوڑ کر صرف تم لوگوں سے ملنے آئی ہوں..... اماں کو دیکھنے آئی ہوں..... تم آخر اتنے بدگمان کیوں ہو میں تو ہمیشہ تم سے ملنے کی کوشش کرتی رہی تمہارے پاس آنا چاہتی تھی مگر تم نے ہی مجھے ہمیشہ نظر انداز کیا۔

میں نے تو تمہاری وجہ سے اسلام آباد میں اپنا اپارٹمنٹ بھی لیا۔'' وہ اپنے احسان گنوا رہی تھی۔

ایک ماں اپنے بیٹے کو عنایتوں سے زیر بار کرنا چاہتی تھی۔ عاشر کا دل چاہا سامنے رکھے گلاس کو اٹھا

کر دیوار پر مار دے کم از کم اندر کی وحشت کسی طور تو کم ہو مگر وہ پی سی کی لابی میں کھڑے ہو کر اس بد تہذیبی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا تھا۔

نانو کی تربیت نے اسے صبر و ضبط کے ساتھ اعصاب پر مکمل قابو رکھنا بخوبی سکھایا تھا۔

اس نے اب تک کی تمام جنگ بڑے پُرسکون انداز میں لڑی تھی سو اس وقت اس کا چہرہ اندرونی انتشار کو بڑی خوبی کے ساتھ پی گیا اور وہ دھیمے سے مسکرا دیا۔

''آپ دونوں نے میرے لیے مکان تو بنائے کاش گھر بھی بنا لیا ہوتا۔''

شمائلہ بخوبی جانتی تھی وہ کون سے گھر کی بات کر رہا ہے وہ پہلی دفعہ محبت کرنے کے بجائے نظریں چرا کر رہ گئی۔

''اگر تم نہیں لے کر جاؤ گے تو میں خود آ جاؤں گی اور ہاں یہ خولہ کون ہے کیا تم نے شادی کر لی۔''

''میں تو نہیں لے کر جاؤں گا باقی آپ کی مرضی اور ہاں میری ابھی کسی سے شادی نہیں ہوئی ہے۔'' نہ جانے کیوں شادی کے ذکر پر اس کی آنکھوں میں چھم سے ایک چہرہ اترا تھا۔

جادوئی آنکھوں والا خوبصورت چہرہ رات سے ایک نئے روپ میں نظر آ رہا تھا۔

روایتی مشرقی عورت کی طرح روتا دھوتا، کمزور، مضطرب..... بات بات پر آنکھوں میں آنسو بھر لانے والا چہرہ.....اس کی نظریں بے ساختہ رسٹ واچ پر چلی گئیں بہت سارا وقت گزر گیا تھا ان لوگوں سے رابطہ منقطع کیے۔

''پتا نہیں.....وہاں کیا صورتحال ہو گی۔''

دل نے لمحوں میں صلاح دی کہ وہ فون پر ان سے رابطہ کر لے۔ اس نے جیسے ہی موبائل سوئچ آن کیا ایس ایم ایس کی لائن لگ گئی۔

کشمالہ، خولہ، کاشف سب ہی اسے ڈھونڈ رہے تھے بلا رہے تھے اس سے ضروری بات کرنا چاہ

رہے تھے اور وہ بے حس بنا ان کی کسی صدا پر کان نہیں دھر رہا تھا۔

اس نے راجہ طارق محمود کی رگوں میں اپنا خون منتقل ہوتے دیکھ کر ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ یہاں نہیں رکے گا۔ خون اس کا، باپ اس کا اور ان کے لبوں سے بے ہوشی کے عالم میں جو نام نکلا وہ مالا کا تھا۔ وہ خاموش پکار صرف اس نے دیکھی تھی اور سنی تھی اور پھر اس کے بعد وہ مکمل بے ہوش ہو گئے تھے۔

وہ کمسن بچہ تو تھا نہیں اس زیادتی پر اس ناانصافی پر دھاڑیں مار مار کر روتا اور اپنا آپ منوانے کے لیے باپ کی ٹانگوں سے لپٹ جاتا وہ کڑیل جوان تھا اپنے باپ کی طرح مضبوط کسرتی جسم کا مالک.....

خود کو اذیت دینے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا تھا اور شاید اس کے نزدیک خود کو دینے کے لیے اس سے بڑی سزا کوئی نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ باپ کے زخموں سے چور وجود کو نظر انداز کر کے ماں کے زخموں کی داستان سننے چلا آیا تھا۔

عجیب گورکھ دھندا تھی اس کی زندگی بھی..... جب اسے دونوں کی ضرورت تھی ان کے لیے رات کی تنہائی میں تڑپتا تھا وہ دونوں اس کی ضرورتوں سے بے خبر اپنی خواہشوں کو پورا کر رہے تھے۔

آج جب اسے کسی کی ضرورت نہیں تھی تو وہ دونوں اپنی محبتوں کا کاسہ پھیلائے اسے گلے لگانے کو منتظر تھے۔

اس نے باری باری سب کے ایس ایم ایس پڑھے اس دوران شمائلہ کی کھوجتی نگاہیں مسلسل اس کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں تب ہی اس کا موبائل بج اٹھا تھا۔

کسی کا لینڈ لائن نمبر تھا یس کرنے کے بعد موبائل کان سے لگایا ہی تھا کہ غصے سے بھری ہوئی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

"عاشر! مجھے اندازہ نہیں تھا آپ اتنے بے رحم، بے حس اور بزدل بھی ہو سکتے ہیں۔"

بزدلی پر وہ چونکا تھا وہ نان اسٹاپ بول رہی تھی۔

''انسان کی ہمت، طاقت اور ضبط کا امتحان مشکل وقت میں ہوتا ہے۔ یہ جو مشکل وقت پاپا پر آیا ہے۔ یہ صرف ان کے لیے اذیت ناک نہیں بلکہ ہم سب کے لیے امتحان کا وقت ہے اور آپ اتنے کمزور نکلے کے بسترِ مرگ پر پڑے شخص سے بدلہ لینے کی خاطر چھپ کر بیٹھ گئے۔

آپ کے کیموفلاج ہونے سے یہ حقیقت تو نہیں بدل سکتی کہ وہ آپ کے بابا ہیں۔ آپ دونوں کا رشتہ نہیں بدل سکتا۔'' وہ سانس لینے کو رکی تھی شاید تھک گئی تھی۔

''آپ کہہ چکیں..... اب فون بند کر دیں میں اپنی زندگی کے فیصلے خود کرتا ہوں کسی سے ڈکٹیشن نہیں لیتا میری وہاں پر ضرورت تھی نہیں اس لیے چلا آیا۔''

وہ فون بند کرتے کرتے بھی اتنا کچھ بول گیا تھا۔

کشمالہ پہلے سے ہی بھری بیٹھی تھی یہ سب سننے کے بعد تو چھت سے لگنا لازمی تھا۔

''یاد رکھنا عاشر عباس..... ایک دن تمہاری زندگی کے ہر فیصلے میں میرا مشورہ شامل ہوگا..... یاد رکھنا ایسا ضرور ہوگا۔''

وہ بہت سارا کچھ کہنے کے بجائے اس مختصر سے جملے میں اپنی بھڑاس نکال کر خاصی پرسکون ہوگئی تھی اسی لیے فون پٹخ کر کوریڈور کے دوسرے سرے کی طرف مڑ گئی تھی۔

محبت کے لیے اس سے بڑا امتحان اور کیا ہوگا کہ وہ اپنے محبوب کو اس کی ہر خامی کے ساتھ قبول کرنے کی پابند ہوتی ہے۔ اس کے پاس کوئی دوسرا آپشن نہیں ہوتا سوائے اس کوشش کے کہ محبوب اپنی خو چھوڑ دے۔

عاشر کو اس فون پر اور اس لہجے پر کوئی خاص حیرانی نہیں ہوئی تھی پچھلے کئی دنوں سے وہ اس کی براہ راست تکرار سنتا اور اگلے ٹاکرے کا انتظار کرنے لگا تھا۔

''کس کا فون تھا۔''

سیل فون کی آواز اتنی تو تھی کہ شمائلہ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ فون کرنے والی کوئی دبنگ لڑکی ہے جس نے عاشر کی بولتی بند کر دی تھی۔

''یہ تو مجھے بھی نہیں پتا کہ کس کا فون تھا بہر حال میں اب چلتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ اگر آپ مجھے خوش اور مطمئن دیکھنا چاہتی ہیں تو اس طرح کی ملاقاتوں کے لئے اصرار نہیں کریں گی۔''

اس کا انداز قطعیت سے بھرپور تھا اس کے لہجے میں کسی قسم کی لچک نہیں تھی شمائلہ کے بے ساختہ آنسو چھلک پڑے۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں میری زندگی میں آپ دونوں کی کوئی گنجائش نہیں میں اتنا ظالم، بے رحم اور بے حس کیوں ہوں یہ تو میں خود بھی نہیں جانتا۔''

وہ اپنی بات کہہ کر رکا نہیں تھا مغرور سی مردانہ چال کے ساتھ لابی میں بہت ساری آنکھوں کی توجہ کا مرکز بنتے ہوئے شمائلہ کی دسترس سے دور ہوتا چلا گیا تھا۔

یہاں تک کہ وہ نظروں سے اوجھل ہوا تو اس نے پلکیں جھپکیں اور جلتی ہوئی آنکھوں کو رگڑتی ہوئی لابی کے دوسرے سرے کی طرف مڑ گئی۔

☆.....☆.....☆

منیر کمال جب سے ہسپتال کا وزٹ کر کے آیا تھا کچھ بے چین سا تھا یہ نہیں تھا کہ ایکسیڈنٹ کی وجہ سے اس کا ضمیر کچوکے لگا رہا تھا یا پھر اسے راجہ طارق محمود کی دگرگوں حالت پر افسوس ہو رہا تھا۔

اسے تو بار بار کشمالہ کا ستا ہوا چہرہ اور شعلے برساتی نگاہیں یاد آ رہی تھیں جن میں اس کے لیے نفرت ہی نفرت تھی۔ اتنی نفرت سے تو اسے ایک ہی عورت دیکھا کرتی تھی۔

''مریم.....'' پتا نہیں کیوں اس نیلی آنکھوں والی لڑکی کو دیکھ کر اسے مریم کی یاد آ گئی تھی مریم کے زندگی سے چلے جانے کے بعد آج اسے پہلی بار اس کی یاد آئی تھی تو وہ بھی کشمالہ کو دیکھ کر..... وہ ہو بہو

وہی صورت تھی بس انداز اور لباس کا فرق تھا۔

اس کا باپ منیر کمال کی وجہ سے ہاسپٹل بیڈ پر پہنچ گیا تھا وہ اسے نفرت بھری نگاہوں سے نہ دیکھتی تو کیا کرتی مگر نفرت کے اتنے گہرے رنگ چہرے پر بے ساختہ آنے والا اشتعال اتنا بے معنی بھی نہیں تھا کہ اس کا جیسا شاطر اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والا شخص نظر انداز کر دیتا۔

اس نے اپنے لیے پیگ بنا کر ٹی وی آن کیا تھا تب ہی شمائلہ اندر داخل ہوئی تھی۔

''تم کب آئے..... کام ہو گیا۔'' اس کے چہرے پر تھکن کے آثار تھے منیر کمال مسکرا دیا وہ جانتا تھا شمائلہ اپنے بیٹے سے ملنے گئی تھی۔ بیٹے سے ملنے کے بعد اس کا چہرہ حزن و ملال کی تصویر بنا ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا ملاقات لاحاصل رہی تھی۔

وہ کمینی سی دل جلانے والی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھنے لگا۔

''میرا تو کام ہو جائے گا تم بتاؤ صاحبزادے سے مل آئیں۔ اس نے دھتکار دیا یا گلے لگایا۔''

دونوں ایک دوسرے کی خصلت سے بخوبی واقف تھے۔ شمائلہ کو اس کے طعنوں تشنوں سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا تھا۔ اس لیے صوفے کی پشت پر سر رکھ کر کوئی بھی جواب دیے بغیر آنکھیں موند کر پڑ گئی۔

''ارے جان من کچھ تو بولو کیا ہوا تم بہت اجنبی ہوتی جا رہی ہو۔ مجھ سے اپنے دل کی بات کہتی ہی نہیں ہو۔'' وہ اس کے قریب چلا آیا تھا اور ڈیپ گلے سے جھانکتی صراحی دار گردن پر نرمی سے ہاتھ پھیرنے لگا۔

''نہیں کرو منیر مجھے اس وقت تنہا چھوڑ دو۔'' اس نے ہاتھ جھٹک دیا تھا ساڑھی کا پلو نیچے گرا تو منیر کمال کے ہاتھوں میں مزید سرسراہٹ سی ہونے لگی۔

عورت مریم ہو یا شمائلہ یا پھر کوئی اور..... اس کے نشیب و فراز منیر کمال کے خون میں آج بھی گرمی دوڑا دیتے تھے وہ جنونی سا ہو جاتا تھا۔ اس کے اندر کی شیطانی سی بے چینی میں کوئی کمی نہیں آتی تھی۔

مریم اس کے جنون میں محبت ڈھونڈا کرتی تھی وہ اس کے نکاح میں آنے والی پہلی عورت تھی جو روح کا سودا کرنا چاہتی تھی اور جوانی میں زندگی ہار گئی۔

شمائلہ اس کے نکاح میں آنے والی دوسری عورت تھی جو اس کے جنون اور پاگل پن کا جواب بھرپور انداز سے دیتی تھی وہ آج بے روح بے مزا زندگی گزارتے ہوئے اپنی جوانی کو بڑھاپے سے ہم آغوش ہوتے دیکھ کر افسوس اور ملال میں گھر جاتی۔

وقت کی بساط پر ان دو عورتوں نے منیر کمال کو شکست دے دی تھی لیکن وہ جانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا آج بھی عورت کا سودا کرتے ہوئے اپنے مطلب کی چیز سب سے پہلے الگ کرتا تھا۔

''ہوا کیا..... کچھ بتاؤ بھی..... دیکھو اس محاذ میں تنہا لڑنے کا فیصلہ تم نے خود کیا ہے ورنہ میں تو ہمیشہ تمہارا ساتھ دینا چاہتا ہوں مجھے کیوں لگتا ہے میں تمہارے لیے بوجھ بن گیا ہوں تم مجھ سے دور ہوتی جا رہی ہو تمہاری آنکھوں میں اجنبیت اتر آئی ہے۔''

حسب عادت اس کے چہرے گردن سے کھیل رہا تھا اور شمائلہ کو کوفت ہو رہی تھی۔

''حیرت ہے تمہیں اب بھی میری آنکھوں میں دیکھنے کی فرصت ہے بہر حال یہ محاذ میرا اپنا ہے اس کے لیے میں ہر چیز ہارنے کو تیار ہوں۔ تم فکر مت کرو تمہارا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔'' وہ پر سوچ لہجے میں بولی۔

''یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو میں اور تم الگ تو نہیں۔'' وہ تڑپ کر بولا مصنوعی وارفتگی کے ساتھ۔

شمائلہ کے لیے یہ لگاوٹ کے مظاہرے نئے نہیں تھے کوئی اور وقت ہوتا تو وہ بھی اس فریب میں آ کر تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی زندگی کا مزا لے لیتی مگر وہ اس وقت عاشر عباس سے مل کر آئی تھی۔

اس کا دل گئے دنوں کی یاد سے بوجھل ہو رہا تھا وہ آنکھیں بند کرتی تو بے ساختہ اولین محبت کے وہ پل درد میں اضافہ کرنے لگتے جب راجہ طارق محمود کی پُر اسرار سی آنکھوں میں اپنا عکس دیکھ کر وہ ہواؤں میں اڑنے لگتی تھی۔

آج وہ شہرت اور دولت کے اڑن قالین پر سوار تھی مگر وہ اولین لمحوں کا سا لطف اور زندگی جینے کا احساس نہ تھا۔

''دیکھو منیر..... تمہارے اور میرے ساتھ رہنے سے اب کوئی فرق نہیں پڑنے والا، مجھے اب جس رشتے کی آرزو ہے وہ تم نہیں دے سکتے مجھے میرا بیٹا چاہیے اور کچھ نہیں۔''

''عجیب بات ہے شمائلہ جب میں تم سے کہتا تھا اپنے جیسی ایک بیٹی پیدا کر لو تو تم کہتی تھیں۔ نہیں ہمارے درمیان کسی تیسرے کی گنجائش نہیں، تمہاری محبت اپنی اولاد کو بھک رقیب سمجھتی تھی۔''

وہ تلخی سے بولا شمائلہ کو سچ سننے کی عادت تھی۔

''کبھی تم نے سوچا شمائلہ مجھ جیسا شخص اولاد کی خواہش کر سکتا ہے تو تم کیوں اتنی بے حس تھیں۔''

وہ جانے کیا جانا چاہ رہا تھا۔ شمائلہ کی آنکھوں میں اذیت سی اتر آئی۔ وہ سچ ہی تو کہہ رہا تھا شمائلہ نے کئی بار منیر کمال کے اس مطالبے کو رد کیا تھا۔

''منیر کبھی تم نے یہ سوچا کہ تمہاری اور میری اولاد کا مستقبل کیا ہوتا۔'' وہ اچانک ہی اس اذیت سے نکل آئی تھی۔

''کیوں ہماری اولاد کے مستقبل کو کیا ہوتا تم نے سرمد کی بیٹیوں کو دیکھا ہے نا امریکہ میں پڑھتی ہیں شاہانہ زندگی گزار رہی ہیں انہیں اس بات سے کیا غرض کہ باپ کے پاس دولت کہاں سے آ رہی ہے۔'' وہ اسی لے انداز میں بولا تو شمائلہ چڑ سی گئی۔

وہ پہلے ہی پریشان تھی اوپر سے اس کی باتیں۔

''مت کرو ایسی باتیں..... بیٹیاں تو تمہاری بھی تھیں۔ تم کیوں انہیں چھوڑ آئے تھے میں بھی خوفزدہ تھی۔ میرے لیے وہی تجربہ کافی تھا جب تم نے اپنی پہلی اولاد کی فکر نہیں کی..... تو آگے کیا کرتے۔ میں تو تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں منیر سارا الزام مجھے مت دو۔''

شمائلہ نے انجانے میں اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تھا اچانک ہی اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا تھا اور ہاسپٹل کا منظر نگاہوں میں گھوم گیا تھا۔

وہ نیلی آنکھوں والی لڑکی ہو بہو مریم کی تصویر تھی۔ منیر کمال کو اس کے چہرے سے زیادہ اس کا بولنا یاد رہ گیا تھا۔

''وہ ٹھیک نہیں ہیں..... انہیں ابھی تک ہوش نہیں آیا۔ اینی وے آپ کا شکریہ ہمارا جو نقصان ہونا تھا ہو گیا۔ آپ سامنے آ کر تکلیف میں اضافہ نہ کریں۔''

دکھ سے لبریز بلا کا مہذب لہجہ وہ بھول نہیں سکا تھا اسے اچھی طرح یاد تھا اس کے بعد وہ کچھ نہیں بولی تھی۔

بس دیکھا تھا اور پھر پلٹ کر چلی گئی تھی وہ نفرت بھری نگاہ اس کے ذہن میں نقش ہو گئی تھی۔

مریم نے اعجاز الدین کے ساتھ غائب ہو کر جو اسے زندگی کی سب سے بڑی شکست دی تھی اس کی نفرت بھری نگاہ نے ان زخموں کو بھی کریدنا شروع کر دیا تھا۔

''پتا ہے شمائلہ.....'' اس نے ایکسیڈنٹ سے لے کر آج تک کی پوری کہانی شمائلہ کے گوش گزار کر دی اور وہ پوری آنکھیں کھولے ادے سن رہی تھی۔

''تمہیں حیران ہونے کی ضرورت نہیں میں اس کا کارڈ دیکھتے ہی جان گیا تھا یہ کون شخص ہے اور سچ بتاؤں کوئی اور ہوتا تو شاید میں مڑ کر بھی نہ دیکھتا۔ لیکن اس کی فیملی.....''

وہ پھر الجھ گیا پر سوچ نگاہیں شمائلہ پر جمی تھیں وہ بھی سوچ میں پڑ گئی تھی۔

''عاشر نے کسی خولہ کا نام لیا تھا۔'' وہ کڑی سے کڑی ملا رہی تھی اور منیر کمال کی سوچ کے گھوڑے دوسری ہی سمت دوڑنا شروع ہو گئے تھے۔

☆.....☆.....☆

''پتا نہیں پھوپھی جان کو بھی ہنگامی حالت نافذ کر کے نکاح کروانے کی کیا ضرورت پڑ گئی میں کون سا بھاگا جا رہا ہوں۔''

انعم، محسن، عائزہ کسی نے بھی اس کے بخار کی پرواہ نہیں کی تھی اور رات گہری ہونے سے پہلے آؤٹنگ کا پروگرام بنا لیا تھا اس وقت یہ قافلہ ساحل سمندر کی طرف رواں دواں تھا اور صوفیہ کے برابر بیٹھا شجاع معصوم اور مظلوم بننے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔

''کچھ سوچ کر ہی فیصلہ کیا ہوگا آپ کا کیا بھروسہ.....''

وہ بھلا کب باز آنے والی تھی۔ سب نے خوب شور مچا کر داد دی۔

''جیو صوفیہ.....ہم تو سمجھتے تھے وہاں جا کر سب کچھ بھول گئی ہوگی۔'' علی نے دہائی دی تو وہ مسکرا دی بخار، طبیعت کا اضمحلال.....سب کچھ رخصت ہو گیا تھا برابر میں بیٹھے شخص کی محفوظ سی پناہ میں۔

''یہ بھولنے نہیں گئی تھی.....مزید تیز کرنے گئی تھیں اپنے ہتھیاروں کو۔'' شجاع نے پھر مظلومیت کا رونا رویا۔

''تو کون سا شریف ہے تیری زبان تو.....پتا ہے صوفیہ جب تم نہیں تھیں نا تو یہ ہر وقت تمہیں گالیاں دے رہا ہوتا تھا۔

بے حس لڑکی ہے، بے رحم ہے، بہت بری ہے ذرا جو انسانیت ہو محبت کیسے کرے گی۔'' اس سے پہلے کے وہ مزید کچھ کہتا شجاع نے پیچھے سے ہو کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔

''تو کون سے جنم کا بدلہ لے رہا ہے علی۔''

''تو نیچے اتر تجھے تو میں ابھی ٹھیک کرتا ہوں۔'' گاڑی کے اندر دھینگا مشتی شروع ہو گئی تھی اس کوشش میں شجاع پورا صوفیہ پر آ گیا تھا اور وہ چیخنا شروع ہو گئی تھی۔

عائزہ اور صوفیہ نے مل کر پہلے تو علی کو چھڑایا اور پھر صوفیہ پنجے جھاڑ کر شجاع کے پیچھے پڑ گئی تھی۔

''مجھے پتا ہے آپ ایسی ہی باتیں کرتے تھے ہر وقت کا غصہ تو مجھے بھی یاد ہے۔''

''پتا ہے صوفیہ.....!''

فون کی بات پر تو علی کو اور بھی کچھ یاد آ گیا تھا شجاع نے کان بند کر لیے تھے اور صوفیہ سننے کو بے چین ہو گئی تھی۔

''اب بس بھی کرو علی کیوں تم گھر بسانے سے پہلے اجاڑنے کے درپے ہو۔'' شجاع نے التجا کی تھی سب کا چھت پھاڑ قہقہہ گاڑی کے سن روف سے باہر نکل گیا تھا۔

''مجھے پتا ہے ان کے ساتھ زبردستی ہو رہی ہے۔'' صوفیہ کی مدہم سی آواز ابھری۔

''لو..... اب ایک نیا الزام لگ جائے گا۔ علی فساد کی جڑ معاف کر دے۔'' شجاع نے ہاتھ موڑے اور صوفیہ آنکھوں میں آنسو بھر لائی۔

''مادام یہ بندہ..... آج ان سب کے سامنے بہ ہوش و حواس یہ اقرار کرتا ہے کہ آپ کے ساتھ شادی سراسر اس کے دل کا فیصلہ ہے اور اس کی زندگی میں نہ آپ سے پہلے کوئی تھا اور نہ کوئی ہو گا آپ کے بعد۔''

وہ سینے پر ہاتھ رکھے دلکش سی مسکراہٹ کے ساتھ بڑی روانی میں اعتراف کر رہا تھا محسن کے ہاتھ اسٹیرنگ پر جمے تھے ورنہ اس بہادری پر ضرور شانے تھپتھپاتا علی نے فوراً پینترا بدل کر پیچھے مڑ کر سلوٹ پیش کیا۔

انعم اور عائزہ نے اس تاریخی موقع پر ڈھیر ساری تالیاں بجائیں اور صوفیہ نے بلش چہرہ عائزہ کی گود میں چھپا لیا۔

''آپ کی جگہ ادھر ہے۔'' اس کے کانوں میں سرسراہٹ سی ہوئی تھی۔ وہ تینوں لڑکیوں کے ساتھ پیچھے بیٹھا ہی اس لیے تھا کہ ان خوبصورت لمحوں کو پوری شدتوں کے ساتھ محسوس کر سکے اور کروا سکے۔

''یہ تو تقدیر کا فیصلہ تھا جاناں۔'' ایک اور سرگوشی اس بار عائزہ اور انعم احتجاجاً چیخنے لگی تھیں۔

''تم لوگ تو کسی حال میں بندے کو جینے نہیں دیتے ہو پیار کر لے تو مشکل غصہ کر لے تو مشکل کیوں صوفی ہم لوگ شادی کے بعد دبئی چلے جائیں گے ساحل پر گھر بنائیں گے۔''

''اور مچھلیاں بھون بھون کر کھائیں گے۔'' علی نے لقمہ دیا تھا سب کا شور نما قہقہہ پھر بلند ہوا شجاع پھر سے حملہ کرنا چاہتا تھا علی پر لیکن وہ حفاظتی اقدام کے طور پر آگے ہو کر بیٹھ گیا تھا۔

''آپ لوگ کوئی اور بات نہیں کر سکتے پلیز سر میں درد ہو گیا ہے۔''

اس بات صوفیہ نے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

شجاع نے مسکراتی نگاہوں سے طواف کرتے ہوئے فوراً سر تسلیم خم کیا تھا۔

''جو حکم سرکار کا.....'' وہ کسی صورت باز نہیں آ سکتا تھا پھر آج تو موقع بھی تھا اور کچھ ماحول کی سازش بھی اس کی راہ ہموار کر رہی تھی۔

من پسند ساتھی کے شریک حیات بننے کی نوید مل جائے تو موسم کی ہر ادا پر پیار آنے لگتا ہے۔

وہ لوگ موجوں کی طغیانی سے لطف اندوز ہونے کے لیے گاڑی پارک کرنے کے لیے ساحل کے ساتھ دھیرے دھیرے چل رہے تھے تب ہی من چلوں کے ہجوم کی دوسری جانب صوفیہ کی نگاہ ایک جانے پہچانے چہرے پر پڑی تھی۔

''سعدیہ.....'' بے ساختہ اس نے کہا شجاع نے بھی پلٹ کر دیکھا اور اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔

''یہ سو فیصد سعدیہ ہے۔'' وہ جیپ میں بیٹھی کسی لڑکی کو دیکھ کر بے چین ہو گئی تھی اور شجاع کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس گاڑی میں سعدیہ ہو سکتی ہے۔

''محسن گاڑی یوٹرن سے لے لو ہمیں اس گاڑی کے پیچھے جانا ہے۔'' اس نے بے تابی سے کہا تو انعم، عائزہ، علی سب ہی پریشان ہو گئے۔ جب کہ شجاع اس تعاقب کے پس منظر سے واقف تھا۔ اس

لیے خاموش رہا محسن جب تک گاڑی واپس موڑتا اور مطلوبہ سڑک پر آتا وہ جیپ خاصی آگے نکل چکی تھی۔

''محسن پلیز مجھے سعدیہ سے ملنا ہے ہر حال میں۔'' اس کی بے چینی سوا ہو گئی تھی اسٹریٹ لائٹس اور ہیڈ لائٹس کی روشنی میں بھی وہ سعدیہ کو پہچاننے کا دعوا کر کے اس گاڑی کے پیچھے جانا چاہتی تھی یقیناً کوئی نہ کوئی مسئلہ ضرور تھا۔ اس لیے محسن نے مہارت سے اپنی جیپ چھوٹی بڑی گاڑیوں کے درمیان سے نکالنا شروع کر دی تھی۔

☆.....☆.....☆

راجہ طارق محمود کو آپریشن تھیٹر منتقل کیا جا چکا تھا۔ کشمالہ کی بے چین نگاہوں میں اب کوئی سوال نہیں تھا۔ خولہ اور کاشف آپتیشن تھیٹر کے باہر فرش پر بیٹھ گئے تھے اور وہ تھکے تھکے قدموں کے ساتھ نانو کے کمرے کی طرف آ گئی تھی اور ان کے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر اسے حیرت کا جھٹکا سا لگا تھا۔

عاشر ان کے بیڈ کے سامنے بیٹھا تھا وہ جیسے ہی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو اس نے آہٹ پر نگاہ اٹھائی محض سوالیہ نگاہ۔

کشمالہ نے بے رخی سے چہرہ موڑ کر پہلے نانو کو دیکھا۔ پھر ان کی ای سی جی چیک کی..... وہ ہنوز سو رہی تھیں۔

کشمالہ نے عاشر کو مکمل نظر انداز کر کے ان کی چادر ٹھیک کی تکیہ آرام پوزیشن میں رکھا اور فائل لے کر باہر کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

تب ہی عاشر کی بھاری سی آواز اس کے قدموں سے لپٹ گئی۔

''کیسے ہیں وہ؟''

وہ یہ سوال نہ کرتا تب بھی کشمالہ اسے کوئی جواب نہ دیتی اس نے مکمل بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دروازہ کھولا تب ہی وہ پکار اٹھا۔

''مالا.....!'' اس بار وہ واقعی زنجیر ہوگئی تھی سرتاپا وہ رکنا نہیں چاہتی تھی مگر ان عذابِ جاں لمحوں میں یہ پکارا سے مسیحائی کی چاشنی سے آشنا کر گئی تھی۔

''مجھے نہ آپ سے بات کرنی ہے اور نہ آپ کی کوئی بات سننی ہے آپ پلیز جائیں..... واپس وہیں جہاں اب تک تھے۔''

عورت دنیا کے کسی بھی خطے کی ہو کسی بھی معاشرے میں جنم لے وہ اپنے ساتھ ہونے والی بے رخی ور بے اعتنائی کا بدلہ انہی الفاظ میں لیتی ہے عاشر عجیب سے انداز میں اسے دیکھ کر رہ گیا۔

☆.....☆.....☆

''مالا! جب آپ کا دل چاہتا ہے آپ بات کرتی ہیں جب آپ کا دل چاہتا ہے آپ بات سنتی ہیں اور جب آپ کا دل چاہتا ہے آپ سنانے بیٹھ جاتی ہیں۔ آخر آپ خود کو سمجھتی کیا ہیں۔''

کوئی زنجیر سی اس کے قدموں میں لپٹی تھی اور وہ من من بھاری ہو گئے تھے اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی پلٹ کر دیکھا وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا بے حد گہری نظروں سے اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا مگر آنکھیں ہمیشہ کی طرح کشمالہ کے اندر اتر گئی تھیں اس کا دل لمحے بھر میں اپنا اختیار کھو بیٹھا تھا۔

نانو ڈسٹرب ہوں گی باہر آ جائیں کبھی اپنے سوا دوسروں کے لیے بھی سوچ لیتے ہیں۔ وہ برہم سے انداز میں کہہ کر دروازے سے باہر نکل گئی۔

دل کی بے اختیاری اپنی جگہ لیکن وہ اس مشکل گھڑی میں اس کی حد درجہ بڑھی ہوئی بے نیازی اور طویل غیر حاضری کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔

عاشر نے ایک نظر نانو پر ڈالی اور اپنی طبیعت کے برخلاف اس کی بات مانتے ہوئے کوریڈور میں آ گیا وہ ریلنگ سے ٹیک لگائے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

اسکن کلر کی ٹی شرٹ اور ڈارک براؤن پینٹ میں اس کی آنکھوں کا رنگ آج بالکل بدلا ہوا

محسوس ہو رہا تھا۔ پتا نہیں وہ سوتا رہا تھا یا جاگتا رہا تھا اس کی آنکھوں کے سرخ ڈورے کشمالہ کو تشویش میں مبتلا کر گئے تھے لیکن انا اتنی طاقت ور تھی کہ دل میں ابھرنے والا کوئی سوال زبان تک نہ آ سکا تھا۔

''تھینک یو سو مچ..... آپ کی کیئر اور اٹین شین کی وجہ سے نانو بہت بہتر فیل کر رہی ہیں۔''

وہ انگریزی میں گویا ہوا تھا کشمالہ نے حیران نظروں سے اسے دیکھا اور اس کی بے نیازی، ضبط اور مضبوطی پر رشک کرتے ہوئے دل ہی دل میں اس کے سدھرنے کی دعا بھی مانگ ڈالی۔

''آپ کو شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں میں نے جو کیا اپنا فرض سمجھ کر کیا میں آپ کی طرح نہیں ہوں خطا کسی کی، سزا کسی کی۔''

وہ بھری تو بیٹھی تھی پھر اس کا شکریہ اوپر سے تن بدن میں آگ لگا گیا تھا اس وقت وہ اپنے باپ کی خیریت پوچھ رہا تھا۔

کشمالہ کے لیے اس کی بے حسی گہرے صدمے کے ساتھ شدید غصے کا بھی باعث بن رہی تھی۔

''یہ آپ کی رائے ہے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' وہ کندھے اچکا کر پرسکون سے انداز میں گویا ہوا۔

''آپ کو کچھ کہنا بھی نہیں آتا اور نہ ہی میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں آپ سے کچھ پوچھوں آپ اپنی زندگی کے مالک اور مختار ہیں آپ بہتر جانتے ہیں اپنے بارے میں۔''

وہ سلگ تو رہی تھی اب بھڑکنے لگی تھی بدیسی زبان میں غصہ اور ناراضی کا اظہار اس پر خوب جچ رہا تھا راہداری سے گزرنے والے لوگ پلٹ کر دیکھنے پر مجبور ہو رہے تھے۔

عاشر کو یہ جسارت کچھ اچھی نہیں لگی تھی وہ چند قدم آگے چلنے کے بعد پھر پلٹا تھا۔

''یہاں کھڑے ہونا مناسب نہیں چلیں نانو کے پاس بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ مجھے پتا ہے آپ اس وقت اپنے پپا کی وجہ سے بہت پریشان ہیں مجھے اندازہ ہے۔''

''آپ کو کچھ اندازہ نہیں ہے..... بہتر ہے اس موضوع پر مجھ سے اس وقت کوئی بات نہ کریں

میں دنیا کے سب سے اچھے باپ کی بے حس اور بے رحم اولاد سے اب ہمدردی تو کر سکتی ہوں مگر اسے کوئی دوستانہ مشورہ نہیں دینا چاہتی۔"

اس نے ہاتھ اٹھا کر دوٹوک انداز میں کہا اور نانو کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی

عاشر اس کے پیچھے آنا چاہتا تھا مگر اس کا فون بجنا شروع ہو گیا تھا اس نے دروازے کے باہر رک کر اسکرین پر بلنک کرنے والے نمبر کا جائزہ لیا اور پھر غصے کی شدید لہر کو دباتے ہوئے موبائل آف کر کے دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔

کشمالہ نانو سے ذرا فاصلے پر دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر نیچے بیٹھی ہوئی تھی اس کا سر دیوار سے ٹکا ہوا تھا اور بند آنکھیں اندرونی اضطراب کے باعث لرز رہی تھیں۔ تھکن اس کے چہرے سے ہویدا تھی عاشر نا چاہتے ہوئے بھی اسے دیکھ رہا تھا رشک اور حسد بھری نگاہوں سے۔

وہ بلا کی مضبوط اور پر اعتماد لڑکی اس کے باپ کی بے حد لاڈلی تھی اس لڑکی کے چہرے پر ہمہ وقت تمکنت سی جھلکتی تھی جو اب عاشر عباس کی شخصیت پر چھائے جمود سے ٹکرانے لگی تھی۔

اس کی آنکھوں میں عاشر کو ہر وقت اپنا عکس ہلکورے لیتے ہوئے نظر آتا تھا اور یہ وہ پریشان کن بات تھی جو عاشر کو عجیب سی کیفیت میں مبتلا کر رہی تھی۔

احساسات کی دنیا میں ہلچل مچانے والا یہ انوکھا تجربہ عاشر کو زندگی کے ایک نئے موڑ پر لے آیا تھا جہاں وہ اس کی ہر کڑوی کسیلی بڑے ضبط کے ساتھ سن بھی رہا تھا اور اب اس کے برابر میں اس بھرپور ارادے سے بیٹھا تھا کہ جتنی سنی ہیں اس کا حساب دگنا کر کے لوٹائے گا۔

کشمالہ کو اپنے برابر میں آہٹ سی محسوس ہوئی تھی تب بھی اس نے آنکھیں نہیں کھولی تھیں البتہ جب دل و جان کو معطر کرنے والی خوشبو نے اپنا حصار مضبوط کر لیا تو اس نے بے اختیار گھنیری پلکیں اٹھا دیں۔

وہ اس کے برابر میں ذرا فاصلے پر بیٹھا تھا اب اس کا سر دیوار سے ٹکا ہوا تھا اور آنکھیں بند تھیں۔

مگر پلکوں کی جنبش سے اضطراب عیاں تھا۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کے دل نے زمانے بھر کا بیر باندھا ہوا تھا عاشر عباس سے اور اس کا بس نہیں چل رہا تھا وہ اس شخص کو جی بھر کر بے عزت کرے اس کی بے حسی کو لتاڑے اور اس کی شکل نہ دیکھنے کا عزم کر کے اس پر قائم رہنے کا اعلان بھی کر دے مگر اس وقت اس کا مضطرب چہرہ ساری کج ادائیوں کو درگزر کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔

اس کا دل چاہ رہا تھا دونوں ہاتھوں کے کٹورے میں اس دشمن جاں کا چہرہ تھام لے اور اس کی آنکھوں کو جل تھل کرنے والا ہر نمکین قطرہ انگلیوں کی پوروں پر چن لے مگر ایسا کرنے کے لیے شاید ابھی عمروں کی مسافت باقی تھی روحوں کا ملاپ باقی تھا۔

اس کے دل نے تو سارے دروازے کھول رکھے تھے مگر دربارِ عشق میں قبولیت کی سند کا مرحلہ باقی تھا بادشاہ کو دل کی اجازت درکار تھی تب کہیں جا کر وہ اسے چھو کر اس کے قرب کو محسوس کر کے اپنے جیون کو انتظار کی قید سے آزادی دلا سکتی تھی اور پتا نہیں وہ وقت ریت کی طرح پھسلتا جاتا تھا مٹھی میں قید ہی نہیں ہوتا تھا۔

لیکن اسے یقین تھا محبت کی بنیاد پر ایک دن دو دل ضرور گلے ملیں گے دو جسم ایک قالب میں ڈھل کر دکھ درد کو بانٹ لیا کریں گے۔

وہ اس کا سرخ مضطرب چہرہ دیکھتے ہوئے دنیا بھر کی حکایتیں اور روایتیں سوچے جا رہی تھی تب ہی عاشر نے سر سیدھا کیا اور دونوں آنکھیں کھول لیں پہلی نگاہ کشمالہ پر ہی پڑی جو اپنے اندر کی دیوانگی اور جنون کو پہلی بار اس شدت کے ساتھ عیاں کر رہی تھی عاشر جیسے بے حس بے نیاز شخص کے دل کی دنیا زیر و زبر ہو گئی اسے لگا جیسے اس کا وجود گرم صحرا کی تپش کے حصار میں جھلسنے لگا ہو۔

اس نے صنفِ نازک کو کبھی قابلِ اعتنا نہیں گردانا تھا اس لیے نہیں کہ وہ کوئی بڑی تائب قسم کی

ہستی تھی بلکہ اس لیے کہ وہ پہلی بار جس صنفِ نازک کے اوصاف سے آگاہ ہوا تھا وہ اس کی ماں تھی جس نے اسے مایوس ہی نہیں رنجور بھی کیا تھا۔

اسے انسانوں کی زندگی میں صنفِ نازک کا کردار بڑا ہی متنازعہ اور قوی محسوس ہوا تھا اس لیے وہ اپنے اعصاب کو اس حد تک مضبوط کر چکا تھا کہ اس پر نہ تو حسن کے جلوے اثر کرتے تھے اور نہ توجہ کی گرمی کوئی خوشگوار اثر چھوڑتی تھی مگر اس وقت اس کے سارے حفاظتی حصاروں میں دراڑیں پڑنا شروع ہو گئی تھیں۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا اپنی جھنجھلاہٹ مٹانے کے لیے کشمالہ نے ہمیشہ کی طرح کسی مہربان دوست کی طرح پکارا تھا۔

''عاشر! آپ کیوں ڈسٹرب ہیں۔ آپ کہاں چلے گئے تھے آپ کو پتا ہے پاپا کا آپریشن ہو رہا ہے اس ہاسپٹل کی ہسٹری میں سب سے طویل آپریشن..... اور یہ ہی آپریشن ان کی زندگی کی ضمانت بھی ہے آپ کے جانے کے بعد کتنا کچھ ہو گیا اور میں آپ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئی۔''

تھوڑی دیر پہلے آسمانی بجلی کی طرح گرجنے برسنے والی یہ لڑکی اتنی نرم خو اور اس قدر ملائم لہجے میں بھی بات کر سکتی ہے عاشر کو اس بات پر حیرانی نہیں ہوئی تھی بلکہ قدرت کی کاری گری پر رشک آ رہا تھا جو مٹی کے پتلے میں ان گنت رنگ سمو کر کیا شاہکار تخلیق کرتی ہے۔

''آپ مجھے کیوں ڈھونڈ رہی تھیں۔'' وہ اسی کے انداز میں مدہم لہجے میں گویا ہوا۔

''کیا اس وقت آپ کو یہاں نہیں ہونا چاہیے تھا۔'' وہ لاجواب سی ہو کر پھر سوال کر بیٹھی تھی۔

''ڈاکٹرز کیا کہتے ہیں کیا نانو کو پتا ہے کہ ان کا آپریشن ہو رہا ہے۔'' اس بار وہ لاجواب ہو گیا تھا دل کی گہرائیوں میں باپ کے لیے تفکر نے بڑی زور سے انگڑائی لی تھی اور کسی قدر ملال کے رنگ بھی شفاف آنکھوں کی سطح پر ابھرے تھے۔

کشمالہ اسے ہی بغور دیکھ رہی تھی۔ پانی بھی پتھر پر مسلسل پڑتا رہے تو وہاں اپنا اثر چھوڑ دیتا ہے یہ تو باپ بیٹے کے درمیان فاصلے دور کرنے کے لیے کشمالہ کی مخلصانہ کوششیں تھیں بھلا کیوں نہ رنگ لاتیں وہ ایک لمحے کے لیے ہی سہی مگر اپنی پریشانی کشمالہ پر عیاں کر کے شرمندہ بالکل نہیں تھا۔

''ڈاکٹرز تو کبھی کسی کو مایوس نہیں کرتے۔ نانو کو بتانے سے ان کی حالت اور بگڑنے لگتی میں تو دونوں کو اس حالت میں نہیں دیکھ سکتی اللہ تعالیٰ میرے پاپا کو جلدی سے ٹھیک کر دیں۔''

وہ بڑی معصومیت سے کہہ رہی تھی پلکوں پر موتی چمکنے لگے تھے۔ عاشر نے ایک گہری سانس لے کر نانو کے بستر پر نگاہ ڈالی وہ ہنوز غنودگی میں تھیں ان کی وجہ سے یہ دونوں بھی سرگوشی کے انداز میں بات کر رہے تھے۔

''کیا رونے سے مسئلے حل ہوتے ہیں۔'' وہ قدرے الجھ کر بولا پتا نہیں کیوں اسے آنسو کوفت میں مبتلا کر دیتے۔

''رونے سے دل کو تو سکون ملتا ہے نا تھوڑی دیر کے لیے۔'' وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولی تو عاشر اتنے بوجھل ماحول میں بھی مسکرا دیا۔

پھر تو مجھے بھی رونا چاہیے۔

''آپ جیسے لوگ روتے نہیں رلاتے ہیں۔'' بہت وقت کے بعد بڑی واضح چوٹ تھی جو کشمالہ نے جانے کب سے سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔

''آپ نے بھی تو..... خیر چھوڑیں۔'' اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ کر کشمالہ کی الجھن میں اضافہ کر دیا تھا۔

''میں اتنی حوصلہ مند ضرور ہوں کہ اپنے بارے میں سن سکوں۔ آپ میرے گناہ گنوا سکتے ہیں اور میری خامیوں کی نشاندہی بھی کر سکتے ہیں۔''

وہ بے حد سنجیدہ تھی عاشر اپنک ادھوری بات پر پچھتا رہا تھا۔

''آپ اتنی سنجیدہ کیوں ہو گئیں میں نے تو بس یوں ہی کہہ دیا تھا۔''

''یونہی کوئی بات نہیں ہوتی۔'' وہ بدستور مصر تھی تب ہی نانو نے کروٹ لی اور اس کا دھیان بٹ گیا۔

وہ سرعت سے اٹھ کھڑی ہوئی اس جلدی میں اس کا دوپٹہ کندھے سے اتر کر خود اس کے اپنے ہی پاؤں سے الجھ گیا اس سے پہلے کے وہ اپنا دوپٹہ سنبھالتی عاشر نے ساتھ کھڑے ہوتے ہوئے اس کے دوپٹے کا پلو تھام کر بالکل غیر محسوس طریقے سے اس کے کندھے پر ڈال دیا تھا۔ وہ شرمندہ سی عاشر کو تھینکس کہتے ہوئے نانو کے بیڈ کی طرف بڑھ گئی بڑی عجیب بات تھی عاشر نے اب تک جس ذہنی الجھن میں مبتلا کیا ہوا تھا اس کا سبب تو نہیں بتایا تھا لیکن بڑی حد تک ذہن و دل کا بوجھ ہلکا کر دیا تھا۔

نانو نے بے دار ہونے کے بعد سب سے پہلے اسے پکارا تھا اور وہ ان کا ہاتھ تھام کر ان کے بیڈ پر پاس ہی بیٹھ گئی تھی۔

''طارق کیسا ہے مجھے میرے بچے کی شکل تو دکھا دو۔''

ان کی کانپتی ہوئی آواز نے کمرے کا جمود توڑا تو عاشر بے قرار ہو کر ان کے پاس چلا آیا۔

ایک ہاتھ کشمالہ نے تھام رکھا تھا دوسرا عاشر نے تھام کر اپنے چہرے سے لگا لیا۔

''نانو وہ دوسرے روم میں ہیں..... دور ہیں ناں آپ سے..... یہاں نہیں آسکتے آپ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں پھر خود چل کر جانا ان کے پاس۔''

عاشر نے انہیں بچوں کی طرح تسلی دی۔ کشمالہ نے بڑے غیر محسوس انداز میں ان کا دوسرا ہاتھ بھی عاشر کو تھمایا اور اٹھ کھڑی ہوئی وہ ان دونوں کی محبت کے درمیان کسی بھی انداز سے نہیں آنا چاہتی تھی۔

وہ دونوں ماں بیٹا بھی تھے دوست بھی اور سہیلیاں بھی۔ اسے ان دنوں کی کیمسٹری میں ہر رشتہ پورے حق کے ساتھ نظر آتا تھا۔ اور وہ ان دونوں کے کسی بھی رشتے کو اپنے ساتھ نہیں بانٹنا چاہتی تھی اس لیے اٹھ کر باہر آ گئی اب اس کا رخ آپریشن تھیٹر کی طرف تھا۔

☆.....☆.....☆

''ہوسکتا ہے وہ سعدیہ نہ ہو.....تم نے اس کی ہلکی سی جھلک ہی تو دیکھی تھی۔''

شجاع نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی مگر وہ جب سے آئی تھی ایک ہی رٹ لگائے ہوئے تھے۔

سعدیہ کی گاڑی آگے تھی اور محسن باوجود کوشش کے ان تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ بے ترتیب گاڑیوں کی قطار نے سعدیہ کی گاڑی کو جلد ہی آنکھوں سے اوجھل کر دیا تھا تب سے صوفیہ خود بھی پریشان تھی اور اب شجاع کو بھی پریشان کیا ہوا تھا۔

''آپ کچھ کریں.....وہ اسی شہر میں ہے وہ کسی بھی لمحے اپنے گھر والوں کے ہاتھ لگ سکتی ہے اور وہ اسے ماردیں گے۔''

''تم کس طرح کی باتیں کر رہی ہو کس میں اتنی ہمت ہے کہ اسے ماردیں۔ یہ گاؤں دیہات تھوڑی ہے۔''

شجاع کی حیرانی قابلِ دید تھی بعض اوقات صوفیہ بڑی ناقابلِ فہم باتیں کرتی تھی اور کبھی کبھی ایسی ہی ناقابلِ یقین باتیں راحت بیگم کے منہ سے سن کر وہ الجھ جاتا تھا۔

اس نے پسماندہ علاقوں کے ان پڑھ گھرانوں میں اس طرح کی مرنے مارنے اور قتل کر دینے والی باتیں تو سن رکھی تھیں مگر اب صوفیہ کی زبان سے بھی اس خوف کا اظہار اسے حیرت سے زیادہ پریشانی میں مبتلا کر رہا تھا۔

وہ جن حالات میں صوفیہ کو اپنی ذمہ داری کہہ کر اس کی تائی کے طیش میں اضافہ کرنے کا سبب بنا تھا اس کے بعد تو سب سے پہلا حملہ خود اس پر ہونا چاہیے تھا اور پھر صوفیہ کے تایا کا آفس میں آکر راحت بیگم سے جھگڑا کرنا اور اس کا وہاں موجود ہونا بھی جلتی پر تیل کا کام کر گیا تھا۔

وہ سچ مچ اب کسی نئے تماشے کا منتظر تھا جبکہ صوفیہ ایک نئے ہنگامے پر مصر تھی۔

سعدیہ کی تلاش وہ بھی اس بھرے پرے شہر میں اور پھر سعدیہ جس گاڑی میں تھی وہ کدی معمولی

آدمی کی نہیں ہو سکتی لیکن سعدیہ گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر نہیں تھی اس کا مطلب وہ کسی ڈرائیور یا اجنبی کے ساتھ تھی۔

شجاع اپنے نکاح کا جوش وخروش بھول کر کڑی سے کڑی ملانے کی کوشش کر رہا تھا۔

پتا ہے وہ لوگ اسے مار دیں گے۔ صوفیہ نے یہ جملہ تیسری بار دہرایا تھا وہ دوپٹہ نماز پڑھنے کے انداز میں سر پہ لپیٹے ادھر سے ادھر ٹہلتے ہوئے حد درجہ پریشان نظر آ رہی تھی۔

اور ان لمحوں میں شجاع کو اس پر صرف پیار آ رہا تھا۔

''میری باربی ڈول خود بھی پریشان رہتی ہو اور مجھے بھی بے سکون کیے رکھتی ہو۔ نکاح ہو جاتا تو میں تمہارا سر اپنی گود میں رکھ کر سہلاتا اور تمہاری پریشانی ختم کرنے کی کوشش کرتا مگر اس وقت جاسوس پارٹی کا کوئی بھروسہ نہیں کب حملہ کر دے اس لیے پلیز مجھ پر مزید ستم نہ کرو مجھے کچھ سوچنے دو۔''

وہ اسے کندھے سے تھام کر اتنے سنجیدہ لہجے میں اپنی نالائقی کا اعتراف کر رہا تھا کہ صوفیہ نا چاہتے ہوئے بھی مسکرا دی۔

''شجاع آپ کو مذاق سوجھ رہا ہے اور مجھے سعدیہ کی فکر لگی ہوئی ہے آخر وہ کس کے پاس ہو گی مجھے تو نہیں لگتا وہ لڑکا اتنا ویل آف ہو سکتا ہے اگر ایسا ہوتا تو چاچا چاچی کو کیا اعتراض ہوتا۔''

''تم اس لڑکے کی بات کر رہی ہو جس کا رشتہ آیا تھا سعدیہ کے لیے اور سعدیہ اسے پسند کرتی تھی۔'' شجاع نے ذہن پر زور دیا۔

''جی بالکل..... میں نے آپ کو بتایا تھا نا وہ کسی کلب میں شو وغیرہ کرتا ہے اس کا ڈانس گروپ ہے یا پھر سنگنگ کرتا ہے مجھے صحیح سے یاد نہیں۔''

''تمہیں کلب کا نام یاد ہے۔''

''مجھے سعدیہ نے اتنی لمبی کہانی کبھی نہیں سنائی کلب کا تو میں نے تائی کے منہ سے سنا تھا اس لیے

یاد رہ گیا۔" اس لڑکے کی اس بنا پر خوب بے عزتی کی تھی تایا تائی نے چچی بیچارہ چپ رہ گئی تھیں۔

جو لوگ تکبر کی زبان بولتے ہوئے اپنی اوقات بھول جاتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں چھوٹی چھوٹی آزمائشوں کے کے ذریعے سنبھلنے کا موقع بھی دیتا ہے مگر افسوس کے غفلت کی پٹی گہری ہوتی جاتی ہے۔

شجاع کو سعدیہ کے ساتھ دلی ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔

مگر سعدیہ کا اس گھر سے چلے جانا چھوٹی آزمائش تو نہیں آپ کو پتا ہے ناں لڑکی کا ایک رات گھر سے باہر رہنا اس کی پوری زندگی کو شک کے اندھیروں میں غائب کر دیتا ہے اسے نہ زندگی میں عزت ملتی ہے نہ مرنے کے بعد کوئی اچھے لفظوں میں یاد کرتا ہے۔

وہ روہانسی ہو رہی تھی شجاع اب اس کا مزاج آشنا ہو چکا تھا جانتا تھا وہ اتنی آسانی سے بہلنے والی نہیں اسے کچھ نا کچھ تو کرنا پڑے گا سعدیہ کا سراغ لگانے کے لیے۔

"پتا ہے صوفی! سعدیہ کا اس گھر میں رہنا بھی بڑی آزمائش تھا تمہاری باتوں سے اندازہ ہوتا ہے وہ باغیانہ مزاج کی لڑکی تھی پتا نہیں کس کے پلے باندھ دی جاتی ایسے گھروں میں جہاں تعلیم کے ساتھ احساس کی بھی کمی ہو لڑکے لڑکیوں میں فرق کیا جاتا ہو۔ وہاں کوئی بھی فیصلہ متوقع ہو سکتا ہے تم دعا کرو وہ جہاں کہیں بھی ہو۔"

شجاع نے اس کے دونوں ہاتھ تھام کر اپنے سامنے بٹھاتے ہوئے تسلی آمیز انداز اختیار کیا ورنہ اتنی قربت پر اگر وہ ذرا سا بھی کسی شرارت کو دعوت دے دیتا تو وہ بدک کر دور جا کھڑی ہوتی۔

"اللہ کرے وہ محفوظ ہاتھوں میں ہو اور خوش بھی ہو، مجھے پتا ہے اس کی واپسی کا اب کوئی فائدہ نہیں وہ بے حس لوگ اس کے مرنے کا اعلان کر چکے ہیں۔"

"کیا بکواس ہے یہ..... زندہ انسانوں کو مارنے کا حق انہیں کس نے دیا۔" شجاع ایک اور ناقابلِ فہم بات پر بھپر سا گیا تھا۔

''پتا نہیں..... مگر وہ لوگ کسی دوسرے ہی سیارے کی مخلوق لگتے ہیں مجھے۔''

صوفیہ نے جھرجھری لے کر کسی تلخ یاد سے پیچھا چھڑایا تو شجاع اس کی منطق پر مسکرا دیا۔

''بڑا شوق تھا تمہیں سیارے کی دریافت کا شکر کرو بچت ہوگئی ورنہ.....'' وہ دانستہ چپ ہوگیا۔

باقی کی ساری کہانی آنکھوں میں سمٹ آئی تھی اس بات کا اعلان کرتے ہوئے کہ اگر شجاع نہ ہوتا تو تم بھی اس سیارے کی مکین ہوتیں۔

''کیا کہنا چاہتے ہیں کسی خوش فہمی میں مت رہیے گا۔ میرا احسان مانیں جو میں.....''

شجاع کی نگاہوں میں چھپے شریر احساسات کی تاب کانا آسان نہیں تھا اس کی زبان کو بھی بریک لگ گئے اور سر بھی خود بخود جھک گیا۔

''ہاں بالکل ایسے ہی رہنا پڑے گا مجھے تابعدار، فرمانبردار، ذمہ دار قسم کی بیوی چاہیے۔'' وہ اس کی چھوٹی سی ناک کو چھوتے ہوئے شرارت سے بولا تو اس کا ضبط جواب دے گیا حیا کی لالی کے بجائے چہرے پر غصے کی سرخی چھا گئی۔

''آپ کو بیوی چاہیے یا سیکریٹری..... میں ان میں سے کچھ بھی نہیں ہوں یاد رکھیے گا۔ ایسا نہ ہو بعد میں پچھتائیں اور مجھ سے شکوہ کریں۔''

''تم ایک بار میری تو بن جاؤ..... پھر اس کے بعد یہ سب کچھ میں خود بخود بنا دوں گا۔ تھوڑی سی محبت ہی تو کرنا پڑے گی..... کرلوں گا۔

جانتی ہو مرد اگر اپنی عورت سے وفادار ہو، اس کی نسوانیت سے پیار کرتا ہو اس کے دلکش سراپے پر دل و جان سے نثار ہوتا ہو اس کے گرد اپنی توجہ کا دائرہ تنگ کرتا رہے تو پھر اس کی عورت اپنے اندر کی ہر فطری سرکشی سے تائب ہو جاتی ہے۔ اور اسے اپنی زندگی میں سب سے اچھا جو کام لگتا ہے وہ اپنے شریک حیات کی دلداری اس کی فرمانبرداری..... اور، اور.....'' اس سے پہلے کے وہ سنبھلتی حملہ ہو چکا تھا۔

شجاع کی گرم سانسیں صوفیہ کے چہرے کو چھو گئی تھیں۔

وہ ایک جھٹکا کھا کر پیچھے ہٹی۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے۔'' اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا شجاع کا بلند قہقہہ اس کے احتجاج پر بھی حاوی آ گیا تھا۔

''میں نے کوئی بدتمیزی تو نہیں کی..... میری باربی ڈول۔'' وہ مسرور لہجے میں گنگنایا۔

''آپ بہت بے ہودہ ہیں۔ ابھی آپ کی شکایت کرتی ہوں۔''

اب یہ معصومیت کی انتہا تھی یا پاگل پن..... شجاع کی شکایت کرنے چلی تھی وہ..... شجاع ایکدم کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

''کیا بتاؤ گی سب کو۔'' وہ پھر بدتمیزی پر آمادہ تھا۔ اس کی قربت حواس مختل کیے دے رہی تھی وہ بے باک تو ہمیشہ سے تھا لفظوں کے چناؤ میں مہارت بھی تھی لیکن نکاح کے اعلان کے بعد اس کا ہر جوہر کھل کر سامنے آ رہا تھا۔ صوفیہ صدائے احتجاج بلند کرتی بھی تو کیا..... وہ بھلا اس کی کیا شکایت کرتی..... بس دھمکی دے سکتی تھک جانتی تھی وہ بھی شجاع خاطر میں نہیں لائے گا۔

وہ تو دل ہی دل میں اپنی خوش بختی پر نازاں تھی کسی کسی لمحے اسے یقین نہیں آتا تھا کہ شجاع جیسا پر جوش اور وارفتگی لٹانے والا شخص اس کی زندگی میں ہمیشہ کے لیے شامل ہونے جا رہا ہے۔

اس کی نوخیز عمر کا پہلا خواب تھا شجاع۔

اس کی زندگی میں محبت کی سرشاری کو دریافت کرنے والا۔

وہ اسے دھمکیاں تو دیتی تھی مگر آنکھوں سے ذرا سا اوجھل ہو جاتا تو بے قراری تن من کو گھیر لیتی۔

اسے تو وہ ہوائیں بھی معطر کر دیتی تھیں جو شجاع کو چھو کر آتی تھیں یہ مصنوعی رعب اور ناز نخرے تو اس رشتے کا تقاضا تھے جس کا وہ بھرپور فائدہ اٹھاتی تھی۔

''آپ چلے جائیں.....ورنہ ابھی سب کو بلالوں گی۔''اس بار اس نے کھڑکی کے پردے ہٹا کر سلائیڈنگ ڈور کو کھسکایا تھا۔

''سعدیہ کا پتا نہیں معلوم کرنا۔''

وہ پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ پھر وہی جان لیوا سرگوشی۔

''مجھے پتا ہے آپ کچھ نہیں کر سکتے.....آپ سے بس فالتو کے کام کروالو۔''وہ الجھی۔

''مثلاً کون کون سے فالتو کام۔''اس نے دوپٹہ چہرے سے پیچھے کیا۔

''شجاع پلیز مجھے ابھی نماز بھی پڑھنی ہے۔''التجا کی۔

''اوہ ضرور.....ہمیشہ دعا مانگنا اللہ ہمارے رشتے کی شدتوں کو برقرار رکھے۔''

''اللہ آپ کا سایہ میرے سر پر ہمیشہ سلامت رکھے۔''اس نے شجاع کا جملہ مکمل کر کے اپنا سر اس کے آگے تابعداری سے جھکا دیا تھا وہ اس بے اختیاری پر مغرور سا ہو گیا تھا۔

''تم اللہ کے دربار میں حاضر ہو.....میں ابھی طاہر کو فون کرتا ہوں کلفٹن ٹاؤن آج کل اس کے انڈر میں ہے شاید وہ ہماری کوئی ہیلپ کر سکے ایٹلیسٹ کوئی مشورہ تو دے سکتا ہے اس سلسلے میں۔''

شجاع کے کہنے پر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا مگر گھورنا بھی لازمی سمجھا شجاع جانتا تھا یہ خفگی کس لیے تھی تب ہی صوفیہ کا موبائل مدھر دی دھن بجانے لگا۔

وہ شجاع کو باہر کا راستہ دکھاتے ہوئے سائیڈ ٹیبل کی طرف آ گئی موبائل کی اسکرین پر کوئی نامعلوم نمبر چمک رہا تھا اس نے تیسری بیل پر یس کا بٹن دبایا اور ہیلو کہا جواباً خاموشی تھی

کوئی دوسری طرف موجود تھا مگر چپ اس نے قدرے حیرت سے دوبارہ سلام کیا۔

تب دوسری طرف سے مانوس سی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

وہ سو فیصد سعدیہ تھی اس نے بڑے مدھم لہجے اور آواز میں اس کے سلام کا جواب دے کر سب سے پہلے صوفیہ کی موجودگی کو کنفرم کیا تھا۔

''سعدیہ تم کہاں ہو ہاں میں صوفیہ ہی ہوں میں آج تمہیں بہت یاد کر رہی تھی۔'' شجاع اس کی آواز سن کر دروازے سے پلٹ آیا۔

''میں نے تمہیں گاڑی میں دیکھا پیچھا بھی کیا مگر.....''

''میں بھی تمہیں بہت یاد کرتی ہوں تم نے آج مجھے کہاں دیکھ لیا میں تو اس شہر میں نہیں۔''

.....صوفیہ نے موبائل کا اسپیکر آن کر لیا تھا۔

''نہیں تم اسی شہر میں ہو میں تمہیں پہچاننے میں غلطی نہیں کر سکتی میں تمہاری آنکھیں اور ان کا کاجل نہیں بھول سکتی پاگل لڑکی کس حال میں ہو جلدی سے بتاؤ۔''

''حیرت ہے تم مجھے اتنا غور سے دیکھتی رہی ہو، مجھے پتا ہوتا تو کبھی خود کو اکیلا نہ سمجھتی۔'' وہ افسردہ اور مضمحل لہجے میں کہہ رہی تھی۔ صوفیہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''سعدیہ تم کہاں چلی گئی ہو.....تم نے اپنے ساتھ یہ ظلم کیوں کیا میری جان۔''

''میں نے اپنے ساتھ کوئی ظلم نہیں کیا صوفی میں جہاں ہوں بہت خوش ہوں تم تو جانتی ہو میری خوشیوں سے کسی کو کوئی مطلب نہیں تھا سب کے اپنے مسائل تھے۔''

وہ شاید رو رہی تھی یا رونا ضبط کر رہی تھی شجاع کو اس لمحے وہ بہت پُر اسرار سی محسوس ہوئی۔ اس کا لہجہ اس کے لفظوں کا ساتھ نہیں دے رہا تھا وہ جیسے کسی خالی کمرے سے بات کر رہی ہو۔

''نہیں سعدیہ ایسا کچھ نہیں تھا تم نے بہت جلد بازی میں فیصلہ کیا، تم نہیں جانتیں اس فیصلے کا خمیازہ سب کو بھگتنا پڑے گا۔''

''جس نے جو کیا ہے وہ اس کا خمیازہ تو بھگتے گا نا کسی کو نا کردہ جرم کی سزا ملنی تھی، میں ہی سہی۔''

''سعدیہ! میرے ساتھ تم فلسفہ مت بولو مجھے جلدی سے بتاؤ تم کہاں ہو میں تم سے ملنے آ رہی ہوں ابھی۔''

''تم مجھ سے ملنے نہیں آسکتیں میں تم سے بہت دور ہوں اور یہ بتاؤ تم اتنے مزے سے مجھ سے باتیں کیے جارہی ہو کیا تم اپنے گھر میں ہو۔''

''ہاں میں مسکن آ گئی تھی تمہارے جانے کے بعد ہر چیز کی ذمہ دار میں ہی نظر آ رہی تھی تائی کو۔ میں بہت ان سیکیور فیل کر رہی تھی تب میں نے سوچا واپس آنا ہی بہتر ہے۔''

وہ دونوں بچھڑی ہوئی سہیلیوں کی طرح بات کر رہی تھیں شجاع کے ہاتھ ابھی تک کوئی سرا نہیں آیا تھا۔ جس کو پکڑ کر اس کا سراغ لگانے کی کوشش کی جاتی۔

''تم نے اچھا کیا آ گئیں ورنہ تمہارے ساتھ بہت برا ہو جاتا۔ ہماری تائی جو جادو ٹونے کروانے کا شوق بھی ہے اور ایسے لوگوں سے ان کے تعلقات بھی گہرے ہیں۔'' سعدیہ نے جلے کٹے انداز میں ایک نیا انکشاف کیا تھا۔

''کیا مطلب۔''

''میری بات کا مطلب وقت سمجھائے گا مجھے یہ بتاؤ امی ابا سب ٹھیک تو ہیں نا، امی کو سب نے بہت سنائی ہوں گی ابا نے تو مارا بھی ہوگا۔'' سعدیہ کے سارے اندازے صحیح تھے۔

اب صوفیہ کیا اسے بتاتی کہ اس کی ماں کو ایک دن کچن میں تایا نے کھڑے کھڑے دو تھپڑ رسید کر دیے تھے اس اعزاز کے ساتھ کہ ایسی حرام کی اولاد پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی اور صوفیہ سکتے کے عالم میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔

''تو کیا ایسا وقت امی پر بھی آیا ہوگا۔'' اس نے سوچا تو کانپ کر رہ گئی۔ کیا انہیں بھی اسی طرح بابا کی موت کے بعد تایا نے.....

اس نے اس وقت تو کچھ نہیں سوچا تھا مگر دن گزرنے کے ساتھ بہت ساری تلخ حقیقتوں اور اپنی ماں کے گھر چھوڑ دینے کے فیصلے کا ادراک ضرور ہو گیا تھا۔

اس کی نازک مزاج نفیس طبع ماں اس گھر میں کبھی نہیں رہ سکتی جہاں عورت کی عزت نفس کو کچلنے کے لیے مرد ہر لمحے تیار ہو۔

وہ اس وقت سعدیہ کی بات پر عجیب سے احساسات سے دوچار ہوگئی تھی وہ اسے کوئی بھی مشورہ دینے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔

وہ اسے اپنے گھر آنے کے لیے بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔

''تم چپ کیوں ہوگئیں مجھے پتا ہے کس کس نے کیا کچھ کہا ہوگا۔لیکن مجھے ایک بات کا پورا یقین تھا کہ تم مجھے یاد کرتی ہوگی اس لیے میں نے بہت ہمت کر کے آج تمہیں کال کر لی۔''

اس کی آواز بھاری ہو رہی تھی جیسے اس نے ڈھیر سارے آنسو اپنے اندر اتارے ہوں۔

''سعدیہ تم کسی کی قید میں ہو میں تم سے کیوں نہیں مل سکتی میں اور شجاع آئیں گے تمہارے پاس۔''

''شجاع وہی تمہارا کزن نا..... جو تمہیں پزا بھیجتا تھا۔میری دعا ہے اللہ تم دونوں کی جوڑی قائم رکھے تمہیں بہت ساری خوشیاں دے۔''

وہ اب باقاعدہ رو رہی تھی صوفیہ کی آواز بھی گلے میں رندھ گئی۔

''سعدیہ تم کہاں ہو مجھے تم سے ملنا ہے بہت ساری باتیں بتانی ہیں پلیز بتاؤ نا.....''

صوفیہ نے پھر اصرار کیا تھا اور دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہوگیا۔صوفیہ کو محسوس ہوا تھا جیسے کسی نے اس سے موبائل لے کر لائن ڈس کنیکٹ کی ہو اور کوئی اس کے پاس بیٹھا انسٹرکشن دے رہا ہو۔

صوفیہ فون شجاع کے ہاتھ میں تھما کر رونے بیٹھ گئی تھی اور شجاع موبائل کی اسکرین پر محفوظ رہ جانے والے نمبر کو اپنے موبائل پر منتقل کر رہا تھا۔

سعدیہ نے موبائل کے ذریعے ہی رابطہ کیا تھا شجاع اب فوراً اپنے دوست طاہر سے ملنا چاہتا تھا۔

''صوفی بی ریلیکس میں کوشش کرتا ہوں طاہر سے ہیلپ لینے کی تم اس سے ملنا چاہتی ہو نا ایسا

ضرور ہوگا..... چلو اب چیئر اپ ہو جاؤ۔"

وہ اس کے بال سہلاتے ہوئے بولا تو صوفیہ نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

"نہیں شجاع آپ طاہر سے کوئی بات مت کریں مجھے یقین ہے وہ پھر مجھ سے رابطہ کرے گی اور ملنے آئے گی وہ یہیں اسی شہر میں ہے آج یقیناً اس نے مجھے بھی دیکھا ہوگا آپ سب لوگ بھی ساتھ تھے اس کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ میں مسکن واپس آ گئی ہوں اس لیے وہ بے فکری سے فون کر بیٹھی میں نہیں چاہتی ہماری وجہ سے اسے کوئی پرابلم ہو وہ اگر اظہر یا کسی اور کے ساتھ ہے تب بھی مجھے لگتا ہے اس پر کوئی پریشر ہے میں اس کی نیکسٹ کال کا انتظار کروں گی۔"

صوفیہ نے اسی دوران اس کا نمبر ڈائل بھی کیا مگر وہاں سے نمبر بند ہونے کی صدا آ رہی تھی۔

سعدیہ نے یقیناً بات ختم کر کے فون بند کر دیا تھا۔ شجاع کو بھی صوفیہ کی بات سے اتفاق کرنا پڑا۔ ویسے بھی یہ اتنا گھمبیر معاملہ تھا کہان کے گھرانے کو مشکلات میں گھیر سکتا تھا۔

"چلو یہ بھی ٹھیک ہے کم از کم تمہیں یہ تو اطمینان ہو گیا نا کہ وہ جہاں کہیں بھی ہے اپنی مرضی سے رہ رہی ہے۔ اللہ اس کے حق میں بہتر کرے چلو اب فریش ہو جاؤ ورنہ پھوپھی جان کہیں گی میں نے ابھی سے ان کی لاڈلی پر ظلم شروع کر دیا اور ہاں یہ ابھی تک آئیں کیوں نہیں وہ تو آج مجھ سے پہلے آفس سے نکل گئی تھیں۔" شجاع نے رسٹ واچ پر نظر ڈالتے ہوئے قدرے تشویش سے کہا تو صوفیہ بھی کھڑی ہو گئی۔

باہر رات گہری کو رہی تھی اور راحت بیگم عموماً مغرب کی نماز گھر آ کر پڑھتی تھیں اور اب تو عشاء کا وقت ہو چلا تھا انہوں نے کوئی فون بھی نہیں کیا تھا۔

"امی آپ کے ساتھ کیوں نہیں آئیں۔"

وہ شاید جیولر کے پاس جانا چاہ رہی تھیں میں نے تو آفر کی تھی مگر کہنے لگیں آج وہ مجھے اور تمہیں سرپرائز دینا چاہتی ہیں۔ شجاع نے ان کا نمبر ڈائل کرتے ہوئے بتایا تو صوفیہ بھی پریشان ہو گئی۔

ان کا موبائل رسپانس نہیں کر رہا تھا۔

''امی کے دونوں نمبر ٹرائی کریں میں انعم سے پتا کرتی ہوں ہوسکتا ہے ماموں کے پاس ہوں۔''

صوفیہ انٹرکام کی طرف آ گئی اور شجاع کی تشویش دونوں نمبروں سے رسپانس نہ آنے کی وجہ سے گہری ہوتی جا رہی تھی۔ عموماً وہ شجاع یا ڈرائیور کے ساتھ سفر کرتی تھیں آج گاڑی وہ خود ڈرائیو کر رہی تھیں۔

''ہوسکتا ہے وہ جس شاپ میں ہوں وہاں سگنل ویک ہوں۔'' اس نے سوچا مگر یہ تسلی ناکافی تھی وہ صوفیہ کو انٹرکام پر مصروف دیکھ کر کمرے سے باہر آ گیا۔

☆.....☆.....☆

''نظامی نے انوائٹ کیا ہے آج رات کی پارٹی تمہارے نام کی ہے اس نے، اب فریش ہو جاؤ یوں ہلکان ہونے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ ویسے بھی مجھے لگتا ہے طارق محمود کو ہوش نہیں آئے گا۔''

منیر کمال کے چہرے پر ندامت نہیں مسکراہٹ تھی شمائلہ کو اس سے نفرت سی محسوس ہوئی۔

جب سے اس نے راجہ طارق محمود کے ایکسیڈنٹ اور ماں کی بیماری کا سنا تھا کسی پل چین نہیں آ رہا تھا منیر کمال نے کھانا بھی منگوا کر کھایا تھا مگر وہ بس سگریٹ پر سگریٹ پھونکے جا رہی تھی۔

''منیر! اللہ کے لیے کسی وقت تو انسانوں کی طرح سوچا کرو تمہاری گاڑی سے ایک شخص کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے اور وہ موت اور زندگی کی کشمکش میں ہے اور تم اس کے مرنے کی دعائیں مانگ رہے ہو کچھ تو شرم کر لو۔''

وہ چیخ اٹھی تھی۔

''تمہیں اس شخص سے ہمدردی اس لیے ہو رہی ہے کہ وہ تمہارا محبوب اور سابقہ شوہر ہے۔ ہے نا۔'' وہ اس کے چیخنے پر مزید اپنی کھال سے باہر آ گیا تھا اور بے ہنگم ہنسی کے ساتھ بڑا گھراوا کیا تھا۔

شمائلہ کے چہرے پر نفرت کے ساتھ وحشت بھی نمودار ہوئی تھی۔

''منیر کاش میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے قتل کر سکتی کم از کم اپنا گھر برباد کرنے کا پچھتاوا کسی طور تو کم ہوتا۔''

وہ زہریلے لہجے میں گویا ہوئی تھی اور منیر کمال کو مزید کھلکھلا کر ہنسنے کا موقع مل گیا تھا۔

''پاگل عورت اب ہم دونوں کی بہتری اسی میں ہے کہ ایک دوسرے کی جان کی پرواہ کریں۔ ہمیں ایک دوسرے کے سوا کوئی برداشت نہیں کر سکتا دیکھو اپنے اس ہمدرد سرمد بخاری کو..... نئی نویلی کے ساتھ فارم ہاؤس پر مزے کر رہا ہے۔ ویسے تو تمہارا سب سے بڑا ہمدرد بنتا ہے مگر اپنے کام میں حصہ دار نہیں بناتا ابھی تک ہم دونوں اس کی سپورٹ کے بغیر لولے لنگڑے ہیں سوچو اگر کل وہ نہ رہا تو ہم کال کوٹھڑی میں سڑ رہے ہوں گے دلال ہی تو ہیں ہم لوگ۔''

وہ پتا نہیں کس بات کا سوگ منا رہا تھا۔ شمائلہ کو اس کی کوئی بات اس وقت پلے نہیں پڑی تھی سوائے اس کے

''دلال ہی تو ہیں ہم لوگ۔''

اس نے سائیڈ ٹیبل پر پڑا گلاس اٹھا کر دیوار پر دے مارا تھا۔

پہلے وہ اس طرح کی عریاں حقیقتوں کا سامنا بڑی بہادری اور خوش دلی سے کرتی تھی۔ مگر اب اس کی برداشت کا پیمانہ ایسی ہر بات پر لبریز ہو جاتا تھا۔

''ریلیکس جانِ من تمہاری طبیعت خراب ہو جائے گی اور ابھی نظامی بڈھے سے کام بھی نکلوانا ہے۔ سرمد نے خاص تاکید کی ہے اس سے ملاقات کی وہ فارن منسٹری کا بندہ ہے ہمارے کام کا آدمی ہے چلو اب ان ساری فضولیات کو ذہن سے نکالو اور تیار ہو جاؤ لاؤ میں تمہارا مساج کر دیتا ہوں تمہاری وہ لاڈلی بیگم تو ہے نہیں جس کے مساج سے تم ٹھیک ہو جاتی ہو۔''

وہ اسے پچکارتے ہوئے اپنے مطلب کی بات پر لا رہا تھا نظامی کی پارٹی تو رات گئے شروع ہونا تھی

فی الحال تو اس کی رگوں میں سیاہ کتوں کی دوڑ شروع ہو گئی تھی جب سے وہ کشمالہ سے مل کر آیا تھا مستقل پیے جا رہا تھا اب اس شیطانیت کو کسی طور باہر تو نکلنا تھا۔

اس نے شمائلہ کے سر میں ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا تھا اور وہ عاشر کی سرد مہری اور منیر کمال کی طرف سے ملنے والی بے ہودہ باتوں کی ڈوز کے بعد ذہنی اور اعصابی طور پر اتنا تھک چکی تھی کہ اس وقت اس کے ہاتھوں کا مساج نعمت محسوس ہو رہا تھا اس نے آنکھیں موند لیں اور منیر کمال اس کے بالوں، کانوں، گردن چہرے سے کھیلتے ہوئے اسے ریلیکس کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

''منیر میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا ایکسیڈنٹ کے بعد تم ہاسپٹل گئے طارق کی بیٹی سے بھی ملے پھر بھی سن لوگوں نے ابھی تک کسی قسم کی ایف آئی آر فائل نہیں کی مجھے حیرت ہو رہی ہے۔''

جیسے جیسے وہ پرسکون ہونا شروع ہو رہی تھی ویسے ویسے اس کا دماغ چلنا شروع ہو گیا تھا۔

''اس وقت ہم کوئی اور بات نہیں کر سکتے..... اپنی بات..... دیکھو نا کمرے کا ماحول کتنا رومینٹک ہو رہا ہے اور ایک مدت بعد ہم دونوں کو ایسی تنہائی نصیب ہوئی ہے۔'' وہ اس کے بے حد قریب سانس لے رہا تھا شمائلہ کا ذہن کہیں اور الجھا ہوا تھا ادے گھٹن سی ہونے لگی۔

''میں جانتا ہوں وہ معمولی آدمی نہیں نہ ہی وہ لڑکی..... لیکن تم مجھے اتنا بے وقوف سمجھتی ہو..... میں اپنی طرف سے ساری کاروائی کر چکا ہوں تم فکر نہیں کرو۔''

وہ سرگوشی کے انداز میں بولا ہاتھ مسلسل اس کے بالوں میں گردش کر رہے تھے۔ وہ باوجود کوشش کے اس گھٹن کے خلاف مزاحمت نہیں کر سکی کیونکہ منیر کمال اس کی کمزوریوں سے واقف تھا اس لیے حاوی ہونے لگا تھا۔

''منیر پلیز..... اس وقت نہیں پلیز میں بہت تھکی ہوئی ہوں مجھے ریسٹ کرنے دو۔''

وہ کسمسائی۔

''ابھی تمہاری تھکن اتر جائے گی جانِ من۔'' وہ طبیعت کو مکدر کر دینے والی بو کے حصار میں تھی اس کا جی متلانے لگا۔

''منیر..... تمہارے اندر کی ہوس جانے کب ختم ہوگی۔'' اس نے بے بسی سے کہہ کر آنکھیں بھینچ لی تھیں۔ منیر کمال کو اس سے کو غرض نہیں تھی کہ وہ اس کے ساتھ ہے یا نہیں وہ بس اپنی بھوک مٹا رہا تھا اور شمائلہ کمال کا رواں رواں رو رہا تھا اور شاید ایک مدت بعد آج اس کا رواں رواں طارق کو پکار رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

''طارق! میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ زمانے بھر کی عورتیں آپ سے ہی کیوں مدد مانگنے چلی آتی ہیں انہیں پورے کلب میں کوئی اور نظر نہیں آتا۔'' وہ طارق محمود کی محبوبہ بیوی تھی ان کے اولین خوابوں کی تعبیر وہ اس سے کبھی کچھ نہیں چھپاتے تھے نہ دفتر کے معمولات اور نہ کلب کی سرگرمیاں۔

اس وقت بھی ستم یہ ہوا تھا کہ کلب کے ایک سینئر ممبر اور طارق محمود کے اچھے دوست کی بیگم صاحبہ اپنے شوہر نامدار کی گمشدگی کا رونا رونے چلی آئی تھیں۔ ان کے شوہر صاحب کو آفس سے کلب پہنچنا تھا۔ وہ ابھی تک نہیں پہنچے تھے ان سے فون پر بھی رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ سو مسز زبیر اپنی موٹی موٹی آنکھوں میں تفکر کے رنگ لیے طارق کے پاس چلی آئی تھیں۔

''مجھے پتا ہے آپ ہی اس وقت میری مدد کر سکتے ہیں۔''

ان کا پر یقین لہجہ ہمیشہ کی طرح شمائلہ کی تنگ نظر فطرت کو تاؤ دلا گیا تھا۔

''طارق ہم لوگ لیٹ ہو رہے ہیں ابھی اماں کے پاس بھی جانا ہے چلیں۔''

اس نے مسز زبیر کے سامنے ہی بے زار لہجہ اختیار کرتے ہوئے بڑی ادا سے طارق محمود کا ہاتھ تھام لیا۔

''اوہ سوری پلیز..... میری وجہ سے آپ لوگ اپنا پروگرام خراب نہ کریں میں خود ہی کچھ کرتی

ہوں۔'' وہ شمائلہ کی فطرت سے بخوبی واقف تھیں سو جز بز ہو کر کاؤنٹر کی طرف مڑ گئیں۔

طارق محمود نے بے چارگی سے پہلے اپنی محبوب بیوی کے ناراض چہرے اور پھر سامنے دیوار گیر آئینے میں خود کو دیکھا اور ایک سرد آہ بھر کر راہداری کی طرف مڑ گئے۔

''اب میرا کیا قصور ہے اگر دنیا بھر کی عورتوں کو میں بڑے بھائی جیسا لگتا ہوں۔''

وہ یہ بات کہہ نہ سکے کیونکہ واپسی میں شمائلہ کا موڈ بہت خراب تھا اسے اپنا موڈ خراب کرنے کے لیے کسی بڑے واقعے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی بلکہ وہ ایسی ہی باتوں پر منہ پھلا لیا کرتی تھی طنز کرنے لگتی تھی۔

''آپ کی بھی عادت ہے خواتین سے بات کرتے ہوئے آپ کی آنکھوں میں.....''

''پلیز شمائلہ کوئی فضول بات مت کہنا تم جانتی ہو میری آنکھوں میں صرف تم ہو ہمیشہ سے۔'' وہ اسے اپنی گہری نگاہوں میں جزب کرتے ہوئے بولے تھے۔

''جب تک میں سامنے ہوتی ہوں بس.....'' ان کی خفگی برقرار تھی راجہ طارق محمود نے ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ گھماتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے شمائلہ کے گرد گھیرا تنگ کرتے ہوئے اسے خود سے لپٹا لیا تھا ان کے وجود کی مسحور کن خوشبو اور جذبوں کی نرم گرم تپش نے شمائلہ کو پگھلنے پر مجبور کر دیا تھا۔

ورنہ وہ آج بہت زیادہ لڑنے کے موڈ میں تھی۔

''تم تو میری زندگی ہو، میری آنکھیں، میرا چہرہ، میری روح..... میں بھلا کسی کو تمہاری نظروں سے دیکھ سکتا ہوں۔'' انہوں نے اس کے ماتھے اور گال پر اپنے پیار کی مہر ثبت کرتے ہوئے کہا تو وہ تفاخر سے مسکرا دی یہ وہ لفظ تھے جو بلا ناغہ بے حساب سننے کے بعد اس کا دل نہیں بھرتا تھا اور وہ شک کرنے بیٹھ جاتی تھی۔

''طارق! آپ کو جب مجھ سے مطلب ہوتا ہے تب مجھ سے پیار کرتے ہیں۔''

اس کی یہ بات طارق کے سارے جذبات پر برف گرا دیتی تھی اور وہ کئی دنوں تک شمائلہ کو خود سے قریب اس لیے نہیں کرتے تھے کہ وہ ان کے پیار کی شدت اور وارفتگیوں کو بڑے اطمینان سے ہوس

اور مرد کی فطرت کا نام دے دیتی تھی اس وقت اگر وہ محبت اور ہوس کی گرمی میں فرق کرتی تو شاید آج منیر کمال کی قربت میں خون کے آنسو نہ رو رہی ہوتی۔

زندگی اپنی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والوں کو کبھی معاف نہیں کرتی اس کا احساس آج شمائلہ کمال کی بے تاثیر آنکھوں اور سپاٹ چہرے کو دیکھ کر ہوتا تھا۔

منیر کمال اپنی بھی ساری تھکن اس کے اندر اتار کر پرے ہو گیا تھا اور وہ نڈھال دی بستر پر پڑی اپنے ماضی کے تھپیڑوں سے الجھی ہوئی تھی تب ہی اس کے موبائل پر سرمد بخاری کا نمبر جگمگانے لگا۔

اس نے لائن ڈس کنیکٹ کر کے موبائل ایک طرف ڈال دیا۔

اس نے کہا تھا

تم وہ شجر ہو

جس کی شاخیں تپتی دھوپ میں شبنم شبنم

سایہ سایہ پھیل رہی ہیں

جیسے ذات کی پنہائی ہو

اس نے کہا تھا

اس نے کہا تھا تم وہ شجر ہو جس کے پتوں کی شادابی سوندھی خوشبو

موسم گل کا سرمایہ ہے

تم وہ شجر ہو جس کی جڑیں اتنی گہری ہیں

جیسے روح کہ گہرائی ہو

اس نے کہا تھا

یہ تو گئے دنوں کی باتیں ہیں

پت جھڑ سے پہلے کی باتیں
اب تو زیست کی ایک ایک ساعت ایک ایک لمحہ
دشت جنوں میں تنہائی کا بوجھ اٹھائے
آنے والے راہ گیروں سے پوچھ رہا ہے
یہ موسم کب تک بدلے گا؟ کب تک یہ موسم بدلے گا؟
وہ منہ پر تکیہ رکھے سسکیاں بھر رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

صوفیہ سے بات کرنے کے بعد اس کا دل چاہ رہا تھا وہ چیخ چیخ کر روئے اور اس ویرانے میں اس کی آواز عرش تک پہنچ جائے مگر سرمد بخاری کی موجودگی میں ایسا ممکن نہیں تھا۔

سرمد بخاری اور وہ ساتھ ساتھ اس فارم ہاؤس پر پہنچے تھے۔ دونوں نے الگ الگ گاڑیوں میں سفر کیا تھا مگر یہاں پہنچنے کے بعد وہ اس کا سایہ بنا ہوا تھا۔ سعدیہ کو ابھی خود سے چلنے میں خاصی دقت ہوتی تھی پلاسٹر کے باعث وہ زیادہ وقت وہیل چیئر پر ہی گزار رہی تھی اور سرمد بخاری بڑی خوشدلی سے اس کی وہیل چیئر کو دھکا دیتے ہوئے اس وسیع و عریض فارم ہاؤس کی سیر کروا رہا تھا۔

بظاہر یہ ایک ویران جگہ تھی لیکن فارم ہاؤس کے اندر کی پرتعیش دنیا کو دیکھ کر آنکھیں ساکت ہو جاتی تھیں۔ اعلا قسم کا ڈیکوریشن سینٹرل ائیر کنڈیشن اسے لگ رہا تھا جیسے وہ کسی محل میں آ گئی ہو۔

ہر کمرے کی کلر اسکیم الگ اور بڑے بڑے دو ہال بیک وقت کئی لوگوں کو سمیٹے ہوئے انہیں ہر قسم کی تفریح فراہم کر سکتے تھے۔

سرمد بخاری جانے کیا کچھ بتائے جا رہا تھا لیکن وہ تو بس دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔

''اللہ تعالیٰ نے کسی کو اتنی فراوانی سے نوازا ہے اور کسی کے پاس سر چھپانے کو جگہ نہیں۔''

''پتا ہے کل میں نے یہاں تمہاری بوریت دور کرنے کے لیے زبردست سی پارٹی کرنے کا سوچا ہے تم اگر کسی فیورٹ ایکٹریس کو بلانا چاہتی ہو تو بتاؤ۔''

سرمد بخاری نے اس کے سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے خوشدلی سے کہا۔

''مجھے یہاں پر کب تک رہنا ہوگا۔'' اس نے وہ سوال ہی نظر انداز کر دیا تھا۔

''تم جب تک چاہو یہاں رہ سکتی ہو یہ تمہارا فارم ہاؤس ہے اسے اپنا گھر سمجھ کر رہو سعدیہ۔'' وہ اسے بغور دیکھتے ہوئے بولا۔

اس ایکسیڈنٹ نے اس کی شگفتگی کو مرجھا سا دیا تھا اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں اب صرف خوف ہلکورے لیتا تھا سرمد بخاری کو اب وہ اور بھی اچھی لگنے لگی تھی۔

اپنے غول سے بچھڑی ہوئی ہرنی کی طرح۔

''لیکن میں یہاں کیا کروں گی نہ بندہ نہ بندے کی ذات۔'' وہ چڑ کر بولی

''تم یہاں مہارانیوں کی طرح رہو مزے کرو تمہاری خدمت کے لیے ملازم ہوں گے اور تم..... خوب آرام کرو تا کہ جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ۔''

اس کے لہجے سے سچائی جھلک رہی تھی اور سعدیہ کی نظریں اس پر جمی تھیں۔

اپنی عمر کی خوبصورت بہاریں دیکھنے کے باوجود وہ شخص آج بھی ہشاش بشاش اور زندہ دل تھا اس کے بالوں سے جھلکتی سفیدی اس کے گریس میں کئی گنا اضافہ کرتی تھی اور اس کی مضبوط جسامت سعدیہ جیسی کمزور دل ناپختہ ذہن لڑکی کے لیے سائبان ہی تو تھی وہ اس کی باتوں پر اعتبار نہ کرتی تو کیا کرتی۔

''ایک بات پوچھوں آپ سے.....'' اس نے بہت دیر کے بعد نظروں کا ارتکاز توڑا۔ سرمد بخاری کے چہرے پر بڑی دلکش سی مسکراہٹ بکھر گئی مرد کسی بھی عمر کا ہو اور کسی بھی مرتبے کا حامل عورت کی توجہ پر اس کی آنکھوں میں اپنی تصویر دیکھ کر ہمیشہ نہال ہو جاتا ہے۔

''بہت ساری باتیں پوچھو.....'' وہ محبت سے بولا سعدیہ پھر سوچ میں ڈوب گئی۔

''آپ میرے لیے اتنا کچھ کیوں کر رہے ہیں؟''

اس نے بہت دیر سوچنے کے بعد بالآخر پوچھ ہی لیا۔

''تم مجھے اچھی لگتی ہو اپنی اپنی سی لگتی ہو تم نے میری خاطر اپنا گھر اپنے گھر والے سب کچھ داؤ پر لگا دیا کیا میں تمہارے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتا۔''

اس نے بلا جھجک کئی اعتراف کیے تھے سعدیہ کا دل ایک نئی لے پر دھڑکنے لگا اس نے جو کہا تھا وہ اس کی آنکھوں میں بھی لکھا تھا۔

عورت کو بہلنے کے لیے کیا چاہیے ہوتا ہے چند خواب اور دو چار محبت بھرے جملے.....اور بس مرد ساری عمر کے لیے جیت اپنے نام لکھوا لیتا ہے۔

''آپ سے ایک بات کہوں مانیں گے۔''

''پوچھو یار.....ایک تو تم سوچتی بہت ہو۔'' وہ اسے اپنے قریب کر کے مصنوعی غصے سے بولا تو سعدیہ نے بھی سوچنے کے بجائے مطالبہ کرنے میں ہی غنیمت سمجھی۔

''آپ مجھے دبئی مت لے کر جائیں میں یہاں پر آپ کی نوکرانی بن کر رہ لوں گی۔لیکن مجھے اتنی دور مت لے کر جائیں جہاں میرا اپنی مٹی سے رشتہ بھی ختم ہو جائے۔''

اس نے روہانسے لہجے میں کہا تو سرمد بخاری ہنس پڑا۔

''بس اتنی سی بات.....''

''اگر آپ میری یہ بات مانیں گے تو میں ساری زندگی آپ کا یہ احسان یاد رکھوں گی۔''

اب اس نے اپنے ہاتھ جوڑ دیئے تھے جو سرمد بخاری نے اپنے مضبوط ہاتھوں میں جکڑ لیے تھے۔

''ارے یار! یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تم جب تک یہاں رہنا چاہتی ہو رہو.....تم دبئی اس وقت تک

نہیں جاؤ گی جب تک تمہارا دل نہ مانے.....بس اب خوش۔"

وہ بہت جلد مان گیا تھا سعدیہ کو حیرت نہیں ہوئی تھی یہ وقت ہی ایسا تھا کہ وہ اس کی کسی بات کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ مگر اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ سر پر دبئی کی لٹکی ہوئی تلوار ذرا پرے کھسک گئی تھی۔

اس نے قدرے اطمینان کی سانس لے کر وہیل چیئر کی پشت سے سر ٹکا دیا تھا اور سرمد بخاری اللہ رکھی کو آواز دینے لگا۔

☆.....☆.....☆

"اوہ تو یہ کہانی ہے.....کب ہوا یہ سب کچھ۔"

"ارے دوست آج رات ہی آپ کے اعجاز الدین نے یہ کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ یقین مانو تو ایک مدت بعد ایسی حرکت کر کے دل کو بڑا سکون ملا ہے۔"

اعجاز الدین کے چہرے پر جانے کس بات کی مسرت تھی.....اس سارے قصے میں تو کوئی ایسی بات نہیں تھی جو راجہ طارق محمود کو باعثِ اطمینان اور باعثِ مسرت محسوس ہوتی۔ بلکہ ان کا دل بے نام سے دکھ سے دوچار ہو گیا۔

انہیں خواہ مخواہ ایک ان دیکھی انجان اجنبی عورت پر ترس آ رہا تھا جو پہلے ہی کم ستم نہیں جھیل رہی تھی اور اب نئی آزمائش اس کی منتظر تھی۔

"میں آپ کو اپنی سسٹر سے ملواتا ہوں مریم نام ہے اس کا....." یہ کہہ کر اعجاز الدین نے قدرے بلند آواز میں مریم کو پکارا تو راجہ طارق محمود حیرت سے اس کی شکل دیکھنے لگے یہ کون سا اعجاز الدین تھا بالکل ایک نیا انسان.....

کہ اس مالک سے مختلف جو خوبصورت بدصورت ہر طرح کی عورتوں سے کام لینا جانتا تھا۔

"ارے اس طرح حیران کیوں ہو رہے ہو جگر! مانتا ہوں برا ہوں مگر اتنا بھی برا آدمی نہیں کہ ایک

بے بس ماں کی مجبوری کا سودا کروں۔"

وہ صدق دل سے کہہ رہا تھا اور راجہ طارق محمود کی نظریں آہٹ پر سامنے والے دروازے کی طرف اٹھ گئی تھیں۔

سیاہ چادر میں لپٹا ہوا وہ بلا کا سفید چہرہ معصومیت کی ہر تعریف پر فٹ بیٹھتا تھا۔

مہین سا سراپا اور کانپتی لرزتی آواز۔

"آپ نے بلایا۔" اس کی خوفزدہ نگاہیں اپنے لیے اگلے حکم کی منتظر تھیں۔ اور دو مردوں کی نظریں اس پر جمی تھیں وہ سو جان سے کانپ کر رہ گئی مگر جب ایک مرد نے کھڑے ہو کر اسے تعظیم دیتے ہوئے بیٹھنے کا اشارہ کی تو اس کا لرزنا کانپنا کچھ کم ہوا۔

"آپ کھڑی کیوں ہیں بیٹھیں نا۔" راجہ طارق محمود کے کہنے پر وہ چند قدم آگے چل کر آئی اور ان کے سامنے والے صوفے پر ٹک گئی اب پتا نہیں خوف کے مارے اس کا چہرہ سفید اور آنکھیں نیلی ہو رہی تھیں یا پھر تھی ہی ایسی۔ انہوں نے سوچا ضرور مگر اس کی طرف دوبارہ غور سے نہیں دیکھا۔ اچھا ایک بات بتائیں آپ واپس اپنے گھر جانا چاہیں گی۔ انہوں نے رسان سے پوچھا تو اعجاز الدین چونک کر دونوں کو دیکھنے لگے۔

"ارے اپنے گھر کے عذاب سے تو اس کو میں نے نکالا ہے آپ پھر اس سے وہی بات کر رہے ہیں۔"

"ایک منٹ اعجاز مجھے مریم سے پوچھنے دو وہ اپنے بارے میں خود بہتر بتا سکتی ہیں۔"

وہ اپنے مخصوص متحمل انداز میں بولے تو مریم نے جھکی ہوئی نظریں اٹھا کر قدرے حیران نگاہوں سے انہیں دیکھا اس جانام آج تک کسی نے اتنی تعظیم اور نرمی سے نہیں پکارا تھا اپنے گھر میں وہ موموتھی بہن بھائی کزنز کسی کو بھی شاید اس کا اصلی نام یاد ہی نہیں تھا۔

منیر کمال اسے عورت ضرور کہتا تھا یا پھر کوئی شاندار سی گالی تیار رکھتا تھا مگر اس کے منہ سے اسے

اپنا نام سننا بھی گراں گزرتا تھا اور آج اس اجلی صبح میں جب اس کے ذہن کی بہت ساری کثافت ڈھل گئی تھی اور اس نے ایک نئی زندگی گزارنے کا عزم کر لیا تھا تو اعجاز الدین کا یہ دوست غیر شعوری طور پر اس کے اعتماد کو بحال کرنے کی ایک اور سعی کر رہا تھا وہ اس سے مرضی پوچھ رہا تھا اور مریم یہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کی مرضی کیا ہے۔

''میں اپنے گھر نہیں جانا چاہتی منیر کمال نے میری زندگی عذاب کر رکھی تھی اب وہ میری بیٹیوں کی جان کا دشمن بنا ہوا ہے میں نے خود تو سہہ لیا تھا لیکن میں اپنی بیٹیوں کو اس دلدل میں نہیں پال سکتی اور نہ ہی میں انہیں منیر کمال کے رحم و کرم پر چھوڑ سکتی ہوں۔''

بلا کا مخبوط لہجہ اور قطعی انداز راجہ طارق محمود کو حیران کر گیا۔

منیر کمال اور اعجاز الدین دونوں ہی ایک ہی کاروبار سے وابستہ تھے کوئی خاص فرق نہیں تھا پھر بھی مریم نے منیر کمال سے ہر رشتہ توڑنے کا اعلان کرتے ہوئے اعجاز الدین کے ساتھ آنے کو ترجیح دی تھی۔

راجہ طارق محمود کو اس کے فیصلے پر حیرانی سے زیادہ پریشانی ہو رہی تھی کہ وہ انسانوں کے اس بے ہنگم ہجوم میں اپنی اور اپنی بیٹیوں کی حفاظت کیسے کرے گی۔

منیر کمال جیسے بھیڑیے تو قدم قدم پر تھے اور اعجاز الدین نے فی الوقت اگر اس کی حفاظت کا ذمہ لے لیا تھا تو اب وہ بھی پریشان تھا کہ اسے کہاں رکھے اس کا کاروبار اس کی دشمنیاں اور پھر سب سے بڑا دشمن منیر کمال۔

اس نے پوری داستان کا اختتام اس تشویش پر کیا تھا کہ مریم کا کیا ہوگا اور اب یہ ہی تشویش راجہ طارق محمود کے رگ و پے میں اتر گئی تھی بلکہ مریم کا اطمینان قابلِ دید تھا۔

کچھ دیر پہلے والا خوف بھی اب چہرے سے غائب ہو چکا تھا اور دو بڑی پر اعتماد نظروں سے کبھی ایک کو تو کبھی دوسرے کو دیکھنے لگتی۔

''آپ کے پیرنٹس کہاں ہیں آپ کا تعلق.....'' وہ ہم زبان تو تھی لیکن اس کے خدوخال، آنکھیں مغربی ہونے کی چغلی کھا رہے تھے۔

''میرا تعلق انڈیا کے ایک چھوٹے سے گاؤں سے ہے میں شادی کے بعد پہلی مرتبہ بمبئی ائیر پورٹ پر آئی تھی ورنہ میں نے اس سے پہلے کبھی اپنے گاؤں سے دوسرے شہر تک سفر نہیں کیا تھا۔''

''اوہ.....تو آپ کے پیرنٹس انڈیا میں ہیں اس وقت۔''

طارق محمود ایک گہری سانس لے کر اسے دیکھنے لگے ان کا تجسس بڑھنے لگا تھا۔

''آپ کے امی ابو انڈیا میں آپ کی شادی پاکستان میں ہوگئی کیوں اعجاز الدین منیر کمال تو پاکستانی ہے نا؟''

انہوں نے تصدیق چاہی اور اعجاز الدین منیر کمال کو پھر سے مغلظات بکنے لگا۔

''ارے اس شخص کا نہ کوئی دین ہے نہ دھرم.....دیس کیا ہوگا مجھے تو پکا جھوٹا اور دھوکے باز لگتا ہے یہ تو میری بہن کو پتا ہوگا وہ کہاں سے آیا ہے۔'' اس نے پھر گالی دی تھی راجہ طارق محمود نے گھور کر دیکھا۔

جس پر وہ بڑی معصومیت سے کانوں کو ہاتھ لگا کر خاموش ہوگیا۔

وہ حسبِ عادت سمجھانے بیٹھ گئے تھے اعجاز الدین اٹھ کر ان کے پاس آ گیا اور بیٹھتے ہوئے بولا۔

''پتا ہے مریم ہماری یاری زیادہ پرانی نہیں مگر بڑی پکی ہے اب کوئی مجھے کہے کہ اس شخص کی خاطر چھت سے کود جاؤ اور جان دے دو تو میں دے دوں گا۔''

وہ بڑے مزے سے اعتراف محبت کر رہا تھا راجہ طارق محمود تو جز بز ہو ہی رہے تھے مریم بھی اس بے ساختگی اور وارفتگی پہ سرخ ہوگئی۔

اس کے چہرے پر بھولی بھٹکی سی مسکراہٹ آ گئی تھی جسے پہلی بار طارق محمود نے بڑی دلچسپی سے دیکھا تھا اور منیر کمال کو دل ہی دل میں گالیاں دی تھیں۔

''کیسا شخص ہوگا وہ جو اس عورت کی قدر نہیں کر سکا۔''

سرتاپا چادر میں لپٹا نازک اندام سراپا، بلا کی کشش نیلی آنکھیں اور اس پر ستم چہرے کی معصومیت.....زندگی گزارنے کے لیے اس سے خوبصورت ساتھ کیا ہوگا۔

ان کی سوچیں بھٹکنے لگی تھیں، لمحوں میں آنکھیں سرخ ہو چلی تھیں۔

انہوں نے بمشکل خود کو ماضی کی طرف جانے سے روکا اور اعجاز الدین کو پرے دھکیل کر ذرا دور ہو کر بیٹھ گئے۔

''تم خالی خولی پیار جتایا کرو۔ پیٹ میں چوہوں کی دوڑ ہو رہی ہے ناشتے کا وعدہ تھا کیا وہ آسمان سے پک کر آئے گا۔''

وہ اپنے موڈ میں آ گئے تھے۔

''ارے صاحب! بھول گیا ان صاحبہ کی پریشانی میں ہم نے سوچا تھا اب صبح صبح دیسی گھی کے پراٹھے اور آملیٹ مریم بی بی کھلایا کریں گی مگر.....'' اس نے مصنوعی خفگی کا مظاہرہ کی تو مریم شرمندہ سی ہو کر کھڑی ہو گئی۔

''آپ مجھے بتائیں.....کیا بنانا ہے مجھے تو کچھ پتا ہی نہیں کہاں کیا رکھا ہے۔''

''ارے آپ بیٹھیں آج ہم دونوں اس کے مہمان ہیں یہ ہمیں ناشتا کروائے گا زبردست سا.....کس طرح بنے گا.....یہ ہمارا ہیڈک نہیں۔''

وہ صوفے پر مزید پھیل کر بیٹھ گئے تھے آج ایک مدت بعد ذہن و دل خوشگوار سی نوک جھونک پر آمادہ ہوا تھا مریم کو انہوں نے اشارے سے بیٹھنے کے لئے کہا تو وہ بھی میکانکی انداز میں دوبارہ صوفے پر ٹک گئی اعجاز الدین نے ایک نظر راجہ طارق اور دوسری مریم پر ڈالی تو کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

''یہ سراسر زیادتی ہے میرا کوئی بھی ساتھ نہیں دے رہا۔''

''آج آپ کی باری.....اس کے بعد دوپہر کا کھانا ہم پکائیں گے کیوں مریم۔''

یہ دوسرا اعلان تھا راجہ طارق نے قدرے پُر تجسس نگاہوں سے راجہ طارق محمود کو دیکھا جیسے ہو چھ رہا ہو۔

''دوست تم کہاں چھپے ہوئے تھے میں تو جس شخص سے آج تک ملا ہوں اس کی تو کلف ہی نہیں اترتی تھی اس سے تو بات کرتے ہوئے خوف آتا تھا۔''

راجہ طارق نے اس کی سوالیہ نگاہیں نظر انداز کر کے کچن کی راہ دکھائی تھی۔

''شاباش جلدی کرو جب تک میں اور مریم آئندہ کا لائحہ عمل طے کر لیتے ہیں کہ کرنا کیا ہے کیوں مریم؟''

''جی بالکل.....''

وہ ان دونوں کی باتوں کو دل سے انجوائے کر رہی تھی چہرے پر نرم سی مسکراہٹ اس بات کا ثبوت تھی آج اس نے طویل قید سے نجات حاصل کرنے کے بعد نئی زندگی جینے کا جو عزم کیا ہے وہ اس پر ہر حال میں قائم رہے گی۔

اسے ان دونوں کی بے فکری نے منیر کمال کے خوف سے بھی آزاد کر دیا تھا وہ بارہا مشکور نظروں سے راجہ طارق محمود کو دیکھ رہی تھی جن کی اس گھر میں موجودگی نے اس کے بہت سارے خدشے دور کر دیے تھے۔ اسے یقین ہو چلا تھا یہ شخص اس کی طرف آنے والی ہر مشکل کے سامنے دیوار بن جائے گا۔

اس نے کہیں پڑھا تھا کہ ہر نئی پریشانی سچائی کے وجود کی دلیل دیتی ہے اور ہر نیا حادثہ زندگی کی قدر و قیمت بڑھا دیتا ہے۔

لیکن اس وقت کوریڈور کی خنک فضا میں راجہ طارق محمود کے مکمل ہوش میں آنے کا انتظار کرتے ہوئے وہ اپنے مہربان رب سے یہ شکوہ کرنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ

''اے اللہ تو نے ہر پریشانی ان کے نصیب میں کیوں لکھی زندگی بھر کی مسافت اور اب شاید عمر

بھر کی ذہنی معذوری۔"

کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا وہ منیر کمال کو بد دعائیں دے اپنے رب سے پاپا کی صحت اور تندرستی مانگے یا کسی کونے میں چپ چاپ کھڑی روتی رہے۔

ڈاکٹرز کے مطابق آپریشن میں سو فیصد کامیابی کے چانسز تھے لیکن ان کا چند گھنٹوں میں ہوش میں آنا اور یادداشت کے عمل کو دہرانا بہت ضروری تھا۔

ڈاکٹرز اپنی صلاحیتوں کے امتحان میں سرخرو ہونے کے لیے بے چین تھے اور وہ چاروں اس شخص کی زندگی کے لیے دل و جان سے دعا گو.....

جو قطرہ قطرہ سانس اپنے اندر منتقل کر رہا تھا اس کا لمبا چوڑا وجود سفید چادر سے ڈھکا ہوا تھا اور چہرہ سانس لینے والے مشین کے حصار میں۔

"عاشر! پاپا کب ہوش میں آئیں گے؟"

بہت دیر کی خاموشی کے بعد اس نے پھر وہی سوال دہرایا تھا جس کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔

"مجھ سے تو وہ ناراض ہیں میری کب سنیں گے۔"

عاشر کی آنکھوں میں ٹھہرا ہوا پانی باہر نکل آیا تھا۔ کاشف نے بے اختیار ادے آگے بڑھ کر گلے سے لگا لیا۔ پتا نہیں وہ کب سے رونا چاہ رہا تھا کاشف نے خود سے لپٹایا تو اس کا ضبط جواب دے گیا۔

خولہ اور کشمالہ بھی اس کی بے اختیاری پر بلک بلک کر رو پڑیں۔

وہ ناراض تھا اپنے باپ سے دور تھا ان سے بات نہیں کرتا تھا لیکن محبت تو کرتا تھا اور محبت بھی اس بلا کی کہ ان کی شخصیت کا ایک ایک رنگ چرا کر ان کا عکس بن بیٹھا تھا۔ وہ بات کرتا تو ان جیسا لگتا وہ چلتا تو ان کے ہونے کا گمان ہوتا وہ ذرا بھی تو ان سے الگ نہ تھا ان سے ناراضی ان سے دوری رکھنے کی کوشش میں وہ بس ان جیسا بن گیا تھا۔ اور اس وقت اس کا دل چاہ رہا تھا سارے بند توڑ کر سارے

دروازے کھول کر بس ان کے وجود میں سما جائے اور برسوں کی تشنگی مٹا ڈالے۔

''مجھے بابا کے پاس جانا ہے ان سے بات کرنی ہے پلیز انہیں جگاؤ۔''

وہ اونچا لمبا جوان کاشف کے گلے لگ کر رو رہا تھا تڑپ رہا تھا اور اس کے لفظ ابھی ابھی اندر آنے والی شمائلہ کے کانوں میں بھی پڑے تھے اور وہ وہیں پتھر کے بت کی طرح ساکت ہو گئی تھی۔

اس کا سکتہ کشمالہ نے توڑا تھا جس نے کاشف کے گلے لگے ہوئے عاشر عباس کے کندھے کو تھام کر اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی۔

''عاشر پلیز! آپ اس طرح کریں گے تو ہمارا کیا ہوگا۔ پاپا کو کچھ نہیں ہوا وہ تو بس آپ کا انتظار کر رہے تھے۔ آپ ان کے پاس آئیں اور وہ اپنی آنکھیں کھول لیں۔'' وہ اس کے آنسو صاف کر رہی تھی اس کے چہرے کا گیلا پن بے حد نرمی سے اپنے ہاتھوں میں جذب کر رہی تھی اور خود بھی بس روئے جا رہی تھی۔

''آپ بابا سے کہیں..... میں آ گیا ہوں..... اب کبھی ان سے نہیں لڑوں گا دور نہیں جاؤں گا..... کبھی انہیں سر نہیں بولوں گا..... وہ آپ کی بات سن لیتے ہیں۔''

وہ کسی طور سنبھل نہیں رہا تھا قدرے فاصلے پر کھڑی شمائلہ کمال کو وہ چھوٹا سا بچہ یاد آ گیا جو وقت کی بھول بھلیوں میں کہیں گم کو گیا تھا وہ تڑپ کر آگے بڑھی..... اسے بے اختیار پکارا۔

وہ جو اس وقت کشمالہ طارق کے سامنے بکھر رہا تھا اپنی بے قراریوں کا اعتراف کر رہا تھا اس اجنبی آواز پر جیسے ہوش میں آ گیا اس نے پلٹ کر دیکھا اور اس کی نگاہوں کے تعاقب میں خولہ، کاشف اور کشمالہ کو بھی مڑنا پڑا۔

''عاشر میرے بچے.....'' وہ تینوں حیران نظروں سے دیکھ رہے تھے اور عاشر نے اس صدا پر نفرت سے منہ موڑ لیا تھا۔

''پلیز..... ان سے کہو..... اس وقت یہاں سے چلی جائیں۔'' اس نے کشمالہ سے کہا تھا۔

''عاشر بیٹا.....! میرے پاس آؤ۔'' وہ قریب آنے کو بے تاب تھیں عاشر چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔

اب اس کا رخ گلاس وال کی جانب تھا۔

جس کے اندر اس کی زندگی سانس لے رہی تھی۔

کوریڈور میں ان چاروں کے سوا دو نفوس اور بھی کھڑے تھے جن کا ان سے کوئی رشتہ نہیں تھا مگر وہ عاشر کے بابا کے لیے دل ہی دل میں دعا گو تھے۔

''اللہ اس شخص کو زندگی دے۔'' وہ ادھیڑ عمر شخص اپنے بیٹے کی بیماری بھول کر راجہ طارق محمود کے لیے دعا گو تھا اس کی آنکھیں نم تھیں۔

شمائلہ کمال نے پھر اپنے بیٹے کو پکارا اور خوفزدہ سی نگاہ کشمالہ اور خولہ پر ڈالی تھی جو اسے مکمل نظر انداز کر کے عاشر کے پاس چلی آئی۔

تب ہی آئی سی یو کے اندرونی کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور ڈیوٹی پر مامور ڈاکٹر اور میل نرس نے باہر کا دروازہ کھول کر عاشر کو اندر آنے کا اشارہ کیا تھا۔

''میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں۔'' ڈاکٹر نے اس کا ہاتھ تھام کر نرمی سے پوچھا۔ تو وہ اپنی بے پناہ سرخ آنکھوں میں حیرانی بھر کر انہیں دیکھنے لگا۔

''میں عاشر عباس ہوں۔'' اس نے آنکھوں میں آئی نمی کو پیچھے دھکیل کر قدرے عجلت سے کہا وہ ڈاکٹر کے ساتھ چینجنگ روم میں تھا جبکہ اس کا دل چاہ رہا تھا ڈاکٹر جلدی سے اسے شیشے کے دوسری طرف جانے کی اجازت دے دے۔

''پیشنٹ۔'' ڈاکٹر کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ بول اٹھا۔

''میرے بابا ہیں وہ.....آپ بتائیے نا کب تک وہ ہوش میں آجائیں گے۔''

اس کی بے چینی عروج پر تھی ستے ہوئے چہرے سرخ آنکھوں اور ماتھے پر بکھرے سیاہ بالوں والا

یہ ینگ سا نوجوان ڈاکٹر غیور کے پیشہ ورانہ جملوں کے آگے ہمدردی کا بند باندھنے لگا تھا۔

انہیں لگا..... وہ کہنا بہت مشکل ہے جوان کا تجربہ اور پیشنٹ کج مجموعی صورتحال سے اخذ کیا گیا ہے۔ مگر ان کھ پیشے کا تقاضا یہ تھا کہ وہ مریض کے اہل خانہ کو ہر حال میں حقیقت سے آگاہ کرتے تھے۔

''دیکھو عاشر!'' انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

''کبھی کبھی میڈیکل سائنس کی ترقی اور ہمارا تجربہ سب کچھ قدرت کی مرضی کے آگے بک بس ہو جاتے ہیں اور ہمیں یہ کہنے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتا کہ ہماری دواؤں کے ساتھ اب دعاؤں کی اشد ضرورت ہے اور دعا تس تقدیر کے فیصلے کے سامنے دیوار بن جاتی ہے۔''

''سچ بتاؤ عاشر! اس وقت میرے پیشنٹ اور آپ کے بابا کو صرف دعاؤں کی ضرورت ہے یوں لگتا ہے انہیں زندگی سے پیار نہیں..... آپ کو پتا ہے دو بار ان کی بے ہوشی ٹوٹی..... مگر.....''

وہ ساکت چہرے اور پتھریلی آنکھوں کے ساتھ ان کے سامنے کھڑا تھا۔ اسے کچھ نہیں پتا تھا وہ کیا سن رہا ہے۔ اس کے کانوں میں ایک ہی بازگشت تھی۔

''آپ کے بابا کو دعاؤں کی ضرورت ہے۔''

''کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ اب تک بابا کو ہوش آ جانا چاہیے تھا۔ وہ بہت اسٹرونگ ہیں آپ پلیز اپنی ٹریٹمنٹ بہتر کر لیں۔''

وہ متنفر لہجے میں بولا جس کی ڈاکٹر غیور کو پوری امید تھی. عموماً ان کا واسطہ ایسے جذباتی لوگوں سے پڑتا رہتا تھا جو مریض کی کلی ذمہ داری ڈاکٹر پر ڈال کر بری الزمہ ہو جاتے تھے۔

انہوں نے ایک گہری نگاہ عاشر پر ڈالی وہ اس لمحے پچیس چھبیس سال کا نوجوان نہیں بلکہ پانچ چھ سال کا بچہ لگ رہا تھا۔

جس کا باپ اس سے ناراض آنکھیں بند کیے پڑا تھا اور وہ غصے میں بھی پیر پٹختا تو کبھی ہاتھ مسلنے لگتا۔

کہ بہت کم ایسے چہرے ہوتے ہیں جنہیں اللہ نے بڑی محبت سے تراش خراش کر تخلیق کیا ہوتا ہے اور ایسے چہروں کو بار بار دیکھنے کا دل بھی چاہتا ہے اس وقت ڈاکٹر غیور کی نگاہوں کے سامنے بھی ایک ایسا ہی چہرہ تھا جس کا ہر نقش اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا انہوں نے بے اختیار سبحان اللہ کہا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''دیکھو نوجوان..... میں جانتا ہوں تم اس وقت پل صراط پر ہو لیکن تم جیسے پڑھے لکھے بندے سے وہ باتیں بالکل اچھی نہیں لگیں گی جن کا کوئی سر پیر نہیں ہوتا۔

دیکھو ڈاکٹرز کو اپنے تجربے کا امتحان تو دینا ہی ہوتا ہے لیکن اللہ کے سامنے بھی سرخرو ہونا پڑتا ہے۔ وہ کبھی اپنے پیشے سے ناانصافی نہیں کر سکتے۔''

''پلیز آپ کھل کر کہیں..... کیا کہنا چاہتے ہیں۔'' اس کے چہرے پر اضطراب ہی اضطراب تھا اور آنکھوں میں الجھن۔

''میں نے بالکل کھل کر کہا کہ اب ہمارے پیشنٹ کو دعاؤں کی ضرورت ہے۔ کوئی معجزہ ہی انہیں زندگی کی طرف لا سکتا ہے کیونکہ.....'' ڈاکٹر غیور نے ذرا سا توقف کیا تو عاشر کی سانس حلق میں اٹک گئی۔

''کیونکہ.....'' اس نے سسکی سی بھری۔

''ان کی Brain death ہو چکی ہے..... وہ کوما میں چلے گئے ہیں جب تک زندگی ان کے اندر سانس لے رہی ہے ہم اپنی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ وہ.....''

ڈاکٹر غیور کے چہرے پر سنجیدگی اور آنکھوں میں سفاکی کی حد تک سچ تھا۔ اور یہ ان کے پیشے کا تقاضا تھا کہ وہ اس موڑ پر عاشر کو تمام صورتحال سے آگاہ کر دیتے کیونکہ طارق محمود کی حالت ایسی نہیں تھی کہ اس پر طفل تسلیاں دے کر اپنی قابلیت اور مہارت کا رعب جھاڑا جائے۔

پانچ گھنٹے کے طویل آپریشن کے بعد ان کے سر کے زخموں کو تو سی دیا گیا تھا لیکن اسی دوران یہ

بھی انکشاف ہوا تھا کہ دماغ کو لگنے والی چوٹ معمولی نہیں بہت گہری ہے۔ عموماً ایسے مریض زندہ نہیں بچ پاتے یا پھر کوما کی کیفیت میں چلے جاتے ہیں۔ ان کی سانسیں تو گنتی شمار کر رہی ہوتی ہیں مگر ان کے اعصاب مر چکے ہوتے ہیں۔

عاشر نے اس سفاک سچ کو بے دردی سے جھٹلا دیا تھا۔

''نہیں ایسا نہیں ہو سکتا آپ کو اندازہ نہیں ہم سب ان کے لیے کتنی دعائیں مانگ رہے ہیں۔''

''بالکل ایسا ہی ہونا چاہیے میں نے کہا نا اس وقت دعاؤں کی طاقت نے ہی انہیں تھام رکھا ہے۔ پتا ہے جوان میڈیکل سائنس کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائے۔ یہ جو ہمارا ایمان ہے نا اس بات پر کہ کوئی طاقتور ہستی ہے جس کے پاس ہماری زندگی اور موت کے فیصلے ہیں اور اس کے پاس رحمتوں کا بیش بہا خزانہ ہے وہ کبھی بھی کسی بھی لمحے نواز سکتا ہے بس اس یقین کے سہارے تم اپنے بابا کے لیے دعا کرو اللہ انہیں تندرست کرے دعاؤں سے تو تقدیر بدلی جا سکتی ہے۔''

وہ خود بھی پریشان تھے عاشر کے سفید پڑتے چہرے کو دیکھ کر یہ ان کی زندگی کا پیچیدہ ترین کیس تھا جہاں انہیں پیشنٹ اور اس کے گھر والوں دونوں سے انسیت ہو گئی تھی۔

''ڈاکٹر صاحب..... کیا میڈیکل سائنس میں اس کوما کا کوئی علاج نہیں۔''

''علاج کیوں نہیں..... بالکل ہے..... میں نے کہا نا صبر اور دعائیں..... پھر ان شاء اللہ ہماری تمام دوائیں تیز اثر کریں گی۔''

وہ ڈاکٹر کم اسکالر زیادہ تھے۔ عاشر کو الجھن سی ہونے لگی وہ چاہ رہا تھا ڈاکٹر غیور بس مختصر سا پیغام دیں اور کہیں کہ ہاں! وہ بالکل ٹھیک ہیں۔

''مجھے الجھن ہو رہی ہے آپ کی باتوں پر.....'' وہ الجھ ہی تو پڑا۔

''آپ مجھے بتائیے بابا کب تک ری کور کر جائیں گے۔'' اس کے چہرے پر پچکانہ سی ضد تھی۔

ڈاکٹر غیور کے چہرے پر مدہم سی مسکراہٹ آ کر غائب ہو گئی۔

''حوصلہ رکھو عاشر میں نے کہا نا ہمارا ٹریٹمنٹ ابھی سے شروع ہو چکا ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی نہیں چاہتا ان کی اس نیند کا دورانیہ طویل ہو ان شاء اللہ وہ جلدی بلکہ بہت جلدی ٹھیک ہو جائیں گے۔''

انہوں نے بڑے یقین کے ساتھ کہا تو عاشر کی نظریں آئی سی یو کے شیشے کے اس پار چلی گئیں۔ جہاں اس کے ساتھ زندگی کا پہلا قدم اٹھانے والا اس کا ہاتھ تھام کر اسے چلنا سکھانے والا بے حس و حرکت پڑا تھا اور وہ آج ان کے لیے کچھ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔

آج وہ انہیں اتنا بھی نہیں بتا پا رہا تھا کہ وہ ان کے بغیر کتنا ادھورا اور کتنا اکیلا ہے۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے چلتا ہوا آئی سی یو کے شیشے کے بالکل نزدیک آ گیا اور سر ٹھنڈی یخ دیوار پر ٹکا کر اندر کے بے جان منظر میں زندگی ڈھونڈنے لگا۔ مگر وہاں سوائے مشینوں کی ٹک ٹک کے زندگی کے آثار کہیں نہ تھے۔ اس کی آنکھوں میں ڈھیر سارا پانی جمع ہونے لگا۔

ڈاکٹر نے ایک بار پھر اس کے کندھے تھپتھپائے اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے

☆.....☆.....☆

شمائلہ کمال کبھی خولہ کو دیکھتی تو کبھی کشمالہ کو..... اسے حیرانی سے زیادہ یہ تجسس مارے جا رہا تھا کہ ان میں سے کشمالہ کون ہے خولہ کون ہے اس نے ایک دفعہ عاشر کے منہ سے یہ نام سنا تھا۔

''طارق کو ہوش آیا یا نہیں ڈاکٹرز نے عاشر کو اندر کیوں بلایا ہے۔''

وہ خولہ کے پاس چلی آئیں کیوں کہ کشمالہ کے چہرے پر اتنی واضح بے گانگی اور تنفر سا تھا کہ اس کی ہمت ہی نہیں ہوئی بات کرنے کی۔

''دیکھیں..... ہمیں خود کچھ نہیں پتا کہ پاپا کو ہوش آیا ہے یا نہیں آپ پلیز ہمیں ڈسٹرب نہ کریں۔''

بے نیازی اور اجنبیت تو خولہ کے انداز میں بھی تھی۔ لیکن قدرے تہذیب کے دائرے میں اور

ایسے میں کشمالہ نے خود کو ضبط کے گہرے سمندر میں اتارا ہوا تھا۔ ورنہ اس کا بس نہیں چل رہا تھا وہ اس عورت کو جسے بدقسمتی سے عاشر کی ماں کہا جاتا تھا اس کوریڈور سے دھکے دے کر باہر نکال دے۔

عاشر اور راجہ طارق محمود کی زندگی کے ہر کرب اور ہر تکلیف کی ذمہ دار یہ عورت تھی وہ اس سے بات کرنا تو درکنار شکل دیکھنے کی بھی روادار نہیں تھی۔ اسے وہ لہجہ اور انداز اب تک یاد تھا جب فون پر بات ہوئی تھی اور اس وقت بھی شمائلہ کمال کے انداز میں بدگمانی کے سوا کچھ نہ تھا۔

''دیکھو میں اپنے بیٹے سے بات کیے بغیر تو نہیں جاؤں گی۔ وہ اس وقت اتنا پریشان ہے میں اسے اکیلا تو نہیں چھوڑ سکتی۔'' خولہ نے اسے نظر انداز کر کے باہر کا راستہ دکھایا تو وہ جلدی سے اس کے ساتھ ہولی۔

''مجھے اندر جانا ہے۔''

''دیکھیں محترمہ آپ اپنے بیٹے سے ہمدردی کرنے کے لیے کسی اور وقت آیئے گا۔ اس وقت ہم لوگ بہت پریشان ہیں عاشر نے آپ سے بات کرنی ہوگی تو خود آجائے گا ابھی آپ اسے پریشان نہ کریں۔''

کاشف کو حالات کی گہرائی کا اندازہ تو ہو چلا تھا۔ مگر وہ کوئی قیاس آرائی نہیں کر سکتا تھا اس کے لیے تو یہ ہی انکشاف تھا کے شمائلہ کمال جسے وہ دیگر کئی حوالوں سے جانتا اور پہچانتا تھا وہ اس خاندان کا حصہ ہے وہی عاشر کی ماں اور نانو کی اکلوتی بیٹی ہے۔

اسے اتنے مہینوں میں پتا ہی نہیں چل سکا تھا کہ عاشر کے اندر ایک مضطرب سا بچہ کیوں روتے ہوئے نظر آتا ہے اور وہ بھلا کیسے سوچ سکتا تھا کہ نانو جیسی پاکیزہ اور شریف النفس عورت کی بیٹی کا نام وویمن ٹریفکنگ جیسے گھناؤنے جرم کرنے والے گروہ کے ساتھ بھی منظر عام پر آچکا ہے۔

اس کا ذہن جس حقیقت کو قبول نہیں کر رہا تھا وہ حقیقت بڑے اعتماد اور اپنے مخصوص انداز میں اب اس کے سامنے کھڑی اس کا تعارف چاہ رہی تھی۔

''میں کاشف کیانی ہوں عاشر کا دوست۔''

''اوہ..... یہ اماں نے کیا یتیم خانہ کھولا ہوا ہے۔''

یہ شمائلہ کمال کی زندگی کے بدترین لمحوں میں سے ایک لمحہ تھا جب اس کے منہ سے یہ جملہ نکلا تھا کیونکہ کاشف اور کشمالہ بیک وقت اس کی جانب پلٹے تھے اور دونوں کی نگاہوں میں جسم و جاں کو بھسم کر دینے والی نفرت محسوس کر کے شمائلہ کے اندر سرد سی لہر دوڑ گئی تھی۔

''محترمہ اگر آپ میرے دوست کی ماں..... نام نہاد ہی سہی نہ ہوتیں تو میں اس وقت آپ کو بتاتا کہ یتیم خانہ کس نے کھولا ہے اس یتیم خانے کا آخری مہمان کون ہے۔ لیکن نہیں آپ کو تو پاگل خانے میں ہونا چاہیے۔

آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے میرا باپ فارن منسٹری کے تھنک ٹینک کا اہم رکن ہے۔ آج کل برٹش قونصلیٹ میں ہوتا ہے نام اس لیے نہیں بتاؤں گا کہ میں آپ کے کاروبار سے واقف ہوں۔ جانتا ہوں آپ جیسے چھوٹے لوگوں کو بڑے ناموں کے ساتھ جڑنے کا ان سے دوستیاں کر کے اپنے کام نکلوانے کا شوق ہوتا ہے۔''

اس یخ بستہ ماحول میں کاشف کی بھاری اور سرد آواز شمائلہ کے الکوحل کے عادی جسم پر لرشہ سا طاری کر گئی تھی۔

اس نے بہت خوفناک آواز میں کہا تھا ''میں آپ کے کاروبار سے واقف ہوں۔''

اس وقت اسے بڑی شدت سے سکون آور سگریٹ کی طلب ہوئی تھی اور منیر کمال کی بھی یاد آئی تھی۔

''کیا بکواس ہے..... تمہیں تمہارے باپ نے تمیز نہیں سکھائی۔'' وہ کمزور سی آواز میں بولی لیکن اس کا جملہ کاشف کیانی کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔

''میرے باپ نے مجھے یہ بھی سکھایا ہے کہ آپ جیسے لوگوں سے کیسے نبٹا جاتا ہے۔'' اس نے

استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہتے ہوئے شمائلہ کا سرتاپا جائزہ لیا جو معمول کے ناپسندیدہ سے حلیے میں اس جگہ بہت ہی ناقابلِ برداشت لگ رہی تھی۔

کشمالہ پاس کھڑی حیرت سے کبھی کاشف اور کبھی شمائلہ کو دیکھنے لگی۔

اس نے کاشف کا اتنا خطرناک لہجہ اور لال بھبھوکا چہرہ پہلی بار دیکھا تھا۔ ورنہ وہ عموماً مسکراتا ہی رہتا تھا یا پھر اسے لطیفے سوجھتے رہتے تھے۔

اس کی شخصیت کا یہ روپ اور نیا تعارف تو پہلی بار سامنے آیا تھا۔

اس نے لمحوں میں شمائلہ کمال کے چہرے پر بے بسی کی سیاہی پھیر دی تھی۔

''اوہ جسٹ شٹ اپ.....'' وہ اسے ایک طرف دھکیل کر اندر کی طرف بڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔ جس پر کشمالہ نے اس کا رستہ روک لیا۔

''آپ اندر نہیں جا سکتیں عاشر اس وقت آپ سے بات نہیں کرنا چاہتا۔''

''تم کون ہوتی ہو مجھے عاشر کے پاس جانے سے روکنے والی۔''

''بولو..... کون ہو تم..... طارق کی لے پالک..... ارے جو شخص اپنی اولاد کے ہوتے ہوئے دوسروں کی بیٹیاں پالتا پھرے..... اسے تم لوگ کیا کہو گے..... شریف یا پھر.....''

شمائلہ کمال کی زبان کو بریک لگ گئے تھے کیونکہ اچانک ہی عاشر دروازہ کھول کر سامنے آ گیا تھا۔

اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ شاید اس نے اپنی ماں کے مہذب انداز سے نقاب اترتے دیکھ لی تھی۔ لہجے کی شیرینی میں گھلتا زہر سن بھی لیا تھا۔

وہ شرمندہ تو تھا ہی لیکن اس لمحے نفرت کی شدید لہر اپنے اندر محسوس کر کے ٹوٹ بھی گیا۔

''کاش..... میں آپ کا بیٹا نہ ہوتا تب آپ کو اس پبلک پلیس پر تماشا کرنے کا حق بھی نہیں ہوتا کاش آپ کا میرا کوئی رشتہ نہ ہوتا تو میں اس وقت.....''

شدت ضبط سے اس کی آواز بھرا گئی۔ کاشف نے اسے تھام لیا۔

''ہم آپ سے الگ تو نہیں ہیں ناں..... آپ بتایئے ڈاکٹر نے کیوں میٹنگ کی ہے اس وقت پاپا کو ہوش نہیں آیا..... کیا پھر کوئی سرجری.....''

وہ اپنے نرم لہجے کی پھوار سے بڑی حد تک اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اس وقت جو محبت اور استحقاق ہلکورے لے رہا تھا۔ وہ شمائلہ کے تن بدن میں شرارے بھر گیا تھا۔

''اوہ تو یہ چکر ہے اس عورت کی وجہ سے میرا بیٹا میرے ہاتھ کبھی نہیں آئے گا۔''

اس کی زہریلی سوچ نے پھن پھیلائے تو نفرت چہرے پر بھی آ گئی لیکن حیرت انگیز بات تو یہ تھی کہ اس کوریڈور میں کوئی بھی ملک کی مایہ ناز فنکارہ بین الاقوامی شہرت یافتہ کلاسیکل رقاصہ کو نہیں پہچان رہا تھا۔ اور جن کے درمیان وہ اس وقت کھڑی تھی وہ لوگ اسے جانتے پہچانتے تو تھے مگر اپنے اس تعلق پر شرمندہ اور ملال کا شکار تھے۔

''عاشر..... میرے.....''

''اوہ جسٹ شٹ اپ..... اینڈ پلیز گو..... لیو می الون.....''

وہ چیخ ہی تو پڑا تھا بہت سارے لوگ متوجہ ہونے لگے تھے۔

''عاشر..... کیا بچکانہ پن ہے ہم اس وقت ہسپتال میں ہیں۔''

کاشف اسے آئی سی یو ایریا سے باہر لے آیا کشمالہ اور خولہ ان کے ساتھ تھیں۔

شمائلہ کو ذلت سہنے کی عادت تو تھی۔ مگر اس طرح بے توقیر ہونے میں بڑا فرق تھا اس کا تفاخر اور اپنی ماں ہونے کا غرور لمحوں میں ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔

وہ حیران نگاہوں سے اپنے چوڑے شانوں والے بیٹے کو تک رہی تھی۔

جو کاشف، کشمالہ اور خولہ کے ساتھ کوریڈور کے آخری سرے سے اوجھل ہو گیا تھا۔ اسے اپنے

قدم بے جان محسوس ہو رہے تھے۔

اسے خود بھی حیرت ہو رہی تھی کہ آج اس کا قد آور بیٹا اس کے ساتھ نہیں تھا تو وہ اتنا دکھی کیوں ہو رہی ہے جب اس کا ننھا سا روپ آنکھوں میں ڈھیر سارے آنسو بھر کر اسے روک رہا ہوتا تھا تو وہ اسے رسمی سا بوسہ دے کر آیا کو آواز دیتی تھی۔

پھر پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھتی تھی اس وقت وہ اس ذمہ داری سے بھاگ رہی ہوتی تھی کیونکہ کیوں کہ آگے زندگی بلا رہی ہوتی تھی۔ اور آج وہ ذمہ داری جب اس کے اندر زندگی بن کر دوڑنے لگی تھی تو وقت کی بساط پر مہرے اپنی چال بدل گئے تھے۔

وہ چپکے سے دروازہ کھول کر آئی سی یو کے اندرونی حصے میں چلی گئی جہاں سے گلاس ڈور کے سامنے والا منظر واضح نظر آ رہا تھا۔

راجہ طارق محمود..... اس کا اولین خواب.....

وہ خواب آج بھی باقی تھا مگر کرچیوں کی صورت میں کبھی آنکھوں میں چبھنے لگتے کبھی پورے جسم کو لہولہان کر دیتے۔

☆.....☆.....☆

طارق ہمیں زندگی ایک بات ملتی ہے ناں..... پھر ہمیں اس کو اپنے انداز سے جینے کا حق کیوں نہیں۔

پی سی بھور بن کی طویل محرابی کھڑکی میں کھڑے ہو کر اس نے اپنے برابر میں پورے قد سے ایستادہ طارق محمود کی ہر خوبی سے نظریں چرا کر بڑے دھڑلے سے کہا تھا۔ تب انہوں نے سرمئی شال اپنے گرد اچھی طرح لپیٹتے ہوئے اس پر ایک حیران اور پُر تاسف نگاہ ڈالی تھی۔

''شمائلہ..... زندگی اپنے انداز سے جینا کس کو کہتے ہیں۔''

وہ سرخ رنگ کی جرسی سیاہ ٹراؤزر اور گولڈن کلر کی پشمینہ کو شانے پر ڈالے اردگرد کے ماحول سے

بے گانہ نظر آ رہی تھی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے فطرت کے حسین نظاروں کا سلسلہ تھا لیکن آج وہ ان سے مکمل بے نیاز نظر آ رہی تھی۔ جبکہ یہ وہی جگہ تھی جہاں انہوں نے نئی زندگی کے اولین پل محبت کی گرم جوشی اور قربت کی مہک میں سرشار ہو کر گزارے تھے۔ لیکن اب یہاں صرف یخ بستہ ہوائیں چل رہی تھیں جن کا احساس طارق کے رگ و پے میں درد بن کر اتر رہا تھا۔

''دیکھو نا طارق ہم جب پہلی بار یہاں آئے تھے تو بہت خوش تھے لیکن آج..... وہ دانستہ چپ ہو گئی۔''

''میں آج بھی تمہارے ساتھ یہاں خوش ہونا چاہتا ہوں۔ تمہارے ساتھ ان اولین دنوں کی یادیں شیئر کر کے ہنسنا چاہتا ہوں۔'' انہوں نے بڑے غیر محسوس طریقے سے اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے کر خود سے قریب کیا مگر وہ کسمسا کر پرے ہو گئی۔

''طارق اب ان باتوں میں کوئی چارم نہیں میں آگے بڑھنا چاہتی ہوں اپنا کیریئر بنانا چاہتی ہوں مجھے اپنا نام اور اپنی شناخت بنانی ہے۔ لیکن تمہارے نزدیک یہ ساری باتیں لغو ہیں تم شاید اس بات سے خوفزدہ ہو کہ ایک دن میرے نام سے پہچانے جاؤ گے۔''

وہ ہمیشہ اتنی ہی بے سروپا باتیں کرتی تھی جن کی طارق کے نزدیک لفظوں سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں ہوتی تھی اور ان باتوں پر اس کا لاجواب ہونا فطری تھا کیونکہ یہاں آ کر انہیں لگتا تھا۔ یہ جو لڑکی ان کے سامنے ہے وہ ایک غلط انتخاب تھا۔

''جب لوگ تمہیں میرے نام سے پکارتے ہیں۔ تو تمہیں برا لگتا ہے۔'' طارق محمود نے دکھ سے پوچھا تو وہ مسکرا دی۔

''لیکن شمائلہ کی اپنی بھی تو کوئی ہستی ہے نا لوگ اس کو کیوں بھول جاتے ہیں۔''

''اچھا چلو اب میں سب کو منع کر دوں گا تمہیں مسز شمائلہ نہ کہیں بلکہ مس شمائلہ کہا کریں۔'' انہوں نے ماحول کو ہلکا پھلکا کرنے کی کوشش کی وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس سیر کا مقصد ان بے سروپا باتوں سے ختم ہو جائے۔

شمائلہ کے لاہور وزٹ کے بعد شمائلہ کو اس کے میکے میں کسی نے قبول نہیں کیا تھا۔ ماں اور باپ نے دروازے بند کر طارق کو بھی تنبیہہ کی تھی اگر اس نے شمائلہ کو شہ دی اور ایک غلط کام کے لیے اس کی سفارش کی تو اس کے لیے بھی اس گھر کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گے۔

''اور ہاں.....'' انہوں نے عاشر کا ہاتھ تھام کر پکارا تھا۔

''بھول جاؤ کے تم دونوں نے کسی اولاد کو جنم دیا تھا۔ میں نہیں چاہتی کہ یہ تم دونوں کے درمیان سسک سسک کر جیے اور زندگی بھر احساس کمتری سے اس کا سر جھکا رہے کہ میں اپنے ماں باپ کا ان چاہا بچہ تھا۔ کیا کہتے ہو تم لوگ اس کو ان وانٹڈ چائلڈ..... میں اسے ایسا نہیں بننے دوں گی۔''

وہ عاشر کی ڈبڈبائی آنکھوں کو نظر انداز کر کے کھینچ کر اندر لے گئی تھیں تب راجہ طارق محمود تھکے تھکے قدموں سے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

انہوں نے اس لمحے سوچ لیا تھا وہ شمائلہ کے ساتھ ہر صورت سمجھوتہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ اسے خوشی دینے کی کوشش کریں گے۔ اسے خوشی دینے کی کوشش کریں گے اس کی وہ ساری خواہشیں پوری کریں گے جن کی چاہ میں وہ سراب کی طرف نکل گئی تھی۔

اسی سلسلے کی ایک کڑی یہ بھوربن کا ٹرپ تھا۔ دونوں تنہا ان مرغزاروں میں گھوم پھر رہے تھے اور ان کے جذبات پر بھی اوس جم چکی تھی۔

شمائلہ ہر بات میں بدمزگی کا کوئی نی کوئی پہلو نکال کر بحث شروع کر دیتی اور راجہ طارق محمود بات کو بڑھاوا دینے کے بجائے خاموشی سے اس جھگڑے کو سمیٹنے کی کوشش کرتے۔

''شمائلہ تم پہلے تو ایسی نہ تھی.....''

''کیوں اب کیا ہو گیا ہے مجھے۔''

وہ تنک کر بولی تو راجہ طارق محمود کے چہرے پر مسکراہٹ سی بکھر گئی دل چاہا اسے یاد دلائیں کہ

تمہاری دیوانگی میں بھلا کیسے بھول سکتا ہوں ایک دن اگر تمہیں شکل نہ دکھاتا تھا تو تم اپنے کمرے کی ساری چیزیں توڑ پھوڑ کر اپنے ہاتھ لہولہان کر بیٹھتی تھیں اور میں اس لمحے خود کو کتنا معتبر اور خوش قسمت سمجھتا تھا یہ نہیں پتا تھا یہ جنون اور دیوانگی تو لمحوں کا کھیل ہے۔

''شمائلہ! آؤ وہاں سے زندگی شروع کرتے ہیں جہاں سے سلسلہ ٹوٹا تھا۔''

انہوں نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''میرے ساتھ انڈیا چلو گے..... پتا ہے سب سے بڑا کلچرل شو ہونے والا ہے ساری دنیا سے ڈیلی گیشن لے آئیں گے منیر نے میرا نام وہاں بھیجا ہے اور دیکھو میں سلیکٹ بھی ہو گئی۔ ان کی سلیکشن کمیٹی کو میرا کام اور میرے اسٹیپس بہت پسند آتے ہیں۔''

وہ اتنی ایکسائیٹڈ ہو کر بتا رہی تھی جیسے اس کا نام پی ایچ ڈی کے مقابلے کے لیے ہاورڈ یونیورسٹی میں سلیکٹ ہو گیا ہو۔

طارق محمود کا دل چاہا خود کو گولی مار دیں یا اپنے سامنے کھڑے اس حسین وجود کو قتل کر دیں جس کے پاگل پن نے ان کی زندگی کو عجیب سے دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔

''تم اب کہیں نہیں جاؤ گی میرے بغیر.....'' وہ اچانک ہی بھپر اٹھے تھے ان کے چہرے پر اذیت بھی تھی اور وحشت بھی۔

''کیوں طارق کیوں نہیں جاؤں گی میری بات ہو چکی ہے منیر سے میں اس وقت تو اسے انکار نہیں کر سکتی۔''

اس نے ہٹ دھرمی سے کہا تو اسی محرابی دروازے میں کھڑے کھڑے طارق محمود کا ہاتھ اس پر اٹھ گیا۔ اور وہ زناٹے دار تھپڑ کھا کر گھومتے سر کے ساتھ اندر کمرے کی طرف بھاگی۔

''طارق.....تم نے مجھے مارا۔''

اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا اینٹک پیس اٹھالیا..... تم نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا مجھے پیٹا۔ وہ چیخ رہی تھی چلا رہی تھی اس کی آنکھیں شرارے اگل رہی تھیں اس سے پہلے کہ وہ اینٹک پیس طارق محمود کے ماتھے پر سوراخ بنا دیتا انہوں نے باقاعدہ جمپ لگا کر اس کو تھاما اور دونوں ہاتھ اپنے ایک ہی مضبوط ہاتھ میں جکڑ لیے۔

''یہ کیا حرکت ہے..... تم نے مجھے مجبور کیا کہ میں تم پر ہاتھ اٹھاؤں.....''

''تم مجھ سے وہ باتیں کر رہی ہو جو کوئی غیرت مند مرد برداشت نہیں کر سکتا۔ میں آج تک صرف اس لیے خاموش رہا تمہیں سمجھاتا رہا کہ شاید تم اس دنیا کی حقیقت جان کر پلٹ آؤ۔

شاید تمہیں میری محبت عاشر کا پیار روک لے مگر تم تو حد سے ہی بڑھ گئیں۔

تم جانتی ہو منیر کمال جیسے دو ٹکے کے مرد میرے آگے پیچھے کام کرتے ہیں۔''

''تم جیسے تنگ نظر مرد اور کیا کہہ سکتے ہیں۔ تمہاری سوچ بس یہیں پر ہی آ کر ختم ہو جاتی ہے طارق! دو اور دو چار کرنے والے تم جیسے بے حس انسان کو کیا پتا آرٹ کی قدر و قیمت کیا ہے تم کیا جانو روٹی کپڑا مکان سے آگے بھی انسان کی کوئی ضرورت ہوتی ہے۔'' وہ ان کی بات کاٹ کر بولی۔

وہ اب دوبدو مقابلے پر اتر آئی تھی۔

راجہ طارق محمود نے بمشکل کنٹرول کیا خود پر، دل چاہ رہا تھا اس کا سر دیوار سے مار کر اس کے دماغ کا سارا خناس نکال کر باہر کر دیں مگر وہ اتنی دھان پان سی تھی کہ کچھ بھی ہو سکتا تھا سو انہوں نے اپنا سر دیوار پر دے مارا تھا اور کمرے میں زوردار گونج پیدا ہوئی تھی۔

شمائلہ نے سراسیمگی کے عالم میں انہیں دیکھا اسے طارق محمود کے اتنے سخت ردعمل کی توقع نہیں تھی جب دوسری بار انہوں نے اپنا سر دیوار پر پوری قوت سے ٹکرایا تو وہ تیزی سے آگے بڑھی اب اس کی باری تھی انہیں سنبھالنے کی۔

''طارق..... یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ میں نے کوئی ایسی غلط بات تو نہیں کہی آپ پلیز سنبھالیں خود کو۔'' وہ ان کا سر مسلتے ہوئے بھی ہٹ دھرمی پر قائم تھی طارق محمود کے سینے

سے درد کی ایک تیز لہر سی اٹھی اور ان کا پورا وجود درد کی لہروں سے بھر گیا۔

سر سے تو ٹیسیں اٹھ ہی رہی تھیں لیکن سرخ آنکھوں سے بے ساختہ بہہ نکلنے والا پانی شمائلہ کو پریشان کر گیا

وہ تو اپنے ایسے کئی روپ دکھاتی تھی مگر اس نے طارق محمود کا یہ ردعمل پہلی بار دیکھا تھا اس نے فوراً روم سروس کال کر کے چائے اور پین کلر منگوائی اور انہیں پلائی پلا کر کشن کے سہارے صوفے پر ہی لیٹنے کی تلقین کی۔

''طارق مجھے آپ سے اتنی جذباتیت کی توقع نہیں تھی۔'' اس کے لہجے میں دنیا بھر کی نرمی تھی طارق محمود ایک گہری سانس لے کر آنکھ موند کو سکون کے کسی پل کو آواز دینے لگے۔

''اگر میں اس شخص..... منیر کمال کو گولی مار دوں..... تو میری زندگی میں سکون آ جائے گا۔'' ان کی سوچ اس ایک نکتے پر آ کر ٹھہر گئی تھی۔

شمائلہ آئینے کے سامنے کھڑی اپنا حلیہ اور بال درست کرنے میں مگن تھی، طارق آپ کو درد تو نہیں ہو رہا۔

اس نے آئینے میں طارق کا عکس دیکھ کر بڑے ناز سے استفسار کیا تھا۔

''شمائلہ کوئی اور بات کرو۔''

''طارق واپس چلیں..... یہاں اس بار مزا نہیں آ رہا..... شاید سردی بہت ہے نا۔''

وہ اس لمحے کوئی اور ہی شمائلہ تھی تابعدار، دمساز..... دلرباسی بیوی کے روپ میں انہیں دیکھ رہی تھی۔

''میں ریلیکس کرنے آیا تھا یہاں پر..... ابھی میری تھکن نہیں اتری مالا!'' ان کا لہجہ بھی نرم ہو چلا تھا۔

''چلیں یہ ٹھیک ہے..... میں ایک دن اور دے رہی ہوں آپ کو..... لیکن پلیز آپ یہ سفید کمبل مت اوڑھ کر لیٹیے گا مجھے وحشت سی ہوتی ہے۔'' جیسے ہی انہوں نے سفید خرگوش جیسے نرم و ملائم کمبل کی طرف ہاتھ بڑھائے وہ سرعت سے پلٹ کر ان کے پاس آ گئی۔ اور سفید کمبل اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔

''اب سفید کمبل سے کیا دشمنی ہے۔'' وہ مسکرا دیئے تھے ان کی کمزوری جانتے تھے اسے پہننے اوڑھنے والی ہر سفید چیز کفن لگتی تھی اور یہ خیالات بچپن کی کسی یاد کے ساتھ پل کر جوان ہوئے تھے۔

''مجھے سردی لگ رہی ہے سر میں بھی درد ہو رہا ہے اب کیا کروں۔'' وہ اسے منتظر نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

''صبر کریں ابھی روم سرونٹ آتا ہے چائے لے کر۔''

اس نے چادر درست کی کمرے کی حالت کو بہتر کیا اور مسکراتے ہوئے ان کے قریب ہی نیم دراز ہو گئی۔

انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ تھوڑی دیر پہلے والی شمائلہ تھی جس نے چیخ چیخ کر کمرہ سر پر اٹھا لیا تھا مگر وہ ایسی ہی تھی دھوپ چھاؤں کا کھیل کھیلنے والی۔

راجہ طارق محمود نے اسے خود سے قریب کر کے اس کے ملائم بالوں میں اپنا بایاں ہاتھ پھنسا لیا تھا اور دائیں ہاتھ سے اپنا ہیج سر دبانے لگے تھے۔

وہ اس سے پیار کرتے تھے اسے اپنی زندگی مانتے تھے اسے کھونا نہیں چاہتے تھے اس لیے مانتے چلے جاتے تھے..... اور پھر مانتے ہی گئے..... یہاں تک کہ اپنی زندگی بھی دان کر دی مگر وہ خوش نہیں تھی خوش ہوتی بھی کیسے۔

طارق محمود اس کی آنکھوں کے سامنے سر تا پیر سفید چادر میں لپٹے ہوئے تھے ان کے ارد گرد ہر چیز سفید تھی۔

کمرے کی دیواریں، بیڈ، بیڈ شیٹ، مشینیں..... ہر چیز کا رنگ سفید تھا۔ اس کی بے اختیار چیخ نکل گئی وہ وہیں شیشے کے ساتھ بیٹھتی چلی گئی۔

طارق یہ سفید چادر ہٹاؤ اپنے اوپر سے..... تم نہیں مر سکتے۔

☆.....☆.....☆

اعجاز الدین نئے سرے سے گھر کی آرائش اور سجاوٹ کرنا چاہتا تھا اس کا یہ گھر بہت خوبصورت لوکیشن اور آرٹسٹک اسٹائل کا تھا مگر اس کی ہنگامہ مزاجی کے باعث بے ترتیبی نے نقشہ ہی بگاڑ دیا تھا۔

یوں لگتا تھا جیسے مہینوں کسی نے صفائی نہ کی ہو مریم تو پورے گھر کا جائزہ لینے کے بعد ڈسٹ الرجی کے باعث چھینک چھینک کر بے حال ہو گئی تھی۔

اعجاز الدین کو اس کی تکلیف نے شرمندہ تو کیا ہی تھا مگر ایک نئے خیال کا سرا بھی ہاتھ میں تھما دیا تھا۔

زندگی میں روپے پیسے کی محتاجی خواہش کے آگے بند باندھتی ہے مگر اس کے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا اس کی فون کال پر انٹیریئر ڈیکوریٹر حاضر تھا۔

"یہ لو سسٹر بند حاضر ہے اور گھر تمہارے سامنے ہے بولو کیا کرنا ہے بس میرا کمرہ ذرا اچھا سا سجا دو..... پھر طارق صاحب کو رکنے کی دعوت دوں گا باقی تم جو چاہے کرو..... یہ تمہارا گھر ہے۔ اپنا کمرہ سجاؤ میری بھانجیوں کے کمرے سیٹ کرواؤ اور ہاں یہ ڈرائنگ روم دیسی اسٹائل میں ڈیکوریٹ ہونا چاہیے۔ چاندنیاں..... گاؤ تکیے..... کشن..... سب ورائٹی منگواؤ....." وہ بہت مسرور اور بے چین نظر آ رہا تھا مریم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اپنا گھر بنانے اور سجانے کی خواہش ہر عورت کے اندر ہوتی ہے وہ بھی تو اسی آرزو کی تکمیل کے لیے منیر کمال سے احتجاج کرتی تھی لیکن انجام..... نہ گھر رہا اور نہ تحفظ کا احساس..... اگر اعجاز الدین نہ ملتا تو۔

اس نے ایک مشکور سی نگاہ اس پر ڈالی اور اس کے شوق کو مزید ہوا دینے کے لیے انٹیریئر ڈیکوریٹر کی بکس کے صفحے پلٹنے لگی۔ اسے تو سب کچھ اچھا لگ رہا تھا اب جبکہ انتخاب کا مرحلہ آیا اس نے مدد طلب نظروں سے اعجاز الدین کو دیکھا۔

"نہ بابا..... ہم تو رنگوں کے معاملے میں کورے ہیں..... یہ تمہارا ڈیپارٹمنٹ ہے جو دل چاہے کرو۔"

دل تو بہت کچھ چاہ رہا تھا مگر اعتماد نہیں تھا کہ وہ خود سے فیصلہ کرتی اور اسی کشمکش میں راجہ طارق

محمود مختلف فوڈز کے ٹن پیکس لے کر اندر داخل ہوئے تو اس نے گہری سانس لے کر ان کا بڑی مسرت سے استقبال کیا۔

"ارے میں آپ کو ہی سوچ رہی تھی کتنا اچھا ہوا آپ آ گئے۔

یہ صاحب آئے بیٹھے ہیں نا مجھے نہ ان کی زبان آتی ہے اور نہ ان چیزوں کی اتنی سمجھ ہے آپ پلیز ہیلپ کریں نا۔"

اس نے اعجاز الدین کی خواہشات کو ان کی سماعتوں میں منتقل کرتے ہوئے ملتجی انداز میں کہا تو وہ مسکرا دیے۔

دو دن پہلے وہ اس سے مل کر گئے تھے تب اس کے چہرے پر بمشکل سکون کے رنگ نظر آئے تھے مگر آج تو وہ باقاعدہ چمک رہی تھی اس کا مطلب یہ تھا کہ اسے اپنا گھر چھوڑنے کا کوئی ملال نہیں تھا۔

(یقیناً کچھ تو ایسا ہوگا جو وہ یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوئی) انہوں نے خود کو یقین دہانی کرائی اور اس کے ساتھ فرش پر بیٹھ کر ان ڈیزائن بکس کا جائزہ لینے لگے جو انٹیریئر ڈیکوریٹر اپنے ساتھ لے کر آیا تھا اور خود اس کی نظریں ان دو حسین پریوں پر جمی تھیں جو الگ رنگوں کے کاٹ میں لپٹی ہوئیں آنکھوں سے دنیا کو تسخیر کرنے کے جتن کر رہی تھیں۔

"واٹ آ بیوٹی....."

وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا جب طارق محمود نے اسے مخاطب کیا تھا۔

ان کی مخصوص بھاری آواز اور مکمل برطانوی لہجہ اتنا سحر انگیز تھا کہ مریم ہر طرف سے سماعتیں ہٹا کر ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔

اس نے پہلی دفعہ کسی مرد کو اتنا خوبصورت بولتے سنا اور دیکھا تھا وہ محو نہ ہوتی تو کیا کرتی.....

اس کی انگریزی بالکل اچھی نہ تھی مگر اسے ان کی ہر بات سمجھ آ رہی تھی اعجاز الدین ان کے کمرے کی

کلر اسکیم برائٹ رکھنی ہے ڈرائنگ روم میں دو رنگوں کا امتزاج سیٹ کرنا ہے مریم کا کمرہ لائٹ کلر کا ہوگا۔

''جناب! آپ کا فیورٹ کلر کون سا ہے۔'' انہوں نے اچانک پلٹ کر پوچھا تو وہ سٹپٹا سی گئی شادی سے پہلے تو ہر پھول کا رنگ اچھا لگتا تھا شادی کے بعد تو اسے اپنی آنکھوں کے رنگ سمیت ہر رنگ سے چڑ ہو گئی تھی۔ وہ کچھ بھی پہن لیتی منیر کمال خوش ہونے کے بجائے برسنے لگتا۔

''ارے مت پہنا کر اس ماتمی صورت پر یہ رنگ.....''

وہ اس لمحے بالکل بھی ان تلخ لمحوں کی یاد سے ان خوبصورت پلوں کو بوجھل نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے سر جھٹک کر یکدم انہیں دیکھنے لگی۔

''ایسا کرتے ہیں مریم کے کمرے میں اسکائی بلیو کلر کے ساتھ ڈارک بلیو کا کمبی نیشن کرواتے ہیں.....کیا خیال ہے۔''

وہ گویا ان کی بات سمجھ کر مسکرا دیا۔

''گڈ آئیڈیا سر!''

''پنک کلر اچھا لگتا ہے مجھے۔'' اچانک ہی اس کے منہ سے نکلا تو وہ دونوں ہنس پڑے۔

''فکر نہیں کریں بیٹیوں کا کمرہ بھی تو ہے۔''

انہوں نے اتنے مان اور شفقت سے بیٹیوں کا کمرہ کہا تو مریم کے رگ و پے میں تشکر سا ہلکورے لینے لگا۔

''یہ شخص اس دنیا کا نہیں ہے۔''

اس نے سوچا اور چائے بنانے کچن کی طرف چل دی اب اسے اسی گھر میں رہنا تھا وہ اپنی ذمہ داریوں کو انجوائے کرنا چاہتی تھی اور اپنے محسن کو کوئی ایسی شکایت نہیں دینا چاہتی تھی جو اسے اپنے فیصلے پر پچھتانے کے لیے مجبور کرتی۔

''میری چائے میں شوگر بالکل نہیں.....'' انہوں نے آواز لگائی۔

''اور میری چائے میں دو اسپون.....''

یہ اعجاز الدین کی آواز تھی ڈھیر سارا کچن کا سامان گروسری، گوشت مسالے لیے وہ کسی جن کی طرح برآمد ہوا تھا۔ اس نے سارے پیکٹس کچن کاؤنٹر پر ڈھیر کر دیے۔

''تمہیں خالی فریج دیکھ کر غصہ آ رہا تھا نا اب اس کو بھرتے ہیں میں سب لے آیا۔''

وہ واقعی بہت کچھ الم غلم لے کر آیا تھا۔ مریم کو تو چند روایتی چیزوں کے علاوہ کسی نئے ذائقے سے منیر کمال نے آشنا نہیں کیا تھا اس لیے اس نے بغور ہر پیکٹ کا جائزہ لیا اور گوشت و سبزی الگ کر کے باقی سارے پیکٹس اعجاز الدین کے سامنے رکھ دیے۔

''میں ذرا چائے دے دوں پھر مجھے بتائیے گا یہ ہے کیا کیا۔''

اس کی بیٹیوں کو تو اتنا پیار اور اتنا مان شاید حقیقی رشتے بھی نہ دے پاتے کیوں کہ وہ سب اپنے اپنے بچوں میں الجھے ہوئے تھے۔ مریم دن میں پانچ بار اللہ کے حضور سر جھکاتی تو اس کی دعاؤں کا محور و مرکز اعجاز الدین ہوتا جس نے اسے جہنم سے نکال کر زندگی جینے کی راہ دکھائی تھی۔

وہ اپنی ہر نماز کیا ختتام پر منیر کمال کی ہدایت اور اعجاز الدین کے تحفظ کی دعا ضرور مانگتی۔

ایک ہفتے میں اعجاز الدین کے کاٹیج نما گھر کا نقشہ بدل گیا تھا اور مریم کو محسوس ہو رہا تھا وہ جہنم سے جنت میں آ گئی ہو۔

پورے گھر کی ڈیکوریشن جس میں سو فیصد طارق محمود کی پسند شامل تھی اتنی اعلیٰ اور دلکش تھی کہ ہر کمرے میں ٹھہرنے کو دل کرتا تھا۔

کاش گھر کا سکھ اسے منیر کمال نے دیا ہوتا۔ ذرا سی دیر کے لیے بھی ذہن ماضی کے دریچے کھولتا تو اس کے زخم تازہ ہو جاتے۔

''ہیلو.....میم..... چائے نہیں ملے گی۔'' وہ خالہ کا کاٹ ہلاتے ہوئے کسی تکلیف دہ یاد میں ہی گم تھی تب طارق محمود نے اس کے قریب آ کر چٹکی بجائی۔

''ارے آپ کب آئے..... اعجاز بھائی کہاں ہیں۔ بہت بے خبر انسان ہیں لاک کھلا چھوڑ کر نکل جاتے ہیں۔''

وہ فطرتاً باتونی تھی راجہ طارق محمود کے چہرے پف مدہم مسکراہٹ بکھر گئی۔

''ان فیکٹ میں اندر آیا وہ باہر نکل گیا کوئی کام یاد آ گیا ہوگا اور مجھے کیونکہ آج اپنی شہزادیوں کو دیکھنا تھا دو دن ہو گئے تھے ان سے ملے اس لیے صبر نہیں ہوا جلدی سے اندر آ گیا۔'' انہوں نے اسی کے انداز میں تفصیلی جواب دیا تو وہ ہنس پڑی۔

''میں نے تو ایسے ہی پوچھا تھا آپ تو خفا ہو گئے.....''

وہ کچن کہ طرف مڑ گئی۔

''اچھا جی..... وہ کیسے.....'' وہ کشمالہ کو لے کر کچن سے ملحق لاؤنج میں آ گئے۔

''آپ کے انداز سے لگ رہا ہے ورنہ آپ کہاں اتنا بولتے ہیں۔''

یہ پہلا تجزیہ تھا جو مریم نے بلا جھجک ان کے بارے میں بیان کر دیا تھا۔

''آپ کو بھی شوق ہے چہرے پڑھنے کا.....''

انہوں نے مالا سے کھیلتے ہوئے استفسار کیا۔

''ہر ایک چہرہ نہیں..... مگر کچھ چہرے حکایت سے بھرے ہوتے ہیں۔'' بڑا فلسفیانہ جواب تھا۔

انہیں لگا جیسے وہ خود سے باتیں کر رہے ہوں۔

سچ ہے جب دکھ سانجھے ہوں تو خیالات کا سلسلہ ایک دوسرے کے ذہن پر دستک دینے لگتا ہے۔

انہیں لگا رشتوں کی پامالی کا صدمہ سہنے والے دو نفوس نہ چاہتے ہوئے بھی ایک ہی جیسا سوچتے ہیں۔

''مریم! گھر یاد آتا ہے۔''

''نہیں..... وہ گھر ہوتا تو میں کیوں در بدر ہوتی۔ اس قفس سے رہائی میری سب سے بڑی خوش

بختی ہے۔'' اس نے چائے کی ٹرے سائیڈ ٹیبل پر رکھی ہلکے سبز رنگ کے سادہ سے لباس میں اس کا پُر خزن چہرہ کسی کھلی کتاب کی مانند تھا۔

اس کی آنکھوں، چہرے اور ہونٹوں پر کوئی مصنوعی رنگ نہیں تھا مگر پھر بھی اس کا ہر نقش کلام کرتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

''سنو..... مریم..... آپ نے اپنے لیے کوئی شاپنگ کی شہزادیوں کے کپڑے لے کر آیا یہ نالائق۔''

وہ اچانک ہی پوچھ بیٹھے اور مریم نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''اوکے..... جلدی سے تیار ہو جائیں۔ آج کچھ شاپنگ ہو جائے۔''

ان کے لہجے میں ان کی فطرت کے برخلاف عجلت تھی مریم نے حیرت سے دیکھا۔

''ارے نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ اعجاز بھائی لے آئیں گے۔''

''کیا مطلب اعجاز بھائی لے آئیں گے..... میں کیوں نہیں کروا سکتا شاپنگ اگر آپ مجھے اجنبی سمجھتی ہیں تو یہ ایک الگ بات ہے۔''

وہ خفا نظر آنے لگے چہرہ کشمالہ کے اوپر جھکا لیا وہ بھی ان کی چھیڑ چھاڑ پر خوب قلقاریاں مار رہی تھی۔

''یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ..... میں تو صرف منیر کی وجہ سے.....''

''ارے چھوڑیں..... منیر کو..... اس سے ڈر کر زندگی نہیں گزارنی۔''

آج انہوں نے تہیہ کر لیا تھا اسے ساتھ لے جانے کا۔

❁ ❁

ناول **خواب خواہش اور زندگی** ابھی جاری ہے۔ مزید واقعات اگلے صفحات میں پڑھیں۔

قسط نمبر 8

راحت بیگم آٹھ گھنٹے سے لاپتا تھیں وہ آٹھ گھنٹے مسکن کا سکھ تہہ و بالا کر گئے تھے۔ صوفیہ نے رو رو کر اپنا حال برا کر لیا تھا اور گھر کا ہر فرد انہیں ڈھونڈنے کی کوشش میں تھا۔ لیکن ان سے کہیں کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا نہ ہی ان کا سیل فون ریپلائی کر رہا تھا جب سب تھک ہار کر بیٹھے ان کو تلاش کرنے کی اگلی حکمت عملی پر غور کر رہے تھے تو ایک فون نے مسکن میں طوفان کے بعد کا سکوت طاری کر دیا تھا۔

راحت بیگم اغواء کاروں کے قبضے میں تھیں ابھی انہوں نے صرف ان کی سلامتی کی اطلاع دی تھی باقی کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا۔

بڑے ماموں نے ان کا فون سنا تھا انہوں نے خود اپنی خیریت کی اطلاع دی تھی اور پھر فون بند ہو گیا۔

صوفیہ بے ہوش ہو کر مامی کے گلے میں جھول گئی تھی۔ شجاع کی تو جان پر بن گئی تھی ایک طرف ماں جیسی پھوپھی کی پریشانی اور دوسری طرف صوفیہ کی یہ حالت۔

''چچی جان آپ اس کو تو سنبھالیں۔ میرے خیال میں ڈاکٹر کو کال کر لیں۔''

سب اس کے ارد گرد جمع ہو گئے تھے۔

وہ ڈاکٹر کو کال ملانے لگا انعم اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مار رہی تھی مگر وہ مسلسل بے ہوش تھی۔

حساس تو ویسے بھی تھی لیکن آج کل حساسیت کے ساتھ ڈپریشن کا بھی غلبہ تھا۔

کبھی اسے مسکن چھوڑ کر جانے پر پچھتاوا ہونے لگتا کبھی اسے ماں کی نافرمانی اذیت دینے لگتی اور کبھی سعدیہ کا غم ستانے لگتا۔

شجاع چونکہ اس کی رگ رگ سے واقف ہو چکا تھا اس لیے اس کی توجہ منقسم کرنے کے لیے ادھر ادھر کے قصے سناتا رہتا تھا۔

اور اب تو صورتحال ایسی ہوگئی تھی کہ اس کو بہلانے کا کوئی اہتمام نہیں ہوسکتا بلکہ وہ کیا گھر کا ہر فرد گہری سوچ میں غرق تھا اور سب کی سماعتیں غیر شعوری طور پر فون کی طرف لگی تھیں۔

پہلی بار فون بھی راحت بیگم کے موبائل سے کیا گیا تھا اور وہ بھی گھر کے نمبر پر.....اب سب کی نگاہیں ٹیلی فون اسٹینڈ کی طرف بھٹک رہی تھیں۔

☆.....☆.....☆

وہ رنگ و خوشبو کے بھ باک نظاروں کی محفل تھی جس میں شہر کے امرا اور رؤسا سب ہی مدعو تھے۔

سعدیہ نے اوپر کھڑے ہو کر حیران نگاہوں سے ہال کا جائزہ لیا تھا یہ سب لوگ کس اور فارغ ہیں اتنا لمبا سفر کر کے یہ بے ہودہ ڈانس دیکھنے آئے ہیں۔

اس نے گیلری نما روش پر چلتے ہوئے سوچا اسٹک کے سہارے اب وہ چل تو لیتی تھی مگر ایک پاؤں پر زور نہ دینے کی مشق نہ ہونے کی وجہ سے لڑکھڑا بھی جاتی تھی۔

ہال میں شہر کی نامی گرامی ہستیاں اس قدر اطمینان سے براجمان بے ہنگم موٹی بھدی رقاصاؤں کی بے ہودگی دیکھنے میں مصروف تھیں گویا ان کے سامنے ایشوریہ اور مادھوری کا مشترکہ شو چل رہا ہو۔

سرمد بخاری نے اسے کہا تھا وہ اپنی پسندیدہ اداکارہ اس شاندار پارٹی میں بلانا چاہے تو کھلی آفر ہے مگر ستم یہ تھا اسے کوئی پاکستانی اداکارہ پسند ہی نہیں تھی نہ ہی وہ کسی پاکستانی فلم کو دیکھنے کے لئے اہتمام سے کشن کے سہارے نیم دراز ہو کر بیٹھتی تھی۔

ایسے میں اگر اس کے سامنے پاکستان کی نامور اداکارہ بھی ہوتی تو اسے کوئی فرق نہیں پڑنا تھا۔

فرق تو خیر کسی کو بھی نہیں پڑنا تھا سب اس تاریک رات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے مشہور و

معروف چہروں پر سیاہی پھیرنے کے لیے یہاں جمع ہوئے تھے اس طرح کی بڑی مچھلیوں کو خوش کرنے والی محفلیں سرمد بخاری آئے دن کرواتا رہتا تھا۔

اور اس بار اس کا انتخاب فارم ہاؤس تھا جس پر سب بہت خوش تھے اور سعدیہ ان کی خوشی پر حیران۔

اس نے نیچے ہال ایریا میں جانے سے معذرت کر لی تھی۔

وہ اس کے گال چھوتے ہوئے آگے بڑھ گیا تھا تب سے وہ اس گیلری کے سہارے ادھر سے ادھر چلتے ہوئے ہال کا نظارہ کر رہی تھی اچانک اس کو اپنے پیچھے کسی کے ہونے کا احساس ہوا اس نے پلٹ کر دیکھنے کی کوشش کی تو ایک ہاتھ اس کی آنکھوں کے سامنے دیوار سا بن گیا گویا کوئی اس سے کھیل رہا تھا۔

یہ سرمد بخاری نہیں ہو سکتا اس کی موجودگی تو اس کی خوشبو سے پتا چلتی تھی اس کے مخصوص کلون کو سعدیہ اب اچھی طرح پہچاننے لگی تھی۔

''کون ہے.....''

اس نے ناگوار سی بو کو محسوس کر کے جلدی سے ہاتھ جھٹکا اور پیچھے پلٹ کر دیکھا تو پتھر کی ہو گئی اس کے سامنے اظہر کھڑا تھا اس کی زندگی کو طوائفیت کے در پر لا کر کھڑا کرنے والا اظہر۔

اسے محبت کے خواب دکھا کر اسے رسوا کرنے والا اظہر۔

وہ لرز کر رہ گئی.....

''یہ شخص یہاں۔''

''تم یہاں بھی آ گئے بے غیرت ڈلیل.....'' اس نے موٹی سی گالی دی تب اس کے چہرے پر بھرپور مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''میں تو خیر کہیں بھی جا سکتا ہوں لیکن تم سناؤ یہاں کیسے پہنچ گئیں یہ تو بڑے لوگوں کی دنیا ہے۔

تم نے مجھے دھوکا دے کر اپنے راستے ہموار کرنے تھے تو پہلے بتا دیتیں میں ڈائریکٹ....."

وہ اپنی بات مکمل نہیں کر پایا تھا کہ سعدیہ کا ہاتھ اس کے نازک سے چہرے پر اپنا نشان ثبت کر گیا۔

اظہر کی تو کھوپڑی گھوم گئی۔

"سالی....." اس نے گالیاں بکتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"مجھ پر ہاتھ اٹھاتی ہے تیری ہمت کیسے ہوئی، سرمد بخاری سے یاری کر کے شیر ہو گئی۔"

وہ آپے سے باہر ہو گیا اس کی آواز بلند ہونے لگی تو سعدیہ نے مدد طلب نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔

"ارے تیرے گھر والوں کو ابھی خبر کرتا ہوں کوٹھے پر بیٹھی ہے ان کی بیٹی تیری بوٹیاں کتوں کے آگے ڈال دیں گے وہ....."

اسے بہت ساری باتوں کا غصہ تھا لیکن سب سے بڑا رنج اس بات کا تھا کہ وہ اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔

اتنا مہنگا سودا وہ اپنی نادانی کی وجہ سے نہیں کر پایا ورنہ آج ان چھوٹے موٹے دھندوں سے نجات مل چکی ہوتی۔

آج وہ اپنے ڈانس گروپ کے ساتھ نہیں تھا۔ بلکہ ڈانسر لڑکیوں کے گروپ کے ساتھ ان کی حفاظت اور جاسوسی پر مامور تھس۔

کسی بھی غیر معمولی ڈیل اور واسطے کی صورت میں اسے حسنہ بائی کو رابطہ کرنا تھا۔

یہ تمام لڑکیاں جو اس کے ساتھ یہاں پر لوگوں کو انٹرٹین کرنے آئی تھیں ان سب کا تعلق بازار کی دنیا سے تھا۔

سرمد بخاری کی سب سے اچھی بات یہ تھی کہ وہ ہر طبقے کی عورت کو نواز کر خوش ہوتا تھا۔ لیکن یہ الگ بات کہ حسنہ بائی ان کا آدھے سے زیادہ حصہ خود ہڑپ کر جاتی تھی۔

''منحوس عورت..... تجھے تو میں.....''

''تم اپنی بکواس بند کر کے یہاں سے دفع ہو جاؤ تمہاری وجہ سے آج میں یہاں پہنچ گئی ہوں تم نے مجھے دھوکا دیا اظہر اور میری زندگی برباد کر دی۔''

سعدیہ کو اب کوئی خوف کوئی ڈر نہیں تھا اب تو اسے رونا بھی نہیں آتا تھا۔

وہ تو خود چاہتی تھی اس کی بوٹیاں کتوں کے آگے ڈال دی جائیں اس کی نادانی اور بے وقوفی کی اس سے اچھی سزا کیا ہو سکتی تھی لیکن اس سے پہلے اس کی شدید خواہش تھی کہ اظہر کو وہ اپنے ہاتھ سے ذبح کر دے اور شاید اس وقت وہ یہ کر بھی لیتی اس کے ٹکڑے نہ سہی گلا ضرور دبا دیتی لیکن ٹانگ کی تکلیف آڑے آ گئی۔

''ارے تو خود یہ ہی چاہتی تھی یاد ہے اس رات مجھے چھوڑ کر سرمد کے ساتھ غائب ہو گئی تھی اچھا آدمی ہے جس نے تجھے اب تک اپنے ساتھ رکھا ہوا ہے ورنہ تو۔''

''اظہر تم اپنی بکواس بند کرو..... میں تمہاری شکل پر تھوکنا بھی نہیں چاہتی۔''

یہ کہہ کر اس نے اظہر کی شکل پر واقعی تھوک دیا تھا۔

اظہر کے لیے یہ بالکل غیر متوقع تھا اس نے بے دردی سے اپنا چہرہ صاف کر کے سعدیہ کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اس کے حلق سے چیخ بلند ہو گئی۔

وہ یکدم بدک کر پیچھے ہٹا جذباتیت میں وہ انتہائی احمقانہ حرکت کرنے چلا تھا اس وقت سعدیہ پر ہاتھ اٹھا کر سرمد بخاری سے بھڑنا کسی بھی طرح اس کے حق میں نہیں جاتا تھا۔

سعدیہ اس لمحے بہت مضبوط ہاتھوں میں تھی اور وہ محض ایک چھوٹا سا بروکر..... وہ بھی اس پر نفرت بھری نگاہ ڈال کر پلٹ گیا۔

سعدیہ کی چیخ پر کسی نے دھیان تو نہیں دیا تھا لیکن سر۔د بخاری کو ہر حال میں چوکنا رہنے کی عادت تھی وہ اپنے ایک خاص مہمان سے معذرت کرتا ہوا تیزی سے انٹرکام کی طرف بڑھا۔

اگر سعدیہ اپنے کمرے میں ہوتی تو ضرور پک کر لیتی۔ وہ ہال میں سے نکل کر اوپر گیلری کی طرف آنے لگا سیڑھیوں پر اس نے اظہر کو نیچے آتے دیکھا تو وہیں رک گیا۔

''تم اوپر کیا کرنے گئے تھے تم جانتے ہو تمہاری حد کیا ہے تم کس کی اجازت سے اوپر گئے۔''

سرمد بخاری کی سرد سی آواز نے اس کے قدم جکڑ لیے۔

''مجھے واش روم جانا تھا سمجھ نہیں آیا تو اس طرف آ گیا۔''

وہ سر جھکائے مجرمانہ انداز میں وضاحت پیش کر رہا تھا۔

''تم نہیں جانتے کہ یہاں واش روم کس طرف ہوگا۔ کیا پہلی دفعہ حسنہ کے ساتھ کام کر رہے ہو تمہیں اس نے اس کاروبار کے آداب اور اصول نہیں سکھائے۔''

سرمد بخاری کی نظریں اس پر گڑی تھیں اور وہ اندر ہی اندر کانپ رہا تھا وہ ذرا سا بھی اس سے بحث کرتا تو کام خراب ہو جاتا حسنہ بائی تو اس کا کمیشن بھی ہڑپ کر جاتی اگر اسے کوئی شکایت ملتی۔

''باسٹرڈ! نیچے جاؤ اور اپنی حد میں رہ کر کام کرو.....''

سرمد بخاری کی دھمکی اور تذلیل کو وہ بڑے حوصلے کے ساتھ پی گیا۔ اس دنیا میں جو جتنا ذلیل اور کم ظرف تھا وہ اتنا ہی کامیاب تھا جس کے پاس غیرت نام کی کوئی چیز نہیں تھی وہ اس دنیا کا حاکم تھا۔

وہ سر جھکا کر سرمد بخاری کے پاس سے گزر کر نیچے جانے لگا۔

''اور ہاں..... سعدیہ اب میری حدود میں ہے اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھا تو آنکھیں نکال دوں گا۔''

اس نے تابوت میں کیل ٹھونک دی تھی وہ بے جان قدموں سے نیچے جا رہا تھا اور سرمد بخاری سعدیہ کے پاس۔

☆.....☆.....☆

وہ چاروں نانو کے کمرے میں ان کے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھے ہوئے تھے نانو کی طبیعت اس وقت کافی بہتر تھی لیکن ان کی بس ایک ہی فرمائش تھی کہ کسی بھی طرح ان کو طارق سے ملوا دیا جائے۔

''بچے طارق نے کچھ کھانا شروع کیا یا ابھی تک اسے پانی پلا پلا کر مارنے پر تلے ہوئے ہیں یہ ڈاکٹر لوگ.....''

انہیں ڈرپ سے بہت خوف آتا تھا بقول ان کے یہ سفید نلکیاں تو گلے کا پھندا بن جاتی ہیں۔ اگر وہ طارق محمود کے اردگرد سفید نلکیوں کا جال دیکھ لیتیں تو.....

یہ ہی سوچ کر کوئی بھی انہیں آئی سی یو تک نہیں لے کر گیا تھا اس وقت بھی ان کے معصومانہ سے استفسار پر ان چاروں کے ستے ہوئے چہروں پر کرب آمیز مسکراہٹ سی بکھر گئی انہوں نے آپس میں اس بات کا تہیہ کیا ہوا تھا کہ وہ نانو کے سامنے بالکل بھی کمزور نہیں پڑیں گے نہ ان کی آنکھوں میں پانی آئے گا اور نہ ہی چہرے پر اندر کی تکلیف کو آنے دیا جائے گا۔

''نانو آپ کو پتا ہے یہ پانی بہت قیمتی ہوتا ہے زندگی بن کر دوڑنے لگتا ہے۔''

کاشف نے ان کے ملائم ہاتھ تھام کر محبت سے کہا تو سب نے تائید میں سر ہلا دیا۔

''ارے ہٹو.....زندگی تو رب کے پاس ہوتی ہے اس سے دعا مانگو عاجزی کے ساتھ وہ سب مشکل آسان کر دیتا ہے۔''

ان کی بات پر عاشر نے چونک کر انہیں دیکھا۔

''کیا واقعی نانو کا بابا کے ساتھ کوئی روحانی رشتہ ہے۔

کیا واقعی اس وقت نانو کی دعاؤں نے بابا کو تھام رکھا ہے۔''

اس کے ذہن میں ڈاکٹر کے الفاظ کی بازگشت شروع ہوگئی۔

''میں کب سے کہہ رہی ہوں مجھے طارق کے پاس لے کر چلو کچھ تو اس پر دم کر کے پھونکوں مجھے

کیوں تم لوگ قید کر کے بیٹھے ہوئے ہو..... میں اب ٹھیک ہوں چل پھر سکتی ہوں۔"

انہیں اب غصہ آ گیا تھا انہوں نے اپنے بازوؤں کے سہارے اٹھنے کی کوشش کی تو خولہ نے انہیں تھام لیا۔

"نانو پلیز! ابھی نہیں ہم ابھی تو ان کے پاس سے آئے ہیں۔ اصل میں آئی سی یو کے اندر بار بار جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اور پھر آپ خود اتنی سینسٹیو ہو گئی ہیں وہاں جا کر اور بیمار ہو جائیں گی۔"

خولہ نے انہیں بہلانے کی کوشش کی۔

مگر وہ کہاں اب بہلنے والی تھیں۔

"عاشر باپ سے مل کر آئے ہو..... یا ابھی بھی اس سے ناراض رہ کر اسے دکھی کر رہے ہو۔"

آج وہ اس کی کلاس لے رہی تھیں پہلے ڈاکٹرز کی نالائقی پر تبصرہ تھا اب عاشر کو مخاطب کر لیا تھا۔

"جی نانو ابھی ان کے پاس ہی تھا اصل میں وہ غنودگی میں ہیں اور پھر ڈاکٹرز بھی بات کرنے سے منع کر رہے ہیں اس لیے..... چپ چاپ انہیں دیکھتا رہا....."

وہ مسکرا رہا تھا کشمالہ اس کے اندر کا کرب بآسانی دیکھ سکتی تھی۔

"بس کر دو اب..... مت تنگ کرو اسے..... ساری زندگی خفگی میں گزار دو گے تو پھر پچھتاوا بہت تنگ کرے گا۔ ابھی بھی وقت ہے سنبھل جاؤ۔"

انہوں نے تنبیہہ کی تو اس کا سر بھی جھک گیا اور پلکیں بھی بوجھل ہو گئیں پانی کے قطروں سے۔

"وقت ہی تو نہیں ہے اب ہمارے پاس۔"

اس کے دل میں ٹیس سی ابھری تھی۔

"میں ابھی آیا....." وہ اسی طرح سر جھکائے باہر نکل گیا۔

"جاؤ دیکھو اسے رو رہا ہو گا..... سب جانتی ہوں بظاہر غصہ کرتا ہے اور اندر ہی اندر گھٹتا ہے

جانے کب بڑا ہوگا۔'' انہوں نے کشمالہ کو مخاطب کیا تھا۔ اس کے لیے نانو کا یہ حق بھرا انداز کسی اعزاز سے کم نہیں تھا وہ ان کے حکم کی تعمیل کے لیے عاشر کے پیچھے آ گئی۔

وہ کوریڈور میں رکھے بینچ پر بیٹھا تھا اور اس کی آنکھیں پورے چہرے کو جھل تھل کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔

کشمالہ کے دل پر چوٹ سی پڑی اس کا بس نہیں چل رہا تھا اپنے حصے کی ساری دولت دے کر اس کے لیے خوشیاں خرید لیتی۔

''عاشر.....'' وہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔

''نانو پھر پریشان ہوں گی..... انہوں نے ہی مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔'' اس نے جلدی سے وضاحت بھی کر دی مبادا وہ غصہ نہ ہو جائے۔

''میں آپ کے سامنے رونا نہیں چاہتا..... آپ پلیز جائیں۔''

وہی ضدی انداز تھا جس پر کشمالہ نے دل ہارا تھا۔

''کیا ہم دونوں مل کر نہیں رہ سکتے۔''

بے ساختہ خواہش نے لفظوں کا روپ دھارا تو عاشر نے نظریں اٹھا کر اسے سرسری سا دیکھا اور رخ موڑ کر بیٹھ گیا۔

''اگر بابا کو آپ لوگ نہ ملتیں تو وہ میرے پاس واپس آ جاتے۔''

''اگر وہ ہمیں نہ ملتے تو آج ہم کسی بار میں ہب میں نوکری کر رہے ہوتے یا.....''

اس کی آواز بھرا گئی۔ عاشر نے خوفناک انداز میں پلٹ کر اسے دیکھا۔

''جسٹ شٹ اپ..... ضروری ہے آپ اس وقت مجھ سے وہ بکواس کریں جو مجھے مزید اذیت دے۔''

اس کی بات بہت بامعنی تھی کشمالہ روتے روتے مسکرا دی۔

''آپ نے مجھے مجبور کیا۔ ورنہ کیا دکھ زندگی میں صرف آپ نے دیکھا ہے۔ آپ نے اصل میں کبھی کسی کا دکھ سنا نہیں ہے نا اس لیے۔''

''پلیز.....''

وہ دھوپ چھاؤں سی لڑکی اسے لاجواب کر گئی تھی۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں عاشر! کبھی اپنے اردگرد پھیلی زندگی کو بھی دیکھنے کی کوشش کریں آپ کو اپنی تکلیف بہت چھوٹی لگے گی۔''

وہ بہت دلگرفتہ نظر آ رہی تھی۔

''میری تکلیف اور چھوٹی.....'' وہ اسے دیکھ کر مسکرا دیا۔

''جی عاشر..... کبھی کسی بڑے دکھ کا چہرہ دیکھنا ہو تو ان لوگوں سے ضرور ملیے گا۔ جنہیں منیر کمال نے پیدا کیا ہو اور راجہ طارق محمود نے پالا ہو.....''

وہ بالکل بے تاثر چہرے کے ساتھ کہہ کر کھڑی ہو گئی تھی اور عاشر کو پہلے تو سمجھ ہی نہیں آیا تھا وہ کیا کچھ کہہ گئی ہے مگر جب عقل کے دریچے سے اس کے جملے کا مفہوم ٹکرایا تو عاشر عباس کے دماغ کے پرخچے اڑ گئے تھے یہ کیا کہہ گئی تھی وہ..... منیر کمال..... میری ماں کا دوسرا شوہر اور.....

اس کے اردگرد متواتر بلاسٹ ہو رہے تھے۔

کیا اس دن نے بھی آنا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے کئی تصویروں کا کولاج بن رہا تھا بگڑ رہا تھا کشمالہ منیر کمال شمائلہ منیر کمال اور راجہ طارق محمود۔

بابا کو میں اکیلے چھوڑ آیا تھا اور شمائلہ۔ اچانک ہی اسے کچھ یاد آیا تو وہ کھڑا ہو گیا۔ اب اس کے قدموں کا رخ پھر سے آئی سی یو کی جانب تھا۔

☆.....☆.....☆

اظہر نے بھی نعمان کے سر پر بم ہی پھوڑا تھا۔

''ارے تم لوگ میرے پیچھے پڑے ہوئے تھے میرے گھر والوں کی زندگی اجیرن کر دی تھی جانتے ہو تمہاری کزن کہاں عیش کر رہی ہے۔ کتنے مزے میں ہے ارے بہت بڑا آدمی ہے وہ..... ہیروئن، اسلحہ، شراب کچھ نہیں اسمگل کرتا ہے وہ..... چکاس کام کرتا ہے لڑکیاں ادھر سے ادھر۔۔''

وہ خود ہی بول رہا تھا شاید خود ہی سن رہا تھا کیونکہ نعمان کے کان تو سائیں سائیں کرنے لگے تھے سعدیہ کا نام سنتے ہی اور پھر اظہر کی بکواس۔

اس کا دل چاہا اظہر کا گریبان پکڑ کر ایک زوردار مکا اس کے منہ پر جڑ دے جس میں سے یہ بکواس برآمد ہو رہی تھی۔ مگر یہ وقت جذبات کا نہیں ہوش سے کان لینے کا تھا۔

وہ دونوں اس وقت ایک درمیانے درجے کے ہوٹل پر بیٹھے ہوئے تھے ان کے اردگرد کافی سارے لوگ بھی تھے مگر ان کی توجہ ٹی وی کی طرف تھی جس پر کوئی انڈین فلم چل رہی تھی اور اس کی آواز اتنی بلند تھی کہ کسی نے بھی نعمان اور اظہر کی باتوں کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔

''تو اپنا منہ بند کرتا ہے یا میں تیرا منہ سی دوں۔'' نعمان نے دانت پیس کر کہا۔

''ارے اب کیوں مجھے روکتا ہے ابھی تو میرا وقت آیا ہے یاد ہے عزت سے مانگنے گیا تھا اس کا ہاتھ..... مگر بے عزتی کر کے میرے گھر والوں کو نکال دیا۔ بہت دل دکھا تھا اس وقت تو نے زندگی میں کبھک دل لگایا ہو تو پتا چلے یہ چوٹ کیا ہوتی ہے۔''

اس کا ہر انداز اس وقت بھی فلمی تھا نعمان کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی اس کی بکواس ناقابلِ برداشت تھی لیکن وہ اس وقت یہاں کوئی تماشا نہیں چاہتا تھا اس لیے کھڑا ہو گیا۔

''چل اٹھ یہاں سے باہر چل کر بات کرتے ہیں میں نہیں چاہتا تو سب کے سامنے میں تیرے کپڑے اتار دوں۔''

نعمان کا خون گرم ہو چلا تھا اظہر کو حیرت سی ہوئی۔

''کس بات پر تو اتنا اکڑ رہا ہے نعمان..... تیری بہن۔''

''خبردار جو اس کا نام لیا اپنے گندے منہ سے..... وہ جہاں ہے جس حال میں ہے کم از کم تیرے جہنم سے بہتر ہے۔''

نعمان کسی صورت خود کو کمزور نہیں ظاہر کرنا چاہتا تھا یہ ہی اس وقت کی بہترین حکمت عملی تھی ورنہ اظہر تو سارے زمانے میں گیت گاتا پھرتا۔

''اوہ..... کہہ تو تو ٹھیک رہا ہے مہارانیوں کی طرح رہتی ہے وہ یہاں..... اس کی ایک آواز پر سرمد بخاری چلا آتا ہے سانپ کی طرح پھنکارتا ہوا بڑی پارٹی ہے بھئی تیرا بہنوئی.....'' وہ کمینی ہنسی ہنسا نعمان کا ضبط جواب دے گیا تھا اس نے الٹے ہاتھ کا تھپڑ رسید کر دیا جس نے اظہر کے چودہ طبق روشن کر دیے۔

وہ دونوں اس وقت ہوٹل کے سامنے والی گلی میں تھے۔

''ارے اس کو قتل کرنے کے بجائے مجھے مارتا ہے۔''

اظہر نے بھی جوابی حملہ کیا دونوں ایک دوسرے کو گالیاں بکتے ہوئے گتھم گتھا ہو گئے تھے تب ہی پولیس کی گشتی موبائل ان کے قریب آ کر رکی۔

''اوئے کیا کر رہے ہو.....'' پولیس والے کی آواز پر انہوں نے ایک دوسرے کے گریبان چھوڑے۔

''کچھ نہیں صاحب..... بس ایسے ہی۔''

اس وقت ایک دوسرے کو الزام دینے کا مطلب وہ اچھی طرح جانتے تھے اور پھر اس میدان کے تو وہ پرانے کھلاڑی تھے ہمیشہ صاف بچ کر نکلتے رہے ہیں۔

''کیا ایسے ہی..... چوری کرتے ہو اور پھر مال پر لڑتے ہو۔'' وہ کوئی انسپکٹر ٹائپ چیز تھی جو گاڑی

کی اگلی سیٹ سے اتر کر ان کے پاس آ گیا۔

''چوری.....ہم نے کوئی چوری نہیں کی.....ہم تو دوست ہیں بس یونہی غصہ آ گیا تھا۔''

اظہر کے لہجے میں بلا کی شیرینی تھی نعمان نے بھی تائید کی۔

''رنگے ہاتھوں پکڑا ہے تم لوگوں کو میں نے.....چلو بیٹھو گاڑی میں باقی بات تھانے چل کر ہو گی۔''

اس نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا۔

پولیس والے تو اس کے اشارے کے منتظر تھے لمحوں میں دونوں کو اپنی گرفت میں لے کر موبائل وین کی جانب رخ کر لیا۔

یہ اچھی مصیبت گلے پڑ گئی.....دونوں کو اس وقت پر پچھتاوا ہو رہا تھا جب وہ ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریباں ہوئے تھے پولیس والوں نے اپنے ہی اسٹائل میں انہیں موبائل وین کے اندر دھکا دیا۔

''زیادہ چالاکی نہیں۔'' پولیس والے شاید ان کے تاثرات کو بخوبی پڑھ رہے تھے۔

''صاحب! اب کیا چالاکی کریں گے ہم تو ایسے ہی غصے میں آ گئے تھے آپ نے دھر لیا ہمارے پاس تو جیب میں بٹوہ تک نہیں آپ چوری کی بات کرتے ہیں۔''

نعمان کا بھی اپنا ہی انداز تھا پولیس والوں نے ان سنی کر کے انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ دونوں کا دل اس وقت ایک ہی لے پر دھڑک رہا تھا۔

پتا نہیں کون سی چوری کس کی ڈکیتی یہ ہمارے کھاتے میں ڈال دیں گے۔

☆.....☆.....☆

کئی گھنٹے گزر چکے تھے مسکن کا ہر مکین اپنے تمام معمولات ترک کیے صرف فون کال کر منتظر تھا پورے گھر میں قبرستان کی سی خاموشی تھی ایسے میں کبھی کبھی شجاع اور ماموں کی تسلی بھری آواز گونجتی اور پھر طویل خاموشی چھا جاتی۔ صوفیک گھٹنوں میں سر دیے نڈھال پڑی تھی۔

''میرے خیال میں اب ہمیں پولیس کو اس سارے معاملے سے آگاہ کرنا چاہیے ہم جتنا ڈیلے کریں گے اتنی پرابلم بڑھے گی۔''

شجاع نے علی اور محسن سے مشورہ کیا ماموں بھی سن رہے تھے۔

''میرے خیال میں شجاع ہمیں ان کی دوسری کال کا انتظار کرنا چاہیے۔ سچویشن تو سامنے آئے ان کا مطالبہ کیا ہے کون لوگ ہیں..... کیا چاہتے ہیں۔'' ماموں کے انداز میں تفکر بھی تھا اور تحمل بھی۔

''سمجھ میں نہیں آرہا کس نے کیا ہوگا..... ہمارا تو کوئی خاندانی دشمن بھی نہیں۔'' علی جھنجھلا رہا تھا۔

''میں تو سمجھتا ہوں پھوپھی جان نے اب تک کاروبار اتنے صاف ستھرے انداز میں کیا ہے کہ انہوں نے کاروباری حریف بھی نہیں بنائے۔ پھر یہ حرکت کس کی ہوسکتی ہے۔'' شجاع ان دنوں کو سوچ رہا تھا جب اس نے بڑی بڑی کاروباری میٹنگز میں راحت بیگم کے ساتھ شرکت کی۔

''ضروری نہیں بیٹا کہ یہ کوئی ہمارا دشمن ہو یا راحت کا حریف..... یہ کوئی جرائم پیشہ گروہ بھی ہوسکتا ہے، یہ کوئی اکیلا مجرم بھی ہوسکتا ہے جس نے تاوان کے لیے یہ حرکت کی ہو.....''

چھوٹے ماموں نے ایک گہری سانس لے کر کہا تو سب کے ذہن میں ایک ہی سوال گردش کرنے لگا۔

''تاوان لینے والا اتنی دیر کیوں کر رہا ہے۔''

لیکن پھر تھوڑی دیر میں اس سوال کا جواب بھی مل ہی گیا تھا اس بار فون شجاع نے اٹھایا تھا۔

اسے کسی نے انگریزی میں مخاطب کر کے حال احوال پوچھا تھا وہ بڑے تحمل سے جواب دیتا رہا۔

''مجھے آپ کے تعارف سے کوئی دلچسپی نہیں کیا آپ فون کا مقصد بتا سکتے ہیں۔'' اس بار اس کے لہجے سے تلخی اور ترشی نمایاں تھی۔

''ہمارا مطالبہ بہت چھوٹا سا ہے اگر آپ اپنی آنٹی کی زندگی چاہتے ہیں تو ہماری ڈیمانڈ ایک کروڑ

پچاس لاکھ ہے۔"

اس بار وہ اردو میں مخاطب تھا بلا کا مہذب اور شستہ انداز.....

شجاع کو یہ سن کر نہ تو حیرانی ہوئی تھی نہ کوئی صدمہ.....وہ اسی طرح کی توقع کر رہا تھا۔

فون کے دوسرے طرف سے پھر مطالبہ دہرایا گیا تو شجاع پھٹ پڑا۔

"دیکھو.....اگر تم نے میری ماں کو کوئی نقصان پہنچایا تو میں تمہیں قبر سے کھینچ لاؤں گا تم اگر اپنی زندگی چاہتے ہو تو انہیں احترام سے رکھو تمہاری ڈیمانڈ کل تک پوری ہو جائے گی بتاؤ کہاں آنا ہے....."

شجاع کے لہجے میں پتھروں کی سی سختی تھی لیکن دوسری طرف سے فون بند ہو چکا تھا۔

انہوں نے شاید ابھی جگہ کا تعین نہیں کیا تھا یا پھر وہ مسکن کے لوگوں کو اذیت دینا چاہتے تھے کچھ تو ایسا تھا جو شجاع کی برداشت کو چیلنج کر گیا تھا۔

"میں پولیس کو انفارم کر رہا ہوں اپنے طریقے سے.....میں مجرموں کی ڈیمانڈ پوری کر سکتا ہوں لیکن ان کا ساتھ نہیں دوں گا۔ان کو آزاد نہیں رہنے دوں گا۔"

وہ ہٹ دھرمی سے کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا وہ اب پہلی فرصت میں اپنے دوست ڈی ایس پی طاہر سے ملنا چاہتا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ تینوں کشمالہ اور خولہ کے ساتھ اس وقت مہنگے ترین شاپنگ مال میں تھے کشمالہ طارق کی گود میں خولہ اعجاز الدین کی.....مریم بس اپنی چادر سنبھالے حیران نظروں سے اس نئی دنیا کے رنگ ڈھنگ دیکھ رہی تھی۔

اس کی تو آنکھیں چندھیا گئی تھیں اتنی روشنی اور اتنے رنگ.....وہ تو آج تک عجیب خستہ حال تاریک گھروں میں رہتے ہوئے یہ تک بھول گئی تھی کہ وہ دنیا کے کسی ترقی یافتہ شہر کا حصہ ہے۔

اور اس ترقی یافتہ شہر کے دلکش نظارے آج جب اس کی نظروں کے سامنے تھے تو اس کی آنکھوں میں جلن سی شروع ہو گئی تھی۔

قسمت انسان کو خواب دیکھنے کی کتنی بھیانک سزا دیتی ہے.....اور پھر یہ ہی قسمت جب اپنا اثر دکھاتی ہے تو خواب مجسم لو کر سامنے آجاتے ہیں۔

الٰہی تیرے بھید تو ہی جانے.....

اس کا دل تشکر کے جذبات سے لبریز تھا۔

طارق محمود نے کشمالہ اور خولہ کے لیے ڈھیر ساری شاپنگ کی تھی کپڑے، کھلونے، بے بی چیئرز، کیری کاٹ.....اور بھی بہت کچھ۔۔مریم کے نہ نہ کرنے کے باوجود۔

"محترمہ..... میں نے آپ کے لیے کچھ لیا ہے.....نہیں نا..... پھر آپ کیوں ہماری شاپنگ خراب کر رہی ہیں۔آپ جائیں اپنے بھائی صاحب کے ساتھ ہمیں ڈسٹرب نہ کریں۔"

ان کے سرخ و سفید چہرے پر بڑی دلکش مسکراہٹ تھی۔آج شاید پہلی بار مریم نے ان کو ہنستے ہوئے دیکھا تھا اور پھر وہ مستقل اعجاز الدین کے ساتھ نوک جھونک میں مصروف تھے۔

کشمالہ اور خولہ ان کی پارٹنر تھیں۔

مریم اس اعلان پر کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔راجہ طارق محمود نے قدرے حیرانی سے یہ منظر دیکھا۔

"مریم! آپ کے اندر زندگی سے لڑنے کا حوصلہ ہے ایسے لوگ دوسروں کے لیے مثال بن جاتے ہیں۔آئی سلیوٹ یو....."

انہوں نے واقعتاً ماتھے تک ہاتھ لے جا کر اسے سلیوٹ مارا تو سیاہ چادر کے ہالے میں اس کا چہرہ پورے چاند کی طرح دمکنے لگا۔

"آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں.....میں اگر اب بھی اپنی بے بسی اور بدقسمتی کا سوگ مناؤں گی

تو تقدیر مجھ سے کبھی انصاف نہیں کرے گی۔

اللہ نے مجھے آپ کا ساتھ دیا اتنا خوش نصیب تو کوئی نہیں ہوتا کہ وہ جہنم سے نکل کر جنت میں چلا جائے لیکن متو خود کو اتنا ہی خوش نصیب محسوس کر رہی ہوں آپ نہیں جانتے میں نے وہاں کس کس محاذ پر جنگ لڑی ہے۔

آپ کے لیے اتنا کافی ہے کہ میں ایک ایسے شخص کی بیوی ہوں جو نشے میں اپنے حواس کھو بیٹھتا ہے۔"

اس کی آنکھوں میں حزن اور چہرے پر بڑی نرم سی مسکراہٹ تھی۔

اس جیسی عورت کا مرد تھی نشہ کر سکتا ہے اپنے گھر کو جہنم بنا سکتا ہے وہ بے ساختہ سوچ کر رہ گئے آنکھوں کے کناروں میں گلابیاں گھلنے لگیں۔

"مریم جو لوگ اللہ کے قریب ہوتے ہیں وہ ہر حال میں اس کا شکر بھی ادا کرتے ہیں ایسے لوگوں کی آزمائش کڑی ہوتی ہے لیکن انعام غیر معمولی ہوتا ہے۔"

ان کی آواز بھاری ہو چلی تھی مریم کو لگا جیسے وہ خود کو بھی سمجھا رہے ہوں۔

"میرے خیال میں آج کل اتنی مشکل باتیں کرنے کا رواج ختم ہو گیا ہے لوگ ہنس رہے ہیں کھیل رہے ہیں خود میں مگن ہیں اور آپ دونوں خوامخواہ اداس ہونے کی کوشش کر رہے ہو۔"

کافی شاپ کی گلاس ٹیبل بجاتے ہوئے اعجاز الدین نے ماحول کی یاسیت پر ایک دم اپنی شگفتگی کی بوچھاڑ کر دی۔

راجہ طارق محمود نے ہنستے ہوئے اس کے شانے دبائے۔

"تیرا تو جواب نہیں دوست! اپنی نوعیت کی انوکھی بات کرتا ہے ہمیشہ۔"

"آداب عرض ہے حضور! کاروبار لفظوں کا کرتے ہیں کیا کریں عادت پڑ گئی بکواس کرنے کی۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا مریم کے چہرے پر ہنسی بکھرنے کو تھی تب ہی اس کی نظر منیر کمال پر پڑی۔

جو کافی دور بیٹھا ہوا تھا لیکن مریم نے اسے پہچان لیا تھا۔

''اعجاز بھائی! چلیں یہاں سے منیر یہاں پر ہے۔''

اس کے چہرے پر خوف اور سراسیمگی سی پھیل گئی تھی اس نے جلدی سے کشمالہ اور خولہ کی بے بی چیئرز اپنے قریب کیں اور کھڑی ہوگئی۔

''مریم! ابھی بیٹھ جاؤ..... میں ذرا ماحول کا جائزہ لے لوں۔''

اعجاز الدین نے سنجیدگی سے کہا تو وہ فوراً ہی اپنی کرسی پر ٹک گئی۔ اس کی نظریں اب بھی اس ٹیبل پر بھٹک رہی تھیں۔ جس پر منیر کمال کسی عورت کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔

''میرے خیال میں ہم لوگ یہاں سے چلتے ہیں یہ ہماری آج کی شام تو غارت کرے گا خوامخواہ میرے متھے لگ کر۔''

اعجاز الدین نے طارق محمود کو اٹھنے کا اشارہ کیا تب ہی انہوں نے بھی سرسری سا اس ٹیبل کا جائزہ لیا جس کی طرف مریم کی خوفزدہ نگاہیں بھٹک بھٹک جاتی تھیں۔

وہ اور اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی عورت انہیں واضح نظر تو نہیں آئے تھے اور نہ ہی انہیں اس شخص کو دیکھنے کا اشتیاق تھا جو مریم جیسی بھلی صورت والی عورت کی قدر نہیں کر سکا۔

اعجاز الدین نے کشمالہ کو تھام لیا تھا۔ مریم نے بھی خولہ کو گود میں سمیٹ کر اس کی معیت میں قدم باہر کی جانب بڑھا دیے۔ تب ہی بل ادا کرتے ہوئے راجہ طارق محمود نے ذرا سا پلٹ کر اس ٹیبل کی جانب دیکھا تو انہیں لگا جیسے وہ اپنی گردن اونچی کر کے دروازے کی جانب دیکھ رہا ہو۔

انہوں نے ذرا سا قدم بڑھا کر رخ موڑ کر دیکھا تو وہاں کوئی نہیں تھا وہاں تین دروازے تھے اور وہ لوگ کسی قریبی دروازے سے نکل چکے تھے۔

انہوں نے اطمینان بھری سانس لی اور دانستہ اس ٹیبل کی جانب بڑھ گئے اپنے شک کی تصدیق

کے لیے اور پھر جب اس ٹیبل کا منظر واضح ہوا تو ان کا شک یقین میں بدل گیا لیکن انہیں حیرت بالکل نہیں ہوئی تھی۔

وہ منیر کمال ہی تھا وہی منیر کمال جس نے ان کے گھر پر نقب لگائی تھی اور اس کی ہنستی کھیلتی زندگی کو جہنم میں دھکیل دیا تھا۔

یہ وہی بدطینیت شخص تھا جس نے شمائلہ کو گناہ آلودہ زندگی کی چمک دمک سے آشنا کر کے ان دونوں کے درمیان نفرت کے بیج بوئے تھے اور انجام کار وہ تنہا زندگی سے نبرد آزما تھے جبکہ شمائلہ.....

ان کے ذہن میں جھماکا سا ہوا.....

اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی عورت شمائلہ تو نہیں وہ ذرا سا اور آگے بڑھے مگر وہ اس رخ پر بیٹھی تھی کہ اس کی پشت نظر آ رہی تھی اور اس کا چہرہ گھنیرے سنہرے بالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔

اگر منیر کمال یہاں ہے تو پھر شمائلہ کہاں ہے؟

فطری تجسس نے سر ابھارا اپنی بربادی کی نفرت نے مجبور کیا کہ سامنے بیٹھے شخص کا گریبان پکڑ لیں یا پھر مریم کی پامالی کے کسی ایک لمحے کا ہی بدلہ لے لیں۔

مگر یہ ان کی سرشت نہیں تھی وہ ایسے لوگوں سے شناسائی تو دور کی بات دشمنی بھی پسند نہیں کرتے تھے جن کا کوئی کردار نہیں ہوتا۔

انہیں ہمیشہ اپنی مردانگی کا وقار عزیز رہا انہیں لگا منیر کمال جیسے لوگوں سے بھڑ کر وہ اپنی ہی نظروں میں ملامتی ٹھہریں گے۔

انہوں نے شمائلہ سے بار بار اپنی زندگی کا سکھ مانگا تھا وہ ان کی اپنی تھی اسے بار بار روکا تھا۔

محبت کا واسطہ دے کر.....

اور محبت کی نشانی کا چہرہ دکھا کر۔ مگر منیر کمال اور اس کے اردگرد کی دنیا شاید ان سب چیزوں سے

زیادہ طاقتور تھی کدی سیلابی ریلے کی مانند جس میں شمائلہ تنکے کی مانند بہتی چلی گئی۔

تب انہوں نے کرائے کے غنڈوں سے منیر کمال کی خوب درگت بنوائی تھی اسے مار مار کر انہوں نے ادھ موا کر دیا تھا۔ بس وہی ان کا انتقام تھا وہی ان کی نفرت تھی۔

اس وقت بھی وہ اسی نفرت کی شدید لہر کو اندر دباتے ہوئے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئے منیر کمال خود میں اور نئے شکار میں اتنا محو تھا کہ اسے اپنے اردگرد شناسا چہروں کی موجودگی کا احساس بھی نہیں ہوا۔

راجہ طارق محمود نے کافی شاپ سے باہر نکل کر پارکنگ کی راہ لی وہ لوگ یقیناً گاڑی کی طرف ہی آئے تھے۔

اعجاز الدین نے انہیں دیکھ کر مسکراہٹ بکھیری۔

''میں نے سوچا صاحب لوگ بندے کا کام تمام کر کے ہی آئیں گے۔''

''کیا مجھے غلاظت کے ڈھیر سے الجھ کر خود کو گندا کرنا چاہیے کیا میں ایسے شخص پر اپنی توانائی صرف کروں جو من سے مردہ اور تن سے سیاہ ہے۔''

انہوں نے بے حد رسان سے کہتے ہوئے ایک سوال کرتی نگاہ مریم پر ڈالی جو قدرے حیرانی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

جو اعجاز الدین سوچ رہا تھا وہ بھی کچھ ایسا ہی سوچ رہی تھی حالانکہ دل اس کی شدت سے نفی کر رہا تھا وہ کسی صورت نہیں چاہتی تھی کہ منیر کمال کا طارق محمود سے کسی بھی طرح کا سامنا ہو۔

اعجاز الدین اور منیر کمال کی دنیا ہی دوسری تھی ان کا ملنا اور بھڑنا بعد از قیاس نہیں تھا مگر طارق محمود اس دنیا کے نہیں تھے۔

اس نے شکر کا کلمہ پڑھا یہ الگ بات کہ اس شکر کے کلمے میں اپنے دیکھ نہ لیے جانے کا منیر کمال

کی نظروں سے بروقت اوجھل ہونے کا احساس زیادہ تھا۔

''ڈونٹ وری..... جب تک اعجاز آپ کے ساتھ ہے یہ آپ کا سب سے بڑا شیلڈ ہے اس کے ہوتے ہوئے آپ کو کوئی خوف نہیں ہونا چاہیے اور ویسے بھی منیر کمال جیسے لوگ حد درجہ بزدل ہوتے ہیں۔ نقب بھی لگائیں گے تو رات کے اندھیرے میں۔ دشمن بزدل ہو تو اس سے لڑائی میں بھی مزا نہیں آتا۔''

اعجاز الدین گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے ان کی بات پر سر دھن رہا تھا اور مریم اب بھی حیرانی سے گاہے بگاہے راجہ طارق محمود کی سرخ آنکھوں پر نگاہ ڈال لیتی تھی۔

''کیا میری پامالی کا دکھ اس شخص کو اتنی شدت سے محسوس ہوا ہے۔''

وہ سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

اسے اگر یہ پتا چل جاتا اس کے آگے بیٹھا سنجیدہ اور بے نیاز سا شخص بھی منیر کمال کی عیاری اور مکاری کی لپیٹ میں آ چکا ہے تو وہ شاید صدمے سے مر جاتی۔

''اب کدھر چلنے کا ہے دوستو.....'' اعجاز الدین نے ماحول کی یاسیت کم کی۔

''اب صرف گھر.....'' طارق محمود سے پہلے مریم بول پڑی۔

''لیکن ہم تو ڈنر کرنے والے تھے۔'' طارق محمود نے کہا۔

''ڈنر تو گھر پر بھی ہو سکتا ہے اب بس موڈ خراب ہو گیا ہے، گھر چلیں۔'' اس نے قطعیت سے کہا تو طارق محمود نے تائیدی انداز میں اعجاز الدین کو دیکھا اور اس نے تابعداری سے سر ہلاتے ہوئے گاڑی مطلوبہ راستے پر ڈال دی۔

سچ تو یہی تھا کہ موڈ تو سب کا خراب ہو چکا تھا لیکن طارق محمود کی آنکھوں میں جلن نے پانی سا بھر دیا تھا۔

انہیں اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ اس وقت شمائلہ کہاں تھی اور کس کے ساتھ تھی اور منیر

کمال یہاں کیا کر رہا تھا لیکن انہیں اس بات کا رنج ضرور تھا کہ وہ ایک بار پھر اپنے دشمن کو زندہ سلامت چھوڑ آئے۔

اگر ایک خون معاف ہوتا اور زندگی کا خاتمہ کرنا ایک بار انسان کی خواہش کے مطابق ہوتا تو وہ ضرور منیر کمال جیسے شخص کو قتل کر دیتے صرف اس لیے نہیں کہ وہ ان کی ہنستی کھیلتی زندگی کا قاتل تھا بلکہ اس لیے بھی کہ وہ مریم جیسی نیک نفس عورت اور اپنی دو بیٹیوں کا مجرم تھا۔

اولاد کا درد اور اس سے دوری کی تڑپ کیا ہوتی ہے یہ ان سے بہتر کون جان سکتا تھا لیکن وہ تو انسانیت کے وصف سے ہی محروم تھا بھلا ان احساسات کی پرواہ کیسے کرتا۔

چھ مہینے پہلے راجہ طارق محمود عاشر کو باضابطہ اور باقاعدہ اعلان کے ساتھ نانو کے حوالے کر کے جب مستقل اس پردیس کا قصد کر رہے تھے تو ان کی سماعتوں سے ایک معصوم سی آواز ٹکرائی۔

''بابا! آپ کہاں چلے جاتے ہیں پلیز جلدی آئیں نا میں آپ کو یاد کرتا ہوں۔''

ان کا دل پیچھے کی طرف لپکتا اور دماغ کہتا۔

''طارق محمود! تم مر جاؤ گے اس زمین پر جہاں قدم قدم پر شمائلہ کی اس کے ساتھ کے خوبصورت پل تمہارا رستہ روکیں گے تمہیں دوہری اذیت سے ہمکنار کریں گے۔''

اس سے دوری کی اذیت اور اس کی رسوائی و پامالی کی اذیت۔

تم کتنا درد پیو گے اور کب تک.....

کیا تم چاہتے ہو تمہاری منزل کوئی نفسیاتی اسپتال یا کوئی شراب خانہ ہو۔

نہیں تم اپنی ذات کے ساتھ اتنا بڑا ظلم نہیں کر سکتے۔ تم کو اپنے ساتھ انصاف کرنا ہوگا۔

تمہیں یہاں سے جانا ہوگا ان سارے شناسا منظروں کو بہت پیچھے چھوڑنا ہوگا تا کہ تم زندگی کا حق ادا کر سکو۔

دل و دماغ کی یہ کشمکش کئی دنوں تک چلتی رہی اور وہ جب ذہنی و جسمانی طور پر مکمل نڈھال ہو گئے کوئی فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں نہ رہے تو نانو کی گود میں سر رکھ کر رو پڑے۔

☆.....☆.....☆

''بھیا ایک بات تو بتائیں۔ یہ خولہ جی کہاں چلی گئیں نہ وہ پروگرام کر رہی ہیں نہ ہی وہ مجھے فیس بک پر نظر آ رہی ہیں مجھے تو کچھ دال میں کالا نظر آ رہا ہے۔''

سامعہ نے چپکے سے پہلے اس کے قریب جگہ بنائی اور پھر سرگوشی نما اعلان شروع کر دیا تھا۔

''پہلے تو مجھے یہ بتاؤ کہ وہ تمہاری فیس بک پر کب سے ہے اور تم مجھے آج بتا رہی ہو اور یہ تمہاری عمر ہے فیس بک سائن اپ کرنے کی۔''

خزیمہ نے اس کے کان کھینچ لیے تھے۔

''عمر تو خیر میری ہی ہے فیس بک پر ایڈ ہونے کی۔ آپ تو پتا نہیں کون سی دنیا میں رہتے ہیں۔ میں نے اپنے سارے انڈین کزنز کو بھی ایڈ کر لیا ہے۔

اور امی نے آپ کے لیے فیس بک سے لڑکی بھی ڈھونڈ لی آپ کو خبر ہی نہیں کچھ تو بڑے ہو جائیں۔''

وہ اپنی سریلی آواز میں اتنے مزے سے لہک لہک کر کہہ رہی تھی کہ خزیمہ کی تھوڑی دیر پہلے والی کوفت مسکراہٹ میں ڈھل گئی۔ اس کی آنکھوں میں شرارت کے رنگ اُمڈ کر معدوم ہو گئے۔ مبادا وہ مزید اس پر اپنی قابلیت جھاڑنا نہ شروع ہو جائے۔

اب یہ قابلیت تو تھی کہ پہلے اس نے خولہ کمال سے چیٹنگ کی پھر اس نے فیس بک پر ایڈ کر کے دوستی کر لی اور اب وہ اسے سامنے بیٹھ کر طعنے دے رہی تھی۔

یہ بھی تو سچ ہی تھا کہ وہ اپنی بے تحاشا مصروف پروفیشنل زندگی میں سے کبھی اپنے لیے اتنا وقت ہی نہ نکال پایا کہ فیس بک آرکٹ یا اس جیسی دوسری سائٹ پر سائن اپ ہوتا۔

اپنے سوشل سرکل میں اضافہ کرنے کی سوچنا یا نت نئے لوگوں سے راہ و رسم بڑھانے کے لیے ان سائٹس کی مدد لیتا۔

اسے تو لگتا تھا جو قریبی دوست ہیں اب وہ بھی مصروف اور بھاگ دوڑ کے باعث زندگی سے معدوم ہوتے جا رہے ہیں لیکن یہ سامعہ بھی ناشیطان کی خالہ ہے۔

اب ایک نیا شوشا لیے اس کے سر پر سوار تھی۔

"تمہیں یہ سب کرنے کے لیے ٹائم کب ملتا ہے سامی! تم اسٹوڈنٹ ہو تمہیں پتا ہے اس طرح کی حرکتوں میں کتنا ٹائم ویسٹ ہوتا ہے۔

نیٹ کے فائدے تو ہیں لیکن اس کا بے جا استعمال آپ کو دیگر کاموں سے دور لے جاتا ہے۔"

خزیمہ نے فوراً بڑے بھائیوں والی ذمہ داری نبھانی شروع کر دی تھی سامعہ کا منہ بن گیا۔

"بھیا میں اس وقت جو آپ سے پوچھنے آئی ہوں مجھے وہ بتائیں بس۔" وہ ٹھنک کر بولی۔

"تمہاری الٹی سیدھی باتوں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں چلو بھاگو یہاں سے پاگل نہ ہو تو۔"

وہ آفس کی الجھنوں سے ویسے ہی پریشان تھا سامعہ جس سوال کا جواب مانگ رہی تھی وہ تو ایسی پریشانی تھی کہ جو دل سے جاتی ہی نہ تھی۔

ایک کسک ایک خواہش اور اداسی کی لہر بن کر ساتھ رہتی تھی۔

جو اس کے دل میں تھا وہ اس نے اب تک کسی سے شیئر نہیں کیا تھا اور جو سامعہ کو اس نے بتایا تھا اس پر خود اس کا دل اور سامعہ دونوں ہی یقین کرنے کو تیار نہ تھے۔

"سامی! کیا ضروری ہے ہم اس موضوع پر بات کر کے خود کو خواہ مخواہ ٹینشن میں ڈالیں تجھے پتا ہے نا میری اس سے کوئی کمٹ منٹ نہیں تھی بس ایک خیال سا تھا اور اب تو وہ بھی نہیں پھر بھی تم....."

وہ سنجیدہ تھا اس کی نظریں کسی غیر مرئی نقطے پر جمی تھیں تب ہی سامعہ نے کمپیوٹر ٹیبل کے سامنے

والی کرسی سنبھال لی۔

''بھیا! خیال کو حقیقت میں بدلتے دیر نہیں لگتی۔ بس بندے کی لگن سچی ہونی چاہیے۔''

زبان اور ہاتھوں کی رفتار مساوی تھی۔ خزیمہ کی نظر کا ارتکاز بھی ٹوٹا اور وہ سامعہ کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا۔

''اب کیا ہو رہا ہے یہ۔''

''خولہ کمال کی فیس بک پر لے کر جا رہی ہوں آپ کو۔'' اس کے لہجے میں سرشاری تھی۔

''سامی! تم نہیں سدھرو گی۔''

وہ دوسری کرسی گھسیٹ کر اس کے ساتھ بیٹھ گیا تھا۔ فیس بک کا جائزہ لینے کے لیے وہ جانتا تھا فیس بک کسی اجنبی سے تعارف حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ تھی۔

اس کی تصویریں، اس کی مصروفیات اس کے فرینڈز اور اس کی فیملی اگر کوئی ایمانداری کے ساتھ یہ تمام چیزیں فیس بک پہ متعارف کراتا رہے تو پھر بہت جلد دو اجنبی لوگوں میں تکلف کی دیوار گر جاتی ہے سامعہ نے جیسے ہی فیس بک کی وال آن کی تو ڈھیر ساری ویڈیوز، فوٹوز اور میسجز آن اسکرین آ گئے۔

خزیمہ کو انہی چیزوں سے تو کوفت ہوتی تھی۔

پتا نہیں لوگوں کے پاس اتنی فرصت کیسے ہوتی ہے۔

وہ جھنجھلا اٹھا کیونکہ سامعہ اس کے ضبط کا امتحان لے رہی تھی ڈائریکٹ خولہ کمال کی پروفائل پر جانے کے بجائے سب کی پوسٹ چیک کر رہی تھی۔

پھر یکدم ہی سامعہ نے ایک ونڈو پر کلک کیا تو اس کا بے حد روشن چہرہ مدہم سی مسکراہٹ کے ساتھ تقریباً مانیٹر کی ہاف اسکرین پر جگمگانے لگا۔

خزیمہ کی آنکھیں روشن سی ہو گئیں اور چہرہ اندرونی مسرت سے جگمگانے لگا۔

صرف اس کی تصویر دیکھنے پر یہ حال تھا اگر کبھی وہ سامنے آجائے تو۔ وہ بے اختیار سوچ کر رہ گیا۔

تب ہی سامعہ نے اس کی فیس بک کی وال پر کلک کیا تو وہ یکدم چونک سی گئی۔

اس کا بالکل تازہ پیغام لکھا ہوا نظر آرہا تھا اور اس نے اپنے تمام دوستوں کو مخاطب کیا ہوا تھا۔

''میرے پاپا آئی سی یو میں ہیں پلیز ان کے لیے بہت ساری دعا کریں۔''

اس کے انگریزی میں لکھے گئے جملے کا مفہوم سامعہ اور خزیمہ دونوں کو بے چین سا کر گیا جیسے کوئی کسی بے حد اپنے کی تکلیف پر دکھی ہو جائے۔

اور وہ تو ایسی تھی کہ ہزاروں میل دور ہونے کے بعد بھی خزیمہ کو اپنے وجود کا حصہ لگتی تھی۔

خزیمہ نے غور سے دیکھا تو وہ نوٹ صرف دس منٹ پہلے کا تھا۔ سامعہ کی نظریں بھی ٹائم پر جمی تھیں اس نے فوراً سے بیشتر چیٹ باکس کھولا مگر وہاں پر اس وقت دیگر لوگ تو آنلائن تھے مگر خولہ کمال آفلائن ہو چکی تھی۔

خزیمہ کو شدید مایوسی نے آن گھیرا۔

لیکن اگر وہ آنلائن ہوتی بھی تو میں اس سے کیا بات کرتا۔ سامعہ نے اس کی سوچ پڑھ لی تھی۔

''بھیا! آپ کو کوئی میسج کرنا ہو تو میری فیس بک یوز کر لیں کوئی مسئلہ نہیں اسے پتا ہے میں آپ کی اکلوتی لاڈلی بہنا ہوں۔''

اس نے مسکراتے ہوئے ایک اور انکشاف کیا تو خزیمہ حیرت سے اس کا معصوم سا چہرہ دیکھنے لگا۔ جس پر اس کی بہت پیاری اور دل کی تھکن سمیٹ لینے والی مسکراہٹ تھی۔

''میں نے اسے بہت دن پہلے ایڈ کیا تھا تب وہ دن میں ایک بار ضرور آنلائن ہوتی تھی پھر میں نے اسے بتایا کہ میں اس کی بہت بڑی فین ہوں اور میرے بھیا بھی..... انہوں نے کبھی ریڈیو نہیں سنا تھا لیکن آپ کو سننے کے بعد وہ کچھ پاگل سے ہو گئے ہیں۔

پتا ہے بھیا! اس ہر اس نے iconsmile مسکراتا ہوا کارٹون بھیجا اور پوچھا کیا نام ہے تمہارے بھیا کا کیا کرتے ہیں وہ میری بے وقوفانہ باتیں سننے کے علاوہ اور جب میں نے اسے بتایا آپ کا نام تو وہ یکدم آف لائن ہوگئی۔"

سامعہ نے بڑے مزے سے پورے ایکشن کے ساتھ یہ داستان اس کے گوش گزار کی تھی۔

"پھر ایک دن میں نے اس سے بہت ساری باتیں کیں اس نے مجھے اپنے اور اپنی ٹوئن سسٹر کے بارے میں بتایا اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ لوگ پاکستان صرف چند مہینوں کے لیے آئی تھیں لیکن یہاں آ کر زندگی اتنی اچھی لگی کے واپس جانے کے موڈ میں نہیں ہیں۔"

اس کی بات پر خزیمہ کا دل بڑے زور سے دھڑکا تھا وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔

"پھر....."

"پھر میں نے اس سے ریڈیو کا پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ یہاں کی ٹیم کے ساتھ کمفرٹیبل نہیں تھی اس لیے گیپ لے لیا۔"

"اوں.....تو اس کا مطلب ہے مجھے اپنی اسلام آباد پوسٹنگ کے لیے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ ہوسکتا ہے قسمت مجھے دوبارہ کسی خاص مقصد کے لیے اس کے پاس لے کر جا رہی ہو اس کے شہر میں کچھ دن رہنے کا ٹھکانہ دے رہی ہو۔ شاید قدرت نے کچھ انوکھا ہی سوچ رکھا ہو۔"

اس کے مسکراتے چہرے پر کسی سوچ کا عکس ڈھیر سارے رنگ بکھیر گیا تھا۔

سامعہ بغور اس کو دیکھ رہی تھی۔

"کیا سوچ رہے ہو بھیا جانی!"

"میں سوچ رہا ہوں کل کی اسلام آباد کی سیٹ کنفرم کروا لیتا ہوں۔ مجھے اس کے پاپا کی عیادت بھی تو کرنی ہے۔"

وہ اسے شریر نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اپنے خیالات کی تصدیق کر رہا تھا۔

''بھیا! آپ سچ مچ چلے جائیں گے۔'' وہ یکدم روہانسی ہوگئی آنکھوں میں پانی جمع ہونے لگا۔

''کیا مطلب چلا جاؤں گا میں کوئی امریکہ، لندن جا رہا ہوں جو تو اتنی پریشان ہوگئی۔ یہ رہا اسلام آباد پڑوس میں صرف ڈیڑھ دو گھنٹے کی دوری پر۔ اور پھر سوچ نا میری پروموشن بھی تو ہو رہی ہے نا۔ کنٹری منیجر بن جائے گا تیرا بھائی۔ اور کیا پتا جسے تو بھابھی بنانے کے خواب دیکھ رہی ہے وہ بھی مان جائے۔''

خزیمہ اب اسے اپنی بانہوں میں لے کر اسے تسلیاں دے رہا تھا۔ آنسو پونچھ رہا تھا بھابھی والی بات پر وہ بے ساختہ مسکرا دی تھی۔

''اچھا رکیں میں اپنی بھابھی کو کوئی اچھا سا میسج تو کر دوں۔ پتا نہیں ان کے پاپا کو کیا ہوا ہے؟''

وہ ان کی بانہوں کے حلقے سے نکلی پھر کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''اور سنو امی کو سنبھال لینا ان کا دل فاطمہ پر آیا ہوا ہے انہیں روکو۔''

سامعہ اس سے چھوٹی ضرور تھی مگر عقل میں اس سے بہت آگے۔ وہ آجکل امی کے اصرار اور اسلام آباد پوسٹنگ کی وجہ سے پریشان تھا لیکن اس لمحے اسے اسلام آباد پوسٹنگ سب سے بڑی نعمت محسوس ہو رہی تھی۔

اس کے دل میں امید کے نئے دیپ جل اٹھے تھے خولہ ابھی تک پاکستان میں تھی یہ خبر ساری الجھنوں کا مداوا کر گئی تھی۔

سامعہ کی انگلیاں کی بورڈ پر بڑی تیزی سے چل رہی تھیں اور اس کھٹ کھٹ میں اسے زندگی کا شور سا محسوس ہو رہا تھا۔

وہ اپنی وارڈ روب کے سامنے کھڑا پیکنگ کے لیے کپڑوں کا جائزہ لینے لگا۔

☆.....☆.....☆

شجاع نے ڈی ایس پی طاہر کے ساتھ ذاتی نوعیت کی ملاقات کی تھی اور اس ملاقات کا مقصد وہ لائحہ عمل طے کرنا تھا جس کے ذریعے مجرموں کا سراغ لگایا جا سکے۔

ڈی ایس پی طاہر اپنے کام کے ساتھ مخلص اور انویسٹی گیشن میں خاصی نہارت رکھتا تھا۔

اس کی اور شجاع کی دوستی کئی سالوں پر محیط تھی لیکن شجاع نے کبھی اس کو ناکام ہوتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اس سے قبل بھی وہ ایک دس سالہ بچے کے اغواء کے کیس کو بڑی خوبی سے نبٹا چکا تھا بچہ بھی بخیریت بازیاب ہوا اور مجرم..... جو کہ عادت مجرم نہیں تھے بلکہ اپنی ضرورت سے مجبور ہو کر یہ واردات کر بیٹھے تھے پکڑے گئے تھے۔

اس بار محسوس یہ ہو رہا تھا کہ راحت بیگم کا اغواء نہ تو کسی دشمنی کا نتیجہ ہے اور نہ ہی یہ عادی مجرموں کی کاروائی لگتی ہے لیکن جس چیز کا فائدہ وہ اٹھا رہے تھے اور کوئی سراغ نہیں دے پا رہے تھے وہ راحت بیگم کا سیل فون تھا۔ انہوں نے اب تک تمام کالز ان کے موبائل سے کی تھیں۔ پولیس نے اپنے طور پر ان تمام جگہوں پر چھاپے مارنا شروع کر دیے تھے جہاں سے موبائل سم کے استعمال ہونے کی نشاندہی ہو رہی تھی مگر کوئی خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

''شجاع میرے خیال میں ہمیں تھوڑا ٹائم چاہیے ہوگا اس بار جب ان کریمنلز کا فون آتا ہے تو کال کو لمبا کرو تھوڑا وقت اور مانگو ان سے۔''

ڈی ایس پی طاہر نے خاص طور پر تاکید کی تھی اور شجاع اس وقت ان سے خواہ مخواہ کی حجت کرنے کا ارادہ کر کے کال کا منتظر تھا تب ہی فون بج اٹھا۔

شجاع نے لپک کر فون اٹھایا صوفیہ اور انعم بھی پاس چلی آئیں۔

''سنا ہے اب تم لوگوں نے نیا ڈرامہ رچایا ہے۔''

یہ آواز اجنبی نہیں لیکن غیر متوقع ضرور تھی۔

''آپ کا دماغ خراب ہے میں اس وقت آپ سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔''

وہ یکدم بھڑک اٹھا صوفیہ نے قریب آ کر اشارے سے پوچھا۔

''کون ہے وہ؟'' اسے شجاع کے تیور بہت خطرناک لگ رہے تھے۔

''آپ کے تایا ہیں اور انہیں لگتا ہے اب ہم کوئی ڈرامہ کر رہے ہیں۔''

اس نے ریسیور کان سے دور کر کے صوفیہ کو بتایا تو وہ اپنا ضبط کھو بیٹھی۔

ریسیور شجاع کے ہاتھ سے جھپٹ کر لے لیا۔

''تایا میرے اور آپ کے درمیان احترام کا رشتہ کبھی تھا مگر اس لمحے سے اب ہمارے درمیان صرف نفرت کا رشتہ ہے۔ مجھے نہیں پتا میں اپنی فرشتہ صفت ماں کو دکھ دے کر اسے ناراض کر کے آپ لوگوں کے پاس کیوں آ گئی تھی پتا نہیں آپ لوگ مجھ سے کیا چاہتے تھے وہ تو میری قسمت اچھی تھی جو اللہ نے مجھے آپ کی سازشوں سے بچا لیا۔

مجھے پتا ہے میری ماں کی بربادی اور میرے باپ کی موت کے ذمہ دار صرف آپ ہیں میرا باپ اتنا حساس اور غیرت مند تھا اس نے آپ جیسے بھائی کے ساتھ رشتہ رکھنے کے بجائے موت کو گلے لگا لیا۔ آپ نہیں جانتے آپ کس قدر ظالم آدمی ہیں۔''

وہ اس وقت بالکل مختلف صوفیہ تھی اس کی آنکھوں میں غصہ اور نفرت اتنی شدت کے ساتھ امڈ کر آیا تھا کہ انعم حیرت سے کبھی شجاع کو کبھی اسے دیکھ رہی تھی۔

شجاع نے اشارے سے انعم کو سمجھایا۔

''اسے بات کرنے دو ورنہ یہ لوگ زندگی عذاب بنائے رکھیں گے۔''

وہ دونوں سامنے والے صوفے کی طرف چلے گئے اور صوفیہ چہرے پر نفرت سمیٹے اپنے تایا کی بات سن رہی تھی۔

''پتا ہے آپ چاہتے تو اس گھر کو سب کے لیے سکون کی جگہ بنا سکتے تھے۔ جہاں رہتے ہوئے زندگی کا احساس ہوتا مگر آپ نے تو اس گھر کو قبرستان بنا دیا پتا نہیں کیوں تایا یہ آپ کا کون سا روپ ہے جس نے کئی زندگیاں داؤ پر لگا دیں۔''

انعم اٹھ کر اس کے پاس چلی آئی۔

''صوفی بس کر دے کیوں خود کو ہلکان کرتی ہے آگے ہی تو نے رو رو کر حشر کیا ہوا ہے۔''

انعم نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''اللہ نے چاہا تو امی کل تک گھر آ جائیں گی اور آپ کو اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہیے کیونکہ ہمارا اور آپ کا رشتہ ختم ہو چکا ہے۔''

اس بار اس کی رفتار دھیمی ہو چکی تھی دوسری طرف سے شاید اسے تسلی دی جا رہی تھی۔

''دیکھیں اب یہ ساری باتیں بے معنی ہیں آپ نے جو کیا اور جو اس وقت سوچ رہے ہیں وہ سب آپ کے چہرے پر آ جاتا ہے پلیز خود کو قابلِ نفرت نہ بنائیں اور پلیز اب اس گھر میں فون کبھی مت کرنا آپ یوزن سمجھ لیں ندیم شاہ کی طرح صوفیہ بھی مر گئی۔''

اس نے مضبوط لہجے میں کہتے ہوئے فون پٹخ دیا تھا اور انعم کے گلے لگ کر رونے لگی۔

شجاع نے ایک نظر صوفیہ پر ڈالی اور پھر سب سے ضروری کال کرنے کے لیے ڈی ایس پی طاہر کا نمبر ملانے لگا۔

''طاہر! بزی تو نہیں ہو۔''

''میں تمہیں کچھ امپورٹنٹ انفارمیشن دے رہا ہوں اس کو انویسٹی گیشن میں ٹاپ پر لے لو..... لکھو۔''

''سید عظیم شاہ..... سید فہیم شاہ..... ہاں پھوپھی کی سابقہ سسرال۔''

وہ بڑے اطمینان سے ڈی ایس پی طاہر کو تمام تر تفصیلات سے آگاہ کر رہا تھا نام، کاروبار، محلّہ، گھر اور بھی بہت کچھ.....

انعم تو حیرت میں تھی ہی صوفیہ کو بھی حیرانی ہو رہی تھی شجاع کو تو اس کے تایا عظیم شاہ کے بارے میں اتنا کچھ پتا تھا کہ وہ بھی اتنا نہیں جانتی تھی۔

''دعا کرو جو اس وقت میں سوچ رہا ہوں ویسا کچھ نہ ہو لیکن اگر میرے سچ کی تصدیق ہو گئی نا تو میں اس خاندان کا نام و نشان تک مٹا دوں گا.....بس بہت ہو چکا.....اب اور نہیں ہونے دوں گا۔''

شجاع کے چہرے پر چٹانوں کی سختی تھی۔

☆.....☆.....☆

نازیہ کنول نازی کا بہت خوبصورت نیا ناول

جنہیں راستے میں خبر ہوئی

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

رابعہ رزاق کا بہت خوبصورت نیا ناول

خواب خواہش اور زندگی

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

نعمان کو پولیس پکڑ کر لے گئی تھی اور گھر میں کسی کو کوئی فکر نہیں تھی۔

عظیم شاہ نے صوفیہ سے بے عزت ہونے کے بعد فون ہی اٹھا کر پھینک دیا تھا اور تائی حیرت سے کبھی فون کے ٹکڑوں کو تو کبھی اپنے مجازی خدا کو دیکھ رہی تھیں۔

ساری زندگی گزر گئی یہ شخص ان کے پلے نہ پڑا۔

''ارے فون کا ہی ستیاناس مار دیا بچے کی خیر خبر تو لے لیتے ان پولیس والوں کو میرا ہی معصوم بچہ نظر آیا تھا اللہ غارت کرے۔''

وہ بلند آواز میں شروع ہو گئی تھیں عظیم شاہ کا پارہ ہائی تو تھا ہی فون پر پہلے غصہ اترا تھا اب اٹھ کر دروازے کو لات رسید کی تھی اور پھر تائی کو ایک جھانپڑ.....

یہ سب کچھ اتنی رفتار اور تسلسل کے ساتھ ہوا تھا کہ تائی کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔

کسی فلم کے ایڈیٹ۔ فاسٹ سین کی طرح تائی اب چہرے پر ہاتھ جمائے ہکا بکا ادھر ادھر دیکھ رہی تھیں کہ کسی کی نظر تو نہیں پڑی اس فلمی سین پر.....

''یہ جو تو جس کو معصوم بچہ کہہ رہی ہے پورا حرام کا پلا ہے..... کام کاج کرتا نہیں کسی شریف زادے سے اس کی دوستی نہیں طوائفوں کے گھر سے میں نے اسے نکلتے دیکھا ہے..... ارے وہ تو ساری عمر جیل میں سڑتا رہے میں ضمانت کروانے نہ جاؤں۔''

تایا روانی میں بہت کچھ بول گئے تھے۔ موٹی موٹی گالیوں کے ساتھ اور لاحقوں سمیت.....

البتہ تائی کے گرد ایک ہی جملے کی تکرار ہو رہی تھی۔

''طوائفوں کے گھر سے میں نے اسے نکلتے دیکھا۔''

ان کے اس جملے کا زہر تائی کی زبان کی نوک پر اتر آیا انہوں نے فساد لمبا کرنے کے بجائے ساری کڑواہٹ اپنے اندر اتار لی۔

''ارے تو کیا دونوں باپ بیٹا ایک ہی کوٹھے پر جاتے ہو۔''

یہ وقت مصلحت سے کام لینے کا تھا سفیر بھی شہر سے باہر گیا ہوا تھا فہیم سے کسی بھلائی کی امید نظر نہیں آ رہی تھی سعدیہ کے بعد وہ بالکل ہی گوشہ نشین ہو گیا تھا لے دے کر عظیم شاہ رہ جاتے تھے جو نعمان کے سلسلے میں کچھ کر سکتے تھے اور تائی کو اس وقت صرف اور صرف اس کی فکر کھائے جا رہی تھی۔

پولیس کا کیا بھروسہ کسی بڑے کیس میں اندر کر دیتی تو وہ کہاں سے مقدمہ لڑتے کون ان کی سنتا۔

نعمان کی پریشانی میں وہ اپنا صدمہ بھی بھول گئیں جو اچانک عظیم شاہ کے تھپڑ کی صورت میں ملا تھا اور چونکہ یہ مہربانی تو زندگی کے ساتھ تھی اس لیے کوئی خاص فرق بھی نہیں پڑا تھا۔

''دیکھو سفیر کے ابا! ہے تو تمہاری اولاد اب اسے اس طرح دوسروں کے رحم و کرم پر تو نہیں چھوڑ سکتے۔ پتا نہیں کس حال میں ہو گا وہ پولیس والے تو مار مار کے ادھ موا کر دیں گے اس کو دیکھو اتنے ظالم مت بنو کچھ کرو۔''

وہ روہانسی ہو گئی تھی ہر ماں کی طرح انہیں بھی اپنی یہ ناخلف اولاد زیادہ کچھ عزیز تھی۔

''میں تو چاہتا ہوں وہ اس کے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک کریں تا کہ اسے اپنی ذلالت کا احساس تو ہو۔'' وہ جانے کہاں کا غصہ کس پر اتار رہے تھے۔

تائی نے دہل کر سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔

''اللہ نہ کرے کیا ہو گیا ہے سفیر کے ابا اس عمر میں تم کون سا شریف تھے اور پھر ایسا کون سا قتل کر دیا ہے جو تم برا ہی سوچے جا رہے ہو تین چار لڑکوں کو پکڑا ہے پولیس والوں نے شاید آپس میں جھگڑا کر رہے تھے نا۔''

انہیں اصل صورت حال کا بھی علم نہیں تھا۔ بس جو کچھ نعمان نے بتایا تھا۔

''نہیں صرف دو لڑکوں کو پکڑا ہے پولیس والوں نے ایک تمہارا نعمان اور دوسرا بھی تم لوگوں کا ہی

عزیز ہے بس داماد بنتے بنتے رہ گیا وہ میراثی لڑکا اظہر..... جو سعدیہ کو بھگا لے گیا ہے۔"

ان کے منہ سے کف نکل رہا تھا اور حسب عادت گالیوں سے بیان میں رنگ بھر رہے تھے چہرے پر اضطراب اور آنکھوں میں زمانے بھر کی نفرت تھی۔

"کیا کہہ رہے ہو سفیر کے ابا!" اظہر کا نعمان سے کیا واسطہ وہ کہاں سے بیچ میں آ گیا۔

تائی کے لیے یہ نیا صدمہ تھا۔ انہیں تو لگتا تھا اظہر نام کا لڑکا اس ملک سے تو نہیں شہر سے ضرور دور جا چکا ہوگا۔

"ارے یہ ہی تو بتا رہا ہوں مجھے تو دونوں کی کوئی ملی بھگت لگ رہی ہے سب سمجھ میں آ جائے گا بس ذرا مجھے فرصت مل جائے۔" انہوں نے اب ادھر سے ادھر ٹہلنا شروع کر دیا تھا تائی فون سمیٹ رہی تھیں۔

"اے ہائے! سفیر کے ابا! اچھا تو تم کبھی نہیں سوچ سکتے میرا نعمان ایسا نہیں ہو سکتا جانتے کو نا سعدیہ کی اپنی حرکتیں خاندان کو ذلیل کروانے والی تھیں۔"

اپنے بیٹے سے تو بدگمانی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا اور سعدیہ تو قصہ پارینہ ہو چکی تھی۔

"دیکھ لینا میری آنکھیں ہمیشہ بہت آگے تک دیکھ رہی ہوتی ہیں آج تم جس بات کو جھٹلا رہی ہو کل وہی سامنے آئے گی۔" وہ ایک نئی کہانی پر بضد تھے تائی کا ماتھا ٹھنکا۔

"کیا چاہتے ہو کھل کر بتاؤ پہیلیاں مت بوجھواؤ نا کیا سنا ہے۔" وہ پاس چلی آئیں ہاتھ تھام کر رازداری سے پوچھا۔

"ارے سنا نہیں یقین ہے سعدیہ نعمان کی مرضی سے اظہر کے ساتھ چلی گئی اب دونوں پیسوں کے معاملے پر لڑ رہے ہوں گے اس لیے۔"

وہ بے رحمی سے کہہ کر کھڑکی کی طرف مڑ گئے جہاں انہیں آہٹ سی محسوس ہوئی تھی اور تائی تو ان کی بات پر صدمے میں گھر گئی تھیں۔

اگر چہ اس بات کو عقل تسلیم نہیں کرتی تھی تب بھی صدمے کی بات ایک باپ کا بیٹے کے خلاف حد درجہ متنفر رویہ اور بدگمانی تھی جس کے بعد تائی کی امیدیں دل توڑنے لگی تھیں۔

''تم دیکھ لینا نسرین بیگم وہ میرا باپ نہیں ہے میں اس کا باپ ہوں اتنا تو اپنی اولاد کو جانتا ہوں۔'' انہوں نے بیرونی دروازے کی طرف قدم بڑھائے تائی دو قدم آگے آ کر دیوار سی بن گئیں۔

''اللہ کے واسطے ایسی باتیں نہ کرو نعمان لاابالی، لاپرواہ، اور ضدی ضرور ہے لیکن اتنی گھٹیا حرکت کبھی نہیں کر سکتا۔'' انہوں نے عظیم شاہ کا ہاتھ تھام لیا۔

''جا رہے ہو نا اس کو ساتھ لے آنا دو فون آ چکے ہیں تھانے سے۔'' وہ اس وقت صرف نعمان کی ماں بن کر بات کر رہی تھی۔

عظیم شاہ کی الجھن چہرے پر لکیروں کی صورت پھیل گئی۔

''میرا دماغ مت کھاؤ آگے ہی کم پریشانیاں نہیں تھیں جو تمہاری اولاد یہ مہربانی کر کے بیٹھ گئی اب اپنی منحوس صورت لے کر سامنے سے ہٹ جاؤ دیکھتا ہوں میں کیا ہو سکتا ہے۔''

وہ بالآخر نرم پڑ گئے تھے تائی کے آنسو یا کوئی اور وجہ لیکن عظیم شاہ نے اس وقت اپنی زوجہ پر احسان عظیم کیا تھا اور تائی جانتی تھیں کہ اس احسان عظیم کی کوئی بھاری قیمت ہی چکانی پڑے گی۔

☆.....☆.....☆

میں ہوتا ہوں
میرے اندر
ایک سنہرا
حد سے گہرا
غم ہوتا ہے

جب بھی آنکھیں کھولوں

سامنے منظر دیکھوں

گھاس اگ آتی ہے

اور رستہ ضم ہوتا ہے

وہ نہ بے آواز رو رہی تھی اور نہ ہی اس کی آنکھیں نم تھیں لیکن اس کے اردگرد شام کی اداس کر دینے والی ہوا کا شور اتنا زیادہ تھا کہ اسے اپنے اندر سے بین کی آوازیں آتی محسوس ہو رہی تھیں۔

وہ منیر کمال کی بیٹی تھی۔

وہ مریم فاطمہ کے بطن سے پیدا ہوئی تھی۔

تمام عمر جس شخص نے اسے پیار، محبت، ماں اور باپ کی شفقت دے کر پروان چڑھایا اس کے لیے سکھ کا اہتمام کیا۔

منیر کمال اس شخص کی خوشی کا بھی مجرم تھا۔

اور اب اس کی زندگی کا بھی دشمن.....

اس کے تمام ڈاکومنٹس میں صرف منیر کمال کا نام ولدیت کے خانے میں تھا لیکن باقی کے تمام معاملے کے لیے راجہ طارق محمود کا نام پتا دیا جاتا ہے۔

اور وہ اس بات پر ہمیشہ بڑے فخر سے کہا کرتی تھی۔

مائی سول فادر۔

وہ اس رشتے کو بڑے اعزاز اور اہتمام کے ساتھ جی رہی تھی کہ!

زندگی حادثات کی راہ پر چل پڑی۔

پہلے پاکستان آنا۔

پھر منیر کمال سے ملنے کا خوف.....

لیکن منیر کمال سے ملاقات تو نہیں ہوئی البتہ اس کے کرتوتوں نے کسی سائے کی طرح پیچھا کیا۔

وہ نانو کا، راجہ طارق محمود کا، عاشر عباس کا سب کا صبر سمیٹ کر لے گیا تھا۔

اب صرف اس کے لیے بددعائیں تھی ان کے پاس.....اور وہ منیر کمال کی بیٹی تھی۔

ایک بدکار، بدکردار شخص کی بیٹی اس کے اندر ماتم سا بپا تھا۔ وہ اس حقیقت سے کمیشہ آشنا تھی مگر آج پورے وجود میں اس حقیقت کی تلخی زہر بن کر دوڑ گئی تھی۔

اب عاشر عباس پھر سے صدیوں، قرنوں کے فاصلے پر چلا گیا تھا۔ کیوں کہ ان دونوں کے درمیان منیر کمال آ گیا تھا۔

جس طرح وہ شمائلہ کے لیے بچھڑ گئے تھے۔

اف اس نے ایک گہری سانس لی۔

واہ رے زندگی.....

تھے بہت بے درد لمحے ختم درد عشق کے

تھیں بہت بے مہر صبحیں، مہرباں راتوں کے بعد

ابھی تو مہرباں رات نے آنا تھا ابھی تو شام کے آنچل میں پناہ ملی تھی۔

ابھی تو خوشگوار پلوں سے قربت کا سلسلہ باقی تھا۔

ابھی تو مناجاتوں کا سلسلہ باقی تھا۔۔ یہ تو گلوں شکوؤں کا موسم تھا..... ابھی تو دلداری سے غمگساری تک سفر شروع ہوا تھا۔

اور میں نے خود اس راستے پر کرچیاں بکھیر دیں۔

یا اللہ! تو میرا حوصلہ قائم رکھنا تو مجھے اس سفر میں نڈھال مت ہونے دینا میرے رب تو مجھے

ٹوٹنے نہیں دینا۔ میں نے زندگی سے بہت پیار کیا ہے لیکن مجھے زندگی سے بھی پیارا جو لگا ہے وہ عاشر ہے اس سے اچانک ملنا کوئی حادثہ نہیں تھا یہ تیرا فیصلہ تھا میری تقدیر کا دلکش موڑ تھا۔

وہ تو ازل سے میرے اندر موجود تھا۔

میرے وجود کی طاقت اور توانائی بن کر لیکن مجھ سا بدنصیب بھی کوئی ہوگا کہ ہر بار میری ذات اس کے دکھ کا موجب بنی وہ میرے اندر زندگی بن کر دوڑ رہا ہے اور میں نے اسے زندگی کا سب سے بھیانک چہرہ دکھا دیا۔

اب وہ بے آواز رو رہی تھی۔ آنسوؤں کی برسات اس کے اندر باہر تواتر سے ہونے لگی تھی۔

اسپتال کے لان کا یہ ویران گوشہ اس کی سسکیاں سن رہا تھا اور اس کے دکھ بانٹنے کے لیے رنگ برنگے پھولوں کی خوشگوار سی مہک بھی سمیٹ لایا تھا لیکن وہ بس اب رونا چاہتی تھی۔

☆.....☆.....☆

"کیا ہوا پھر رسوا ہو کر آ گئیں تمہارا تو دماغ خراب ہے، کیوں بار بار اس کے پاس جاتی ہو جانتی ہو وہ جب تمہارا نہیں ہے تو پھر اس سے امیدیں کیوں لگا رہی ہو۔"

منیر کمال نے نڈھال سی شمائلہ کے چہرے پر طنزیہ نگاہ ڈالتے ہوئے کہا تو شمائلہ نے بے زاریت سے رخ موڑ کر اے سی کا ریموٹ اٹھا لیا احساس توہین کی تپش اور لاحاصل سفر کی تھکن نے بے جان سا کر دیا تھا وہ اس وقت بالکل تنہائی چاہتی تھی لیکن مجبوری یہ تھی کہ پہلے دن سے وہ دونوں ہوٹل کا یہ روم شیئر کر رہے تھے۔

آج کل ان کا اپنے اپارٹمنٹ میں رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ ایف آئی اے نے منیر کمال کا نام تفتیش میں شامل کیا ہوا تھا اور اس بار ستم یہ تھا کہ سرمد بخاری بھی اس سے اکھڑا ہوا تھا۔

"دیکھو تم میرے معاملے میں نہ بولو تو بہتر ہوگا تم اپنے بارے میں سوچو بہت برا پھنسنے والے ہو۔"

اس نے برائے نام لباس کی ڈوریاں ڈھیلی کرتے ہوئے اپنا سگریٹ کیس اور ایش ٹرے اٹھالی۔

''جانِ من تمہارا اور میرا معاملہ الگ الگ نہیں ہے پھنسیں گے دونوں جئیں گے مریں گے دونوں یاد ہے تم نے میرے ساتھ زندگی بنانے کی قسمیں کھائی تھیں دیکھو اب تم اپنے وعدے سے مکرنا نہیں۔''

وہ حسبِ عادت کمینی سی مسکراہٹ اچھالتا ہوا اسے اپنے ٹریک پر لانے لگا۔

منیر کمال بیڈ کراؤن کے سہارے نیم دراز بڑے سکون سے ٹی وی دیکھ رہا تھا اور شمائلہ کو اس وقت منیر کمال کی خوشی اور کمرے کا سکون بہت ناگوار گزر رہا تھا۔ شاید اندر اور باہر کی دنیا کا تضاد اسے ہضم نہیں ہو رہا تھا اس کے اندر تو صرف آوازوں کا شور تھا۔

عاشر عباس نے کہا تھا۔

''کاش میں آپ کا بیٹا نہ ہوتا۔

کاش میرا آپ سے کوئی رشتہ نہ ہوتا تب آپ کو یہ تماشا کرنے کا حق بھی نہ ہوتا۔''

کتنا مہذب تھا اس کا انداز مگر کتنی نفرت تھی اس کے لہجے میں وہ سرتاپا کانپ کر رہ گئی۔

''منیر!'' وہ بے ساختہ اسے مخاطب کر بیٹھی۔

''وہ دو ٹکے کا لڑکا مجھے کہہ رہا ہے چھوٹے لوگوں کو بڑے ناموں کے ساتھ جڑنے کا ان سے دوستیاں کر کے کام نکلوانے کا بڑا شوق ہے۔''

منیر کمال کو بھی اس کی بات پر حیرت ہوئی۔

''کون لڑکا..... کہاں پر.....''

''اسپتال میں عاشر کے ساتھ تھا اس کا کوئی دوست کسی فارن منسٹر کا بیٹا بھی ہو سکتا ہے۔'' شمائلہ نے قیاس آرائی کی تو منیر کمال کے چہرے پر شکنوں کا جال بن گیا۔

''دیکھو میں تمہیں بارہا ایک ہی بات سمجھا رہا ہوں اس وقت زیادہ سوشل مت ہو لوگوں سے ملنا

جلنا بہت زیادہ سفر کرنا بھی ہمارے لیے خطرناک ہوسکتا ہے۔

سرمد کا کچھ پتا نہیں وہ کب بیچ راستے میں چھوڑ کر الگ ہو جائے مجھے اس کے تیور ٹھیک نہیں لگتے اور تمہیں پتا ہے ہماری بیک بون وہی ہے۔"

وہ خوفزدہ سا تھا۔

"ارے اسے کہاں جانا ہے میں ذرا عاشر کے مسئلے سے نبٹ لوں پھر اسے بھی ٹھیک کرتی ہوں پریشان مت ہو۔"

وہ دوسرا سگریٹ سلگاتے ہوئے بولی۔

یہ مسئلہ دونوں کا مشترکہ تھا اس لیے فوراً ہی ایک دوسرے کے ہمدرد غمگسار بن گئے۔

"اس خوشی میں ایک ایک پیگ ہو جائے۔"

وہ للچائی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"بنالو....."

وہ خود بھی اذیت کی گھٹن سے باہر نکلنا چاہتی تھی۔ اس لیے فوراً راضی ہوگئی۔

پہلی بار جب اس نے حرام شے کو منہ لگایا تھا تب بھی وہ شدید اذیت میں تھی اور منیر کمال نے کہا تھا۔

"آج میری پارٹی جوائن کر کے دیکھو تم لمحوں میں سارے غم بھول جاؤ گی تمہاری زندگی کا سب سے خوبصورت دور شروع ہو جائے گا صرف ایک بار میرا ساتھ دو۔"

پھر وہ ایک بار کا ساتھ ساری عمر کا عذاب بن گیا تھا اس کی زندگی کا دب سے خوبصورت دور شروع تو ہوا تھا مگر زندگی ختم ہوگئی تھی۔

"منیر ایک بات تو بتاؤ۔" ایک پیگ لینے کے بعد اب اس کے ذہن نے دوسری ڈگر پر کام کرنا شروع کر دیا۔

''بولو جانِ من..... کبھی کبھی تو تم اس موڈ میں آتی ہو۔''

وہ بھی مست ہو رہا تھا۔

''تم نے جس عورت سے شادی کی تھی اور اپنی اولاد پیدا کی کیا تمہیں اس کی شکل یاد ہے کوئی نشانی کوئی تصویر.....''

وہ بے حد سنجیدہ اور پر تجسس انداز میں مخاطب تھی۔

''یہ کیا بکواس ہے..... میں بھلا کیوں اس کی نشانیاں سنبھال کر رکھوں گا۔''

اس کی زبان لڑکھڑانے لگی وہ خالص اور بے حساب پینے کا عادی تھا۔ لیکن اس وقت زبان کی لڑکھڑاہٹ کا سبب شمائلہ کا تجسس تھا۔

''تمہیں یاد ہے نا جب تم مجھ سے ملے تھے تو تم نے کہا تھا تمہاری زندگی میں کوئی نہیں تم بالکل تنہا ہو تم دنیا کو انٹرٹین کرتے ہو لیکن تمہارے دکھ سمیٹنے والا کوئی نہیں..... ہے نا۔''

وہ سب کچھ یاد کر رہی تھی منیر کمال کا سر اثبات میں ہل گیا۔

''لیکن اس وقت تمہاری شادی.....''

وہ دانستہ رک گئی منیر کمال نشے میں جا چکا تھا اب اس نے جو بھی بولنا تھا عاری اور فریب کے علاوہ کہنا تھا یہ شمائلہ کمال کا بہترین حربہ تھا وہ اسے بہت سارا پلا کر سارا کچھ اگلوا لیا کرتی تھی۔

''میں نے جب تمہیں دیکھا تھا تو مجھے لگا تم نہ ملی تو مر جاؤں گا جوانی سے بھرپور زندگی کا نشہ تھیں تم تمہاری آنکھوں میں ایک بار دیکھنے کے بعد کون کافر اس پیک کی تمنا کرتا تھا۔'' وہ مسلسل بولنے لگا شمائلہ کو کوفت ہوئی۔

''اور تمہاری بیوی، بچے.....''

''ارے چھوڑو نا ان کو۔'' وہ مدہوشی میں بولا۔

''ادھر آؤ میرے قریب۔''

وہی پرانا راگ.....

''اس عورت کا نام نہ لو بڑی حرافہ تھی بھاگ گئی سالی اپنے یار کے ساتھ اور میری بیٹیوں کو بھی لے گئی وہ بیٹیاں تھیں میری.....''

یہ منیر کمال کا اصلی روپ تھا جو اس وقت شمائلہ کو نا گوار نہیں گزرا تھا وہ جانتی تھی اس شخص کا نہ ماضی ذلالت سے خالی ہے اور نہ حال۔

''بیٹیوں کو اس سے چھین لیتے۔'' اس نے بدلہ اتارا۔

''ارے کہاں سے چھینتا ادھر تم نہیں چین سے جینے دے رہی تھی ادھر وہ عورت جینا حرام کیے ہوئے تھی میرا میری لاپروائی کا فائدہ اٹھا لیا اس نے میں تم سے کہانی سیٹ کر رہا تھا اور وہ اپنا عشق چلا رہی تھی۔''

''ارے تو اس میں ملال کس بات کا..... یہ تو ہوتا ہے۔'' شمائلہ نے ایک گہری سانس لے کر اس اجنبی عورت سے ہمدردی محسوس کی جسے منیر کمال کی اولاد پیدا کرنے کا کرب سہنا پڑا۔

اس ساری کہانی میں شمائلہ کے لیے کوئی بات نئی نہیں تھی اور نہ ہی وہ منیر کمال سے ہمدردی کر رہی تھی اس کے لیے سب سے اہم بات منیر کمال کی دو بیٹیاں تھیں۔

''سنو کیا تمہاری جڑواں بیٹیاں تھیں ایک جیسی شکل کی.....'' اس نے سرگوشی نما آواز میں پوچھا۔

''ہاں کتیا تھی وہ ایک ساتھ پیدا کیں میں نے تو کبھی ان کی شکل تک نہیں دیکھی ان کی ماں کی منحوس صورت سے ہی نفرت ہو گئی تھی۔''

''کیا بہت کالی، موٹی بھدی تھی وہ عورت۔''

شمائلہ کا شاطر دماغ خوب کہانی بُن رہا تھا۔

''ارے نہیں ایسا ہوتا تو پھر کس بات کا غم تھا۔ انگریزوں والی شکل تھی اس کی اللہ جانے ہمارے گاؤں میں کیسے پیدا ہوگئی۔''

وہ مستقل پی رہا تھا لیکن اب دھیرے دھیرے۔

''کیا مطلب..... تمہاری رشتے دار تھی۔''

''ہاں ہوگی رشتے دار بھی۔''

وہ اب مکمل مست ہو چکا تھا۔ شمائلہ کے ذہن سے آخری جملہ چپک سا گیا تھا۔

''انگریزوں والی شکل تھی اس کی۔''

اس نے اسپتال میں دو انگریزوں والی شکل کی لڑکیاں دیکھی تھیں دونوں ایک جیسی ایک ہی عمر کی۔ راجہ طارق محمود کی لے پالک بیٹیاں۔

اور بلا کی خوبصورت.....

اس کی آنکھیں گہری سوچ میں ڈوب گئی تھیں۔

☆.....☆.....☆

''صوفی میری جان میری زندگی..... کیا اس طرح رونے سے ہماری مشکل آسان ہو جائے گی۔ تم اس وقت میرا ساتھ نہیں دو گی میری طاقت نہیں بنو گی اکیلے بیٹھ کر روتی رہو گی تو میں کچھ نہیں کر پاؤں گا..... پگلو.....''

وہ بہت پیار سے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹتے ہوئے نرمی سے بولا تھا۔ تب وہ اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے کسمسا کر اس سے الگ ہوگئی۔

ان سارے دنوں میں وہ بس اس کا سایہ بنا ہوا تھا نہ اکیلے بیٹھنے دیتا تھا اور نہ رونے دیتا تھا۔

''شجاع! امی ٹھیک ہوں گی نا..... انہیں وہ لوگ پریشان تو نہیں کرتے ہوں گے نا۔''

سیاہ رنگ کے دوپٹے میں اس کا اجلا چہرہ چاندنی کی طرح چمک رہا تھا اور سرخ سوجھی ہوئی آنکھوں نے شجاع کی دھڑکنوں کو تھمنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''جاناں.....'' وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔

''دیکھو.....انہیں پھوپھی جان سے کوئی مطلب نہیں.....انہیں اپنے پیسوں سے مطلب ہے اور ہم ان کی ڈیمانڈ پوری کرنے کو تیار ہیں پھر وہ کیوں انہیں نقصان پہنچائیں گے۔''

وہ اسے تو تسلی دے رہا تھا لیکن خود خوفزدہ تھا گزشتہ چوبیس گھنٹوں میں انہوں نے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا جبکہ پولیس اپنی کاروائی کا آغاز کر چکی تھی۔

وہ فکر مند تھا کہیں اس کارروائی کی وجہ سے وہ لوگ پھوپھی جان کو نقصان نہ پہنچا دیں۔ عموماً اس طرح کے واقعات میں مجرم اپنا سراغ مٹانے کے لیے کچھ بھی کر گزرتے ہیں۔

''آپ کو یقین ہے نا وہ لوگ صرف پیسوں کے لیے یہ سب کر رہے ہیں۔'' اس نے الجھ کر پوچھا۔

ہاں ہاں بالکل۔ وہ پر یقین تھا۔

''تو پھر آپ نے تایا کا نام کیوں.....اس سے کوئی بات نہ بنی۔''

''اوہ تم اس وجہ سے پریشان ہو.....ہونا احمق.....ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا پولیس ہمیشہ شک کی بنیاد پر تفتیش شروع کرتی ہے۔ میرے ذہن میں اس فون سے پہلے بھی تمہارے تایا کا خیال آیا تھا۔

ان فیکٹ لاسٹ ٹائم جب وہ آفس میں توڑ پھوڑ کر کے گیا تھا مجھے پھوپھی جان کی فکر ہوئی تھی کیونکہ ایسے لوگوں سے کچھ بھی بعید نہیں ہوتا اور پھر وہ شخص ہر اس عورت کا دشمن ہے جو اس سے ذہانت قابلیت میں آگے ہو۔''

شجاع نے توقف کیا صوفیہ کے آنسو تھم چکے تھے اور وہ بے دھیانی میں اس کے ہاتھوں کی انگلیوں سے کھیل رہی تھی۔

''یہ کیا ہے؟'' اس نے لطیف سا اشارہ کیا اور سٹپٹا کر دور ہو گئی۔

''میں نے یہ تو نہیں کہا.....''

معنی خیزی برقرار تھی آنکھوں میں جذبوں کی تپش تھی شجاع کو ماحول پر چھانے میں کمال حاصل تھا۔ یہ اعتراف ہمیشہ صوفیہ کرتی تھی۔

''آپ مجھے کچھ کام کی بات بتا رہے تھے۔'' وہ اب نگاہیں اٹھا کر بات کرنے سے قاصر تھی۔

''میں اس وقت اپنی زندگی سے مخاطب ہوں۔ کوئی اور بات نہیں کرنا چاہتا آجاؤ میرے پاس بیٹھو۔''

وہ اسے اپنی خوشبو کے حصار میں لینا چاہتا تھا۔ لیکن صوفیہ نے بروقت کارروائی کر کے یہ حصار توڑ دیا تھا اور اس کے ہاتھوں کی گرفت سے آزاد ہو کر دور جا کھڑی ہوئی تھی۔

''پاگل کب تک بھاگو گی۔'' وہ مسکراتا ہوا اس کے پیچھے آیا۔ تب ہی فون کی بیل بج اٹھی۔

اس نے سائیڈ پاکٹ سے موبائل نکالا اسکرین پر ڈی ایس پی طاہر کا نام جگمگا رہا تھا۔

اس نے بعجلت سلام کیا دوسری طرف طاہر کی آواز میں غیر معمولی اطمینان تھا جو اس کی طبیعت کا خاصہ تھا۔

''طاہر انہوں نے اب تک کوئی رابطہ نہیں کیا میں بہت پریشان ہوں کیا چاہ رہے ہیں وہ لوگ.....''

وہ مدہم لہجے میں صوفیہ سے ذرا فاصلے پر جا کر بات کرنے لگا۔

''وہ تم سے کوئی بات کریں گے بھی نہیں اس لیے کہ ان کے تین بندے پولیس کسٹڈی میں ہیں اور چوتھا فرار ہو چکا ہے۔''

ڈی ایس پی طاہر نے بھرپور اطمینان سے کہا تو وہ چیخ پڑا۔

''تم مجھے اب بتا رہے ہو۔''

اس کی آواز میں غیر معمولی مسرت در آئی تھی۔

''اس لیے کہ میرے پاس بھی یہ خبر اب آئی ہے اور وہ لوگ کراچی پولیس کی کسٹڈی میں نہیں ہیں دوست.....انہیں لاڑکانہ کے آگے کسی گاؤں سے گرفتار کیا گیا ہے۔''

''اور پھوپھی جان۔''

اس کی بے تابی صوفیہ کی دھڑکنیں ساکت کر گئی تھی۔

''شجاع تحمل سے میری بات سنو وہ تین لوگ جو گرفتار ہوئے ہیں ابھی وہ بالکل خاموش ہیں ظاہر ہے اتنی آسانی سے نہیں اگلیں گے پولیس نے جس مکان پر چھاپہ مارا ہے وہاں سے ایک وزیٹنگ کارڈ اور کچھ دوسری چیزیں ملی ہیں جن کا سرا تمہاری آنٹی سے جا کر ملتا ہے۔

وہ وزیٹنگ کارڈ آنٹی کا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کہاں گئیں اور فرار ہونے والا چوتھا بندہ ان کے ساتھ ہے یا وہ خود ان کی غفلت سے کہیں آزاد ہونے میں کامیاب ہو گئی تھیں۔ کیونکہ یہ تو طے ہے کہ وہاں کسی عورت کو رسیوں میں جکڑا ضرور گیا ہے اور ان رسیوں کے ساتھ مزاحمت بھی ہوئی اب مجھے تھوڑا ٹائم دو۔''

وہ انتہائی پروفیشنل انداز میں بات کر رہا تھا۔

''میں تمہیں پوری صورتحال سے آگاہ کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے سوچا تم پریشان ہو گے کیونکہ اب.....حالات دوسرے رخ پر جا چکے ہیں۔''

اس نے دوستانہ لہجہ اختیار کیا۔

''بہت ممکن ہے کہ آنٹی ان کی گرفت سے بچ نکلی ہوں اور کسی محفوظ جگہ پر پہنچ چکی ہوں لیکن ان کا چوتھا ساتھی کہاں ہے۔ اب ہم اس کی تلاش میں ہیں۔''

اس نے اپنی بات مکمل کر کے شجاع کو امید اور بے یقینی کے بڑے صبر آزما لمحے میں لا کھڑا کیا تھا۔

صوفیہ کی نظروں میں آس کی چمک تھی۔

''ڈونٹ وری شجاع! اللہ سب ٹھیک کرے گا دیکھو میں نے کہا تھا تم تعاون کرو گے تو پولیس کو اپنے ہدف تک پہنچنے میں آسانی ہوگی۔تمہاری انفارمیشن بہت کام آئی ہیں۔''

وہ اسے تسلی دے رہا تھا اور شجاع گہری سانس لے کر صوفیہ کو دیکھنے لگا اس نے دوسرے ہاتھ سے صوفیہ کے کندھے کو تھاما۔ڈی ایس پی طاہر سے الوداعی کلمات کیے اور فون بند کر دیا۔

اس کی یکدم خاموشی نے صوفیہ کو خوفزدہ کر دیا تھا۔وہ بس چپ چاپ اسے دیکھ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

''کیا رونے سے گیا وقت ہاتھ آیا ہے۔'' مانوس سی خوشبو زندگی کی نوید دیتا لہجہ اور دل میں اترنے والی آواز.....اس نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔

آنسو تو دونوں کی آنکھوں میں تھے چہرہ تو دونوں کا بھیگا ہوا تھا اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس جگہ پر اکیلے بیٹھی رو رہی ہوگی تو عاشر عباس اسے ڈھونڈتے ہوئے پہنچ جائے گا۔

لیکن بعض چیزیں گمان کے دوسرے سرے پر ہوتی ہیں اور اپنے ہونے کا تعین کر رہی ہوتی ہیں بس وقت ان کی ڈور تھامے رکھتا ہے۔

''چلیں.....اندر چلیں۔نانو بابا کے پاس جانے کی ضد کر رہی ہیں اور انہیں آپ ہی سنبھال سکتی ہیں میں چاہتا ہوں اب ہم انہیں گھر لے جائیں کیونکہ یہاں اسپتال میں.....''

وہ بہت کچھ اپنے اندر ضبط کرتے کرتے تھک گیا تھا۔

''مجھے اپنی ماں پر کوئی اعتبار نہیں وہ پھر انہیں تکلیف پہنچائیں گی میں نے اپنی ماں کی وجہ سے نانا جان کو کھویا ہے میں نانو کو وہ اذیت نہیں دے سکتا۔''

اس نے ایک گہری سانس لی۔

تھکن کا سود رگ و پے میں سرائیت کر جائے تو پھر ادائیگی میں عمر کی نقدی ختم ہونے لگتی ہے۔

کشمالہ اپنا غم بھولنے لگی اپنا دکھ ہلکا لگنے لگا یہ شخص ہر بار اس پر ایک نیا انکشاف کرتا تھا اور اسے مضبوط بندھن میں باندھ لیتا تھا۔

''نانا جان کو کیا ہوا تھا؟''

اس نے مضطرب لہجے میں پوچھا تو وہ اس کا سوال نظر انداز کر کے بالوں کو سلجھاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

''ابھی نانو کے پاس چلیں۔'' اس کے چہرے اور آنکھوں میں کوئی تاثر نہیں تھا کشمالہ نے ستم کر کے چہرے سے نظریں ہٹا دیں۔

وہ توقع کر رہی تھی اب جب عاشر عباس سے سامنا ہوگا تو اس کی آنکھوں میں صرف نفرت ہوگی اور وہ شاید اسے ساری دنیا کے سامنے بے عزت کر کے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لے گا لیکن جو بھی ہوا تھا توقع کے برعکس تھا گویا اس سکوت کے پیچھے جو طوفان چھپا تھا اس کا سامنا ابھی باقی تھا۔ وہ ہولے ہولے قدموں سے عاشر عباس کے ساتھ چلنے لگی۔

☆.....☆.....☆

منیر کمال تو نشے میں دھت ہو گیا تھا البتہ شمائلہ کا اقرار، نیند، چین سب اڑ چکا تھا۔

وہ جلے پیر کی بلی کی طرح ادھر سے ادھر ٹہل رہی تھی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ عاشر کو کس طرح اپنی زندگی میں واپس لائے۔

وہ تو سوچتی تھی کہ عاشر وقتی طور پر بے نیازی کا مظاہرہ کرے گا متنفر ہوگا غصہ کرے گا لیکن پھر ماں کے آنسوؤں کو دیکھ کر بالآخر پگھل جائے گا۔

وہ بچپن میں بھی ناراض ہو جاتا تھا پھر اسے منانا زیادہ مشکل ہوتا تھا وہ ناراض ہو کر اپنی نانو کے پاس چلا جاتا تھا۔

اس کے دل سے ہوک سی اٹھی میری ماں اسپتال پڑی ہے اور میں اس قابل بھی نہیں کہ.....

اس کے اندر احساس زیاں نے اس شدت کے ساتھ سر ابھارا کہ وہ بے بسی سے اپنے بال نوچنے لگی آج اسے اپنے خوبصورت چہرے سے کراہیت سی محسوس ہو رہی تھی اپنی خمار آلود آنکھوں سے وحشت ہو رہی تھی جو اسے بھیانک خوابوں کے راستے پر لے گئی تھیں اور پھر زندگی ایک تماشا بن کر رہ گئی تھی۔

وہ یکدم ہسٹریائی انداز میں چیخنے لگی تھی یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا دماغی توازن بگڑ رہا ہو۔

''اماں..... مجھے بلا لو اپنے پاس اماں.....''

اس کی چیخوں کی آواز پر منیر کمال کا نشہ ٹوٹا بمشکل آنکھیں کھول کر اس کی تلاش میں نظریں دوڑائیں وہ آئینے کے سامنے کھڑی اپنے بال نوچ رہی تھی۔ ناخنوں سے اپنا چہرہ بگاڑ رہی تھی وہ اس وقت شمائلہ کمال نہیں بلکہ عبرت کی تصویر محسوس ہو رہی تھی۔ جس نے منیر کمال کے اندر سنسنی سی دوڑا دی وہ سرعت سے اٹھا اور اس کے ہاتھ مضبوطی سے تھام جکڑ لیے۔

''کیا پاگل ہو گئی ہو..... اسٹاپ اٹ۔''

''ہاں پاگل ہو گئی ہوں میں چھوڑ دو مجھے..... چھوڑو۔'' اس نے پوری طاقت سے خود کو چھڑایا اور قہقہے لگانے لگی۔

''سالی! اس کے دماغ پر کوئی اثر ہو گیا ہے۔'' اس نے نفرت سے منہ پھیرا اور روم سروس کا نمبر ملانے لگا۔

بے بسی، بے وقعتی، پامالی اور زندگی رل جانے کا جان لیوا احساس کیا کچھ نہ تھا اس کے چہرے پر وہ رو نہیں رہی تھی لیکن اس کی آنکھوں سے مستقل پانی بہہ رہا تھا۔

روم ویٹر کے لیے یہ حیران کن منظر تھا۔ حالانکہ وہ منیر کمال کی اجازت سے اندر آیا تھا لیکن اب شرمندہ ہو رہا تھا۔ اتنی نک سک سے درست شاندار شخصیت کی مالک اس خاتون کا یہ انداز اتنی دگرگوں

حالت روم ویٹر کی سمجھ سے باہر تھا اور اسے تو یہ بھی نہیں سمجھ میں آ رہا تھا کہ اس وقت اسے کیوں بلایا گیا ہے۔

اس سارے سین میں اس کا کردار کیا ہے اور اسے کیا کرنا چاہیے اس وقت کیونکہ ایک شکستہ حال عورت خاصے نازیبا حلیے میں بیڈ پر آڑی ترچھی پڑی تھی۔ اور تھوڑی دیر کے بعد اس کے جسم میں ارتعاش سا پیدا ہوتا پھر وہ خود کو تھپڑ مارتی بال کھسوٹتی سابقہ حلیے میں واپس جاتی۔

منیر کمال کسی سے فون پر مصروف تھا اور فون پر بھی وہ اونچے اونچے لہجے میں کسی کو اسی بستر پر پڑی ہوئی عورت کے بارے میں بتا رہا تھا۔

روم ویٹر کے لیے یہ صورتحال کافی ناقابلِ برداشت تھی لیکن وہ حکم کا تابعدار تھا وہ باہر واپس جانا چاہتا تھا تب منیر کمال نے اسے ہاتھ کے اشارے دے روک لیا تھا۔

اب وہ منیر کمال کو سننے کو شمائلہ کو دیکھنے پر مجبور تھا۔

''دیکھو سرمد! اب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے اب میں اس کو نہیں رکھ سکتا ویسے بھی ایک پاگل عورت میرے کسی کام کی نہیں تمہارا اگر کام نکل سکتا ہے تو آؤ سنبھالو اس کو اور میرا حصہ الگ کر دو ختم کرو اس قصے کو۔''

وہ غصے سے کہتے ہوئے ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا روم ویٹر کے چہرے پر پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگے۔ اس نے دوسری طرف سے کوئی بات سن کر مزید غصے میں کہا تھا۔

''منیر کمال کو الو کا پٹھا مت سمجھو۔''

روم ویٹر کو اس کی بات پر ہنسی آ گئی تھی اور منیر کمال فون بند کر چکا تھا۔

''مجھے یہ بتاؤ اس فلور پر کوئی دوسرا روم خالی ہے، فوراً میرا سامان وہاں شفٹ کر دو۔''

اس کا لہجہ قطعی تھا، شمائلہ کمال شاید غنودگی میں تھی اس لیے اس اعلان پر اس کا ردعمل کچھ بھی نہیں تھا۔ البتہ روم ویٹر کو اس پر خود ترس آ رہا تھا اس کے چہرے گردن پر زخموں کے نشان تھے۔ رنگت میں

زردی گھلی ہوئی تھی اور آنکھوں کے حلقے نمایاں ہو گئے تھے۔

اسے اس وقت اپنا کوئی ہوش نہیں تھا اور اس کی مدہوشی کا فائدہ اٹھا کر منیر کمال اس کمرے سے شفٹ ہو رہا تھا روم ویٹر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اس ساری صورتحال میں وہ کس کا ساتھ دے۔

کھڑے کھڑے منہ کیا تک رہے ہو مجھے روم چینج کرنا ہے۔

منیر کمال دھاڑا۔

"کس قسم کا شخص ہے بیوی اس کی اتنی لاچاری کی حالت میں پڑی ہے اور اسے کمرہ چاہیے وہ بھی دوسرا۔"

اس نے سرعت سے چلتے ہوئے سوچا اب اس کا کافی دیر تک واپس آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اور نہ ہی وہ منیر کمال کے لیے دوسرے کمرے کا انتظام کرنے کا سوچ رہا تھا فی الحال تو اس کی ساری ہمدردیاں شمائلہ کمال کے ساتھ تھیں۔

وہ اپنے منیجر کی تلاش میں اس کے کمرے کے دروازے پر پہنچ گیا۔

اندر اس سے پہلے کوئی اور موجود تھا وہ انتظار کرنے کے لیے باہر ہی رک گیا اسے اپنے منیجر سے اکیلے میں بات کرنی تھی تھوڑ دیر بعد کمرہ خالی ہو گیا تو وہ اپنے چہرے پر زمانے بھر کے ہونق تاثرات لے کر ہوٹل منیجر کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

"ہاں عارف بولو کیا بات ہے؟"

وہ حسب عادت اپنے لیپ ٹاپ میں گم تھا جبکہ عارف کو اس کی پوری توجہ چاہیے تھی۔

"ظفر صاحب! بات ذرا توجہ سے سننے والی ہے آپ کے پاس ٹائم ہے یا میں بعد میں آ جاؤں۔" اس کی سنجیدگی پر ظفر علی کو بھی کسی غیر معمولی صورتحال کا احساس ہوا تو وہ لیپ ٹاپ کا فلیپ گرا کر مکمل اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''کیا ہوا.....کوئی مسئلہ ہوا ہے۔''

اسے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا تو عارف کے چہرے کا ہونق پن خوف میں ڈھل گیا۔

''ظفر صاحب! روم نمبر 206 میں کوئی گڑبڑ ہے۔ مجھے لوگ ٹھیک نہیں لگتے۔''

وہ سسپنس پھیلا رہا تھا۔

''کیا کہنا چاہتے ہو کھل کر کہو۔''

''کھل کر تو مجھے بھی نہیں سمجھ میں آیا لیکن جو دیکھا وہ بتا رہا ہوں۔''

اس کے بعد وہ کسی ریکارڈر کی طرح بجنے لگا تھا۔

ظفر علی کے چہرے پر سنجیدگی کے ساتھ سوچ بھی تھی وہ بغور اس کی بات سن اور سمجھ رہا تھا کیونکہ یہ اس کی ڈیوٹی اور اس پروفیشن میں محتاط رہنے کے لیے بہت ضروری تھا۔

''ٹھیک ہے تم نظر رکھو ان پر میں پہلے خانزادہ صاحب سے بات کرلوں پھر.....''

اس نے حتمی انداز میں کہتے موبائل اٹھالیا تو عارف کمرے سے اٹھنے کا اشارہ لے کر باہر آ گیا۔

☆.....☆.....☆

نانو گھر تو چلی گئی تھیں لیکن اپنا آپ راجہ طارق محمود کے یخ بستہ کمرے میں چھوڑ گئی تھیں جہاں وہ زندگی کو آواز دینے کی کوشش کر رہے تھے اور زندگی جانے کیوں اس قدر خفا ہو چلی تھی کہ سن ہی نہیں رہی تھی۔

نانو صرف اسی شرط پر گھر آنے کے لیے راضی ہوئی تھیں کہ پہلے وہ طارق سے ملیں گی بات کریں گی جلدی گھر آنے ٹھیک ہونے کا وعدہ لیں گی لیکن یہاں تو سب کچھ ان کی سوچ کے برعکس تھا یہ تو ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ طارق محمود سے نہیں زندہ نعش سے ملیں گی جس کی آنکھیں ساکت اور چہرے پر بلا کا سناٹا تھا۔

عاشر! تم لوگ تو کہہ رہے تھے طارق اب ٹھیک ہے اس کے زخم بھر گئے ہیں تم نے اس سے بات کی ہے مگر تم نے اس ساکت وجود سے کیسے بات کی کیسے اس کو اپنی محبت کا اپنے رشتے کا یقین دلایا۔

''بتاؤ نا بچے..... یہ تو کسی اور دنیا کا مسافر ہو گیا۔''

وہ جیسے خود کلامی کر رہی تھیں شیشے کی دیوار کے سامنے کھڑے رہنے کے بعد ان کا پورا وجود برف تو ہو ہی گیا تھا مگر ان کا دل کسی نے سلگتی ہوئی بھٹی میں ڈال دیا تھا۔

''کون درندہ تھا جس نے میرے بچے کو اس حال تک پہنچایا۔ اللہ اس کے ساتھ ہمارے ساتھ انصاف کرے۔''

ان کی کپکپاتی آواز پر کشمالہ سرتاپا کانپ کر رہ گئی تھی۔

عاشر نے انہیں تھام لیا تھا اور سہارا دے کر کوریڈور تک پہنچایا۔

''میں نے آپ سے کہا تھا نا آپ اپنی طبیعت پھر سے خراب کر لیں گی۔'' وہ ان کے ماتھے اور چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

''تو کیا کروں۔ کیسے برداشت کروں۔ میرا بچہ میری آنکھوں کے سامنے ہے بول نہیں رہا کھا نہیں رہا چل نہیں رہا۔ بھلا بتاؤ مجھے کیسے صبر آئے کوئی تو صبر کا انجیکشن مجھے بھی لگوا دو۔ مجھ سے تو اپنے بچے کی یہ حالت برداشت نہیں ہو رہی۔'' ان کا چہرہ سفید لٹھے کی مانند ہو رہا تھا اور آنکھیں بند۔

عاشر نے کشمالہ کو اشارہ کیا وہ انہیں اپنی بانہوں میں سمیٹ کر بیٹھ گئی۔

''نانو ڈاکٹرز کہتے ہیں کہ وہ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے اصل میں جوان کا آپریشن ہوا ہے اس کے بعد بے ہوشی کا عرصہ تھوڑا لمبا ہو جاتا ہے مگر باقی وہ بالکل ٹھیک ہیں ان کے زخم بھر گئے ہیں۔'' کشمالہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا انہیں کیا سمجھائے اور کیسے سمجھائے۔

''میں بچی نہیں ہوں اور نہ ہی نادان تم لوگ اتنے دن سے مجھے کیوں طفل تسلیاں دے رہے ہو

میرا تو دل بند ہو رہا ہے۔"

جو وہ کہہ رہی تھیں ان کے چہرے پر بھی لکھا تھا۔ کشمالہ کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔

"عاشر آپ انہیں روم میں لے جائیں میں ڈاکٹر کو لے کر آتی ہوں۔"

"نہیں اب میرے لیے کسی ڈاکٹر کو کال مت کرو مجھے گھر لے چلو تم لوگ میرے بچے کے خیر خواہ بالکل نہیں ہو مجھے اس کے لیے خود ہی کچھ کرنا ہوگا اپنے رب سے اس کی زندگی مانگنی ہوگی۔"

وہ یکدم کھڑی ہو گئیں عاشر نے انہیں سہارا دے کر کشمالہ کو بھی ساتھ چلنے کا اشارہ کیا ان کی آنکھوں میں ڈھیر سارا پانی تھا اور چہرہ دھواں دھواں۔

"ہار گئی میں..... آج تو سب کچھ لٹ گیا..... میری زندگی کی جمع پونجی اندر اس کمرے میں پڑی ہے اور میں پتا نہیں اور کیا کچھ دیکھنے کے لیے زندہ ہوں۔" ان کے سفید جھریوں والے چہرے پر وقت کے دیے ہوئے سارے زخم نمایاں ہو رہے تھے۔

ان کی آنکھیں دل پر پڑنے والی چوٹ کا آئینہ بنی ہوئی تھیں۔ کشمالہ کا دل چاہ رہا تھا اس شخص کو گولی مار دے جو اس خاندان کا دیدہ اور نادیدہ دشمن تھا جسے شاید یہ لوگ بھول چکے تھے یا اس کے چہرے سے ناواقف تھے۔

☆.....☆.....☆

وہ اپنے لیپ ٹاپ کے ساتھ نانو کے کمرے میں ہی بیٹھی تھی آج کل اس کے صبح و شام نانو کے لیے مخصوص تھے کیونکہ کشمالہ نے خود کو ہاسپٹل کے لیے وقف کیا تھا۔ نانو کی حالت بھی ایسی نہیں تھی کہ انہیں اکیلا چھوڑا جاتا۔

وہ اس وقت مسکن دواؤں کے زیر اثر تھیں اور ان کے چہرے پر سکوت کے بجائے صرف اضطراب تھا گہری نیند میں بھی ان کے لب طارق محمود کے لیے دعا گو تھے جب نیند سے بے دار ہوتیں تو

سارا وقت رب سے طارق محمود کی زندگی مانگنے میں گزار دیتیں۔

خولہ کو کبھی کبھی ان کے اس قدر بے لوث پیار پر حیرت ہوتی تھی..... جب دعاؤں لاوظیفوں کا دورانیہ طویل ہو جاتا تو خولہ بھی ان کے قریب بیٹھ جاتی اور ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ اس پیارے انسان کے لیے سرتاپا دعا بن جاتی جس کی محبتوں اور مان نے آج انہیں ایک باوقار اور پرسکون زندگی کی نعمت سے سرفراز کیا۔

اسے دعاؤں کی طاقت پر ہمیشہ سے یقین تھا۔ اسی لیے وہ فیس بک کے ان باکس میں پڑے ہوئے پیغام کے متن سے اپنے خیالات کے ملنے پر پریشان بھی ہوئی تھی اور رنجیدہ بھی۔ وہ پیغام جس اجنبی کا تھا وہ اس کو ایک عرصہ سے جاننے کی جستجو میں تھا۔ خولہ اس کی طرف کھلنے والی ہر کھڑکی ہر دروازے پر پہرے بٹھاتی تب بھی وہ دستک دینے سے باز نہیں آتا۔

وہ اس سے چھپ رہی تھی بھاگ رہی تھی تب بھی وہ اسے کھوج نکالتا تھا وہ اس سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھا وہ ایک بار پھر اسلام آباد میں تھا اور خولہ کو لگ رہا تھا پھر سے آنکھ مچولی کا سلسلہ شروع ہوگا۔

اس نے غیر ارادی طور پر انگریزی میں لکھے پیغام کو پھر سے پڑھنا شروع کیا جس کا لب لباب یہ تھا کہ.....

"ہر گزرتے دن کے ساتھ مجھے زندگی آپ سے دور کرنے کے بجائے آپ کی طرف بلا رہی ہے میں نے لاکھ کوشش کی میں آپ کو اپنے دھیان کے کسی گوشے کی طرف بھی نہ بھٹکنے دوں لیکن میری بد قسمتی یہ ہے کہ میں ہر بار اس کوشش میں ناکام رہا مجھے لگتا ہے کہ کوئی نادیدہ طاقت آپ کو اور مجھے ایک کرنے پر تلی ہوئی ہے اور ہم جتنا بھی ایک دوسرے سے بھاگ لیں کسی میں حوصلہ نہیں کہ وہ آپ کے اور میرے درمیان روحانی رابطے کو توڑ سکے۔

میرا دل کہتا ہے کہ میں آپ سے کہوں کہ آپ جن راستوں سے پلٹ جانا چاہتی ہیں وہ راستے

بار بار آپ کے قدموں کی زنجیر بن رہے ہیں وہ آپ سے لپٹ جاتے ہیں آپ کو روک رہے ہیں۔

بے شک آپ کو جو آواز دے رہا ہے اس کی صدا میں بہت طاقت ہے لیکن ایک بار ذرا سا پلٹ کر تو دیکھیں ذرا سی دیر کے لیے راستے کی دھول کو ہلکا ہونے دیں اور سوچیں وہ جو قدموں کی زنجیر بنے راستے ہیں ان کی چاہ کیا ہے وہ کیوں آپ کو روک رہے ہیں وہ کیوں آپ کو آگے نہیں جانے دے رہے اس لیے کے آپ کی منزل آپ کی نگاہوں سے دور نہیں آپ کے قدموں تلے ہے آپ کو روکنا ہوگا خود کو بے نام تھکن سے بچانا ہوگا۔ میرے بارے میں کچھ تو سوچنا ہوگا۔

میرا اور آپ کا رشتہ تو تقدیر کا فیصلہ ہے اور یہ ہو کر رہے گا آپ کو میری محبت کے دائرے میں آنا پڑے گا آپ کی کمٹ منٹ سر آنکھوں پر لیکن میں اپنے یقین سے دستبردار نہیں ہو سکتا خولہ کمال۔"

اف..... اس نے لیپ ٹاپ کا فلیپ نیچے گرا کر سر تھام لیا تھا یہ شخص اتنا ثابت قدم کیوں ہے اور اس کی باتیں..... اس کا چہرہ سرخ ہو چلا تھا۔ آنکھوں کے آگے دھند سی چھا گئی تھی وہ آنکھیں مسلتے ہوئے اس کی باتوں کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کر رہی تھی تب اس سے ہونے والی دو اتفاقی ملاقاتیں فلیش بیک کی صورت دماغ سے ٹکرانے لگیں۔

وہ کتنے دھڑلے سے اس کے آفس چلا آیا تھا اور پھر کتنے مضبوط لہجے کے ساتھ وہ عین اس کی آنکھوں کے سامنے بیچ بازار میں سارے تکلفات بالائے طاق رکھ کر اسے یوں چائے کی آفر کر رہا تھا جیسے ان دنوں کے درمیان بچپن سے قرب کا سلسلہ ہو۔

وہ یکدم گھبرا کر کھڑی ہو گئی بہت دنوں سے نہ وہ رابطے میں تھا اور نہ ہی خولہ کسی بھی چیٹ ٹائم پر لوگ ان ہو رہی تھی سوائے فیس بک کے اور اب اس نے فیس بک پر بھی.....

شاید اس کا کسی سائبر نیٹ ورک کے آفس سے تعلق ہے۔

اس کا ذہن اس لمحے سامعہ اور پھر خزیمہ تک جانے کی طاقت سے عاری تھا اس لیے وہ نانو کے

بستر پر نگاہیں جمائے بے ربط سا سوچے جا رہی تھی تب ہی دروازے پر دستک دے کر کاشف اندر آ گیا وہ آج کل اپنے کسی پروجیکٹ میں کافی مصروف ہو چکا تھا اس لیے اس کا بہت کم وقت ان کے ساتھ گزرتا تھا اس وقت بھی وہ نانو کی خیریت لینے اور اسپتال کی صورتحال معلوم کرنے اس کے پاس آیا تھا لیکن خولہ کا سرخ چہرہ اور پریشان حال دیکھ کر بے چین سا ہو گیا۔

''کیا ہوا ڈیئر..... تم کچھ الجھی ہوئی ہو سب خیر ہے نا۔

نانو تو ٹھیک ہیں نا..... عاشر سے ابھی میری بات ہوئی ہے وہاں تو سب اوکے ہے پھر.....''

وہ اس کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے سرگوشی کے عالم میں بولا۔ تو خولہ کو اسے دیکھ کر ڈھارس سی ہوئی۔

''چلو باہر چلتے ہیں یہاں نانو ڈسٹرب ہوں گی.....'' وہ کھڑی ہو گئی اور اپنا لیپ ٹاپ بھی اٹھا لیا۔

''خولہ! کچھ پریشان بلکہ بہت زیادہ الجھی ہوئی ہو۔''

''مجھے نہیں بتاؤ گی۔''

کاشف اپنی طبیعت کی بے چینی سے مجبور تھا لائٹ گرین کلر کے ملگجے سے سوٹ میں وہ بہت تھکی تھکی سی لگ رہی تھی شاید اس لیے نانو کے کمرے سے کوریڈور تک آتے دو چار دفعہ اس سے یہ سوال کر چکا تھا۔

راستے میں خدیجہ پر بھی نظر پڑ گئی تھی اس کو چائے کے لیے آواز دے کر وہ دونوں برآمدے کی طرف چلے آئے موسم میں خنکی گھلنا شروع ہو گئی تھی اب ہواؤں کی سرسراہٹ اچھی لگتی تھی۔

خولہ نے لیپ ٹاپ سنگی میز پر رکھا اور اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود بھی اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

شاید یہ پہلا موقع تھا وہ اس سے کوئی اپنی ذاتی الجھن شیئر کرنے جا رہی تھی ورنہ اس سے قبل دونوں کے درمیان ڈھیر ساری باتیں ہوتی رہتی تھیں مگر کبھی ان معاملات پر بات نہیں ہوئی تھی جن کا تعلق

براہ راست خولہ کی ذات سے تھا لیکن اب اس کے سوا خولہ کے پاس کوئی دوسرا راستہ بچا نہیں تھا کہ وہ اس مخلص سے انسان سے مشورہ مانگ لے یا اس کی مدد سے خزیمہ عادل سے جان چھڑا لے جس کا لمبا چوڑا پروگرام صرف ایک ہی بات کی تکرار کر رہا تھا۔

اس نے لیپ ٹاپ کھول کر کاشف کے حوالے کیا اور اسے ان باکس کی طرف متوجہ کیا کاشف نے میدج باکس اوپن کر کے سب سے اوپر پڑا پیغام شروع کیا تو اس کے چہرے کے تاثرات بدلنا شروع ہو گئے۔ خولہ بھی اس کو بغور دیکھ رہی تھی اسے لگ رہا تھا یہ سب پڑھتے ہوئے کاشف چیخ پڑے گا اور کہے گا۔

''کیا بکواس ہے.....'' مگر ایسا کچھ نہیں ہوا پورا پیغام پڑھنے کے بعد اس کے چہرے پر عجیب دلفریب سی مسکراہٹ بکھر گئی اور آنکھوں میں بے نام سی شرارت.....

''کون ہے یہ.....خولہ!''

وہ اسے اب بغور دیکھ رہا تھا اور خولہ کو اس کی چمکتی آنکھوں میں اپنا عکس بخوبی نظر آ رہا تھا شفاف آئینے جیسی آنکھیں تھیں جو اس اجلی دھوپ میں نے تحاشا روشن ہو گئی تھیں خولہ نے اپنے بالوں کے لچھوں کو درست کرتے ہوئے ایک گہری سانس لی اور مسکرا دی۔

''تم مجھ سے سوال مت کرو..... بلکہ مجھے اس سوال کا جواب چاہیے کہ کون ہے یہ..... میں بھی اس کو اتنا ہی جانتی ہوں جتنا اس میسج میں دعوا ہے آئی مین میں بہت عرصے سے اس کے اس طرح کے میسجز پڑھ رہی ہوں اینڈ دیٹس اٹ..... یہ میرا ریڈیو فین ہے.....لیکن ریڈیو کے بعد بھی.....''

وہ چپ ہو گئی اس لمحے اس یورپین لڑکی کے چہرے پر بڑے معصومانہ سے تاثرات تھے کاشف نے دلچسپی سے اسے دیکھا اور ہنس پڑا۔

''اور ریڈیو کے بعد بھی اس کی ڈھٹائی برقرار ہے..... ہے نا۔'' اس نے تائید چاہی۔

''اب بتاؤ کیا کرنا ہے اٹھوانا ہے، اغواء کروانا ہے یا پھر بند کروانا ہے۔'' وہ اپنی مخصوص ٹون میں واپس آ گیا تھا۔

''پاگل ہو گئے ہو تم۔''

وہ سٹپٹا کر بولی۔ خدیجہ نے چائے کی ٹرے رکھی تو کاشف نے کچھ کھانے کی فرمائش کر دی۔

''صبح سے بھوکا پیاسا تمہارا دوست کام میں لگا ہوا ہے اور تمہیں بڑی فکر ہے اس کی۔''

''واہ جی واہ..... کاشف تیری تو قسمت ہی خراب ہے۔''

خدیجہ اس کی بات ہر سر ہلا کر واپس مڑ گئی تھی اور خولہ نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا تھا۔

''اب آپ کا لنچ باکس تو بنا کر ساتھ دینے سے رہی۔''

''ہاں..... وہ تو یہ صاحب ساتھ لے کر جایا کریں گے جو کہتے ہیں کہ آ کو میری زندگی میں آنا پڑے گا میری یقین.....''

اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتا خولہ نے سرعت سے کھڑے ہو کر اس کا گلا دبوچ لیا تھا۔

''انسان بنو تمہیں اس لیے نہیں بتایا کہ.....''

''ارے یار! اب ظلم تو نہ کرو..... ایک ستم ہی کافی ہے..... میرا حریف..... کیا کہتے ہیں اس کو رقیب روسیاہ۔ تو تم لے ہی آئیں۔ اب تو اس مظلوم پر رحم کرو۔''

وہ تو باز نہیں آیا تھا خولہ نے گردن پر دباؤ بڑھایا تھا۔ کاشف نے بمشکل اس کے پنجوں سے خود کو آزاد کیا اور اس کے الجھے ہوئے بالوں کو مزید بگاڑ کر ذرا فاصلے پر جا کھڑا ہو گیا۔

''بلی! اب میرے پاس نہیں آنا ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔''

''جاؤ..... جاؤ تم کچھ نہیں کر سکتے سوائے باتوں کے۔'' وہ سنجیدہ ہرگز نہیں تھی لیکن کاشف اس کی بات پر ضرور سنجیدہ ہو گیا تھا۔

''بتاؤ کیا کرنا ہے یہ بندہ تمہارے سامنے حاضر کرنا ہے یا پھر اس کی حاضری لگوانے ہے۔'' وہ پھر سے اپنی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا تھا خولہ کے عین مقابل پوری سنجیدگی سے اسے مخاطب کیا تھا۔

''تم کیا انٹرپول میں ہو جو ہر جگہ تمہاری پہنچ ہے۔'' اس نے انگریزی میں بات تو ہنستے ہنستے کی تھی لیکن کاشف چونک سا گیا تھا۔

کسی نئی سوچ نے اس کے چہرے کا احاطہ کر لیا تھا۔

''خولہ ایک سیریس کوئسچن ہے وہ جو خاتون اسپتال میں دیکھی تھیں ہم نے..... عاشر کی مدر..... مجھے ان کی بات بالکل اچھی نہیں لگی تھی اور میں اس کی سزا دینا چاہتا ہوں ان کو..... ان کو لگتا ہے نا کہ راجہ صاحب نے یتیم خانہ کھول رکھا ہے۔'' وہ پرسوچ انداز میں بولا۔

''چھوڑو نا..... تم بھی کیا بات لے کر بیٹھ گئے ہو..... مجھے تو وہ خاتون مینٹلی ڈسٹرب لگیں۔ اب کیا ہم بھی ان کے ساتھ پاگل ہو جائیں۔''

''اونہہ بات تو تمہاری بھی ٹھیک ہے کہ پاگلوں کا علاج تو پاگل خانے میں ہوتا ہے گڈ آئیڈیا۔'' اب وہ پھر سے کسی کہانی کے تانے بانے بُن رہا تھا گہری سی مسکراہٹ کے ساتھ خولہ کو تو وہ ویسے بھی پر اسرار سا لگتا تھا انگریزی جاسوسی فلم کا کردار سو اس کی مسکراہٹ کو نظر انداز کر کے پھر سے اپنے لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ فیس بک کی وال پر بہت ساری نئی ویڈیوز اور فیڈز نظر آ رہی تھیں۔

اس نے پہلی فرصت میں چیٹ لائن سے آف ہو کر وال چیک کرنا شروع کی تب ہی کاشف پیچھے سے اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا اور جھک کر دیکھنے لگا۔

''میں آپ کی پرائیویسی میں مخل ہو سکتا ہوں میم!''

''بکواس نہیں کرو..... تم اس وقت بہت تھک چکے ہو۔ جا کر آرام کرو..... ٹیک گڈ سلیپ اور پھر اسپتال چلنا ہو گا آج وہ دونوں گھر آ کر ریسٹ کر لیں تو اچھا ہے۔''

''بالکل.....ٹھیک ہے لیکن تمہاری تو وہ کہانی بیچ میں ہی رہ گئی بندہ اٹھوانے والی۔''

اب اسے ایک نئی تفریح ہاتھ لگ گئی تھی خولہ کو پتا تھا سب وہ زچ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دے گا۔

''میری وہ کہانی بیچ میں مت چھوڑنا تمہارا جہاں سے دل چاہ رہا ہے اس کو شروع کرو پھر دیکھتے ہیں اس کا اینڈ کیا کرنا ہے؟''

وہ ہنس پڑی تھی اپنی بات پر جانتی تھی اس کہانی کا انجام کیا ہونا ہے۔

''آپ کا حکم سر آنکھوں پر میم آپ کی خدیجہ تو شاید کل تک کچھ کھانے کا بندوبست کر ہی دے.....میں فریش ہونے جا رہا ہوں جب وہ آجائے تو بلا لینا۔'' وہ چائے کا کپ خالی کر کے ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولا تو خولہ کو اس کی معصوم سی شکل پر پیار سا آ گیا۔

''مسئلہ یہ ہے کاشف کے تم بہت اچھے ہو اس لیے تم سے کوئی بات چھپائی نہیں جا سکتی نہ ہی تمہاری کسی بات پر انکار کرنے کو دل کرتا ہے۔'' وہ اس کی طرف شرارت سے دیکھ رہی تھی۔ اونچا لمبا زندگی سے بھرپور کاشف کیانی اس کی بات ہر کھلکھلا دیا اور پھر سے کرسی گھسیٹ کر اس کے نقابل بیٹھتے ہوئے بڑے مزے سے بولا تھا۔

''شادی کرو گی مجھ سے۔'' اس کی شفاف آنکھیں خولہ کے گرد حصار تنگ کر رہی تھیں اور چہرے پر زمانے بھر کی معصومیت سمٹ آئی تھی۔ خولہ نے بس ایک پل لیا تھا سنبھلنے میں اور اس کے انتہائی سنجیدہ سوال کو نظر انداز کرنے میں۔

''شکل دیکھی ہے اپنی.....تم سے شادی کر کے ساری زندگی کا سفر تھوڑی اپنے سر لینا ہے تم ٹھہرے مہم جو اور مجھے گھر اچھا لگتا ہے۔''

آخری جملہ اس نے بھرپور سنجیدگی سے ادا کیا تھا کاشف کا بے ساختہ قہقہہ خدیجہ کو بھی سنائی دے

گیا تھا جو بھری ہوئی ٹرے کے ساتھ کوریڈور سے نمودار ہوئی تھی۔

''اوہ جیو.....خدیجہ بی بی.....اس وقت تم نے دل خوش کر دیا۔''

کاشف نے ایک نظر خدیجہ پر ڈالنے کے بعد پھر سے خولہ کو اپنی نظروں کے حصار میں لے لیا تھا۔

''ویسے میری بات پر سوچنا ضرور۔''

وہ سرگوشی نما انداز میں بولا تو خولہ نے لیپ ٹاپ کا فلیپ بند کر کے پھر سے اس پر حملہ کرنے کا سوچا مگر خدیجہ اور اس کی ٹرے درمیان میں آ گئی۔

''تمہیں فالتو باتوں کے بھی پیسے ملتے ہوں گے نا ویسے یہ کون سا ادارہ ہے جس نے تمہیں اتنی اچھی جاب دے رکھی ہے۔''

''سب بتا دوں گا پہلے تم راضی ہو جاؤ۔''

وہ مذاق کر رہا تھا یا مصر تھا خولہ سمجھ نہیں پا رہی تھی اس نے کبھی کاشف کی آنکھوں میں اس کے چہرے پر اپنا عکس نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی وہ دیکھنا چاہتی تھی خولہ کو یقین تھا کہ اس وقت بھی وہ اسے تنگ کر رہا تھا اور ان باتوں پر خولہ اس سے بحث کر کے اپنی انرجی ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی تو محض مسکرا دی تب ہی کاشف کا موبائل بج اٹھا۔

اس نے موبائل کان سے لگاتے ہوئے بڑے پیار سے کہا تھا۔

''جی بابا! مجھے آپ سے کچھ کام تھا اس لیے کال کی تھی۔''

☆.....☆.....☆

راحت بیگم گھر پہنچ گئی تھیں صبح کے ملگجے اجالے میں بیل بجی تھی اور بڑے ماموں حسب عادت چہل قدمی کرتے ہوئے دروازے کی طرف چلے گئے تھے ان کے خیال میں اخبار والا جلدی آ گیا تھا لیکن دروازے پر اخبار والا نہیں بلکہ ایک تازہ خبر ان کی منتظر تھی راحت بیگم کی دگرگوں حالت کی صورت میں

بڑے ماموں نے گلی کے کونے سے ایک رکشہ اوجھل ہوتے دیکھا اور راحت بیگم کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ وہ لسی شہتیر کی مانند ان کے بازوؤں میں گرتی چلی گئی تھیں۔

اس کے بعد انہیں جب ہوش آیا تھا تو وہ اپنے کمرے کے بستر پر اپنے سارے گھر والوں کے حصار میں تھیں۔ صوفیہ اور شجاع ان کے سب سے قریب تھے۔

انہوں نے خالی خالی نگاہوں سے ان دونوں کو دیکھا جیسے وہ انہیں پہچاننے کی کوشش کر رہی ہوں۔

صوفیہ نے خوفزدہ نظروں سے اپنی دھان پان سی ماں کو دیکھا جن کے ستے ہوئے چہرے پر جا بجا خراشوں کے نشان تھے جن کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بن گئے تھے وہ سب کو اجنبی نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔

"امی! مجھے دیکھیں..... میں صوفیہ ہوں..... آپ کی بیٹی..... آپ مجھے پیار کیوں نہیں کر رہی ہیں۔"

وہ ان سے لپٹ کر خود رو رہی تھی اور اس نے سب کو بھی رلا دیا تھا راحت بیگم نے اسے اپنے اندر سمیٹ تو لیا تھا لیکن ان کی ذہنی حالت اتنی ناگفتہ بہ ہو رہی تھی کہ ان کا چہرہ ان کی آنکھیں ہر احساس سے عاری نظر آ رہی تھیں حالانکہ فیملی ڈاکٹر نے ان کا معمول کا چیک اپ بھی کیا تھا اور سکون کا انجیکشن لگانے کے بعد اس نے سب کو تاکید کی تھی کہ انہیں بالکل ڈسٹرب نہ کیا جائے صرف سونے دیا جائے اور اب تین گھنٹے کی بے ہوشی والی نیند کے بعد وہ جاگی تھیں تو اس حالت میں کہ سب کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا تھا۔

بڑے ماموں نے فوراً سے بیشتر ڈاکٹر کو فون کیا تھا اور ممانی ان کے پاس چلی آئی تھیں۔

"تم سب لوگ یوں اس کے پاس ہجوم مت لگاؤ۔ اس کو پرسکون ہونے دو۔" انہوں نے کمرے کا رش کم کرنے کا اشارہ کرتے ہوئے راحت بیگم کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور دھیرے دھیرے ان کے بالوں کو سلجھانے لگیں۔

"صوفی! جاؤ ماں کے لیے سوپ بنا کر لے آؤ اور ہاں یہ برش مجھے دو ذرا میں اس کے بال سلجھا دوں۔"

انہوں نے راحت بیگم کے ماتھے پر انگلیوں سے مساج کرتے ہوئے نرمی سے کہا تو صوفیہ سرعت سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

انعم نے برش ممانی کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے صوفیہ کو باہر آنے کا اشارہ کیا تو شجاع بھی کھڑا ہو گیا ڈی ایس پی طاہر کو اس نے خبر کر دی تھی اب اس سے مل کر تمام تر صورتحال سے آگاہ کرنا ضروری تھا۔

فیملی ڈاکٹر تو جنرل فزیشن تھا۔ راحت بیگم کو اس وقت کسی سائیکاٹرسٹ یا سائیکالوجسٹ کی بھی ضرورت تھی اس نے لمحوں میں اپنے لیے ذمہ داریوں کی فہرست ترتیب دے دی تھی ممانی نے نرم ہاتھوں سے راحت بیگم کا مساج شروع کیا تو وہ پھر سے غنودگی میں چلی گئی تھیں۔ وہ جب سے آئی تھیں کسی نے ان کی آواز نہیں سنی تھی۔ سوائے کراہنے کے..... اب سب اپنے سپیٹور پر اس الجھن کا سرا ڈھونڈ رہے تھے کہ ذہنی جسمانی تشدد کے باعث ان کی یہ حالت ہوئی یا پھر کسی خوف کے تحت انہوں نے خود کو خاموش کیا ہوا ہے۔

پولیس کو بھی ان کا بیان مطلوب تھا اور میڈیا کے نمائندوں کو بھی لیکن شجاع اور علی نے سب سے معذرت کر لی تھی اور سب سے بڑی ڈھارس تو ڈی ایس پی طاہر کی تھی جن کی وجہ سے یہ معاملات رازداری کے ساتھ طے ہوتے گئے۔

اس وقت بھی اسے اپنی تفتیش سے زیادہ راحت بیگم کی فکر تھی۔ شجاع کو اپنے دوست اور دوستی کے اس رشتے پر بہت پیار آ رہا تھا اس وقت بھی وہ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے ڈی ایس پی طاہر سے ڈسکس ہونے والی باتیں سوچ رہا تھا کہ موبائل اسکرین پر طاہر بلنک کرنے لگا۔

شجاع نے گاڑی کا سوئچ آف کرتے ہوئے موبائل آن کر کے کان سے لگایا تو مسرت بھری آواز میں مبارکباد کی صدا اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

"مبارک ہو دوست ہمارا مشن کامیاب رہا آنٹی بھی صحیح سلامت گھر آ گئیں اور ان کا مجرم بھی

پکڑا گیا اپنے ساتھیوں سمیت اور اس بار یہ کریڈٹ حیدر آباد پولیس کو جاتا ہے۔ مجرم حد سے زیادہ چالاک تھا خود بھی بھاگ رہا تھا اور اپنے ساتھیوں کے پولیس کے حوالے ہونے پر خوشیاں بھی نا رہا تھا۔

بس تم شکر ادا کرو آنٹی کی زندگی محفوظ رہی۔ انہیں ذہنی اور جسمانی اذیت جو پہنچی ہے اس کا مداوا وقت کرے گا ان کے زخموں کو کریدو نہیں کیونکہ جس شخص نے آنٹی کے اغوا کی مکمل منصوبہ بندی کی ہے وہ اس وقت حیدر آباد پولیس کی کسٹڈی میں ہے۔ وہ جیسے ہی کراچی منتقل ہوتا ہے تم کو کال کروں گا یقیناً تمہاری برداشت اور ضبط کا امتحان اس کے بعد سے شروع ہوگا۔"

وہ ڈی ایس پی طاہر کی کسی بھی بات پر حیران نہیں ہوا تھا البتہ خوشی حد سے زیادہ تھی جو اس نے چاہا تھا وہ ہو گیا تھا اب اہم بات یہ تھی کہ مجرم نہ صرف اعتراف جرم کرے بلکہ اس ساری کہانی کے محرکات بھی بتائے شجاع نے فون بند کر کے سکون کی ایک گہری سانس لی۔

اس وقت اس کا دل چاہ رہا تھا زندگی جیسی لڑکی کو اپنے ساتھ لپٹا کر اس کے کان میں سرگوشی کرے اسے بتائے کے وقت اپنا فیصلہ سنانے میں کبھی دیر نہیں لگاتا اپنا مقدمہ جب بھی اللہ کی عدالت کے سامنے کرو گے سرخرو ہونے کے لیے ایک بھی پیشی نہیں بھگتانی ہوگی اور حق میں فیصلہ ہو جائے گا۔ قدرت کا فیصلہ ہی تو تھا کہ راحت بیگم محفوظ اور مامون ان کے درمیان موجود تھیں ورنہ جس بے یقینی اور عدم تحفظ کی فضا میں اس شہر کے باسی سانس لے رہے تھے اس میں تو کوئی بھی خیر کی خبر ملنا بعد از قیاس تھا۔

☆.....☆.....☆

سرمد بخاری کو شمائلہ کے فون پر حیرت تو نہیں ہونی چاہیے تھی لیکن منیر کمال کی بے ہودہ اور بدتمیز گفتگو کے بعد اب شمائلہ کا فون..... اس نے ائیر پورٹ پر لاؤنج میں کھڑے کھڑے پہلے فلائٹ ٹائم کا جائزہ لیا اور پھر کال ریسیو کر لی۔

"ہائے جانِ من....." اس کے لہجے میں سرشاری تھی۔ دوسری طرف شمائلہ تو بھری بیٹھی تھی۔

''مر گئی تمہاری جانِ من..... تمہیں اپنی نئی نویلی کی ہی فکر ہے نا آجکل۔ کتنے دن ہو گئے ہیں نا مجھے یہاں آئے ہوئے تم نے ایک بار بھی پلٹ کر خبر نہیں لی۔ اتنے بے حس کیوں ہو گئے ہو سرمد۔''

اس کا لہجہ غصے کے بعد دلگرفتہ ہو چلا تھا۔ سرمد بخاری کو اس پر ترس آنے لگا۔

''بے چاری عورت.....''

''جانِ من میرے بغیر کبھی نہیں مرے گی اس نے میرے ساتھ جینا ہے اور میرے ساتھ مرنا ہے میں آ رہا ہوں تمہارے پاس..... کیوں پریشان ہو۔

پھر مجھے تمہارے اس پالتو کا فون بھی آیا تھا۔ الٹی سیدھی بکواس کر رہا تھا تم ٹھیک تو ہو نا..... میں تو پریشان ہو گیا تھا پہلی فلائٹ میں سیٹ ریزرو کروائی ہے میں تھوڑی دیر میں تمہارے پاس ہوں گا ملکہ عالیہ۔''

اسے شمائلہ کو شانت کرنے کا ہنر بخوبی آتا تھا اور وہ واقعی سرمد بخاری کی باتیں سن کر قدرے سکون سے ہو گئی تھی لیکن اپنی نادانی میں چہرے، گردن اور بازوؤں پر جو ناخنوں کے نشان ڈال دیے تھے اب ان پر پشیمان تھی۔

سرمد کے سامنے یہ حالت ایسا حلیہ کتنا ناراض ہو گا..... وہ آئینے کے سامنے آ کر کھڑی ہوئی تو اسے اپنا چہرہ کسی عمر رسیدہ عورت کا چہرہ لگا جو عمر بھر دھول مٹی سے اٹے رہنے کے بعد مٹیالے رنگ کا ہو جاتا ہے اور آنکھیں زرد تھکن سے بے حال.....

''یا اللہ! یہ میں ہوں شمائلہ کمال ایک حسین باکمال فنکارہ جس کے ابرو کی جنبش پر پورا پورا اسٹیج نیلام ہو جاتا تھا پورے ہال کی بولی لگ جایا کرتی تھی اور آج..... حال یہ ہے کہ.....''

وہ دبی دبی آواز میں گنگنانے لگی۔

جب بھی چاہا سمیٹوں خود کو
کوئی شے مجھ میں بکھرتی چلی گئی

پہلے تو آسمان سر پر نہ رہا
پھر میرے پاؤں سے دھرتی چلی گئی۔

دھیرے دھیرے گنگناتے ہوئے اس کے ہاتھ اپنے ہی خدوخال سے اپنے ہی بالوں کی الجھنوں سے کھیلنے لگے جیسے کوئی مجذوب اپنے ہی کسی خیال پر مسکرا دے تو کبھی خود کلامی کا سلسلہ شروع کر دے لوگ مجذوب سے ڈرتے ہیں اس کے پاس آتے ہوئے احتیاط کرتے ہیں بالکل اسی طرح جیسے منیر کمال اب اس کمرے میں رہتے ہوئے محتاط ہو چلا تھا۔

وہ ابھی بھی اپنے لیے دوسرے روم کی بات کرنے گیا تھا لیکن منیجر نے نہ جانے کیا سوچ کر معذرت کی تھی کہ

فی الحال کوئی خالی کمرہ دستیاب نہیں آپ کو انتظار کرنا ہوگا۔

یہ سب سننے کے بعد واپس اپنے کمرے میں آنا تو مجبوری تھا لیکن شمائلہ کی ناقابلِ برداشت حرکتوں کے ساتھ سمجھوتا کرنا کوئی مجبوری نہیں تھا اس لیے وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتے ہی اس پر برس پڑا تھا۔

''تم یہ ناٹک بند کرو گی یا میں خود اس کا علاج ڈھونڈوں.....''

سیاہ رنگ کے لباس میں اس کا چہرہ بھی سیاہ رنگ اپنے اندر جذب کیے ہوئے تھا شمائلہ نے ایک بے زار کن نگاہ اس پر ڈالی اور پھر سے کچھ گنگنانے لگی۔

''بند کرو یہ تماشا.....اور یہاں سے اب نکلنے کی کرو.....تمہیں تو اب اپنی فکر نہیں ہوگی مگر مجھے جینا ہے۔'' اب وہ اس کے سر پر کھڑا تھا۔ شمائلہ کمال یکدم جھٹکے سے پلٹی اور پھنکارتے ہوئے لہجے میں بولی۔

''لیکن جب تک تم زندہ رہو گے دوسروں کو اذیت دیتے رہو گے اس سے بہتر ہے کہ تم مر جاؤ منیر کمال!''

''بے فکر رہو شہزادی میرے مرنے سے اب تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہونے والا تمہارا وقت ختم ہو چکا ڈھل چکا ہے تمہارا شباب.....تم اب ایک بوڑھی عورت ہو.....آئینے میں اپنی جھریاں بھی دیکھا کرو..... پتا ہے شمائلہ! اب کوئی نہیں آئے گا تمہارے فریب میں اور نہ ہی تمہارے پاس زندگی کا ملال مٹانے کیونکہ اب تمہارے پاس کچھ نہیں ہے عورت کے نام پر جبکہ منیر کو غور سے دیکھو.....'' وہ خود کو آئینے میں اس کے برابر لے آیا۔

''' دیکھو غور سے منیر کمال آج بھی تر و تازہ اور ہینڈسم نظر آ رہا ہے اس کے پاس ابھی زندگی جینے کے لیے بہت وقت پڑا ہے۔ ہے نا۔''

وہ خود کو آئینے میں ستائشی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ شمائلہ کا ضبط بس اب یہاں تک ہی تھا وہ مستقل اب اس کی ذات پر حملے کر رہا تھا اس نے پلٹے بغیر نفرت سے آئینے پر تھوک دیا تھا۔

''یہ دیکھو منیر! یہ ہے تمہارا اصل چہرہ اور یہ ہے اس کی اوقات تمہیں میری جھریاں ڈھونڈنے کے بجائے اپنے مردہ چہرے کی سیاہی سے نفرت کرنی چاہیے۔''

اس کی آنکھوں میں نفرت کی کئی لہریں اُمڈ آئیں منیر کمال کو آئینے میں اپنے عکس پر شمائلہ کمال کی دکھائی ہوئی اوقات نظر آ رہی تھی۔

اسے واقعی خود سے گھن سی محسوس ہوئی وہ پلٹا اور ایک زوردار ہاتھ شمائلہ کے چہرے پر رسید کر دیا۔

''سالی! کتیا..... مجھے اپنی اوقات دکھاتی ہے۔ تیری قیمت بڑھا کر تجھے ساری دنیا کے سامنے عزت اور نام دینے کے بعد تو مجھے یہ صلہ دے گی تو مجھے آئینہ دکھائے گی۔'' وہ دوسرا حملہ بھی کر بیٹھا تھا اس سے پہلے کہ شمائلہ جوابی کارروائی کرتی منیر کمال اس کی گردن دبوچ چکا تھا۔

''تجھے میں زندگی دوں گا تو مجھ پر تھوکے گی نا..... مجھے آئینہ دکھائے گی۔'' اس کی زبان مغلظات بکنے لگی اور منہ سے جھاگ اڑ رہا تھا۔

شمائلہ آنکھیں پھاڑے بے بسی سے اس کو دیکھ کر رہ گئی حیرت انگیز طور پر وہ اس وقت مکمل اس کے قابو میں تھی۔ شاید اس کی قوت مدافعت کمزور پڑ چکی تھی یا پھر وہ ذہنی طور پر ایسے کسی حملے کے لیے تیار نہیں تھی اس لیے وہ اس پر حاوی ہو گیا تھا ورنہ اس طرح کے حملے میں دونوں کے ہاتھ اور زبان برابر چلا کرتی تھی۔

اس وقت شمائلہ کے حلق سے بمشکل آواز نکلی تھی۔

''منیر چھوڑو مجھے..... میرا دم گھٹ رہا ہے۔''

''میں چاہتا ہوں تیرا دم گھٹ جائے..... تری یاری مجھے اب مہنگی پڑے گی۔'' وہ غرایا۔

شمائلہ نے وحشت زدہ نظروں سے اسے دیکھا اور اس بار سچ مچ اس کے چہرے پر تھوک دیا۔

''جا جا جو کرنا ہے کر لے اب شمائلہ کو کسی چیز کا خوف نہیں۔''

وہ نفرت سے کہتے ہوئے اپنا سر دیوار کے ساتھ پٹخنے لگی۔ جس کے ساتھ منیر کمال اس کی گردن دبوچے کھڑا تھا اسے لگ رہا تھا اب اس کا دم نکل جائے گا کیونکہ منیر کمال نے اپنے ہاتھ کی گرفت سخت کرتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اس کے بال جکڑ لیے اور اس کا چہرہ اپنے قریب لاتے ہوئے اس کے ہونٹوں کے قریب بڑی بے رحمی سے دانتوں سے کاٹ ڈالا تھا۔

وہ اذیت کی انتہا پر تو تھی ہی..... جسمانی تکلیف کے باعث بالکل ہی بے دم ہو گئی۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں نے مزاحمت کرنا چھوڑ دی۔

منیر کمال اس کو مارنا چاہتا تو کوئی مشکل نہیں تھا کیونکہ اس کی نازک گردن پر اس کے پنجے کی گرفت مضبوط تھی لیکن منیر کو اس لمحے احساس ہوا تھا کہ اسے مارنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

ابھی اس کہانی کا ایک موڑ تو باقی تھا۔ طارق محمود تو مر چکا تھا اور اس کی بیش بہا دولت یقیناً عاشر عباس اور اس کی ماں کے حصے میں ہی تو آنی تھی۔ سو کیوں وہ گھاٹے کا سودا کرے اس بار اس کا شاطر ذہن نئے زاویوں سے سوچ رہا تھا نئی بساط پر ان مہروں کے ساتھ نیا کھیل کھیلنا چاہتا تھا۔ ابھی یہ مہرہ کام

کا تھا۔اس کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔شمائلہ اذیت میں تو تھی دیوار کے ساتھ بیٹھتی چلی گئی۔اس کے حواس مختل ہو رہے تھے سانس لینے میں تکلیف ہو رہی تھی۔منیر کمال نے اپنا چہرہ صاف کرتے ہیں ایک گہری سانس خارج کی اور نڈھال سا ہو کر اس کے برابر میں ہی بیٹھ گیا تب ہی دروازے پر دستک ہوئی۔

اس نے چونک کر دیکھا دروازہ لاک نہیں تھا۔روم ویٹر تو اس کے یس کہنے پر اندر آ جاتا مگر دوسری بار بھی کسی نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا تھا وہ گرتے پڑتے قدموں کے ساتھ اٹھا شمائلہ پر نظر پڑی وہ تقریباً بے ہوش تھی۔

منیر کمال نے جلدی سے اس کو سہارا دے کر بیڈ تک پہنچایا اور دل ہی دل میں گالیاں دیتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

''میرا نام ناصر ہمدانی ہے مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔آپ باہر آئیں گے یا میں اندر.....''

دروازہ کھولنے پر اس اجنبی آدمی نے منیر کمال کی سوالیہ نگاہوں کے استفسار میں اپنا کارڈ دکھاتے ہوئے بڑے متحمل لہجے میں جواب دیا تھا اور منیر کمال کی نظریں اس کے کارڈ پر جمی رہ گئی تھیں۔''انسپکٹر ناصر ہمدانی.....اسپیشل کرائم برانچ.....''

منیر کمال کے چہرے پر ایک ساتھ کئی رنگ آ کر چلے گئے تھے اور ناصر ہمدانی اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

اندر آ جائیں۔صورت حال خاصی گھمبیر ہو گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

تائی جلے پیر کی بلی بنی ادھر سے ادھر گھوم رہی تھیں ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا یہ کیا ہو رہا تھا گھر میں ایک کے بعد دوسری مصیبت آ رہی تھی لیکن کسی کو احساس ہی نہیں تھا نعمان کے ابا اسے لینے گئے تھے اب ان کی خبر بھی کہیں سے نہیں مل رہی تھی رات آنکھوں میں کٹی تھی اب ان کا ضبط جواب دے گیا تھا

انہوں نے فہیم شاہ کے کمرے کا دروازہ زور زور سے بجایا اور اندر داخل ہو گئیں چاچی کپڑے سمیٹ رہی تھیں استری کے بعد البتہ فہیم شاہ اپنے بستر پر پڑے تھے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔

''خیر تو ہے.....''

''خیر ہی تو نہیں ہے۔ تم لوگ تو ارد گرد کی خبر لیتے نہیں ہو، یوں کمرہ بند کر کے چھپ کر بیٹھے ہو جیسے قیامت آنے والی ہو لیکن اب اس سے بڑی قیامت کیا ہو گی۔''

حسبِ عادت خود ہی سوال..... خود ہی جواب..... ان دونوں میاں بیوی کے چہرے پر بے زاریت کی لکیریں نمودار ہوئیں۔

چاچی نے کام روک کر بغور ان کا جائزہ لیا..... کافی پریشان لگ رہی تھیں۔

''آپ بیٹھیں تو..... کیا کھڑے کھڑے ساری باتیں کر لیں گی۔''

چاچی نے کرسی سے دھلے کپڑے اٹھا کر انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''کیا بتاؤں تم لوگوں کو..... گھر میں دلچسپی لو تو پتا چلے نا..... سفیر کے ابا نعمان کو چھڑانے گئے تھے ابھی تک خود بھی گھر نہیں لوٹے۔ ارے میری پوری رات آنکھوں میں کٹ گئی..... تم لوگوں کو کوئی احساس ہی نہیں۔''

(کس کی ٹوپی کس کے سر) حسب عادت بات کر رہی تھیں۔

''آپ بتائیں تو سہی..... بھائی جان گھر پر نہیں ہیں..... بھلا مجھے تو الہام ہونے سے رہا۔''

فہیم شاہ بھی پریشانی کے عالم میں ان پر برس پڑے۔

گھر کے معاملات میں دلچسپی نہ لینے کا الزام اپنی جگہ مگر بھائی کے لیے پریشان ہونا تو فطری عمل تھا۔

''مجھے پوری بات بتائیں۔''

وہ ان کے پاس چلے آئے تائی کو اس وقت سہارا ہی تو چاہیے تھا پہلے آنکھوں میں پانی امڈ آیا پھر

آواز بھرا گئی چاچی بھی اپنے سارے کام چھوڑ کر ان کے پاس آ گئیں۔

''آپ کو پتا تو ہے بھائی صاحب کا..... انہیں جہاں رات گزارنے کا دل چاہتا ہے رک جاتے ہیں۔ آپ نے عالیہ کو فون کیا ہو سکتا ہے اس کے پاس رک گئے ہوں۔''

''ارے اب کی بار تو وہ مجھ سے لڑ کر گئے ہیں۔ پتا نہیں کیوں برے برے خیالات آ رہے ہیں۔ بہت غصے میں تھے اور پھر مجھے نعمان کی بھی کوئی خبر نہیں۔''

ان کے آنسوؤں میں شدت آ گئی تھی۔

''اچھا آپ رونا تو بند کریں..... میں پتا کرتا ہوں..... غصہ ہوگا آپ پر..... اس لیے کہیں چھپ گئے ہوں گے۔''

فہیم شاہ نے انہیں طفل تسلی دی۔ تائی نے دوپٹہ چہرے پر رکھ لیا۔ چاچی نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ لیا۔

''آپ تو ایسے رو رہی ہیں جیسے پہلی بار وہ اس طرح گھر سے غائب ہوئے ہیں بس کریں ابھی آ جائیں گے۔ چلیں اٹھیں منہ ہاتھ دھو کر اپنی حالت ٹھیک کریں۔ بلکہ ایسا کریں سفیر کو فون کر لیں آپ کو تسلی ہو جائے گی۔''

صبح ہی صبح تائی کو سنبھالنے والا مشکل کام بھی چاچی کو کرنا پڑا تھا۔ انہیں یقین تھا آج کا پورا دن اسی دلجوئی میں گزرے گا۔ کام بھی کرنے پڑیں گے اور خدمت بھی..... یہ سوچتے ہوئے چاچی کو شدت سے چائے کی طلب ہو رہی تھی فہیم شاہ بھی اٹھ کر باتھ روم چلے گئے تھے۔

یہ بھائی بھی..... بھائی نہیں ناسور تھا..... جب سے زندگی میں آیا تھا..... زندگی سولی پر ٹنگی ہوئی تھی تائی کی طرح ان کی چھٹی حس بھی کہہ رہی تھی کہ کوئی نیا ستم ایک بار پھر ان کا منتظر ہے۔

☆.....☆.....☆

میرا نام عظیم شاہ ہے مجھے ابھی تھوڑی دیر پہلے کراچی کی اس حوالات میں منتقل کیا گیا ہے۔ میری اپنی غفلت اور بے وقوفی ہی تھی جو میں حیدر آباد پولیس کے ہاتھ لگا ورنہ میں تو..... پولیس والوں کے درمیان رہ کر.....

پولیس کی بات چھوڑیں..... کوئی اور بات کرتے ہیں..... اب حوالات کے باہر بھی پولیس والے اور میرے اندر بھی.....

لیکن آپ لوگوں جو حیرت ہو رہی ہو گی کہ میں آپ کو کیوں مخاطب کر رہا ہوں شاید میں اپنی صفائی پیش کرنا چاہ رہا ہوں۔ شاید میں خود کو بے گناہ ثابت کرنا چاہتا ہوں یا پھر آپ لوگوں کی ہمدردی حاصل کرنا چاہتا ہوں لیکن سچ بتاؤں ان میں سے کوئی بات نہیں ہے۔

مجھے اپنی بے گناہی ثابت کرنی ہی نہیں ہے۔ کیونکہ میں بے گناہ ہو ہی نہیں سکتا میں ایک گناہ کے صلے میں اس دنیا میں آیا تھا اس لیے میرا ضمیر بھی مجھے نہیں جھنجھوڑتا اس نے بھی ہار مان لی ہے۔

میری بات پر حیران ہونے کی ضرورت نہیں اب آپ لوگ سوچ رہے ہوں گے کس کے گناہ کا پھل ہوں میں تو.....

تو میں سچ بتاؤں..... میں اپنے ماں باپ کے گناہ کی بدترین شکل ہوں۔

دیکھیں آپ کو میری باتوں پر زیادہ پریشان ہونے کی الجھنے کی ضرورت نہیں میں جب آپ کو اپنی کہانی شروع سے سناؤں گا اور اپنے دل کی ساری باتیں بتاؤں گا تو آپ کی بھی الجھن دور ہو جائے گی اور میرے دل پر رکھا بوجھ بھی کم ہونا شروع ہو جائے گا ایک عمر گزر گئی زندگی اپنے آخری سفر کی طرف گامزن ہے میں نے کبھی کسی اپنے سے دل کی بات نہیں کی۔

میں نے اپنے بارے میں سب کی قیاس آرائیاں ضرور سنیں لیکن میں نے خود پر کوئی قیاس آرائی نہیں کی ورنہ میں وہ کردار ہوں جو سب سے زیادہ اپنی ذات کی ہمدردی کا مستحق ہے۔

یہ سچ ہے جس طرح آپ لق دق صحرا میں پھولوں کی آبیاری نہیں کر سکتے اسی طرح آپ میرے جیسے شخص سے خیر کی امید نہیں کر سکتے۔

آپ نے اب تک میری زندگی کا وہ رخ دیکھا جو میں نے دکھایا آپ کو پتا ہی نہیں کہ میں اندر سے کون ہوں۔اور میں نے زندگی کے مسکراتے چہرے پر کتنی بار خون کے چھینٹے ڈالے ہیں۔

جی ہاں کسی کے خون کے نہیں اپنے خون کے۔

آپ کو میری یہ بے ربط کہانی سمجھ میں نہیں آ رہی ہو گی میں چاہتا ہوں کہ آپ کو شروع سے پوری بات بتاؤں اور پھر فیصلہ کروں کہ مجھے اب کیا کرنا ہے۔

جی بالکل! میں اپنی زندگی کے سارے فیصلے خود کرتا آیا ہوں اپنی موت کا فیصلہ کرنا پڑا تو وہ بھی خود ہی کروں گا کسی کو بھی زحمت نہیں دوں گا۔

ارے آپ تو مجھے شیطان سمجھنے لگے یا کوئی دہریہ.....نہیں ایسی کوئی بات نہیں.....میں پانچ وقت کا نمازی ہوں میری آنکھ عین وقت فجر کھل جاتی ہے کیونکہ میں نے سنا ہے کہ وہ بھی وقت فجر ہی تھا جب میں اس دنیا میں آیا تھا۔لیکن میری بدقسمتی کے میرے قبیلے میں کوئی میرے کانوں میں اذان دینے والا نہیں تھا اور میرا باپ.....شاید اس کے نزدیک ان باتوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

اہمیت تو اب اس بات کی بھی بالکل نہیں رہی کہ کون مجھ سے ملنے آ رہا ہے کس کو میری پرواہ ہے اور کون یہ سب دیکھنے اور سننے کے بعد مجھ پر ہنسے گا مجھے مجرم کہے گا۔لعنت ملامت کرے گا۔لیکن پولیس والے کا اصرار ہے کہ صاحب کے کمرے میں کوئی ملاقات میرا انتظار کر رہی ہے۔

سو جب تک یہاں پر ہوں تب تک ان در و دیوار کے ناز نخرے تو اٹھانے پڑیں گے اس لیے پہلے ملاقات سے ملاقات کر آؤں پھر آپ سے بات کرتا ہوں۔آپ لوگ صفحہ مت پلٹیے گا میری کہانی انوکھی بھی ہے اور دلچسپ بھی اس میں عبرت بھی ہے اور رنگینی بھی.....شاید زندگی کی کہانی ایسی ہوتی ہے۔

خواب اور خواہش کے دائروں سے بنتی بگڑتی زندگی!

صاحب کے کمرے میں میری ملاقات مگر اتنی جلدی کس کو خبر ہوگئی جو میری خبر گیری لینے آ گیا یہ ذرا اچنبھے والی بات تھی میں سر جھکائے صاحب کے کمرے کی طرف چل دیا جو حوالات کی راہداری عبور کر کے ذرا آگے والی لائن میں تھا۔ سنتری بادشاہ میرے ساتھ تھے اور میرے ہاتھ سیاہ زنگ آلود ہتھکڑی میں جکڑے ہوئے تھے پتا نہیں یہ زنجیر کتنے لوگوں کا مقدر بنی تھی اور آج اپنا مقدر میں نے جان بوجھ کر اس کے حوالے کر دیا تھا۔

یہ کوئی حیران ہونے کی بات نہیں ہر مسافر کو اپنی منزل کا پتا ہوتا ہے اور وہ جلد از جلد اس تک پہنچنا چاہتا ہے۔ میں نے طویل عرصہ اس سفر کی صعوبتیں جھیلی تھیں اور اب تھک گیا تھا اس لیے ستانے کے لیے اس مانوس سی دنیا میں چلا آیا تھا۔

میری سوچوں کا تسلسل اس وقت ٹوٹا جب صاحب کے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر مجھے رک جانے کو کہا گیا۔

''صبر..... بڑی جلدی ہے تیرے اندر.....''

شاید وہ پہلے اپنے صاحب کی پرائیویسی کا دھیان کرنا چاہتا تھا سو اس نے مجھے دروازے پر ذرا سا روک کر اندر جھانک کر دیکھا اور پھر پلٹ کر مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

پولیس والوں کی مخصوص وضع قطع سے ہٹ کر میری آنکھوں کے سامنے خاصی پروقار اور بارعب شخصیت براجمان تھی اور جو میرا ملاقاتی تھا اس کے سامنے والی کرسی پر تھا اس لیے اس کی پشت اور بالوں سے ڈھکے سر کے علاوہ میرے سامنے کچھ نہیں تھا.

''تو عظیم شاہ تم ہو..... شجاع یہ ہے تمہارا مجرم..... اور تمہاری فرشتہ صفت پھوپھی کی زندگی میں مشکلوں کے پہاڑ کھڑے کرنے والا شخص.....''

وہ شاید ڈی ایس پی تھا جس روایتی کڑوے لہجے میں میرا تعارف کروایا مگر میں لفظ شجاع پر گڑ کر رہ گیا۔

مجھے اس وقت سفیر سے ملنے کی توقع تو تھی فہیم بھی آ سکتا تھا اور میرا کوئی داماد بھی لیکن راحت بیگم کا بھتیجا اتنی جلدی مجھ سے ملنے آ گیا تھا۔ مجھے خود کو سنبھالنے میں دقت سی ہوئی لیکن اس کے باوجود میری گردن کا طنطنہ اور کمر کی کمان کم نہ کو میں بدستور سر اونچا کیے اسے دیکھ رہا تھا اور وہ مجھے.....

اس کی آنکھوں میں کوئی تاثر نہیں تھا۔

نہ غصہ نہ نفرت اور نہ گئے وقت کا حساب کتاب۔

وہ بس چپ چاپ مجھے دیکھ رہا تھا اور میں اسے..... کئی لمحے سناٹے کی دیوار کو توڑتے گزر گئے۔

ڈی ایس پی دونوں کی طرف سے کسی ردعمل کا منتظر تھا میں نے اپنے بڑے پن کا ثبوت دیا اپنی ڈھٹائی کو سلام کرتے ہوئے شجاع کو مخاطب کیا۔

''تمہارا کیا خیال ہے تمہاری پھوپھی کے اغوا کا ذمہ دار میں ہوں۔ تو یہ تمہاری بھول ہے میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔''

''میرا خیال ہے آپ نے صرف میری پھوپھی کو ہی اغوا نہیں کروایا بلکہ اپنے بھائی اور صوفیہ کے بابا کی جان بھی لی ہے اور اب میں کورٹ میں اس کو ثابت کر کے رہوں گا۔''

وہ گہرے اور ٹھنڈے لہجے میں بولا تو میرے چہرے پر مسکراہٹ سی آ گئی میرے سامنے کل کا بچہ تھا میں اس لفاظی سے کہاں متاثر ہونے والا تھا اور نہ ہی میں اس کی باتوں پر کوئی ایسا تاثر دینے والا جو میری زندگی کی پوشیدہ سچائیوں سے نقاب اتارنے والا ہوتا۔

''برخوردار! تم شدید قسم کی غلط فہمی کا شکار ہو کیونکہ میں اس وقت ایک ملزم کی حیثیت سے تم سے مل رہا ہوں اور جب تک یہ الزام جھوٹا ثابت نہیں ہو جاتا میں تم سے کچھ نہیں کہوں گا میں تو خود راحت.....''

''جسٹ شٹ اپ اپنی آلودہ زبان سے ان کا نام بھی نہ لینا میں سب جانتا ہوں آپ ان کو اپنے ہاتھوں کا puppet (پپیٹ) بنانا چاہتے تھے جب انہوں نے آپ کا ساتھ نہیں دیا تو آپ نے وہ کیا جو آپ سا بدفطرت آدمی ہی کر سکتا ہے۔''

شجاع کے لہجے میں کاٹ ہی کاٹ تھی اور مجھے اس ردعمل کی پوری توقع تھی۔

''ارے تم بکواس بند کرو ابھی کچھ ثابت نہیں ہوا جب میرا جرم اور اس کا ثبوت تمہاری آنکھوں کے سامنے آجائے تو مجھ سے بات کرنا۔'' میرے منہ سے ایک بار پھر جھاگ اڑنے لگی تھی۔

شدید غصے اور تناؤ کی کیفیت میں میری حالت عجیب ہو جاتی تھی کنپٹیاں سلگنے لگتیں آنکھوں کی سفیدی سرخ ڈوروں سے بھر جاتی اور میرے ذہن میں گویا جھکڑ سے چلنے لگتے میرا بس نہ چلتا اس حالت میں میں خود کو کاٹ ڈالوں اور جوانی میں ایسے بہت سے زخم میں نے اپنے جسم کو دیے تھے لیکن اب ذرا قوت برداشت اور مصلحت کا ساتھ مجھے محفوظ رکھتا تھا۔

ڈی ایس پی نے دیکھا ماحول کشیدہ ہونے لگا ہے اور بے مقصد گفتگو سے اس کی تفتیش کو کوئی فائدہ نہیں پہنچنے والا تو اس نے سنتری کو اشارہ کیا مجھے لے جانے کا اور خود اٹھ کر شجاع کے پاس آ گیا۔

''کیوں اب اپنی جان جلاتے ہو جرم کرنے والا ثبوتوں کے نشان مٹانے کی کوشش تو کر سکتا ہے مگر اپنے اعمال نہیں چھپا سکتا، فکر نہیں کرو..... یہ شخص اپنے ایک ایک جرم کا اعتراف کرے گا اور اس نے جو شرافت کا بہروپ بھر رکھا ہے نا اب اسے اتارنا ہمارا کام ہے۔''

وہ پولیس افسر اسے تسلی دے رہا تھا اور مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا کیونکہ میرے چہرے کا اطمینان تھا ہی قابلِ دید.....

سنتری نے مجھے آگے دھکیلا ہتھکڑی کی آواز ابھری وہ دونوں میری طرف متوجہ نہیں تھے میں نے اپنی رعونت اور تکبر دروازے پر اتارا اور واپس اس کوٹھری میں آ گیا جہاں سپین اور گندگی نے عجیب سا

تعفن پھیلا رکھا تھا۔

بظاہر گندگی اور تعفن والی کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی لیکن یہ میں جانتا تھا جو جو یہاں آتا ہوگا وہ اپنے سیاہ اعمال کا تعفن سانسوں کے ذریعے ضرور خارج کرتا ہوگا۔ وہی جو اس وقت اس سلاخ زدہ کوٹھری میں رچی ہوئی تھی۔ لیکن میں یہ نہیں کہوں گا اس ماحول میں میرا دم گھٹ رہا ہے یا مجھے اپنے گھر کا بستر شاہی یاد آ رہا ہے ایسا بالکل نہیں تھا۔

میں نے کہا نا منزل کوئی بھی ہو سفر کی تھکان سے آزاد کر دیتی ہے میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور میں نے سر گھٹنے پر رکھا تو میرے کانوں میں ایک نوزائیدہ آواز جو شاید اس کا اپنے غلاف سے باہر نکل آنے پر احتجاج تھا گونجنے لگی۔

میں نے لفظ نوزائیدہ بچہ نہیں کہا آپ کو حیرت ہوئی ہوگی دراصل بچہ تو ماں باپ کا ہوتا ہے لیکن میں تو بس ایک عورت بے بطن سے پیدا ہو گیا تھا جو نہ کسی کی بیوی تھی اور نہ ہی کسی عزت دار گھرانے کی عورت..... وہ تو بس ایک جنس اور میں اس کی جنس۔

اس عورت کا تعلق خانہ بدوشوں کی ایک مفلوک الحال بستی سے تھا موسموں کی شدتوں کے ساتھ ٹھکانہ بدلنے والا یہ قبیلہ اپنے وجود سے لے کر اب تک سفر میں تھا اس بار شاید اس کا پڑاؤ کسی سرحدی گاؤں میں تھا یا پھر پنجاب کا کوئی نواحی دیہات..... مجھے ٹھیک طور سے اپنی پیدائش کا مقام یاد نہیں اور نہ ہی کسی نے بتایا۔

خیر وہ عورت جس کے ساتھ میں پیدائش سے لے کر عمر کے بارہویں سال تک رہا وہ اس قبیلے کی سب سے خوبصورت الہڑ اور شوخ حسینہ کے طور پر مشہور تھی بڑا سا آتشی رنگ کا چولا اپنے اوپر چڑھائے اپنے سنگھار کے ہر گُن سے آشنا تھی۔ وہ کس کی اولاد تھی اس کا اصل والی وارث کون تھا یہ تو مجھے یاد نہیں لیکن مجھے یہ بتایا گیا تھا ایک شہری آدمی نے اسے ایک ہفتے کے لیے اپنی خدمت کے لیے منتخب کیا اور

معاوضے کے طور پر کچھ رقم اور میرا وجود اسے تھما دیا تھا۔ گویا جبر کی اولاد تھا میں یا پھر عیاشی کا ثمر.....

میں نے یہ بھی سنا ہے کہ اس قبیلے کی بڑی بوڑھیوں نے مجھے پیدا کرنے والی عورت کا جینا حرام کر دیا تھا اور جب اس کے اندر غیر معمولی تبدیلی رونما ہونے لگی میرے وجود کے آثار اس کے جسم کے نشیب و فراز سے جھلکنے لگے تو ایک طوفانی بارش کی قیامت رات کو دائی نما عورت نے اپنی عمر بھر کی حکمت کا نچوڑ شہزادی کو پلا دیا تھا۔ (جی ہاں اب مجھے یاد آیا اس عورت کو سب شہزادی کہتے تھے۔)

او..... ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ نہ صرف پلایا گیا بلکہ اس کی کمر، پیٹ اور ٹانگوں کے اوپری حصوں پر لاتوں مکوں کی شدید ضربیں لگائی گئیں مگر شہزادی بھی کمال عورت تھی سب سہہ گئی اور اس غلاف میں کوئی سوراخ نہیں ہونے دیا جس میں اس نے مجھے چھپا رکھا تھا۔

کرموں جلی، بے مراد، بدذات تجھے سمجھایا بھی تھا کوئی دم چھلا ساتھ نہ لے کر آنا۔ اوپر سے ایسی سخت جان ہے کہ کتیا بھی کیا ہوگی ذرا جو کچھ اثر ہو۔

یہ وہ باتیں جو مجھے شاید کسی نے بتائی نہیں تھیں میرے دنیا میں آنے سے پہلے ہی میرے کانوں میں پڑنے لگی تھیں یا پھر ایسے موقعوں پر عورتیں اور مرد ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔

ارے بدذات اپنے آپ کو کسی قابل نہیں چھوڑا تو نے، کون تجھے بیاہے گا اور کون تیری ہوس پوری کرے گا کوئی مرد بھلا یہ برداشت کرے گا کہ تو نے کسی اور کا بچہ جنا ہے۔

لعنت ہے تیری جوانی پہ..... پتا نہیں ان عورتوں کا اصل مقصد کیا تھا اور وہ دائی کیوں اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکی بہر حال جو بھی ہوا تھا برا ہوا تھا شہزادی اس رات بھی سہہ گئی اور آنے والے کتنے دنوں میں بھی سہتی رہی۔

سب اس سے پوچھتے تھے پھٹکار بھیجتے تھے غصہ کرتے تھے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوتی تھی۔

اس یار کا اتا پتا بھی لیا ہے تو نے کیا کرے گی اس عذاب کو پالے گی کہاں سنبھالے گی۔

وہ چولہے سے نکلنے والے دھوئیں کے مرغولوں میں منہ دیئے بیٹھی رہتی نہ وہ جواب دیتی نہ ہی اثر لیتی۔

وہ مٹکے سر پر رکھ دور سے پانی بھر کر لانے والی شہزادی اللہ جانے اتنی سخت جان کیوں تھی شاید یہ بے نیازی اس کی فطرت کا خاصہ تھی یا پھر وہ میری وجہ سے اتنی مضبوط ہو گئی تھی۔

خانہ بدوشوں کے خیموں میں زندگی کس ڈگر پر گزرتی ہے ان کو کون کون سی نعمتوں کی فراوانی ہوتی ہے اس کا اندازہ تو کوئی بھی ذی شعور کر سکتا ہے۔

میں آج بھی ان خیموں کی سیاہ بھیانک سرد راتیں نہیں بھلا سکتا لیکن شہزادی نے انہی بھیانک راتوں کو شدید تکلیف اور کرب میں گزار کر جب مجھے جنم دیا تو عورتوں اور مردوں نے انگلیاں دانتوں تلے داب لیں۔

میں نے سنا ہے میں بہت خوبصورت اور صحت مند پیدا ہوا تھا میری صحت مندی کے باعث شہزادی کو تین دن تخلیق کے کرب سے گزرنا پڑا تھا۔

کھردرے بان کی چارپائی نے اس کی پشت پر زخم بنا دیے تھے دائی نما عورت نے اس کی ڈھٹائی اور ہٹ دھرمی پر طعنے دے دے کر اس کی آزمائش کو مشکل تر بنا دیا تھا مگر وہ واقعی ڈھٹائی کی اعلیٰ مثال تھی ضبط کے اس پلِ صراط سے گزر گئی وہ بھی ایک انجان شخص کی اولاد کے لیے۔

اللہ جانے وہ انجان شخص اسے کیا دے کر گیا تھا اور کیا دینے والا تھا یہ تو کوئی نہ جان سکا شاید میں بھی نہیں لیکن یہ سچ ہے کہ شہزادی نے میری پیدائش کے بعد اپنے شب و روز صرف میرے لیے وقف کر دیے اس کا سونا، جاگنا، کھانا، پینا کچھ بھی میری ذات کے دائرے سے الگ نہیں تھا۔

ظاہر ہے شہزادی کا ٹھکانہ جس جھونپڑی میں تھا اسی میں مجھے بھی پلنا اور بڑے ہونا تھا اور وہاں پر شہزادی کے علاوہ ایک بوڑھی عورت بھی رہتی تھی جس کی شکل بڑی حد تک شہزادی سے ملتی تھی مگر مزاج کسی بھی حد تک نہیں ملتے تھے۔

دونوں ہر وقت ایک دوسرے سے خائف رہتیں اور ایک بولتی بکتی جھکتی رہتی جبکہ دوسری کبھی بڑبڑانے لگتی اور کبھی جلتے چولہے پر پانی کا بھرا گلاس پھینک کر سارے آنگن میں دھوئیں کے بادل بھر کر کسی دوسرے کونے میں جا بیٹھتی۔

یہ تھا وہ میرا ابتدائی ماحول جس میں میری پرورش ہوئی جہاں شہزادی کے علاوہ میرا کوئی خیر خواہ نہیں تھا اور نہ ہی میں کسی کا منظور نظر بن سکا شہزادی کا ناجائز بیٹا ہونے کی وجہ سے.....

خانہ بدوشوں کی اس بستی میں جہاں زندگی کی گاڑی کھینچنا مشکل ہو وہاں مجھ جیسے بچوں کی تربیت تو دور کی بات انہیں زندہ رہنے کا حق دے دیا جائے وہی کافی ہوتا ہے سو میں اس احساب تلے دب کر کدو کی بیل کی طرح بس بڑا ہونے لگا۔

شہزادی کچھ نہ کچھ کر کے میرے کھانے پینے کا بندوبست اچھی طرح کر دیتی تھی۔

بکری کا خالص دودھ، بٹیر کا گوشت اور بھنے ہوئے مشرومز میری پسندیدہ غذا بن چکے تھے۔

کیوں کہ شہزادی کے پاس ان تینوں چیزوں کے حصول کے لیے اپنا خاص ہنر موجود تھا۔

میں شاید چار سال کا تھا جب میں نے اسے بٹیر کا شکار کرتے دیکھا اور مشرومز کا حصول تو کوئی مسئلہ نہیں تھا جن دنوں یہ قبیلہ پہاڑوں سے اتر کر وادی میں پناہ لیتا مشرومز وافر مقدار میں دستیاب ہو جاتے اور شہزادی ان کو دیسی طریقے سے محفوظ بھی کر لیتی۔

ایک تو ویسے بھی صحت مند پیدا ہوا تھا اوپر سے اس طرح کی خوراک میں اس بستی کے سارے مفلوک الحال بچوں سے الگ ہی نظر آتا۔

مجھے شہزادی کہیں بھی ساتھ لے کر جاتی تو پہلے تو سب اسے عجیب و غریب نظروں سے گھورنے لگتے اور پھر سوالات ایسے کے جن سے ان کے چہرے پر تناؤ کی واضح کیفیت نظر آنے لگتی۔ اس وقت تو میں اپنی نادان عمر کے باعث ان کو سمجھ نہیں پایا لیکن جب بڑا ہوا تو اندازہ ہوا کہ اس عورت نے مجھے زندہ

رہنے کا حق دے کر خود اپنے آپ سے زندگی کا حق چھین لیا تھا۔

میں بڑا ہو رہا تھا اور ساتھ ساتھ میرے سوالات بھی۔

ایک دن تو میں بھی اس سے پوچھ بیٹھا۔

باجی یہ یار کیا ہوتا ہے میرا سوال اتنا مشکل نہیں عجیب ضرور تھا جب ہی اس نے جھڑک کر کہا۔

تو چپ کر..... تیرے مطلب کی بات نہیں۔

اس نے مجھے غصے سے دیکھا اور میں مزید خائف ہو گیا۔

یقیناً یہ کوئی ایسی بات ضرور تھی جو شہزادی کو سخت ناپسند تھی میں نے پہلی بار ان سب عورتوں اور مردوں کے بارے میں اپنے دل میں نفرت اور غصے کے شدید تاثرات ابھرتے محسوس کیے جو شہزادی کو اس لفظ کے ساتھ تکلیف دیتے تھے۔

میں اسے ماں کبھی نہیں کہہ سکا بلکہ میری محرومی اور بدنصیبی کہ میں کسی کو بھی اسکے اصل رشتے کی حرمت اور تقدس کے ساتھ نہیں پکار سکا۔ شاید میری تربیت کا قصور تھا یا اس ماحول کا جہاں سب رشتے اپنی اپنی پہچان سے محروم تھے۔

کوئی اگر کسی کا چاچا تھا تو وہ اسے گالیاں دے رہا ہوتا اور کوئی کسی کی خالہ تو شرم وحیا سے بے نیاز نہ جانے کیسی کیسی باتیں ہو رہی ہوتیں۔

میں ان دنوں پانچ یا چھ کا ہوں گا جب میں نے شہزادی کی ماں کو ایک پتھر کی اوٹ میں نہاتے دیکھا تو میرا تجسس مجھے وہیں ٹھہرنے پر مجبور کر گیا۔ اسے شاید بہت دنوں بعد پانی اور صابن میسر آیا تھا اور وہ خوب مل مل کر نہا رہی تھی۔

میں اس کے شہزادی کے بات کے فطری تضاد پر ایک نئے زاویے سے سوچتے ہوئے جب کچھ دیر اور وہاں رکا رہا تو میری حالت عجیب سی ہونے لگی مجھے لگا جیسے میں کسی دیوار سے چپک گیا ہوں پتا

نہیں مجھے کیا ہوا تھا بہر حال جب میں وہاں سے ہٹ کر اپنی جھونپڑی کی طرف آنے لگا تو چند قدم چلنے کے بعد مجھے اپنی ہی بستی کے ایک آدمی نے جکڑ لیا۔

وہ خاصی بڑی عمر کا آدمی تھا اس نے مجھے پل بھر کے لیے اپنی بانہوں میں دبوچا اپنے اندر پوری طاقت سے بھینچا پھر مجھے خود سے الگ کر دیا۔

میں مضبوط ساخت کا بچہ تھا، اس کے اس عمل پر میں نے تکلیف تو محسوس کی، مگر کوئی نیا احساس بھی تھا جو مجھے اس آدمی کے قریب ہونے پر مجبور کر گیا، اس کے بعد وہ مجھے اپنی جھونپڑی میں لے گیا، اس نے ڈھیلی ڈھالی سی شلوار قمیض پہنی ہوئی تھی اور میں نے بھی--- پھر شاید اس نے قمیض اتاری۔

''تجھے گرمی نہیں لگ رہی؟؟ اتار دے ان کو چل آ..... نہاتے ہیں۔۔'' اس نے مجھے شاید کچھ کھانے کو دیا تھا یا پینے کو، اب تو یاد نہیں، لیکن میں مسمرائز سا ہو کر اسے دیکھے جا رہا تھا۔

آج سے پہلے یہ آدمی مجھے اتنا برا نہیں لگا تھا، میں خوفزدہ بھی تھا اور رونا بھی چاہتا تھا، لیکن اس کی سرخ نگاہیں مجھ پر ایسے جمی تھیں جیسے کوئی وحشی درندہ اپنے شکار کی تاک میں بیٹھا ہوتا ہے اور وہ کئی دن کا بھوکا بھی ہوتا ہے۔

''چاچا! باجی مارے گی--- میں بے بے کے ساتھ آیا تھا--- جاؤں.....'' میں اس کے گرم جسم کی حدت سے گھبرا کر منمنایا۔

''ارے نہیں مارے گی، بے بے کے ساتھ میں بھی آیا تھا، لیکن خیر چل چھوڑ--- تو کس لیے ڈر بہادر بن، شہزادی مارے تو میرے پاس آ جانا۔'' اس نے ایک آنکھ دبا کر میری گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تو یکدم میں اس کی گرفت سے نکل کر بھاگا۔

نہ مجھے اس وقت رونا آ رہا تھا اور نہ ہی غصہ، میں بس بھاگنا چاہتا تھا، کیونکہ مجھے اندازہ ہو گیا تھا وہ بغیر قمیص کا آدمی اس وقت مجھے پکڑنے کے لیے جھونپڑی سے باہر نہیں نکلے گا۔

پہلے تو میرا دل چاہا میں جا کر سب کچھ شہزادی کو بتا دوں اور اسے کہوں کہ تجھے جو آدمی گندا لگتا ہے وہ مجھے بھی بہت گندا لگتا ہے، لیکن پھر کوئی الجھن تھی جو نہ سلجھ سکی اور میں خاموش ہو گیا۔

اس رات میں جب کھلے آسمان تلے شہزادی کے ساتھ چارپائی پر لیٹا تو مجھے نیند نہیں آئی، میں جیسے ہی آنکھیں بند کرتا، بے بے کا صابن ملنا، کبھی اس کے بدبودار جسم کی گرفت سے نکل بھاگنا، آنکھوں کے پردے پر لہرانے لگتا اور سارے منظر گڈمڈ ہونے لگتے، میں آپ کو سچ بتا رہا ہوں میں بہت بڑا نہیں تھا اس وقت لیکن میرا شعور بہت تیزی سے بڑا ہونے لگا تھا۔

اس کے بعد ایک دن پھر وہ گندا آدمی مجھے اپنے ساتھ لے گیا اور اس بار تو اس نے شہزادی سے اجازت بھی لی تھی۔

''او شہزادی! بھیج دے اپنے لونڈے کو میرے ساتھ، میلہ لگا ہے پاس والے گاؤں میں، ذرا گھوم پھر کر آ جائے گا بیچارا۔'' وہ شاید ہمیشہ ہی ایک آنکھ دبا کر بات کرتا تھا۔

شہزادی نے ذرا خائف نظروں سے اسے دیکھا۔

''غصہ کیوں کرتی ہے، تو بھی چل نا، پوچھ لے اپنے ابے اور بے بے سے--- چوڑیاں دلاؤں گا تجھے، تیرے دونوں ہاتھ خالی ہیں۔''

''چل بکواس نہ کر، شکل دیکھی ہے اپنی، چوڑیاں پہنوں گی وہ بھی میں تجھ سے لے کر--- چل جا میرا سر نہ کھا''

شہزادی نے جھاڑو پٹخ کر اپنے مخصوص کرخت انداز سے کہا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

''تیری یہ شان تو مجھے مار دیتی ہے، ساری بستی تجھے گالیاں دیپر تیرے غرور میں کمی نہ آئی، واہ رے شہزادی تو واقعی کسی بادشاہ کی اولاد ہے۔''

وہ اسے حریص نظروں سے دیکھ رہا تھا اور میرا دل چاہ رہا تھا میں ان نظروں کے بیچ دیوار بن جاؤں۔

تو میرے قصیدے نہ پڑھ، مجھے کام کرنے دے،" وہ تیز تیز دھول اڑانے لگی۔

''تیرے قصیدے نہ پڑھوں تو کس کے پڑھوں، سالوں سے تیرے قصیدے پڑھ رہا ہوں، تیرا نام سن کر جیتا مرتا ہوں یہ تو ہے کہ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی۔'' اس کی نظریں بس شہزادی کو اوپر سے نیچے تک دیکھ رہی تھیں، وہ کبھی جھک کر تو کبھی بیٹھ کر کچا صحن جھاڑو سے صاف کر رہی تھی اور اس آدمی کی آنکھیں اس کے ساتھ اوپر تو کبھی نیچے ہو رہی تھیں۔

''تو میرا دماغ کھاتا رہے گا یا جائے گا بھی۔'' وہ غصے سے بولی تو اس کی صحت پر کوئی فرق نہیں پڑا۔

''اچھا غصہ نہ کر، اپنے ببلو کو بھیج دے، گھوم پھر کر آ جائے گا، سوچ نا اس کا باپ ہوتا تو تیری زندگی میں اتنی مشکل نہ ہوتی، تجھے ہی اس کے سارے کام کرنے پڑتے ہیں نا۔''

''میلہ تو بچوں کا ہی ہوتا ہے نا، مجھے بڑا خیال آتا ہے تیرے اس لونڈے کا، چل جانے دے نا۔''

وہ اب مجھے دیکھ رہا تھا، میٹھی میٹھی نظروں سے، کوئی پیغام بھی تھا ان نظروں میں جو مجھے اکسا رہا تھا کہ تم بھی بولو۔

اس لمحے مجھے اس کی بات تو --- سمجھ نہیں آئی، لیکن میلے کا تصور میرا شوق بڑھا رہا تھا، کچھ دن پہلے ہی تو میں شہزادی کے ساتھ ایک میلے میں گیا تھا، تب میں نے ایک نئی دنیا دریافت کی تھی۔

ایک نئے سیارے کی سیر کی تھی میں نے۔

وہ رنگوں کی دنیا تھی۔

خوشیاں ہی خوشیاں تھیں اس میں۔

اس میں سب اچھے، صاف ستھرے لگ رہے تھے۔ کوئی میلا گندا نہیں تھا، کسی سے بدبو نہیں آ رہی تھی۔

کوئی ایک دوسرے پر برس نہیں رہا تھا اور نہ ہی گالیاں دے رہا تھا۔

وہ کوئی اور ہی دنیا تھی، اس لیے مجھے اس دنیا کی رنگینی، اس میلے گندے آدمی کے ساتھ جانے پر اکسا رہی تھی۔

آج وہ بھی صاف کپڑوں میں تھا اور پھر ہماری بستی کا تو تھا، میں اس سے خوفزدہ کیوں ہوتا۔

میلے میں تو بہت سارے لوگ ہوتے ہیں نا پھر کس بات کا خوف۔

جانا ہے تجھے۔" شہزادی نے براہ راست مجھ سے پوچھا۔

میں نے سر جھکا کر جانے کی ہامی بھری تو شہزادی نے جھاڑو ایک طرف ڈال کر ہاتھ دھوئے اور پھر وہی گیلے ہاتھ میرے منہ پر پھیر دیا اور میرا منہ بھی صاف ہو گیا۔

شہزادی! اولاد تیری شہزادے سے کم نہیں۔ خوب ہاتھ مارا تھا تو نے بھی مگر قسمت--" مجھے اس کی باتیں آج تک یاد ہیں۔ شاید میری یادداشت اچھی تھی یا پھر میں یہ سب کچھ کبھی نہیں بھولنا چاہتا تھا۔

بہر حال اس کی بات پر شہزادی کی آنکھیں سرخ سی ہو گئی تھیں اور اس کے چہرے پر ہمیشہ والے تاثرات تھے، سخت اور سپاٹ۔

پتا نہیں یہ سب لوگ میرے باپ کا کیوں پوچھتے تھے، بستی میں بھی بہت سارے باپ تھے، لیکن کوئی مارتا تھا، کوئی گالیاں دیتا تھا، کوئی نشہ کرتا تھا، کسی کی ٹانگ ٹوٹی ہوئی تھی۔

میں سوچتا تھا، شاید میرا باپ ہوتا تو اس کی آنکھیں نہ ہوتیں، اس کے بازو نہ ہوتے۔

وہ مجھے مارتا، شہزادی کو گالیاں دیتا، غصے میں آ کر مٹکا توڑ دیتا۔

پھر ہم دونوں رویا کرتے چپکے چپکے۔

اس سے تو اچھا تھا ہمارے ساتھ کوئی باپ نہیں تھا۔

اس دن مجھے شہزادی نے اس آدمی کے ساتھ میلے میں بھیج دیا۔

میلے کی وہی دنیا تھی رنگ برنگی، پورا دن خوب موج مستی میں گزرا۔

میرے جیسے بہت سارے بچے تھے, کچھ میری عمر کے، کچھ مجھ سے زیادہ، میری دوستی تو کسی سے نہ ہوئی، البتہ ایک وقت ایسا آیا کہ میں نے شدت جذبات سے مغلوب ہو کر اس آدمی کو پکارا۔

''چاچا تو بہت اچھا ہے۔''

''اچھا---سچ کہہ رہا ہے۔'' وہ مجھے جھولے پر بٹھا کر پیار سے بولا۔

''چل ٹھیک ہے، کل بھی ادھر ہی مزا کریں گے۔ میں تجھے سرکس دکھاؤں گا۔ وہاں بہت کچھ ہوتا ہے۔'' وہ اپنے مخصوص انداز میں آنکھ دبا کر بولا۔

اب تو وہ مجھے دنیا کا سب سے اچھا آدمی لگ رہا تھا، سو اس کی یہ حرکت مجھے بری نہیں لگی، میں بھی مسکرا دیا۔

میں جھولے جھولتا رہا، کھاتا پیتا رہا، شام کو واپس شہزادی کے پاس جانے کا مجھے خیال بھی نہیں رہا کیونکہ اگلے دن پھر مجھے اس رنگ برنگی دنیا میں آنا تھا۔ چاچا بشیر کے بہت سارے دوست تھے یہاں پر، رات کو وہ مجھے ان کی بیٹھک پر لے گیا۔

میری پسند کا گوشت اور روٹی کھلانے کے بعد اس نے مجھے دودھ پتی چائے پلائی، کی وہ تینوں چاروں دوست بڑے خوش باش لوگ تھے۔

ایک مذاق کرتا سب اونچا قہقہہ لگاتے۔

پھر بشیر چاچا مجھے اپنی چارپائی پر لے آیا، اس نے قمیض اتار دی۔

''ذرا میرے کندھے تو دبا دے۔'' وہ ایک بھرپور انگڑائی لے کر بولا۔

اس کے دوست سگریٹ پی رہے تھے کیونکہ سب ایک دوسرے کو غور غور سے دیکھ رہے تھے اور کہہ رہے تھے۔

''شیدے نے تو اس بار دل لوٹ لیا، بڑی خالص چیز بھیجی ہے۔'' جس دوست کی یہ بیٹھک

تھی، اس کو سب سے مزہ آ رہا تھا۔

میں نے چاچا بشیر کے کندھے دبانا شروع کر دیے۔

کل تو وہ مجھے گندا لگتا تھا میرا دشمن تھا جس کی آنکھیں مجھے خوف میں مبتلا کر دیتیں لیکن آج وہ میرا محسن تھا، اس نے مجھے میری زندگی کا سب سے خوبصورت دن دیا تھا تو کیا اس کے بدلیمیں اس کی اتنی خدمت نہیں کر سکتا۔ ٹانگیں تو میں ابے کی بھی دباتا تھا جو مارتا رہتا تھا۔

میں شاید اس وقت سات سال کا ہوں گا یا آٹھ کا لیکن میرے ہاتھ خوب مضبوط تھے، جس کا اقرار چاچا نے کیا تو میرا چہرا کھل اٹھا۔

پھر تو میں نے اس کی مالش شروع کر دی۔ کندھے، پشت، بازو، پیٹھ، ٹانگیں۔

وہ میرے سامنے مست پڑا تھا اور میں اس کی خدمت کر رہا تھا، وہ جو کہتا گیا کیا میں کرتا گیا۔

رات کی تاریکی میں جب سارے نفوس سو رہے تھے تو اس بیٹھک میں لالٹین کی مدہم پیلی روشنی میں صرف انسان کا نفس جاگ رہا تھا اور وہ بھی ان سارے انسانوں کا۔

مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ سب کی خدمت کے بعد میں جب تھک ہار کر گرا تو میرا سر ایک بار پھر چاچا بشیر کے زانو پر تھا اور وہ اب میرا سر سہلا رہا تھا۔

اس رات جو میری زندگی کی پہلی خوفناک رات تھی، میں نے ''آدمی'' کی زندگی کا ایک نیا اور تکلیف دہ روپ دیکھا لیکن اس وقت میں اس روپ کو طاقت کی علامت سمجھا۔ میرے شعور نے کہا کہ شاید یہ سب اسی طرح ہوتا آیا ہے اور اسی طرح ہوتا ہوگا جیسے آج رات ہوا۔

جو میں نے کیا جو میرے ساتھ ہوا، وہ فطرت آدمی ہے۔ بچپن سے لڑکپن کے سفر میں زندگی ایسی ہی ہوتی ہے۔

بہر حال رات سے صبح ہونے تک میں صرف تھکن اور گھبراہٹ کا شکار تھا، میرا دل متلی کرتا رہا۔

چاچا بشیر نے سنا تو خوب ہنسا، اس نے مجھے لسی اور پراٹھے کا ناشتا کروایا، مجھے وہ ناشتا آج تک یاد ہے۔ شاید اس کے بعد میں وہ ناشتا دوبارہ نہیں کر سکا، اس لیے بھی.....

وہ صرف رات ہی خوفناک تھی، صبح پھر سے خوشگوار تھی۔ نئی امنگوں اور رنگوں سے بھرپور۔ آج سرکس بھی لگا ہوا تھا، مختلف کھیل تماشے اور کرتب ہو رہے تھے۔

چاچا بشیر نے مجھے بھی ان کے حوالے کر دیا، وہ کوئی کرتب والا تھا جس کو میری عمر کے بچے پر کوئی تماشا کرنا تھا۔

مجھے یاد تو نہیں کہ انہوں نے کیا کیا تھا لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ اس کے بعد لوگوں نے خوب تالیاں بجائی تھیں۔

گویا وہ تالیاں میرے لیے بھی تھیں۔ میں بھی خوش ہو گیا یہ ایک اور کامیابی تھی اس خوفناک اندھیری رات کے بعد۔

اس سے پہلے بھی مجھے ایک چھوٹی سی خوشی ملی تھی، چاچا بشیر کے بیٹھک والے دوست نے مجھے کچھ پیسے دیے تھے۔

"اپنے لیے مٹھائی لے لینا۔" اس نے میرے کندھے کو پیار سے دباتے ہوئے کہا، وہ مضبوط قامت کا خوش شکل آدمی تھا، اس کا بڑا سا ہوٹل تھا جس پر چائے سے لے کر کھانے پینے کی ہر چیز دستیاب تھی۔

"آجا میرے پاس ہوٹل پر، کام بھی سکھا دوں گا تجھے اور کھانے پینے کی کوئی تنگی نہیں ہوگی، مزے ہی مزے۔"

وہ چاچا بشیر کو دیکھتے ہوئے مزے سے بولا۔

"خیال تو اچھا ہے، چل ابھی تو اس کا پیچھا چھوڑ۔ اپنی ماں کا لعل ہے اس سے پوچھ لوں گا پھر ہی کچھ ہو سکتا ہے۔" وہی مخصوص انداز تھا۔

کیوں اس کا باپ کچھ نہیں کہے گا۔

''باپ ہوگا تو کہے گا۔ ماں ہی ماں ہے اس کی۔'' چاچا بشیر کا یہاں پر بالکل مختلف انداز تھا۔

اور پھر سے میں تھوڑی دیر کے لیے اس الجھن میں الجھ گیا تھا کہ سب کو میرے باپ کی فکر کیوں ہے۔

''کیا زندگی میں باپ ہونا اتنا ضروری ہے۔''

اس لفظ اور اس سوال کی تکرار زندگی بھر میرے ساتھ رہی۔ شاید اسی لیے میں خود بھی ایک اچھا باپ کبھی نہ بن سکا۔ میری اولادیں تو ہوئیں لیکن میں ان کے ساتھ پدرانہ شفقت اور محبت کا مظاہرہ کبھی نہ کر سکا۔

ہاں تو میں بتا رہا تھا، اس خوفناک رات کا سفر۔

وہ مجھے نئی دنیاؤں کے سفر پر لے گیا۔

وہ میلہ ختم ہو گیا، وہ سرکس بھی۔ سب لوگ واپس چلے گئے کسی دوسرے گاؤں کی طرف نکل گئے ہوں گے۔ ان کا تو کام ہی سفر کرنا اور تماشا لگانا تھا لیکن اس کے بعد میری زندگی۔ جی بالکل، اس کے بعد مجھ جیسے بن باپ کے لڑکے کی زندگی تماشوں کے سفر پر گامزن ہو گئی۔

''باجی! کیا تیری چاچا بشیر کے ساتھ شادی ہو رہی ہے۔'' شہزادی اپنے کپڑوں پر رنگ برنگے دھاگوں سے کچھ بنا رہی تھی تب میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔

اس نے مجھ پر گہری نگاہ ڈالی۔

''نہ کروں کیا شادی، ساری عمر ابے اور بے بے کی پھٹکار سنتی رہوں۔ دیکھتا نہیں کیا حشر کرتے ہیں میرا۔'' وہ تنک کر بولی۔

''تو تو چلی جائے گی نا پھاتو کی طرح اور مجھے یہیں چھوڑ جائے گی نا۔'' میری آنکھیں ڈبڈبا گئیں، اس نے بیساختہ مجھے اپنے ساتھ چمٹا لیا۔

''پاگل ہو گیا ہے، تیری خاطر ہی تو سب کر رہی ہوں، تو بھی میرے ساتھ جائے گا۔ ہم دونوں

اب اس کے گھر میں رہیں گے، دیکھنا اس نے چھت بھی ڈال دی ہے۔"

ہم لوگ شاید دو تین سال سے اسی علاقے میں ڈیرا ڈالے ہوئے تھے، اسی لیے کچھ جھونپڑیاں پکی چھتوں والی بھی بن گئیں تھیں۔

"چھت پکی ہو یا کچی، اگر وہ تن کا دکھ سکھ سمیٹ لے تو اس سے دوری کا تصور بھی محال ہوتا ہے۔

میں بھی اپنی اپنی کچی چھت والی جھونپڑی کو غور سے دیکھنے لگا۔ تو کیا بے بے اکیلی رہے گی ابے کے ساتھ۔"

"ہاں تو۔۔ ہم کون سا دور جائیں گے، یہ تو رہا تیرے چاچا بشیر کا ڈیرا۔"

شہزادی نے ہاتھ کیا شارے سے اپنی مخالف سمت اشارہ کیا تو میری نظریں اس بے آب و گیاہ زمین کی ان کچی پکی چھتوں پر جم گئیں، جہاں نہ بارش ہونے کی خوشی ہوتی تھی اور نہ دھوپ کی تیزی میں کوئی رنج مٹتا تھا۔

"باجی! کیا تو لال جوڑا پہنے گی۔" میں نے اشتیاق سے پوچھا، وہ جب مجھے کبھی بھولے بھٹکے اپنے ساتھ لپٹا کر پیار کرتی تھی تو میں بہت دیر تک اس کے وجود سے پھوٹنے والی ایک مخصوص مہک کے حصار میں رہتا تھا۔

وہ بری بوتھی یا اچھی، یہ تو میں نہیں جانتا لیکن میری تنہائیوں میں آج بھی وہ باس میرا دکھ بانٹنے چلی آتی ہے۔ میں نے کبھی شہزادی کو ماں نہیں کہا اور نہ اس نے کہلوایا۔

مجھے نہیں پتہ میں اس سے محبت کرتا تھا یا نہیں لیکن اس کے مشقت زدہ وجود کا حصار آج بھی مجھے مکر و فریب کی اس بری دنیا سے دور لے جاتا ہے۔ میرے اندر جمع ہونے والے بہت سارے ناسوروں پر مرہم رکھتا رہتا ہے۔

کچھ ہی دن میں اس کی شادی چاچا بشیر سے ہوگئی، چاچا بشیر نے شہزادی کو کپڑے بھی دیے،

چوڑیاں، زیور اور پاوڈر کریم سرخی بہت ساری چیزیں۔

میں نے بھی چاچا بشیر کے ساتھ جا کر بازار سے شہزادی کے لیے پھولوں والا ہار خریدا۔

کاغذ کے لال پھول میں نے شہزادی کو پہنائے تھے جسے میں باجی کہتا تھا جو میری ماں تھی جس کے وجود سے پھوٹنے والے رزق کی سفید دھاروں نے ڈیڑھ سال تک میری بھوک مٹائی تھی۔

دراصل وہی میرا سب کچھ تھی لیکن ہمارے درمیان نامحسوس سی خلیج نے رشتے کی لطافتوں کا سکھ کبھی نہیں اٹھایا۔ شاید میں ناجائز طرز عمل کا نتیجہ تھا، اس لیے یا پھر میں اس دنیا میں بغیر کسی چاہ کے آ گیا تھا اس لیے۔۔

کچھ تو تھا جو میرے اندر کے اضطراب کو وحشت کا روپ دیتا رہا، زمانے سے میری عداوت کو مہمیز کرتا رہا۔

کچھ تو تھا ایسا جس نے مجھے خیر و شر کی کشمکش میں ہمیشہ رکھا۔

شہزادی کے بعد اب تو میں بھی چاچا بشیر کی ملکیت تھا اور چاچا بشیر اپنی ملکیت کے ساتھ کیا کیا سلوک کر سکتا تھا، یہ اب آپ کو سمجھانے کی ضرورت نہیں۔

میں اور شہزادی، ہم دونوں ماں بیٹا اور چاچا بشیر..... ایک نفسانی خواہش کا مارا ہوا انسان..... جنسی حیوان.....

میرے ذہن میں جب بھی وہ مناظر گڈمڈ ہوتے ہیں تو وحشت مجھے اس دوراہے پر لے آتی ہے جہاں صرف وصرف شر ہوتا ہے۔

چاچا بشیر نے شہزادی سے لڑ جھگڑ کر مجھے ہوٹل پر رکھوا دیا۔ شہزادی نہیں چاہتی تھی کہ میں اس سے دور رہوں یا کہیں بھی جاؤں۔

لیکن میری طرح وہ بھی اب اس کے حکم کی غلام تھی اس لیے بک جھک کے بعد میں ہوٹل پر آ گیا۔

ایک طرف سے میں یہاں آ کر خوش بھی تھا کم از کم اب شہزادی کی آہیں اور سسکیاں میرے کانوں میں نہیں پڑتی تھیں اور نہ ہی چاچا بشیر کی متلاشی نظروں سے مجھے چھپنا پڑتا تھا۔

لیکن دن میں کام اور رات کو خدمت " تو مجھے کرنا ہی پڑتی تھی۔ کبھی کندھے دباتا تھا کبھی ٹانگیں، کبھی سر تو کبھی.....

اور وقت تیزی سے گزرنے لگا، میں تیزی سے بڑا ہونے لگا۔ میں دس سال کا بہت بڑا آدمی بن گیا تھا۔

دنیا کی کون سی برائی تھی جس کو میں نے اپنی آنکھوں سے ہوتے نہیں دیکھا۔ میرے اردگرد جوا، شراب، چرس انسان کو ہر طرح کی لذت سے ہمکنار کرنے والے سارے تماشے ہوتے تھے۔ بشیر چاچا کا بیٹھک والا دوست کوئی اچھا آدمی نہیں تھا، اس کے ہوٹل پر ہر قماش کا آدمی آتا تھا اور دو سب کو بھرپور کمپنی دیتا تھا اور ان سے فائدہ اٹھاتا تھا۔ ان کی کمزوریوں کو کیش کرتا تھا۔ میں بچہ نما آدمی بھی اس کے کام کا تھا اور اب تو خیر اس کے اعتماد کا آدمی بھی بنتا جا رہا تھا۔

عمر نے تو خیر اپنے وقت پر ہی بڑھنا تھا لیکن قد اور شعور کو اس ماحول میں وقت سے پہلے بڑے ہونے سے کوئی نہیں روک سکا۔

شہزادی دوبارہ ماں بن گئی، درحقیقت تو وہ پہلی بار ماں بنی تھی، سب نے اس بار اس کی خدمت بھی کی، خیال بھی رکھا۔ چاچا بھی خوش تھا کیونکہ وہ بیٹے کا باپ بن گیا تھا۔

میں بھی اس کے بیٹے سے ملنے، گیا، شہزادی نے مجھے گلے لگا کر بہت پیار کیا، شاید اس بار میں بہت دنوں بعد گیا تھا یا پھر اس کی سوئی ممتا جاگ گئی تھی۔ میں نے بغور اس نئے وجود کو دیکھا۔

تب وہ مسکرا کر بولی تھی۔

"تو بھی ایسا ہی تھا، ایسا لگتا ہے کل کی بات،..... دیکھ کتنا بڑا ہو گیا ہے تو کہ میرے ہاتھوں سے

نکل گیا۔۔تو خوش تو ہے نا، کوئی تنگی تو نہیں دیتا وہ ہوٹل والا۔" وہ فطری فکر کے ساتھ بولی۔۔

"وہ مجھے کیا تنگی دے گا باجی! خود ہی تنگ رہتا ہے۔"

میں نے شہزادی کے ہاتھ پر کچھ پیسے رکھے، اس سے پہلے جو مجھے ہوٹل سے ملتے تھے، وہ سیدھے چاچا بشیر کے ہاتھ پر چلے جاتے تھے۔ یہ میں نے اپنی "کمائی" شہزادی کے لیے بچا رکھی تھی۔

وہ آنکھوں میں آنسو لیے مجھے دیکھنے لگی۔

"تو رکھ لے..... کسی کے ساتھ جا کر کپڑے لے آنا، کیا پہنا ہوا ہے تو نے۔۔"

میرے کپڑوں پر بہت سارے داغ تھے۔ سالن کے، چائے کے اور چکنائی کے۔ میں اس کی بات پر اثبات میں سر ہلا کر اٹھ آیا۔

یہ پہلی بار ہوا تھا کہ میں شہزادی سے رخصت ہوتے ہوئے رو رہا تھا، میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا تھا اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں شہزادی کو بتائے بغیر کسی کا قتل کرنے جا رہا ہوں۔۔

ہاں ایک بات بتاؤں، میں پہلی بار دس سال کی عمر میں ہی دو بندوں کے قتل کا آنکھوں دیکھا گواہ بھی بنا۔

یہ قتل اسی ہوٹل پر ہوا اور عجیب و غریب قتل تھا۔ قاتل اپنی گاڑی میں آئے، صحن میں بیٹھے دو بندوں پر گولیاں برسا کر گاڑی بڑھا لے گئے۔ وہ لوگ جس طرح کی گاڑی میں آئے تھے میں نے پہلی مرتبہ دیکھی تھی، پولیس آئی، ہوٹل کے سارے بندوں کو پوچھ گچھ کے لیے لے گئی۔ مجھے بھی جانا پڑا، میری تو نظروں کے سامنے کی بات تھی، میں نے جو دیکھا وہ بتا دیا۔

پولیس والوں نے مجھے بٹھا لیا، سب کو چھوڑ دیا۔ حتیٰ کہ مالک کو بھی۔

انہوں نے پھر مجھے نئے سرے سے پوری کہانی دہرانے کو کہا جو میں نے دیکھا تھا۔

میں بولتا گیا وہ لکھتے گئے پھر پتا نہیں کسی کے من میں کیا آئی۔

ایک نے کہا۔ ''یہ قتل تو نے کیا ہے۔''

دوسرے نے کہا۔ ''دیکھ تو سچ نہیں بولے گا تو ہم تجھے بند کر دیں گے۔''

میں ایک دم سے رو پڑا۔ پولیس والے نے کھینچ کر مجھے تھپڑ مارا۔

''جھوٹ بولتا ہے بکواس کرتا ہے تیری شکل پر لکھا ہے تو کسی قاتل کی اولاد ہے۔''

پتا نہیں ان کو کیا ہوا تھا، میرے رونے میں اور شدت آ گئی۔ میری تو شکل پر لکھا تھا میں کسی قاتل کی اولاد ہوں، مجھے تو یہ بھی نہیں پتا تھا میں کس کی اولاد ہوں۔

میں ان سے معافیاں مانگتا رہا، انھوں نے مجھے حوالات میں بند کر دیا۔ وہ رات بھی بڑی بھاری رات تھی۔

اندھیری کال کوٹھڑی میں، میں کانپتا رہا، ٹھٹھرتا رہا، رات کے کسی پہر ایک پولیس والا آیا، اس نے مجھے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا۔

پھر اس کے بعد دوسرا پھر تیسرا اور یوں صبح ہو گئی۔

صبح کا اجالا پھیلتے ہی پولیس والوں نے مجھے چھوڑ دیا۔

''چل بھاگ یہاں سے۔ خبردار جو منہ سے ایک لفظ بھی نکالا، ورنہ.....''

اس کی خوفناک سرخ آنکھیں مجھے کسی قاتل کی آنکھیں لگ رہی تھیں، میں وہاں سے سرپٹ بھاگا تھا۔

تھانہ میرے ہوٹل سے زیادہ دور تو نہیں تھا، مجھے تو حیرت بھی ہوئی تھی کہ اچانک ہی میری بے گناہی کیسے ثابت ہو گئی۔ خیر میں اس جہنم سے نکل آیا بھاری رات گزارنے کے بعد میرے لیے یہی کافی تھا۔

اب آپ سوچیں جو گیارہ سال کی عمر میں حوالات میں ایک بدترین رات گزار آیا ہو، کیا اس کے بعد وہ کسی قید سے خوفزدہ ہو سکتا ہے۔

لیکن اس ایک رات کے بعد میری قدر و قیمت میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ میں ہوٹل کے مالک کے لیے قابل اعتبار آدمی تھا وہ مجھ سے کچھ ذاتی کام بھی کروایا کرتا تھا۔ اس کے نشے کی پڑیاں میں با آسانی ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیا کرتا تھا۔ اب تو چونکہ میں حوالات کی سیر کر آیا تھا اس لیے پکڑے جانے کا خوف بھی ختم ہوا۔

اور جب اس حمام میں سب ننگے ہی تھے تو سب کو اپنی عزتیں بھی پیاری تھیں، تب مجھے اندازہ ہوا کہ یار محمد اتنی آسانی سے وہاں یہ سب کیسے کرتا ہے۔

میری زندگی کا ہر گزرتا دن میرے تجربوں میں اضافہ کر رہا تھا۔

ان دنوں شدید بارش نے سیلاب کا رخ ہمارے علاقے کی طرف کر دیا۔ ہماری کچی بستی تو تنکے کی طرح بکھر کر رہ گئی۔ کچی جھونپڑیوں کے تو نشان مٹ گئے تھے اور پکے ڈیرے بھی سیلابی ریلے کی زد میں آ کر بہتے چلے گئے۔

شہزادی، چاچا بشیر اور قبیلے کے باقی لوگوں نے بڑی مشکلوں سے اپنی جان بچائی اسی دوران میں نے سنا کہ حکومت کی طرف سے کوئی مدد آئی ہے اور انہی لوگوں نے سب کو وہاں سے کسی محفوظ جگہ پر منتقل کیا ہے۔

میں چونکہ دوسرے گاؤں میں تھا اس لیے سیلاب تو اس طرف نہیں آیا تھا، البتہ یار محمد کا دھندہ طوفانی بارش کے باعث کم ضرور ہو گیا تھا۔ ٹرک ڈرائیور اس کے خاص گاہک تھے۔ سیلاب سے سڑکیں بھی ٹوٹ گئی تھیں، اس لیے سامان سے بھرے ٹرک آنا بھی کم ہو گئے تھے۔ چاچا بشیر ہوٹل پر آیا تو میں اس کے ساتھ ہو گیا۔

''مجھے باجی کے پاس لے چل''

''کیا کرے گا۔ وہاں رہنے کھانے کو کچھ نہیں۔ دن بھر انتظار کرتے ہیں تب شام کو مدد آتی ہے یا خیرات۔ سکھ سے رہ رہا ہے رہتا رہ'' وہ خاصا بے زار اور پریشان لگ رہا تھا۔

''سوچ رہا ہوں یار محمد! اب کی شہر کی طرف نکل جاؤں، شہزادی کو بھی لے جاؤں، کوئی حال نہیں۔ سال بھر محنت کر کے چھت پکی کی تھی اور دیکھ پھر سے سڑک پر آ گئے۔''

وہ اس کو بتا رہا تھا اور میں سامنے ہی بیٹھا تھا۔ آدمی تو بن گیا تھا، مگر دل تو بچے کا تھا نا۔ میری آنکھیں یکدم برسنے لگیں۔

''چاچا تو مجھے چھوڑ جائے گا، باجی کو اتنی دور لے جائے گا۔'' میں دھاڑیں مار کر رونا چاہتا تھا مگر یار محمد نے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔

''کیوں تجھے کیا تنگی ہے یہاں پر، عیاشی کر رہا ہے۔'' وہ اپنے درشت انداز میں بولا تو میں سہم کر چپ ہو گیا۔

''تنگی تو مجھے واقعی کوئی نہیں تھی، دن بھر کام کرتا تھا، رات کو خدمت معاوضہ بھی ملتا تھا، کھانا پینا بھی۔ اب تو کبھی کبھی حوالات سے بھی بلاوا آ جاتا تھا اور یار محمد مجھے بھیج دیتا۔ میں بھی اسے اپنا" کام" سمجھ کر چلا جاتا۔

بدلے میں وہ لوگ یار محمد کے سارے کام آسان کر دیتے۔

تنگی تو تھی، بس اتنی کہ مجھے اب شہزادی کی یاد آتی تھی، میں اب اس کی آغوش میں چھپنا چاہتا تھا۔ اس کے اندر گھس کر رونا چاہتا تھا، بالکل اسی طرح لاڈ اٹھوانا چاہتا تھا جس طرح وہ پپو کے اٹھاتی تھی لیکن شاید چاچا بشیر نے اسے منع کر دیا تھا یا پھر وہ خود ہی مجھ سے خوف زدہ ہو گئی تھی لیکن وہ بارہ سال کے اپنے بیٹے کو اب پاس بٹھاتے ہوئے بھی کتراتی تھی۔

وہ اب مجھے اس طرح بھینچ کر گلے نہیں لگاتی تھی جس طرح وہ پپو کو چمٹاتی تھی۔ میں اب اس کی مخصوص باس کو ترس کر گیا تھا اور چاچا بشیر کہہ رہا تھا، وہ اسے لے جائے گا۔

میرا دل کسی طور نہیں بہل رہا تھا میں نے تھوڑی اور ضد کی تو چاچا نے یار محمد سے پوچھا۔

بھیج دے ایک دو دن کے لیے اچھا ہے اس کی صورت دیکھ کر دفتر والوں کو بھی رحم آئے گا۔ اس کا اتنا ہی کہنا تھا میں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے پتا تھا اب یار محمد انکار نہیں کر سکے گا میں نے پہلی بار خوشی خوشی کپڑے تبدیل کیے منہ ہاتھ رگڑ رگڑ کر دھوئے بالوں میں تیل لگا کر انہیں خوب محنت سے جمایا۔

آج میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں جلدی سے شہزادی کے پاس پہنچ جاؤں۔ میں نے اپنی کمائی نیفے میں اڑسی۔

یہ وہ میری محنت کی کمائی تھی جو میں صرف شہزادی کو دینا چاہتا تھا۔ مجھے پتا تھا آج کل وہ مشکل سے دو چار ہو گی، ایک تو سیلاب اور پھر سے دربدری کا عذاب۔ اب پتہ نہیں ہم خانہ بدوشوں کی اگلی منزل کون سا دیس تھا۔

وقت کے تھپیڑے ہمیں کس طرف لے جا رہے تھے، ہم میں سے کوئی نہیں جانتا تھا، اسی لیے میں نے چاچا بشیر سے ضد شروع کر دی تھی کہ میں بھی شہر چلوں گا۔ اب اس ہوٹل پر کسی صورت نہیں رکوں گا۔ میری ضد پر وہ مسکرا دیا تھا۔

''شہر تو تجھے لے جانا پڑے گا۔ آخر ہم دونوں کام کریں تو گزارا ہو گا۔'' اور میرے لیے یہی کافی تھا کہ میں اب شہزادی کے ساتھ رہ سکتا تھا۔ میرے اندر اس کی محبت کب بے دار ہوئی، کیسے بے دار ہوئی، مجھے اس کی بات بات پر یاد کیوں آنے لگی، یہ ساری باتیں میری سمجھ سے بالاتر تھیں۔ میں تو ایس اتنا جانتا تھا کہ رات کے کسی تنہا پہر جب کسی ڈراؤنے خواب کی وجہ سے جاگ کر اپنی آنکھیں کھول کر اطراف میں کسی سہارے کو تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو مجھے صرف شہزادی ہی نظر آتی ہے۔

اس کی آنکھیں، اس کا چہرہ، اس کی خوبصورت ہنسی اور اس کے وجود کی گرمی کبھی مجھے رونے پر مجبور کرتی ہے تو کبھی ہنسنے پر۔

ممتا کی تڑپ مجھے اپنی طرف بلانے لگتی ہے اور میری بدنصیبی یہ ہے کہ وہ مجھے پیار تو کرنا چاہتی

ہے لیکن ڈرتی ہے۔شاید وہ میری تخلیق کا درد اور اس کے نتیجے میں ملنے والے طعنے کبھی نہیں بھلا سکتی۔یا پھر وہ بھی اب مجھے آدمی سمجھنے لگی ہے۔اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اپنے بچے کو آدمیوں کے جنگل میں تنہا نہ چھوڑتی۔

میں آج بھی اسے یاد کرتا ہوں تو میرے دل سے اس کے لیے دعا نہیں نکلتی۔بس شکوے ہوتے ہیں جو میں خود سے بھی کرتا ہوں اور اس سے بھی۔

وہ کہیں اگر زندہ ہوئی تو میرا پیغام ضرور اس تک پہنچے گا اور اگر وہ مجھے مل گئی تو میں ضرور اس سے پوچھوں گا۔

کیا تجھے احساس ہے کہ تیرے لمحے بھر کے گناہ نے میری تمام عمر کو رسوائیوں کے موسم خزاں سے باہر نہیں نکلنے دیا۔کیا تو اس رسوائی کو کسی ہنر کے حوالے نہیں کر سکتی تھی۔تجھے اپنی پامالی کے دکھ نے خودکشی پر مجبور نہیں کیا تو مجھے ہی کسی تندور میں ڈال دیتی۔

اس عمر بھر کی تشنگی کا تو کوئی انت نہیں۔کوئی انت نہیں..... باجی۔۔میں اپنی تاریک راتوں کا احتساب کر کے آج پھر رو رہا تھا۔

❁ ❁

ناول خواب خواہش اور زندگی ابھی جاری ہے۔مزید واقعات اگلے صفحات میں پڑھیں۔

قسط نمبر 9

''منیر کمال صاحب! آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔'' ناصر ہمدانی نے اندر آتے ہی بڑے اطمینان بھرے لہجے میں کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ اس دوران اس کی نظر شمائلہ پر بھی پڑی تھی جو سر تک چادر تانے نڈھال سی پڑی تھی۔

''کیا آپ کی بیگم کی طبیعت خراب ہے۔'' اس نے ہمدردی سے پوچھا۔

''جی دراصل ڈپریشن کی مریضہ ہیں۔ ڈاکٹرز کی رائے کے بعد ہی ہم یہاں ذرا چینج کے لیے آئے ہیں۔'' حد سے زیادہ انکساری والا انداز تھا۔

منیر کمال کے دماغ پر اس کا پہلا پیام اب تک ہتھوڑے کی طرح برس رہا تھا حالانکہ وہ بہت ریلکس نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''دراصل آپ پر اپنی بیوی کو حبس بے جا میں رکھنے اور تشدد کرنے کا الزام ہے اور یہ بھی امکان ظاہر کیا گیا ہے کہ آپ اپنی بیوی کو جسمانی اور ذہنی تشدد کا نشانہ بنانے کے بعد اسے اکیلا چھوڑ دیتے ہیں تاکہ وہ خود کو مزید اذیت پہنچائے۔''

ناصر ہمدانی کے لہجے میں بلا کا اطمینان تھا، منیر کمال ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

''کیا یہ میرا ذاتی مسئلہ نہیں ہوسکتا۔''

''جب تک کسی کی جان و مال کی سلامتی کو خطرہ نہ ہو، یہ ذاتی مسئلہ ہی ہوتا ہے لیکن ہمیں کمپلین ملی ہے کہ آپ کے اپنی بیوی کی ساتھ تعلقات خاصے مشکوک ہیں۔''

ناصر ہمدانی کو منیر کمال کی گھبراہٹ مزادے رہی تھی۔ حالانکہ وہ جس کیس کی انویسٹی گیشن کرنے اس ہوٹل میں آیا تھا وہ تو کسی دوسری جگہ منتقل ہو چکا تھا لیکن اس دوران ہوٹل کے مالک خانزادہ سے ملاقات نے اسے یہ نئی کہانی تھما دی تھی۔

خانزاہ سے اس کی پرانی بیٹھک تھی، دونوں پارٹی فیلو بھی تھے، اس لیے محمد خانزاد، ہ ناصر ہمدانی کی اچانک آمد پر کھل سا اٹھا تھا۔

''تمہیں کس قسم کا شک ہے اس پر۔'' ناصر ہمدانی کے ماتھے پر شکنیں نمودار ہو گئیں۔

''ابے شک نہیں، یقین ہے۔ بیوی کی سلو پوائزننگ کر رہا ہے، دولت جائیداد کا چکر ہوگا۔ تجھے تو پتا ہے ان امیر عورتوں کا سب سے بڑا مسئلہ ان کی جائیداد ہوتی ہے اور یہ چغد قسم کے مرد آخری عمر میں ان کو زہر دے کر اپنا الو سیدھا کرتے ہیں۔'' محمد خانزادہ نے تلخی کی حد تک سچ بولا اور جیسے یہ سب کچھ اس کے ساتھ بیت چکا ہو۔

''ہوں۔ تو یہ بات ہے پھر میں وزٹ کر لیتا ہوں اس روم کا۔ فی الحال تو میرا انٹروڈکشن ہی کافی ہوگا۔ پھر تم نظر رکھنا، ایسا نہ ہو کہ میرے وزٹ کے بعد وہ بوریا بستر باندھ کر غائب ہونے کی سوچیں۔''

اور اب ناصر ہمدانی منیر کمال کے سامنے کھڑا سوچ رہا تھا کہ یہ تو اس کے ہوتے ہوئے غائب ہونے کی سوچ رہا ہے لیکن نہ جانے کیوں اسے یہ صورت اور نام شناسا سے لگ رہے تھے۔

وہ اسے اس باتوں میں الجھا رہا تھا اور شائلہ کے چہرے سے مکمل چادر ہٹنے کا منتظر۔

''کیا میں مسز شائلہ سے مل سکتا ہوں، بات کرنا چاہتا ہوں میں ان سے۔'' لہجے میں خود بخود سختی آ گئی تھی۔

''آپ بالکل ان سے بات کر سکتے ہیں لیکن اس وقت وہ گہری نیند میں ہیں، میڈیسن لی ہوئی ہیں۔ ڈاکٹرز بھی یہی کہتے ہیں انہیں مکمل آرام کرنے دیا جائے۔'' اس کے لہجے سے بلا کی محبت ٹپک رہی تھی۔

''ہاں تا کہ وہ اسی نیند نیند میں پوری ہو جائے اور تمہارے وارے نیارے ہو جائیں۔''

ناصر ہمدانی سوچے بنا نہ رہ سکا۔

''واہ رے حضرت انسان تیری لالچ کی بھی کوئی حد ہے۔'' اسے محمد خانزادہ کی سنائی ہوئی کہانی پر بہت حد تک یقین آتا جا رہا تھا لیکن جس شعبے سے اس کا تعلق تھا، وہاں سارا کھیل ثبوتوں پر ہوتا ہے اور اس وقت اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا، سوائے اس کے کہ چھٹی حس منیر کمال اور شمائلہ کمال کے نام پر پھڑکنا شروع ہو گئی تھی۔

''اینی وے، مجھے بیگم صاحبہ سے ضروری بات ڈسکس کرنی ہے۔ میں پھر آؤں گا۔ آپ لوگ کب تک ہیں یہاں پر۔'' وہ خود کو اتنا مصروف اور ذمہ دار ظاہر کر رہا تھا کہ منیر کمال کو اب اس کے اطمینان پر غصہ آنے لگا تھا۔

اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اسے دھکا دے کر باہر نکال دیتا مگر یہ اب ممکن نہیں تھا، اس کا اسپیشل کرائم برانچ سے ہونا ہی کافی تھا۔

وہ بے چینی سے انگلیاں مسلنے لگا۔ ناصر ہمدانی نے بغور اس کا جائزہ لیا اور دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔

''امید ہے ہوٹل انتظامیہ کو اب آپ دونوں سے کوئی شکایت نہیں ہوگی'' وہ وارننگ دینے والے انداز میں کہتے ہوئے دروازے سے باہر نکل گیا۔

اس کے باہر نکلتے ہی شمائلہ نے اپنے چہرے سے چادر ہٹا دی۔ رکا ہوا سانس بحال کر کے وہ اٹھ بیٹھی اور ساری گھٹن قہقہے کی صورت میں باہر نکال دی۔

اس کا وحشیانہ قہقہہ دروازے کی درزوں سے باہر بھی نکلا تھا۔ ناصر ہمدانی کی رگ پھر پھڑکی مگر وہ اب کچھ سوالوں کے جواب لیے بغیر پلٹنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے یقین ہو گیا اس کمرے کے اندر کوئی بہت

بڑا ڈرامہ ہو رہا تھا۔

ادھر شمائلہ، منیر کمال کی گھبراہٹ پر محظوظ ہو رہی تھی۔

''ویسے تو بڑے طرم خان بنتے ہو اور اس کے سامنے کیسے ہاتھ باندھ کر کھڑے تھے۔''

وہ اسے ذلیل کرنے کا کوئی موقع کب ہاتھ سے جانے دینا چاہتی تھی۔

''تو کیا کرتا اسے دھکے دے کر باہر نکال دیتا۔ تجھے منع کرتا ہوں موبلائزنگ ذرا کم کر دے مگر نہیں۔ کبھی تمہیں بیٹے کی یاد تڑپا رہی ہوتی ہے اور کبھی اس کے باپ کی۔ بس ختم کرو اب یہ ڈرامے اور واپس چلو۔ آج کل کے حالات تم جانتی ہو اور اب ناصر ہمدانی، کتے کا..... کام کی ایک بات نہیں کی۔ ادھر ادھر کی ہانک کر چلا گیا، سب جانتا ہوں ان کی چالاکیاں۔ خاص تربیت ہوتی ہے ان کی اداکاری کی۔''

وہ چہرے کے خدوخال بگاڑ بگاڑ کر بات کر رہا تھا۔ اس کی ساری باتوں میں سے شمائلہ کو صرف ایک بات یاد رہ گئی تھی، اس نے تڑپ کر فون اٹھایا، عاشر کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف اس نے نمبر دیکھ کر بزی کر دیا تھا، شاید اس لیے اب مستقل بزی ٹون آ رہی تھی۔

شمائلہ نے جھنجلا کر موبائل بیڈ پر پٹخا اور اگلی جست میں آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

آئینہ جو عورت کو اپنے محبوب کی طرح عزیز ہوتا ہے، وہ اسے سب سے زیادہ قابل نفرت لگ رہا تھا، کیونکہ وہ اس میں خود کو ٹوٹا بکھرا تھا اور شکستہ دیکھ رہی تھی اور اسے یہ سچ بالکل ہضم نہیں ہو رہا تھا۔

اس نے جلدی سے چہرے پر کلینزنگ ملک لگا کر ٹشو سے صاف کرنا شروع کر دیا، وہ سیاہی مٹانا چاہتی تھی مگر نہیں جانتی تھی یہ روح کی تاریکی ہے جو ثبت ہو جائے تو پھر دفن ہوتی ہے، مٹتی نہیں۔

''کہاں کی تیاری ہے، میں تمہیں بار بار منع کر رہا ہوں۔ اپنے لیے، میرے لیے مشکل مت کھڑی کرو مگر تمہاری سمجھ میں نہیں آتا۔ کام دھندے سے تم بھاگ رہی ہو، پارٹیز تم نے چھوڑ دیں۔ سوچو

تمہارا انجام بہت برا ہونیوالا ہے، بہت برا۔"

وہ اس کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا۔

"کام دھندے کی اب تم فکر کرو، بہت کما کر کھلایا ہے، اب میرا خرچ کرنے کا وقت آیا ہے۔" وہ خوب رگڑ رگڑ کر کلینزنگ ملک صاف کر رہی تھی۔

"تم خرچ کرو۔ ضرور کرو مگر وہ سب مت کرو جو ہمیں جیل کی ہوا کھانے پر مجبور کر دے۔"

"ان سب کی فکر تم کرو، جیل کی ہوا تم کھاؤ گے میں کیوں۔ تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ میں نے تمہارے کالے دھندے میں تمہارا ہاتھ بٹایا۔"

"تم نے ہاتھ نہیں بٹایا تو کیا فرشتے آئے تھے لڑکیاں گھیرنے۔ یاد ہے اپنے پہلے شو کے لیے تم چودہ لڑکیاں لے کر گئی تھیں۔ ان میں سے ایک بھی واپس نہیں آئی تھی۔" وہ اس کی یادداشت کنگھالنے لگا۔

"یہ لڑکیاں تو مجھے تم سپلائی کرتے تھے نا، مجھے اس سے کیا غرض کوئی اس کے بعد کہاں جانا چاہتا ہے۔ یہ تو تیرا کام تھا نا۔"

وہ اسی کے لہجے میں ڈھٹائی سے بولی اور بالوں میں برش کرنے لگی۔

"ٹھیک ہے، وہ میرا کام تھا نا، اب تجھے اس کمرے سے میری اجازت کے بغیر ایک قدم بھی باہر نہیں رکھنا ہوگا۔ یہ بھی میرا کام ہے، اگر تو نے کوئی گڑبڑ کی تو میں تیری ٹانگوں میں گولی مار کر خود بھاگ جاؤں گا۔ جانتی ہے نا جو میں کہتا ہوں وہ کر گزرتا ہوں۔" وہ خونخوار سے لہجے میں بولا تو شمائلہ اندر تک سلگ کر رہ گئی۔

"تیری یہ ہمت۔" اس سے پہلے کہ وہ اس کا گریبان پکڑتی، منیر کمال نے اسے دھکا دے کر بستر پر گرایا اور خود باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔

سچ ہے انسان بلندی سے گر کر اتنا ریزہ ریزہ نہیں ہوتا جتنا وہ ذلت کی پستی میں گرنے سے ہوتا ہے۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا آج اس شخص کے لیے اس کے دل میں نفرت ہی نفرت ہے، وہ کل اس کا دوسرا مجازی خدا کیسے بن بیٹھا تھا۔

☆.....☆.....☆

''عاشر اس رات کیا ہوا تھا۔'' کاشف نے اس کے ہاتھ سے فون لے کر سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور اس کے دونوں تھام کر اپنے سامنے بٹھا لیا۔ کشمالہ دونوں کو ڈھونڈتے ہوئے گیسٹ روم میں آئی تو عاشر کے چہرے پر پھیلے سناٹے کو دیکھ کر وہیں تھم گئی۔

''کیا ہوا کاشف..... عاشر کیوں اتنے پریشان ہیں، خولہ کا فون تو نہیں آیا ہاسپٹل سے۔''

اس کی سوئی ایک ہی جگہ پر اٹکی تھی، وہ اپنی محبت اور پریشانی کے عالم میں ایک بار پھر عاشر کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ گئی تھی۔ وہ اسے جلتی نظروں سے دیکھنے لگا۔

''نہ اپنے آپ کو اوجھل ہونے دیتی ہے اور نہ ان سے غافل ہونے دیتی ہے۔ پتا نہیں کون سی طاقت ہے جو مجھے اس کی جانب کھلنے والے راستوں پر لے کر جانا چاہتی ہے۔''

''عاشر! آپ کیوں اتنے اپ سیٹ ہیں، آپ کو بخار تو نہیں۔'' اس نے بے ساختہ اپنا ہاتھ عاشر کی کلائی پر رکھا۔ پتا نہیں کون جل رہا تھا کیونکہ حدت دونوں جانب برابر کی تھی۔ عاشر سے پہلے اس نے ہاتھ کھینچ لیا اور روم ریفریجریٹر کی طرف بڑھ گئی۔

جوس کے گلاس کاشف اور عاشر کے سامنے رکھ کر وہ خود بھی دونوں کے سامنے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

عاشر کے اندر کا سکوت اس وقت اس کی آنکھوں اور چہرے پر ٹھہرا ہوا تھا۔ اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں طوفان سمیٹے وہ کبھی کاشف کو دیکھتا تو کبھی کشمالہ کو جو اس کی دلجوئی کی خاطر اتنے مستعد بیٹھے تھے کہ اسے اپنی کیفیت پر غصہ آنے لگا۔

اس سے غلطی یہ ہوئی تھی کہ شمائلہ کمال کا فون بند کر کے وہ خود سے مخاطب ہوا تھا۔ ''آپ مجھے

نہیں بھول سکتیں اور میں وہ رات نہیں بھول سکتا۔ میری زندگی کی بھیانک رات۔"

کاشف کو اس کی بات نے چونکا دیا تھا، کوئی تو گرہ تھی جو کھلنے کے قریب تھی۔ کوئی تو تکلیف دہ احساس تھا جو لفظوں کا روپ دھارنے کو تھا، تب کاشف نے کسی ماہر نفسیات کی طرح اس کا کتھارسس شروع کر دیا تھا۔

"عاشی! تجھے پتہ ہے نا اپنے آپ کو محض اس ڈر سے کہ لوگ کیا کہیں گے، خول میں بند کر دینا نہ اپنی ذات کے ساتھ انصاف ہے اور نہ اس زندگی کے ساتھ جو بڑے مختصر وقت کے لیے ہمیں ملی۔"

"مجھے نہیں پتا اپنی ذات کے ساتھ انصاف کیا ہوتا ہے، مجھے تو بس اتنا پتہ ہے کہ بعض رشتے اتنے تکلیف دہ ہوتے ہیں کہ انھیں برتتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ آپ ہر لمحے کسی آزمائش کے دوراہے پر کھڑے ہیں۔"

"مگر آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں نانو، بابا اور ہم سب..... کیا ہمارے خلوص اور محبت میں اتنا بھی اثر نہیں تھا کہ آپ کسی تلخ رشتے کو بھلا سکتے۔"

اس سے پہلے کاشف کچھ کہتا، کشمالہ بول پڑی۔

"کیا ماں جیسے رشتے کو زندگی سے کھرچ کر پھینکا جا سکتا ہے۔" وہ براہ راست اسی سے پوچھ بیٹھا، کچھ جتانے والے انداز میں۔

"ہاں، جب باپ کے سارے ستم بھلا کر ایک روحانی رشتے کو دل میں سب سے اونچا درجہ دیا جا سکتا ہے تو پھر ماں کی تکلیف دہ یادوں سے بھی باہر نکلا جا سکتا ہے۔"

وہ ہٹ دھرمی سے بولی تو عاشر کے چہرے پر استہزائیہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"آپ ٹھیک کہتی ہیں، آپ کو متبادل مل گیا، مجھے بھی ملتا تو شاید....." اس نے ایک گہری سانس لی اور جوس کا گلاس اٹھا لیا۔

اس کا انداز ایسا تھا جیسے طویل تھکن زدہ سفر کے بعد ستانے بیٹھا ہو۔۔

تیرے اندر جتنا غبار ہے اسے باہر نکال دے، اپنے ساتھ کوئی زبردستی مت کر۔

میرے اندر ایسا کچھ نہیں ہے کاشف جو تم لوگ سننا چاہتے ہو۔ وہ زچ سا ہو کر بولا۔

ہم لوگ عاشر کو سننا چاہتے ہیں۔ ہمیں اچھا لگتا ہے جب وہ بولتا ہے، اپنے دل کی کہتا ہے اور ہمارے دل کی سنتا ہے۔

کشمالہ کا لہجہ مدہم ہو چلا تھا مگر کاشف کو اس کی بات بہت اچھی لگی تھی، اسے ان کے درمیان لطیف جذبوں کی زنجیر مضبوط ہونے کے خیال سے خوشی ہو رہی تھی۔ حالانکہ یہ ساری یک طرفہ کوششیں تھیں۔

اس وقت میرے دل کی کسی نے نہیں سنی کی۔ میں روتا ہوا پیچھے تک گیا تھا، بہت دور تک ساتھ، مگر میری کسی نے نہیں سنی۔ اس کے اندر سے لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکلے تھے۔

ہو سکتا ہے تمہاری ضد ناجائز ہو۔ کاشف نے نرمی سے کہا۔

ایک بیٹے کی ماں کو روکنے کی ضد کیسے ناجائز ہو سکتی ہے۔ وہ تڑپ کر بولا۔

ماں اس وقت رک جاتی تو..... کشمالہ نے اس کی مشکل آسان کی۔

ہاں اگر ماں رک جاتی تو تب بھی کچھ اچھا نہ ہوتا پھر شاید کوئی بھی زندہ نہ ہوتا۔ اس کی سرخ آنکھیں پاسٹ میں ڈوبتی جا رہی تھیں اور اس کے لاشعور کی دیواروں سے ٹکرانے والی وہ طوفانی رات شعور کے پردے پر آ کر واضح ہونا شروع ہو گئی تھی۔

وہ نہیں جانتا کہ اس سے پہلے کیا ہوا تھا مگر وہ اتنا جانتا تھا کہ کار پورچ میں گاڑی رکنے کی آواز پر وہ حسب عادت بھاگتا ہوا آیا تھا۔

اس نے سوچا تھا مما ہوں گی اور آج وہ جلدی آ گئی ہیں تو انہیں اپنا ہوم ورک دکھائے گا جس میں

بہت سارے سٹارز ملے ہوئے ہیں مگر وہ گاڑی مما کی نہیں، بابا کی تھی۔ انہوں نے حسب عادت اسے گود میں اٹھا کر اسے ساتھ چمٹا لیا تھا اور پھر بھرپور پیار کرتے ہوئے گود میں اٹھائے اٹھائے اندر آ گئے تھے۔

میرا شہزادہ ابھی تک سویا نہیں۔

میں تو آپ کا ویٹ کر رہا تھا۔ اس نے جلدی سے بیان بدل دیا مبادا باپ کے ساتھ زیادتی نہ ہو جائے۔

اچھا جی..... میرا انتظار کر رہے تھے آپ۔ بہت ڈرامے آ گئے ہیں آپ کو۔ مما آ گئی ہیں آپ کی۔"

مما تو نہیں آئیں۔ نینی کہہ رہی تھیں کہ وہ دیر سے آئیں گی۔" اس نے وضاحت کی۔

مگر مجھے تو کہا تھا کہ میں تھوڑی دیر میں گھر پہنچنے والی ہوں، راستے میں ہوں اور اب تو مجھے بھی آفس سے نکلے ہوئے دو گھنٹے ہو چکے ہیں۔" انہوں نے جیسے خود کلامی کی۔ عاشر ان کی بات پر کندھے اچکا کر ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا جہاں کوئی کارٹون فلم چل رہی تھی۔

بیٹے آپ کے کارٹونز میں کوئی کمی آئی یا ہر وقت دیکھ رہے ہوتے ہیں۔"

بابا! یہی تو میرے فرینڈز ہیں۔ میں بھی تو بور ہو جاتا ہوں۔" اس نے ناک سکوڑ کر کہا تو طارق محمود کو قدرت کے اس شاہکار پر بے ساختہ پیار آ گیا۔

وہ اسے اپنے اندر جذب کر کے کتنی ہی دیر تک ساکت و جامد بیٹھے رہے، دونوں کی محبت کا یہ انداز اس دن سے تھا جب عاشر نے پہلا قدم اٹھایا تھا اور گرتے سنبھلتے ان کے سینے میں سما گیا تھا۔

بابا! آپ مما کو ساتھ لے کر آتے نا آج آپ کو کلب نہیں جانا تھا۔ اس نے معصوم سا استفسار کیا۔

بیٹے بابا تو اتنے دنوں سے کلب نہیں جا رہے، کام بھی تو اتنا ہوتا ہے پھر وہ تھک جاتے ہیں اور ان کا دل چاہتا ہے بس گھر آ کر اپنے گڈے کے پاس گھس کر سو جائیں۔"

انہوں نے اسے صوفے پر بٹھا کر ایک لمبی سی انگڑائی لی۔

تو آپ مجھے اپنے ساتھ آفس لے جایا کریں۔ میں آپ کے سارے کام کر دوں گا۔"

بابا کی جان کو کتنی فکر ہے لیکن میری زندگی ابھی تو بابا کام کر سکتے ہیں جب وہ بوڑھے ہو جائیں گے اور آپ بڑے تو پھر سارا کچھ آپ نے ہی تو کرنا ہے۔"

وہ چینل سرچ کرتے ہوئے بولے لیکن شمائلہ کی غلط بیانی کا سوچ سوچ کر ذہن ماف ہی ہو رہا تھا اور ان کا بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا وہ اسے فون کریں۔

صاحب کھانا لگا دوں۔" ساجدہ کافی دیر سے منتظر تھی، ان دونوں کی باتیں مکمل ہوں تو اپنے کام کی بات کرے۔

نہیں ابھی نہیں، بیٹے آپ کا ڈنر ہو گیا۔" وہ جیسے چونک کر بولے۔

جی بابا! اب میں سونے جا رہا ہوں۔ آپ بھی چینج کر لیں۔"

وہ ان کے پاس چلا آیا تھا اپنا پیار لینے اور دینے۔

راجہ طارق محمود نے پیار لینے اور دینے کے بعد اس کو کمرے تک چھوڑا اور اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے بے دھیانی میں ہی بیرونی دروازے سے باہر نکل آئے۔ روش پر آ کر احساس ہوا کہ ہلکی ہلکی پھوار سے ہر چیز بھیگ چکی تھی اور ویسے بھی جاڑے کی راتیں اپنے اندر عجیب سی ہیبت سمیٹے ہوئے ہوتی ہیں۔

وہ ٹھنڈ اور خوف کے ملے جلے احساس کے ساتھ جھرجھری لے کر رہ گئے۔

شمائلہ ابھی تک نہیں آئی تھی ان کی نظریں دروازے پر جمی تھیں، وہ تیز ہوتی بارش سے بچنے کے لیے شیڈ کے نیچے آ گئے۔

شمائلہ! کیوں تم نے اپنی اور میری زندگی کو قابل رحم بنا دیا ہے۔ پلیز لوٹ آؤ، مت اتنی دور جاؤ کہ واپسی کا راستہ بھول جاؤ۔"

وہ کسی غیر مرئی نقطے پر نظریں جمائے خود میں اتنے گم تھے کہ انہیں دروازہ کھلنے اور ایک اجنبی گاڑی کے اندر آنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔

سکوت ٹوٹا تو اس وقت جب شمائلہ کا نقرئی قہقہہ تیز ہوا کے باوجود ماحول کے سناٹے کو منتشر کر گیا۔

وہ منیر کمال کے ساتھ تھی۔ اس کا انداز، اس کی بے تکلفی اس کے چہرے کی شادابیاں چیخ چیخ کر کہہ رہی تھیں کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بھرپور وقت گزار کر آئے ہیں۔

شمائلہ کو گھر کی، گھر والوں کی کوئی فکر نہیں تھی، اگر ایسا ہوتا تو وہ اس وقت اپنی بے باکی کے مظاہروں سے باز رہتی جنہوں نے طارق محمود کا خون کھولا دیا تھا۔

شمائلہ اپنے حواسوں میں ہوتی تو شاید اسے پتا چل جاتا کہ وہ اس وقت اپنے گھر کی روش پر کھڑی ہے اور اس برستے موسم میں اسے کوئی دیکھ بھی رہا ہے۔ ان کا ضبط جواب دے گیا تھا اور پھر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ منیر کمال نے شاید شمائلہ کے گال چھوئے تھے۔

یو..... با..... سٹرڈ..... تم نے اسے چھوا کیسے۔۔" طارق محمود کی دھاڑ جتنی بلند تھی اتنا ہی طاقتور حملہ بھی تھا۔

منیر کمال کبھی بھی نہیں سنبھل سکتا تھا، اگر شمائلہ درمیان میں نہیں آتی۔

''طارق! آپ یہ کیا کر رہے ہیں چھوڑیں انہیں۔" منیر کمال کی گردن راجہ طارق محمود کے مضبوط ہاتھوں میں تھی۔

میں تم دونوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا، اتنی غیرت ہے مجھ میں کہ اپنے ہاتھوں سے تمہیں قتل کر دوں اور اس....." انہوں نے بھرپور نفرت اپنے لفظوں میں سمو دی تھی اور شمائلہ کی چیخ و پکار شروع ہو گئی۔

ہاں میں بھی یہ ہی چاہتی ہوں۔ آپ مجھے قتل کر دیں، میں نہیں رہنا چاہتی اس جہنم میں، یا تو مجھے مار دو یا میری زندگی میں گھسنا چھوڑ دو طارق.....

میں تنگ آ چکی ہوں، تم ایک ذہنی مریض اور بیمار آدمی ہو، تمہارے ساتھ رہنے کا مطلب..... ہے کہ میں پاگل ہو جاؤں، میں تمہاری قید میں نہیں رہ سکتی، طارق۔ وہ چیخنا شروع ہو گئی تھی، اس کا حلیہ

اس کا انداز ایک سڑک پر کھڑی جاہل عورت سے بھی بدتر تھا۔

خود تو وہ سڑک پر کھڑی تھی ہی، تھوڑی دیر میں سب کو سڑک پر لے آئی تھی، آوازیں چیخ و پکار سن کر گھر کے سارے ملازمین باہر نکل آئے تھے۔ ایک کونے میں عاشر بھی کھڑا تھا اپنے دودھ کے گلاس کے ساتھ اور وہ دیکھ رہا تھا اس کی ماں مستقل زہر اگل رہی ہے۔

منیر کمال کو یہ تماشا دیکھنے میں بہت مزا آ رہا تھا، آمنے سامنے کے ٹیرس بھی تماش بینوں سے آباد ہو گئے تھے۔

عاشر کی خوفزدہ آنکھیں اس وقت کسی کو نظر نہیں آ رہی تھیں، وہ بس ایک دوسرے پر چیخ رہے تھے۔

پلیز طارق میرا پیچھا چھوڑ دو، مجھے اپنی زندگی جینے دو۔" وہ جیسے روتے روتے ہلکان ہو گئی تھی، گھر کے ملازمین کو اس کی مکاری اور اداکاری سے نفرت سی محسوس ہو رہی تھی۔

انہیں حیرت ہو رہی تھی کہ راجہ طارق محمود جیسا طاقتور شخص اس عورت کا گلا کیوں نہیں دبا دیتا۔

میں تمہیں زندگی بھر کے لیے قید میں ڈال دوں گا، لیکن تمہیں ان عیاشیوں کی اجازت نہیں دے سکتا جو تم اس دو ٹکے کی اوقات والے مرد کے ساتھ کرتی پھر رہی ہو۔"

زبان سنبھال کر طارق محمود! مجھے میری اوقات مت دکھاؤ، اپنی اوقات پہچانو، بالشت بھر کی عورت کو نہیں سنبھال سکے، جانتے ہو عورت کب اپنے گھر کو آگ لگانے کا سوچتی ہے، جب اسے اپنا مرد ''نامرد'' لگنے لگے، جاؤ، جا کر اپنا علاج کرواؤ....."

منیر کمال کی ہمت شمائلہ کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر اور بڑھ گئی تھی۔

''علاج میں تم دونوں کے دماغ کا کرواؤں گا، مجھے اپنی مردانگی ثابت کرنے کے لیے تجھ جیسے طوائف زادے کو ہی استعمال کرنا پڑے گا ہے نا۔"

راجہ طارق محمود کے لہجے میں بلا کا اطمینان تھا مگر لفظوں کی وحشت نے منیر کمال کے حواس مختل

کر دیے تھے۔ وہ یکدم ان پر ابل پڑا۔

تو نے مجھے طوائف زادہ بولا، اپنی عورت کو طوائف بنا کر دولت کما رہا ہے اور مجھے آئینہ دکھا رہا ہے، میں جانتا نہیں تیری حرکتیں۔ تجھے اپنا کاروبار چمکانے کے لیے شمائلہ کی ضرورت ہے، میں نے اگر اس کے ساتھ وقت گزار لیا تو تیری غیرت جاگ اٹھی۔"

وہ زہر اگلنا شروع ہو گیا اور راجہ طارق محمود کے سر پر ایک ہی جملہ ہتھوڑے برسا رہا تھا۔

اپنی عورت کو طوائف بنا کر، کاروبار چمکا رہا ہے۔"

"تو کیا شمائلہ لوگوں کی ہمدردیاں سمیٹنے کے لیے یہ کہانیاں سناتی ہے۔" ان کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی۔

شمائلہ کو معاملے کی نزاکت کا احساس ہوا تو وہ پھر سے درمیان میں آئی۔

بس کرو طارق! میرا بہت تماشا بنوا چکے ہو..... ساری دنیا اس وقت ہمیں دیکھ رہی ہے، بس کرو، بند کرو یہ ڈرامہ۔

مجھے پتا ہے تم میری محبت میں نہیں، میری ضد میں آ کر یہ کر رہے ہو۔" دونوں نے ایک دوسرے کو چھوڑ تو دیا تھا مگر اس دوران دونوں کے چہرے اور گردن پر نیل پڑ چکے تھے، ملازمین کے ساتھ آس پاس کے سارے ہی لوگ حیرانی کے عالم میں یہ تماشا دیکھ رہے تھے اور کانوں کو ہاتھ لگا رہے تھے، بارش تھم چکی تھی، مگر پانی اب بھی روش پر جمع تھا۔

شمائلہ کا گولڈن گرین لباس اس کے تن سے چپکا ہوا تھا اور دیکھنے والوں کو وہ اس وقت صرف قابل رحم نظر آ رہی تھی۔

ضد تو میری تم سے اب شروع ہوئی ہے شمائلہ بیگم! آج کے بعد تم اس گھر سے قدم نہیں باہر نکال سکتیں اور تم چاہتے ہو کہ زندہ نظر آتے رہو تو اس علاقے میں قدم نہ رکھنا۔" اتنا سب کچھ ہونے کے بعد

راجہ طارق محمود کے لہجے کا تحمل کم نہیں ہوا تھا۔

تم ایسا نہیں کر سکتے طارق..... میں ابھی اس وقت یہ گھر چھوڑ دوں گی۔ میں کوئی لاوارث اور مسکین لڑکی نہیں ہوں کہ تم مجھے قید میں ڈال دو۔ میں تمہارے ساتھ رہنا ہی نہیں چاہتی، مجھے آزاد کر دو۔"

دو تو جانے کیا کیا سوچے بیٹھی تھی، طارق محمود نے حیرت سے اسے دیکھا اور پھر نفرت کی شدید لہر من سے پیدا ہوئی۔

میں نے عورت کا یہ روپ اگر کبھی پہلے دیکھا ہوتا تو آج تم میری زندگی میں نہ ہوتیں، تم اپنی خواہشوں کے لیے اتنی پستی میں گر سکتی ہو، شمائلہ میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ تم میرے محسنوں کی اولاد نہ ہوتیں تو میں شک میں پڑ جاتا، سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ تم کسی گناہ کی پیداوار ہو، لیکن تمہارا نسب تو بہت اعلا تھا، تم کس پر چلی گئیں۔"

وہ جیسے ہار سے گئے تھے، انہیں اپنی آواز اجنبی سی محسوس ہوئی۔ شمائلہ، منیر کمال کی گاڑی سے لگ کر کھڑی تھی۔ اور منیر کمال ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پھر اس کے پاس چلا آیا۔ وہ اسے خوفزدہ نظروں سے دیکھنے لگی، اسے لگ رہا تھا آج اگر وہ اپنے گھر کے دروازے سے اندر چلی گئی، پھر مر کے بھی وہیں دفن ہو گی۔

جاؤ، اندر جاؤ..... میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گا، اگر تمہارا یہ نام نہاد شوہر تمہیں اجازت دے دیتا ہے تو ٹھیک، ورنہ مجھے دوسرے طریقے بھی آتے ہیں، تم جانتی ہو، اپنا مقام..... تم اس شو کو لیڈ کر رہی ہو، اور آنے والے رتوں میں تم ساری دنیا پر راج کرو گی۔"

وہی خواب، وہی لگاوٹ بھرا انداز..... وہی پیار چھلکاتی نظریں..... اس بار راجہ طارق محمود نے منیر کمال کو کچھ نہیں کہا تھا، بلکہ انہوں نے شمائلہ کا ہاتھ تھام کر اندر کی طرف چلنے کو کہا، مگر وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئی، عاشر بھی سامنے آ گیا۔

بابا! آپ مما کو ماریں گے تو نہیں۔" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا، منیر کمال نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ چھ، سات سال کا بچہ تھا جو پتا نہیں کب اس تماشے کا حصہ بنا تھا، لیکن اس کے جملے نے پھر سے بازی الٹ دی تھی۔

دیکھا طارق! یہ تمہارا خون ہے نا تمہارا نسب۔ اسے بھی پتا ہے تم اس کی ماں پر کتنا ظلم کرتے ہو، اسے بھی پتا ہے تم کتنے ظالم انسان ہو۔"

اس نے درشت لہجے میں کہتے ہوئے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی، تب ہی طارق محمود نے اسے اندر کی طرف دھکیلنا چاہا۔

میں اندر نہیں جاؤں گی، پہلے مجھ سے وعدہ کرو۔ مجھے شو کرنے دو گے۔۔ وہ عجیب تھی، اپنی ہٹ کی پکی اور ہٹ بھی بالک۔

اتنا سب کچھ ہو چکنے کے بعد، طارق محمود کے عزت دار گھر کا تماشہ بن چکنے کے بعد بھی وہ اپنی فکر میں ہلکان تھی۔

نہ اسے اپنے معصوم بیٹے کی آنکھیں نظر آ رہی تھیں اور نہ ہی اپنے ماں ہونے کے رتبے کا احساس ہو رہا تھا۔

نوکروں کو طارق محمود پر ترس آ رہا تھا جو اس عورت کو برداشت کر رہا تھا اور منیر کمال کو یقین ہو چلا تھا اس تماشے کے بعد شمائلہ خود بخود اس کی جھولی میں آن گرے گی۔

اتنی دلتوں کے بعد وہ بھلا کیوں اسے اپنی بیوی بنا کر رکھے گا، مگر عجیب آدمی تھا، پھر اسے اندر کی طرف لیے جا رہا تھا، اس کی شیطانی ذہنیت نے بازی ہاتھ سے نکل جانے کی فکر کرتے ہوئے ایک اور پتھر پھینکا۔

دیکھو طارق..... شمائلہ کا میرے ساتھ کنٹریکٹ طے ہو چکا، اگر اسے کچھ ہوا، اس کو کوئی بھی نقصان پہنچا تو میں تیرے ساتھ وہ کروں گا جو تیری نسلیں یاد رکھیں گی۔"

فی الحال تو میں تیرے ساتھ وہ کرنے والا ہوں جو تیری نسلیں یاد رکھیں گی۔ میں چاہتا ہوں تو آج کی رات سلامت چلا جائے۔ میں اپنے گھر پر تجھ شیطان کا قتل نہیں کرنا چاہتا۔"

ان کے کہنے کی دیر تھی، منیر کمال اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔ اس کی گاڑی میں پچھلی سیٹ کے نیچے ہر وقت اسلحہ رہتا تھا، اس نے اپنا پسٹل نکالا اور ان پر تان دیا، شمائلہ کی آنکھیں پھٹ سی گئیں۔

تو شمائلہ کو چھوڑ دے، جب سب کچھ تجھ پر کھل گیا ہے تو پھر سن، پیار کرتے ہیں ہم ایک دوسرے سے۔ ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی ہیں ہم نے..... تو اسے رکھنا چاہتا ہے تو رکھ مگر۔۔ یہ اب تیرے ساتھ نہیں رہنا چاہتی، تیری بیوی بن کر۔"

اس کی دیدہ دلیری نے ایک لمحے کو شمائلہ کو بھی ساکت کر دیا تھا، وہ منیر کمال کو اتنا بہادر" نہیں سمجھتی تھی۔

اسے یقین تھا، جس راستے پر وہ چل پڑی تھی، اس کا انجام کچھ ایسا ہی ہوگا، مگر اتنی جلدی اس پر یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا، ویسے بھی اس وقت وہ اپنا گھر نہیں کیریئر بچانا چاہتی تھی، اپنے خوابوں کی تعبیر چاہتی تھی۔ اپنی خواہشوں کے منہ زور گھوڑے کے آگے بے بس تھی۔

اس نے راجہ طارق کے آگے ہاتھ جوڑ دیے، اب یہ مصنوعی آنسو تھے یا وہ واقعی اپنے عیاں ہونے پر شرمسار تھی، ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔

وہ اسے نگاہوں سے تولنے لگے، ان نگاہوں میں کیا کچھ نہیں تھا، نفرت، کراہیت، پامالی، رسوائی۔۔ سب کچھ اور سب سے بڑھ کر وحشت کی سرخی، شمائلہ کا دل کانپا۔ وہ یہ کیا کرنے جا رہی تھی، وہ یہ کیا کر بیٹھی تھی، یہ شخص تو اسے زندہ زمین پر اتار دے گا۔

اگر اس کی محبت میں اتنی شدت تھی تو نفرت، اس پر لرزہ سا طاری ہو گیا۔

شمائلہ تم میرے ساتھ چل رہی ہو یا میں تمہیں کل لینے آؤں۔" وہ کھیل جاری رکھنا چاہتا تھا۔

بکواس بند کرو، نکل جاؤ میرے گھر سے۔۔ جرات ہے تو مجھے گولی مار دو.....شمائلہ اب کبھی تمہارے ساتھ نہیں جائے گی۔"

ان کے کہنے کی دیر تھی، گھر کے کسی ملازم نے ایک جست میں منیر کمال تک پہنچ کر اس کے پسٹل کو پکڑنے کی کوشش کی۔ یہ کسی فلم کا سین ہوتا تو گولی کبھی نہ چلتی اور منیر کمال پر قابو بھی پا لیا جاتا، لیکن حقیقت یہ تھی اس وقت منیر کمال کی گولی چل گئی تھی، راجہ طارق محمود نے تڑپ کر اپنا بازو تھام لیا تھا، گولی ان کے دل سے ذرا اوپر کندھے پر گھس گئی تھی۔ سارے ملازم ان کی طرف بھاگے، منیر کمال گتھم گتھا ملازم سے جان چھڑا کر گاڑی میں بیٹھا اور شمائلہ کو آواز دی۔

چلو شمائلہ، اس وقت یہاں رکنا ٹھیک نہیں، بہت مسئلہ ہو جائے گا۔ یہ شخص مار ڈالے گا تمہیں اور میں تمہیں اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔"

عاشر اپنے بابا سے لپٹ گیا تھا۔ ساجدہ ڈاکٹر کو بلانے بھاگی تھی، تب ہی پڑوس میں ہونے والی ہلچل نے منیر کمال کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ شمائلہ کو گاڑی میں دھکیلے اور یہاں سے روانہ ہو جائے۔

گولی چل چکی تھی، خون تیزی سے بہہ رہا تھا، پولیس کسی بھی وقت آ سکتی تھی، رات کا یہ پہر نہ ہوتا تو یہاں سے نکلنا بھی مشکل تھا۔ اس نے شمائلہ کو کھینچتے ہوئے گاڑی میں لے جا کر بٹھایا۔

منیر کمال سے الجھنے کی کوشش مت کرنا، وہ اس میدان کا پرانا کھلاڑی ہے اور تم ٹھہرے شریف آدمی۔"

ان کے ذہن پر منیر کمال کے آخری جملے ثبت ہو گئے تھے اور تمام عمر ذہن میں گونجتے رہے۔ وہ سمجھ نہیں پائے آج تک کہ یہ شرافت تھی یا محبت.....جو انہوں نے نفرت کی صورت میں بھی شمائلہ کمال سے کی تھی۔

وہ آج بھی اس کی پسند کا لباس، اس کی پسند کی خوشبو، اس کی پسند کے کھانے کھاتے تھے اور خود کو اذیت دیتے تھے۔

☆.....☆.....☆

اب تم لوگ بتاؤ، میں اپنے بابا کی اذیت کیسے کم کروں، میں اپنی ماں کو کیا سزا دوں جو، اس رات کی تلخی میرے اندر کی تاریکی کو کم کر سکے۔"

وہ رو رہا تھا، کشمالہ اور کاشف کے سامنے بالکل بچوں کی طرح، وہ بھول نہیں سکتا، جب اس کے بابا کا خون فرش پر پانی میں مل رہا تھا، اس کے دودھ کا کپ بھی خالی ہو چکا تھا، خون، پانی، دودھ، سب کا رنگ ایک ہو رہا تھا اور اس کی مما ایک اجنبی شخص کی گاڑی میں بیٹھ کر چلی گئی تھیں۔

وہ اجنبی شخص کس کی ہمت سے، کون سے راستے سے ہمارے گھر میں آیا تھا اس وقت تو میری سمجھ میں نہیں آیا تھا، لیکن آج میں سوچتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔" کاشف اور کشمالہ ساکت و جامد اس کی بے بسی کو اپنے اندر اتار رہے تھے، کشمالہ کی تو سانسیں رک رہی تھیں۔

میں نہیں بھولتا اس رات کا کوئی بھی پل..... جب بارش ہی بارش تھی، الزامات کی بارش، بہتانوں کی بارش، نفرت کی بارش اور آسمان سے برستی رحمت کی بارش۔" اس وقت کی طرح اس وقت بھی اس کی آنکھیں بارش برسا رہی تھیں۔

پتا ہے میں مما کے پیچھے تک بھاگا۔۔ان سے کہا، بابا کو اسپتال جاتا ہے آپ نہ جائیں۔"

نہیں بیٹے..... میرا جانا ضروری ہے، ورنہ پولیس ہمیں پکڑ کر لے جائے گی، آپ بھی میرے ساتھ آ جاؤ، ہم اب یہاں نہیں رہیں گے۔

میری ماں نے کھڑکی سے منہ نکال کر کہا تب میں نے منیر کمال کی آواز سنی۔

اسٹاپ نان سنس شمائلہ یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے، میں پکڑا گیا تو تمہارا بھی نام دے دوں گا۔ میں اس وقت کوئی اسکینڈل برداشت نہیں کر سکتا۔ کروڑوں کا کنٹریکٹ کیا ہوا میں نے۔"

تب گاڑی نے مجھے پیچھے چھوڑ دیا یا پھر میں آگے نکلتا چلا گیا، لیکن مجھے یاد ہے مما نے جاتے ہوئے مجھے دیکھا تھا بار بار..... شاید انہیں پتا تھا، میں اس کے بعد ان کی زندگی میں کبھی نہیں ہوں گا۔

وہ عجیب سی کشمکش سے دوچار تھا، فطرت اور انتقام کی باہمی کشمکش میں، اس کی ساری توانائیاں یاسیت میں ڈھل گئی تھیں۔

وہ خود سے بھاگ رہا تھا، وہ سچ سے بھاگ رہا تھا، کیونکہ وہ سچ ماں کی مامتا تھا اور ماں سے نفرت بھی۔ اس کے اندر کی آگ کو کشمالہ سے بہتر کون سمجھ سکتا تھا۔

پھر کیا ہوا تھا۔" کاشف نے جمود توڑا۔

پھر پولیس آ گئی..... شاید ڈاکٹر بھی..... مجھے کچھ نہیں یاد۔ مجھے تو بس یہ یاد رہا کہ مما چلی گئیں اور بابا مرنے والے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ آج بھی۔۔" وہ پھر سے رو دیا تھا۔

تب ہی کاشف کے موبائل کی بیل بجنا شروع ہوگئی۔ اسکرین پر خولہ کا نمبر تھا۔ اس نے جیسے ہی کانوں سے لگایا، وہ چیخ پڑی۔

تم لوگوں کے فون کیوں بند ہیں۔۔ سب کے۔"

بولو..... خولہ سب ٹھیک ہے نا....." کاشف کھڑا ہو گیا۔

بولو نا۔۔ ہوا کیا....." وہ بھی جیسے رو دینے کو تھا۔ کشمالہ کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی تھی اور عاشر نے اس کے ہاتھ سے فون جھپٹ لیا۔

خولہ تم بولتی کیوں نہیں۔۔ چپ کیوں ہو۔" وہ اذیت سے چیخ پڑا، اس کی آواز پر کشمالہ کا دل دہل کر رہ گیا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا کیا بولوں۔۔ کیسے بولوں..... پتا ہے پاپا نے ابھی تھوڑی دیر پہلے آنکھیں کھولی ہیں۔ انھوں نے مجھے غور سے دیکھا ہے۔ بس آپ لوگ جلدی سے آ جائیں مجھے یقین ہے عاشر! آپ ان کے سامنے آئیں گے تو وہ مسکرا دیں گے ان کے اندر زندگی دوڑنے لگے گی۔"

وہ بلا تکان بولتی جا رہی تھی بلکہ بولنے سے زیادہ چیخ رہی تھی، پہلے تو اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی

اور اب کوئی بریک نہیں تھا۔

عاشر نے موبائل قریب کھڑی کشمالہ کو تھمایا اور خود سجدے میں گر گیا۔

اس کی یہ حرکت اتنی بے ساختہ اور معصومیت سے بھرپور تھی کہ کاشف اور کشمالہ ایک لمحے کو ساکت سے ہو گئے۔

سمجھ نہیں آیا اس وقت کس طرح ری ایکٹ کریں، انہیں تو یہ خود پسند مغرور سا شخص بار بار حیران کرتا تھا۔

آج اس کی باتیں سن کر کشمالہ کو احساس ہوا تھا کہ وہ خود پسند نہیں وہ تو بس اذیت پسند ہے، وہ تو پل پل خود کو درد کے سمندر میں غوطے دیتا ہے اور پھر کسی امید کی لہریں اسے اچھال دیتی ہیں، اس نے تو زندگی کا بڑا بھیانک چہرہ اپنی آنکھوں سسکتے اور کرلاتے دیکھا ہے۔

عاشر! جلدی سے اپنا حلیہ درست کرو ہم سب ہاسپٹل چل رہے ہیں، مالا آپ بھی جلدی سے فریش ہو جائیں، اب دیر نہیں کرنی ورنہ خولہ سب کا خون پی لے گی۔"

کاشف نے ماحول کی یاسیت کم کرنے کے لیے اپنی فطری بشاشت کو آواز دی اور ویسے بھی خولہ نے خبر ہی ایسی دی تھی کہ اس نے سردیوں کی کہر آلود شام کو نرم گرم دوپہر میں بدل دیا تھا۔

کشمالہ کو عاشر کی سجدہ کرنے والی حرکت اتنی اچھی لگی تھی کہ وہ تیز رفتاری سے نانو کے کمرے کی طرف بھاگی تھی، سجدہ شکر ادا کرنے، اور انہیں بتانے کہ دعائیں کبھی رائیگاں نہیں جاتیں، دعائیں عرش پر لکھے فیصلوں کا رخ موڑ سکتی ہیں اگر رب کو اپنے بندے کی گڑگڑاہٹ اور اس کی عاجزی پسند آ جائے۔

نانو آپ کو پتا ہے..... اللہ نے آپ کی سن لی، اس نے آپ کے دل کا کہا مان لیا، پاپا کو ہوش آ رہا ہے۔۔ انہوں نے آنکھیں کھولی ہیں، انہوں نے خولہ کے سر پر اپنا ہاتھ پھیرنے کی کوشش کی ہے، انہوں نے خولہ سے بات کرنے کے لیے لبوں کو حرکت دی ہے اور یہ سب کچھ لمحوں میں ہوا ہے، جب سے وہ

وہاں پاگل ہو رہی ہے۔"

وہ بھی تو خولہ کی بہن تھی بولتے ہوئے سانس کیسے لیتی، نانو گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز تسبیح کے دانے گرا رہی تھیں کشمالہ کی آواز سن کر پوری آنکھیں کھولیں اور جھٹکا لے کر اٹھنے کی کوشش کی تو کشمالہ نے انہیں دونوں بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔

نانو! پاپا کی نئی زندگی آپ نے اللہ سے مانگی ہے نا وہ کتنا قریب ہے آپ کے، ہر بات سن لیتا ہے، ہر بات مانتا ہے۔" وہ ان سے لپٹی ہوئی رو رہی تھی اور یہ ہی حال ان کا بھی تھا، ان کے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا یہ وقت شکر کا ہے یا طارق کو ایک نظر دیکھ کر سکون لینے کا۔

پگلی.....! وہ تم سب کو چھوڑ کر کہاں جاتا، کیسے جاتا، اپنی ذمہ داریاں ہمیشہ پوری کی ہیں اس نے، جب تک تم دونوں آباد نہیں ہو جاتیں وہ سکون کا سانس کیسے لے سکتا ہے۔۔"

انھوں نے اس کا روتا چہرہ ہاتھوں میں تھام کر ماتھا چوم لیا۔

بہت اچھے..... ویری گڈ۔ آپ ابھی تک، نانو یہ لڑکی بھی بلا کی سست ہے، عاشر صاحب گاڑی اسٹارٹ کر کیویٹ کر رہے ہیں اور اس کی شکل دیکھیں، آنسو کے نشان بنا کر بیٹھی ہے کشمالہ تم نے پھر عاشر سے ڈانٹ کھانی ہے نا۔ اچھی بات ہے کھاؤ۔۔ میری تو ہمت نہیں ہے۔"

کاشف نے اندر آ کر دونوں خواتین کا جو یہ حال دیکھا تو احتجاجاً سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

اچھا نا۔ مجھے کون سی تیاری کرنی ہے۔ میں بالکل ریڈی ہوں چلو۔ وہ چہرے پر پھیلے آنسو صاف کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

چلو میں بھی چلتی ہوں۔" یک نہ شد دو شد دونوں نانی نواسی کی پھرتی قابل دید تھی، کاشف دھیمے لہجے میں کہتا ہوا ان کے پاس چلا آیا۔

نانو! آپ کو میں کل لے جاؤں گا۔ ابھی دیکھیں موسم بھی اتنا ٹھنڈا ہو رہا ہے اور پھر آپ کی

طبیعت ٹھیک نہیں ڈاکٹر ویسے بھی اندر نہیں جانے دیتے اور آپ کی حالت ایسی نہیں کہ آپ مزید ٹینشن لیں، میں بس انکل کو دیکھ کر ابھی آیا اور پھر ہم دونوں گپ شپ کریں گے۔"

وہ ان کے پاس بیٹھ کر نرمی سے سمجھانے لگا کچھ تو ان کی سمجھ میں آیا کچھ نہیں۔

وہ انہیں بچوں کی طرح بہلا رہا تھا، کشمالہ ہاتھ منہ دھو کر آ گئی تھی اب اس کے چہرے پر آنسو کے نشان نہیں بلکہ اپنے روحانی باپ سے ملنے کی جلدی اور خوشی تھی۔

اس نے بھی کاشف کی بات کی تائید کرتے ہوئے تکیہ سیدھا کر کے کمبل ان کی ٹانگوں تک پھیلا دیا۔

میں آپ کو پاپا کے پاس پہنچ کر فون کرتی ہوں، آپ یہ کارڈلیس اپنے پاس رکھیں۔" اس نے سیٹ سائیڈ ٹیبل سے اٹھا کر ان کے سرہانے رکھ دیا، کاشف کو اندر آئے کافی دیر ہو چکی تھی، باہر سے گاڑی کے ہارن کی مدہم سی آواز اندر آنا شروع ہو گئی تھی۔

جاؤ۔۔ عاشر انتظار کر رہا ہے مجھے جلدی خبر دینے کی کرنا، میرے بچے کی صحت سے بڑھ کر میرے لیے کوئی سکھ نہیں۔"

انھوں نے دونوں کو جانے کا اشارہ کرتے ہوئیا یک بار پھر تسبیح تھام کر آنکھیں موند لیں لیکن مشکل یہ تھی کہ دو تین دن سے عجیب عجیب خیالات ان کی عبادت اور یکسوئی میں خلل ڈال رہے تھے اور وہ گھبرا کر آنکھیں کھول دیتی تھیں۔

اس وقت بھی یہ ہی ہوا، انہوں نے آنکھیں کھولیں تو کمرے میں کوئی نہیں تھا البتہ ذہن و دل پر بڑی بوجھل سی کیفیت نے ڈیرا جما لیا تھا۔

اللہ تجھے، میری بھی زندگی دے طارق۔۔ اور شمائلہ..... مجھے پتا ہے تیرے لیے سکھ مانگنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

ایک بار سکھ مانگا تھا وہ تمہیں بلا جھجک بنا کسی مشکل کے مل گیا تھا مگر اب سکھ مانگنے کی سکت نہیں

رہی تیرے لیے، تیرے بوئے ہوئے کانٹے آج بھی بہت چبھتے ہیں۔"

☆.....☆.....☆

وہ ایک بھیانک رات تھی، ہر چیز ہواؤں کے شور کی زد میں تھی انہوں نے بے چینی سے کروٹ لے کر اپنے مقابل لیٹے شریک حیات کو بڑیمدھم لہجے میں آواز دی تھی۔

اٹھیے نا! پتا نہیں کیوں مجھے بہت گھبراہٹ ہو رہی ہے، کوئی برا خواب دیکھا ہے بہت ڈر لگ رہا ہے۔"

ان کی سرگوشی نما آواز پر محبّ عالم نے پوری آنکھیں کھول دی تھیں، بے دار تو شاید ان کی کروٹوں سے ہی ہو گئے مگر منتظر تھے کہ وہ اپنے مخصوص انداز میں انہیں پکاریں۔

ان کی پکار پر وہ اٹھ کر بیٹھ گئے تھے اور ان کے ماتھے کو چھوتے ہوئے ازلی سکون اور نرمی سے پوچھا تھا۔

کیا ہوا..... کیوں پریشان ہو۔""

پتا نہیں کیا خواب تھا، لیکن مجھے بہت پریشانی ہو رہی ہے آپ شمائلہ کو فون کریں نا۔ اس سے پوچھیں عاشر ٹھیک ہے۔ ہاں میں نے عاشر کو خواب میں دیکھا ہے بہت روتے ہوئے۔"

اس وقت کیوں اس کو فون کرنے پریشان کر رہی ہو، سو رہے ہوں گے۔ طارق کی روٹین کا تمہیں پتا ہے نا۔ جلدی بستر پر چلا جاتا ہے اور ویسے بھی موسم طوفانی سا ہو رہا ہے تمہیں ایسا موسم کبھی اچھا نہیں لگا۔ بس وہی خوف تمہیں لاشعوری طور پر تنگ کر رہا ہے۔"

انہوں نے اپنی محبوب بیوی کے بالوں کو پیار سے سمیٹتے ہوئے ان کے گھبرائے چہرے پر محبت کی مہر ثبت کی، سائیڈ ٹیبل پر رکھا پانی کا گلاس لبوں سے لگایا اور وہ جلدی سے پورا گلاس خالی کر گئیں۔

اس قدر ٹھنڈ ہے اور مجھے لگ رہا ہے جیسے میرے اندر آگ سی لگی ہو۔"

۔حکم کرو تو اے سی آن کر دوں..... میری خیر ہے آپ کی آگ ختم ہو جائے گی۔" متبسم سے

انداز میں محبّ عالم نے چھیڑا تو وہ مسکرا دیں۔

آپ بھی نا۔ عمر چلی گئی مگر شوخیاں نہ گئیں۔"

ارے عمر کی کیا بات ہے، ابھی چند سال پہلے تو ہم نے شادی کی صرف سلور جوبلی منائی ہے۔"

وہ بھرپور موڈ میں آ چکے تھے تب ہی ان کی طرف والی سائیڈ ٹیبل پر رکھا فون بج اٹھا۔ بیل کی آواز نے کمرے کا سناٹا ہی نہیں بلکہ رات کی خاموشی پر بھی ضرب لگائی تھی۔

دوسری بیل پر محبّ عالم نے فون اٹھا لیا تھا، دوسری طرف طارق کے گھر کا کوئی وفادار ملازم تھا یا پھر عاشر کا ہمدرد.....

صاحب! آپ جلدی سے پہنچو۔ ادھر ہمارے طارق صاحب کو گولی لگ گئی ہے، ڈرائیور کوئی ہے نہیں اور ڈرائیونگ ہم میں سے کسی کو آتی نہیں، عاشر بابا بہت رو رہا ہے، آپ آ جاؤ بس۔۔ وہ درد سے تڑپ رہے ہیں۔

اس سے پہلے کہ وہ پوچھتے شمائلہ کہاں ہے۔ عاشر کیوں رو رہا ہے۔ دوسری طرف کا فون بند ہو چکا تھا۔

یہ سب کچھ بہت عجلت میں کہا گیا تھا مگر ان کا دماغ ماؤف ہو گیا تھا انہوں نے فون رکھ کر خوفزدہ نظروں سے اپنی انتہائی سمجھ دار اور معاملہ فہم بیوی کو دیکھا تو یقین آ گیا کہ عورتوں کی چھٹی حس ہر معاملے میں حیران کن حد تک تیز ہوتی ہے، اس وقت تو ان کی بے چینی بے سبب تھی اور نہ ہی گھبراہٹ بلا جواز تھی، وہ انہیں کچھ بھی بتانے کی ہمت نہیں کر پا رہے تھے۔

ہمیں ابھی طارق کی طرف جانا ہوگا۔" بمشکل چند لفظ ادا کر کے انہوں نے بستر چھوڑ دیا تھا اور بیگم محبّ عالم عجیب سکتے کے عالم میں اپنے شریک حیات کو دیکھنے لگیں جو رات کے اس پہر برستی بارش میں طارق کے پاس جانے کے لیے اپنا سلیپنگ ڈریس بدلنے ڈریسنگ روم میں چلے گئے تھے۔

وہ بھی سرعت سے اٹھی تھیں۔

طارق کے پاس جانے والی بات سمجھ میں بالکل نہیں آئی تھی لیکن روبوٹک انداز میں اپنا عبایا پہن کر گرم چادر بھی لپیٹ لی تھی۔

محبّ عالم ڈریسنگ روم سے باہر نکلے تو انہوں نے سوئیٹر تھمایا۔

مجھے کچھ بتائیں گے بھی یا..... میرا تو دماغ پھٹ رہا ہے۔"

حوصلہ رکھو، مجھے خود نہیں پتا اور ملازم بے چارے نے کہا ہے صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں۔" وہ بڑے حوصلے کے ساتھ گویا ہوئے ورنہ دل بارش میں بھیگے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔

اور کیوں نہ لرزتا یہ دل۔ کیونکہ اس رات کے صرف چھ دن کے بعد ہی اس دل نے دھڑکنا ہمیشہ کے لیے بند کر دیا تھا، اس دل کے اندر ہمکتی، مستی کرتی زندگی ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی تھی کیونکہ یہ زندگی عزت اور مرتبے کا اعلا مقام دیکھنے کے بعد ذلت اور رسوائی سہ نہ پائی تھی۔

کیسے سہ پاتی عزت اور غیرت کا خون کرنے والی کوئی اور نہیں ان کی اپنی لاڈلی اکلوتی بیٹی شمائلہ تھی۔

اس رات تو وہ ڈھیر سارا حوصلہ اور ہمت اپنے اندر سمیٹ لائے تھے، خون میں لت پت طارق کو سمیٹ کر گاڑی میں ڈالا تھا اس کو جہاں پر گولی لگی تھی وہاں ہاتھ رکھ کر خون روکنے کی کوشش کی تھی۔

گھر کے ملازموں کی مختلف بولیوں میں اس حادثے کی پوری روداد سنی تھی اور آخر میں عاشر کی سسکیوں نے انہیں شمائلہ سے شدید نفرت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

مما چلی گئیں انکل کے ساتھ، انہوں نے بابا کو مارا ہے اور انکل مما کو بھی لے گئے۔" اس کی زبان پر بس یہ ہی جملے تھے۔ بیگم محبّ عالم کے سر پہ قیامت آن ٹھہری تھی۔

انہوں نے عاشر کو اپنے اندر سمیٹ لیا تھا۔

نہیں میرے بچے! ایسا نہیں ہے۔ مما ابھی آجائے گی، ان کو انکل کے پاس کوئی کام ہوگا نا اور

پھر ہو سکتا ہے وہ ڈاکٹر کو لینے گئی ہو، باہر کتنی بارش ہو رہی ہے کیا پتا کہیں پھنس گئی ہو۔"

انہوں نے بے حد کمزور دلیلوں سے خود کو بہلانا چاہا، عاشر کے معصوم ذہن کو صاف کرنا چاہا مگر کچھ تحریریں ذہن و دل پر نقش ہو جاتی ہیں، کچھ لمحے وقت کے پنڈولم میں قید ہو جاتے ہیں۔

عاشر اور بیگم محبّ عالم کے ساتھ بھی یہ ہی ہوا تھا دونوں کی زندگی کا یہ بھیانک لمحہ کسی آسیب کی طرح ان کے اندر پھیل گیا تھا۔

اس رات محبّ عالم نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے طارق کو گولی لگنے کی وجہ کو پولیس کیس بننے سے بچا لیا ورنہ اس سارے معاملے کی تحقیق شروع ہو جاتی تو پھر بے آبروئی کے نئے باب کھل جاتے۔

سب نے دیکھا تھا سب جانتے تھے طارق زخمی کیسے ہوا۔

طارق کا زخم گہرا تھا لیکن روح پہ لگے زخم سے زیادہ گہرا اور کاری نہیں، وہ تین دن تین راتیں ہسپتال میں رہے۔ سب ان سے ملنے ان کی خیریت دریافت کرنے آتے رہے لیکن انہیں لگتا تھا جیسے سب کی نظروں کا تمسخر اور ہمدردی انہیں بے موت مار رہی ہے۔

ایک دن تو وہ چیخ پڑے تھے۔

خالہ جان پلیز میں جینا نہیں چاہتا..... مجھے کوئی دعا نہیں چاہیے، مجھے تندرستی کی نہیں مرنے کی دعا دیں، مجھ سے نفرت کریں، میں آپ کی بیٹی کے قابل نہیں تھا اسے کوئی خوشی نہیں دے سکا اور آج خالی ہو گیا۔ پلیز خالہ جان یہاں کسی کو مت آنے دیں پلیز۔" ان کی بڑی بڑی سرخ ڈوروں والی آنکھیں خون آلود ہو چکی تھیں، ان کے زرد چہرے پر اشتعال کی سرخی اور لہجے میں بے بسی بیگم محبّ عالم کا کلیجہ نوچ کر لے گئی تھی۔

طارق میرے بچے ایسا نہ سوچ۔۔ نہ کر ایسی باتیں میرا دل بند ہو جائے گا، میرے بارے میں بھی تو سوچ، تیرا دکھ دیکھوں، عاشر کو سنبھالوں یا اپنی تربیت اور خون کے بے ثمر ہونے کا ماتم کروں۔

مجھے بھی تو بتا میں کس کے پاس جا کر روؤں۔"

ان کا ضبط جواب دے گیا تھا آنسوؤں کا لاوا سا پھوٹ نکلا تھا طارق نے انہیں اپنے قریب کر کے کندھے پر سر رکھ دیا تھا دونوں پھوٹ پھوٹ کر روئے تھے۔ دونوں کا درد سانجھا تھا دونوں کا نقصان ایک جیسا تھا۔

خالہ جان! میں نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی میں نے بارہا اسے سمجھایا تھا، یہ دنیا تمہاری اور میری نہیں، وہ سراب ہے اس کے لیے مت بھاگو۔ لیکن پتا نہیں کیوں اسے میری ہر بات فطرت کے برخلاف لگتی تھی۔" وہ ہچکیوں سے رو رہے تھے۔

بیگم محبّ عالم نے گزری رات بالکل اسی طرح اپنے شوہر اور اس وقت شمائلہ کے شوہر کو روتے دیکھا تھا، ان کے اندر اپنی بیٹی کے لیے نفرت کی شدید لہر بے دار ہوئی تھی۔

اللہ غارت کرے تجھے شمائلہ اور اس نامراد کو بھی جس نے تجھے اس راستے پر ڈالا۔"

وہ ماں تھیں بہت کچھ برداشت کیا تھا آج تک، دل سے بددعا نہ بھی نکلتی لیکن اندر کا رنج زبان پر آ ہی گیا تھا۔

نہ کریں خالہ جان۔ بس دعا کریں اللہ اسے ہدایت کے راستے پر رکھے ابھی تو بہت روشنی ہوگی اس کے اردگرد مگر پھر..... اللہ نہ کرے۔" وہ جھرجھری سی لے کر رہ گئے۔

چل پولیس کو فون کر تو..... دونوں کو بند کر دے۔"

خالہ جان..... وہ تلخی سے مسکرا دیے۔

پولیس ان کو بند کرتی ہے جو مجرم ہوں، جنہوں نے کوئی گناہ کیا ہو، انہوں نے بھلا کون سا جرم کیا ہے، وہ باشعور اور سمجھ دار لوگ ہیں انہیں اپنی زندگی گزارنے کا پورا حق ہے، شمائلہ کو کوئی زبردستی نہیں لے کر گیا، وہ اپنی مرضی کی زندگی گزارنا چاہتی ہے، ہم اسے قید میں تو نہیں ڈال سکتے۔

جب اس کا دل دماغ میرے ساتھ نہیں تو میں بے روح وجود سے کیا کروں گا۔"

میں اپنے ہاتھوں سے اسے زہر پلا دوں گی مجھے سکون ہو جائے گا۔" وہ سنگدلی سے بولیں۔

خالہ جان! آپ تقدیر کو مانتی ہیں نا، آپ جانتی ہیں نا کچھ چیزیں صرف نصیب سے۔۔ ہوتی ہیں شاید ہم سب کے نصیب میں یہ رسوائی کبھی تھی ہم قدرت سے تو نہیں لڑ سکتے۔"

وہ اپنے زخموں کی ٹیسوں کو دباتے ہوئے اس مہربان عورت کو تسلی دے رہے تھے اس کا درد کم کرنے کی کی کوشش کر رہے تھے جو اس وقت دہرے عذاب سے دوچار تھی۔

بیٹی کا گھر برباد ہو گیا تھا اور بیٹے کی زندگی، طارق کو جنم تو نہیں دیا تھا مگر پالنے والی کی محبت کا پورا حق ادا کیا تھا۔

خالہ جان! آپ جائیں اب آرام کریں میں کافی بہتر ہوں۔ پھر عاشر بھی اکیلا ہوگا۔"

انہوں نے نرمی سے ہاتھ تھام کر حوصلے کے ساتھ کہا، اس وقت زندگی دہری تلوار پر تھی، وہ ہسپتال میں نہ ہوتے تو شاید حالات مختلف ہوتے، وہ ایک کوشش ضرور کرتے شمائلہ کو واپس لانے کی۔

وہ خود اس سے الگ ہو جاتے مگر ماں باپ کو بیٹی سے ضرور ملا دیتے، مگر زندگی کا جواب نہیں۔

بے بس کیا تو ہر راستے پر باڑ لگا دی۔ ہر طرف شام غریباں نے ڈیرے ڈال دیے۔

☆.....☆.....☆

منیر! میں ایک بار گھر جانا چاہتی ہوں مجھے بابا اماں دونوں کی فکر ہے، ایٹ لسٹ میں ان کو ساری سچویشن تو کلیر کر دوں کہ اس رات کو ہوا کیا تھا، میں ان کی طرف سے بہت پریشان ہوں۔"

وہ بہت بے چینی سے ہوٹل کے اس کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہل رہی تھی۔ اس کے بلا کے حسین چہرے پر منیر کمال کو تفکر کے بادل بالکل نہیں اچھے لگ رہے تھے ویسے بھی وہ اس وقت مکمل اس کی دسترس میں تھی ایسے میں وہ اپنے گھر والوں کے بارے میں سوچ رہی تھی اور گھر والوں میں وہ شخص بھی شامل

تھا جو آج بھی اس کا قانونی اور شرعی مالک تھا، وہ کسی بھی وقت اس حق کا استعمال کر سکتا تھا تب منیر کمال کی ساری محنت رائیگاں چلی جاتی، اتنی مشکلوں۔۔اور مشقتوں سے تو یہ کام کی عورت اس کے دام میں آئی تھی جو ہر طرح سے اس کے لیے سونے کی چڑیا تھی۔

نہیں شمائلہ اس وقت نہیں، تم جانتی ہو پولیس ہماری تلاش میں ہوگی کوئی ایک نہیں پورا محلّہ اس رات کا گواہ ہے کہ ہم دونوں نے طارق کو جان سے مارنے کی کوشش کی ہے۔"

پلیز اسٹاپ اٹ! ہم دونوں نے نہیں گولی تو آپ سے چلی، اس رات جو ہوا وہ ٹھیک نہیں تھا، مجھے طارق اجازت دے دیتے، وہ ہمیشہ میری بات مانتے آئے ہیں۔"

شمائلہ کے آنسو میں ملال کا رنگ نمایاں تھا، منیر کمال اس کے پاس چلا آیا، اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر اس کا روتا چہرہ بغور دیکھنے لگا۔

چنگاری ابھی بھی بھڑک رہی تھی یہ ٹھیک نہیں تھا۔

شمائلہ! اس رات جو ہوا اگر وہ غلط تھا تو تم اس وقت میرے پاس میرے اتنے قریب کیوں بیٹھی ہو، کیا میں نے اس وقت طارق کے سامنے جھوٹ بولا، کیا میں نے تم سے اپنی محبت اپنے جنون کا اظہار کر کے غلطی کی، کیا مجھے سچ نہیں بولنا چاہیے تھا۔

کیا میں ساری زندگی اس آگ میں جلتا رہتا کہ ہاں مجھے شمائلہ سے پیار ہے، بہت پیار ہے، میں اس کے بغیر اب سانس بھی نہیں لے سکتا مجھے اس کے بغیر اپنی ساری دنیا قبرستان لگتی ہے مجھے اس کے بغیر نیند نہیں آتی، مجھے اسکا پیار پاگل کر رہا ہے، کیا میں یہ سب نہ کرتا اور اپنی ہی آگ میں جل مرتا۔

کیوں شمائلہ! میں ایسا کیوں کرتا مجھے زندگی ایک ہی بار ملی ہے مجھے اس میں وہ سب حاصل کرنے کا حق نہیں جو میرا دل تمنا کرتا ہے اور یہ سچ ہے محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔

میرا کیا قصور کہ مجھے محبت ہوئی اس عورت سے جو کسی کی بیوی ہے، کسی کی ماں ہے مگر میری تو کل کائنات ہے یہ عورت، میں تو مر جاؤں گا۔

وہ اس کی گود میں سر رکھ کر رونے لگا تھا اس کے دونوں ہاتھ شمائلہ کے ہاتھوں میں الجھے ہوئے تھے، عجیب سی نرمی گرمی ان ہاتھوں سے نکل کر شمائلہ کے اندر مستقل ہو رہی تھی۔

وہ اتنا لمبا چوڑا شخص ہچکیوں سے رو رہا تھا اس کی گود میں سر رکھے، شمائلہ کا دل اس کی قربت اور اتنی شدتوں سے ہی پگھلنے لگا۔

شمائلہ اگر یہ سب جھوٹ ہے اور تمہیں میری کوئی پروا نہیں تمہیں میرا ساتھ نہیں چاہیے تو پھر بتاؤ نا اتنے دنوں سے تم میرے ساتھ کیوں ہو، تم مجھ سے مل کر خوشی کیوں ہو جاتی تمہارا چہرہ چمکنے لگتا ہے، تمہاری آنکھیں بولنے لگتی ہیں اور مجھے بلانے لگتی ہیں، تمہارا رواں رواں مجھے پکارنے لگتا ہے کیوں۔

شمائلہ..... کیوں جس آگ میں، میں جل رہا ہوں، وہ صرف میری آگ نہیں، تمہارے اندر بھی اس کا الاؤ دہک رہا ہے۔

وہ اسے جذبات کی آندھی میں لپیٹ رہا تھا، اپنے مخصوص بھاری لہجے میں اس کے ہیجان میں اضافہ کر رہا تھا۔

شمائلہ کو لگ رہا تھا یہ شخص تو اس کے بغیر واقعی مر جائے گا اور ایک اور خون اس کی گردن پر ہوگا۔

اس کی بے قراریوں، بے تابیوں پر شمائلہ خوفزدہ ہو گئی تھی، وہ پگھلنا شروع ہو گئی تھی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا جذبات کے اس بند کو کیسے روکے، اس شخص کو کیسے سنبھالے۔ وہ اپنی پریشانی بھول کر اس کے دکھ میں الجھ گئی تھی۔

منیر..... آپ کس طرح کی باتیں کر رہے ہیں میں آپ کے ساتھ ہوں نا، آپ اکیلے تو نہیں۔"

وہ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگی، منیر کمال کے دل میں سکون کی لہریں موجزن ہونے لگیں۔

اس نے سر اٹھایا، روتی ہوئی آنکھیں، نمناک چہرہ اور ہونٹوں پر بوجھل سی مسکراہٹ۔

شمائلہ کا دل عجیب سے لے پر دھڑکنے لگا، وہ اس لمحے طارق کی وارفتگیاں، اس کی نگاہوں کی

گرمی، اس کے لہجے کی بے تابی یکسر فراموش کر کے یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ یہ شخص، اتنی محبتیں اور اتنی بے قراری اسے پہلے کیوں نہ ملی۔

وہ اس کے چہرے پر نظریں جمائے سوچ رہی تھی۔

تب ہی منیر کمال نے اس کے مقابل آ کر اسے اپنے قریب کر لیا۔

تم میرے لیے بنی ہو شمائلہ، تمہیں نہیں پتا ہمارا ملنا مقدر تھا، اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم کبھی نہ ملتے، کبھی ایک دوسرے کو نہ دیکھتے۔

یاد ہے، ہم ملاقات کے بعد ہی ایک دوسرے کے قریب ہو گئے تھے، ہمیں یوں لگ رہا تھا جیسے ہم ہمیشہ سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔

ایسا کیوں ہوا تھا اسی لیے نا کہ ہم ایک دوسرے کے لیے بنے تھے بس درمیان کچھ فاصلے تھے جنہیں آج میں ختم کرنا چاہتا ہوں۔

میں تمہیں اپنے اندر سمونا چاہتا ہوں، اپنے اندر چھپانا چاہتا ہوں اب نہیں جانے دوں گا۔"

وہ دھیمے لہجے میں کہتے ہوئے اس کے ماتھے، گرون اور گردن سے ذرا نیچے اپنے ہونے کا احساس ثبت کرنے لگا اور شمائلہ بے خودسی ہونے لگی، اس سے پہلے کہ وہ دونوں جذبات کے اس سیلاب میں بہہ جاتے اطلاعی گھنٹی نے خدائی فوجدار بن کر لمحوں کی سازش درہم برہم کر دی۔

شمائلہ مس یو....." وہ بمشکل اس کے قریب سے دور ہو گیا تھا، دروازہ پر اس کا اسسٹنٹ تھا جو ساری تفصیل سے آگاہ کرنے آیا تھا، منیر کمال نے بے زاریت سے اسے دیکھا۔

تمہیں بھی اس وقت آنا تھا، چلو آ گئے ہو تو اندر آ جاؤ۔" وہ اسے لے کر اندر آ گیا، شمائلہ جب تک واش روم میں جا چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

ہم خانہ بدوش پیدا ہوتے ہیں اور خانہ بدوش ہی مرجاتے ہیں، اس بار جب یار محمد نے مجھے روکنے کی کوشش کی تو میں نہیں رکا، جب میرا نصیب دربدری تھا، خانہ بدوشی تھا تو میں کیوں یار محمد کا ہی ہو کر رہ جاتا۔

چاچا بشیر کو بھی میری ضرورت تھی اور میری ضرورت تو شہزادی تھی جس سے مجھ پیار ہو گیا تھا۔

ہمارے پاس سامان کیا تھا جس کو ہم سمیٹتے۔ ایک گٹھڑ چاچا بشیر کے پاس، ایک تھیلا میرے پاس، اور شہزادی نے پپو کی پوٹلی اٹھالی۔

یہ تھا ہمارا مختصر قافلہ جو کسی نئی منزل کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا تھا، چاچا بشیر کو ہی پتا تھا ہم کون سے شہر جا رہے ہیں اور وہاں جا کر ہمیں کیا کرنا ہوگا، میں اور شہزادی تو بس اس کے حکم کے منتظر رہتے تھے۔

میں پہلی بار ریل میں بیٹھا تھا، چوکور چوکور ڈبوں والی ریل بھی میرے لیے بڑی انوکھی چیز تھی بس بھاگے جا رہی تھی بھاگے جا رہی تھی، کتنے راستے، کتنے کھلیان کتنے ویرانے پیچھے رہ گئے تھے۔

ہم لوگ ریل کے ننگے ٹھنڈے فرش پر بیٹھے تھے، پپو کی پریشانی تھی کہ اسے ٹھنڈ نہ لگ جائے ورنہ ہمیں کوئی پریشانی نہیں تھی۔

ایک رات کے بعد جو صبح آئی تھی اس نے ہمیں کسی شہر میں پہنچا دیا تھا، بڑی اجلی اجلی روشن صبح تھی، لوگ ریل گاڑی سے اترنا شروع ہو گئے تھے میں بھی تھیلا اٹھا کر چھلانگ لگا کر دروازے سے باہر نکلا۔

یہ آخری اسٹیشن ہے اس کے بعد ریل کہیں نہیں جائے گی، ہم لوگ کراچی پہنچ گئے..... چل شہزادی بہت بڑی دنیا ہے اس شہر کی، کوئی تو ٹھکانہ مل جائے گا۔"

چاچا بشیر نے انگڑائی لے کر شہزادی کو آواز لگائی، شہزادی اور میں ایک ہی جیسی کیفیت سے دوچار تھے، کچھ حیران کچھ پریشان، یہ تو اسٹیشن پر ہی اتنی بڑی دنیا تھی۔

میلہ سا لگا ہوا تھا۔

مجھے وہ میلہ یاد آ گیا جس نے میری زندگی بدل دی، مجھے لگا یہ میلہ بھی میری زندگی بدل دے گا۔

میں نے سرکاری نلکے پر جا کر ہاتھ، منہ پیر دھوئے ڈھیر سارا پانی پیا، ابھی پانی پی کر پلٹا تھا کہ ایک لمبے چوڑے آدمی سے ٹکرا گیا۔

اوئے دیکھ کر نہیں چلتا۔۔"اس نے ڈپٹ کر کہا حالانکہ غلطی میری نہیں تھی۔ میں تو دیکھ کر ہی چل رہا ہوں۔"میں بولے بغیر نہیں رہ سکا وہ بندہ ذرا آگے آیا اور میرا منہ اپنے ایک ہاتھ میں جکڑ لیا۔

بہت گرمی ہے تیرے اندر۔"اس نے مجھے بے دردی سے نوچا تھا یہ میں بھلا کہاں برداشت کر سکتا تھا میں نے بھی اس کا گریبان پکڑ لیا۔

وہ بندہ خوامخوہ مجھ سے الجھا تھا، میں بھی چیخ اٹھا۔ لوگ جمع ہو گئے چاچا بشیر بھی آ گیا، اس نے مجھے اس آدمی کے نرغے میں دیکھا تو غصے سے آگے بڑھا۔

چھوڑ دو اسے کیوں پکڑا ہے،"چاچا بشیر میرے معاملے میں ذرا جذباتی ہو گیا تھا۔

ارے کیسے چھوڑ دوں..... جیب مار رہا تھا میری..... پکڑ لیا رنگے ہاتھوں۔"وہ آدمی ڈھٹائی سے مجھے دیکھتے ہوئے جھوٹ بول رہا تھا۔

پتا نہیں ایک لمحے میں اس نے مجھ سے کیا دشمنی باندھ لی، چاچا بشیر نے بے یقینی سے مجھے دیکھا، میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، میں لوگوں کے نرغے سے نکلنا چاہتا تھا میں نے اب تک سارے برے کام کر لیے تھے مگر میں چور نہیں تھا۔

میرے سامنے یار محمد کی تجوری کھلی پڑی رہتی تھی مگر میں اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا کیونکہ میری جیب بھی خالی نہیں ہوتی تھی اور نہ ہی میری کوئی ایسی ضرورت ہوتی تھی جس کے لیے میں چوری کروں۔

چاچا میں نے کچھ نہیں کیا، یہ آدمی جھوٹ بول رہا ہے، بالکل جھوٹ بول رہا ہے میں پانی پی رہا

تھا بس ادھر مڑا اور اس سے ٹکرا گیا۔ دیکھو میرے پاس کچھ نہیں ہے۔"

میں بزدل بھی نہیں تھا جو خاموشی سے ان لوگوں کے تھپڑ کھا لیتا، لیکن وہاں پر کون میری سننے والا تھا، پتا نہیں پولیس کہاں سے آ گئی تھی۔

ارے ڈاکو پکڑا ہے میں نے، لے جاؤ اس کو جیب کاٹ رہا تھا میری۔" مجھے ہر طرف سے ایک ہی آواز آ رہی تھی۔

صاحب! یہ میرا بیٹا ہے، ہم ابھی ادھر گاؤں سے آئے ہیں، یہ چوری نہیں کر سکتا یہ تو بہت چھوٹے سے محنت مزدوری کر رہا ہے، ادھر کھڑی ہے اس کی ماں، آپ بے شک اس سے پوچھ لو۔"

چاچا بشیر نے پولیس والے کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے، مگر ان کے ہاتھ شکار آ چکا تھا اور وہ اپنی دیہاڑی بھی ضائع نہیں کر سکتے تھے اتنے سارے لوگوں کے سامنے لہذا اب مجھے ساتھ لے جانا ضروری ہو گیا تھا۔

چاچا بشیر اور شہزادی پپو کے ساتھ وہیں کھڑے رہ گئے اور پولیس والا مجھے لے کر آگے بڑھ گیا، اس نے مجھے گردن سے جکڑا ہوا تھا۔

نہ میں نے چوری کی تھی نہ مجھ پر کوئی جرم ثابت ہوا تھا اور نہ ہی اس آدمی کے پاس کوئی ثبوت تھا پھر بھی وہ پولیس والا مجھے ساتھ لے کر جا رہا تھا۔

یہ میرے لیے حیران کن بات آج تک ہے، اس وقت تو اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے طریقے سوچتے ہوئے آگے بڑھ گیا تھا لیکن جب کبھی پولیس کو مستعد دیکھتا ہوں تو وہ دن یاد آ جاتا ہے۔ اور پھر خیال آتا ہے کیا کریں یہ لوگ بھی اپنی ڈیوٹی کے آگے مجبور ہیں۔

روزانہ ان کے کھاتے میں دو چار مجرم درج نہ ہوں تو ان کی روزی حلال نہیں ہوتی اور پھر ستم یہ کہ حلال روزی سے ان کا گزارا بھی کہاں ہو سکتا ہے۔

میں نے اپنے پیچھے کسی کی آواز بھی سنی تھی۔

ارے کچھ دے دلا کر جان چھڑا لو، کیوں تھانے کچہری کے چکر میں پڑ رہے ہو۔" وہ کوئی ہمدرد تھا شاید چاچا بشیر سے مخاطب تھا۔

میرے ہاتھ فوراً اپنے نیفے کی طرف بڑھ گئے۔

چاچا بشیر کہاں سے کچھ دیتا دلاتا، یہ کام بھی شاید مجھے خود ہی کرنا تھا۔

پولیس والا مجھے اپنی گاڑی کی طرف لے جا رہا تھا جس میں بڑے بڑے مجرموں اور چھوٹے چھوٹے شر پسندوں کو ایک ہی انداز سے بھرا جاتا ہے۔

یہ دنیا جتنی بڑی تھی جتنی پر ہجوم اور روشن تھی اتنی ہی پر فریب بھی تھی مجھے اپنے اردگرد کے ماحول سے شدید نفرت سی محسوس ہوئی، گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے میں نے آخری پتا پھینکا۔ پولیس والے کا ہلکے سے ہاتھ دبایا۔

صاحب ایک بات کرنی ہے ادھر چلو نا میرے ساتھ۔" میرا انداز پولیس والوں کی خدمت کر کے خاصا گھاگ ہو چکا تھا۔ میں بندہ پہچان کر بات کرنے کے ہنر سے آگاہ ہو چکا تھا۔

کیا بکواس کرتا ہے۔ بکواس بند کر۔" اس نے مصنوعی رعب جھاڑا اس کے بھدے نقوش میں کوئی جاذبیت نہیں تھی تبھی مجھے وہ بہت برا لگا۔

صاب! بکواس نہیں، سچ بات کرنا ہے تجھ سے، ادھر چل۔" میں نے قدرے خالی جگہ کی طرف اشارہ کیا۔

اسے شاید میرا انداز غیر معمولی لگا وہ میرے ساتھ ہو لیا، ویسے بھی میرے چہرے کی معصومیت کو وہ نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

بک..... کیوں لے کر آیا ہے مجھے ادھر۔"

صاحب! تیرا کتنے میں گزارا ہو جائے گا آج، بول نا اور پھر تیری چپی دبی بھی کر دے گا اگر موڈ ہے، دیکھ مجھے تھانے مت لے کر جا، مجھے ابھی اپنی باجی کے لیے کوئی ٹھکانہ ڈھونڈنا ہے، تو مجھے لے گیا تو وہ لوگ مجھ سے کھو جائیں گے۔"

میرے انداز میں لجاجت بھی تھی اور لالچ بھی، پولیس والے کے چہرے پر حیرانی سی اتری۔

باجی کے لیے ٹھکانہ..... تیرا باپ تو کہہ رہا تھا ادھر کوئی تیری ماں واں کھڑی ہے اب وہ باجی ہو گئی۔" وہ بدتمیزی سے بولا شاید وہ اتنی جلدی ہار نہیں ماننا چاہتا تھا ورنہ میری بات سن کر اس کی آنکھیں تو چمک اٹھی تھیں۔

ہاں وہی میری ماں ہے، باجی کہتا ہوں میں اس کو، ہم لوگ سیلاب والے گاؤں سے آئے ہیں ادھر ہمارا کوئی نہیں ہے، ادھر جو تھا وہ پانی میں بہہ گیا۔" میں روہانسا ہو گیا۔

ارے پھر تو کوئی امداد و مدد بھی ملی ہو گی نا۔"

نہیں صاحب! غریبوں کو کوئی امداد بھی نہیں دیتا، میرے پاس یہ تھوڑے پیسے ہیں انہیں رکھ لو اور مجھے جانے دو، میں جیب نہیں مارتا، کام کرتا ہوں ہوٹل پر، اگر مجھے کسی ہوٹل پر کام دلا دو تو بڑی مہربانی ہو گی۔"

میں اپنے مخصوص لہجے میں اس کو گرویدہ کرنے پر تل گیا تھا، میرے ہاتھ میں چند سرخ نوٹ دیکھ کر اس نے قدرے مسکراتی اور پھر حیرت بھری نگاہ مجھ پر ڈالی، اس لمحے وہ بھدے نقوش والا پولیس والا مجھے اتنا برا نہیں لگا۔

"تمہیں پتا ہے یہاں شہر میں کوئی اس طرح کام نہیں دیتا، ضمانت مانگتے ہیں سب۔" اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اب وہ میرے پیسے نہیں بس مجھے دیکھ رہا تھا۔

تو صاحب ضمانت دے دو نا، تیرا کیا جائے گا اگر میرا بھلا ہو جائے گا۔" میں نے ہاتھ جوڑ دیے۔

اور اگر تو نے کوئی گڑ بڑ کی تو۔" وہ نرم پڑ چکا تھا۔

کیا گڑ بڑ صاحب، اگر تجھے شکایت ملی تو بند کر دینا اپنے حوالات میں، میں جھوٹا نہیں ہوں، جو کر تا ہوں سامنے کرتا ہوں۔" میں نے ایک اور سچ بولا۔

تب نہ جانے اس کے من میں کیا آئی شاید مجھے دیکھ کر اس کا بھی دل پلٹ گیا۔

اس نے پیسے مجھے واپس اپنے نیفے میں اڑسنے کو کہا۔

جا ابھی اپنے باپ کے ساتھ، میں شام تک ادھر ہی ہوں، دو گھنٹے کے بعد اسی جگہ پر آ جانا، میں تجھے ایک ہوٹل پر لے جاؤں گا۔"

پولیس والے کے انداز میں شفقت در آئی تھی۔

صاحب! سچ بول رہا ہے یقینی سے پوچھا تو وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مسکرا دیا تب مجھے یقین آیا کہ ضروری نہیں کہ میلوں کی ہر دنیا بری ہی ہو، میلے میں کچھ اچھے اجنبی بھی مل جاتے ہیں۔

میں واپس چاچا بشیر کے پاس پہنچا تو اسے بھی یقین نہیں آ رہا تھا لیکن اس شام جب مجھے وہیں کینٹ کے پاس ایک ہوٹل میں نوکری اور رہنے کا ٹھکانہ مل گیا تو مجھے زندگی بڑی پیاری لگی۔

بڑا ہی پر ہجوم علاقہ تھا، گاڑیوں کا شور، لوگوں کا آنا جانا، کسی کی اتنی لمبی کار تو کوئی ٹوٹی پھوٹی ویگن میں سوار، میں صبح سے شام تک زندگی کے مختلف چہرے دیکھنے لگا۔

باجی اور چاچا بشیر وہیں ریلوے لائن کے پاس ہی ایک جھونپڑی ڈال کر رہنے لگے، چاچا بشیر ان کاموں میں ماہر تھا۔

اب وہ بھی نوکری کی تلاش میں تھا مگر اسے ابھی تک کوئی آسرا نہیں ہوا تھا، ایک مہینے بعد میں نے اپنی محنت کی کمائی باجی کے ہاتھ پر رکھ دی تو وہ بے اختیار مجھے اپنے ساتھ لپٹا کر رونے لگی۔

گزرا مہینہ بڑی تنگی کا تھا لوگ بھیک تھما کر چلے جاتے تھے، آج اسے عذاب سے نجات ملی تھی تو

مجھے بھی سکون ہوا تھا ورنہ میرے اندر دولت مندوں سے نفرت کے سوا کوئی جذبہ بے دار نہیں ہوتا تھا۔

پپو بیمار ہوا، کسی نے سرکاری اسپتال کا بتایا وہاں بھی ایک لال شربت کے بعد ساری دوائیاں پرچی پر لکھ کر ہاتھ میں تھما دیں۔

اس دن پہلی بار میں نے ایک بابو ٹائپ شخص کے سفید سوٹ پر چائے چھلکا دی تھی، جواباً اس نے بھی وہی سلوک کیا جو اسٹیشن والے آدمی نے کیا لیکن میں بھی ان سب جھڑکیوں کا، ماروں کا عادی ہو چکا تھا، میرے اطمینان کے لیے یہ کافی تھا کہ میں بھڑاس نکال چکا تھا۔

میں جب اپنے گاؤں میں تھا تو میرے اندر خوب صورت چہرے اور صاف ستھرے کپڑوں والے سے کوئی نفرت نہیں جاگتی تھی بلکہ مجھے اس فرق کا پتا ہی نہیں تھا، لیکن یہاں آ کر میرے اندر عجیب و غریب سے احساسات پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے۔

اس آدمی نے مجھے نفرت سے گالی بھی دی تھی،.....اور کچھ لوگ مجھے دیکھ کر بے ساختہ پکارتے تھے معصوم سا بچہ، محنتی بچہ.....اب پتا نہیں میں کیا تھا کہ لیکن یہ سچ ہے وہاں سے ہی میری زندگی عجیب تضادات میں گھر گئی تھی۔

میں پتا نہیں کیا سوچتا رہتا، شاید قدبت کے ساتھ میرا ذہن بھی بڑا ہو رہا تھا یا پھر اس شہر کی ہواؤں نے مجھے سوالوں کی دنیا میں دھکیل دیا تھا لیکن یہ سچ ہے میرے اندر اب آتش فشاں دہکتا رہتا۔

انہی دونوں زندگی نے ایک اور کروٹ لی، چاچا بشیر کو بس کنڈکٹری مل گئی، ہم لوگ ریلوے لائن کی جھگی چھوڑ کر ایک کچی آبادی کے چھوٹے سے کوارٹر میں چلے آئے، ایک کمرا اور اس کے ساتھ چھوٹی سی گیلری، میں اول تو ہوٹل پر رہتا ورنہ جب کبھی ادھر جاتا تو اس گیلری میں پڑ کر سو جاتا۔

اندر سے مجھے کبھی چاچا بشیر اور شہزادی کے سرگوشیاں سنائی دیتیں۔

ادھر کی سب عورتیں بنگلوں پر جاتی ہیں کام کرنے تو بھی کسی سے بات کر لے ہمارا گزارا اچھا

ہو جائے گا۔ پھر کہیں کوئی ٹھکانہ اپنا کرنے کی سوچیں گے۔"

چاچا بشیر اس کو ایک رات مشورہ دے رہا تھا میرا خون کھول اٹھا۔

کیسا بے غیرت آدمی تھا۔

میں تو کرلوں پر پپو کا کیا کروں، کس کیپاس چھوڑوں۔" وہ مجبوری سے بولی۔

ارے اس کی فکر کیوں کرتی ہے، کبھی ساتھ لے جایا کر، کبھی گھر پر چھوڑ دے، میں بھی دیکھ لوں گا روز تو میری دیہاڑی لگتی نہیں۔"

وہ سب کچھ طے کیے بیٹھا تھا اور میرے اندر پھر سے الاؤ دہکنا شروع ہو گیا تھا، اس رات کی صبح بڑی مشکل سے ہوئی تھی۔

شہزادی جا کر جھوٹے برتن دھوئے اور امیروں کی میل صاف کرے یہ مجھے گوارا نہیں تھا میں نے صبح اٹھ کر ہوٹل جانے سے پہلے شہزادی کو جب چپکے چپکے روتے دیکھا تو اس کے قریب چلا آیا۔

تو فکر نہ کرو۔ میں دوں گا تجھے اور پیسے کوئی ضرورت نہیں کام وام کرنے کی، چپ کر کے ادھر پڑی رہ۔"

میں نے تو بڑے مان اور پیار سے کہا تھا پر وہ چاچا بشیر کی باندی تھی، میری ماں تو نہیں جو میری سنتی اور اس کی نہ مانتی۔

پھر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا، اگلے ہفتے میں آیا تو وہ گھر پر نہیں تھی اور چاچا بشیر پپو کے سامنے بیٹھ کر کش پر کش لے رہا تھا، پپو کے پاس دودھ کی خالی گندی بوتل پڑی تھی۔

ہوٹل کی زندگی نے مجھے ان کاموں کا ماہر تو کر ہی دیا تھا، پپو کی بوتل دھو کر دودھ لے کر آیا، اس کے کپڑے بدلوائے، دودھ پلایا اور پھر سلا دیا، چاچا بشیر تو خوش تھا لیکن میرا ضبط جواب دے گیا۔

اس دن میں اس سے بہت لڑا، اس نے مجھے گھر سے نکل جانے کی دھمکی دی اور شاید میں گھر سے

نکل بھی جاتا ہمیشہ کے لیے اس لمحے لیکن مجھے شہزادی کا انتظار تھا۔

لیکن شام گہری ہو جانے کے بعد بھی جب وہ نہ آئی تو میں گھر سے نکل گیا۔ میں بے سمت چل رہا تھا تب ہی مجھے سرگوشی سی محسوس ہوئی، ودو تین اچھے خاصے بڑے لڑکوں کا گروپ تھا۔

مجھے ان کی باتیں سمجھنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی، وہ لوگ کسی جگہ چوری کا پروگرام بنا رہے تھے۔

میں نے ان کی شکلیں دیکھنے کی کوشش کی مگر وہ خاصے اندھیرے میں تھے۔

ارے ایک ہی وار میں ساری مشکلیں آسان ہو جائیں گی، گھر بھی بن جائے گا، اور کاروبار بھی کرلیں گے، بینک میں بہت مال ہوتا ہے۔"

مجھے ان کی ساری باتوں میں ایک ہی بات دل پر لگی تھی، گھر بھی بن جائے گا۔"

خانہ بدوشوں کو تمام عمر گھر کی تلاش رہتی ہے نا اور اگر وہ گھر بنالیں تو پھر کہاں کے خانہ بدوش۔

میرا دل چاہا جا کر ان لڑکوں سے کہوں مجھے بھی اپنے ساتھ ملالو، میں دو قدم پیچھے پلٹا بھی شاید میں ان کی طرف پلٹ بھی جاتا لیکن ہمیشہ کی طرح اس دھندلکے راستے پر مجھے اپنی سست چال والی شہزادی نظر آ گئی، وہ گلی کی دوسری طرف سے آ رہی تھی۔

اس کے ہاتھ میں تھیلی نما کوئی چیز تھی، وہ میرے قریب پہنچی تو میں اس کے دامن پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔

باجی! میں نے تجھے منع کیا تھا نا تو نہیں جائے گی کام پر۔" میرا انداز ہٹ دھرمی والا تھا۔

میں نہیں جاؤں گی تو گزارا کیسے ہوگا، تیرے پیسے تو کرائے میں چلے جاتے ہیں۔"

وہ بہت تھکی ہوئی لگ رہی تھی، نڈھال، زندگی سے بے زار۔

ابھی میں چاچا بشیر کو آرام کرتے اور لمبی لمبی انگڑائیاں لیتے دیکھ کر آیا تھا مجھے پتا تھا جو کچھ وہ کھا پی چکا تھا اس کے بعد شہزادی کی کیا درگت بننے والی تھی۔

کاش میرا شعور وقت سے پہلے پروان نہ چڑھتا۔

میں نے خود پر، اپنے خیالات پر لعنت بھیجی اور شہزادی کو گالیاں دیتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

آئندہ سے تیرے گھر نہیں آؤں گا، مر گیا تیرے لیے، تجھے جو کرنا ہے کرتی رہ، تو میری باجی نہیں چاچا بشیر کی سگی ہے، چل جا اس کے پاس۔"

میں خاک اڑاتا ہوا آگے بڑھ گیا یہ سوچے بغیر کہ شہزادی کے دل پر کیا گزری ہوگی، یہ دیکھے بغیر کہ وہ وہاں گلی میں کھڑی ہو کر کتنی دیر روتی رہی۔

لیکن میں بھی کیا کرتا وہ میری ماں تھی، میں اس کی پامالی، اس کی ہتک برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

وہ بہت خوب صورت ماں تھی، بہت بھرپور ماں تھی، مجھے پتا تھا ساری نظریں بس اس کو دیکھتی اور گھورتی ہوں گی اور وہ خود سے جلتی کڑھتی ہوگی۔

اب تو بے بے بھی نہیں تھی جس پر دل کی بھڑاس نکالتی۔

آج تو میں بھی اس پر دل کی بھڑاس نکال آیا تھا اور اب چاچا بشیر کی بھڑاس اس پر نکلنی تھی۔

وہ رات مجھ پر بہت بھاری تھی، بلکہ اگلے کئی دن اور راتیں مجھ پر بھاری گزرے تھے، نہ مجھے شہزادی کی خبر تھی اور نہ میں اس سے ملنے جانا چاہتا تھا، میں نہیں چاہتا تھا کہ میں چاچا بشیر کا سر پھاڑ دوں، سو میں جبر کیے دن گزارتا رہا۔

جبر کی اولاد تھا اس لیے یہ ہنر مجھے بخوبی آتا تھا لیکن مجھے نہیں پتا تھا کہ ایک دن زندگی ایک اور بھیانک کروٹ بھی لے گی اور جبر کی اولاد کا مالک اس کے سر پر کھڑا ہوگا۔

وہ لمبا چوڑا، صاف ستھرا بے حد مضبوط جسامت والا شخص..... ہاں ہو بہو میرے جیسا، شہزادی کے ہمراہ میرے ہوٹل پر کھڑا تھا، اس کا چہرا، آنکھیں، بال رنگ سب کچھ ویسا تھا جیسا مجھے اپنا آئینے میں نظر آتا تھا۔

اور شہزادی کہہ رہی تھی، چل اٹھ سلام کر تو مجھ سے پوچھتا تھا نا تیرا باپ کون۔۔ دیکھ میں تیرے

باپ کو ڈھونڈ کر لے آئی۔"

ان دونوں کے درمیان کیا بات ہوئی تھی، میرا باپ، میری ماں کو کب اور کہاں ملا۔ اس نے کیا کہا اس نے کیا سنا، مجھے کچھ نہیں پتا، میرے تو اعصاب پر صرف شہزادی کا لہجہ اور اس کے لبوں سے نکلی تلخ حقیقت ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھی۔

احسانوں کی لمبی فہرست اور میرا سارا وجود ان میں جکڑا ہوا۔

شہزادی نے مجھے جنم دیا بہت تکلیفوں کے ساتھ۔

پالا پوسا، مفلسی اور تنگی حالت میں بھی۔

اچھا کھلایا پلایا۔

پیار دیا، مان دیا اور اب۔

وہ میرا باپ بھی ڈھونڈ لائی تھی۔

وہ میرا باپ ہی تھا کوئی بھی دیکھتا یہ ہی کہتا۔

اس شخص نے آگے بڑھ کر میرے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا، مجھے پیار سے دیکھا۔

میرے کپڑوں پر کراہیت بھری نظر ڈالی، شہزادی کو عجیب سی نظروں سے دیکھا اور مجھے لے کر ہوٹل کے برآمدے سے باہر آ گیا۔

چائے بھجوا دو کسی اور کے ہاتھ، اس بچے سے مجھے کوئی کام ہے۔" اس کا انداز ہی اتنا دبنگ تھا کہ کاؤنٹر پر بیٹھا مالک بھی سر ہلا کر رہ گیا۔

ویسے مجھے جب کوئی بچہ کہتا تھا تو ہنسی آتی تھی۔

اچھا خاصا آدمی نما بچہ تھا میں..... لیکن جانے کیوں اس اجنبی باپ کے منہ سے مجھے یہ لفظ اچھا لگا، مجھے لگا جیسے یہ شخص میرا تمسخر نہیں اڑا رہا۔

میں نے یہ نہیں چاہا تھا شہزادی، تم جانتی ہو۔" اس کا سر جھکا ہوا تھا اور شہزادی کی آنکھیں، میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

میں نے کچھ کہا۔ "مجھے پہلی بار شہزادی کوئی اور لگی، نہ وہ میری ماں تھی نہ اس وقت چاچا بشیر کی بیوی۔ وہ شاید اس لمحے عورت تھی بس عورت۔ جس کے دل کی دھڑکن، ہاتھوں کی لرزش سے محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اس شخص کے سامنے کھوئی کھوئی سی عورت تھی شہزادی نہیں۔

آپ بس ببلو کو ساتھ لے جاؤ، اسے اچھی زندگی دے دو، اسے پڑھاؤ، لکھاؤ، یہ آپ کا ہے، یہ آپ لوگوں جیسا ہے، یہ کبھی بھی اس گندی سڑی زندگی میں خوش نہیں رہا۔

میں جانتی ہوں نا، اس کو بات بات پر غصہ کیوں آتا ہے۔"

آج شہزادی کا لہجہ یکسر بدلا ہوا تھا۔

ہاں میں اس کو ساتھ لے جاؤں گا، اسے اب یہ سب نہیں کرنا، تم فکر نہیں کرو۔"

وہ تو جیسے سب کچھ سوچ کر آیا تھا۔

عجیب آدمی تھا کسی چیز سے انکاری نہیں تھا۔

یہ تو مجھے بعد میں مرتے دم اس شخص نے بتایا تھا کہ وہ شہزادی سے قربت کے مختصر سے لمحوں کی یاد کو زندگی بھر دل سے نہیں نکال پایا تھا۔

اگر اس کے بس میں ہوتا اور اس کے خاندانی رسم و رواج اجازت دیتے تو وہ شہزادی کو اپنے گھر لے آتا مگر بہت کوششوں کے بعد بھی جب ایسا نہ ہو سکا تو اس نے شہزادی کو دل میں بڑا خاص مقام دے کر چپ سادھ لی۔

س دن تو میں یکدم بھڑک اٹھا۔

نہیں مجھے کسی کے ساتھ نہیں جانا، بالکل نہیں، میں نہیں جانتا یہ کون ہے، میں اس کے ساتھ نہیں جاؤں گا، باجی سن لے تو ورنہ یہاں سے بھی کہیں چلا جاؤں گا۔"

میں غصے سے کہتے ہوئے پاؤں پٹخ کر اندر کی طرف بڑھ گیا تھا وہ دونوں وہیں بیٹھے رہ گئے تھے۔

اس دن تو میں نے انکار کر دیا تھا، بعد میں احتجاج بھی کیا، شہزادی کو واسطے بھی دیے مگر اس نے ایک نہ سنی۔ بہت سنگدل اور ظالم ہو گئی تھی وہ۔

تو چاہتا ہے نا میں کام نہ کروں، تو چاہتا ہے نا یہاں میری اپنی چھت ہو جس سے مجھے کوئی نہ نکالے، تو چاہتا ہے نا پپو کی زندگی اچھی گزر جائے تو پھر تو سن، تجھے جانا ہوگا اپنے باپ کے پاس، وہ تیری ضرورت ہے اور مجھے ان پیسوں کی جو وہ تیرے بدلے میں مجھے دے گا۔" وہ پھٹ پڑی تھی اور میں ششدر سا اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔

گویا میری ماں نے میرے باپ سے میرا سودا طے کر دیا تھا۔

کیا تھی یہ زندگی اور کیوں تھی زندگی۔

بس ایک لمحے کی سوچ تھی، ایک لمحے کا ادراک تھا.....

یہ زندگی اسی لیے تھی کہ میں شہزادی کے احسانوں کا قرض اتار سکوں یہ زندگی اس لیے تھی میں شہزادی کی اس تکلیف کا بدلہ چکا سکوں جو اس نے تخلیق سے لے کر آج تک میرے لیے اٹھائی۔

بس پھر وہ ایک لمحے کا ادراک میری پوری زندگی پر حاوی ہو گیا، میں بھول گیا شہزادی سے محبت کو، اس کے سینے سے لگ کر رونے کی خواہش کو، اس کے ساتھ چھوٹے بڑے دکھ سکھ ایک کرنے کی طلب کو۔

مجھے بس اتنا یاد رہا کہ میں اپنے باپ کے ساتھ چلا گیا تو شہزادی کے بہت سارے کام آسان ہو جائیں گے۔ اس کی زندگی سنور جائیگی۔ اس کو لوگوں کا جھوٹا اور میل صاف نہیں کرنا پڑے گا، اس کو وہ اذیت نہیں سہنی پڑے گی جس۔۔۔ سے میں بار بار گزرتا ہوں۔

اور پھر اس دن ببلو مر گیا۔ محمد عظیم شاہ پیدا ہو گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

تائی کی زندگی میں صف ماتم بچھ گئی تھی، نعمان، نعمان کا باپ دونوں ہی سلاخوں کے پیچھے تھے، ایک پر چوری کا الزام تھا، ایک برائے اغوا برائے تاوان کا اور تاوان بھی کس کا۔ انہوں نے بے یقینی سے سفیر کو دیکھا۔

نہیں تیرا باپ جھگڑالو ہے، فسادی ہے، عیاش ہے..... لیکن یہ حرکت نہیں کر سکتا، نہیں میرا دل نہیں مانتا، وہ راحت بیگم کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتا، مجھے پورا یقین ہے اسے کسی نے سازش میں پھنسا دیا ہے۔"

تائی کا لہجہ یقین سے بھرپور تھا، فہیم شاہ نے بھی انہیں حیرت سے دیکھا، اس وقت تو گھر کا ہر فرد ہی ورطہ حیرت میں تھا۔

یکے بعد دیگرے مصیبتیں۔

شادی شدہ بیٹیوں کی زندگی بھی عذاب میں گھر گئی تھی، ابھی سعدیہ کا زخم مندمل نہیں ہوا تھا، گھوم پھر کر اس کا طعنہ بھی مل ہی جاتا، اب یہ نئی آزمائش، یوں لگتا تھا زندگی نے ہر امتحان کے لیے اسی گھر کا پتا معلوم کر لیا تھا۔

ندیم شاہ کی موت کے بعد، راحت بیگم کے اس گھر سے چلے جانے کے بعد پھر اس گھر میں کوئی خوشی نہیں جاگی تھی کوئی سکھ کی مکمل گھڑی نہ آئی تھی۔

اب بتائیں کرنا کیا ہے، راحت چاچی گھر آ گئی ہیں، میں کسی وکیل سے بات کرتا ہوں، لیکن فہیم چاچا آپ کو پتا ہے نا وہ لوگ کتنے اثر ورسوخ والے لوگ ہیں، ہم ان کا مقابلہ کیسے کریں گے۔"

لیکن ہم یہ سوچ کر خاموش تو نہیں بیٹھ سکتے، پھر یہ سچ ہے کہ بھائی صاحب کو شبہے میں پکڑا گیا ہے۔"

ارے شبہے میں پڑ کر انہوں نے کیس بھی بنا دیا۔" تائی نے دو ہتڑ مارے۔

بھاوج آپ خاموش رہو تھوڑی دیر، ہمیں سوچنے دو کیا کرنا ہے، ادھر نعمان کی بھی مشکل ہے، اس وقت پائی پائی کی محتاجی چل رہی ہے اور یہاں کوئی کام پیسوں کے بغیر نہیں ہو سکتا۔

ہزار بار سمجھایا تھا بھائی صاحب کو مت پنگے لو اس خاندان سے، ندیم مر گیا قصہ ختم ہو گیا، پہلے اس کی بیٹی کو لا بٹھایا، کل اگر وہ اس گھر کی ملکیت کا دعوا کر دے تو ہم سب سڑک پر آ جائیں گے۔

یاد ہے نا یہ گھر ندیم شاہ نے پیسے دے کر چھڑوایا تھا ورنہ بھائی صاحب تو گروی رکھ آئے تھے۔"

فہیم شاہ نے ایک اور کڑوا سچ یاد دلایا تھا، سب کی زبان اور چہرے پر تلخی سی بھر آئی، اس گھر کی ہر ریت انوکھی تھی ہر قصے کے پیچھے کوئی نئی اور انوکھی کہانی ہی نکلتی تھی اور فہیم شاہ کا خیال تھا یہ سب عظیم شاہ کے سبب ہے کیونکہ وہ جب سے اس گھر میں ان کا شراکت دار بن کر آیا تھا تب سے زندگی مشکل میں آ گئی تھی۔

وہ سوچوں کے تانے بانے کے ساتھ بہت دور نکل گئے تھے تب سفیر کی آواز پر واپس آنا پڑا۔

فہیم چاچا آپ میرے ساتھ چل رہے ہیں نا..... میرا ایک دوست ہے اس کے ابا اچھے بڑے وکیل ہیں، ادھر جوڑیا بازار کے پاس ہی ان کا اپنا دفتر ہے، ابا کو بھی جانتے ہیں، میرے خیال میں ان سے مشورہ کرتے ہیں۔"

ٹھیک ہے چلتے ہیں، مگر میں سب کو بتا دوں بغیر پیسوں کے کچھ نہیں ہو گا۔" وہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں کہہ رہے تھے، تائی کا سر جھک گیا، زیور نام کی کوئی چیز ہوتی تو وہ سوچتیں بھی کہ پیسے کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔

لیکن یہاں پر کھایا، پیا، پہنا، اوڑھا اور ختم۔

شروع سے ہی سارا دوش مقدر کو دے کر بری الذمہ ہونے کی عادت بھی کمال کی تھی۔

سفیر اور فہیم شاہ اٹھ کر چلے گئے تھے اور وہ نڈھال سی ایک طرف سر گرا کر پڑ گئی تھیں۔

سرمد بخاری اسلام آباد پہنچتے ہی پہلی فرصت میں اس کے پاس پہنچا تھا، وہ کتنا ہی برے کردار کا انسان سہی مگر دوستی یاری نبھانے میں کسی پس و پیش سے کام نہیں لیتا تھا۔

یہ کیا حالت بنا لی ہے تم نے۔" وہ اس کے ساتھ ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں آ گیا تھا جہاں اس

وقت لوگ بھی کم تھے اور ماحول بھی پر سکون۔

تم میری فکر مت کرو۔ میری حالت کے ذمے دار تم بھی ہو۔" وہ نروٹھے لہجے میں بولی۔

کیا ہو گیا ہے شمائلہ..... یہ کون سی ضد باندھ رکھی ہے تم نے اپنے ساتھ، چہرہ دیکھو..... کیا منیر باسٹرڈ نے کچھ کہا ہے تم سے۔" سرمد بخاری واقعتاً اس کے لیے فکر مند تھا۔

نہیں، منیر میں اتنی ہمت نہیں..... یہ میں نے اپنے ساتھ خود ہی کیا ہے۔" دھانی رنگ کے اوور کوٹ میں سمٹے ہوئے بالوں کے ساتھ اس کا چہرہ اندر باہر کی ساری کہانیاں کہہ رہا تھا، اس کی غلافی آنکھوں میں کوئی الاؤ دہک رہا تھا جس کی آنچ سرمد بخاری تک بھی پہنچ رہی تھی۔

وہ بہت دنوں سے تنہا تھی، بہت دنوں سے سرمد بخاری نے اسے اپنے ہونے کا احساس نہیں دلایا تھا، بہت دنوں سے انہوں نے ایک دوسرے کی ہمراہی میں وقت نہیں گزارا تھا، سرمد بخاری کو اپنی کوتاہی کا احساس ہونے لگا۔

اس نے اس کے یخ ہاتھ اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیے۔

پاگل۔ جانتی ہو نا اس وقت ہم کس قدر مشکل میں ہیں، ساری ایجنسیاں حرکت میں آئی ہوئی ہیں، مجھے تمہاری فکر نہ ہوتی تو میں اب تک جا چکا ہوتا اور میں تم سے بھی بار بار کہہ رہا ہوں۔ نکل چلو، منیر کتے کو ہوا بھی مت لگنے دو، خود ہی بھگتے گا۔"

نہیں سرمد..... میں عاشر سے دور نہیں جا سکتی، ایٹ لیسٹ مجھے اس کی شکل تو نظر آ جاتی ہے کبھی کبھار، میں اپنی ماں سے ملنے جانا چاہتی ہوں معافی مانگنا چاہتی ہوں۔

وہ معافی جو منیر کمال نے آج تک مجھے نہیں مانگنے دی، آج تک وہ لفظ میرے دل پر بوجھ بنے ہوئے ہیں۔" شمائلہ کی آنکھیں چھلک اٹھی تھیں۔

بالکل احمق ہو، یہ جذباتی باتیں تم پر سوٹ نہیں کرتیں۔ تم شمائلہ کمال ہو..... شمائلہ آدھی دنیا تمہارے

اشارے پر جان لٹانے کو تیار ہے مجھ سمیت.....وہ اس کا رنج کم کرنے کے لیے شرارت سے مسکرایا۔

نہیں.....اب کوئی شمائلہ کمال کی نہیں سنتا، تم بھی پرائے ہو گئے ہو۔"

بس مصروف تھا لیکن اپنی جان من سے ایک پل کے لیے بھی غافل نہیں ہوا۔ وہ پورے جذب سے بولا، اسے یقین تھا تھوڑی دیر کے بعد شمائلہ سب بھول کر اس کی باتوں پر مسکرا رہی ہوگی۔"

اچھا یہ بتاؤ، عاشر کے معاملے میں کوئی پروگریس ہوئی۔" اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

نہیں وہ کچھ سننے پر آمادہ نہیں، کچھ ماننے پر راضی نہیں، بہت بدل گیا ہے، طارق نے پتا نہیں اسے کیا سکھایا ہے، اس کی نظر میں سارے گناہ میرے ہیں، بہت نفرت سے بات کرتا ہے۔

ڈونٹ وری، وقت کے ساتھ ٹھیک ہو جائے گا، غصہ تو کرے گا نا، بہت چھوٹا تھا جب تم نے اس کو چھوڑ دیا تھا۔" وہ اس کا ہاتھ تھپکتے ہوئے پیار سے بولا۔

سرمد! طارق ہسپتال میں ہے، ان فیکٹ کوما میں ہے اور تمہیں پتا ہے اس کا منیر کی گاڑی سے ایکسیڈنٹ ہوا ہے اور تمہیں پتا ہے....."

اس نے ذرا توقف کیا اور پھر اس کے بعد ایک نئی کہانی سرمد کے گوش گزار کرنا شروع کی۔

ہسپتال میں خولہ، کشمالہ سے ملنے سے لے کر منیر کی جڑواں بیٹیوں کی کہانی تک۔

اور کاشف کیانی کی دھمکی سے ناصر ہمدانی کی کمرے میں آمد تک۔

اوہ گاڈ۔ شمائلہ جو بھی ہو رہا ہے ٹھیک نہیں ہو رہا۔"

سرمد بخاری سر پکڑ کر بیٹھ گیا تھا۔

تم نے یہ سب کچھ مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا، اتنا کچھ ہوتا رہا اور میں بے خبر۔" اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔

منیر کمال کی یا پھر راجہ طارق محمود کی جڑواں بیٹیوں میں اس کی دلچسپی مفقود تھی لیکن کاشف کیانی کا

انداز اور ناصر ہمدانی کی آمد خطرے سے خالی نہیں تھی۔

شمائلہ مجھے تم سے اتنی حماقت کی توقع نہیں تھی، تمہیں یاد ہے میں نے کہا تھا یہاں آ کر تمہیں احتیاط سے کام لینا ہوگا، لیکن تم نے عجیب وغریب مسئلے پال لیے۔

اب مجھے یہ بتاؤ تم کب تک یہاں قیام کرو گی، میں کم از کم رسک نہیں لے سکتا۔" وہ قطعیت سے بولا۔

شمائلہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی اور پھر بڑے تحمل سے بولی۔

دیکھو سرمد! میں نے ایک بار عاشر کو کھویا ہے میں اسے دوبارہ نہیں کھونا چاہتی، وہ مجھ سے ناراض ہے میں اسے منالوں گی، تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دو، مجھے کچھ نہیں ہوگا لیکن منیر کمال کا بہت برا انجام مجھے نظر آ رہا ہے۔

اگر طارق ہوش میں آ گیا تو اس کی خیر نہیں۔" وہ بڑے رسان سے بولی، سرمد بخاری ماحول کی پروا کیے بغیر اس پر برس پڑا۔

تم پاگل ہوگئی ہو، میں اب تمہیں اس طرح چھوڑ کر نہیں جا سکتا..... تمہیں میرے ساتھ واپس چلنا ہوگا۔ منیر کے ساتھ کیا ہوتا ہے کیا نہیں یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔"

اس کے چہرے پر غصے کی سرخی شمائلہ کو بہت بھلی لگ رہی تھی، بہت دنوں بعد حبس آلود فضا میں تازہ ہوا چل رہی تھی، وہ اچھی طرح جانتی تھی اس کے اور سرمد کے درمیان کاروبار کے علاوہ جو بھی رشتہ ہے وہ بڑا بے غرض اور پائیدار ہے۔

اچھے لگ رہے ہو، اپنے اپنے سے، بہت دنوں سے کھو گئے تھے نا۔" وہ اس کا ہاتھ نرمی سے دبا کر بولی۔ میں اس وقت بہت سیریس ہوں، کسی مذاق کے موڈ میں بالکل نہیں۔" اس کی برہمی برقرار تھی۔

میں کب مذاق کر رہی ہوں، سچ ہی تو کہہ رہی ہوں۔"

پھر تیاری پکڑو..... ہوسکتا ہے رات کی فلائٹ سے ہم لوگ نکل جائیں۔" اس نے فیصلہ سنا دیا تھا۔

اس سے پہلے کہ شمائلہ حیل و حجت کو طول دیتی سرمد کا فون بجنے لگا اس نے شمائلہ کو گھورتے ہوئے سیل فون کان سے لگایا۔

ہاں بولو....." اس کے انداز میں عجلت تھی۔

کیا..... کیا بکواس کر رہے ہو..... میں سب کچھ تمہارے حوالے کر کے آیا تھا اور ابھی مجھے آئے ہوئے چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے۔

سرمد بخاری کے ماتھے پر شکنیں گہری ہو گئیں، آنکھوں میں وحشت کی سرخی ناچنے لگی۔ کوئی بڑا واقعہ ہو گیا تھا یقیناً۔

شمائلہ کا دل بھی تیزی سے دھڑکنے لگا۔

سب باسٹرڈ ہیں، ایک ایک کو دیکھ لوں گا، کس نے ہمت کی ہے سرمد کے فارم ہاؤس پر ہاتھ ڈالنے کی۔"

وہ مارے غصے کے کھڑا ہو گیا تھا اور شمائلہ کو بھی چلنے کا اشارہ کیا تھا۔

شمائلہ کو کسی حد تک کہانی سمجھ میں آ گئی تھی اس لیے الجھن اس کے چہرے پر بھی در آئی تھی۔

کمرے میں پہنچ کر اس نے فون بیڈ پر پٹخ دیا تھا اور پانی کی بوتل غٹا غٹ چڑھالی تھی۔

مجھے نہیں بتاؤ گے۔" شمائلہ نے پانی کی خالی بوتل اس کے ہاتھ سے لے کر سائیڈ ٹیبل پر رکھی۔

کیا بتاؤں، شمائلہ بہت برا ہوا جو بھی ہوا، پولیس کس طرح فارم ہاؤس تک پہنچی اور کیوں پہنچی کچھ نہیں سمجھ میں آ رہا، سعدیہ کے ساتھ سارے لوگ اریسٹ ہو گئے ہیں۔"

وہ اس غیر متوقع صورت حال پر انتہائی صدمے میں تھا۔ شمائلہ کو تو یقین ہی نہیں آیا تھا۔"

ایسا کیسے ہوسکتا ہے سرمد..... نہیں مجھے یقین نہیں آ رہا۔" اسے اپنی آواز اجنبی لگی تھی۔

ایسا ہو چکا ہے شمائلہ اور یہ اس وقت نہیں ہونا چاہیے تھا، سالی سعدیہ بھی پولیس کے ہاتھ لگ گئی۔

"اس نیا پنے ہاتھ پر ہاتھ مسلا۔

میں نے تمہیں پہلے ہی کہا تھا وہ لڑکی کوئی مشکل ضرور کھڑی کرے گی۔" شمائلہ نے سلگ کر کہا۔

ہاں، جس طرح تم مشکل کھڑی کرنے جا رہی ہو، کیا تم میری بات سن رہی ہو۔" وہ زچ ہو گیا تھا شدید الجھن اس کے چہرے سے ہویدا تھی، شمائلہ نے پہلی بار اس کو اتنا پریشان دیکھا تھا ورنہ وہ اس طرح کے حالات میں گھبرانے کے بجائے محظوظ ہوتا تھا لیکن اس وقت اس کی کیفیت مختلف تھی۔

شمائلہ اپنی پریشانی بھول کر اس کی دلجوئی میں لگ گئی۔

☆.....☆.....☆

راحت جبیں کا بہت خوبصورت نیا ناول

زندگی ہم تجھے گزاریں گے

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

ندا حسنین کا بہت خوبصورت نیا ناول

قربت ہجر میں محبت

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

ہسپتال کے ٹھنڈے یخ بستہ ماحول جہاں اب سے چند گھنٹے پہلے صرف سناٹا تھا، خاموشی تھی اور بے بسی کا گھٹتا بڑھتا احساس تھا وہاں اس وقت کاشف اور خولہ کی نوک جھوک نے عاشر کے چہرے پر اطمینان کے رنگ بکھیرے ہوئے تھے۔

راجہ طارق محمود کو تھوڑی دیر کے لیے شعوری بے داری ملی تھی، اس کے بعد وہ پھر مسکن دواؤں کے زیر اثر چلے گئے تھے، کشمالہ ان کے پاس تھی اور وہ تینوں باہر لابی میں اپنی مخصوص جگہ پر آ گئے تھے۔

ڈاکٹر نے اس بار طارق محمود کی طرف سے اطمینان کا اظہار کیا تھا۔

سکتے کی کیفیت ٹوٹ چکی ہے، بہت جلدی ان کی ذہنی اور جذباتی بے داری کا عمل شروع ہو جائے گا بس آپ لوگ صبر اور حوصلے کے ساتھ ہمارے ساتھ تعاون کریں گے، اب فکر کی کوئی بات نہیں۔" ڈاکٹر غیور نے ہمیشہ کی طرح عاشر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی تھی پیشہ وارانہ الفاظ میں اپنائیت کے ساتھ۔

اس لمحے بھی کشمالہ کی نظریں اس کے چہرے پر دلی خوشی کا عکس تلاش کر رہی تھیں مگر وہاں ہمیشہ کی طرح خوشی کا رنگ سات پردوں میں چھپا ہوا تھا۔ بس آج آنکھوں کے آگے کوئی پردہ نہیں تھا۔

روئی روئی سوجی ہوئی سرخ آنکھیں کشمالہ کی زندگی بن گئی تھیں۔

اسے یقین ہی نہیں آتا تھا سب کچھ جانتے بوجھتے یہ شخص اب اس کی طرف اذیت سے نہیں اپنائیت سے دیکھتا ہے۔ اس کی ایک نگاہ جلے ہوئے صحرا میں اس جھرنے کی مانند تھی جس نے کشمالہ کو مقدر کے بدلنے کی نوید دی تھی۔

وہ دراجہ طارق محمود کے ہاتھ پر ہاتھ رکھے کبھی عاشر تو کبھی شمائلہ کمال اور کبھی منیر کمال کو سوچنے لگتی۔

کیا وہ شخص تمام عمر زندگی کے مزے لیتا رہے گا۔

کیا اس نے جو کیا۔ پاپا کے ساتھ، ماما کے ساتھ، ہمارے ساتھ۔ عاشر کے ساتھ۔ کیا اسے کوئی

سزا نہیں ملے گی؟" وہ اپنے رب سے چھوٹے چھوٹے شکوے کرنے لگی تھی۔

پاپا کو جلدی ٹھیک کر دیں بس آپ۔ یا اللہ۔ بس مجھیا پنے پاپا کی زندگی چاہیے باقی جو آپ کو منظور۔"

وہ اپنی ہی سوچوں میں مگن تھی تب ہی دروازے پر آہٹ ہوئی، دستک دے کر اندر آنے والا شاید کوئی اجنبی تھا، کشمالہ نے پلٹ کر دیکھا۔

شمائلہ کمال....." وہ بل کھا کر اٹھی تھی۔

آپ یہاں....." اس کے منہ سے بیساختہ نکلا۔

کیوں میں یہاں کیوں نہیں آسکتی، رشتہ دار ہے طارق میرا، میرے بیٹے کا باپ ہے اور پھر تم لوگوں کے حوالے سے بھی بڑا گہرا رشتہ بنتا ہے۔"

ٹھنڈے ٹھار مگر بہت کچھ جتانے والے لب و لہجے میں اس نے گفتگو کا آغاز اس طرح کیا تھا جیسے کسی ڈرامے یا فلم کی عکس بندی کا آغاز ہو گیا ہو۔

پلیز آپ باہر چلیے یہاں پاپا ڈسٹرب ہوں گے۔"

کشمالہ نے اسے بڑے تحمل کے ساتھ دروازے کی راہ دکھائی اور خود بھی قدم بڑھائے۔

ہاں ٹھیک ہے باہر ہی چل کر بات کرتے ہیں، ویسے بھی میں تم سے بات کرنے آئی ہوں۔"

سفید رنگ کے جدید سوٹ اور ہاتھ میں نفیس سا پرس تھامے شمائلہ کمال کے انداز و اطوار کا طنطنہ اب بھی وہی تھا بس اس کے چہرے کی بشاشت اس کے ساتھ نہیں تھی اور نہ ہی آنکھوں میں کوئی شادابی تھی۔ کشمالہ نے بغور اسے دیکھا۔

ذہن و دل عاشر کے کہے ہوئے الفاظ میں الجھ گئے۔

اسے لگا جیسے اس اندھیری رات کا منظر آنکھوں کے پردے پر مجسم ہو کر آ گیا ہو۔ اس عورت کے

غرور اور تکبر میں ذرہ برابر فرق نہ آیا تھا اور اس غرور و تکبر نے کتنے گھروں کی خوشیاں آسیب زدہ کر دی تھیں۔

کشمالہ اس کے ساتھ ہی باہر آ گئی، آئی سی یو کے باہر ایک چھوٹے سے کمرے سے ملحق کامن روم میں اتفاق سے اس وقت کوئی نہیں تھا، وہاں عموماً" مریضوں کے عزیز ہی بیٹھا کرتے تھے۔ کشمالہ کو وہ جگہ غنیمت محسوس ہوئی تھی۔

دیکھیں آپ نے جو کہنا ہے، جلدی کہیں پاپا اکیلے ہیں، وہ کسی بھی وقت ہوش میں آ سکتے ہیں۔"

کشمالہ کیوں اس سے مرعوب ہوتی، وہ شکر کر رہی تھی چہرے پر نفرت اور بے زاری نہیں آئی تھی ورنہ شمائلہ کو پھر سے دورہ پڑتا جیسے ایک دفعہ پہلے.....

کشمالہ کو لابی کا منظر یاد آ گیا جب..... کاشف نے ٹھیک ہی کہا تھا، آپ جیسے لوگوں کو بڑے لوگوں کے ساتھ جڑنے کا، دوستیاں کر کے کام نکلوانے کا شوق ہوتا ہے۔"

میں تم دونوں کی ماں کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں، کیا طارق نے تمہاری ماں سے شادی کی تھی۔"

شمائلہ کمال کی زبان نیزے کی انی کی طرح کشمالہ کو چبھتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ اسے بہت سارے دیگر سوالوں کی توقع تھی مگر یہ سوال۔

ہاں ایسا کوئی بھی سوال شمائلہ کمال ہی کر سکتی ہے۔ کشمالہ نے ایک لمحے کے لیے شیشے کے کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے روحانی طاقت اپنے اندر منتقل ہوتے محسوس کی۔

میں آپ کو کسی بھی سوال کا جواب دینے کی پابند نہیں۔" اس نے رکھائی سے کہا۔

نہیں تمہیں میرے ہر سال کا جواب دینا ہوگا، کیونکہ تمہاری ماں نے میری زندگی برباد کی ہے میں جاننا چاہتی ہوں، وہ عورت کون تھی جس نے میرے حق پر ڈاکا ڈالا اور میرا طارق مجھ سے چھین لیا۔"

شمائلہ کمال کی آنکھوں میں بلا کی یاسیت ابھر آئی، کشمالہ کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

آپ کا دماغ خراب ہو گیا ہے محترمہ، میں پتا نہیں کیوں آپ کا لحاظ کر رہی ہوں لیکن پلیز آپ

چلی جایئے،۔آپ کی یہ باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔"وہ یکدم لال بھبھوکا ہوگئی تھی۔

اس کی نیلی آنکھوں میں پانی چمکنے لگا تھا۔شمائلہ کو اپنے اندر سکون سا اترتا محسوس ہونے لگا۔

نہیں تمہیں میری بات کا جواب دینا ہوگا۔پہلے میری زندگی اور اب میرے بیٹے کی زندگی کے پیچھے پڑ گئی ہو تم لوگ۔"

اس نے ایک اور تیر پھینکا۔

جسٹ شٹ اپ۔شمائلہ کمال۔جسٹ شٹ یور ماؤتھ....."وہ چیخ ہی تو پڑی تھی،اس کی تیز آواز دروازے کی طرف مڑتے عاشر کے کانوں میں پڑی وہ آئی سی یو کی طرف جاتے ہوئے ادھر آ گیا۔

سامنے کا منظر حیران کن ہی نہیں اعصاب شکن بھی تھا۔

اگر آپ عاشر کی ماں نہ ہوتیں تو میں آپ کی ساری باتوں کا جواب دیتی،لیکن آپ کی بہتری اسی میں ہے آپ یہاں سے چلی جایئے اور آئندہ میری پاکیزہ ماں کا نام اپنی زبان پر مت لایئے گا۔

اس جیسی عورت عزت کے لیے خواہشوں کو مار دیتی ہے۔اس کا نام لینے سے پہلے سو بار سوچنا....."

عاشر کو وہ کوئی اور ہی لڑکی نظر آ رہی تھی،کسی بپھرے ہوئے سیلاب کی مانند.....وہ یکدم سامنے آ گیا،یہ سیلاب روکنا تھا ورنہ بہت کچھ بہا کر لے جاتا۔

مالا....."اس نے بڑے استحقاق سے پکارا تھا،وہ تو ٹھٹکی ہی تھی،شمائلہ کمال کے چہرے کا رنگ بھی بدل گیا۔

☆.....☆.....☆

وہ دونوں عاشر کو کشمالہ کے پاس بھیج کر گاڑی کی طرف آ گئے تھے۔

"میں نانو سے وعدہ کر کے آیا ہوں جلدی آؤں گا اور سوپ بناؤں گا۔" کاشف نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اطلاع دی تو خولہ مسکرا دی،آج بہت دنوں کے بعد سب کا موڈ خوشگوار ہو چلا تھا۔

لیکن مجھے تم اس شہر کا بیسٹ پزا کھلانے والے ہو۔ شدید بھوک لگی ہے صبح سے سینڈوچز پر گذارا ہو رہا ہے۔"

اس نے ہاتھ سے بال سنوارتے ہوئے بیگ پچھلی نشست پر رکھا اور ریلیکس ہو کر بیٹھ گئی۔

اوکے باس..... اس شہر کا بہترین پزا۔" اس نے سوچنے والے انداز میں کہتے ہوئے یوٹرن لے لیا۔

کاشف! پاپا جلدی ٹھیک ہو جائیں گے نا۔"

میرا یقین ہے وہ بہت جلدی ٹھیک ہو جائیں گے، پتا ہے راجہ صاحب کو زندگی سے پیار ہے اور جو لوگ اس نعمت کی قدر کرتے ہیں اللہ ان کو آزمائش میں سرخرو کرتا رہتا ہے۔" کاشف نے سنجیدگی سے کہا تو خولہ کے چہرے پر طمانیت کے رنگ پھیل گئے۔

بہت گہری باتیں کرتے ہو کبھی کبھی کاشف!"

میں بہت گہرا انسان بھی ہوں، ڈوبنے کا ارادہ تو کرو۔" وہ یکدم شرارت پر اتر آیا تھا۔

لاحول ولاقوۃ میرا کسی کنویں میں چھلانگ لگانے کا کوئی ارادہ نہیں۔"

سوچ لو..... دوسری طرف کھائی ہے۔"

کیا مطلب..... کھائی۔" وہ چونکی۔

ارے وہی اجنبی سپر فین۔"

کتنی بکواس کرتے ہو تم..... اس وقت اس کا کیا ذکر..... کاشف تم بھی نا..... پورے پاگل ہو۔"

اسی لیے تم سے پوچھا تھا..... شادی کرو گی اس پاگل سے اور وہ ابھی تک جواب کا منتظر ہے، دو دن بعد پاپا آنے والے ہیں، جلدی سے بتا دو۔ ان سے بات کرنی ہے بلکہ ملوانا ہے تمہیں۔"

گاڑی ایک پزا ہٹ کی پارکنگ میں رک چکی تھی، کاشف از حد سنجیدہ تھا اور خولہ حیرت و پریشانی سے اس کی شکل دیکھ رہی تھی جہاں زندگی کے سب سے اہم فیصلے کی باتیں ایسے ہو رہی تھیں جیسے پزا

کھانے کے لیے جانے کا پروگرام طے ہو رہا ہے۔

کاشف آر یو سیریس....."خولہ نے پوری طرح اس کی طرف گھوم کر پوچھا تھا۔

ارے تو کیا میں اس طرح کی باتیں تم سے مذاق میں کروں گا پاگل لڑکی۔

میں ایسا ہی ہوں، مجھ سے نہیں تمہید باندھی جاتی، مجھے تم اچھی لگتی ہو ان فیکٹ پیاری سی ڈول لگتی ہو، اب اگر کوئی اچھا پیارا لگے تو اس سے یہ ہی پوچھتے ہیں نا کہ شادی کرو گی مجھ سے۔"

اس کے چہرے پر بڑے مختلف رنگ تھے اور آنکھیں عجیب سی شرارت سمیٹے ہوئے بہت انوکھی سی لگ رہی تھیں۔

بالکل فضول بکواس کرتے ہو تم..... شکل دیکھو اپنی، صاف لکھا ہوا ہے جوکر....." وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر ہنس پڑی تھی بے ساختہ۔۔

گڈ..... اب میں جوکر ہو گیا۔ واہ رے باربی ڈول۔" وہ اس کی ہنسی سے محظوظ ہوتے ہوئے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا تھا۔

خولہ نے بھی اس کی تقلید کی..... دونوں کے چہرے پر ہنسی اور شرارت کے رنگ بخوبی محسوس ہو رہے تھے۔

چلیے مادام..... آپ زندگی بھر سنجیدہ نہیں ہو سکتیں اور میں۔۔"۔ مایوسی سے سر ہلایا۔

مجھے لگتا ہے میں کنوارہ ہی مر جاؤں گا۔" از حد مایوسی کے ساتھ کہا گیا خولہ پھر ہنسی تھی تب ہی پاس سے گزرنے والے اجنبی نے ذرا سا مڑ کر دیکھا وہ کاشف کی بات سن چکا تھا اور خولہ کی ہنسی پر پلٹنے پر مجبور ہوا تھا وہ دونوں ایک دوسرے کی سنگت میں بہت مطمئن اور مسرور نظر آ رہے تھے، خزیمہ عاول کے دل میں چھن سے کوئی احساس ٹوٹ کر بکھر گیا۔ خواہشوں کے بکھر جانے کی کرچیاں ادھر سے ادھر ہو رہی تھیں اور وہ خولہ کو دیکھ رہا تھا جس کی نظریں کاشف سے ہوتی ہوئی اس پر آن رکی تھیں۔

☆.....☆.....☆

اس سے ملنے کے تھے کتنے امکاں وقت سے پہلے
کتنے ارماں رہ جاتے ہیں، ارماں وقت سے پہلے
اس کی چاہت میرے دل میں ایسے آن بسی
جیسے خالی گھر میں کوئی مہماں وقت سے پہلے

رات کا جانے کون سا پہر تھا وہ تو بس ساکت و جامد اپنے بستر پر لیٹا رگوں کو توانائی دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

''خزیمہ عادل تیرا بھی جواب نہیں۔'' کسی نے بڑی بے رحمی سے پکارا۔

''تو ایسے سوگ منا رہا ہے، اس طرح جوک لے کر بیٹھا ہے جیسے اس نے ساتھ نبھانے، زندگی گزارنے کے وعدے تجھ سے ہی کیے تھے نا۔

ارے پاگل ہو گیا ہے تو۔ جن خواہشوں کے گلاب تیرے اندر کھل رہے تھے، ان کی خوشبو بھی اس تک نہیں پہنچی تھی اور تو سوچ رہا ہے اس نے تیرے گلاب مسل دیے۔ بہت ہی بے وقوف ہے۔"

اس نے اس تکرار سے عاجز آ کر اپنا سر ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔

لیکن میں کیا کروں دل کے ہاتھوں بہت مجبور ہوں، مجھے نہیں پتا کون سا جذبہ، کون سا رشتہ مجھے اس کی طرف کھینچتا ہے، لیکن میں اسے خود سے الگ کرنے کا سوچتا ہوں تو سانس الجھنے لگتی ہے۔"

اس کے اندر کوئی بہت زور سے چیخا تھا۔

کون سا جذبہ، کون سا رشتہ، کون سا احساس۔ وہ تیری کیا لگتی ہے، صرف تو نے اس کو سنا ہے، دیکھا ہے اور بس....."

ہاں میں نے جب اسے سنا تھا تب سے لے کر آج تک وہ مجھے خود سے الگ نہیں لگی۔ میں نے

اسے پل پل اپنی زندگی کا، اپنے خوابوں کا حصہ محسوس کیا ہے، وہ میری Soulmate ہے اور جب دو روحیں رشتہ جوڑ لیں تو پھر انہیں مجسم ملنے یا نہ ملنے کا جواز نہیں رہتا۔

ایک سے بڑھ کر ایک تاویل تھی خود کو قائل کرنے کی، مگر ذہن کی دیواروں سے بار بار جو منظر ٹکرا رہا تھا وہ ہر تاویل پر پانی پھیر دیتا تھا۔

وہ جو اس کی زندگی تھی، اسے زندگی جیسی لگتی تھی، کسی بہت اپنے کے ساتھ خوش و خرم گاڑی کے ساتھ اتری تھی۔

اس کی نظروں میں کاشف کیانی اور خولہ کمال کی مسکراہٹ ثبت ہو گئی تھی۔

اس نے اسے دیکھا تھا اور نظر انداز بھی نہیں کیا تھا، بلکہ وہ چونک کر کاشف کی طرف مڑی تھی اور اس کے قریب آ کر کوئی سرگوشی کی تھی، جس پر اس کی نگاہوں نے بھی خزیمہ کا تعاقب کیا تھا۔

خزیمہ کو یقین ہو گیا تھا، اس لمحے تذکرہ اس کا تھا۔

پھر وہ اجنبی بن کر پاس سے نہیں گذری تھی۔ بڑے تحمل کے ساتھ پاس آ کر مسکرائی۔

ہائے..... ہاؤ آر یو....."۔ بالکل انگلش میم والا انداز، خزیمہ کا کانفیڈنس لیول ڈاؤن ہوا۔

زبردستی کی مسکراہٹ کو کھینچ کر لایا گیا۔

می فائن..... اینڈ یو....."

پھر اس نے کاشف کا تعارف کروایا، اس کے بارے میں کاشف کو بتایا گیا، بالکل سادہ سے انداز میں، عام سے لہجے میں، کاشف یہ خزیمہ ہیں، اور خزیمہ یہ کاشف ہیں۔" (بھلا۔۔ کیا بات ہوئی) کوئی تو بات ہوتی جو خولہ کے ساتھ ہونے کا جواز بنتی۔

کاشف نے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا، شاید اس کا انداز ہی یہی تھا، خزیمہ کو وہ شکل سے ہی بہت ذہین اور انرجیٹک سا بندہ لگا، یقیناً خولہ کی چوائس کوئی عام سا شخص نہیں ہو سکتا۔

خزیمہ خوامخواہ مرعوب ہو گیا، کاشف نے ذرا گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لیا۔

شاید یہ ہی وہ لمحہ تھا جب خزیمہ کی بے قرار نظروں نے خولہ کے مسکراتے چہرے کا تعاقب کیا۔

آپ کے فادر کیسے ہیں؟" اسے فوری طور پر سامعہ کی مہربانی یاد آئی۔

جی اللہ کا شکر ہے، آج زندگی کو زندگی ملی ہے۔"

بہت گہری اور بامعنی بات تھی، وہ خولہ سے اسی قسم کے فلسفیانہ انداز کی توقع کر سکتا تھا، انہی باتوں نیتو اس کے دل کی کشتی کو بغیر پتوار کے لہروں کے حوالے کر دیا تھا۔

لیکن اب کیا ہو سکتا تھا، ساحل بہت دور رہ گیا تھا، کشتی بس آگے بڑھتی جا رہی تھی اور بڑھتی جا رہی تھی۔

تب، پھر کاشف نے ہی گفتگو سمیٹی، پھر ملنے کے وعدے ہوئے رسمی سے انداز میں اور وہ دونوں ایک دوسرے کی معیت میں اندر کی طرف بڑھ گئے، جہاں سے خزیمہ عادل ابھی تھوڑی دیر پہلے دل پر کوئی بھی بوجھ لیے بغیر نکلا تھا، لیکن بس چند لمحوں کی بات تھی، اب اس کے پاؤں میں بھاری زنجیر آن پڑی تھی۔

اور وہ کسی ہارے ہوئے سپاہی کی طرح بے سمت، بے مقصد چلنے کی سعی کرنے لگا۔

تو یہ تھا خزیمہ عادل..... تمہاری اس کہانی کا انجام۔"

نہیں میری کہانی کا یہ انجام، یہ نہیں ہو سکتا، مجھے پتا ہے دعاؤں سے تقدیر بدل جاتی ہے اور میں نے خولہ کو اپنے رب سے مانگا ہے، وہ مجھے ضرور دے گا۔"

اس کا وجدان کہہ رہا تھا، اس کا یقین بول رہا تھا، وہ اپنے سارے حوصلے مجتمع کرتے ہو یا پنے لیپ ٹاپ کو آن۔ کرنے کے لیے سوئچ تلاش کرنے لگا۔

اس کا واحد سہارا اور خولہ سے رابطہ کا آسرا وہ میلنگ ایڈریس ہی تھا جو اس کے دل پر رقم تھا۔ اور آج پھر اس نے خولہ سے بہت ساری باتیں کرنی تھیں۔

☆.....☆.....☆

"اوہ..... میرا عاشر..... میرا بچہ..... میری زندگی..... میری خوشی..... تم کہاں تھے، دیکھو یہ دو ٹکے کی لڑکی کس طرح تمہاری ماں کو بے عزت کر رہی ہے، حالانکہ میں تو تمہاری خیریت لینے اور طارق کی عیادت کرنے آئی تھی، بھلا اتنا بھی حق نہیں بنتا میرا، طارق سے میرا ایک رشتہ ختم ہوا، دو سرا تو کبھی ختم نہیں ہوسکتا اور تم تو میرے اندر سے ہو، تم بھلا مجھ سے کب تک جدا رہ سکتے ہو۔"

کمال کی ریا کاری، مکاری، عیاری اور جانے کیا کچھ شمائلہ کمال کیچر ے پر درج تھا۔ کشمالہ تو ششدر سی تھی وہ..... عاشر کی آنکھیں دیکھ رہی تھی جہاں اس وقت نا قابل فہم تاثر تھا۔

وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ عاشر نے اس کا نام غصے اور برہمی سے لیا تھا یا کوئی حق استعمال کرتے ہوئے اسے مزید تکرار سے روکا تھا۔

"آپ کیا چاہتی ہیں، کیوں مجھے اس شہر سے در بدر کرنا چاہتی ہیں، آپ سے تنگ آ کر تو میں جنگلوں کی طرف نکل گیا تھا، لیکن قسمت کو کچھ اور منظور تھا، آپ کیوں دوبارہ سے میری زندگی کو مشکل بنا رہی ہیں، میں اب بچہ نہیں رہا کہ دنیا کی باتیں سنوں اور ان سنی کر دوں..... مجھے بری لگتی ہیں وہ باتیں، مجھے فرسٹریٹ کرتے ہیں لوگوں کے سوالات..... اللہ کے لیے مجھے جینے دیں اور خود بھی سکھ سے رہیں۔"

اس نے بے ساختہ ہاتھ جوڑ دیے، اس کے لہجے میں بے بسی کی بے بسی تھی۔

کشمالہ کا دل چاہا سامنے کھڑی عورت کو قتل کر دے، اس وقت وہ اپنے محبوب کو تکلیف دینے والی عورت سے بھرپور نفرت کا جذبہ اپنے دل میں محسوس کر رہی تھی۔

اس لمحے وہ بڑی روایتی سی، عام سی عورت تھی جسے عاشر پر کسی عورت حتی کہ اس کی ماں کا استحقاق بھی ناگوار گزر رہا تھا۔

حالانکہ وہ جانتی تھی کہ اس استحقاق میں سچائی سے زیادہ بناوٹ کا عنصر غالب ہے۔

بیٹا..... میری زندگی..... میرے عاشر..... مجھے تیری ضرورت ہے، پل پل تیرے لیے جیتی اور

مرتی ہوں۔"

وہ عاشر کے قریب آ گئی تھی اور اس کے دونوں ہاتھ زبردستی اپنے یخ ہاتھوں میں جکڑ لیے تھے۔

سوتی ہوں تو خواب آتے ہیں برے برے اور جاگوں تو صرف تیری صورت نگاہوں میں رہتی، چل میرے ساتھ، ورنہ تیری زندگی تو اسی طرح اسپتال کے چکر لگاتے اور باپ کی خدمت کرتے ختم ہو جائے گی۔"

ایسے لوگوں کا جینا مرنا برابر ہوتا ہے تو کیوں اپنی زندگی برباد کرے، جس نے تیری زندگی برباد کر دی، تیری ماں کی زندگی برباد کر دی۔

شمائلہ کی خود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ کیا بول رہی ہے، کیا کہنا چاہتی ہے اور جو اول فول بک رہی ہے، اس میں تو عاشر کا تنفر سوا نیزے پر پہنچ گیا تھا۔

پلیز اسٹاپ..... اسٹاپ..... میں اپنی زندگی برباد کروں یا آباد کروں یہ آپ کا ہیڈک نہیں ہے، میں بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں کس نے کس کی زندگی برباد کر دی، اور یہ آپ بھی جانتی ہیں۔"

اس کے لہجے میں شعلوں کی لپک تھی، ایک لمحے کو شمائلہ بھی سناٹے میں رہ گئی، وہ اس وقت عاشر سے نہیں طارق سے مخاطب تھی، ہاں بالکل یہ وہی تھا ہو بہو طارق محمود.....

وہی انداز، وہی لہجہ، وہی آنکھیں اور وہی۔۔ وہی زبان.....

اسے لگا جیسے اس کی پوری ہستی ان شعلوں کی لپیٹ میں آ کر خاکستر ہو گئی ہے مگر ڈھٹائی اتنی تھی کہ وہ جمی کھڑی رہی اور حیران آنکھیں عاشر کے چہرے پر جمائے اس سے پھر سوال کر رہی تھی۔۔

"کیوں بیٹے بھول گئے..... کس نے کس کی زندگی برباد کر دی، کیا میری تکلیف اور کرب کی ساری راتیں بھول گئے عاشر!"

وہ بلا کی اداکار عورت تھی، کشمالہ کو شدید نفرت سی محسوس ہوئی، اگر وہ عاشر کے بعد نانو سے شمائلہ

کے بارے میں وہ سب نہ سن چکی ہوتی جو اس سارے سانحے کا پس منظر تھا تو اس وقت شمائلہ کمال کے ساتھ کھڑی آنسو بہا رہی ہوتی۔

اتنی مظلوم خاتون تو روئے زمین پر نہ ہوگی، مگر اس کے ذہن نے سامنے نظر آنے والی سچائی قبول کرنے کے بجائے بڑے غیر محسوس طریقے سے اپنا آپ عاشر کے سائے میں کر لیا تھا۔

"عاشر اب اس بحث کا کیا فائدہ چلیں یہاں سے، یہ جگہ بات کرنے کے لیے مناسب نہیں۔"

اس نے مدھم سی آواز میں کہا۔

"سب جانتی ہوں۔ لڑکی تم اور تمہاری ماں کی عیاریوں نے آج مجھے سڑک تک پہنچا دیا، مجھے پتا تھا طارق اول دن سے تمہاری ماں کے چکر میں تھا اور اسے میری کوئی بات پسند ہی نہیں آتی تھی، بات بات پر وہ مجھے طعنے دیتا تھا اور پھر جب تھک جاتا تو رونے کے لیے باہر چلا جاتا تمہاری ماں کے پاس.....

مت بھولنا، ایک شادی شدہ عورت جب کسی دوسرے مرد کا دکھ بانٹنے لگتی ہے تو پھر اس کا شوہر بے غیرت ہی ہوگا جو اسے اپنے پاس رکھے گا۔"

شمائلہ کمال نے براہ راست اس پر اتنا کڑا وار کیا تھا کہ وہ اندر تک خاکستر ہوگئی، یہ عورت اس کی مری ہوئی ماں کو اتنی نفرت اور حقارت سے یاد کر رہی تھی، اس عورت کو طعنے دے رہی تھی، جس نے اپنے شوہر کو اس لیے چھوڑ دیا کہ وہ اپنے نفس کا سودا نہیں کر سکتی تھی اور اس عورت کے لیے شمائلہ کمال اس طرح زہر اگل رہی تھی، اسے لگا وہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائے گی۔

اس کی آنکھوں کے آگے ساری چیزیں گڈمڈ ہونے لگیں، زلزلے کی سی کیفیت سے گھبرا کر اس نے عاشر کو تھامنے کی کوشش کی، مگر وہ اپنی ماں سے الجھا ہوا تھا، تب وہ لہرا کر زمین پر آ گری۔

یہ اس جیسی مضبوط اعصاب کی لڑکی کے لیے بہت بڑا جھٹکا تھا، وہ عاشر کیسامنے اور شمائلہ کمال کے سامنے اپنی ماں کی صفائی میں ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی، کیونکہ اس کی آواز نہ شمائلہ کمال جیسی بلند ہو سکتی تھی

اور نہ ہی اس کے پاس لفظوں کا اتنا زہریلا ذخیرہ تھا۔

عاشر سرعت سے اس کی طرف لپکا، کامن روم مین کوئی بھی نہیں تھا، سوائے ان تینوں کے، عاشر نے اس کے سر کے نیچے ہاتھ دے کر اسے اٹھانے کی کوشش کی۔

"_مالا۔ مالا.....ہیلو.....اٹھو۔ اسے سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا وہ کیا کرے، کشمالہ بے ہوش ہو چکی تھی، اس کی آنکھیں بند اور چہرہ ساکت تھا۔

"بس شروع ہو گئے ڈرامے، ایسی عورتیں ہی کامیاب زندگی گذارتی ہیں۔" شمائلہ کمال نے نفرت سے منہ پھیرا۔

"اللہ کے لیے آپ چلی جائیں، میں آپ سے بار بار کہتا ہوں، آپ مجھے مجبور مت کریں کہ میں آپ سے نجات حاصل کرنے کے لیے خود کو گولی مار دوں، میں بہت برا لڑکا ہوں، میں آپ کو بھی گولی مار سکتا ہوں۔" اس نے کشمالہ کو سہارا دیتے ہوئے کامن روم میں رکھے صوفے کے کشن کو اس کے سر کے نیچے رکھا اور پلٹ کر شمائلہ کمال سے اپنے مخصوص لہجے میں کہا، مگر وہاں کوئی اثر ہونے کی صورت حال بن نہیں رہی تھی۔

بلکہ وہ تو بے ہوش پڑی کشمالہ کو دیکھ کر دل ہی دل میں محظوظ ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ کمزوری لگ گئی تھی، جس کے ساتھ کھیلتے ہوئے وہ کم از کم اپنا خلفشار اور تناؤ کو کم کر سکتی تھی جو عاشر کی بے رخی اور طارق محمود کی بخشی ہوئی تنہائی کی وجہ سے اب سہنا پڑ رہا تھا۔

عاشر اس وقت کشمالہ کو اس روم میں چھوڑ کر ڈاکٹر کو بھی بلانے نہیں جا سکتا تھا اور شمائلہ وہاں سے جانے کو تیار نہیں تھی، اس نے خود کو بے بسی کی انتہا پر محسوس کیا۔

دو عورتوں کے درمیان اس کی حیثیت اس وقت کٹھ پتلی جیسی ہو رہی تھی، اس نے کاشف کا نمبر ملایا، پہلی ہی بیل پر اس نے فون اٹھا لیا۔

آئی ایم ان ٹربل،، فوراً اسپتال پہنچو۔" اس نے چھوٹتے ہی کہا اور پھر سے کشمالہ کو آوازیں دینے لگا، جس کا ہوش میں آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا، وہ اس کے پاس دوزانو ہو کر بیٹھ گیا۔

وہ بالکل سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ اس بے ہوش لڑکی کے ساتھ کیا سلوک کرے کہ وہ ہوش میں آجائے اور اٹھ کر بیٹھ جائے، اس کے سنہرے بال کشن پر بکھرے ہوئے تھے، دوپٹہ بے ترتیب ہو گیا تھا اور..... اس نے بے ساختہ اس متناسب سراپے سے نظریں چرالیں، یہ دنیا کی سب سے مخلص لڑکی، اب اس کے دل پر دستک دینے لگی تھی، اسے بالکل اچھا نہیں لگا یوں اس طرح اس کا عیاں ہونا۔

اس نے پھر سے آواز دی، اس کے چہرے پر ہلکے ہلکے تھپڑ مارے مگر وہاں کوئی رسپانس نہیں تھا، اس نے نبض چیک کرتے ہوئے بالکل غیر محسوس طریقے سے اس کا دوپٹہ ٹھیک کیا اور وہ یہ سارے کام شمائلہ کمال کے سامنے کر رہا تھا جو اس کی ایک ایک حرکت پر زلزلے کی سی کیفیت میں تھی۔ اس کے اندر صرف دھماکے ہو رہے تھے۔

عاشر بہت دور جا چکا تھا، وہ اس کی دسترس میں کبھی بھی نہیں تھا۔ وہ اب بھی، آج بھی اتنی منتوں، سماجتوں اور فریادوں کے بعد اس سے ہزاروں میل کے فاصلے پر تھا۔

وہ بس ہاتھ بڑھا کر اسے چھو سکتی تھی، مگر وہ اپنے ہاتھ میں بے حد خوبصورت اور گداز ہاتھ تھامے بیٹھا تھا اور اپنے اندر کی ساری توانائیاں اس کو ہوش میں لانے کے لیے صرف کر رہا تھا، جس سے شمائلہ کمال کو اول دن سے ہی نفرت محسوس ہوئی تھی۔

"عاشر مت کرو میرے سامنے یہ تماشے، تم نہیں جانتے یہ سارے ڈرامے۔" اس نے اپنے مخصوص انداز میں شروع ہی کیا تھا کہ عاشر چیخ پڑا۔

"بس کریں..... پلیز اسٹاپ اینڈ گو۔"

اس کے اتنے سخت رد عمل کے باوجود شمائلہ صوفے پر جمی بیٹھی تھی اور اس کے چہرے پر مظلومانہ سی

مسکراہٹ آ گئی تھی۔

شمائلہ بھی آج طے کر کے آئی تھی کہ وہ ہار نہیں مانے گی، آر یا پار جو بھی ہوگا آج ہوگا۔

عاشراب کشمالہ کو گود میں اٹھا کر باہر لے جانے کا سوچ رہا تھا کہ اسے دروازے کے قریب اسٹریچر اور اسٹاف بوائے نظر آیا۔

وہ سرعت سے اس کی طرف لپکا۔

پلیز ہیلپ می....."اس کی آواز پر وہ پلٹا تھا اور شمائلہ کے ماتھے پر بل مزید گہرے ہو گئے۔

"یہ سب تو میں نہیں ہونے دوں گی، طارق محمود تمہاری زندگی میں سب کچھ تمہاری مرضی کے مطابق ہو اور میں شعلوں پر خود کو جھلساؤں ایسا تو نہیں ہو سکتا نا۔

یہ تو شمائلہ کمال کی فطرت میں ہی نہیں۔

عزت بھی تمہاری۔ نام بھی تمہارا۔ اور زندگی کی ہر خوشی پر حق بھی تمہارا۔

نہیں طارق محمود، اس بار تم ہار جاؤ گے اور جیت میری ہوگی۔"

وہ بڑبڑا رہی تھی اور کاتب تقدیر بھی حیران تھا، اس ساکت اور جامد ماحول میں ٹھہرا ہوا ہر لمحہ حیران تھا کہ.....

آخر یہ کس قسم کی عورت ہے، یہ کون سی ہار جیت کی بات کر رہی ہے، وہ ہار جو اس نے خود اپنے مقدر میں، سارے جہان سے لڑ کر لکھی یا وہ جیت جس کے زعم میں اس نے اپنی جوانی، اپنا تابناک حسن اور اپنی عمر بھر کا سرمایہ اپنی اولاد بھی داؤ پر لگا دی تھی۔

آخر اس عورت کے مقدر میں صبر اور سکون کیوں نہیں ہے۔" شاید اس سوال کا جواب کاتب تقدیر ہی دے سکتا تھا، لیکن وہ ابھی خاموش تھا اور کچھ نئے فیصلے رقم کرنے کی سوچ رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ گھٹنوں میں سر دیے، کالی چادر چہرے پر پھیلائے سلاخوں کے پیچھے بیٹھی تھی، اس کی بھرپور کوشش تھی کہ وہ اپنے چہرے کو دوسروں کی نظروں سے اوجھل ہی رکھے۔

یہاں بھانت بھانت کے لوگ تھے، لیکن فارم ہاؤس میں اس کے ساتھ جتنے بھی لوگ تھے وہ سب اس وقت اس کے ساتھ تھے، مگر ان کے چہروں پر تناؤ سے زیادہ بے چینی کی سی کیفیت تھی، جیسے ابھی کوئی غیبی امداد آئے گی اور وہ سب کے سب باہر ہوں گے۔

وہ سب باتیں بھی کر رہے تھے، تبصرے بھی کر رہے تھے اور سعدیہ کبھی حیرانی سے ان کو دیکھتی اور کبھی سلاخوں کے باہر نظر آنے والے پہرے داروں کو، وہ لوگ گزشتہ رات سے پولیس کسٹڈی میں تھے، اور ابھی تک یہ واضح نہیں ہو سکا تھا کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے۔

فارم ہاؤس پر چھاپے کے دوران پکڑی جانے والی واحد لڑکی تھی، باقی ملازمین یا سرمد بخاری کے کام کے آدمی تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ کیا ہے اور کس حیثیت میں یہاں لائی گئی ہے۔

سوائے سرمد بخاری کے کوئی بھی اس کی حیثیت کا تعین نہیں کر سکتا تھا اور نہ وہ خود کوئی پہچان رکھتی تھی.....

آہ..... سعدیہ رحمت اللہ، کیا تھیں تم اور کیا ہو گئی ہو۔" اس کی نظروں میں گئے دنوں کا فلیش بیک لہرایا۔

ہاں وہ سعدیہ رحمت اللہ ہی تھی اور ہمیشہ سعدیہ رحمت اللہ ہی رہنا چاہتی تھی۔ اسے زندگی بہت پیاری لگتی تھی، اسے ہنستے مسکراتے شرارت کرتے لوگ اچھے لگتے تھے۔

وہ بھی خوب ہنستی تھی اور پھر بہت ڈانٹ کھاتی تھی، کیونکہ اس کے گھر میں قہقہہ لگانے کو پسندیدہ نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا اس کی تائی تو خاص طور پر ٹوک دیتی تھیں۔

جوان لڑکیوں کے یہ طور طریقے نہیں ہوتے۔" تب اسے احساس ہوا کہ تائی کی بیٹیاں کیوں

ہر وقت اپنی زندگی کا رونا رہتی ہیں، شاید انہیں بھی یہ ہی سکھایا گیا ہے کہ ہنسنا خلاف فطرت ہے۔ اور اس گھر میں تو خلاف قانون ہے۔ تب اس نے سوچا وہ اس گھر میں کب تک رہے گی، ایک دن تو ساری دو سری لڑکیوں کی طرح اسے بھی اس گھر سے چلے جانا ہے اور نئی زندگی بسانا ہے۔ جس میں نہ اس پر کوئی پابندی ہوگی اور نہ اس کو روکنے ٹوکنے والا کوئی ہوگا۔

بس وہ ہوگا جو اس کا خیال رکھے گا، اس کی کاجل بھری آنکھوں کو محبت سے دیکھے گا۔ اور اس سے کہا کرے گا،

ہنستی رہا کرو تم مجھے ہنستی اچھی لگتی ہو۔" تب بالکل انہی الفاظ کے ساتھ اس کا تعارف اظہر کے ساتھ ہوا تھا۔

ہاں اظہر نے ہی اس سے کہا تھا۔

"تمہاری ہنسی بہت اچھی ہے"۔

اظہر نے ہی کہا تھا۔

تمہاری آنکھیں بہت پیاری ہیں۔

اور تم جو پہن لیتی ہو سعدیہ، بس دل چاہتا ہے تمہیں دیکھتا رہوں۔ سعدیہ رحمت اللہ پاگل لڑکی تھی۔

یہ ہی سب کچھ تو چاہتی تھی۔ یہ ہی تو وہ خواب تھے جو نوجوانی کی دہلیز پر اس کے ذہن و دل میں ہلچل مچانے آ گئے تھے۔

لیکن خوابوں کی اتنی بھیانک تعبیر..... خوابوں کی اتنی بھاری قیمت۔۔ خوابوں کا اتنا زبردست خراج کہ عزت، محبت، حتی کہ زندگی بھی داؤ پر لگ گئی۔

سعدیہ رحمت اللہ، خواہش سے خواب کا سفر، شاید تمہیں اندازہ نہیں تھا کہ ان راستوں پر سنگریزے زیادہ ہیں۔ کانچ کی کرچیاں جا بجا بکھری ہوئی ہیں، پاؤں لہولہان اور روح تار تار ہو جاتی ہے، تب

بھی منزل کا سراغ نہیں ملتا۔

بس یہ سارے مقدر کے کھیل ہوتے ہیں۔

''اف یہ مقدر....."اس نے بے دردی سے آنکھیں رگڑیں۔

سر اٹھایا تو سامنے لیڈی کانسٹیبل کھڑی تھی۔

''ارے لڑکی.....تمہارے آگے پیچھے کوئی ہے بھی یا لاوارث ہو۔"

وہ اس کے کرخت انداز اور تلخ جملے پر تڑپ کر رہ گئی تھی۔

لاوارث کیوں ہوں، بھرا پرا خاندان ہے میرا۔" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی بے ساختگی کا اعتراف کر گئی۔

''تو پھر یہاں کیا کر رہی ہو، خاندانی لڑکیاں اس طرح حوالات میں دھکے نہیں کھاتیں۔"لیڈی کانسٹیبل بھی لگی لپٹی رکھنے والی نہیں تھی۔

''حادثے بھی زندگی میں ہی ہوتے ہیں کیا میرے ساتھ کوئی حادثہ نہیں ہو سکتا۔"

وہ نہ جانے کیوں اس کرخت لیڈی کانسٹیبل پر تابڑ توڑ حملے کر رہی تھی، شاید اندر کی بھڑاس نکالنے کے لیے اس وقت وہ غنیمت محسوس ہو رہی تھی۔

زیادہ بک بک مت کرو، اور فلسفہ مت جھاڑو، چلو اٹھو۔"اس نے اسٹک اس کے کندھے پر ماری، وہ بلک ہی تو اٹھی۔

یہ عزت، یہ ذلت ورنہ یہ وہ سعدیہ تھی جس کی بدزبانی اور اکھڑ پن سے سب خوفزدہ رہتے تھے۔

''کہاں لے کر جا رہی ہو۔"اس نے اپنی لاچاری پر لعنت بھیجی۔

''زیادہ سوال مت کرو، یہ تمہارا باوا کا محل نہیں" وہ بھی کمال عورت تھی عورت کا درد ہی نہیں سمجھ رہی تھی اور پھر صحیح تو کہہ رہی تھی یہ سعدیہ کے باوا کا محل تو واقعی میں نہیں تھا۔اس نے پولیس تھانہ اس طرح

کے لفظ تو بہت دفعہ سنے تھے، مگر ایف آئی اے لاک اپ پہلی بار سنا تھا اور پہلی بار میں اس کے اندر کی دنیا دیکھ لی تھی۔

اس نے کسی سے سنا تھا کہ اللہ ان لوگوں کی مار سے بچائے۔" وہ خوف زدہ نظروں سے لیڈی کانسٹیبل کو دیکھتے ہوئے اس کے ساتھ آگے بڑھی۔

شاید اس کی باری آ گئی تھی مار کھانے کی۔

"ربا میرا گناہ اتنا بڑا تو نہیں تھا..... پھر یہ نہ ختم ہونے والی سزا۔"

اس کے دل نے بڑی شدت سے پکارا۔

اس کے پاس نہ کوئی بیگ تھا نہ موبائل اور نہ ہی پیسے، تب ہی اس کا دل چاہا وہ لیڈی کانسٹیبل سے کہے۔

مجھے اپنا فون دے دو، میں اپنے گھر والوں سے بات کر لوں۔" مگر لفظ لبوں پر آتے آتے رہ گئے، وہ سامنے کا منظر دیکھ کر بے ہوش ہوتے ہوئے بچی تھی۔

وہ جو کوئی بھی تھا سر جھکائے چلا جا رہا تھا، مگر سعدیہ، اس کا چہرہ لاکھوں میں بھی پہچان سکتی تھی۔

وہ اظہر تھا، اس کو خواب دکھانے والا، لیکن اس وقت وہ کوئی ہتھکڑی نہیں پہنا ہوا تھا، بلکہ وہ خاصے پر اعتماد انداز میں دو آدمیوں کے ساتھ چل رہا تھا، سعدیہ نے اپنا چہرہ مزید چادر میں چھپا لیا، اب پتا نہیں یہ لیڈی کانسٹیبل اسے کہاں لے کر جا رہی تھی اور اظہر یہاں کیوں تھا۔

اس نے دل سے دعا مانگی تھی کہ اظہر کا سامنا نہ ہو، مگر بہت ساری دعاؤں کی طرح یہ دعا بھی انتظار کے اوطاق میں محفوظ ہو گئی تھی، وُنکہ تھوڑی دیر بعد وہ اور اظہر ایک دوسرے کے مدمقابل تھے اور یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ اظہر اس کی سیاہ آنکھوں کو نہ پہچانتا۔

☆.....☆.....☆

سرمد بخاری کے پاؤں میں پھرکی لگی ہوئی تھی اور وہ بے چینی کے ساتھ ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا۔

اس وقت تک وہ اپنے سارے رابطے "فعال کر چکا تھا، مگر ابھی تک کوئی نتیجہ سامنے نہیں آیا تھا۔

منیر کمال اس کے سامنے صوفے پر بیٹھا بظاہر مطمئن نظر آ رہا تھا، مگر اضطراب اس کی ایک ٹانگ کی حرکت سے عیاں تھا جو مستقل ہل رہی تھی۔ یہ اس کی مخصوص عادت تھی، وہ بے چینی میں اپنی دائیں ٹانگ کو ہلانا شروع کر دیتا، اور شمائلہ کو اس کی اس مخصوص حرکت سے شدید نفرت تھی۔

تمہارا کیا خیال ہے میں ان دو ٹکے کے لوگوں کی خاطر اپنی عزت داؤ پر لگا دوں گا، ارے سرمد بخاری اتنی کچی گولیاں نہیں کھیلتا، تم فکر نہ کرو میری، بس خود کو بچا لو، اب سرمد بخاری کی طرف نہ دیکھنا۔"

وہ ہمیشہ منیر کمال کو اسی حقارت بھرے لہجے میں پکارتا تھا، کیونکہ اس نے کبھی بھی منیر کمال کو اچھا بزنس پارٹنر نہیں پایا تھا۔ وہ عیاری اور مکاری کی فطرت سے مجبور تھا اور سرمد بخاری کاروبار میں کھرا آدمی تھا۔

منیر کمال دل ہی دل میں اس کی تلملاہٹ پر مسکرا رہا تھا۔

"میں نہیں، تم اب خود کو بچا لو سرمد بخاری، میں بھی منیر کمال ہوں، چار دن میں تمہارے ہوش ٹھکانے آ جائیں" وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا اور چہرے پر دل گرفتگی اور رنجیدگی کے تاثرات تھے۔

دیکھو سرمد! میں جانتا ہوں تمہاری پہنچ کہاں تک ہے، مگر اس بار تم برے پھنسے ہو، حکومت بدل چکی ہے۔"

اس نے پراسرار لہجہ اختیار کیا۔

"تم اپنی بکواس بند کرو تو بہتر ہوگا۔" وہ اس پر بھڑکا اور شمائلہ کا نمبر ملانے لگا، وہ آخری بار اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا وہ ساتھ چلے گی یا پھر یہیں منیر کمال کے طعنے اور زمانے بھر کی رسوائیاں سمیٹتی رہے گی مگر دوسری طرف نمبر مستقل بزی جا رہا تھا۔

دیکھو منیر! یہ تو طے ہے۔ تمہارے اور میرے کاروباری معاملات ختم ہو چکے، تمہیں پتا ہے

میرا لین دین شمائلہ کے ساتھ ہے، تم میرے لیے محض ایک بروکر ہو اور بس اور شمائلہ کے تیور ٹھیک نہیں۔ اس کا ذہن دیگر باتوں میں الجھا ہوا ہے اور اس کی یہ غائب دماغی مجھے کسی بھی نقصان سے دوچار کر سکتی ہے، اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں فی الوقت پاکستان سے بزنس کو وائنڈ اپ کر دوں۔"

وہ پہلی بار منیر کمال کے ساتھ اتنے تحمل سے بات کر رہا تھا، منیر کمال کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔

تو ہمارے شیئرز کا کیا ہوگا۔" منیر کمال کو ہمیشہ کی طرح ایک ہی فکر تھی۔

"دیکھو تمہاری دلالی کبھی رکنے کی نہیں۔ مجھے جب ضرورت پڑے گی تجھے ڈیمانڈ بھیج دیا کروں گا۔ ویسے بھی اب تو بوڑھا ہو چکا۔ شمائلہ جیسی احمق کلی تیرے جھانسے میں آنے سے رہی، اس لیے تو بھی سوچ لے، اب تجھے کیا کرنا ہے۔ کہے تو تیری شہزادی خانم سے بات کروا دوں۔ یار! بڑی زبردست عورت ہے، کیا رعب اور دبدبہ ہے اس کے چہرے پر اور مال ایسا ہے اس کے پاس ہاتھ لگاؤ تو میلا ہو جائے۔"

سرمد بخاری خالص کاروباری انداز اپنائے ہوئے تھے۔ منیر کمال کے منہ میں بھی پانی آ گیا تھا۔ یہ خانم شہزادی یا شہزادی خانم کون تھی اور اب تک اس کی نظروں سے کیوں اوجھل تھی۔ اسے عجیب سی پریشانی نے آن گھیرا۔

"بات وات تو میں خود کر لوں، تم پتا بتا دو۔" ایک کمینی سی مسکراہٹ ہمیشہ کی طرح اس کے چہرے پر تھی۔

سرمد بخاری کو پھر سے شمائلہ کی یاد آ گئی۔ وہ فون کیوں نہیں اٹھا رہی تھی، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

اس نے ایک اور بم منیر کمال کے سر پر دے مارا تھا۔

اور ہاں، میں شمائلہ کو ساتھ لے کر جا رہا ہوں۔ اب تم سوچ لو اسے اپنی بیوی کی حیثیت سے بھیجو گے یا میری بیوی بنا کر۔"

اس قدر طمانیت بھرا انداز تھا کہ منیر کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا تھا۔ شمائلہ کی بات ایسے ہوئی تھی جیسے باقی خریدار لڑکیوں کی ہوتی تھی۔

''تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے شمائلہ میری بیوی ہے.....نہیں۔"

اس کا لہجہ مضبوط نہیں تھا، بس اس میں احتجاج تھا۔

اسی لیے تو کہہ رہا ہوں، بہتر ہے اب تو کسی اور کو لے آ۔ مجھے شمائلہ سے ہمدردی ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں تو اب اس کے لیے بے کار ہے اور وہ اب تیرے کام کی نہیں رہی لیکن دوستی کے ناتے میں اسے اس موڑ پر تنہا نہیں کر سکتا۔"

عجیب و غریب معاملات تھے سرمد بخاری کے۔ منیر کمال آج تک اسے نہیں سمجھ پایا تھا۔

''تیرے پاس کل تک کا ٹائم ہے تو سوچ لے۔ اس نے برادرانہ انداز اپنایا۔

سرمد! جسٹ شٹ اپ۔۔ شمائلہ نہ ہوگئی مٹی کی گڑیا ہوگئی۔ بیوی ہے وہ میری۔ میں اسے اپنے ہاتھوں دفن کر دوں گا لیکن تیرے حوالے نہیں کروں گا۔"

سرمد بخاری حیران ہو رہا تھا، اس وقت منیر کمال کی غیرت اچھی طرح بے دار ہو چکی تھی۔

اس کا دل چاہا شمائلہ کو خوشخبری سنائے مگر اس کا فون بند تھا، اس نے ایس ایم ایس ٹائپ کر کے اسے بھیجا۔

آخر اس میں ہرج ہی کیا ہے؟" اس بار انداز دوستانہ ہو چلا تھا۔ منیر کمال کے چہرے پر لامحدود شکنوں کا جال پھیل گیا۔

''میں نہ تیری بکواس سن سکتا ہوں اور نہ اس کا جواب دے سکتا ہوں۔ تو اچھی طرح جانتا ہے شمائلہ میری کمزوری ہے۔ میں اسے کسی بھی قیمت پر تیرے کیا رب کے حوالے بھی اتنی آسانی سے نہیں کروں گا۔"

سرمد بخاری نے حیرت کے ساتھ منیر کمال کو سرتا پیر دیکھا تھا۔ عجیب آدمی تھا کبھی اسے زہر دے کر مارنے کی سوچ رہا ہوتا اور کبھی اس پر ذہنی تشدد کی انتہا کر دیتا لیکن جب اس سے دستبردار ہونے کی بات آئی تو بپھر اٹھا۔

سرمد بخاری بھی اتنی آسانی سے ہار ماننے والا اور دستبردار ہونے والا نہیں تھا۔ شمائلہ اس کے بہت سارے رازوں کی امین تھی، وہ اسے کسی صورت منیر کمال کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا تھا کہ ایک دن وہ تنگ آ کر ذہنی طور پر ماؤف ہو کر وہ سب کچھ نہ گنوانے پر مجبور ہو جائے جس کا انجام سرمد بخاری کے لیے بھی تنگ و تاریک کوٹھڑی تھی۔

تو سوچ لے اچھی طرح، یہ بھی تیری میری ایک ڈیل ہے اور ہو سکتا ہے تو فائدہ میں رہے۔ فی الحال تو تیری بیوی کا فون نہیں لگ رہا تو بھی ذرا فکر کر لے اور میں بھی دیکھتا ہوں کیا مسئلہ ہو گیا ہے۔

سرمد بخاری کا اطمینان ہنوز برقرار تھا۔ منیر کمال کا اطمینان سرمد کی آخری بات پر مزید رخصت ہوا تھا۔

تیری میری ایک ڈیل....." وہ بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔

اب تو سرمد بخاری سے ڈیل کا کوئی فائدہ نہیں تھا، اب تو اس کی ڈیل ایک بار پھر طارق محمود سے ہونے والی تھی۔

اس نے انگلیوں پر دن گنے تھے یا رقم، سرمد بخاری سمجھ نہیں پایا تھا اور نہ وہ سمجھنا چاہتا تھا کیونکہ وہ اپنی باری کھیل چکا تھا اور یہ خوش فہمی منیر کمال کو بھی تھی کہ اس بار اس نے جو چال چلی ہے، وہ ساری بساط الٹ دے گی۔

اظہر وعدہ معاف گواہ بنے کے لیے تیار تھا اور پولیس نے تو صرف ابھی فارم ہاؤس تک کارروائی کی تھی۔

وہ سب سے پہلے سعدیہ کو وہاں سے نکالنا چاہتا تھا۔۔

ہاں سعدیہ! منیر کمال کو بھی تو زندہ رہنے کے لیے کسی سہارے کی ضرورت تھی۔ شمائلہ کمال اگر بد کنا شروع ہوگئی تھی تو دنیا میں اب ناعاقبت اندیش لڑکیوں کی کمی نہیں تھی۔

اس کا چہرہ عجیب سی مسکراہٹ سے چمکنے لگا۔ شمائلہ سے سعدیہ..... دونوں چہرے گڈمڈ ہونے لگے۔ اسے یقین تھا وہ ابھی اتنا بھی بوڑھا نہیں ہوا، اس کی رگوں میں بھی خون کی جگہ کالے وحشی کتوں کی دوڑ شروع ہوگئی تھی۔

☆.....☆.....☆

شمائلہ نہ فون اٹھا رہی تھی اور نہ کسی سے بات کرنا چاہتی تھی، اس کی گاڑی بس اس لمحے ان راستوں پر رواں دواں تھی جو اس کے لیے انجانے اور ان دیکھے کبھی نہیں تھے مگر اس لمحے ان کی طرف جاتے ہوئے اس کے ہاتھ پاؤں پوری شدت سے کانپ رہے تھے، بالکل اسی طرح جس طرح آج سے کئی سال پہلے وہ لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ واپس آئی تھی تو ہنستی بستی دنیا اجڑ گئی تھی۔

اس کا ذہن ایک ہی جست میں پیچھے پہنچ گیا تھا اور اسے لگا جیسے یہ کل کی تو بات ہے۔ وہ سر جھکائے ندامت اور شرمندگی کا بار اٹھانے کے بجائے خود بھی آنے والے دنوں کے خواب دیکھ رہی ہے اور بیگم محبّ عالم کو بھی دکھا رہی ہے۔

اماں! آپ سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہی ہیں۔ آپ کو میری کوئی بات آج تک سمجھ نہیں آئی۔ بس ہر بات کی پابندی میرے لیے ہی تھی نا۔" سرخ رنگ کے جوڑے کا عکس اس کے چہرے پر آ گیا تھا اور وہ جذبات کی رو میں بہہ کر نہ جانے کیا کچھ کہہ گئی تھی۔

بیگم محبّ عالم تو ششدر سی اس کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔ وہ تو سوچ رہی تھیں، بیٹی اپنی حرکت پر شرمندہ ہوگی، معافی مانگے گی، اس کی آنکھوں میں آنسو ہوں گے، چہرے پر ندامت مگر یہاں تو ڈھٹائی کا عالم یہ تھا کہ وہ ان سے انڈیا جانے کی اجازت مانگنے آئی تھی۔ بیگم محبّ عالم کا دماغ سلگنے لگا۔

کاش شمائلہ تو پیدا ہوتے ہی مر گئی ہوتی تو آج اتنی رسوائی کا منہ نہ دیکھنا پڑتا۔ انہوں نے نفرت سے کہا تو شمائلہ کو بھی عجیب سا لگا مگر سماعتوں میں بس منیر کمال کی دلگرفتہ سی سرگوشیاں اور چہرے پر زمانے بھر کی معصومیت کا تاثر اتنا طاقتور تھا کہ وہ ماں کی بے بسی اور دلگرفتگی نظر انداز کر گئی۔ اسے لگا ماں تو ماں ہے، آج نہیں تو کل معاف کر دے گی لیکن منیر کمال کے ساتھ، یہ زندگی آج نہ ملی تو پھر کبھی ہاتھ نہیں آئے گی۔

اماں! کیا آپ نہیں چاہتیں، میں خوش رہوں، ہنسوں، کھیلوں۔ وہ زندگی جیوں جس کی آپ خواہش کرتی تھیں جس کی آپ نے دعا دے کر رخصت کیا تھا۔" اب اس سے جذباتی وار کیا تھا۔

تو پھر اب آپ سمجھنے کی کوشش کریں، میرا اور طارق کا گزارا ایک چھت کے نیچے ممکن نہیں رہا۔ آپ نہیں جانتیں اگر اس دن وہ گولی نہ چلتی تو طارق مجھے قتل کر چکا ہوتا کیونکہ وہ مجھے مارنا چاہتا تھا، اس نے مجھ پر حملہ کیا تھا، وہ کئی بار میرا گلا دبانے کی کوششیں کر چکا ہے۔ میں نے آپ کو یہ ساری باتیں کبھی نہیں بتائیں۔ میں جانتی تھی آپ دکھی ہوں گی، میرے لیے پریشان ہوں گی۔ آخر کو وہ آپ کا بھانجا ہے مگر اماں! وہ پہلا والا طارق نہیں رہا جو میرے لیے پاگل ہوتا تھا۔ وہ بالکل بدل گیا۔"

شمائلہ نان اسٹاپ شروع تھی، بیگم محبّ عالم کا سر پھٹنے لگا۔

بس کرو..... شمائلہ چپ جاؤ..... بدلا کون ہے، پاگل کون ہو گیا ہے، یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ اس رات گولی طارق کے پستول سے نہیں چلی تھی، وہ تیرا، ہمارا، ہم سب کا دشمن ساتھ لے کر آیا تھا، تو کیوں نہیں سمجھتی ہے۔ وہ شخص ہمارا سجن نہیں ہو سکتا جس نے میرے گھر کی بنیادیں ہلا دیں، جس نے تیرے ماں باپ، تیرے شوہر، تیرے بچے کو رسوائی اور ذلت کے گھڑے میں اتار دیا ہے۔"

بیگم محبّ عالم رو پڑی تھیں، ان کا انداز بھکارن والا تھا۔ انہوں نے سوچا تھا وہ بیٹی کا گھر بچانے کے لیے ہر حربہ اختیار کر لیں گی۔

صد شکر کہ اس وقت محبّ عالم گھر پر نہیں تھے ورنہ شمائلہ کو گھسنے بھی نہیں دیتے۔ انھوں نے کہہ دیا

تھا، اب وہ شمائلہ کو اپنے ہاتھوں سے گولی مار کر خودکشی کر لیں گے۔

بس کریں اماں! کس زمانے کی بات کرتی ہیں آپ، آج کل کسی کو پروا نہیں کون کیا کر رہا ہے، کہاں جا رہا ہے اور پھر زندگی تو بس ایک ہی بار ملتی ہے نا، میں اس کو ان سوچوں میں برباد کر دوں کہ لوگ کیا سوچیں گے، لوگ کیا کہیں گے۔ اماں! بھلا لوگ بھی کسی کی کامیابی، شہرت اور خوشی پر خوش ہوئے ہیں، ان کا تو کام ہے حسد کرنا۔"

وہ اس وقت مکمل منیر کمال کی زبان بول رہی تھی۔ رات ہی تو منیر کمال نے اس کی رگوں میں ام الخبائث کا زہر اتارتے ہوئے بڑی نرمی اور پیار سے، مدہم سرگوشیوں میں یہ باتیں سمجھائی تھیں۔ اسے احساس دلایا تھا وہ ماں باپ کی لاڈلی ہے۔ آج غصہ کریں گے کل مان جائیں گے۔

اسے یقین دلایا تھا کہ طارق محمود اب زندگی سے نکل چکا ہے، وہ واپس اس کے پاس چلی بھی گئی تو ناک کاٹ کر بال کتر کر واپس گھر سے باہر نکال دے گا کیونکہ وہ ایک جاہل مرد ہے جو بیوی کو انسان نہیں ملکیت سمجھتا ہے۔

منیر کمال نے ان تمام باتوں کا زہر کسی ہائی ڈوز انجکشن کی طرح اس کی رگوں میں پیوست کیا تھا اور ویسے بھی گزری رات وہ جس سرور سے آشنا ہوئی تھی، جس طرح اس نے اڑن کھٹولے کا سفر کیا تھا، اس کی خاطر تو وہ بہت سارے محاذوں پر لڑ سکتی تھی۔ طارق محمود تو خیر اب کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

منیر کمال نے ہی یقین دلایا تھا کہ وہ پڑھی لکھی باشعور عورت ہے جس کے پاس خلع کا حق محفوظ ہے۔

بکواس بند کرو شمائلہ! میں سوچنے پر مجبور ہو گئی ہوں کہ تم میرا خون ہو یا میں نے تمہیں کسی بازار سے اٹھایا ہے۔ میرے خون میں اتنی ملاوٹ کیسے آ گئی۔ تو نے تو اپنے باپ کا بھی نہیں سوچا جن کے پاس آدھا شہر درس و تبلیغ کے لیے آتا ہے اور ان کی بیٹی پر ساری دنیا کے سامنے ناچے گی۔

اللہ کے لیے شمائلہ! ہوش کے ناخن لے، اس ہٹ دھرمی کا انجام بہت برا ہے۔"

وہ کوئی جاہل ماں ہوتیں تو تھپڑوں سے اس کا منہ لال کر دیتیں مگر کمال ضبط تھا ان کے اندر بھی۔

تو آپ چاہتی ہیں میں ساری عمر طارق کا ظلم سہتی رہوں، جب میرا دل اس کے ساتھ رہنے پر آمادہ نہیں تو میں جبر کی زندگی گزاروں۔ کیا وہ زندگی گناہ نہیں ہوگی۔ جب دل، دماغ، سوچ کچھ بھی ساتھ نہ ہو تو ایک چھت کے نیچے رہنے کا کیا فائدہ اماں! آپ کیوں نہیں سمجھتیں، طارق آج نہیں تو کل دوسری شادی کر لے گا۔ آپ کو نہیں پتا وہ بھاگ بھاگ کر لندن جاتا ہے، ہر وقت تو اسے وہاں کام نہیں ہو سکتا ہے نا۔" اس نے ایک نیا پتا پھینکا تھا، اس بار بیگم محبّ عالم کا ضبط جواب دے گیا۔

ان کا بے اختیار ہاتھ اٹھا تھا اور شمائلہ کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ یہ ماں کا ہاتھ تھا جو زندگی میں پہلی بار اس کے نازک گالوں کو اس بے دردی سے چھو گیا تھا، وہ کتنی دیر تک سکتے کے عالم میں بیٹھی رہی، آنکھوں میں پتھریلے تاثرات کے ساتھ۔

بیگم محبّ عالم کا خیال تھا کہ وہ روئے گی، چیخے گی اور پھر ان سے لپٹ جائیگی، اپنی غلطی کی معافی مانگے گی مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔

کتنی دیر تک وہ سن بیٹھی رہی پھر سر اٹھایا تو ایک نئی سوچ کے ساتھ۔

مجھے پتا تھا طارق نے میرے خلاف اتنی نفرت بھر دی ہے کہ اب آپ کو میری کوئی بات اچھی نہیں لگے گی۔ آپ کی بلا ہے شمائلہ مرے یا جیے۔ وہ زہر کھا لے یا طارق اسے گولی مار دے۔ آپ کے نزدیک اب ان باتوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ آپ نے ہمیشہ طارق کو مجھ پر ترجیح دی کیونکہ آپ کو بیٹے کا ارمان تھا، مجھے پتا ہے آپ نے مجھے نہیں، طارق کو پیار کیا ہے اور ابا آپ سے کہتے بھی تھے۔ ہاں آپ ٹھیک کہتی ہیں، میں آپ کی بیٹی نہیں ہوں ورنہ آپ کو میری بھی تکلیف کا احساس ہوتا لیکن آپ کو تو صرف اپنی عزت اور طارق کی خوشی کی پروا ہے۔ میں مروں یا جیوں۔"

اس سے پہلے کہ وہ اپنا جملہ مکمل کرتی، محبّ عالم کمرے میں داخل ہو گئے تھے اور انہوں نے اس کا

آخری جملہ سن لیا تھا۔

تم مرو یا جیو.....اب ہمارے سوچنے کا کام نہیں۔ تمارا جنازہ طارق کے گھر سے اس رات اٹھ چکا ہے اور میں تمہیں دفنا چکا ہوں۔ جاؤ نکل جاؤ، آئندہ اس ناپاک وجود کے ساتھ اس گھر میں قدم رکھا تو میں خود کو گولی مار دوں گا۔

جو کچھ غصے اور صدمے کی کیفیت میں انہوں نے کہا تھا، وہ شمائلہ کے لیے سخت ردعمل ضرور تھا، مگر پتا نہیں کیوں وہ ان ساری باتوں کو وقتی ردعمل سمجھ کر اپنی بات پر قائم تھی اور پر یقین تھی کہ تھوڑے دنوں میں سب ٹھیک ہو جائے گا لیکن تھوڑے دنوں میں کچھ بھی ٹھیک نہیں ہوا بلکہ اسی رات اس گھر میں موت کی آندھی نیا پنے خون آشام پر پھیلائے اور محبّ عالم کو ساتھ لے گئی۔

شمائلہ کو گھر سے نکالنے کے بعد وہ اپنی اسٹڈی میں بند ہو گئے تھے۔ بیگم محبّ عالم کے بار بار دستک دینے کے باوجود انہوں نے دروازہ نہیں کھولا تھا۔ وہ دستک دیتی رہیں، التجا کرتی رہیں مگر ہنوز خاموشی تھی۔

تب پڑوسیوں کی مدد سے دروازے کا لاک توڑا گیا، پتا نہیں کیوں ان کا دل جب سے شمائلہ گئی تھی، کسی انہونی پر بضد تھا، وہ اپنے سفید پڑتے چہرے کے ساتھ اسٹڈی روم میں داخل ہوئی تھیں، ان کا دل بے اختیار رہوا۔

اندر آرام دہ کرسی پر محبّ عالم بڑی شان سے ایستادہ تھے، کسی خاموش بت کی طرح۔

انہوں نے پکارا، پھر آواز دی۔ تیزی سے آگے بڑھ کر کندھے پر ہاتھ رکھا، چہرہ چھوا اور پھر سے آواز دی چیخ کر۔

مگر وہاں زندگی ہوتی تو جواب آتا نا۔ وہ تو ایک خاموش مجسمہ تھا، جس کا ناتا سانسوں کی ڈور سے ٹوٹ چکا تھا، تمام زندگی پتھروں، پہاڑوں اور چٹانوں کو توڑنے والا شخص اتنی خاموشی سے ڈھے گیا تھا۔

بیگم محبّ عالم کو یقین نہیں آ رہا تھا تو کسی کو کیا یقین آتا۔

عاشر یشانی کے عالم میں ٹکر ٹکر سب کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

سب لوگ کیوں آ گئے تھے۔ نانا کیوں بستر پر پڑے تھے، اسے کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ وہ تو آج صبح سے بابا کیساتھ تھا۔ شاید وہ بابا کے ساتھ نہ جاتا تو یہ سب نہ ہوتا۔ پتا نہیں نانا کو کس نے مارا ہے ورنہ خود تو نہیں مر سکتے۔ وہ تو اتنے طاقتور ہیں، اتنے بہادر ہیں..... نہیں، نانا کو کسی نے مارا ہے جیسے بابا کو۔"

وہ دروازے کی آڑ میں کھڑا پتا نہیں کیا کیا سوچ رہا تھا، تب طارق محمود نے آ کر اسے اپنی گود میں بھر لیا۔ ان کا زخم ابھی تازہ تھا مگر جو گھاؤ آج لگا تھا اس کے سامنے کچھ بھی نہیں تھا۔

محبّ عالم باپ تھے، رہنما تھے، دوست تھے، دکھ سکھ کے ساتھی تھے، وہ تو ان کی کل کائنات تھے اور شمائلہ نے یہ کل کائنات بھی چھین لی تھی۔

انہوں نے ایک نظر ت بھری آہ کے ساتھ شمائلہ کو سوچا اور بیگم محبّ عالم کے پاس آ گئے جو صدمے سے نڈھال مرنے والے کے بستر کی پٹی سے لگ کر بیٹھی ہوئی تھیں۔

☆.....☆.....☆

خولہ اور کاشف فل اسپیڈ میں گاڑی بھگاتے ہوئے واپس ہاسپٹل پہنچے تھے لیکن صد شکر کہ تب تک کشمالہ ایمرجنسی میں منتقل ہو چکی تھی اور اسے ہوش بھی آ چکا تھا لیکن ڈاکٹرز نے احتیاطی تدابیر کے طور پر اسے تھوڑی دیر کے لیے انڈر آبزرویشن لے لیا تھا۔

مالا! کیا ہوا۔ بالکل یلو ہو رہی ہو تم..... ایک دم سے..... کچھ تو بولو۔" خولہ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھنے لگی، تب اس کی نگاہیں عاشر سے جا ٹکرائیں، جہاں عجیب سا دکھ رقم تھا۔ کشمالہ کا دل مزید اداسی میں گھر گیا۔

جو کچھ آج اس نے سنا تھا اور جو کچھ آج اس کے سامنے ہوا تھا۔ اس کے بعد تو زندگی ان گنت

سوالیہ نشان سامنے لے آئی تھی۔

عاشر کی خواہش کرنا اور اس کے سنگ زندگی بتانے کے خواب دیکھا تو بہت آسان تھا لیکن ان خوابوں کے تعبیر کے لیے قدم قدم پر لگی کانٹوں کی باڑ کو عبور کرنا کیا اس کے بس میں تھا۔

جب عاشر کا اپنی ماں سے رشتہ نہیں ٹوٹ سکتا تو وہ کس طرح اپنی ماں کے بارے میں کوئی بات سن سکتی تھی۔

اس کی ماں نے تو صرف ان دونوں کا مستقبل محفوظ کرنے کے سے عمر بھر کی تنہائی مقدر کر لی تھی اور وہ تقدیر سے اس شخص کا ساتھ مانگ رہی تھی جس کی ماں اسے شاید عمر بھر نہیں قبول کر سکتی تھی۔

اس کے دل پر چوٹ سی پڑی تھی اور آنکھوں کے کنارے سے آنسو کا موتی گر کر سفید چادر میں جذب ہو گیا تھا، تب کاشف کو ہی تشویش ہوئی۔

"مالا..... ہوا کیا، کچھ تو بولو۔ اب تو آزمائش ختم ہونے والی ہے۔ دیکھو نا ڈاکٹر کتنے خوش تھے اپنی کامیابی پر اور یہ ہے بھی حقیقت..... بے شک شفا تو اوپر والے کے پاس ہے لیکن ڈاکٹرز کی محنت اور قابلیت کو سلیوٹ نہ کرنا زیادتی ہوگی۔"

اس نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو خولہ کے چہرے پر بھی خوشی سی دوڑنے لگی۔

"پتا نہیں مالا کیوں اتنی حساس ہو رہی ہے، کیا کوئی آیا تھا، کسی نے کچھ کہا ہے کیا۔" وہ عاشر کی طرف پلٹی۔

ہاں مسز شمائلہ کمال آئی تھیں۔" وہ زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکا۔

اوآئی سی..... مگر کیوں۔۔ اب کیا چاہتی ہیں وہ۔" کاشف کی آنکھوں سے الجھن ہویدا تھی۔

"وہ صرف عاشر کو چاہتی ہیں اور کچھ نہیں ہے ان کی ڈیمانڈ۔" خولہ کا جبہ سرد ہو چلا تھا۔

عاشر کو تو اس کا انداز محسوس ہوا ہی تھا، کاشف بھی چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

''یار خولہ! اب تم بھی ایسے ری ایکٹ کرو گی تو یہ کیسے ٹھیک ہو گی اور تمہیں تو پتا ہے اس کے ٹھیک ہوئے بغیر ہمارا گزارا مشکل ہو سکتا ہے۔ نانو گھر میں نہیں گھسنے نہیں دیں گی، کیوں عاشر....."

اس نے ماحول کی یاسیت کو کم کرنے کے لیے اپنے مخصوص انداز کو آواز دی، ویسے بھی ایمرجنسی روم کا تصور ہی جسم و جاں میں ٹھنڈک اتارنے والا ہوتا ہے۔

نانو تو خیر تمہیں بھی گھر میں نہیں گھسنے دیں گی۔ تم نے کوئی وعدہ کیا تھا ان سے نا۔" اچانک ہی کشمالہ نے ہمت مجتمع کر کے کہا تو کاشف اور خولہ مارے خوشی کے تالیاں بجانے پر مجبور ہو گئے۔

''یہ ہوئی نا بات.....اب سب ٹھیک ہے۔" کاشف نے عاشر کے گرد بازو حمائل کرتے ہوئے کہا تو وہ بھی مسکرا دیا۔ کشمالہ نے درمیان میں آ کر توپوں کا رخ اپنی طرف موڑ لیا تھا۔

''کیا بات ہے، کچھ پریشان ہو۔ میڈم شمائلہ کی طرف سے کوئی پریشانی ہے۔" کاشف نے خولہ اور کشمالہ کو آپس میں مصروف دیکھ کر عاشر سے پوچھا۔

چلو باہر چلتے ہیں، ہو سکے تو اپنی الجھن مجھ سے شیئر کرو۔ شاید میں تمہاری کوئی ہیلپ کر سکوں۔" کاشف کا پرخلوص لہجہ عاشر کو مزید اداس کر گیا۔ جب سے شمائلہ گئی تھی اس کا دل گہرے رنج اور آزردگی کی لپیٹ میں تھا۔

پتا نہیں کشمالہ اس کی ماں کے بارے میں، اس کے بارے میں کیا سوچتی ہو گی؟" یہ ایک نئی سوچ تھی جو وہ کاشف سے بھی شیئر کرنا چاہتا تھا مگر اس وقت نہیں۔

ہاں، میں تمہیں ضرور بتاؤں گا لیکن ابھی نہیں۔ میرا خیال ہے تم لوگ کشمالہ کو بھی گھر لے جاؤ۔ اب وہ بہتر ہے۔"

اس نے سنجیدگی سے کہا تو کاشف مسکرا دیا بڑی معنی خیزی سے۔

''اچھا لگتا ہے نا اس کی کیئر کرنا۔"

عاشر نے صرف اسے گھورنے پر اکتفا کیا، کاشف بھی کہاں باز آنے والا تھا۔

''بتانا..... یہ جو تو اب اس کی اتنی پروا کرنے لگا ہے، بے وجہ تو نہیں نا۔''

''کیا کوئی کام بے وجہ ہوتا ہے۔" عاشر نے الٹا اس سے ہی پوچھ لیا، جواباً وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

''ویسے میں سچے لوگوں کو ہمیشہ سیلوٹ کرتا ہوں۔" اس نے عملاً بھی کر دکھایا تھا۔ خولہ اور کشمالہ بھی متوجہ ہو گئیں۔

''کوئی خاص بات ہوئی ہے کیا۔" خولہ نے پوچھا۔

''ہو جائے گی۔ ابھی تو ہم نے یہ سوچا ہے کہ مالا کو گھر لے چلتے ہیں عاشر انکل کے پاس ہے کیونکہ ملکہ عالیہ نیز رادیر میں سب کو پریشان کر کے رکھ دیا۔" کاشف نے پھر سے کلاس لے لی۔

ایسی کوئی بات نہیں کاشف! دراصل میں تھک گئی تھی۔ اتنے دنوں سے پاپا کی پریشانی..... آج انہوں نے خوشی دی تو سمجھ نہیں آیا کس طرح ری ایکٹ کروں۔"۔

اس نے معصومیت سے کہا تو عاشر بس اس کو دیکھ کر رہ گیا۔ اس کے لہجے میں کوئی بناوٹ نہیں تھی، کوئی شرمندہ کرنے والا انداز نہیں تھا۔ وہ جو ابھی تھوڑی دیر پہلے کاشف سے پوچھنے کا سوچ رہا تھا، اسے لگا اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔

وہ اپنی ماں کی تلخ باتیں ذہن سے نہیں جھٹک پا رہا تھا لیکن کشمالہ کی سادہ سی مسکراہٹ میں اس تلخی کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ ان تینوں کو گھر کی طرف رخصت کرتے ہوئے بھی شمائلہ کمال کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا کیونکہ کشمالہ کو ایمرجنسی روم کی طرف لانے کے بعد وہ واپس پلٹ کر نہیں گیا تھا اس کا من روم کی طرف۔

اور نہ اب جانا چاہتا تھا، بے شک شمائلہ کمال تمام عمر وہاں بیٹھی اس کا انتظار کرتی رہتی تھی مگر یہ اس کی خوش فہمی ہی تھی کہ شمائلہ کمال اس کا انتظار کرے گی۔

☆.....☆.....☆

آج جو بے چینی اسے عاشر نے دی تھی اس کے بعد وہ صرف اپنی ماں سے ملنا چاہتی تھی جس نے آخری وقت میں اسے عاشر کا سہارا دے کر روکا تھا۔

اماں! عاشر ابھی بچہ ہے، وہ طارق کی باتوں پر پریشان ہو جاتا ہے۔ شاید ہم دونوں ایک چھت کے نیچے رہ کر اسے بہتر مستقبل نہیں دے سکتے۔ وہ مینٹلی ڈسٹرب رہنے لگا ہے جس کا انجام ایک اور فرسٹریٹ طارق محمود ہوگا۔" شاید بہت ساری باتوں کے بعد اس نے ایک ڈھنگ کی بات کی تھی کہ وہ دونوں ایک چھت کے نیچے رہ بہتر مستقبل نہیں دے سکتے۔

ہاں تم ٹھیک کہتی ہو۔ فرسٹریٹ طارق محمود نہیں، تم ہو لیکن ہم نے تو تمہاری تربیت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ ہم نے تمہیں صرف محبت کے سائے میں رکھا، ہم نے تو تمہارا پیار کسی سے نہیں بانٹا اور نہ ہی حرام رزق کا نوالہ تمہارے پیٹ میں جانے دیا پھر بھی۔"

تب وہ بیگم محبّ عالم کی بات پر مسکرا دی تھی اور آج وہ مسکراہٹ کرچیوں کی طرح اس کے لبوں کو لہولہان کر گئی تھی۔

اس نے چوکیدار کو اپنے ہی گھر کا، اپنی ماں کے گھر کا دروازہ کھولنے کے لیے کہا تھا مگر چوکیدار نے انکار کر دیا تھا۔

ہمیں اجازت نہیں جب تک صاحب یا بیگم صاحبہ نہ کہیں۔"

وہ اس کی گاڑی کو دروازے کے باہر روک چکا تھا۔

"تو کیا اس گھر میں مہمان نہیں آتے، کیا انہیں اس طرح گھر کے باہر سے لوٹا دیا جاتا ہے۔ یہ تو اس گھر کی روایت نہیں"۔ وہ جھنجھلا کر بولی۔ کنویں کے کنارے کھڑے ہو کر پیاس برداشت کرنا خاصا مشکل ہوتا ہے' وہ بھی اپنے گھر کے دروازے پر تھی مگر اسے اندر جانے کی اجازت نہیں دی' اس کے لئے اس سے بڑا المیہ کون سا ہو سکتا تھا۔

"بی بی جی ___ ہمارے پاس مہمانوں کی لسٹ ہوتی ہے' ہمیں پہلے سے پتہ ہوتا ہے پھر بھی اچانک کوئی آجائے تو ہم بیگم صاحبہ سے اجازت لے کر دروازہ کھولتا ہے کیونکہ یہ ہمارے بڑے صاحب کا آرڈر ہے۔"

وہ خاصا مستعد تھا اپنے کام کے معاملے میں۔"

بڑے صاحب کا آرڈر_ یقیناً یہ حرکت تمہاری ہوگی طارق محمود_ تمہارے اسی پروٹوکول اور اسی شاہانہ انداز نے تو زندگی مشکل میں ڈالی ہوئی تھی اور اب بھی....."

"اچھا جاؤ جا کر بیگم صاحبہ کو بتاؤ شمائلہ کمال آئی ہے۔آپ سے ملنا چاہتی ہے۔"اس نے گاڑی دروازے کے بالکل سامنے سے ریورس کرتے ہوئے ایک کنارے پر لگائی اور باہر نکل کر اردگرد کے گھروں کا جائزہ لیتے ہوئے چوکیدار سے اپنا تعارف کروایا۔

وہ بیچارا کیا مزید حیل و حجت کرتا' سر جھکا کر اندر چلا گیا مگر اندر جانے سے پہلے دروازے کا سکیورٹی لاک چیک کرنا نہیں بھولا۔

شمائلہ کو وہاں کھڑے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی' تب ہی دوسری گاڑی کی ہیڈ لائٹس میں وہ اور اس کی گاڑی نہا گئی تھی۔اس نے رات کے اندھیرے میں بھی سن گلاسز بالوں سے اتار کر آنکھوں پر ٹکائے اور آنے والوں کو بغور دیکھا۔

وہ تین لوگ تھے اور شمائلہ کی بدقسمتی تھی کہ وہ ان تینوں کو اب بخوبی جاننے لگی تھی۔

کاشف کو بھی اسے دیکھ کر حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔اس نے ہارن دیا۔چوکیدار ہوتا تو فوری رسپانس آتا۔

"کاشف! یہ خاتون..... یہ تو مجھے شمائلہ کمال لگ رہی ہے"۔کشمالہ تو بیک سیٹ پر نیم براجمان سی تھی اور خولہ نے قدرے حیرانی سے اپنے برابر بیٹھے کاشف کو دیکھا جو اسے خاموش رہنے کا اشارہ کر رہا تھا۔"

پہلے مالا کو اندر لے جاؤ پھر ان محترمہ سے نبٹتا ہوں"۔

اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ خولہ نے بھی سر ہلا دیا۔ دروازہ ابھی تک نہیں کھلا تھا' تب ہی شمائلہ چند قدم چلتے ہوئے ان کی گاڑی کے سامنے آ گئی تھی۔

"یار! یہ عورت تو بالکل پاگل ہے۔ تم گاڑی اندر لے جاؤ، میں دیکھتا ہوں۔ اس نے خولہ کو ڈرائیونگ سیٹ پر آنے کا اشارہ کر کے خود دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔

اب وہ اور شمائلہ مدمقابل تھے۔ شاید یہی شمائلہ کمال کی ایک اور بھیانک غلطی تھی کہ وہ کاشف کیانی سے الجھ پڑی تھی جس کا اس گھر میں قیام سکیورٹی چیک میں اضافے کا باعث بنا ہوا تھا۔

عظیم شاہ کا کیس کورٹ میں چلا گیا تھا اور نعمان ضمانت پر بری ہو گیا تھا۔ نعمان کی واپسی سے گھر میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی' البتہ عظیم شاہ کا کیس معمہ بن گیا تھا۔

فہیم شاہ اور تائی نے اپنے طور پر بہت پوچھنے کی کوشش کی تھی کہ انہیں راحت بیگم کو اغوا کر کے کیا ملا۔ جواباً ان کی پراسراری خاموشی دونوں کا خون جلا دیتی تھی۔ البتہ سفیر کو یقین تھا اس کا باپ یہ حرکت نہیں کر سکتا' اس لئے اس کی ساری توجہ اچھا وکیل ڈھونڈنے اور عظیم شاہ کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے ثبوت اکٹھے کرنے میں لگی ہوئی تھی۔

وہ آج بھی خاص طور پر اس مقصد کے لیے اپنے باپ کے پاس آیا تھا' اس نے جیل انچارج سے ذرا زیادہ ٹائم مانگا تھا۔

عظیم شاہ کو پہلے تو سفیر کا آنا ہی اچھا نہیں لگا' وہ نہیں چاہتے تھے کہ سفیر کی توجہ کاروبار سے ادھر ادھر ہٹے۔ مارکیٹ میں ان دونوں باپ بیٹے کا نام تھا۔ اب اگر باپ نہیں تو بیٹا تو تھا نا سب کچھ چلانے اور سنبھالنے کے لئے۔ عظیم شاہ ہمیشہ اس کی آمد پر ناخوش ہو جاتا اور اسے جلد از جلد بازار پہنچنے کی تاکید کرتا۔

"ابا! آج تو ایک بات بتا ہی دو_ دیکھو تمہارے سچ سے ہماری بھی مشکل آسان ہو جائے گی اور آپ کو بھی....." "تو کیا مطلب..... میں یہاں پر مشکل میں ہوں کیا۔ ناخوش ہوں۔ ارے نہیں بھئی

ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں بہت خوش ہوں' تم خود کو میری خاطر ہلکان مت کرو۔'

'سفیر کو پہلی بار ان کے انداز میں ہلکی سی شفقت محسوس ہوئی۔ اگر یہ تبدیلی ان سے سلاخوں کے پیچھے رہنے کا کرشمہ تھی تو وہ بے ساختہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا' یہ عرصہ بے شک لمبا ہو جائے۔

"ابا! بچوں والی باتوں کا ٹائم نہیں اب....." وہ جھنجلایا۔ اس کا ذہن اب بھی اپنے سوالوں میں الجھا ہوا تھا۔

وہ جاننا چاہتا تھا، ببلو کون تھا اور ببلو کے مرنے کے بعد عظیم شاہ کیسے پیدا ہو گیا تھا۔ اس نے یہ بات گزشتہ رات اپنے چچا اور ماں کے منہ سے سنی تھی، تب سے اس کا تجسس اسے سونے نہیں دے رہا تھا۔

وہ جاننا چاہتا تھا ببلو کون تھا جس کو اس کی ماں نے جی بھر کر گالیاں دی تھیں اور شاید کسی عورت کو بھی.....

"ابا! ایک بات تو بتاؤ، یہ ببلو کون ہے؟" سفیر کا صبر جواب دے چکا تھا۔ عظیم شاہ نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ قدرے حیران نظروں سے جوان بیٹے کو دیکھا جو باپ کی نوجوانی اور لڑکپن کو کرید رہا تھا۔ عظیم شاہ کے چہرے پر تھکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

"ببلو ایک خانہ بدوشوں کا لڑکا تھا، جس کی عظیم شاہ سے بڑی گہری دوستی تھی۔ دونوں صبح و شام اکٹھے ہوتے' ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے غصہ کرتے اور پھر ایک دوسرے کو منع بھی لیتے۔ بس یا کچھ اور ___" عظیم شاہ نے سفیر کو بہلایا بلکہ وہ بڑی حد تک اس کوشش میں کامیاب بھی ہو گیا تھا۔"

دیکھو ابا! اب باتیں بنانے کا وقت گزر چکا' وکیل ثبوتوں اور گواہوں پر کام کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے اس ببلو کی ضرورت پڑ جائے۔ اگر وہ تیرے بچپن کا دوست ہے۔" سفیر نے اپنا تجسس مزید دور کرنے کی کوشش کی۔

"ارے مر گیا وہ..... زندہ ہوتا تو آج عظیم شاہ یہاں ان سلاخوں کے پیچھے بے بس انداز میں

میں نہ بیٹھا ہوتا"۔

یہ ایک اور نئے کہانی تھی' سفیر کا دماغ اس سے زیادہ کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ جھنجھلا کر کھڑا ہو گیا۔

"اچھا ابا! ابھی چلتا ہوں' شام کو آؤں گا ایک وکیل کے ساتھ۔ اللہ کے لیے اس کے ساتھ فلسفہ مت شروع کر دینا۔

دیکھو اگر تم نے راحت چچی کے اغوا کا جرم نہیں بھی قبول کیا تو کچھ دنوں میں یہ پولیس والے خود ہی قبول کروالیں گے لیکن یقین کرو ایک سچ کے بعد پھر کسی جھوٹ کی ضرورت نہیں پڑتی"۔

عظیم شاہ کو اپنا باپ یاد آ گیا تھا جسے اس کو اپنے گھر لانا تو یاد رہا مگر اس کے بعد بھول گیا کہ عظیم شاہ کو بھی اس کی ضرورت ہے۔

اس نے عظیم شاہ بن کر پہلی نفرت اپنے باپ سے ہی کی تھی اور پہلی چوری بھی اپنے باپ کی ہی کی تھی۔ اس کی جیب سے کئی ہزار روپے اڑا لیے تھے اور پیسے لے کر شہزادی کے پاس پہنچ گیا۔

مگر وہاں کوئی ہوتا تو ملتا نا۔ وہ جگہ تو چٹیل میدان ہوگئی تھی اور وہاں کے مکین کہاں چلے گئے تھے' کسی کو کچھ نہیں پتا تھا۔ وہ پورا دن پوری شام وہیں بیٹھا رہا' اسے لگا جیسے یہ شہزادی کی قبر ہو اور اس ملبے تلے وہ اپنے ببلو کے پاس آرام کے ساتھ سو رہی ہو۔

وہ بچوں کی طرح بلکتے ہوئے اسے سوچ رہا تھا مگر شہزادی وہاں ہوتی تو اس کی آہیں سنتی' شہزادی کو تو چاچا بشیر ایک نئی دنیا کی سیر کرانے لے گیا تھا۔

"پھر ایک اور میلے کی دنیا....." اس کے اندر قیامت کی آندھی اٹھی تھی۔

عظیم شاہ کو پہلی بار میلے کی دنیا میں بڑے بڑے اژدھوں نے ڈسا تھا' اس کے پورے جسم پر نیل ہی نیل تھے' زہر ہی زہر تھا۔ اس کی آنکھوں سے بار بار لہو کی طرح کا سیال بہہ رہا تھا مگر کسی کو اس پر رحم

نہیں آ رہا تھا۔

"پتا نہیں کیوں میں اس ویران چٹیل میدان میں پہنچ کر بس ایک ہی نہج پر سوچ رہا تھا اور میری بہت ساری حسیات مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ چاچا بشیر نے میری شہزادی کو کہیں بڑے بڑے سانپوں کے حوالے نہ کر دیا ہو کیونکہ وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔

وہ ایک دلال ہے جو اپنے مطلب کا سودا کرنے کے لئے کچھ بھی داؤ پر لگاتا ہے"۔

میں نے اپنی جیب سے وہ مڑے تڑے نوٹ نکالے' نفرت سے ان پر تھوکا اور ان کے ٹکڑے کر کے ہوا میں اچھال دیے جیسے شہزادی کی قبر پر پھولوں کی پتیوں کو بکھیر دیا ہو۔

میرے قدم بے جان ہو چکے تھے، میں شام کو جب وہاں سے اٹھا تو میرے دل میں ایک اور نفرت اور دشمنی کا پہاڑ کھڑا ہو چکا تھا۔ مجھے اپنا باپ' اپنا حقیقی باپ دنیا کا ظالم مرد لگ رہا تھا جس نے مجھے شہزادی سے جدا کر کے مجھے میری زندگی سے الگ کر کے قید خانے میں ڈال دیا تھا۔

وہ میرا گھر تھا' نہ وہاں کے لوگ میرے اپنے تھے' نہ مجھے کبھی ان لوگوں سے کوئی دلی لگاؤ محسوس ہوا۔ مجھے تو اس شخص سے نفرت محسوس ہوتی ہے جو میرا خون تھا۔ بقول اس کے شہزادی بھی جھوٹی عورت ہے۔ پتا نہیں پیسے کے لالچ میں مجھے کس کے حوالے کر دیا اور خود مجھ سے جان چھڑا لی۔

"ایک بار مل جائے نا تو اس کو قتل ہی کر دوں گا' چاچا بشیر کے خنجر سے"۔

میں پاگلوں کی طرح اسے ڈھونڈنے لگا۔ کوئی سڑک' کوئی گلی' کوئی کچی بستی میں نے نہیں چھوڑی جو مجھے شہزادی کا سراغ دیتی۔ میں تین دن' تین راتوں سے گھر سے باہر تھا۔ چوتھے دن صبح صبح ہوٹل پہنچا' جہاں میں کام کرتا تھا۔ ابھی میرے مالک نے ترس کھا کر ایک پراٹھا اور چائے کا کپ میرے سامنے رکھوایا ہی تھا کہ سامنے سے مجھے میرا باپ دو پولیس والوں کے ساتھ آتا ہوا ___ نظر آیا۔ میں اسے دیکھ کر بھاگنا چاہتا تھا' پیچھے کی طرف یا آگے سے اس کی گرفت سے نکلنا چاہتا تھا مگر پیچھے کوئی نکلنے کا

راستہ بچا تھا اور نہ آگے۔ وہ دو مسٹنڈے میرے سر پر پہنچ گئے تھے اور میرا نام نہاد باپ کہہ رہا تھا۔ "ساری دنیا میں ڈھونڈ رہا ہوں تجھے اور تو یہاں بیٹھا کچھرے اڑا رہا ہے۔ تجھے پتا ہے کتنا پریشان کیا ہے تو نے سارے گھر کو۔ کوئی اسپتال' کوئی تھانہ' کوئی گلی محلہ نہیں چھوڑا جہاں تجھے نہ ڈھونڈا ہو۔ میرے بچے تو کدھر چلا گیا تھا بغیر بتائے۔ بھلا چھوٹی چھوٹی باتوں پر کوئی ایسے بھی ناراض ہوتا ہے"۔

میں جو کچھ اور ہی توقع کر رہا تھا' شاید لاتیں' مکے' گھونسے مجھ پر برسنے والے تھے' وہ کہیں ہوا میں معلق ہو گئے اور یہ ایک شفیق انسان مجھے یوں منا رہا تھا جیسے میں واقعی اس کا روٹھا ہوا بچہ ہوں۔

وہ مجھ جیسے گندے میلے بدبودار لڑکے کو خود سے لپٹائے بیٹھا تھا اور میرا دل حیرانی کے عالم میں بھی کسی کمزور دروازے کی طرح دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔

اس نے مجھے اپنے ساتھ لگائے پولیس والوں کا شکریہ ادا کیا' ہوٹل والوں کا شکریہ ادا کیا۔

"صاحب! یہ ہمارے پاس کب تھا' ابھی تو آیا' اس کی حالت دیکھو نا جیسے کسی دلدل سے نکل کر آیا ہو"۔

اس مالک کو بھی سچ بولنے کی عادت تھی' میرے باپ نے ایک سرزنش کرتی نگاہ مجھ پر ڈالی اور یوں اس وقت کی وہ محفل برخاست ہوئی۔

مجھے پتا تھا میں واپس جہنم کی طرف جا رہا ہوں۔ ہاں میں اپنے باپ کے گھر کو جنت نہیں کہہ سکتا تھا' وہاں قدم قدم پر میرے لیے کانٹوں کی باڑ تھی' میں اپنی مرضی سے کسی کمرے میں نہیں جا سکتا تھا' میں اپنی مرضی سے کسی بچے سے بات نہیں کر سکتا تھا' میں اپنی مرضی سے کھا نہیں سکتا تھا۔

وہاں پر میرے جیسے جو بھی بچے تھے' خوب کھیلتے ہنستے اور مستی کرتے۔ میں انہیں حسرت سے دیکھا کرتا تھا کیونکہ وہ مجھے نفرت سے تکا کرتے۔ مجھے انہوں نے قبول تو کیا ہی نہیں تھا نا۔

مجھ سے پہلے وہاں اس گھر میں عظیم' ندیم اور درخشاں تھے۔ ایک سے بڑھ کر فتنہ ساز پھر ان کی

امی تھیں اور ان کی دادی۔

ان پر ہر وقت جان نچھاور کرنے والی دو عورتیں مجھے ہمیشہ مشکوک نگاہوں سے دیکھتی تھیں۔ دادی تو باقاعدہ نفرت کرتی تھیں اور وہ نفرت کبھی کبھی ان کے لہجے سے بھی عیاں ہو جاتی تھی۔ مجھے لہجوں اور رویوں کی زبان بخوبی آتی تھی۔

میں حیران ہوتا تھا کہ میں نے ان کا کیا بگاڑا ہے۔ میں تو ان کے بچوں کی ہر کڑوی کسیلی بات اور بدتمیزی بھی سہہ جاتا ہوں کیونکہ وہ مجھے برے نہیں لگتے تھے' وہ تینوں ہی مجھ سے چھوٹے تھے اور پھر میں عمر کے اس موڑ پر تھا کہ جہاں نہ کوئی مجھے بچہ کہتا اور نہ لڑکا۔

عجیب بے ڈھنگی سی عمر ہوتی ہے۔ یہ بھی کسی خودرو بیل کی طرح جس منڈیر سے لگا دو' بڑھنا شروع ہو جاتی ہے اور جدھر موڑ دو مڑ جاتی ہے۔

میں جب پہلے دن اس گھر میں آیا تھا تو میرے باپ نے بڑی بہادری کے ساتھ مجھے سب کے سامنے پیش کر کے کہا تھا۔

"یہ عظیم شاہ ہے' آج سے ہمارے ساتھ رہے گا اسی گھر میں"۔ شاید میرا نام دبنگ تھا یا پھر میرا چہرہ یا پھر میرے باپ کی رعب دار آواز کا کرشمہ کہ ہر چلتا ہاتھ اپنی جگہ ساکت ہو گیا تھا۔

اور پھر جب وہ سکتہ ٹوٹا تو مجھے نہیں پتا میری اس گھر میں کیا شناخت بنی لیکن میں مجرم سا ضرور بن گیا۔

ہر وقت شک اور تذلیل بھری نگاہوں نے مجھے عظیم شاہ اور ببلو کے بھنور میں الجھا دیا۔ دل کہتا ببلو بن کر سب کو بتا دو کہ میں ہوں کون اور کیا کر سکتا ہوں اور دماغ کہتا۔ عظیم شاہ بن کر بھی ان سب کو ان کے رویوں کا جواب دیا جا سکتا ہے۔

میری یہ کشمکش اس وقت سے شروع ہو جاتی جب ناشتے کے بعد بچے سکول چلے جاتے اور وہ دونوں عورتیں مجھے مختلف کاموں کے لیے ادھر سے ادھر دوڑانا شروع کر دیتیں۔

میری ذرا سی کوتاہی پر ان کا طمانچہ تیار ہوتا اور میرے باپ کے آنے پر میری شکایتوں کا سلسلہ۔

میں جاہل ہوں' گنوار ہوں' بدتمیز ہوں اور پتا نہیں کیا کیا ہوں۔ یہ اس دادی کے الفاظ ہوتے جو مجھے بے بے جیسے لگتی تھی جسے دیکھ کر میرا دل چاہتا تھا میں چاچا بشیر بن جاؤں۔

جب وہ مجھے حرام کی اولاد کا طعنہ دیتی تو میرے اندر کی نفرت اور دشمنی شیطانیت کا روپ دھارنے لگتی اور مجھے میلے سے لے کر ہوٹل تک اور ہوٹل سے لے کر تھانے تک کا ہر منظر وحشت کے راستے پر لے جاتا۔ اس وحشت کا نتیجہ یہ تھا کہ کبھی مجھ سے برتن گر جاتے' کبھی راشن بکھر جاتا' کبھی پیسے گم ہو جاتے تو کبھی میں چھت کے کونے پر بیٹھ کر شہزادی کو کوسنے دینا شروع کر دیتا۔

جس نے پہلی غلطی مجھے پیدا کرنے کی کی تھی۔

دوسری غلطی مجھے میرے باپ کے حوالے کر دیا تھا جو خود تو پورا دن گھر سے باہر رہتا اور میں خود کو گدھوں کے درمیان محسوس کرتا۔

شاید دادی کی انہی باتوں سے تنگ آ کر میرے باپ نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ مجھے اسکول میں داخل کروا دے۔

میری عمر کے لڑکے کو کون سے اسکول میں کس کلاس میں داخلہ ملتا یہ بھی ایک لمبی داستان ہے۔

جب اس داستان کا اختتام ہوا تو میں ایک مدرسے میں پہنچ چکا تھا۔

"کم از کم تمہیں دین کا شعور اور قرآن پاک پڑھنا آنا چاہیے۔ مسلمان باپ کی اولاد ہو، مسلمان گھر میں پیدا ہوئے ہو۔ پتا نہیں کسی نے اذان بھی دی ہوگی یا نہیں"۔

یہ ایک اور طعنہ تھا اور مجھے یقین تھا کسی نے اذان تو دی ہوگی۔ میری شہزادی میرے معاملے میں کوئی کوتاہی اور غفلت نہیں کر سکتی تھی۔ وہ وقت اور ماحول سے آگے چلنے والی عورت تھی۔

میں پھر اس عورت کو تلاشنا چاہتا تھا' پتا نہیں کہاں چلی گئی تھی میری زندگی جہنم بنا کر۔

ہاں میں سچ کہہ رہا ہوں' یہ مدرسہ جہاں میرے جیسے بہت سارے قیدی تھے' پچھلے والے جہنم سے بڑا جہنم تھا' جہاں مجھے چوبیس گھنٹے رہنا تھا ہر گھنٹے کی قیمت ادا کرتے ہوئے۔ کبھ

ی خیرات مانگنے کے لیے جانا پڑتا' کبھی خدمت کے عوض نیند کا سکھ ملتا ورنہ ہاتھ پاؤں باندھ کر الٹا بھی لٹکا دیا جاتا۔ اور کبھی دو لفظ یاد نہ کرنے کی پاداش میں روٹی کا لقمہ بھی مجھ سے چھین لیا جاتا۔ یہ تھی اس مدرسے کی زندگی جہاں سب ایک ہیں جیسے لمبے چغے میں ملبوس صبح سے شام تک درس' تبلیغ کی باتیں کرتے اور سنتے' قرآن پڑھاتے اور جب دل چاہتا اس کی تعلیمات کو فراموش کر کے بے رحم انسان بن جاتے۔

یہ دوہری زندگی بڑی کربناک تھی' ایک طرف نیکی گناہ وثواب کی تعلیم اور دوسری طرف درندگی کا مظاہرہ۔

مجھ سے بہتر کون جان سکتا تھا انسان کون سی حد عبور کرتا ہے تو شیطان اس کا دوست بن جاتا ہے۔

آپ نے دیکھی میری بدقسمتی' بڑے تسلسل کے ساتھ میری زندگی میں صرف بدقسمتی نے احاطہ کیا ہوا تھا۔

میں ہر بار قسمت کے چکر میں الجھتا اور اس کے ساتھ لفظ "خوش" کا کوئی وجود نہ ہوتا۔ ہوتے ہیں کچھ لوگ میرے جیسے بھی لیکن سوچنے کی بات یہ تھی کہ میرے جیسے لوگ دنیا میں آتے ہی کیوں ہیں اور بس اس سوچ کے ساتھ میں بڑا ہوتا' رہا بڑا ہوتا رہا' وقت گزرتا رہا' کبھی مدرسے میں' تو کبھی گھر میں۔

قرآن تو مجھے کیا صحیح پڑھنا آتا' البتہ نماز روزے کا پابند ہو گیا۔ باتیں کرنا بھی آ گئیں۔ بڑی بڑی باتیں' درس وہدایت کی باتیں۔

میرا باپ میری فراست پر بڑا خوش ہوتا' خود کو شاباش دیتا کہ اس نے ایک صحیح فیصلہ کیا مجھے مدرسے بھیجنے کا۔ اب میں اسے کیا بتاتا کہ ہفتے کا ایک دن صرف تمہارے ساتھ گزرتا ہے' باقی کے دن

میں کیا کرتا ہوں' تم کیا جانو۔ اور پھر وہ واقعی میں کبھی کچھ نہ جان سکا کہ ببلو اور عظیم شاہ کی جنگ میں جب جیت ببلو کی ہوتی ہے تو پھر کیا ہوتا ہے۔

پھر جب ببلو کو شہزادی جیسی کوئی بھی عورت نظر آتی ہے تو کیا ہوتا ہے' کیسے اس کے اندر خون کی جگہ زہریلا تیزاب دوڑنے لگتا ہے جو اندر اور باہر کے ہر وجود کو خاکستر کر دیتا ہے۔

میں کافی بڑا ہو چکا تھا جب میری مدرسے کی تعلیم و تربیت ختم ہوئی' مجھے مستقل اپنے باپ کے گھر آنا پڑا۔ میں نے کہا نا میں اس کو کبھی اپنا گھر نہیں کہہ سکا کیونکہ مجھے کوئی بھی اپنا بچہ نہیں کہہ سکا۔

میرا باپ بھی پتہ نہیں کون سے ضمیر کے بوجھ اتار رہا تھا' سو میری ضرورتوں سے غافل نہیں ہوا لیکن ویسی محبت بھی نہیں کر سکا جیسی فہیم شاہ اور خصوصاً ندیم شاہ سے کرتا تھا۔

میں جب مستقل گھر لوٹا تو درخشاں کافی بڑی ہو چکی تھی' وہ کوئی بہت زیادہ شرمیلی لڑکی نہیں تھی لیکن مجھ سے باقاعدہ پردہ کرتی تھی۔ دادی نے اس کو میرے سامنے نہ آنے کی خصوصی ہدایت کر رکھی تھی۔ بھلا یہ بھی کوئی بات تھی پھر تو میں اس گھر کا بیٹا نہ ہوا نا' میں ان کا بھائی تو نہ ہوا نا۔

فہیم اور ندیم انگریزی اسکولوں میں گئے' تعلیم حاصل کرنے' پینٹ شرٹ پہن کر خوب شان سے بڑی سی وین میں بیٹھ کر جاتے رہے اور میں کبھی ایک دروازے سے خیرات لیتا اور کبھی کسی دکان سے چندہ مانگنے کے لیے بھیج دیا جاتا۔

میرا دل چاہتا نفرت سے ان کا گلا گھونٹ دوں اور میں سچ بتاؤں، ایسا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ میں ان سے لڑنے کے انوکھے طریقے ڈھونڈتا تھا' میں نے اس خرگوش کو زہر پلا دیا تھا جو ان دونوں کی جان تھا جس کو بڑے پیار سے گھر لائے تھے۔

یہ زہر میں انہیں بھی پلا سکتا تھا لیکن میں انہیں تڑپتا' بلکتا' روتا دیکھنا چاہتا تھا' زہر سے تو ایک دم موت آ جاتی ہے اس کا کیا فائدہ۔

میرے باپ نے گھر والوں سے اختلافات کو دیکھتے ہوئے مجھے اپنے ساتھ لے جانا شروع کر دیا۔ ویسے بھی اب میں اتنا بڑا ہو چکا تھا کہ مجھے گھر میں برداشت تو نہیں کیا جا سکتا تھا اور کمائی تو شائد میں بچپن سے ہی کر رہا تھا' اس لئے یہ نہیں کہہ سکتا کہ اب میرے کمانے کھلانے کی عمر آ گئی تھی۔

بہر حال یہ میرے باپ کا شاید مجھ پر پہلا احسان تھا کہ اس نے مجھے اپنے ساتھ آڑھت کے کاروبار میں لگا دیا۔ تعلیم تو خیر نہ ہونے کے برابر تھے لیکن حساب کتاب میں اچھا تھا۔ یہ تربیت مجھے مدرسے میں ہی ملی تھی کہ میں اچھی خاصی منشی گری کر لیتا تھا۔

باپ کو شاید میری صلاحیتوں کا اندازہ نہ تھا اور اندازہ تو مجھے خود بھی نہ تھا کہ یہ دنیا مجھے اس قدر راس آئے گی۔ مجھے تو یہ لگا جیسے میں بنا ہی اس میلے کی دنیا کے لئے تھا۔

سودا عیاری سے کرو یا ہیرا پھیری سے' گاہک پر محنت کرو یا اسے دھوکے سے اپنا کر لو' میرے لیے سارے فارمولے یکساں تھے۔ میں بس اتنا جانتا تھا مجھے ایک دن اس بازار کا گروہ بننا ہے اور مجھے ان سب پر حکمرانی کرنی ہے جو خود کو بڑے بڑے ناموں سے کہلوانا پسند کرتے ہیں اور جن کے ساتھ ان کے بڑے بڑے خاندانی نام لگے ہوتے ہیں۔ مجھے ناموں کی اس دنیا سے بہت آگے جانا تھا اور اس مقام تک جانے کے لئے میں ہر حربہ اختیار کرنے لگا۔

پھر زیادہ دن نہیں گزرے جو لوگ مجھے اوئے عظیمے کہہ کر پکارتے تھے' وہ مجھے میرے نام سے پکارنے لگے۔ وہ مجھے عظیم شاہ بلانے لگے بڑے احترام کے ساتھ۔

میرے باپ کو حیرت ہوتی تھی اپنے پھلتے پھولتے کاروبار پر' لیکن مجھے ہنسی آتی تھی لیکن مجھے کیا پتا کس وقت کا بے رحم لمحہ مجھ پر ہنسنے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ وہ مجھے ان راستوں پر لے کر جا رہا ہے جن کا انجام صرف دلدل ہوتا ہے' رسوائی اور تنہائی کی دلدل۔

وہ ایک تاریک برستی رات تھی میں دیر سے گھر آیا تھا اور شاید کچھ بھی کر بھی آ گیا تھا۔ مجھے نہیں یاد کہ دروازہ کھلا ہوا تھا یا کسی نے میرے لئے کھولا تھا۔ البتہ میں جب اپنے خستہ حال کمرے کی طرف

بڑھا تو مجھے دادی کی آواز آئی۔ ان کا لہجہ خاصا بلند تھا اور وہ شاید اپنے بیٹے سے مخاطب تھیں لیکن میرے لئے اہم بات کسی خانہ بدوش عورت کا ذکر تھا۔

میں ٹھٹک کر رک گیا اور کھڑکی کی طرف چلا آیا' جہاں سے آواز واضح تھی۔

"جب تم اس گناہوں کی پوٹ کو اٹھا کر لائے تھے تو میں نے تمہیں اسی وقت کہہ دیا تھا' کبھی اس کے حق حقوق کی بات نہیں کرنا' اس سے نسل چلانے کا مت سوچنا' جانے کس کا گناہ ہے جو تیرے حصے میں آیا' کیا تو جانتا ہے وہ خانہ بدوش عورت اتنی پاکباز عورت تھی جتنی تو نے سمجھا۔"

یہ دادی کی پاٹ دار آواز تھی جو رات کی تاریکی کو چیر کر میرے سینے کے آر پار ہو گئی تھی۔

"یہ کون سے حق' حقوق کی بات کر رہی تھی' اب تو میں بھی اس گھر کا کفیل ہوں۔ آج اگر ہاتھ روک دوں تو ساری عیاشیاں مٹی میں مل جائیں"۔

میری سوچ کا زہر میرے چہرے تک آ گیا تھا لیکن میں ضبط سے کھڑا رہا۔

میرا باپ کہہ رہا تھا۔"

اماں! وہ اس گھر کا کماؤ پوت لڑکا ہے، بڑا ہو گیا ہے، اس کی شادی کرنا میرا فرض ہے۔ میں اسے جب اس گھر میں لایا تھا تب آپ کو سب بتا دیا تھا۔ آج بھی اس کو دیکھ کر احساس نہیں ہوتا کہ وہ ہو بہو میری جوانی کی شکل ہے اور پھر اس خانہ بدوش عورت نے تو مجھ سے کچھ نہیں لیا تھا"۔

اس کی آواز گہری آہ کے ساتھ ابھری تھی۔ ہاں یہ میرے باپ کی ہی بھاری آواز تھی اس کے وجود کی طرح جو مجھے اچھی لگی کیونکہ اس نے خانہ بدوش عورت کے بارے میں کہا تھا کہ اس نے کچھ نہیں لیا تھا مجھ سے۔

"تم کچھ بھی کہو' شکلیں ملنے سے لوگ اپنا خون نہیں بن پاتے۔ میں اس وقت تمہاری ضد سے ہار گئی تھی اور بہو کو بھی سمجھا دیا تھا' اب تم اچھی طرح سمجھ لو' ہے تو یہ ہمارے لئے غیر ہی۔ درخشاں بھی بڑی ہو گئی ہے' بہتر ہے کہ اب یہ کہیں اور ٹھکانا کر لے۔" وہی کرخت اور تیز دھار آواز۔

"اماں! پتا ہے اس وقت جو میرے کاروبار کو آپ آگے بڑھتا دیکھ رہی ہیں' وہ سب اس کی وجہ سے ہے۔ مجھے نہیں پتا اس لڑکے کے ہاتھ میں کیا گیدڑ سنگھی ہے جس چیز کو ہاتھ لگاتا ہے' سونا بن جاتی ہے۔ مجھے بڑا سکون ہو گیا ہے اس کے ہونے سے۔ اب دیکھنا درخشاں کی شادی بھی ہم دھوم دھام سے کریں گے اور اور فہیم' ندیم تو میں چاہتا ہوں' خوب پڑھیں' خرچے کی تنگی کبھی نہیں ہو گی۔

میرا باپ خوب میری پیروی کر رہا تھا' میں نے سوچا' ہاں یہ شخص عزت کے لائق ہے مگر یہ عورت..... نہیں یہ عورت عزت کیا زندہ رہنے کے لائق نہیں"۔ میرے اندر چھپے ہوئے ببلو کا زہریلا خون ابال دینے لگا تھا۔

❁ ❁

ناول خواب خواہش اور زندگی ابھی جاری ہے۔ مزید واقعات اگلے صفحات میں پڑھیں۔

ماورا طلحہ کا بہت خوبصورت نیا ناول

مرگِ تمنا

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

تنزیلہ ریاض کا بہت خوبصورت نیا ناول

نور القلوب

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

قسط نمبر 10

"بس کرو میں کچھ نہیں جانتی' اب اس کا ٹھکانہ الگ کرو۔ کم از کم میرے اس گھر سے اس کی شادی نہیں ہو سکتی' نہ بہو ایسا ہونے دے گی۔ اس پر تم نے سوت بٹھا دی تھی' وہ صابر ہے اور میرے دباؤ کی وجہ سے چپ ہے ورنہ اسے حقیقت پتا ہوتی تو آج سارے خاندان میں تماشا لگ چکا ہوتا۔

دادی بڑی کٹھور تھی' بالکل شہزادی کی ماں کی طرح۔

"اوہ تو شہزادی سوت تھی' جب ہی....." میرے اندر سے کسی کی سسکاری ابھری۔ تاریک راتوں میں ابھرنے والی سسکیوں نے کرب آمیز چیخوں کا روپ دھارا۔

"ماں بس ختم کریں' رات گئی بات گئی۔ اب نہ وہ وقت رہا نہ لوگوں کو یاد ہے عظیم شاہ کہاں سے آیا تھا' اب تو وہ بہت ذمہ دار ہو گیا ہے۔ شروع میں تھے اس کے مسائل اور ظاہر ہے جس ماحول سے وہ آیا تھا جن لوگوں میں وہ بڑا ہوا تھا۔ اس کا اثر تو ہو گا لیکن شکر ہے پروردگار کا وہ میرا بیٹا کہلانے کے لائق بن چکا ہے اور میرا بازو بھی"۔

میں بلاوجہ اپنے باپ سے بدگمان رہتا تھا' مجھے شرمندگی تو نہیں' البتہ زندگی میں کسی کمی کا احساس ضرور ہوا۔ میں آج تک اسے ابو نہیں پکار سکا تھا اور نہ کبھی دل سے احترام دے سکا تھا۔

"بس چپ کر جا پتر! نہ مجھے رات کے اس پہر تنگ کر..... دیکھ تیرا لاڈلا ابھی تک گھر نہیں لوٹا ہو گا۔ جا تو بھی سو جا اور مجھے بھی سونے دے۔ میرا تو وہ نہ پوتا ہے اور نہ اس کی شادی کا ارمان ہے مجھے۔ میں تو اپنے فہیم اور ندیم کی شادیاں دھوم دھام سے کروں گی' اللہ مجھے ان کے دن دکھائے۔

''درخشاں والے بھی تاریخ مانگ رہے ہیں اس کی تیاری کر لے"۔

وہ اکتائے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

"بس درخشاں کی شادی کے ساتھ ہی میں عظیم کے فرض سے بھی بری الذمہ ہونا چاہتا ہوں۔ آپ نسرین کے لیے بات کرلیں"۔

رسان بھری آواز ابھری۔

"تیرا دماغ چل گیا ہے' وہ لوگ نسرین کا رشتہ عظیم کو دیں گے' ہرگز بھی نہیں۔ نسرین کی ماں کا دماغ دیکھا ہے' ساتویں آسمان سے ٹکراتا ہے۔" وہ یک دم چیخ اٹھی تھیں۔ نسرین ان کے کسی رشتے دار کی بیٹی تھی' اب رشتے ناتے بھی تو عجیب تھے۔ مجھے آج تک سمجھ نہیں آئے تھے اور خیر ان کو سمجھ کر مجھے کرنا بھی کیا تھا۔

میں خود جانتا تھا نسرین جو کبھی اس گھر میں آتی تھی تو اس کی نظریں مجھے ضرور تلاش کرتی تھیں اور کیوں نہ کرتیں' میرے جیسا چھ فٹ کا مرد اس پورے خاندان میں کوئی نہیں تھا۔ بد دماغی اور بدلحاظی کے وصف الگ تھے جو صنفِ نازک کو ہمیشہ اٹریکٹ کرتے ہیں۔

تب میں نے سوچا۔ دادی تیری یہ خواہش بھی میں پوری کروں گا لیکن اس سے پہلے تجھے شہزادی کو بے عزت کرنے کی سزا تو ضرور دوں گا۔

اور اس رات میں نے دادی کو مارنے کی ہاں قتل کرنے کی پوری کوشش کی مگر وہ بچ گئی۔

مجھے اس کی کمزوری پتا تھی' وہ اندھیرے کمرے میں نہیں سو سکتی تھی۔ میں نے پورا گھر تاریک کر کے اس کے منہ پر تکیے کا دباؤ ڈالا ہی تھا کہ دروازے پر کھٹکا ہوا اور مجھے پچھلے دروازے سے نکلنا پڑا' ورنہ صبح سب کو دادی مری ہوئی ملتی۔ میرا انتقام تو پورا ہو چکا ہوتا' مجھے کیا فرق پڑتا۔

ہاں میرے اندر بسنے والا ببلو ایسا ہی تھا' بے رحم' بے خوف اور بے نام۔ اسے عزت بے عزتی

سے کوئی سروکار نہیں تھا۔

آج میرا بیٹا مجھ سے پوچھ رہا تھا' ببلو کون ہے۔اس کی گواہی چاہیے ہوگی۔

کتنا پاگل ہے' بھلا ببلو کا اتا پتا عظیم شاہ بتا سکتا ہے۔کبھی نہیں' وہی تو اس کی ڈھال ہے اس کی طاقت' یہ دونوں اگر الگ ہو گئے تو مر جائیں گے۔

☆.....☆.....☆

آج بہت دنوں کے بعد مسکن میں سکون کی ہوا چلی تھی۔راحت بیگ نے کچن میں جا کر اپنی پسند کا کھانا بنایا تھا۔اپنے بھائیوں کے ساتھ ڈھیر ساری باتیں کی تھیں۔اگرچہ آواز مدہم تھی لیکن اس میں اطمینان تھا' دوبارہ زندگی ملنے اور عزت سے گھر واپس آنے کا اطمینان لیکن انہوں نے ابھی تک اپنے ساتھ بیتنے والے کسی بھی لمحے کی اذیت نہ دہرائی تھی اور نہ ہی کسی میں اتنی ہمت ہو رہی تھی کہ کوئی پوچھے۔ بس یوں لگتا تھا کہ وہ قطرہ قطرہ پگھل رہی ہیں۔

"بھائی صاحب! بس اب ہمیں بچوں کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہیے۔میں چاہتی ہوں شجاع کی امانت عزت و آبرو کے ساتھ اس کے حوالے کر دوں اور پھر یہ دونوں یہاں سے چلے جائیں۔یہ وقت بہت تکلیف دہ ہے"

انہوں نے شجاع کے بابا کو التجائیہ نظروں سے دیکھا تھا جو ان کی گھر واپسی سے ایک دن پہلے دبئی سے اچانک مسکن پہنچے تھے اور پھر اس دن سے لے کر اب تک وہ متواتر اپنی بہن کے دلجوئی میں لگے رہے جو عجیب و غریب قسمت لے کر پیدا ہوئی تھی۔

شادی کے محض تین سال کے بعد بیوگی اور تنہائی نے اسے عجیب درویش صفت بنا دیا تھا' صوفیہ کے لیے زندگی کی ہر خوشی اور آرام کو تیاگ دینا تمام زندگی ندیم شاہ کی بیوہ کے نام پر گزار دینا ان کا حوصلہ تھا۔کئی سالوں تک وہ اپنی بہن کو مجبور کرتے رہے کہ وہ شادی کر لیں۔اپنی زندگی کو نئے سرے سے جینے

کی کوشش کریں مگر ان کی ایک ہی تکرار ہوتی تھی۔

"میرے لئے صوفیہ کافی ہے' میں اس کے ذمہ داریاں خوش اسلوبی سے پوری کرلوں' اسے اچھا مستقبل دے دوں کافی ہے' باقی اب میرے اندر کوئی خواب نہیں پلتا"۔

اور آج بھی ان کے چہرے پر ان کی آنکھوں میں ایک ہی تکرار تھی کہ مجھے صوفیہ کا مستقبل محفوظ کرنا ہے۔ بھائی نے انہیں اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔

"چلو شادی کی تیاریاں کرو' بس اب دیر نہیں کرنی۔ آج چلتے ہیں پہلے کسی ہوٹل کی بکنگ اور دیگر انتظامات وغیرہ کی طرف۔

شاپنگ پر لڑکیوں کو لگا دو اور کیا کیا کرنا ہے' میں بھائی جان سے مشورہ کرتا ہوں۔ تم کوئی ٹینشن نہیں لوگی' سب گڈ ہوگا لیکن اس سے پہلے..... چلو خیر بعد میں بات کرتے ہیں۔"

شجاع کی آمد پر گفتگو کا تسلسل ٹوٹا تھا جس کے چہرے پر دبی دبی سی مسکراہٹ تھی' شاید اس کے کانوں میں کوئی آواز پڑ گئی یا پھر اسے پتا تھا آج کل ان بہن بھائیوں میں ایک ہی موضوع زیر بحث ہے۔

"جی برخوردار..... آج کل آپ کہاں غائب رہتے ہیں' میں نے آپ کو راحت کی حفاظت اور اس کے خیال کے لئے یہاں بھیجا تھا اور آپ کے ہوتے..... صد افسوس۔"

وہ ہمیشہ اسی انداز میں سرزنش کرتے تھے' راحت بیگ نے ڈھیر سارا پیار نظروں میں سمو کر اپنے مہربان سے بھائی کو دیکھا اور پھر شجاع کو جو مدد طلب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"آپ کے ہوتے صوفیہ چلی گئی' وہ آدمی دفتر میں گھس گیا۔ راحت کے ساتھ اتنا بھیانک..... ایسا کچھ بھی نہیں ہونا چاہیے تھا شجاع_ ائی ایم ڈیم سیریس"۔

"بھائی صاحب! شجاع کو کیوں ڈانٹ رہے ہیں یہ تو جب سے پاکستان میں ہے" سائے کی طرح میرے ساتھ' میری ہر مشکل میں کھڑا رہا ہے۔ اس دن بھی اگر یہ نہ آتا تو صوفیہ کے تایا تو ہر برباد

کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ وہ نرمی سے بولیں۔

" کیا کہوں راحت تمہاری معصومیت کو' تم اب بھی ان لوگوں کے لئے اتنا humble ہو کر سوچتی ہو جنہوں نے آج سب کچھ خاکستر کر دیا۔

عزت مان اور سب سے بڑھ کر اس گھر کے خوشیاں' تمہاری زندگی کی خوشیاں۔" وہ تاسف سے بولے تو راحت بیگم کی آنکھوں میں یکدم آنسو بھر گئے۔

"بھائی جان! وہ ان کا فعل ہے اور یہ میرا مقدر' میں ان کے ذہن اور سوچ کے مطابق تو نہیں ہو سکتی۔ مجھے تو وہ وقت بھی یاد ہے نا جب ندیم شاہ نے مجھے اسی گھر میں ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھا تھا۔ میرے لئے وہ ہر فرد سے لڑ پڑتا تھا۔ اس نے تو میری زندگی میں ایک پل کے لئے بھی کوئی کمی نہیں آنے دی میں بھلا وہ وقت بھلا سکتی ہوں"۔

وہ اس وقت مکمل ندیم شاہ کی یادوں میں محصور ہو چکی تھیں۔ "اور ندیم شاہ کا بھائی..... پھوپھی جان....." یہ الفاظ شجاع کے تھے جو ان کے پاس ان کا ہاتھ تھام کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ بہت کچھ جانتا تھا' بہت سارا کچھ جاننا چاہتا تھا۔ اس گرہ کو کھولنا چاہتا تھا جو راحت بیگم کو درویشی اور تنہائی کی زندگی کی طرف لے گئی تھی۔

"پتا نہیں میں آج تک اس شخص کو نہیں سمجھ پائی' میں نے ایک دفعہ ندیم سے اس بات پر گھنٹوں بحث کی تھی کہ وہ ایسے کیوں ہیں' کوئی نفسیاتی کجی ہے جو ان کو ڈسٹرب رکھتی ہے۔

ہجوم بھی ان کے اندر کی تنہائی کو دور نہیں کرتا' وہ بظاہر مسکرا رہے ہوں ___ مگر ان کا چہرہ عجیب سے اذیت میں ہوگا' انہیں خوش ہونا آتا ہی نہیں تھا' نہ ہی میں نے کبھی اس آدمی کو قہقہہ لگاتے دیکھا"۔

وہ بے ساختہ بولتی چلی گئی تھیں۔

"پتا ہے بھائی جان! مجھے تو یہ لگتا ہے کہ ان کے سامنے کوئی ہنسے، مسکرائے، شرارت کرے تو انہیں

برا لگتا ہے۔ مجھے تو ندیم شاہ ہمیشہ اس ماحول سے دور لے جاتے تھے اور اگر اماں کی خواہش نہ ہوتی تو میں کبھی اس گھر میں جا کر نہ رہتی۔ یہ وہ واحد فیصلہ تھا جو ندیم نے اپنی مرضی سے کیا تھا۔

ورنہ ہم تو اپنی جنت اور اپنے گھر میں بہت خوش تھے بہت مسرور....."

وہ جیسے کسی اور ہی دنیا میں چلی گئی تھیں۔ شجاع اور اس کے بابا چپ سادھے ان کو دیکھ رہے تھے جن کی آنکھوں میں ماضی کسی فلم کی طرح چلنا شروع ہو گیا تھا اور جب ماضی کے پردے چاک ہونا شروع ہوتے ہیں تو بہت کچھ عیاں ہوتا ہے۔

راحت بیگم نے بھی جب ماضی کے تلخ و شیریں اوراق پلٹنا شروع کیے تو کسی پل عظیم شاہ سے ہمدردی اور کسی پل عظیم شاہ سے نفرت شدید ہو جاتی۔

"ہم لوگ جب اس گھر میں آئے تو نسرین بھابھی پہلے سے تھیں' ان کے بچے اور اماں' فہیم بھائی اور بہت دنوں بعد پتا چلا کہ میرے بھائی بھی یہیں رہتے ہیں' ورنہ تو وہ کوئی مہمان لگتے تھے' کبھی کبھی نظر آ جاتے۔ میں سوچتی شاید کسی دوسری جگہ بھی کاروبار ہے۔

کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ ان کی نسرین کے ساتھ انڈرسٹینڈنگ نہ ہو' وہ مینٹل پیس (ذہنی سکون) کے لئے بھاگتے ہوں گھر سے"۔ بھائی کی آنکھوں میں تجسس ابھرا۔

"ایسا بھی تو ہو سکتا ہے' نسرین بھابھی آج بھی بڑی مشکل خاتون ہیں' میں نے ان کے چہرے پر بھی ہمیشہ بل دیکھے کیا بچے تو کیا بڑے سب کے ساتھ ایک ہی رویہ میرے ساتھ تو خیر سمجھ آتا تھا لیکن"۔

"کیا لیکن۔" شجاع کو بھی بے چینی ہوئی۔

"مجھے ندیم نے بتایا تھا کہ عظیم شاہ ان کے سگے بھائی نہیں ہیں اور وہ صرف ان کے والد کی خواہش پر اس گھر میں آئے اور رہے"۔

"کیا مطلب_ کیا وہ پہلی بیوی کی اولاد تھے"۔

"اب اس کا تو ندیم کو بھی نہیں پتا تھا' وہ ان کے گھر میں بارہ' تیرہ سال کی عمر آئے' پھر جیسے تیسے مدرسے کی تعلیم مکمل ہوئی تو وہ اپنے والد کے ساتھ کاروبار میں لگ گئے۔

پھر اسی دوران دادی کا انتقال ہو گیا' میں نے یہ بھی سنا کہ دادی اس کو اس گھر میں کسی صورت برداشت نہیں کرتی تھیں' اسی لیے ایک رات انہوں نے دادی کی آنکھوں کے سامنے اپنا پھل دار چاقو لہراتے ہوئے کہا تھا کہ اگر میری زندگی مشکل کی تو میں قتل کر دوں گا۔ یہ منظر اماں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اس وقت عظیم شاہ کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ اس کے بعد دادی تو کیا اماں بھی ان سے خوف کھانے لگی تھیں۔"

"تو اس کے بعد انہیں گھر میں رکھنے کی کیا ضرورت تھی نکال باہر کرتے ایسے آدمی کو' اولاد اگر اس حد تک چلے جائے تو اس کی جگہ مینٹل اسپتال ہوتی ہے"۔

شجاع کے بابا کا لہجہ قطعیت لئے ہوئے تھا' چاچا نے بھی تائید میں سر ہلا دیا۔

لیکن اس وقت تک پورے کاروبار کو اپنے قبضے میں لے چکے تھے' گھر کا سارا نظام ان کے ہاتھ میں تھا' ان کا اس گھر میں رہنا ان کے والد کی بھی مجبوری بن چکی تھی۔ بہر حال بہت عجیب و غریب قصے تھے اس گھر کے"_

وہی یکدم جھرجھری لے کر کھڑی ہو گئیں۔

لیکن مجھے کیا پتا تھا کہ میں ان قصوں اور سازشوں کا حصہ ہو کر ندیم شاہ کو کھو بیٹھوں گی۔" ان پر ہذیانی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ ان کی آنکھیں لہو رنگ اور چہرہ عجیب سے کرب سے دوچار ہو گیا۔

"عظیم شاہ' آپ کو تنگ کرتا تھا نا' وہ ندیم انکل سے بھی خار کھاتا تھا نا"۔ شجاع نے ان کے کندھے تھام کر انہیں دوبارہ سے صوفے پر بٹھایا۔ بھائی کو تو بہن کی یہ حالت عجیب سی الجھن میں مبتلا کر

گ ءتھی اور بھتیجا اس وقت کسی ماہر نفسیات کی طرح ان کے ذہن کی گرہیں کھول رہا تھا۔

"ان دنوں میں 'ندیم کے ساتھ ان کے کام میں ہاتھ بٹانے لگی تھی۔ ہم لوگ اس گھر سے عظیم شاہ کے تسلط سے نکلنا چاہتے تھے' عجیب سا خوف اور وحشت کا عالم تھا اس گھر کی فضا میں۔

مجھے یوں لگتا تھا جیسے ان کی نگاہیں ہر وقت میرا اور ندیم کا تعاقب کر رہی ہیں' ہم کہیں باہر بھی جا رہے ہوتے تو ڈھیر سارے سوالوں کا سامنا ہوتا۔

اگر اماں کی خواہش اور ندیم کی مجبوری نہ ہوتی تو میں وہاں کبھی نہ رہتی' لیکن ندیم نے صرف ایک ہی تو خواہش کی تھی اپنی ڈھیر ساری عنایتوں کے بعد میں بھلا کیسے انکار کرتی"۔

وہ بلا تکان بولتی چلی گئیں۔

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میرا گھر سے باہر نکلنا' ندیم کے ساتھ کام کرنا کتنا بڑا جرم بن چکا ہے' کچھ نسرین بھابھی کی عادت اور کچھ عظیم بھائی کی فطرت۔ انہیں کسی کی خوشی' ترقی' کامیابی گوارا ہی نہیں تھی"۔

وہ بولتے بولتے یکدم رونے لگیں' ان کی آنکھوں سے آنسوؤں قطار در قطار بہ رہے تھے' پتا نہیں اس وقت کون سی تکلیف یاد آئی تھی جس نے ان کی ہچکیاں باندھ دی تھیں۔

"راحت' میرے بچے۔ میرے چاند' تم تو میری بہت بہادر بہن ہو' ہم لوگوں کو پتہ ہی نہیں چلا کہ تم کس قدر ذہنی اذیت سے گزر رہی ہو' تم نے یہ سب بھائی جان کو کیوں نہیں بتایا' تم کیوں خود کو اس گھر میں جلاتی اور سزا دیتی رہیں۔"

ان کا بس نہیں چل رہا تھا وہ وقت کو پیچھے لے جائیں اور اپنی بہن کی ہر تکلیف سمیٹ لیں۔

کیا کرتی بھائی جان' بچی تھی میری گود میں' پھر ندیم اور اماں میرے ساتھ تھے اور مجھے پتا تھا کہ یہ سب عارضی تو ہے میں اور ندیم اسی کوشش میں تھے کہ جلد از جلد اپنے گھر چلے جائیں"۔

ان کا رونا جاری تھا۔ شجاع نے آنسوؤں کو سمیٹ کر چہرہ صاف کیا۔

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر پتہ نہیں کیا ہوا۔ بہت سارے بھیانک راتوں کی طرح وہ بھی ایک خوفناک رات تھی جب تقدیر بھی مجھ سے روٹھی ہوئی تھی۔

ان دنوں ندیم بھی مجھ سے ناراض رہتے' اکھڑے اکھڑے سے پتا نہیں کیا ہو گیا تھا' بات ہی نہیں کرتے تھے' کچھ ان کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی' میں خود پریشان تھی' وہ اتنے چڑ چڑے کیوں ہو گئے ہیں' لیکن شاید گھر کے حالات ہی ایسے ہو گئے تھے"۔

وہ جیسے کڑی سے کڑی ملا رہی تھیں' اپنی یادوں کو ترتیب دے رہی تھیں یا پھر یادوں کو ایڈیٹ کر رہی تھیں' کچھ تو تھا جو ان کے لفظوں کی روانی کو توڑنے لگتا۔

وہ روتے روتے ہلکان ہو گئیں تو گہری چپ نے ان کے چہرے کا احاطہ کر لیا۔

"تم کیوں چپ رہیں۔ راحت کچھ تو بتایا ہوتا ہم اس مسئلہ کا حل نکالتے"۔ وہ عجیب سی الجھن اور پچھتاوے کا شکار تھے۔ سب سے لاڈلی اور پیاری تھی وہ ان کی اور رازدار دوست بھی۔ اور جب وہ اس کے پاس نہیں تھے تو یہ سب تو ہونا تھا۔

"اچھا_ بس کرو_ جو بیت گیا اسکو یاد کر کے کیا ملے گا_ اللہ نے ہم سب کی راحت ہمیں لوٹا دی_ بس ہمارے لیے یہی کافی ہے"۔ وہ ان کے ماتھے کو چومتے ہوئے بہت محبت سے بولے۔

"شجاع! راحت کو اپنے کمرے میں لے جاؤ..... اور پھر میرے پاس آؤ، کچھ ضروری کام ہے"_

شجاع نے اتنی مشکلوں سے اپنی پھوپھی کی برین واشنگ کی تھی' یہ حکم کچھ اچھا نہیں لگا تھا' مگر اس وقت ان کی حالت بھی ایسی نہیں تھی کہ وہ کریدتا۔

ویسے بھی یہ سچ ہے تھا اب اس گھر کی باتیں قصہ پارینہ ہو چکی تھیں۔

صوفیہ کا بھوت اتر چکا تھا۔

راحت بیگم ایک بڑے امتحان سے گزر کر آ گئی تھیں۔

اور بہت سارے مسئلوں کی وجہ عظیم شاہ جیل میں تھا، جس کی ضمانت کا کوئی امکان نہیں تھا۔

"پھوپھی جان! اب آپ بس آرام کریں' میں صوفیہ کو بھیجتا ہوں' وہ آپکا سر دبا دے گی۔ کچھ چاہیے تو نہیں' میں جلدی آ جاؤں گا۔"

وہ انہیں بچوں کی طرح تسلیاں اور دلاسے دیتے ہوئے کمرے میں لایا تھا اور اب بھی بہلا رہا تھا' جیسے وہ چھوٹی سی بچی ہوں۔

"شجاع! میرے بچے' میں بالکل ٹھیک ہوں' میری فکر مت کرو' یہ جو ماضی کی تلخیاں ہیں نا یہ تو سانسوں کے ساتھ ہیں، دونوں کا ساتھ رشتہ ٹوٹے گا اور ویسے بھی وقت مرہم رکھ دیا' صوفیہ کو تم سنبھالو گے' مجھے کوئی فکر نہیں۔" انہوں نے نمناک لہجے میں کہا۔ آج سب کچھ تازہ ہو گیا تھا' دل ابھی تک بھرا تھا۔

"اس کی فکر آپ بالکل نہ کیا کریں وہ خود بھی خود کو اچھی طرح سنبھال لیتی ہے۔" وہ شریر سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا' پانی کا گلاس ان کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے۔

"اللہ تم دونوں کو سلامت رکھے، خوش رکھے، ہمیشہ ساتھ رہو ہنستے کھیلتے"۔ انہوں نے پل بھر میں ڈھیر ساری دعائیں دے ڈالیں' شجاع ممنونیت سے دیکھنے لگا۔

"بس آپ بھی ایسے ہی رہا کریں خوش باش' ہم سب یہاں سے چلے جائیں گے' دور___ ان سب مسئلوں سے بہت دور۔"

وہ اس کی بات پر مسکرا دی تھیں۔

☆.....☆.....☆

"تم دنیا جہان کی سست لڑکی! میں نے تمہیں کہا تھا کہ پھوپھی جان کے پاس فوراً پہنچو اور تم ابھی تک یہاں چھپی ہوئی ہو۔"

وہ بڑے انہماک سے چائے بنانے میں مصروف تھی، تب شجاع کی آواز پر یکدم اچھل پڑی۔

ہاتھ گرم پین سے ٹکرا گیا' بیاختیاری کے آغاز کے ساتھ اس نے شہادت کی انگلی اپنے لبوں میں دبالی۔ اور گھیرے بالوں میں چھپا ہوا چہرہ اچانک ہی شجاع کے سامنے آ گیا۔

"اُف..... آپ کو کوئی تمیز ہے' یوں اچانک سر پر سوار ہوتے ہیں کیا؟"

وہ بے ساختہ چیخی اور شجاع نے سرعت سے ہاتھ تھام کر انگلی اپنے لبوں میں دبالی۔

"اس کی صحیح جگہ یہ ہے۔" لبوں کی ساری نرمی اور گرمی انگلی کے ذریعے صوفیہ کے پورے وجود میں منتقل کرتے ہوئے وہ شرارت سے مسکرایا۔

"آپ بہت بدتمیز ہیں۔" اب وہی انگلی پھر سے صوفیہ کے منہ میں تھی' شجاع کا چھت پھاڑ قہقہہ بلند ہوا اور صوفیہ کا چہرہ مارے خفت کے مزید سرخ ہو گیا۔

"آپ بھی کم نہیں' ہماری ساری بدتمیزیاں پی جاتی ہیں۔" معنی خیز سا اشارہ صوفیہ کی جان جلا گیا۔

"میری انگلی جل گئی تھی۔ اور آپ کو شوخی سوجھ رہی ہے۔ شجاع کسی جگہ کا تو لحاظ کر لیا کریں۔"

"نہیں بھئی! ہم سے نہیں ہوتا' کسی جگہ' علاقے' محلے کے لحاظ' ہمارے سامنے ہماری شہزادی ہو دل تو بے تاب ہو گا نا۔"

وہ اس وقت پھوپھی کی دلجوئی کرتے شجاع سے بالکل مختلف شخص تھا' جس کے اندر کی ساری شدتیں ہمیشہ کی طرح صوفیہ کو دیکھ کر چہرے اور آنکھوں میں سمٹ آئی تھیں۔

صوفیہ کے معاملے میں اس کا دل اتنا ہی بے اختیار ہو جاتا تھا۔

اس پر صوفیہ کے گھورنے کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

" گھورلو_ اچھی طرح سے دیکھ لو_ بس کچھ دنوں کی بات ہے_ پھر بھاگ کر میرے پاس ہی آؤ گی۔"اس کے کانوں کے پاس سرگوشی ابھری۔

"خوش فہمی_ میں امی کو چھوڑ کر کہیں نہیں جانے والی فی الحال_ اس کمرے تک بھی نہیں"_ اس نے سمت کا تعین کر کے فوراً بدلہ لیا تھا اس کی نگاہوں کی سرکشی کا۔

"چلو امی کے ساتھ رہ لیں گے ان کے کمرے میں' تم صوفے پر سو جایا کرنا اور میں اپنی پھوپھی جان کی گود میں سر رکھ کر"_

اس نے بے ساختہ کہہ کر خود ہی مسکراہٹ بھی بمشکل روکی تھی کیونکہ صوفیہ کے چہرے پر بڑی شریر ہنسی تھی_ اس سے پہلے کہ وہ پیٹ پکڑ کر ہنسنا شروع کر دیتی شجاع نے برنر پر پکنے والی چائے کی طرف اشارہ کیا' جواب احتجاج کر رہی تھی کہ میرا کیا قصور ہے۔

"اگر یہ پینے کی چیز رہ گئی ہو تو جلدی سے کپ میں ڈالو۔" وہ اپنی بات پر ابھی تک ہنس رہا تھا۔

" کیا ڈالو کپ میں_ شکل دیکھ رہے ہیں آپ سے بھی زیادہ کالی_ امی بہت ماریں گی۔

" کالی_ مجھ سے بھی زیادہ_ تم ایک گورے چٹے مرد کو کالا کہہ رہی ہو_ لوگ تو مجھ سے ہمدردی کرتے ہیں کہ میں نے بھی کیا آنکھیں بند کر کے فیصلہ کر لیا کالی' موٹی' بدتمیز لڑکی۔"

"امی! اب اگر آپ یہاں کھڑے رہے تو میں سب کو بلا لوں گی۔" اس نے آواز لگائی تھی دھمکی کے ساتھ۔

"بلا لو! میں کوئی پڑوسن کے ساتھ تھوڑی کھڑا ہوں وہ اب کیلے چھیل چھیل کر کھا رہا تھا اور صوفیہ کو اس کی موجودگی سے زیادہ اس کی چمکتی آنکھوں سے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔

وہ دن بڑے اچھے تھے جب وہ شجاع کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے روبرو سنا دیا کرتی تھی اب تو اسے دیکھنا اس سے بات کرنا محال ہو جاتا تھا۔

رات کو بھی اس نے سب کے سامنے زچ کیا ہوا تھا' لیکن اس کا سب سے پیارا روپ ہی یہ تھا وہ ہر پل ہر لمحے اسے اپنی نظروں کی حصار میں رکھتا تھا۔

"شجاع ایک بات پوچھوں آپ سے_" وہ بڑی سعادت مندی سے پوچھ رہی تھی شجاع اس کی اس ادا پر قربان ہی ہو گیا۔

"کیا بات ہے صوفی_ اتنا سوچنے والی کیا بات ہے۔"

"پتا ہے_ میں اکثر سوچتی رہتی ہوں' عورت اور مرد کے درمیان وہ کونسی چیز ہے جو رشتے کو کمزور اور بے جان کر دیتی ہے اور وہ صرف سمجھوتہ بن کر رہ جاتا ہے۔ اس میں سے محبت ختم ہو جاتی ہے۔" اس کی آنکھوں میں عجیب سا احساس تھا، تفکر اور بے چینی کے رنگ لیے۔

شجاع کاؤنٹر کی سلیب سے اتر کر اس کے پاس آ گیا۔

"اتنی مشکل مشکل باتیں آپ کیوں سوچتی ہیں_ زندگی_"

"شجاع میں بالکل سیریس ہوں۔" اس نے دوبارہ چائے کا پانی برنر پر رکھا۔

"جاناں_ کیا یہ وقت ان باتوں پر سوچنے کا ہے۔"

"ان باتوں پر تو کبھی بھی سوچا جا سکتا ہے، کوئی بھی سوچ سکتا ہے۔" وہ بضد تھی۔

دیکھو صوفی شادی کوئی کنٹریکٹ یا سمجھوتہ نہیں' یہ حقیقت میں دو روحوں کا ملاپ ہوتا ہے' جب وہ ایک دوسرے کو تسلیم کرتی ہیں تو پھر اس کی تمام تر اچھائیوں اور برائیوں پر بھی سرِ تسلیم خم ہوتا ہے۔ جیسے میں آپ کی ہر بدتمیزی گوارا کرنے کو تیار آپ کی ہر ہٹ دھرمی سہنے کو راضی_ ہے نا!

اس کا سنجیدہ ہونا مشکل تھا' جبکہ صوفیہ چہرے پر از حد سنجیدگی طاری لیے اس سے مزید وضاحت کی طلب گار تھی۔

"پاگل لڑکی_ دیکھو زندگی کو گزارنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ یا تو ایک دوسرے کا

یقین بن جاؤ، جہاں یقین متزلزل ہو' جہاں شک زندگی میں آیا' وہاں رشتے کمزور ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ جہاں سے غلط بیانی کا سلسلہ شروع ہوا وہاں سے زندگی سمجھوتہ بن جاتی ہے۔اور زندگی کو زندگی جیسا ہونا چاہیے 'میری صوفیہ جیسا' روشن 'محبت سے بھرپور۔"

اس نے اپنی سنجیدگی کو خود ہی طاق میں رکھ دیا تھا' صوفیہ کے چہرے پر کوشش کے باوجود بھی سنجیدگی قائم نہ رہ سکی تھی۔ مدھم سی مسکراہٹ نے اس کے چہرے کا احاطہ کیا ہوا تھا کہ بادلوں کی اوٹ سے چاند جگمگانے لگا تھا۔

"ان بالوں میں میری زندگی ہے خود سے بڑھ کر ان کا خیال رکھا کرو۔"

شجاع کو دل پر حملے کا وہ دن یاد آ گیا تھا جب اس نے بادلوں کی اوٹ سے چاند کو مسکراتے دیکھا تھا۔ وہ بہت مان سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"اگر آپ اجازت دیں تو میں کوئی ڈھنگ کا کام کرلوں۔" بالآخر وہی ہاتھ جوڑنے پر مجبور ہوئی تھی اور شجاع اس کی ادا پر قہقہہ لگاتے ہوئے کچن سے باہر چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

"واٹ.....تم تھانے میں' کیا بکواس کر رہی ہو شمائلہ۔" سرمد بخاری کا دماغ بھک سے اڑ گیا تھا۔

وہ کیا کچھ سوچ رہا تھا اور شمائلہ اسے کیا خبر دے رہی تھی' اسے لگا ایک ساتھ بہت ساری مصیبتوں نے اس کا پیچھا لے لیا تھا اور وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ کہاں اس سے غلطی ہو گئی۔

اس نے اپنے کمرے کا دروازہ دھاڑ سے بند کیا اور منیر کمال کے دروازے پر پہنچ گیا۔ رات کے سناٹے میں وہ جتنی زوردار دستک دے سکتا تھا دی' کیونکہ وہ جانتا تھا کہ منیر کمال اس وقت نشے میں دھت ہوگا۔

اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ دروازہ توڑ دے' مگر اس وقت ایک کے بعد دوسرا مسئلہ کھڑا کرنا

کسی طور مناسب نہیں تھا۔

اس نے تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے منیر کمال کے سیل پر بیل دینا شروع کی اتنی دیر میں شمائلہ کی طرف سے بھی مستقل کال آ رہی تھی۔

بڑی مشقتوں کے بعد منیر کمال نے دروزہ کھولا اور اسے دیکھ کر مزید بدمزا سا ہو گیا۔

"اب کیا ہوا سونے تو دو یار_ صبح دیکھیں گے' تجھے بیوی دے دوں یا_"

وہ بھرپور نشے میں تھا یا پھر کسی نئی بیوی نما عورت کے خواب دیکھ رہا تھا' سرمد بخاری نے اسے حقارت سے دھکا دیتے ہوئے دراوزہ بند کیا اور اس کے قریب آ گیا۔

"شمائلہ اس وقت پولیس کی کسٹڈی میں ہے۔"

"کیا شمائلہ پولیس کی کسٹڈی میں_ مگر کیوں؟" اس کے دماغ پر یہ خبر کسی ہتھوڑے کی طرح لگی تھی۔

"کیوں کے بچے_ میں نے تجھے بھی سمجھایا تھا اور اسے بھی کہ یہاں آ گئے ہو تو محتاط رہو' مگر تمہاری حرکتیں بھی مشکوک' اب پتہ نہیں اس نے کیا کیا ہے یہ لو۔

پھر فون آ گیا۔ بات کرو اس سے اور پوچھو قصہ کیا ہے؟"

اس نے اپنا سیل فون بستر پر پٹخ دیا اور خود منیر کمال کی بوتل کی طرف بڑھ گیا۔

منیر کمال نے مارے باندھے سیل فون آن کر کے کانوں سے لگا لیا' دوسری طرف شمائلہ کی غصے سے بھری آواز نے اس کے تن بدن میں آگ سی لگا دی۔

سرمد اس منیر کتے کو بولو کہ جلد از جلد میرے پاس پہنچے' اس کا فون بھی بند ہے۔" منیر کو اپنی عزت افزائی کی عادت تو تھی' مگر اس وقت ان حالات میں یہ جملہ اسے خنجر کی طرح لگا تھا۔

"سالی_" وہ زیر لب بڑبڑایا اور پھر گویا ہوا۔

"شمائلہ! تم اس وقت کہاں ہو' تم تو شاید کسی اسپتال گئی تھیں' پھر وہاں پولیس کیسے آ گئی' پھر کونسا

فساد کیا ہے تم نے۔"

"تم مجھ سے جرح مت کرو اس وقت' میرے پاس وقت نہیں کہانیاں سنانے کا۔تم میرے ڈاکومنٹس_ اور اپنی چیک بک لے کر آ جاؤ۔"

اس کا حکمیہ لہجہ اتنا کچھ ہو جانے کے بعد بھی برقرار تھا' وہ تھانے کا پتہ بتا رہی تھی اور منیر کمال کچھ نہیں سن رہا' بس دل ہی دل میں اسے گالیاں دے رہا تھا۔

جب سے شمائلہ کے دل میں اپنے بچے کی محبت کا بخار جاگا تھا' سب کچھ الٹ پلٹ ہو رہا تھا' نہ کام نہ دھندہ..... شمائلہ کو عادت ہو گئی تھی مصیبتیں کھڑی کرنے کی۔اس نے نفرت سے سوچا اور موبائل سرمد بخاری کو تھما شمائلہ کو یقیناً اس سے بھی بات کرنی تھی۔

"یار! میری گاڑی میں اتفاق سے ایک بوتل پڑی ہوئی تھی اور تمہیں تو پتہ ہے یہاں کی پولیس کو موقع چاہیے ہوتا ہے۔"

وہ یہ بات تقریباً گول ہی کر گئی تھی کہ اپنی ماں کے گھر کے دروازے پر ہنگامہ کھڑا کرنے کے بعد کاشف نے کتنی آسانی سے اسے پولیس کے حوالے کر دیا تھا اور پھر ستم یہ کہ اس کی گاڑی کی تلاشی لی گئی تو نشہ آور اشیاء کے ساتھ امپورٹڈ برانڈ کی شراب بھی برآمد ہو گئی تھی۔اس پر ستم یہ کہ اس نے کاشف پر ہاتھ اٹھایا تھا جو انٹرنیشنل نیوز ایجنسی کا نمائندہ بھی نہ ہوتا تو اس کی شناخت کے لئے اس کے باپ کا نام کافی تھا۔اس ایک فون کال پر تمام خفیہ ایجنسیاں حرکت میں آ گئی تھیں' اور اب وہ فیڈرل پولیس کے سوالات کی زد میں تھی۔

"ہاں کیا کہہ رہی ہے_ جلدی بولو کیا کرنا ہے' میں بہر حال ابھی فوراً یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں' تم لوگ خود ہی نپٹتے رہو ان چکروں سے_"

وہ خاصی عجلت میں تھا' عجلت سے زیادہ الجھن اس کے چہرے سے ہویدا تھی' منیر کو وہ اب شمائلہ

کے ساتھ ہمدردی کرنے والا نہیں لگ رہا تھا اس نے جلدی جلدی اپنا نائٹ گاؤن تبدیل کیا' ضروری چیزیں شرٹ کی جیب میں رکھیں' شمائلہ کا وہاں زیادہ دیر ٹھہرنا خطرہ ہی خطرہ تھا' اس وقت اس کی جو ذہنی کیفیت تھی اس میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

سرمد بخاری! منیر کمال کو جلد تھانے پہنچنے کی ہدایت کرتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا وہ اب نہ دوبارہ شمائلہ کی شکل دیکھنا چاہتا تھا اور نہ منیر کمال کی' جب انسان کی اپنی عزت پر بن جاتی ہے نا تو سب وعدے وعید بھول کر اسے بچانے کی فکر میں لگ جاتا ہے۔ وہ بھی بہت سے لوگوں کی طرح اسی سوچ میں غلطاں تھا۔

اس نے اپنی چیزیں سمیٹنا شروع کر دیں' چیزیں تھی ہی کتنی' مگر وہ اس کمرے میں کوئی نشان چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔

☆.....☆.....☆

"کاشف یہ جو بھی ہے بہت برا ہوا' مالا بہت اَپ سیٹ ہے' اسے پہلے ہی دکھ ہو رہا تھا کہ اس نے عاشر کی مدد سے شاید کوئی مس بی ہیو کیا ہے اور اب وہ پھر"

خولہ نے چائے کا مگ کاشف کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے فکرمندی سے کہا۔ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔

نانو کے علاوہ کوئی بھی..... سویا پایا تھا۔ انہیں بمشکل مسکن دواؤں کا سہارا دے کر بستر تک پہنچایا تھا ورنہ وہ تو راہ داری میں دل تھام کر بیٹھ گئی تھیں اور پھر اس کے بعد طویل چپ نے ان کا حصار باندھ لیا تھا۔

''خولہ! میں تمہیں سچ بتاؤں۔ یہ جو بھی ہوا بہت اچھا ہوا۔ شمائلہ کمال اور اس کا پورا گروہ کتنے گھناؤنے کاروبار میں ملوث ہے، تم نہیں جانتیں اور بہتر ہے کہ جاننے کوشش بھی نہ کرو، کیونکہ کچھ بھی سہی اس عورت کا عاشر سے خون کا رشتہ ہے اور ہم سب کو عاشر کے سامنے محتاط رہنا ہوگا۔

عاشر ہماری زندگی بن گیا ہے، میرا اس سے کوئی رشتہ نہیں تھا، ایک سال پہلے تک..... لیکن آج مجھے ایسا لگتا ہے میں اس سے کبھی الگ نہیں ہو سکتا۔ وہ میرا بھائی ہے، میرا دوست ہے، مجھے اس کا ہر دکھ اور تکلیف اپنا لگتا ہے۔"

کاشف کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی، خولہ بغور اسے دیکھ رہی تھی۔ اس گھر میں کتنے سارے لوگ ایسے تھے جن کا آپس میں کوئی خونی رشتہ نہیں تھا لیکن وہ انسانیت اور محبت کے عظیم رشتے میں اس مضبوطی کے ساتھ بندھے ہوئے تھے کہ اپنے اپنے جینے کے مقاصد بھی بھول گئے تھے۔

خولہ نے سوچا تھا کہ وہ ایک بار منیر کمال سے مل کر اس سے یہ ضرور پوچھے گی کہ وہ اگر اچھا مرد نہیں بن سکا، اچھا شوہر نہیں کہلا سکا، اچھا باپ تو بننے کی کوشش کرتا، یہ رشتہ تو قدرت کی عطا ہوتی ہے، اس میں اتنا کھوٹ وہ کہاں سے لے آیا مگر پاپا کی بیماری میں وہ بہت سارے کاموں کی طرح یہ مقصد بھی بھول گئی۔

"سرکار..... آپ کہاں کھو گئیں۔" کاشف نے ہاتھ ہلا کر اس کی محویت کو توڑا۔ "کہیں نہیں بابا۔ بس بہت الجھن ہو رہی ہے، جب عاشر کو پتا چلے گا تو....."

وہ گرم مگ کو گالوں سے لگاتے ہوئے خود کو تپش دینے لگی۔ "میرے خیال میں وہ خوش ہوگا۔ اچھا ادھر آؤ میرے پاس، تم اتنے دور بیٹھی مجھے سہمی بلی لگ رہی ہو۔ دیکھو تم بہت بہادر لڑکی ہو۔ تمہارے لیے یہ معمولی واقعات نہیں، تم نے اپنی پیدائش سے اب تک زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔"

کاشف کی آنکھوں میں اس لمحے کوئی غیر معمولی سا تاثر تھا، خولہ انجان سی بن گئی۔ "نہیں میں ٹھیک ہوں۔" اس نے چھوٹا کشن اپنی گود میں رکھ لیا۔

"نہیں تم بالکل ٹھیک نہیں ہو..... پاگل لڑکی۔" وہ اٹھ کر اس کے پاس آ گیا اور اس کے ماتھے پر بکھرے بالوں کو سمیٹتے ہوئے بہت نرمی سے پوچھا۔

''دیکھو ہم دونوں دوست ہیں نا..... بہت پیارے سے..... بتاؤ کیا بات ہے صرف شمائلہ کمال کا مسئلہ ہے یا کوئی اور بات۔''

آنکھوں کا غیر معمولی تاثر بلا کی نرمی اور شفقت میں بدل چکا تھا۔

''کاشف، شمائلہ کمال کا مسئلہ بھی تو معمولی نہیں نا، وہ تو ہمیشہ مالا کو اذیت دیتی رہے گی، آپ کو پتا ہے وہ کتنی حساس ہے اور سب سے بڑی اذیت تو یہ ہے کہ ہمیں..... ہماری مام کو اپنی تباہی کی وجہ سمجھتی ہے۔''

خولہ کی آنکھیں نم ہونے لگیں، وہ کشمالہ کی طرح جلدی جلدی آنسو نہیں بہاتی تھی لیکن آج وہ بھی بکھری ہوئی، بہت تنہا لگ رہی تھی، ایک شمائلہ کے ہونے سے اس گھر کا ہر فرد مشکل سے دوچار تھا۔

کاشف چند لمحے اسے گہری نظروں سے دیکھتا رہا اور پھر ایکسکیوز کرتا ہوا موبائل لے کر باہر نکل گیا۔

کبھی کبھی اس کی سرگرمیاں ایسی ہی پراسرار ہو جاتی تھیں، خولہ کی نگاہوں نے بے دھیانی میں اس کا تعاقب کیا، اور پھر اسی بے دھیانی میں وہ مگ لے کر کچن کی طرف آ گئی، تب ہی اس کے کانوں میں کاشف کی آواز پڑی، جو لابی میں کھڑا کسی سے فون پر مخاطب تھا۔

''شمائلہ کمال کو کسی صورت ریلیز نہیں ہونا چاہیے۔ میں کچھ نہیں جانتا۔ کسی منسٹر کا فون آئے یا پرائم منسٹر کا، مجھے کل تک وہ عورت سلاخوں کے پیچھے چاہیے۔ تم لوگ جانتے ہو میں نے اس کیس پر ایک سال محنت کی ہے۔''

وہ بلا کی سنجیدگی اور ذمہ دارانہ قسم کے لہجے میں بات کر رہا تھا، اس کے لفظوں کی پختگی میں عجیب سی سفاکی بھی تھی۔

''میں نے کہا نا شمائلہ کمال کی فائل کھول دو، مجھے کل تک پوری رپورٹ دو، دیکھو اس کے ساتھ کچ اور لوگ بھی ہیں، وہ کسی صورت نہ نکلنے پائیں۔''

وہ بالکل مختلف کاشف کیانی تھا، روکھا، سرد اور بے مہر سا۔ خوالہ کو حیرت کا جھٹکا لگا۔ (تو کیا جو میں

مذاق میں کہتی تھی وہ صحیح نکلا) اس نے جلدی سے سر جھٹک کر اپنے حواس قابو میں کیے مگ دھو کر کیبنٹ میں رکھتے ہوئے بیرونی سمت نگاہ کی۔ آواز آنا بند ہو چکی تھی۔ وہ یقیناً لاؤنج کی طرف آ گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ جو سوچتی تھی، تقدیر اسے سرمد بخاری سے بچانا چاہتی ہے، اس لیے فارم ہاؤس پر چھاپہ پڑ گیا، اب ایک بار اظہر کی طرف سے دیے گئے قید خانے میں محصور اپنی تقدیر کو کوس رہی تھی۔

اظہر اسے ایک قید سے چھڑا کر لے آیا تھا اور اپنی حراست میں لے چکا تھا۔ وہ شاید کچھ کھانے کو لینے کے لیے نکلا تھا، اس نے ایک پل میں دروازہ کھڑکی سب چیک کر لیا تھا، مضبوط لوہے کا دروازہ، سخت گرل والی کھڑکی اور اس ایک کمرے میں کوئی روشن دان بھی نہیں۔

''یا اللہ! یہ کون سی جگہ ہے، یہ پھر سے میں کس عذاب میں پھنس گئی۔'' اظہر نے اب تک اس سے کوئی بات نہیں کی تھی اور نہ ہی اس کا نفرت کے مارے اسے مخاطب کرنے کو دل چاہا تھا۔ وہ چپ چاپ ٹیکسی میں بیٹھ کر اس کے ساتھ اس کمرے تک آ گئی تھی، صرف اس امید پر کہ بھاگنے کی کوئی نکل آئے مگر..... اس نے بے دردی سے اپنا سر دیوار کے ساتھ دے مارا۔

اسے اپنے جسم سے بہت عجیب سی بو آ رہی تھی، وہ منہ دھونا چاہتی تھی، نہانا چاہتی تھی مگر اس کمرے میں ایسا کوئی انتظام نظر نہیں آ رہا تھا۔

''لعنت ہے مجھ پر..... جو اس شخص کی خاطر میں اندھی ہو گئی تھی۔'' اس نے خود کو موٹی سی گالی دی اور کمرے میں رکھی واحد سیٹی نما نشست پر دراز سی ہو گئی۔

''پتا نہیں اب یہ منحوس آدمی مجھ سے کیا چاہتا ہے۔'' اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ سرمد بخاری کی قید سے نکل کر پھر سے اظہر کی قید میں آ گئی۔

''یا اللہ، یہ کیا گورکھ دھندا ہے، کیا تو دیکھنے اور سننے والا نہیں، کیا تجھے نظر نہیں آتا، میں نے تجھ

سے بار بار دعا مانگی ہے، بار بار تجھ سے معافی مانگی ہے اور کہا ہے کہ مجھے میری غلطی کی اتنی بڑی سزا نہ دے، مجھے میرے ٹھکانے تک پہنچا دے۔ میرے ماں باپ سے ملوا دے، مگر تو سنتا ہی نہیں، پتا نہیں تو کس کی سنتا ہے۔ کب سنتا ہے۔"

وہ ہذیانی سی کیفیت میں رونے اور کراہنے لگی تھی۔

☆.....☆.....☆

"صاحب..... کام ہو گیا ہے تیرا، بڑی صفائی سے میں اس کو نکال کر لے آیا ہوں، بس بے چاری حیران ہی ہے ابھی تک کہ میرے ساتھ کیا ہو گیا۔"

اظہر کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں، نہاری، روٹی پیک کروانے کے بعد وہ ایک پی سی او پر کھڑا تھا۔ موبائل سے وہ اس طرح کے فون نہیں کرتا تھا، وقت نے اسے بھی بڑی عقل سکھا دی تھی، دوسری طرف منیر کمال تھا جس کی گاڑی شمائلہ کے کہنے پر رواں دواں تھی۔

"چل ایک کام تو تو نے اچھا کیا، اب دیکھ گڑبڑ نہ ہو، پہرہ سخت رکھنا۔"

"دیکھو صاحب، یہ پہرے کا کام مجھ سے نہیں ہوتا، مجھے بتاؤ اسے کہاں پہنچانا ہے آپ کے پاس، اپنی امانت سنبھالو، ہماری امانت حوالے کرو۔"

وہ بیتحاشا مسرور تھا، منیر کمال نے ایک بار پھر اسے شاباش دی۔

"دیکھو کچھ دیر صبر کر لو، میں یہاں مشکل میں ہوں اسے فی الحال وہیں رکھو۔"

"دیکھو باس! میں کہہ رہا ہوں گڑبڑ ہو جائے گی وہ بہت چالاک لڑکی ہے۔"

اظہر کے چہرے کے تاثرات بگڑ رہے تھے، وہ اس مصیبت کو کہاں رکھتا، کب تک پہرہ دیتا، خود اس کے سو ہزار کام، پھر نعمان بھی چھوٹ کر آ گیا تھا..... وہ جھنجھلا گیا۔ "میں نے کہا نا، اس وقت مجھے تنگ مت کرو، تم مجھ پر احسان نہیں کر رہے، قیمت لی ہے تم نے، اب اپنا کام پورا کرو، جب تک میں

کراچی نہ آجاؤں وہ وہیں تمھارے پاس ہوگی، اگر کسی گڑبڑ یا دلالی کی کوشش کی تو کھال ادھیڑ دوں گا۔"

منیر کمال کے انداز نے اظہر کے چہرے کی جوت بجھا دی تھی، اس نے شدید غصّے کے عالم میں فون پٹخا اور یونٹس چیک کر کے پیسے ٹیبل پر پٹخے اور تیز قدموں سے باہر کی طرف نکل گیا۔

☆.....☆.....☆

عاشر نے شاید اپنے ہوش وحواس والی زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے بابا کا ہاتھ تھام کر لبوں سے لگا لیا تھا، سکون کی لہریں برقی رو کی طرح ان کے پورے جسم میں سرائیت کر گئی تھیں۔

"بابا.....آپ آنکھیں کھولیں نا! مجھے دیکھیں نا میں کب سے آپکو دیکھ رہا ہوں، آپ کو سننا چاہتا ہوں۔"

اس کی سرگوشی نما آواز ان کی سماعتوں سے ٹکرائی تو وہ بے چین سے ہو گئے، جیسے ایک مدت اور زندگی نے ان کے اندر سانس لیا ہو، انہوں نے بمشکل بھاری پپوٹے اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر مدھم سے مسکرا دیئے۔

ابھی بات کرنا، تمام لفظوں کو جمع کر کے جملہ بنانا مشکل کام لگتا تھا، اس لیے وہ محض مسکرانے پر اکتفا کرتے تھے اور عاشر کو اشارہ کرتے تھے کہ وہ بولتا رہے اور وہ سنتے رہیں۔

"بابا.....آپ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں اب.....گھر چلیں، سارا گھر ڈسٹرب ہے، نانو، کشمالہ، خولہ، سب ہی پریشان ہیں۔" وہ بالکل معصوم سا عاشر تھا سارے دن کے روداد سنانے والا۔

"اور تم....." نموں نے ہاتھ کے اشارے سے پوچھا۔

"میں تو آپ سے خفا ہوں، میری کوئی بات آپ سنتے ہیں۔" اس کا انداز واقعتاً خفگی سے بھرپور تھا، وہ کھل کر مسکرا دیے۔

بھی خفا ہوں، اس بار مسکراہٹ کے ساتھ لفظوں کی یقین دہانی بھی تھی، عاشر بے ساختہ ہنس

پڑا۔ گویا کشمالہ ٹھیک کہتی ہے اس وقت بابا سے بات کرنا ایسا ہے جیسے کسی چھوٹے بچے کو بولنا، درست الفاظ ادا کرنا سکھاتے ہیں۔

"یہ تو الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔" اس نے اپنے جملے کو خود ہی انجوئے کیا تھا، اسے احساس ہوا کہ وہ اس وقت کشمالہ کو سوچتے ہوئے غیر شعوری طور پر مسرور سے موڈ میں آ گیا ہے، وہ خود کو طویل اسٹریس سے آزاد محسوس کرنے لگا۔ راجہ طاہر محمود کی نگاہیں بھی عاشر کے چہرے کو پڑھ رہی تھیں۔

یہ جملہ تو سنا ہوا تھا، کیونکہ راجا طاہر محمود نے بولا تھا۔ عاشر کے چہرے کی ہنسی دیکھنے والی تھی۔ اس نے موبائل نکال کر کشمالہ کا نمبر نکالا اور میسج لکھنے لگا۔

"اب آپ کیسا محسوس کر رہی ہیں؟" انگریزی میں سوال کیا تھا۔

"پلیز آرام کرنا، پریشان نہ ہونا، سب ٹھیک ہو جائے گا، اللہ ہے نا!"

حیرت آمیز طور پر اس کے یہ مختصر جملے اس کے مزاج کی عکاسی کرتے تھے، مگر اس نے یہ سارے جملے ایک ہی میسج میں لکھ کر بھیج دیے تھے۔ ہلکی ہلکی نیند کے خمار میں کشمالہ کو موبائل کی بیپ سنائی دی۔

اس نے خود کو نیند کی دنیا سے باہر لا کر بمشکل نگاہیں موبائل کی سکرین پر جمائیں۔ "عاشر عباس....."

سامنے اسکرین پر صرف ایک نام ہی نہیں اس کی قسمت جگمگا رہی تھی، یہ اس کی تقدیر کا روشن ستارہ چمک رہا تھا، اسے اپنی آنکھوں پہ یقین نہ آیا، یہ شاید اس کے سیل فون عاشر کے نام کا پہلا میسج تھا جو اس کے لیے تھا اس کے نام تھا۔

وہ خوشی سے پاگل سی ہو گئی تھی۔

نیند آنکھوں سے بالکل غائب اور ذہن بالکل بیدار ہو گیا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں..... پریشان بالکل نہیں..... اللہ ہے نا اور آپ بھی....." اس نے لکھا اور بھیج

دیا، اب اس کے چہرے پر ایک سہانی سی مسکراہٹ تھی۔ وہ جواب کی منتظر تھی۔

عاشر نے اس کا جواب پڑھا اور مسکرا دیا۔

"میری وجہ سے آپ کی زندگی مزید مشکلات سے دوچار ہوگی۔"

اس نے مختصراً لکھا۔

وہ مسکرا دی..... دلربائی کے ساتھ..... جواب آنے پر.....

" کوئی بات نہیں..... ہر کسی کو اپنے حصے کی مشکلات اٹھانی پڑتی ہیں۔"

اسے یقین تھا اتنی جلدی جواب نہیں آئے گا، لیکن جب بیپ بجی تو اس کا جی چاہا کہ نعرہ لگا کر بیڈ سے چھلانگ لگا دے۔

کسی کی بھی سنتی ہیں یا صرف اپنی ہی من مانی کرتی ہیں۔" یہ وہ خفا خفا سا عاشر تھا جس کے ساتھ اسے زندگی ایک حسین خواب کی تعبیر لگتی تھی اور اسے ہر قیمت پر اس خواب کو پورا کرنا تھا۔

"اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں....." اسے عاشر کے تپے تپے جواب میں شرارت سوجھی..... اور ایک اسمائل کرتا ہوا آئی کون بھی بھیجا۔

"جی کہیے....." بلا کا مختصر جواب اس نے بھرپور انجوئے کیا۔

"میں نے آج تک آپ کی کوئی بات ٹالی ہے کیا" بلا کا معصوم انداز تھا۔ عاشر نے جواب پڑھ کر بمشکل مسکراہٹ ضبط کی۔

"میں کسی کو ایسا کرنے بھی نہیں دیتا..... خیال رکھیے گا۔" اس کے انداز میں شرارت تھی مگر کشمالہ کو حیاتِ نو کا پیغام مل گیا تھا۔ اس کا دل گنگنانے اور جھومنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

پتا نہیں وہ کب سوئی تھی لیکن اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے مدت بعد ٹوٹ کر سوئی ہو اور ابھی تک اس نیند کا خمار اس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہو۔

یہ اتنی سکون اور نیند یہ اتنے خوبصورت خواب اور یہ اتنی روشن صبح، کیا صرف اس ایک شخص کی مرہونِ منت تھی، جس نے گزرے پلوں میں بڑے استحقاق سے کہا تھا۔

میں کسی کو ایسا کرنے بھی نہیں دیتا، خیال رکھیے گا۔"

اس نے یہی لکھا تھا کہ

"میری وجہ سے آپ کی زندگی مشکلات سے دوچار ہوگی۔"

وہ جلدی جلدی موبائل کے مختصر پیغامات پھر سے پڑھنے لگی۔

ایک بار نہیں، دو بار نہیں، بلکہ کئی بار اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ عاشر عباس نے لکھا ہے۔

یہ احساسات عاشر کے ہیں، وہ تو اس سے سخت بیزار تھا۔ شاید پہلے دن سے یا پھر اس دن سے جب اسے پتہ چلا تھا کہ اس کے بابا کی توجہ کسی اور نے بانٹ لی ہے اور پھر وہ طویل عمر تک اس توجہ اور محبت کو بلا شرکت غیرے اپنے اندر سمیٹتی رہیں۔

یا پھر اس دن سے جب ماں نے ان دونوں بہنوں کو سامنے بٹھا کر لب دم ان سے وعدہ لیا تھا۔

"دیکھو یہ شخص ہر دن رات میری خبر گیری کرنے آتا ہے، یہ تم لوگوں سے اتنی ہی عزت اور محبت کا مستحق ہے جتنی کہ میں۔

میرا اس شخص کے ساتھ تن کا کوئی رشتہ نہیں تھا لیکن اس نے میرے من کے ساتھ جو رشتہ جوڑا، اس کا احساس آج تک کیا ہے طارق محمود نے۔

مجھے نہیں پتہ یہ کس دنیا کا آدمی ہے، انسان ہے، جن ہے، یا پھر کوئی اور مخلوق، مجھے بس اتنا پتہ ہے کہ یہ کوئی سچی روح ہے جس نے میری روح کے ساتھ رشتہ بنایا، اور تم لوگوں کی زندگی میں جس ایک رشتے کی کمی تھی، جس پدرانہ محبت اور شفقت کی کمی تھی وہ طارق محمود سے ملنے لگی۔

میری ایک آخری التجا ہے کہ کبھی اس نیک اور پاکیزہ روح کی حکم عدولی نہ کرنا، کبھی اس کو کوئی دکھ

نہ دینا ورنہ میری عمر بھر کی ریاضت پر پانی پھر جائے گا، میری اس زندگی پر داغ لگ جائے گا جو میں نے تم لوگوں کے باپ سے علیحدہ ہو کر گزاری۔

میں اس شخص منیر کے ساتھ ہوتی تو طوائف ہوتی لیکن اللہ نے میری عزت رکھ لی، میرا پردہ رکھ لیا، تم لوگوں کو سمیٹ لیا، اس رشتے کی قدر جان و دل سے کرنا۔"

نہ جانے کیوں وہ عاشر کی باتوں کو سوچتے ہوئے اپنی ماں کی باتوں کو از سر نو دل میں تحریر کرنے بیٹھ گئی۔ اسے وہ سفید کمرہ، سفید ہاسپٹل بیڈ، اپنی خوبصورت ماں کا سفید چہرہ اور پانی نی آنکھیں بڑی شدت سے یاد آنے لگیں۔ "انہوں نے کہا تھا اللہ نے میری عزت رکھ لی، میرا پردہ رکھ لیا۔" کوئی تیز دھار نیزے کی سی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ "اور یہ عورت..... میری ماں کی عزت کی چادر کو تار تار کرنے چلی ہے۔

"شمائلہ کمال نہ اب تم بڑے نام والی ہو، نہ تمھارے ساتھ کوئی بڑے مقدر والا ہے اور نہ تمھاری قسمت کا ستارہ اتنا روشن ہے کہ ساری دنیا کی آنکھیں چندھیا جائیں۔ تم اپنی خیر منانا۔"

یک لخت ہی سکون آور نیند کا خمار ٹوٹ گیا تھا اور وہ جیسے کسی گہرے کنویں سے باہر نکلی تھی، جہاں ہوش و حواس کی دنیا کے بہت سے سوالیہ نشان اس کی نگاہوں کے سامنے آن کھڑے ہوئے تھے۔

منیر کمال، ان کا باپ جو اسی شہر میں ان کے سامنے دندناتا پھر رہا تھا، وہ ان کے روحانی باپ کو زندگی اور موت کی کشمکش میں ڈال کر خود مزے لوٹ رہا تھا۔ طمانیت اس کے ہر انداز سے عیاں تھی۔

اوپر سے ستم شمائلہ کمال کے الزامات کہ وہ ان کو ان کی مرحومہ ماں کو اپنی برباد زندگی کی ذمہ دار سمجھتی تھی۔

"اوشٹ..... یہ کوئی فلیش ناول ہے یا کوئی کمرشل فلم کہ اس میں سب کچھ ویسا ہی ہو جائے جیسا نظر آ رہا ہے۔" اس نے واش روم میں گھس کر ٹھنڈے پانی کا شاور کھول دیا۔

وہ فریش ہونے کے بعد اپنے اندر کی فرسٹریشن نکالنے کے بعد تمام تر سوالیہ نشانوں کو کسی منطقی انجام تک پہنچانا چاہتی تھی اور ان سب کاموں کے لیے وقت کم تھا کیونکہ ایک دو دن میں بابا کو بھی گھر لوٹ آنا تھا۔

اور ان کے گھر آنے سے پہلے وہ منیر کمال کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے دیکھنا چاہتی تھی۔

اس نے ڈھیر سارا پانی چہرے پر بہاتے ہوئے سوچا اور اس پانی کے ساتھ گرم پانی کے موٹے موٹے قطرے بھی شامل ہو گئے تھے۔

☆.....☆.....☆

"عظیم شاہ.....تم ہر عورت کے دشمن کیوں تھے، تمہارے لیے اس کی پاکیزگی، سچائی، اس کا مضبوط کردار، اس کا حسن چیلنج کیوں بن جاتا ہے۔

بڑا عجیب سوال تھا لیکن چونکہ یہ آواز مجھے اپنے اندر سے اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی تھی اور میں چونکہ اس آواز کا محور و مرکز جانتا تھا، اس لیے قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"بڑا ہی پاگل ہے تو.....ہیلو.....تجھے نہیں پتہ میں ہر عورت کا دشمن کیوں ہوں۔ تجھے نہیں پتہ مجھے کوئی عورت معصوم، پاکیزہ، باکردار کیوں نہیں لگتی۔ تجھے نہیں معلوم مجھے ہر عورت کا مضبوط کردار کیوں غلیظ بننے پر مجبور کر دیتا ہے۔

واہ میرے معصوم یار! میرے جگر تیرا بھی جواب نہیں، آج جب میں سلاخوں کے پیچھے بیٹھا ہوں اور کل میری کورٹ میں پیشی ہے تو میری یہاں عدالت لگا کر بیٹھ گیا ہے۔ لعنت ہے ایسی یاری پر۔"

عظیم شاہ اس وقت کسی نفسیاتی مریض کی طرح خود سے باتیں کر رہا تھا اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اس کے قہقہے اس کو پاگل ثابت کرنے کے لیے کافی تھے۔

راہداری پر ٹہلتا ہوا سنتری بھی اس کی حرکتوں پر مسکرا دیا تھا اور کالی رات کو ذرا سکون سے بسر کرنے کے لیے بنچ پر لیٹ گیا تھا۔

عظیم شاہ کونسا خطرناک مجرم تھا جس کے لیے وہ الرٹ رہتا۔

"بے چارا!" اس نے ہمدردی سے سوچا۔

دیکھو ہیلو! تم مجھے بیچارا مت سمجھو۔ میں اب بھی بڑا طاقتور ہوں بس مجھے ذرا مجھے باہر نکل لینے دو اور یہ تو مجھے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کیوں دیکھ رہا ہے۔ سب سمجھتا ہوں تیری مسکراہٹ کے پیچھے کیا چھپا ہے۔ تو مجھے وہ وقت یاد دلانے کی کوشش کر رہا ہے کہ جب آتش جوان تھا اور میں کسی ایک کی گردن اپنے ہاتھوں سے دبوچ کر ان کی بے بسی کا لطف اٹھاتا تھا۔

بے وقوف وہ وقت اب بھی آئے گا، زیادہ کل کل نہ کر ورنہ تجھے بھی گردن سے پکڑ کر ٹھنڈا کر دوں گا۔"

"ہاں جس طرح تو نے اپنے بھائی کو ٹھنڈا کیا تھا۔" عظیم شاہ نادیدہ قہقہوں کی لپیٹ میں تھا۔

"ابے چل تو جانتا ہے اچھی طرح میں نے ندیم شاہ کو ٹھنڈا نہیں کیا تھا۔ اسے تو گہری نیند سلانے والی اس کی اپنی بیوی تھی۔۔ حرافہ عورت۔"

عورت ہوتی ہی ہے نا قابلِ اعتبار مخلوق۔

اسی لیے میں نے اسے جوتے کی نوک پر رکھا ہے۔"

"تو ملا کیا..... تنہائی، رسوائی، اور کچھ دن بعد کال کوٹھری۔۔"

تو مجھے آئینہ نہ دکھا..... تجھے اپنا پتا ہے برس ہا برس سے ایک عورت کو ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔ آج تک اس کو کھوجتا پھر رہا ہے تو خود اس عورت کی گود سے نہیں نکلا آج تک....."

"تجھے ہر ماں شہزادی لگتی ہے اور مجھے طعنے دے رہا ہے رسوائی اور بربادی کے....."

"تو کون سا آباد ہے، تجھے تیری ماں نے برباد کر دیا، اب مجھ پر ہنس رہا ہے۔ چل نکل یہاں سے مجھے آرام کرنے دے....."

میں نے پاؤں پسارے مگر وہ مستقل میرے سامنے ڈھیٹ بن کر بیٹھا ہوا تھا۔

"تو مجھے کچھ بھی کہہ لیکن تو نے ندیم شاہ کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ وہ زندگی سے محبت کرنے والا، خواب دیکھنے والا آدمی تھا اور تو اس کا دشمن بن گیا۔"

میں نہیں، اس کی بیوی، خوامخواہ مجھ پر الزام تراشیاں نہ کر، ورنہ اٹھا کہ پھینک دوں گا تجھے بھی باہر۔"

ببلو نے پھر قہقہہ لگایا اور میں جی جان سے سلگ کر رہ گیا۔

"تیری تو....." میں اپنی پوری طاقت کے ساتھ اٹھا تھا اور اپنا ہی سر دیوار میں دے مارا تھا، مجھے اپنی ہی چیخ بہت دور تک سنائی دے رہی تھی۔

راحت بیگم ایک دم جھٹکا کھا کر اٹھ گئی تھیں انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے بستر کے کانٹے نیزے بن گئے ہوں۔

☆.....☆.....☆

انہوں نے گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے سائیڈ ٹیبل پر رکھے پانی کے گلاس پر نظر ڈالی اور پھر دراز کھولا جس میں مختلف طرح کی ٹیبلیٹس رکھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے اپنی ڈپریشن کم کرنے والی ٹیبلیٹس نکالیں اور پھانک لیں۔

برسوں کا ساتھ تھا ان گولیوں کے ساتھ، ندیم شاہ نے جاتے جاتے یہ واحد سہارا انہیں تھما دیا تھا اور وہ اس کے ساتھ بھی مطمئن تھیں۔

احساسِ گناہ، احساسِ شرمندگی جب حد سے بڑھ جاتا تو وہ ان مصنوعی سہاروں کی پناہ میں آجاتیں۔

"ندیم شاہ مجھے معاف کر دینا..... مجھے معاف کر دینا، میرا رواں رواں تم سے معافی کا طلب گار ہے.....لیکن میرا قصور کیا تھا، میں تو....." انہیں ایک دم سے سانس گھٹتا ہوا محسوس ہوا انہوں نے پانی کا پورا گلاس اپنے منہ میں انڈیل دیا۔

"میں نے کچھ نہیں کیا تھا، آپ نے دیکھا تھا نا، میں تو بھائی صاحب کو سبق سکھانا چاہتی تھی....."

وہ پانی پی رہی تھیں، اور کچھ خود پر گرا رہی تھیں، اور روتی جا رہی تھیں۔ یادوں کا ایک سیل رواں تھا جس کا سلسلہ اندھیری رات میں ختم ہو رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

یہ ایک دن کی بات نہیں تھی بلکہ انہیں اس امتحان کا سامنا اب روز کرنا پڑتا تھا۔ پتہ نہیں بھائی صاحب کو کیا ہو گیا تھا۔

ان کی موٹی موٹی پراسرار آنکھیں ہر وقت راحت کو اپنے تعاقب میں محسوس ہوتیں کبھی صوفیا کسی بچے کی گود میں کھیل رہی ہوتی یا کوئی اسے پیار کر رہا ہوتا تب ہی وہ عجیب سے انداز میں دیکھتے۔

"ندیم آپ سے ایک بات کہوں، اگر برا نہیں مانیں۔۔" شب کے خوشگوار ماحول میں ان کے بازو پر سر رکھتے ہوئے راحت نے دھیرج سے کہا۔

"بولو زندگی!، اتنا سوچنے کی کیا بات ہے" وہ کروٹ لے کر مزید قریب ہو گئے تھے اور راحت کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگے۔

"مجھے بھائی صاحب کی کچھ سمجھ میں نہیں آتی، پتہ نہیں کیوں مجھے ان کی نظروں سے خوف سا محسوس ہوتا ہے، آپ بھی رات کو دیر سے آتے ہیں، میرا بس چلے تو آپ کے ساتھ ہی گھر واپس آؤں لیکن پھر صوفیہ بہت ڈسٹرب ہوتی لیکن مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا، وہ ان کے چہرے کو بغور دیکھنے لگی۔

پھر وہ آپ کی غیر موجودگی میں کمرے میں آجاتے ہیں۔ بیشک وہ صوفیہ کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ اسے پیار کرتے ہیں لیکن یہ کوئی طریقہ تو نہیں۔ میں نہیں چاہتی میں انہیں ٹوکوں تو ناگوار گزرے، آپ خود انہیں سمجھا دیں۔"

وہ بات کرتے کرتے اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ گھنے بالوں کو سمیٹتے ہوئے اس کے لہجے میں کوئی غیر

معمولی احساس تھا جس نے ندیم شاہ کو سنجیدہ ہونے پر مجبور کر دیا ورنہ وہ اس کی ڈرپوک طبیعت سے واقف تھے۔ وہ بات کرتے کرتے اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

چڑیا کے پھڑ پھڑانے کی آواز پر تو اس کا رنگ سفید پڑ جاتا تھا۔ یہ تو پھر خاصی غیر معمولی اور تشویشناک بات تھی انہیں راحت کی بات پر بالکل اسی طرح یقین تھا جس طرح خود اپنی ذات کو جانتے اور سمجھتے تھے۔

راحت کبھی غلط ہو ہی نہیں سکتی اور پھر اس کی چھٹی حس۔

لیکن وہ کیا تھا جو بھائی صاحب نے انہیں بتایا تھا۔

کرسن لو تم جو کر رہے ہو بہت اچھی بات ہے کرو ضرور کرو۔ اچھی بات یہ بھی ہے کہ مارا کاروبار بڑھنا چاہیے۔ تم گارمنٹس کی طرف چلے گئے تھے، کوئی اعتراض نہیں، حالانکہ فہیم کو مسئلہ تھا۔ دیکھو تمہاری حد تک ٹھیک ہے لیکن یہ جو تم اپنی بیوی کو اس کاروبار کا حصہ بنا رہے ہو یہ بالکل ٹھیک نہیں ہے۔ وہ کم عمر کی ہے اس گھر کی عزت ہے اس کا اس طرح مردوں میں اٹھنا بیٹھنا ان کے ساتھ میٹنگ کرنا مجھے بالکل پسند ہیں۔ دیکھو میں تمہارا بھائی تمہارے بھلے کی بات کروں گا..... عورت کی عزت اور وقار گھر کی چار دیواری میں ہوتا ہے جب وہ گھر سے باہر نکل گئی تو کچھ پتا نہیں کیسی کیسی نظریں اس کی چادر کو داغ دار کر دیتی ہیں۔ ابھی تو تم برداشت کر لو گے جوان خون ہے لیکن جب سمجھ میں آئے گی تو وقت ہاتھ سے نکل چکا ہوگا۔ تمہاری بیوی تمہارے ہاتھ سے نکل چکی ہوگی۔"

وہ تو اپنی بات مکمل کر کے چلتے بنے تھے لیکن ندیم کی آنکھیں ان کی چوڑی پشت پر جمی رہ گئی تھیں۔ راحت بیگم کی کاروباری سوجھ بوجھ ان سے کہیں زیادہ کی۔ یہ بات وہ محسوس بھی کرتے تھے اور برملا اعتراف بھی کرتے تھے لیکن ابھی جو بھائی صاحب نے تصویر کا رخ دکھایا، اسی نہج پر تو انہوں نے بھی سوچا ہی نہیں تھا۔ یہ سچ بھی تو تھا کہ راحت کی پبلک ڈیلنگ اچھی تھی وہ جب بات کرتی تھی تو مخاطب

مبہوت ہو کر سنتا تھا۔

بھائی صاحب تو یہ بھی کہہ رہے تھے، راحت ہمارے گھر کی عزت ہے۔کوئی اسے غلط نگاہ سے دیکھے.....تو پھر کس طرح وہ راحت پر میلی نظر ڈال سکتے ہیں۔یقیناً راحت کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ان کا مزاج ہی ایسا ہے کہ گھر کی عورتیں خوف زدہ ہو جاتی ہیں۔

ان کے اندر سوال و جواب چل رہے تھے جب راحت نے کندھا ہلا کر انہیں پھر سے مخاطب کیا۔

" کیا ہوا ندیم! آپ کس سوچ میں پڑ گئے۔میں نے تو بس یوں ہی ایک بات کی تھی۔دیکھیں بلا اجازت تو کسی کے کمرے میں جانا اخلاقیات تو نہیں۔

ان کا انداز شعوری طور پر سرسری سا ہو گیا۔

اسے اپنی پوزیشن کا بخوبی احساس تھا، وہ دو بھائیوں کے درمیان کسی مسئلے کی وجہ نہیں بننا چاہتی تھی ویسے بھی اماں کی وفات کے بعد اس گھر میں اپنا وجود رائیگاں ہی لگتا تھا لیکن جب تک اپنے گھر کی تعمیر مکمل نہیں ہو جاتی، یہاں رہنا مجبوری تھی۔

"ارے یار! کچھ سوچ نہیں رہا بلکہ وہ لفظ ترتیب دے رہا ہوں جن کی مدد سے بھائی صاحب کو سمجھایا جا سکے۔"

بیشک ذہنی کشمکش راحت سے نگاہیں چرانے پر مجبور کر رہی تھی لیکن اسے تسلی دینا اس کا اعتماد بحال کرنا بھی تو ضروری تھا۔

وہ مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگے۔

" نہیں نہیں، آپ رہنے دیں، مجھے اندازہ ہے ان کے مزاج کا۔آپ کی بات بری لگے گی۔"

راحت نے معاملے کی نزاکت کو سمجھ کر مشورہ دیا۔

"تم مجھے اتنا کمزور سمجھتی ہو، بلی کا بچہ اپنی طرح۔"

وہ شرارتی نظروں سے دیکھنے لگے۔

"واہ یہ بھی خوب کہی، شیر کی خالہ تو ہوں نا۔"

اس نے مان سے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا

"بس پھر پریشان نہ ہوا کرو، جب تک یہ شیر زندہ ہے، تم پر کوئی آنچ نہیں آنے دے گا۔ بھائی صاحب کے اپنے مسائل ہیں لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کو کبھی گود میں نہیں لیتے مگر صوفیہ کو وہ گود میں اٹھاتے ہیں، پیار کرتے ہیں۔"

ندیم شاہ نے حیرت کا اظہار کیا۔

"بس یہی سوچ کر میں بھی خاموش ہو جاتی ہوں۔ نسرین بھائی کی کل کل کے ساتھ زندگی گزارنا لیکن دنوں ہی ایک مزاج ہیں۔" اس نے جھرجھری سی لے کر کہا۔

"اور سوچیں، اگر ان کی پیاری بہن آپ کی زندگی میں آ جاتی تو پھر کیا ہوتا۔"

"پھر کیا ہوتا..... وہ ہوتی یا میں ہوتا۔" انہوں نے بھی مزے سے کہا۔

"یعنی اس گھر میں ایک اور بھائی صاحب ہوتے۔۔ واہ جی واہ، کتنا اچھا حل ہے نہ ہر مسئلے کا۔"

راحت جو بھی مزہ آ رہا تھا اس بے مقصد بحث میں۔

"میری پاگل سی راحت جان..... جہاں مزاج نہ ملیں، سوچ ساتھ نہ دے، دل ایک دوسرے کے ہونے کی گواہی نہ دے، اور آنکھوں سے دل کی بات سمجھ نہ آئے، وہاں زندگی عزاب ہوتی ہے، ایک بوجھ ہوتی ہے جسے ہم بے زبان یا بیحس جانور کی طرح ڈھوتے رہتے ہیں۔"

وہ اس کے ہاتھ میں اپنے اندر کی ساری حدتیں منتقل کرتے ہوئے جذب کے ساتھ بولے، تب راحت کو اس بیتحاشا جزباتی اور سچے بندے پر شدت سے پیار آیا۔

وہ اپنے آپ کو بہت معتبر محسوس کرنے لگی، یہی ساری باتیں تو وہ ندیم شاہ کے لیے محسوس کرتی

تھی اور ہر بار ان کے منہ اس کا اعتراف ڈھیروں ڈھیر توانائی دے جاتا تھا۔

لیکن پتہ نہیں تھا یہ توانائی ایک تاریک رات نگل جائے گی اور وہ خالی ہاتھ رہ جائے گی مجرم بن کر۔

☆.....☆.....☆

اس رات ندیم شاہ کو آنے میں دیر ہوگئی تھی، وہ صوفیہ کو سلا کر نماز اور قرآن پاک پڑھنے کے ارادے سے وضو کرنے کے لیے ملحقہ باتھ روم میں چلی گئی، تب ہی لائٹ چلی گئی، کوفت تو ہوئی مگر صد شکر کہ باتھروم میں بھی ایمرجنسی لائٹ آن ہو جاتی تھی۔

غصہ اس بات کا تھا کہ وہ اب یکسوئی کے ساتھ قرآن نہیں پڑھ سکے گی، اور پتا نہیں کب تک ندیم شاہ کے انتظار میں جاگنا پڑے گا انہیں سوچوں میں اس نے وضو کر کے باتھ روم کا دروازہ کھول کر کمرے میں قدم رکھا تو دل دھک سے رہ گیا۔

ایمرجنسی لائٹ کی روشنی میں صوفیہ کے اوپر جھکا ہوا وہ چہرہ کسی اور کا نہیں بھائی صاحب کا ہی تھا۔

وہ بنا دوپٹے کے تھی، اسے یکدم ڈھیر ساری کوفت اور الجھن نے آن گھیرا۔

سرعت سے دوپٹہ صوفے سے اٹھا کر اپنے آپ کو سمیٹتے ہوئے ایک قہر آلود نگاہ بھائی صاحب پر ڈالی اور سامنے آ گئی۔

یہ بھلا کونسا طریقہ تھا۔" وہ مناسب الفاظ سوچنے لگی، اس بے وقت آمد پر احتجاج کے لیے مگر ان کے انداز بے نیازی پر اتنا غصہ آیا کہ پھٹ پڑی یکدم۔

"آپ کو شرم بھی نہیں آتی یوں منہ اٹھائے کمرے میں چلے آتے ہیں کسی کے....."

"اس میں شرم کی کیا بات ہے میں بچی سے ذرا دل بہلانے آ گیا تو تو کیوں تلملانے لگی۔"

ان کا انداز اتنا حقارت سے بھرا تھا کہ اس بار راحت سچ مچ شرم ڈے زمین میں گڑ گئی تھی۔

"بچی سے دل بہلانے کا یہ کوئی وقت نہیں کہ آپ آدھی رات میرے کمرے میں چلے آئیں۔"

اس بار اس کے لہجے میں تیزی نہیں، بلکہ نفرت تھی۔ سفید رنگ کے کرتا شلوار میں ان کا لمبا چوڑا جسم کسی عفریت سے کم نہ لگا، اسے یقین ہو گیا تھا کہ یہ شخص اس وقت صرف بدنام کرنے کے ارادے سے کمرے میں آیا ہے۔

"کیوں ندیم تو آیا نہیں، کسی اور کو وقت دے رکھا ہے۔"

مسکراہٹ تھی کہ آگ کا بھڑکتا ہوا شعلہ، راحت کو اپنا آپ تیز آنچ میں جھلستا ہوا محسوس ہوا۔

"آپ سے مجھے اسی گھٹیا سوچ اور رویے کی توقع تھی۔ عظیم شاہ یہ مت بھولیں کہ میں آپ جیسے لوگوں کو سبق سکھانا اچھے سے جانتی ہوں، مجھے آپ کی ہر حرکت کی خبر ہے۔" وہ ایک دم چیخ پڑی تھی۔

"میں سب جانتا ہوں، تم جن لوگوں سے یہ سبق پڑھ کر آتی ہو جا کر ان کو آئینہ دکھاؤ، میرا تو یہ گھر ہے، یہ میرے بھائی کی بیٹی ہے، میرا جب دل چاہے میں ان کے پاس آ سکتا ہوں، تو کوئی نہیں ہوتی مجھے روکنے والی۔"

راحت کے اندر بڑی شدت کے ساتھ گھنٹی بجنے لگی، اسے لگا جیسے عظیم شاہ اس وقت مکمل نشے کی حالت میں ہوں لیکن اسے حیرت اس بات پر ہو رہی تھی کہ کیا پورا گھر بھنگ پی کر سو رہا ہے جو کسی کو بھی اتنے شور کی آواز نہیں جا رہی تھی لیکن سچ یہی تھا کہ چھت کے اس اخری سرے والے کمرے سے آواز نیچے کے کمروں میں جا ہی نہیں سکتی تھی۔

اور پھر اس صورت میں تو بالکل بھی نہیں جب سب لوگ مست ہو کر سوتے ہوں۔

"آپ فوراً میرے کمرے سے چلے جائیں، میں آپکی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔"

اس کے انداز میں کسی قسم کی لچک یا رعایت نہیں تھی۔ عظیم شاہ کو اس وقت یہ عورت ناقابلِ تسخیر اور ناقابلِ فہم لگی۔

یہ بات بھلا عظیم شاہ کے اندر سوئے ہوئے شیطان کو اس ببلو کو جو کبھی خانہ بدوشوں کی بستی میں تو

کبھی ہوٹل میں اور کبھی کڈی سڑک پر جو ذہنی اور جسمانی طور پر استعمال ہوا ہو، کسی طور پر ہضم نہیں ہو سکتی تھی۔

اور ویسے بھی عظیم شاہ کو نا قابلِ تسخیر عورت کبھی اچھی نہیں لگی، انہیں بس شہزادی اچھی لگتی تھی جو تسخیر ہو گئی تھی اور جس کا انجام عظیم شاہ کی مجسم صورت میں سامنے آیا تھا۔

وہ تھوڑا سا اس کے قریب آئے تھے راحت نے چہرہ پیچھے کر لیا، بدبو کا بھبکا اس کے حواس مختل کر گیا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ ہاتھ اٹھاتی، عظیم شاہ نے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ کر سختی سے دبایا۔

" کیا چاہیے، ہاں بولو۔ غور سے دیکھو ندیم شاہ میرے مقابل کچھ بھی نہیں۔ آؤ نا میرے قریب.....آؤ نا....."

یہ وہ قیامت خیز الفاظ تھے جو کئی دنوں سے عظیم شاہ کی آنکھوں میں مچل رہے تھے اور جن پر راحت کا رواں رواں احتجاج کرتا تھا۔

وہ ندیم شاہ کو اپنے انداز میں ان نظروں کی سنگینی کا احساس دلا چکی تھی مگر شاید انہوں نے عظیم شاہ کو سمجھانے میں دیر کر دی تھی اور جون تھا جو ان کو سمجھتا۔

شاید اماں ہوتی تو.....

اور اپنے گھر میں تو ہو ہی نہیں سکتا، شاید کوئی بھی یہ برداشت نہ کرتا، نا کوئی بھائی اور نا بھابھی۔

راحت نے بھرپور نفرت سے عظیم شاہ کے چہرے پر تھوکتے ہوئے ہاتھ جھٹکا اور ان کی گرفت سے نکل کر جلدی سے صوفیہ کی طرف آ گئی لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ جب مرد پر شیطان حاوی ہو جاتا ہے تو نہ وہ رشتہ دیکھتا ہے اور نہ ہی اس کا تقدس اور نہ ہی کسی خونی رشتے کی حرمت اس کی آنکھوں پر چڑھی ہوس کی دھند کو کم کرتی ہے۔

عظیم شاہ کی آنکھوں سے ہوس ٹپک رہی تھی اور سر پر خون سوار ہو چکا تھا۔

آج پہلی بار کسی عورت نے پلٹ کر جواب دیا تھا۔

چہرے پر تھوکا تھا اور اپنی بھرپور نفرت کا اظہار کیا تھا۔

"سالی کتیا.....تو نے عظیم شاہ کو دھتکارا ہے، تو نے میرے منہ کے اوپر تھوکا، تیرے لچھن میں سب جانتا ہوں، ندیم شاہ تو کاروبار چمکانے کے چکر میں ہے اور تو میرے سامنے پاکباز بن رہی تھی۔

خون آشام نگاہیں اور رگ رگ میے نیزے کی انی کی طرح اترنے والا لہجہ راحت کی ساری ہمتیں پست کر گیا تھا۔

صوفیہ جاگ گئی تھی اور راحت نے اسے دبوچ کر خود بھی چیخنے کی کوشش کی تھی اور اسے بھی رلانے کی کوشش کی تھی کہ کوئی تو مدد کو آئے لیکن پتا نہیں کیوں آواز گلے میں ہی گھٹ کر رہ گئی اور اس لمحے تو سانس حلق میں رک سا گیا جب عظیم شاہ کے ہاتھ میں چمکتا ہوا پسٹل دیکھا۔

یا اللہ.....ابھی دل نے صدا دی ہی تھی کہ ندیم شاہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے تھے، ان کے سامنے ایک ناقابلِ بیان منظر تھا۔

بھائی کا ہاتھ اسلحے سے لیس اور راحت صوفیہ کو سمیٹے سامنے دیوار سے لگی تھی۔ انہوں نے بنا سوچے کہے بھائی پر جست لگائی۔ یہ وقت سوال کا نہیں بلکہ بھائی کے چنگل سے بیوی اور بیٹی کو بچانے کا تھا۔ مگر بھائی کی طاقت اور داؤ پیچ کے ہنر ندیم شاہ سے کہیں زیادہ تھے۔

وہ دونوں آپس میں گتھم گتھا ہو گئے کبھی ایک نیچے اور کبھی دوسرا۔

راحت خوف زدہ نظروں سے پسٹل دیکھ رہی تھی جو کسی بھی لمحے.....

اس سے آگے وہ کچھ نہیں سوچ رہی تھی، پسٹل عظیم شاہ کے ہاتھ سے چھوٹ کر بیڈ پر آن گرا تھا۔

عظیم شاہ نے مغلظات بکنا شروع کر دی تھیں۔

اور ندیم شاہ اب بھی بھائی کو سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"میں اس حرافہ عورت کو گھر میں نہیں رہنے دوں گا، تجھے نہیں پتہ یہ تیری آنکھ کے نیچے کیا کر رہی ہے، تو نہیں جانتا میں رات کے اس پل یہاں کیوں آیا، تجھے نہیں پتہ یہ مجھے خود بلاتی رہی اور میں بھاگتا رہا، ارے اس کی دیدہ دلیری دیکھ، کس قدر حوصلہ ہے سارے مردوں کو خوش کر کے تیرے سے محبت سمیٹ رہی ہے۔"

وہ نا جانے کیا کچھ اول فول بک رہے تھے، ندیم شاہ کی تو سمجھ میں کوئی بات نہیں آئی تھی البتہ راحت نے پسٹل تان کر عظیم شاہ کو پکارا۔

اس وقت ایک ہاتھ میں صوفیہ اور دوسرے ہاتھ میں پسٹل تھا اور وہ نہیں جانتی تھی کہ اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی جس نے بزدلی اور چوہے بلی سے ڈرنے والی راحت کو شیرنی بنا دیا تھا۔

"بے غیرت آدمی! اب اگر ایک لفظ بھی کہا تو ساری گولیاں تیرے سینے میں اتار دوں گی۔"

ندیم شاہ کے لیے یہ انداز اور یہ راحت بالکل نئی تھی۔ انہوں نے چونک کر سر اٹھایا، بھائی کو دھکا دے کر پیچھے کیا۔

راحت پلیز یہ پسٹل مجھے دے دو، پلیز تم صوفیہ کو سنبھالو اور اس کمرے سے باہر نکلو، دیکھو صوفی کتنا رو رہی ہے۔ پلیز تمہیں میری قسم....."

"ارے ایک نمبر کی جھوٹی بدمعاش عورت ہے، ندیم اس کی باتوں میں نہیں آنا۔" عظیم شاہ نے پھر آگے بڑھ کر راحت پر حملہ کرنے کی کوشش کی۔

"راحت! آئی سیڈ گو....." یہ وہ آخری جملہ تھا جو اس کی سماعتوں سے ٹکرایا تھا اور پھر کائنات کی گردش تھم گئی تھی۔

ایک دھماکے کی آواز آئی تھی اس کے بعد راحت کو نہیں یاد کہ کیا ہوا تھا، بس جب وہ ہوش میں آئی تھی تو زندگی کی ناؤ گہرے پانیوں میں ڈوب چکی تھی۔

اسے دو دن بعد ہوش آیا تھا اور اس کے ارد گرد کوئی نہیں تھا۔ نہ ندیم شاہ، نہ عظیم شاہ اور نہ کوئی اور..... وہ تنہا ایک وسیع کمرے میں چھت کو گھور رہی تھی۔

پھر اس نے کسی کی آواز سنی تھی۔

"ارے منحوس عورت تھی، اپنے ہی شوہر کو کھا گئی"

"اللہ توبہ..... جیٹھ کے ساتھ، توبہ توبہ....."

"شوہر کیسے برداشت کرتا، بھلا خودکشی نہ کرتا تو کیا کرتا۔"

پھر ایک اور بھیانک آواز۔

"ارے بیچارے نے ڈائریکٹ سر میں گولی ماری تھی۔"

" کس قدر دیوانہ تھا اس عورت کے پیچھے کیسے برداشت کرتا۔"

تب راحت ایک زوردار چیخ مار کر اٹھ بیٹھی تھی۔

" نہیں گولی ندیم نے نہیں ماری۔

گولی تو میں نے ماری ہے۔" وہ اپنا سر دیوار پر پٹخ رہی، چیخ رہی تھی، رو رہی تھی۔

" بے چاری پاگل ہوگئی۔" یہ اس محلے کی عورتیں تھیں، ندیم شاہ کو دفنا بھی دیا گیا تھا۔ عظیم شاہ..... فہیم شاہ، گھر کے ہر بندے سے لوگ تعزیت کرنے آ رہے تھے۔ راحت کے گھر والے بھی شرمندہ سے کھڑے تھے ایک طرف۔

ماتم کا گھر اس طرح کے بہتان اور راحت کی دگرگوں حالت۔

صوفیہ کو تو اسی دن کوئی لے گیا تھا راحت کے میکے، کسی کو اس کا ہوش ہی نہیں تھا اور شاید یہی وہ سب سے اچھی بات تھی جو راحت کو اس قفس سے نکلنے میں مدد دے گئی تھی۔

ورنہ وہ جب سے ہوش میں آئی، عظیم شاہ کی نظروں نے بلیک میل کرنا شروع کر دیا تھا۔

ان آنکھوں میں پتا نہیں کیا کچھ تھا غلاظت سمیت، راحت سمجھنے سے قاصر تھی۔ وہ بس روتی تھی، چیختی تھی، اور اپنے گناہ کا اعتراف کرتی تھی مگر عظیم شاہ کسی معتبر بزرگ کی طرح آگے آجاتے۔

"محبت کرتی تھی پاگلوں والی ندیم سے، یہ حالت نہیں ہوگی تو کیا ہوگی، ارے تم لوگ نہیں جانتے ایک دوسرے کے لیے دیوانے تھے، ہر پل کا سایہ ندیم بھی گولی نہ مارتا تو کیا کرتا، کاروبار میں نقصان، صحت خراب، وہ بیوی اور بیٹی کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا، بڑی بیماری ہوگئی تھی صرف مجھے بتایا تھا اس نے، کیا کہوں بہت شرمندہ ہوں، پتا نہیں ہمارے گھر میں وہ موذی بلا کیسے آئی، ندیم تو بہت پرہیز گار تھا، "بس قدرت کا لکھا قدرت جانے۔"

یہ تصویر کا ایک اور انوکھا رخ تھا جو راحت کے میکے والوں، محلے کے بزرگوں کو اور پولیس کی تفتیشی ٹیم کو دکھایا گیا۔

پولیس کو عظیم شاہ کی بات پر ضروری کاروائی کے بعد روز آخرت کی طرح یقین آگیا تھا۔ راحت کے گھر والے شش و پنج میں مبتلا تھے مگر یہ ایسا قید خانہ تھا جو کوئی بھی اندر جانے کی کوشش کرتا تو واپسی پر تاریکی ملتی۔

کوئی کچھ کہتا کوئی کچھ کہتا، کسی نے راحت کو بدکردار کہا تو کسی نے عظیم شاہ کے کردار اور مردانگی کو نشانہ بنایا، کسی نے ندیم شاہ پر بہتان لگایا، اس کی خودکشی کو قدرت کی سزا قرار دیا۔ غرض کہ جتنے منہ اتنی باتیں، لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ عظیم شاہ نے سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی راحت کو پولیس کے حوالے نہیں ہونے دیا حالانکہ وہ چیخ چیخ کر کہتی تھی۔

"ندیم شاہ نے خودکشی نہیں کی میں نے مارا ہے۔"

تب ہی سب کو اس کی ذہنی حالت پر ترس آتا اور وہ سمجھتے کہ راحت پاگل ہوگئی ہے صدمے میں ہے اس لیے اس طرح کی باتیں کر رہی ہے۔

"اگر صوفیہ کی زندگی چاہتی ہو تو منہ بند رکھو، یہ کیا ساری دنیا میں تماشا لگا رہی ہو۔"

"تمہاری کوئی نہیں سنے گا راحت بیگم! گولی تم نے چلائی ہے، میں جانتا ہوں اور کوئی نہیں۔ تم تو پھانسی چڑھ جاؤ گی کبھی سوچا ہے تمہاری اس ناگن کا کیا ہوگا۔ وہ تو سولی نہیں چڑھے گی نا۔" اشارہ صوفیہ کی طرف تھا۔

عظیم شاہ نے اس کے کندھے پر اپنے پورے وجود کا دباؤ ڈال کر اس کی آنکھیں کھولنے کی کوشش کی اور پھر پتہ نہیں کیا ہوا کہ واقعی صوفیہ کے نام پر اس کی آنکھیں کھل گئیں۔

اسے لگا جیسے کسی نے گہری نیند سے جگایا ہو۔ "صوفیہ ہاں صوفیہ کو تو لے کر آؤ، ندیم..... آپ کی صوفیہ یتیم ہوگئی ندیم..... آپ کہاں چلے گئے....." اس بار اسے واقعی دورہ پڑ گیا تھا۔

عظیم شاہ ہمدردی سے اس کے زرد چہرے کو دیکھنے لگے جو چند دنوں میں ہر شادابی اور ناز و ادا سے محروم ہو گیا تھا۔

"اف یہ موت کتنی ظالم چیز ہے۔۔" انہوں نے جھرجھری لے کر اس کی طرف دیکھا، ندیم شاہ کی موت نے اسے تنہا کر دیا تھا، اور اگر اسے بھی سزا ہو جاتی اور موت ہو جاتی تو وہ..... تو کیا وہ بھی تنہا اور خالی ہو جاتے۔

انہیں یہ ناقابلِ تسخیر عورت، ان کی ضد کو دیوانگی میں بدلنے والی عورت پھر بھلا کب نظر آتی۔

وہ اس کے سامنے سزا بن کر رہنا چاہتے تھے اور اس کی سزا کے لیے یہی کافی تھا کہ اس کا اعتراف جرم اس کا پاگل پن بن گیا تھا۔

طرح طرح کے بہتان تمام عمر اس کا پیچھا کرتے رہیں گے۔ کیا یہ راحت جیسی معصوم عورت کے لیے کسے سزا سے کم تھا؟

بہت دنوں کے بعد انہوں نے اپنے ہم نفس، ہمدرد و مساز کے ساتھ مل کر طویل قہقہہ لگایا تھا۔

"یار! تو نے بھی مجھے کیا راہ دکھائی ہے.....واہ رے واہ.....تو فکر نہ کر، نکاح تو میں اس عورت سے کیا کروں گا لیکن اپنی بے عزتی کا بدلہ ضرور لوں گا۔

اور پھر عظیم شاہ کے عہد اور راحت کے نئے حوصلے کے ساتھ یہ کہانی بھی بہت سارے واقعات کی طرح وقت کے گرداب میں دب گئی۔

لوگوں کی زبان پر کچھ دن تک اس قصے کا چٹخارہ رہا، سب ایک دوسرے کو توبہ تلا کے ساتھ کبھی راحت سے تو کبھی عظیم شاہ سے تو کبھی اس گھر کی چوکھٹ سے دور رہنے کی تلقین کرتے رہتے۔

مگر وقت کہاں رکتا ہے ہر آنے والا دن گزرے وقت کے ستم کو شکست دیتا رہتا ہے، یہی سچائی راحت بیگم کو صوفیہ کے ساتھ نئی زندگی اور مشقت بھری زندگی گزارنے پر مجبور کر گئی۔

ہر پل ایک خوف، ہر پل عظیم شاہ کا سایہ، ہر پل ان کی للچاتی نگاہوں کے اشارے، اسے کچھ دنوں میں اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ گھر، اس کا ہر فرد، اس سے وابستہ ہر رشتہ اور یہ اونچی دیواروں والی مضبوط چھت اس کے لیے دنیا کی سب سے غیر محفوظ جگہ بن گئی تھی۔

اور پھر ایک شام اس نے اپنا اور صوفیہ کا ضروری سامان سمیٹا اور وہ گھر ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا جہاں اس نے ندیم شاہ کے ساتھ قدم رکھا تھا۔

جہاں اسے ندیم شاہ نے بڑے مان اور چاہت کے ساتھ ہر سرد و گرم سے بچا کر رکھنے کی کوشش کی تھی مگر قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

اب یہ بے آب صحرا تھا جہاں اس کا اور صوفیہ کا اپنا کوئی نہ تھا سوائے بے وقعتی کے احساس کے۔

"سالی چلی گئی اتنی آسانی سے، اس کا تو میں جینا حرام کر دوں گا۔ عظیم شاہ کو نہیں جانتی وہ اپنی بے عزتی کبھی بھولتا نہیں،" یہ اس وقت کا عظیم شاہ تھا جو آتش جوان لیکن وقت نے ثابت کیا تھا کچھ خصلتیں مرتی نہیں بلکہ عمر بھر جوان رہتی ہیں اور ان کی تیزی تندی میں شدت آ جاتی ہے۔ عظیم شاہ آج بھی ایسا ہی تھا۔

☆.....☆.....☆

"ذرا ڈھولکی بجاؤ..... گوریو..... میرے سنگ سنگ....." گھر میں شادی کا ہنگامہ شروع ہو چکا تھا، راحت بیگم بالکونی میں آئیں تو ان کے کانوں میں ڈھولکی کی آواز پڑی۔

اتنے دنوں کے بعد تو گھر کی فضا سے اداسی اور پریشانی کے بادل چھٹے تھے، انہوں نے بڑی شدت کے ساتھ ان رونقوں کے آباد اور قائم رہنے کی دعا کی، پتہ نہیں کیوں دل آنے والے دنوں سے بہت خوف زدہ تھا۔

آنکھیں بند کر کے ندیم شاہ کو دل کے قریب کر کے بیٹی کی شادی کی خبر دی کہ وہ رب کے زیادہ قریب ہیں۔۔تو وہ صوفیہ کے سکھ کی دعا کریں اور دعا کریں ندیم کہ یہ وقت خیریت سے گزر جائے پھر میں ہر سزا کے لیے تیار ہوں۔

مجھے بھائی صاحب سے کسی اچھائی اور بھلائی کی امید نہیں، اتنے سالوں بعد اس راکھ کو کریدا جائے گا تو پھر بہت سارے رازوں سے پردہ اٹھے گا۔ندیم! میں نے اس سارے عرصے میں بھائی صاحب کی بات بھی تو نہیں مانی۔میں نے نکاح کی پیشکش ٹھکرا دی۔میں نے وہ گھر دینے سے انکار کر دیا جو آپ کے اور میرے خوابوں کی تعبیر تھا اسے صوفیہ ضرور آباد کرے گی جو آج تک خالی ہے میری زندگی کی طرح۔

ندیم! میں آپ کو کیا بتاؤں کیسی کیسی آفتیں نہ ٹوٹیں.....اور پھر انہوں نے تو صوفیہ کو مجھ سے بدگمان کرنے کی کوشش کی، آپ ہوتے تو کیا یہ سب ہوتا، کبھی نہ ہوتا۔"

ہمیشہ کی طرح آنسو ان کے چہرے پر لکیریں بنا رہے تھے۔

شجاع نے بتایا تھا کہ کل عظیم شاہ کی پیشی ہے۔

"پتا نہیں کل کیا ہوگا۔" ان کا دل سہمے جا رہا تھا۔

سماعتوں میں اب بھی ڈھولکی کی آواز گونج رہی تھی۔

"میرے اللہ مجھے اپنی بیٹی کو اپنے ہاتھوں سے رخصت کرنے کا موقع ضرور دینا۔"

☆.....☆.....☆

خزیمہ کا فون کافی دیر سے بج رہا تھا اور وہ بالکل بھی کسی سے اس وقت بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

کچھ دنوں سے دل ہر چیز سے اچاٹ ہو چکا تھا اسی لیے وہ آفس سے بھی چھٹیاں لے کر بس اپنے ہوٹل کے کمرہ تک محدود ہو گیا تھا۔

امی ابا اور سامعہ کا اصرار تھا کہ وہ کراچی آجائے۔ ہوم سکنس محسوس ہو رہی ہو گی مگر اصل مسئلہ ہوم سکس سے زیادہ دل کی سکنس کا ہو گیا تھا۔

نہ وہ کسی کو مورد الزام ٹھہرا سکتا تھا اور نہ کسی سے کوئی فریاد کر سکتا تھا۔

اچھی بھلی زندگی تھی خوش باش لیکن مجھے بھی شوق ہوا تھا محبت کا صدمہ پالنے کا۔ فون تھوڑی دیر بند ہونے کے بعد پھر بجنا شروع ہو گیا اس نے سستی سے نجات کے لیے ایک لمبی انگڑائی لی اور بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھے سیل فون کو اٹھا لیا۔

کوئی نیا نمبر تھا یس کا بٹن پریس کر کے کانوں سے لگایا تو اجنبی آواز نے تعارف کروایا۔

"کاشف کیانی بات کر رہا ہوں۔

خزیمہ کے لیے یہ نام بالکل اجنبی نہیں تھا بلکہ اس کی یادداشت میں نقش ہو چکا تھا۔

جی فرمایئے خزیمہ عادل بات کر رہا ہوں۔"

وہ تکیے کے سہارے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

خزیمہ مجھے تم سے ملنا ہے، بلکہ اٹس ارجنٹ مجھے تم سے ابھی اور اسی وقت ملنا ہے۔ یہ بتاؤ میں تمہارے پاس آجاؤں یا کہیں باہر ملیں۔"

خزیمہ کو تھوڑی سی حیرت ہوئی کہ کس قدر بے تکلفی کے ساتھ وہ اس سے مخاطب تھا اور ابھی ملنے کی بات کر رہا تھا جیسے جانتا ہو کہ خزیمہ اس وقت کہاں ہے۔۔

"آپ بتائیے میں آپ کے پاس آجاتا ہوں۔کوئی پرابلم ہے۔اس کا ذہن فورا" سے بیشتر خولہ کی طرف گیا۔

چلو ٹھیک ہے،تم میرے پاس مت آؤ۔میں تمہارے ہوٹل آجاتا ہوں۔چائے ساتھ پئیں گے میں پندرہ منٹ میں تمہارے پاس ہونگا۔

وہ خاصی جلد بازی میں تھا اور خزیمہ کی حیرانی بھی فون بند کرنے کے بعد کم نہ ہوئی تھی البتہ اس کا یہ فائدہ ہوا تھا کہ اس کی طبیعت پر چھائی کسلمندی پھرتی میں بدل گئی تھی۔

اس نے سب سے پہلے اپنے حلیے پر توجہ کی،کل سے وہ ایک ہی ٹراؤزر شرٹ میں تھا۔

پندرہ منٹ میں شاور لے کر کپڑے چینج کر کے نیچے لابی تک جانا کوئی مشکل نہیں تھا وہ ایک استری شدہ پینٹ شرٹ لے کر باتھ روم میں گھس گیا۔

☆.....☆.....☆

"شمائلہ پولیس کسٹڈی میں۔"

منیر کمال نے اخبار کے بیک پیج کا جائزہ لیتے ہوئے چھوٹی سی خبر پڑھی اور اپنی عقل کو شاباش دیتے ہوئے قدسیہ کے کمرے میں آگیا۔

جو کل رات اس کی اچانک آمد پر حیران کم اور پریشان زیادہ ہوگئی تھی۔

کئی سالوں سے وہ اس شخص کا انتظار کر رہی تھی،کئی سالوں سے وہ اس شخص کے نکاح میں تھی اور اس نے کبھی پلٹ کر خبر نہیں لی تھی۔

اب جبکہ وہ اس کو بھول کر ایک نئی زندگی مشقت سے بھری زندگی کے ساتھ سمجھوتہ کر کے بیٹھ گئی تھی تو منیر کمال اس کے سامنے آگیا تھا۔

یا اللہ..... یہ زندگی گورکھ دھندہ نہیں تو کیا ہے۔پچھلے ہفتے ہی تو اس نے اپنے بھائی کو فون کر کے

آگاہ کیا تھا کہ وہ ان کے پاس آنے کے لیے تیار ہے۔ ڈاکیومنٹس تیار کروالیں اور یہ کہ وہ اس نکاح کی حیثیت جاننا چاہتی ہے جو آٹھ سال پہلے ہوا تھا۔ ان کے درمیان اب تک کوئی تعلق استوار نہ ہوا تھا نا ازدواجی اور نہ سماجی۔

اس نے صرف ایک بار منیر کمال کو دیکھا تھا، شاید دو بار اس سے فون پر بات ہوئی تھی اور آج تیسری بار وہ اس سے بات کر رہی تھی۔

سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے لیکن چونکہ وہ اب شوہر کی حیثیت سے گھر میں موجود تھا تو اس سے پوچھنا تو ضروری تو تھا نا۔

"آپ کو اب میری یاد آئی۔"

اس کی بلا کی خوبصورت آنکھیں پانیوں سے لبریز تھیں۔ سفید چہرے پر خفگی اور تناؤ کی سرخی منیر کمال کو عجیب سے رعب حسن میں مبتلا کر گئی۔

"میں بھی کتنا احمق تھا اتنا عرصے ان قاتل جلووں سے محروم رہا۔ خیر ابھی بھی وقت ہاتھ سے نہیں نکلا"

کمال نے اپنی شیطانیت کو مظلومیت کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی اور اس سکڑی سمٹی نازک سے ہاتھوں والی لڑکی کے قریب بیٹھنے کے لیے جگہ بنائی۔

اسے تو یاد بھی نہیں تا کہ یہ نکاح کن حالات میں ہو گیا تھا۔ اچھی بات تو یہ تھی کہ وہ اس وقت اپنی نکاحی بیوی کے سامنے صفائی دینے کو ایک زبردست سی کہانی گھڑ کر بیٹھ گیا تھا۔

تمہیں پتا ہے میں آٹھ سال جیل میں رہا۔ اس نے اپنا سر جھکا لیا اور منیر کمال کو یقین تھا کہ وہ اپنا جھکا سر اس انکشاف پر اٹھا لے گی۔

ہاں قدسیہ! میری گاڑی سے ایک ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا دبئی میں۔ میں دبئی پولیس سے تو بچ کا لیکن مجھے کیا پتہ تھا کہ کم بختی میرا پیچھا کرے گی۔ مجھے بیتھر وائیر پورٹ پر پکڑ لیا گیا اور پھر مجھے قید ہو گئی۔ میں کس کو بتاتا کس سے فریاد کرتا، کس سے مدد مانگتا، جن کے آگے پیچھے کوئی نہیں ہوتا وہ اسی طرح خوار

ہوتے ہیں۔تمہارے بھائی سے بھی رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن کیا بتاتا کہ میں کس مشکل میں ہوں۔"

بس مت پوچھو کیا کچھ نہیں جھیلا۔

میں تمہیں دکھ تکلیف میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا مجھے نہیں پتا تھا کہ میں اسی قید خانے سے نکل پاؤں گا یا نہیں۔وہ تو مجھ پر قدرت کو رحم آ گیا میری اچھی ریپوٹیشن کی وجہ سے میری سزا جلد ختم ہو گئی۔"

وہ پتا نہیں کیا کیا کہانیاں سنا رہا تھا۔

کتنا سچ، کتنا جھوٹ، قدسیہ کو یقین آ بھی رہا تھا اور نہیں بھی آ رہا تھا۔

دل کی گواہی کچھ تھی دماغ کی کشمکش کچھ تھی، لیکن اس کے آنسوؤں نے ساری عداوتیں دھو دیں۔

منیر کمال اس کی گود میں سر رکھ کر رو رہا تھا۔

"قدسیہ! میں تمہارا مجرم ہوں، گناہ گار ہوں، تم سب کی خوشیوں کا تمہارے سارے خواب ساری خوشیاں میری وجہ سے ملیا میٹ ہو گئیں۔تمہاری عمر کا سب سے خوبصورت دور میری وجہ سے ضائع ہو گیا۔تم نے میری وجہ سے تنہائی کاٹی۔

تم نے میری وجہ سے اس دوران سنسان علاقے میں درویشی کی زندگی گزاری۔تمہیں میرا انتظار تھا نا تمہیں یقین تھا نا کہ میں لوٹ کر آؤں گا، دیکھو تمہارا یقین کتنا سچ تھا، کتنا اعتبار تھا تمہیں اس رشتے پر جس کی ڈور سے ہم بندھے ہوئے تھے۔"

"دیکھو میں سب سے پہلے تمہیں ڈھونڈتا ہوا یہاں پہنچا۔حالانکہ میں اس جگہ صرف اس وقت آیا تھا جب ہمارا نکاح ہوا تھا دیکھو مجھے سارے رستے یاد تھے۔"

وہ وقت یاد تھا، جب تم میری بنی تھی ہاں قدسیہ! تم میری.....

وہ مچل مچل کر رو رہا تھا، جذبوں کی شدت سے بھرپور باتیں کر رہا تھا، قدسیہ کے دل پر جمی برف پگھلنا شروع ہو گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

آج وہ ایک مدت کے بعد آئی تھی، سر کا مساج کرنے نرم گرم ہاتھوں کی حدت سے آنکھوں کے پپوٹوں کی حدت سمیٹنے۔

شل اعصاب کو نئی زندگی سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ دینے، کیا وہ ناراض تھی جو اتنے دنوں بعد آئی تھی یا پھر شعور نے زندگی کے تمام مراحل طے کرنے کے بعد اسے اپنے سب سے زیادہ قریب محسوس کیا تھا۔

تمام رات اس سے ڈھیر ساری باتیں کی تھیں اور اس کی مخصوص خوشبو ابھی تک اپنے ارد گرد محسوس ہو رہی تھی۔

"آؤ مریم!.....ایک مدت ہو گئی تمہیں دیکھا نہیں، مگر اب دل کو کیسے سمجھاؤں کہ تمہیں دیکھنا اب ممکن نہیں۔ تمہارے معاملے میں بڑا پاگل ہے میرا دل۔"

انہوں نے ایک کروٹ لے کر سرد اور سپید ماحول میں زندگی سے بھرپور مسکراہٹ والی مریم کو محسوس کیا، ایک مخصوص سے مسکراہٹ ان کے لبوں کو چھو گئی۔

"تم کو بس جانے کی جلدی تھی نا....."

جب انہوں نے پہلی بار آپ سے تم کا سفر طے کیا تھا تو وہ اچانک چونکی، شرمائی تھی اور پھر شرارت سے مسکرا دی تھی۔

"برا لگا" وہ بھی مسکرائے تھے۔

"اچھا لگا بالکل اپنا اپنا سا۔" وہ لفظوں کے معاملے میں بالکل بھی کنجوس نہیں تھی اور راجہ طارق محمود اس کے معاملے میں بہت محتاط تھے کہ مریم کو الجھن ہونے لگی تھی۔

ان کی آنکھیں بولتی تھی چہرہ دل کی بات کہہ جاتا تھا اور مریم کے لیے یہ بھی کافی تھا کہ دنیا میں کوئی تو ایسا ہے جو اس کی بات سنتا ہے اور کہے بغیر بھی سمجھ لیتا ہے، وہ جو سوچتی تھی وہ اس کے کہنے پر پورا بھی ہو جاتا تھا۔

آپ کو کیسے پتہ چلا مجھے مائیگرین ہو رہا تھا۔ وہ فون پر ان کی خیریت پوچھتی، انہیں ڈانٹتی تو ان کے اندر سکون کی لہریں دوڑنے لگتیں۔

"اس لئے کہ مجھے بھی ہو رہا ہے، بہت ہو رہا ہے۔"

وہ ان کے جواب پر پریشان ہو جاتی آنکھوں میں آنسو آ جاتے، "اچھا آپ آ جایئے میں آپ کے لیے اچھا سا قہوہ بناتی ہوں۔"

وہ جھجکتے ہوئے کہتی، دل میں سوچتی کہ وہ پتا نہیں اس کے بارے میں کیا سوچتی جو اتنے مزے سے ان پر اپنا حق جماتی ہے، فرمائش کرتی ہے۔

"اور سر کون دبائے گا۔"

"اس کی الگ سے فیس ہوگی۔" اس نے ہونٹ دانتوں تلے دبا لیے۔

"اور کوئی حکم۔" مخاطب کا لہجہ دل میں ہلچل مچا گیا تھا۔

"اچھا آپ آ رہے ہیں یا باتیں بناتے رہیں گے، میں کھانا بنانے جا رہی ہوں اعجاز بھائی نے بھی وعدہ کیا ہے۔ جلد آئیں گے۔"

وہ اپنی طرف سے پروگرام فائنل کر کے اسی طرح فون بند کر دیتی تھی اور طارق محمود کے پاس کسی حیلے بہانے کی کوئی صورت ہی نہیں رہتی تھی، اور پھر قدرت کو شاید ان کا طویل ساتھ منظور تھا یہ حیلے بہانے بھی ختم ہو گئے، ایک رات اعجاز الدین کے گھر پر اس کے کسی دشمن گروہ نے حملہ کیا وہ اس حملے میں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا، مریم کو بھی چوٹ آئی تھی مگر ذہنی حالت زیادہ گرگوں تھی، اسے یقین تھا یہ منیر کمال کی کارستانی ہے۔ عین وقت پر اگر پولیس نہ آ جاتی تو پتہ نہیں کیا ہوتا۔

راجہ طارق محمود نے فوری طور پر اعجاز الدین کا گھر خالی کروا کر اسے اپنے گھر پر منتقل کیا تھا اور پھر کچھ دنوں میں اپنی رہائش گاہ بھی تبدیل کر لی تھی۔

پھر مریم کے ساتھ اس کی زندگی کے آخری دنوں تک جو ربط بنا وہ آج تک قائم و دائم تھا کشمالہ اور خولہ کے ساتھ کی صورت میں، لیکن سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ جا کر بھی نہیں گئی تھی کبھی سر دبانے آجاتی کبھی قہوہ پلانے اور کبھی غصہ کرنے۔

"آپ نے اپنا خیال رکھنا چھوڑ دیا..... دیکھئے وزن بڑھ رہا ہے..... اور آنکھیں..... یہ آئی پیڈ زکس خوشی میں بن رہے ہیں۔"

"تمہاری یاد میں تم جو پاس نہیں....." وہ مسکرا دیتے۔

اب کبھی وہ آنکھیں موندے اس کے ساتھ ہم کلام تھے، تب عاشر کی سرگوشی انہوں نے اپنے قریب محسوس کی۔

"خاموش..... بابا سو رہے ہیں، اس کی آواز پر انہوں نے پٹ سے آنکھیں کھول دی اور کشمالہ کے چہرے پر شرارتی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"میں نے کہا تھا نہ بابا سو نہیں رہے۔"

وہ اپنی جیت پر خوش تھی، عاشر نے منہ بسور لیا۔

"کیا ہے بابا جان! آپ نے آج بھی میری لاج نہیں رکھی۔"

انہوں نے بے ساختہ اسے اشارے سے اپنے قریب لا کر سینے سے لگا لیا۔ کس قدر پر سکون احساس تھا، کتنی ٹھنڈک ملی تھی راجہ طارق محمود کے تپتے دل کو، اس کا اندازہ وہی کر سکتا تھا، جو اس نعمت سے محروم تھا۔ "میری زندگی، میرا خواب، میری سب سے انمول خواہش، میں نے تجھ سے دوری دل کی خوشی سے نہیں کاٹی، اور نہ دل کی خوشی کیلئے یہ سب کیا۔

میں یہاں رہتا تو مر جاتا، اور تم جیتے جی مر جاتے۔ میں چلا گیا تم نے جینا سیکھ لیا اور میری طاقت بن گئے۔

وہ ہنوز اپنے بابا جان کے سینے سے لگا اس کے دھیمے سروں میں ہونے والے اعترافات سن رہا تھا۔

"پتا ہے ابھی مریم کو یہی بتا رہا تھا کہ میرا بیٹا بہت سجیلا اور نخریلا ہے، میرے پاس بیٹھا رہتا ہے مگر اتنا انا پسند ہے کہ نہ مجھے پیار کرتا ہے اور نہ مجھ سے پیار لینے کے لئے آگے بڑھتا ہے مجھے خود ہی کچھ کرنا پڑتا ہے۔"

وہ ایک اور انکشاف کر رہے تھے عاشر نے چونک کر سر اٹھایا کشمالا بس ذرا فاصلے پر کھڑی باپ بیٹے کے اس ملنے پر آنسو ضبط کر رہی تھی اپنی ماں کے ذکر پر ضبط کا پیمانہ لبریز ہو ہی گیا۔

"ہاں مریم..... کشمالہ نے صحیح تو کہا تھا میں سو نہیں رہا تھا، مریم سے باتیں کر رہا تھا، میرا اس سے آن لائن رابطہ ہے حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔"

وہ آج کوئی اور ہی راجہ طارق محمود تھے، سرخ ڈورے والی آنکھوں کے ساتھ مسکراتے ہوئے عاشر عباس کو اپنا ہی عکس محسوس ہو رہے تھے۔

"بابا مریم..... آئی مین مریم آنٹی سے میری چغلی لگانے کا کوئی فائدہ نہیں، انہیں بھی پتا ہے زیادتی کس کے ساتھ ہوئی ہے"، شکوے پر کشمالہ روتے روتے مسکرا دی راجہ طارق محمود نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

مریم کا دوسرا روپ تھی وہ، انہوں نے اسے بھی اشارے سے اپنے پاس بلایا۔

ساری جگہ تو آپ کے صاحبزادے صاحب گھیر کر بیٹھے ہیں، اس نے عاشر کے سر پر کھڑے ہو کر بے ساختہ شکوہ کیا، طارق محمود تو قہقہہ لگانے سے باز نہیں آئے تھے البتہ عاشر عباس نے فوراً سے پیشتر گھور کر دیکھا۔

کشمالہ کے لئے اس کی نگاہ بے نیازی کافی تھی اس نے فوراً ہاتھ جوڑ دیے راجہ طارق محمود کو یہ منظر بہت بھایا تھا، ان کا پھر سے دل چاہا تھا مریم سے کلام کرنے کا، اور وہ اسے بتانا چاہتے تھے۔ میرا بیٹا اور تمہاری بیٹی۔

"ہاں مریم.....ایسا ہوسکتا ہے ہمارے خوابوں کو نئی زندگی مل سکتی ہے....."ان کے دل کے نئی راہ پر قدم ڈالا تھا۔

"پاپا آپ آج بس تیاری پکڑ لیں، نانو بے چینی سے آپ کا انتظار کر رہی ہیں، خولہ اور کاشف سارے اسلام آباد کی دکانوں سے پھول جمع کر کے لے آئے ہیں اگر آج آپ نے ہمت نہ پکڑی تو بہت سخت سزا ملے گی۔"

کشمالہ نے ان کے کمرے کی چیزیں سمیٹنا شروع کر دی، یہ کمرہ کتنے مہینوں سے ان کا مسکن بنا ہوا تھا اب تو اس سے انسیت سی ہوگئی تھی۔

عاشر نے ڈسچارج پروسس کے لیے ڈاکٹر روم کا رخ کیا تھا۔

☆.....☆.....☆

شمائلہ کمال حوالات میں بیٹھی سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہی تھی اور اس کے اندر بے عزتی، بے بسی کی آگ کا الاؤ سا روشن ہو چکا تھا۔

سرمد بخاری کا فون بند تھا، منیر کمال کا فون بند تھا، عاشر عباس اس کا فون نہیں اٹھا رہا تھا، اور بھی بہت سارے لوگ تھے اس کے دوستوں کی فہرست میں مگر اب تک کوئی اس کی مدد کو نہ آیا تھا۔

حیرانی تھی تو اس بات پر پولیس کے عملے نے اب تک اتنی مشہور صورت کو پہچانا نہیں تھا۔ اسے پروٹوکول نہیں دیا تھا، اور اٹھا کر لاک میں ڈال دیا تھا، اوپر سے ستم یہ کہ لیڈی پولیس نے اس کی جامہ تلاشی بھی لی تھی جیسے وہ اسمگلنگ کے جرم میں اندر آئی ہو اور لیڈی پولیس مستقل اس کے سامنے تعینات تھی۔

سوچ سوچ کر اس کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا، وہ محض اس لمحے کو کوس رہی تھی جب اس نے اپنی ماں سے ملنے کا سوچا تھا اور کاشف کیانی سے بھڑنے کی حماقت کر بیٹھی تھی۔

"راجہ طارق محمود کا گھر ہو یا میرے ماں باپ کا.....میرے لئے ہمیشہ منحوس ہی ثابت ہوئے۔"

اس نے تلملا کر سوچا اور ایک لمبی جمائی لے کر پھر سے منیر کمال کا نمبر ڈائل کیا۔

"وہ اتنی آسانی سے مجھے دھوکا نہیں دے سکتا، کیا اسے میری طاقت کا اندازہ نہیں....." وہ اب بھی اپنی متکبرانہ سوچ کے ساتھ اسے گالیاں دے رہی تھی جبکہ اسے یہ نہیں پتا تھا کہ منیر کمال کبھی کچی گولیاں نہیں کھیلیں۔

وہ اتنا احمق نہیں تھا کہ سرمد بخاری کے کہنے پر اور شمائلہ کے بلانے پر اپنی کشتیاں جلا ڈالتا۔ اس نے اس مہلت کو موقع غنیمت جان کر گاڑی ان انجان راستوں پر ڈال دی، جہاں اس سے پہلے کبھی آنے کا خیال بھی نہیں آیا تھا، لیکن وہ جو کہتے ہیں نہ، منیر کمال جیسے لوگ جہنم کدے کو بھی کعبہ بنا لیتے ہیں، سو اس کے لئے قدسیہ کا گھر، اور اس کا ساتھ گوشہ عافیت ثابت ہوا تھا۔

اسے مکمل یقین تھا کشمالہ اپنے ہاتھوں سے کنواں کھود کر اس میں گر چکی ہے، اور وہ ایک بار پھر اس کنویں کے کنارے سے بچ کر آ گیا تھا۔

اب شمائلہ لاکھ سر پٹختی، منیر کمال ہے اس کے ہاتھ نہیں آنا تھا۔

آخری سگریٹ ختم کرنے کے بعد، پھر سے سارے نمبر ٹرائی کیے اور سب سے آخر میں اپنی ماں کے گھر کا وہ نمبر بھی آزما ڈالا، جہاں آج تک اس کی آواز سن کر ریسیور سائیڈ پر رکھ دیا جاتا تھا۔

آج بھی اسے یقین تھا ایسا ہی ہوگا، مگر حیرت انگیز طور پر فون اٹھا لیا گیا اور دوسری طرف سے وہ برسوں بعد اپنی ماں کی آواز سن رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

خزیمہ کاشف سے ملنے کے بعد جب سے کمرے میں آیا تھا، خود کو کسی ڈرامائی دنیا میں محسوس کر رہا تھا۔

اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا، جو کاشف نے بتایا، جو اس نے دریافت کرنے کی کوشش کی اس میں

خزیمہ اور اس کی فیملی کا کردار سرفہرست تھا۔

یہ حیرت نہیں صد حیرت کا مقام تھا کہ کاشف خزیمہ کے گھر کے ہر بندے کو جانتا تھا اور ان کے کوائف تک معلوم تھے۔

اس سے مل کر پہلی بار خزیمہ کو مرعوبیت کا احساس ہوا تھا اور اس نے سوچا تھا کہ خولہ کا انتخاب کوئی عام سا بندہ نہیں ہو سکتا اور آج اسے اپنی چہرہ شناسی اور آدم پرکھ کر یقین ہو گیا تھا۔

کاشف کیانی واقعی کوئی عام بندہ نہیں تھا، جب تک اس کو اس کہانی پر خود یقین نہیں آتا، وہ اماں ابا سے بھی شیئر نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی اس سے از راتشویش پوچھ سکتا تھا کہ "ابا! کیا آپ کو اپنے سارے بہن بھائی یاد ہیں اور یہ بھی کہ ان میں سے کوئی غائب تو نہیں۔"

ابا نے تو اس بات پر اس کے لتے لینا تھے۔

وہ سوچ سوچ کر تھک گیا تھا تب اس نے سامعہ کا نمبر ملایا۔

"مجھے یہ بتاؤ، تمہارے پاس بڑی پھوپھی کا نمبر کوئی نمبر ہے، ان سے ڈائریکٹ بات ہو سکے گی۔"

سامعہ نے چند لمحے لگائے تھے اور پھر ہولڈ پر جا کر اپنے ہی موبائل سے نمبر ڈھونڈنے لگی۔

"بھیا! میں آپ کو سینڈ کر دیتی ہوں، خیر تو ہے کہیں ان کی صاحبزادی کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کا خیال تو نہیں آ گیا۔" وہ چمکی۔

"چپ کر جاؤ، پھر فضول باتیں، مجھے جلدی سے نمبر سینڈ کرو۔"

خزیمہ آج کوئی مذاق سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔

☆.....☆.....☆

"اظہر..... سرمد بخاری اور پھر اظہر..... پتہ نہیں زندگی کس طرف لے جا رہی تھی اس قید خانے سے تو نکلنے کی ہر کوشش بے کار گئی تھی اور پتہ نہیں کیوں اظہر بھی اس سے تلملایا رہتا تھا، وہ پہلے والا اظہر ہی

نہیں تھا اسے تو یوں لگتا تھا، جیسے کسی اجنبی قید میں ہے۔

نا وہ بات کرتا تھا اور نہ ہی کسی بات کا سیدھا جواب دیتا تھا، لیکن گزری رات وہ مرد ضرور بن گیا تھا، اس کے عورت پن کا فائدہ اٹھانے کے لئے۔

صبح اٹھ کر سعدیہ نے ہر چیز پر نفرت سے تھوکا تھا اور خود کو بھی اس نفرت کا نشانہ بنایا تھا، لیکن ان ساری حرکتوں کا فائدہ کیا تھا، کچھ بھی نہیں، غرض پوری ہو چکی تھی، اب اسے کوئی غرض نہیں تھی کہ سعدیہ مر رہی ہے یا جی رہی ہے، یہ وہی سعدیہ ہے بھی کہ نہیں، جس کے ساتھ اس نے جینے مرنے کے بعد کیے تھے۔

آج شام اس نے تیار ہونے کا کہا تھا اور وہ اس مقصد کے لیے کپڑے، جوتے بھی لے آیا تھا۔

سعدیہ کو احساس ہو گیا تھا، پھر کوئی اس کا خریدار مل گیا ہے۔

یہ واحد شام تھی، آخری موقع تھا کہ اگر وہ اظہر اور اس جیسے لوگوں کے چنگل سے نکل سکتی ان کی دنیا سے فرار ہو سکتی اس نے تہیہ کر لیا تھا، وہ آج یہ کوشش ضرور کرے گی اس لئے وہ بلا حیل و حجت اظہر کی بات مانتی جا رہی تھی۔

اس کی مرضی کے کپڑے، اس کی مرضی کی تیاری اور سب سے بڑی بات چہرے کو ریلیکس کر کے مسکراہٹ کے ساتھ وہ اس سے بات کر رہی تھی۔

جیسے دونوں پکنک منانے جا رہے ہوں۔

اظہر اسے لے جانے کے لئے گاڑی لے کر آیا تھا، یہ بڑی بات تھی ورنہ اس کے پاس کھٹارا سی موٹر بائیک تھی۔

"قربانی..... گویا بڑی قربانی کا بڑا صلہ....."

اس کی مسکراہٹ کے پیچھے آنسو کا سیلاب رواں تھا۔

گاڑی جانے انجانے راستے پر رواں تھے اور انہی راستوں سے ایک راستہ اس کے گھر کی طرف

بھی نکلتا تھا، اس کا پیارا گھر، پیارے لوگ، اپنے سچے رشتے، ان کی دی ہوئی ہر تکلیف دوسرے دن زائل ہو جاتی تھی۔

پتا نہیں سب جس حال میں ہوں گے، اماں کیا کرتی ہوں گی، تائی سے صوفیہ نے کیا کچھ نہ سنا ہو گا۔ پتہ نہیں صوفیہ کی شادی ہوگئی یا نہیں اور عظمی باجی، عالیہ باجی، سب کو کتنے طعنے ملتے ہوں گے۔

نعمان تم مجھ سے نفرت کرتا تھا نا اور زیادہ ہوگئی ہوگی.....اس کی نفرت۔

"اف میرے اللہ.....اس نے گہری سانس لی، گاڑی انجان سی جگہ پر رک گئی تھی، اظہر اسے اندر ہی بیٹھنے کا کہہ کر گاڑی آٹو لاک کر کے چابی لے کر نیچے اتر گیا تھا۔

وہ سامنے والے ٹیلیفون بوتھ تک گیا تھا۔

سعدیہ نے محتاط نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا گاڑی لاگ تھی، لیکن ارد گرد بہت سے لوگ تھے جو اس کی مدد کر سکتے تھے اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی، کوئی پولیس والا، کوئی ٹریفک کانسٹیبل، کوئی نظر آئے اظہر کے واپس آنے تک ایک بار ضرور لینا چاہتی تھی۔

اس نے بے چینی سے ادھر ادھر دیکھا۔

کوئی اسے اپنا مددگار نظر نہیں آ رہا تھا، سب خود میں گم تھے اور ویسے بھی یہ کوئی بہت مصروف شاہراہ نہیں تھی اس نے پھر سے ہاتھ ہلایا، شیشے پر ہاتھ مارے۔

تقدیر مہربان ہوتی تو راستے بھی ہموار ہو ہی جاتے وہ بے چینی سے ادھر ادھر نگاہیں دوڑاتا 13e اظہر کو کافی دیر ہوگئی تھی کے اندر گئے ہوئے تب ہی اسے اپنے دائیں طرف سڑک کراس کرتے ہوئے شناسا چہرہ نظر آیا۔

"نعمان....." بے اختیار اس کے لبوں سے سرگوشی نکلی اور پھر چیخ پڑی "نعمان.....!"

☆.....☆.....☆

کاشف، خولا، خزیمہ، اور کشمالہ چاروں آمنے سامنے بیٹھے تھے اور ان کے درمیان خاموشی کا اتنا طویل وقفہ حائل ہو گیا تھا کہ کمرے میں قدم رکھتے عاشر عباس کے چہرے پر بے چینی کے آثار نمودار ہوئے اس کی آمد پر بھی کوئی ہلچل نہیں ہوئی تھی۔ یہ حیرت کا نہیں، تشویش کا مقام تھا۔

گزری رات کاشف نے جو کہانی اسے سنائی تھی، وہ انوکھی ضرور تھی، مگر اتنی انہونی نہیں، لیکن شاید وہ لوگ جو اس انہونی کہانی کا حصہ تھے وہ ان کی ذہنی حالت کا اندازہ کر ہی نہیں سکتا تھا۔

"دیکھو مالا! ہر انسان کے ماضی کی جڑیں اتنی مضبوطی سے پیوست ہوتی ہیں کہ انسان چاہے بھی تو اپنے اصل سے، اپنی حقیقت سے ہمیشہ کے لئے جدا نہیں رہ سکتا۔

"میں نہیں سمجھتا کہ تم لوگوں کا پاکستان آنا، راجہ صاحب کی فیملی کے ساتھ مضبوط تعلق کا بننا، اور ہم سب لوگوں کا کسی ایک مشن پر ہم خیال ہونا بے مقصد تھا۔

عاشر! تمہیں برا لگے گا اور لگنا بھی چاہیے کہ گزری رات ہم نے اپنی زندگی کو ایک مقصد کے لیے وقف کیا اس میں سرفہرست جو لوگ قابل سزا ٹھہرے وہ شمائلہ کمال اور منیر کمال جیسے درندہ صفت انسان تھے، جنہوں نے انسانیت کی تذلیل کے لیے بے گناہ اور معصوم روحوں کی سوداگری میں اپنا حصہ ادا کیا۔

جو باشعور، عقل و فہم رکھتے ہوئے بھی انسانی تجارت کا حصہ بنتے رہے، محض اپنی ہوس اور نفس کی بے لگام خواہشوں کو منانے کے لیے شمائلہ، منیر کمال، سرمد بخاری اور ان کا پورا گینگ اب تک نہ جانے کتنے گھر اجاڑ چکا ہے اور نہ جانے کتنے معصوم خواب خواہش کی دلدل میں الجھ کر زندگی کے مقصد اور محور کو فراموش کر چکے ہیں ہیں۔

عاشر! تمہارا بھی استحصال ہوا کمال کا ہدف شمائلہ تھی لیکن شمائلہ کمال کو اپنے اردگرد بکھری محبتیں اور زندگی کی سچائی نظر نہ آئیں۔ شاید اس لیے وہ ان لوگوں میں سے ہے، جن کی خواہشوں کا کوئی انت نہیں ہوتا، جن کے کردار کی معمولی سی کجی انہیں محض اس لیے اندھیروں کے سپرد کر دیتی ہے کہ وہ اپنی ضد، تکبر

کے باعث کسی کی نصیحت یاد رکھتے ہیں اور نہ رشتوں کا تقدس ان کے پاؤں کی بیڑی بنتا ہے۔"

وہ عجیب سے انداز میں بول رہا تھا، اس کا ہر لفظ اور اس کا لہجہ دل میں اترنے والا تھا وہ ان سب کے درمیان ایک حیران کن شخص تھا۔

ہر بار نیا انداز، نئی پہچان اور نئی تلاش اس کے چہرے اور آنکھوں میں مچل رہی ہوتی۔ پتا نہیں اس کے کتنے روپ تھے۔

خولا اور اور خزیمہ نے بیک وقت، اسے گہری مگر بے حد ستائشی نظروں سے دیکھا۔

اور وہ بول رہا تھا، شاید تمام عرصے سے جو لاوا اس کے اندر پک رہا تھا آج اس کے آتش فشاں بن کر پھٹ نے کا وقت آ گیا تھا، اور کسی کو اس سے تکرار کی ہمت نہیں تھی۔

"قدرت ہمیں ہر بار زندگی میں سنبھلنے کا موقع دیتی ہے، شمائلہ کمال کو بھی موقع ملا ہوگا مگر، تکبر نے سیدھی راہ نہ دکھائی اور اس کا سب سے بڑا سبب وہ شخص تھا، جو پیدا ہی قدرت کی آزمائش کے طور پر ہوا تھا۔

پتا ہے منیر کمال کا نمبر اپنے دس بہن بھائیوں میں آٹھواں تھا، اور شاید تم سب لوگ حیران ہو گے لیکن میری ٹیم نے دو سال کی تفتیش کے بعد مجھے جو پہلی خبر دی تھی وہ یہ تھی کہ منیر کمال جس گھر میں پلا بڑا، اس کے باپ کا نہیں صرف ماں کا گھر تھا۔ غربت اور حالات کی ستائی ماں کو جانے کتنی بار اپنا آپ گروی رکھنا پڑا اور جس کا انجام منیر کمال جیسے ان چاہے بچے ہوتے ہیں، جن کی جذباتی اور نفسیاتی پرورش ہی ناپسندیدہ اور قابل قبول حالات میں ہوتی ہے۔

جن کے لیے ماں کے دل میں بھی کبھی کوئی نرم گوشہ نہیں جاگتا بلکہ وہ ساری زندگی اپنے گناہوں پر شرمسار ہی رہتی ہے۔

شاید میں زیادہ ہی بکواس کر رہا ہوں، لیکن کیا کروں میں بھی تو اس دنیا کی انوکھی کہانیاں تم سب سے شیئر کرنا چاہتا ہوں، اس نے ایک گہری سانس لی۔

اور پتہ ہے، منیر کمال کی بدفطرت کا نشانہ سب سے پہلے جو عورت بنی وہ مریم تھی اپنے نام کی طرح معتبر اور پاکیزہ، اسی لیے وہ بھاگ نکلی اس کے چنگل سے۔"

خولہ اور کشمالہ دونوں ہی اپنی ماں کے ذکر پر آبدیدہ ہوگئی تھیں۔ عاشر عباس کو بھی اس عورت کے بارے میں سوچنا پڑا، جس سے اس کے باپ کا روحانی رابطہ تھا۔ وہ اپنے ذہن میں کشمالہ اور خولہ کو دیکھتے ہوئے، اس معتبر عورت کے خدوخال ترتیب دینے لگا۔

اس کے ذہن میں یہ سوال بھی فوراً آیا تھا، میرے باپ نے اس حسینہ خاتون سے شادی کیوں نہ کی۔

اور نہ جانے کاشف کیانی نے کیسے اس کے ذہن کو پڑھ لیا تھا اور وہ انھیں بتانے لگا تھا۔ پتا ہے مریم واپس بھی جاسکتے تھے اپنے گھر والوں کے پاس، لیکن منیر کمال کے خوف اور زمانے کی اندھی رسموں نے اسے روپوش ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

اسے یقین تھا کہ اس کی سچائی اور پاکیزگی کا گواہ کوئی نہیں، سوائے اللہ کے اور اگر اللہ نے اس کے مقدر میں آزمائش ٹھیک ہے تو اس پر پورا اترنے کی کوشش کرے گی۔

"خزیمہ! تم اپنے والد صاحب سے ضرور پوچھنا کہ انہوں نے اپنی بہن کی منیر کمال کے ساتھ شادی کرنے کے بعد پلٹ کر خبر تک کیوں نہ لی۔

دنیا اتنی بڑی تو نہیں کہ بچھڑے ہوئے یا کھوئے ہوئے لوگ مل نہ سکیں۔ کبھی کسی کو خیال ہی نہیں آیا کہ مریم کس دنیا میں ہے، کس حال میں ہے۔؟"

وہ تھوڑا سا تلخ ہوگیا تھا، شاید انکشاف ہی ایسا تھا کہ خزیمہ کا چہرہ بھی جھکتا چلا گیا۔

اس نے تو ابھی تک اپنے گھر میں کسی کو کچھ نہیں بتایا، بس کاشف کے کچھ سوالوں کی تصدیق کے لئے جب انڈیا میں اپنی بڑی پھوپھی کو فون کیا تو مریم کے ذکر پر سسک اٹھیں۔

ان کا ایک ہی جملہ بار بار اس کی سماعتوں سے ٹکرایا کہ جتنی پیاری اس کی صورت تھی، اتنی بھیانک اس کی قسمت تھی، آخری خبر کے بارے میں جو ان کو ملی تھی، وہ یہی تھی کہ مریم، منیر کمال کو چھوڑ کر

اپنی دو بیٹیوں کے ساتھ کہیں چلی گئی ہے، منیر کمال نے تو خیر بھاگ جانے کی اطلاع دی تھی لیکن وہ مریم کے لیے اس طرح کے لفظ کبھی استعمال نہیں کر سکتی تھی اسی لئے خزیمہ سے بات کرتے ہوئے بھی روتی ہی رہیں۔

اور خزیمہ نہ حیران پریشان اپنے خاندان کی فراموش کہانی پڑھنا تو کوئی تبصرہ کر سکا اور نہ سوال اب بھی اگر کاشف کیانے اس راز سے پردہ نہ اٹھاتا تو کیا وہ لوگ جان پاتے وہ تو اپنی یاداشت میں اپنی بڑی پھوپھی سے نہ مل پائے جو شادی کے بعد وہیں رہنے پر مجبور تھیں تو مریم پھوپھی سے کیا ملاقات ہو پاتی جن کا معاملہ ہے سات سمندر پار والا تھا۔

سمندروں کی دوریاں اگر دلوں میں حائل ہو جائیں، حالات ان فاصلوں کو کم کرنے کے لیے کبھی موافق نہ ہوں تو انجام شناخت کا وہ ادھورا سفر ہوتا ہے جس کے قرب سے خولہ اور کشمالہ بخوبی آگاہ تھیں، جن کے ذہن میں پاکستان آتے ہوئے بار بار یہ سوال آیا تھا کہ وہ لوگ اجنبی دیس جا کر کیا کریں گے، ان کا تو وہاں کوئی نہیں نہ خون کا رشتہ، نہ دل کا رشتہ، سوائے طارق محمود کے کون ہے جو ان کی پہچان کا دعویدار ہو گا مگر دونوں یہ نہیں جانتی تھی کہ قدرت نے جو سفر مقدر کیا تھا اس کے ہر موڑ پر ان کے سوالوں کا جواب منتظر تھا۔

منیر کمال ان کا حقیقی باپ ہے.....

خزیمہ ان کے لئے بالکل اجنبی مگر درمیان میں خون کے رشتے کی ڈور.....

عاشر عباس.....بس دل نے کہا یہی منزل ہے۔

پتا نہیں کتنے اسرار پوشیدہ تھے اس سفر میں، جب ہی تو وہ دونوں چاہتے ہوئے بھی واپس نہیں جا سکیں۔ دونوں کی آنکھوں میں ایک ہی سوال میں چل رہا تھا، اور خزیمہ جو 48 گھنٹے پہلے تک جتنا مضطرب تھا، اس وقت اتنا ہی پرسکون تھا اس کے لیے کاشف کیانی رحمت کا فرشتہ ثابت ہوا، خولہ کے لیے دل بے قرار ہوا تھا اور اس کی تمنا میں پاگل بھی مگر یہ کیا پتا تھا کہ اس سے اتنی قریبی رشتہ داری نکل آئے گی۔

اس کے اندر کی طمانیت اور سرشاری کے سنہرے رنگ اس کے چہرے سے بھی عیاں تھے۔ اس نے جب بھی اس ساری گفتگو کے دوران خولہ پر نظر ڈالے تو وہ اسے اپنے برعکس گہری سوچ میں ڈوبی

ہوئی نظر آئی۔

شاید اس کے اور کشمالہ کے درمیان پہلی بار اختلاف ہی اس بات پر ہوا تھا کہ وہ پاکسان میں کسی رشتے کی ڈور میں نہیں بندھنا چاہتی تھی اور اس کے لیے وہ کشمالہ کو بھی سمجھاتی تھی' اس کے لیے بھی فکر مند رہتی تھی۔

"اب کرنا کیا ہے"۔ بالاخر کاشف کی پرسوچ نگاہوں نے سب کا تعاقب کیا' اس ساری گفتگو میں جب بھی خاموشی کا وقفہ آیا وہ کاشف نے ہی توڑا۔

"سرکار جو کچھ آپ نے کیا' اس کے بعد تو ہمارے کچھ کہنے سننے اور کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ مجھے پتا ہوتا کہ میں میر پور میں جس سے دوستی کا رشتہ باندھ رہا ہوں' وہ جیمز بانڈ کا بھی نانا ہے تو تگوڑی دیر کے لیے ضرور اپنی مایوسی والی رگ کو ایکٹیویٹ کرنے کی کوشش کرتا مگر تو عظیم ہے میرے دوست' میں تجھے سلام کرتا ہوں"۔

عاشر نے باقاعدہ کھڑے ہو کر اسے سلام پیش کیا۔

سب ہی اس کے بھرے انداز میں ہنس پڑے۔

ایک طویل وقت کے بعد نانو کے گھر کے اس بڑے سے بال کمرے کے در و دیوار زندگی کی مسرتوں سے ہم آہنگ ہو رہے تھے۔ کشمالہ کو محسوس ہوا تگا جیسے آج ہر شے مسکا رہی ہو' عاشر کے چہرے کی بشاشت کا عکس اپنے اندر جذب کر رہی ہو۔

"اف کیا ہے یہ شخص_ اور میں کیا سے کیا ہو گئی اس کی چاہ میں"۔

کاشف نے عاشر کو گلے لگایا ہوا تھا اور وہ اسے دیکھ کر سوچے جا رہی تھی۔

"سب تیرے پیار میں کیا ہے اب تو نے اگر زندگی کے اسی موڑ پر بے وفائی کرنے کی کوشش کی تو سوچ لے اور سمجھ لے میں تجھے پاتال کی گہرائیوں سے نکال کر لے آؤں گا۔ کاشف کیانی نام ہے میرا

یاد رکھنا بند قائل میں دبے راز سے پردہ اٹھانا میرا شوق ہی نہیں' پیشہ بھی ہے۔"

وہ است خود سے قریب کر کے کہہ رہا تھا اور عاشر اس کی مضبوط بانہوں کے حصار میں بہت مسرور بھی تھا اور خود پر فخر محسوس کر رہا تھا۔ زندگی میں تمام عمر محبتوں اور چاہتوں کی تلاش میں جنگلوں کے سفر نکلنے والا عاشر آج رشتوں کی دولت سے مالا مال ہو گیا تھا۔

بابا گھر آ گئے تھے' کاشف کے روپ میں اسے جگری دوست' یار اور ایک بھائی جیسا مضبوط سہارا مل گیا تھا۔

اور سب سے بڑھ کر ان سب کے درمیان بیٹھی ایک وہ ہستی جو خود تو خالص الخاص تھی ہی مگر اس کی ایک نگاہِ التفات کی منتظر رہتی تھی۔

یہ احساس کتنا طاقتور ہوتا ہے' آپ کسی کے لیے اتنے اہم ہیں کہ وہ آپ کو ہر رنگ اور ہر آہنگ سے سوچتا ہے۔ آپ کی فکر کرتا ہے اور آپ کے لیے اپنی زندگی کے بہت سارے خواب ترک کر دیتا ہے۔

بس اس راہ شوق پر چل پڑتا ہے جس میں اسے صرف آپ کا قرب اور آپ کا مضبوط صائبان درکار ہوتا ہے۔

اور دیکھ..... اگر تو نے کشمالا کی حق تلفی کی' اس کے ساتھ کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو دیکھ لینا اپنا حشر۔ یہ کان میں گھس کر سرگوشی کی گئی تھی جو عاشر کے علاوہ کوئی نہیں سن سکا تھا۔

"اگر آپ لوگ سر محفل اس طرح غیر مہذبانہ حرکتوں سے اجتناب برتیں تو اچھا ہوگا۔"

یہ الفاظ خولہ کے تھے جس پر خزیمہ نے پہلی بار اسے اپنی نظروں کے حصار میں لیتے ہ براہ راست مخاطب کیا۔

یہ لوگ تو آج اگلے پچھلے حساب بے باق کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ کیا ہم لوگ انھی ہی جائے نہیں پی سکتے۔

میں دو دن سے سویا نہیں ہوں اور صبح سے کچھ کھایا نہیں ہے۔"

اس کے انداز میں اتنی معصومیت اور اپنائیت تھی کہ کشمالہ اور خولہ دونوں ہی ہنس پڑیں۔

اس کا مخاطب تو خولہ تھی مگر جواب کشمالہ کی طرف سے آیا۔

اصل میں چائے کا نہیں' کھانے کا وقت ہے اور جب خدیجہ بہت خوش ہوتی ہے تو وہ میں کچن میں جھانکنے کی اجازت بھی نہیں دیتی۔ آپ کو تھوڑا انتظار اور کرنا پڑے گا"۔

"انتظار___ چلیں ایک اور انتظار....." وہ پرسوچ نگاہوں کے ساتھ مسکرا دیا۔

مسکراہٹ بھی ایسی کہ خولہ کو صاف محسوس ہوا وہ کیا سوچ رہا ہے۔

"مالا میں کھانا لگواتی ہوں' تم ذرا نانو کو دیکھ لو' جاگی یا نہیں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ خزیمہ نے اس کا گریز صاف محسوس کیا تھا مگر وہ اس کی ذہنی کیفیت سمجھ سکتا تھا' اسے خولہ کی بے اعتنائی یا سرد مہری محسوس تو ہو رہی تھی مگر وہ بے بس تھا۔ تسلی بھی نہیں دے سکتا تھا کہ یہ انکشافات میری کوششوں سے نہیں ہوئے' یہ تو قدرت کا فیصلہ تھا کہ انہیں زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر ایک دوسرے کے مقابل تو آنا تھا۔

اس میں بھلا خزیمہ کا کیا قصور تھا۔

عاشر اور کاشف کے راز و نیاز ختم ہوئے تھے' دونوں نے پلٹ کر خزیمہ کو دیکھا۔

"میں بھی منتظر ہوں سایہ شفقت میں آنے کے لئے"۔

کاشف بیساختہ آگے بڑھا۔

"یار! اب تو رشتے دار ہو گیا ہے' کیوں عاشر"___

مخاطب عاشر تھا اور لڑکوں کی خالص قسم کی تڑاخ شروع ہو گئی۔ کشمالہ نے چپکے سے غائب ہونے میں ہی عافیت جانی۔

کاشف نے اسے دروازے سے اوجھل ہوتے دیکھا تو دل میں مچلنے والی شرارت زبان سے پھسلنے لگی۔

"پتا ہے عاشر! تجھے بارات لے کر کراچی جانا ہوگا۔ کشمالہ اپنے ماموں کے گھر سے رخصت ہو گی۔ کیا خیال ہے خزیمہ....."

کاشف کے جملے نے خزیمہ کے خیال کو تقویت بخشی تھی' اس نے بھرپور محبت سے عاشر کو لپٹا لیا۔

"راجہ صاحب کے اکلوتے بیٹے کی بارات ہمارے غریب خانے پر آئے' یہ تو ہمارے لیے اعزاز کی بات ہوگی"۔

وہ انکساری سے بولا۔

"لیکن راجہ صاحب کے اکلوتے بیٹے کو ایک ظالم قسم کے سالے کی اشد ضرورت ہے۔ بہت اکڑو منڈا ہے یہ"۔

کاشف بہت محظوظ ہو رہا تھا' اپنی زندگی کے اس انوکھے پروجیکٹ کے نتائج سے۔ خزیمہ کو بہت اچھا لگ رہا تھا' اس لمحے وہ خود کو بڑا معتبر محسوس کر رہا تھا۔

"جو لوگ محبت سے سرنگوں ہو جائیں' ان کے ساتھ جنگ وجدل بے کار ہے۔" خزیمہ نے پورے یقین سے کہا اور عاشر کو اس بات پر سو فیصد یقین آ گیا تھا۔

اس نے نعمان کو آواز دی تھی بہت زور سے مگر اس کی آواز بند گاڑی کے دروازوں اور کھڑکیوں سے ٹکرا کر واپس ہو گئی تھی۔

نعمان اس سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا' وہ چاہتا تو مڑ کر دیکھ سکتا تھا۔

وہ چاہتا تو اس کی آواز سن سکتا تھا' وہ ذرا سی کوشش کرتا تو سعدیہ کو دیکھ سکتا تھا مگر وہ کیوں نہیں دیکھ رہا تھا۔

وہ ایک بار پھر چیخی۔

"نعمان"۔ تب اسے محسوس ہوا جیسے نعمان کے چہرے پر آواز سے ارتعاش ابھرا ہو' اس نے شیشے پر ہاتھ مارا۔

آج اس لمحے اگر وہ اظہر کے چنگل سے نہیں نکل پائی تو پھر شاید کبھی وہ اس دلدل سے باہر نہیں آ سکتی تھی۔ اس نے ایک اور کوشش کی۔ قریب سے گزرتی ایک دو گاڑیاں متوجہ ہوئیں لیکن ان کی رفتار تیز تھی۔

سعدیہ نے اپنے چہرے سے پوری طرح چادر ہٹا کر ایک بار پھر آواز دی اس بار فٹ پاتھ پر کھڑے نعمان کو شاید احساس ہو گیا تھا کہ کوئی اسے بلا رہا ہے۔ اس نے نگاہیں ادھر ادھر دوڑائیں' تب ہی برابر والا دروازہ کھول کر اظہر اندر آ بیٹھا۔ وہ بھی خاصی عجلت میں تھا۔

نعمان گاڑی اور گاڑی میں بیٹھی لڑکی کو دیکھ چکا تھا۔ اس کے چہرے پر زلزلے کے آثار تھے اور گاڑی اسٹارٹ ہو چکی تھی۔

اس نے ایک جست لگائی لیکن اظہر گاڑی کی رفتار تیز کر کے ہجوم میں شامل ہو چکا تھا۔

"اگر تم نے ایک بھی آواز نکالی تو میں تمہیں اور نعمان کو قتل کر دوں گا' یہ دیکھو" ___ اس نے اپنی پینٹ کی بیلٹ میں اڑسا ہوا پسٹل دکھایا لیکن اس وقت مرنے یا جینے کی پروا کس کو تھی۔

جو زندگی اظہر دینے جا رہا تھا اس سے تو مرنا ہی بہتر تھا' وہ ایک بار پھر چیخنا شروع ہو گئی تھی۔ اس پر ہجوم سڑک پر اس کا چیخنا رائیگاں نہیں جا سکتا تھا۔

اظہر نے پوری طاقت سے اس کے پیٹ میں گھونسا مارا کہ وہ تکلیف کا احساس کر کے خاموش ہو جائے اور ہوا بھی یہی۔ پیٹ میں درد کی شدید لہر نے سعدیہ کی آواز تک سلب کر لی تھی۔ وہ اپنا پیٹ پکڑ کر دہری ہو گئی۔

اظہر نے گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی تھی کیونکہ وہ دیکھ چکا تھا کہ نعمان نے کسی ٹیکسی کو اشارہ دیا تھا۔ چوہے بلی کا کھیل شروع ہو چکا تھا۔

ناول خواب خواہش اور زندگی ابھی جاری ہے۔ مزید واقعات اگلے صفحات میں پڑھیں۔

قسط نمبر 11

مسکن میں صوفیہ اور شجاع کی شادی کی رونقوں نے ڈیرے ڈال لیے تھے۔

گھر کے بزرگ شادی کی تقریب میں کوئی کسر نہ چھوڑنے کے انتظامات کر رہے تھے اور نوجوان پارٹی صرف اس کوشش میں تھی کہ یہ شادی گزشتہ تمام شادیوں سے زیادہ یادگار ہو۔

کیونکہ یہ صوفیہ اور شجاع کی شادی تھی جو اسی گھر کے باسی تھے' انہیں بہت ساری تقریبات کے لیے نت نئے آئیڈیاز سوجھ رہے تھے کیونکہ صوفیہ اور شجاع کی طرف سے کوئی روایتی قسم کی رکاوٹ درپیش نہ تھی۔

علی اور انعم اس قسم کی کارستانیوں میں پیش پیش تھے اور ان کا ہیڈی کیم (چھوٹا کیمرا) ہر وقت انوکھے مناظر کی تلاش میں رہتا۔

صوفیہ کے جوڑے پیک ہو رہے تھے' ساری کزنز جمع ہو چکی تھیں جس پر بار بار شجاع دہائی دے چکا تھا کہ ''تم لوگ کیوں اتنی محنت کر رہی ہو' کس کو دکھانا ہے یہ سب کچھ جو اتنا تام جھام''۔

''ہمیں ہمارا کام کرنے دو' تم اپنی فکر کرو' کل تمہاری باری ہے۔'' ثمرہ باجی نے اس کو کمرے سے باہر دھکیل دیا تھا اور انعم کو اشارہ کیا تھا کہ وہ جوڑوں کی پیکنگ کے شاٹس بنائے اور اس دوران جو ہنسی مذاق ہو رہا تھا' اس کی بھی ریکارڈنگ کی جاری تھی۔

صوفیہ کی ساری شاپنگ شجاع نے انعم اور عائزہ کے ساتھ مل کر صرف دو دن میں کی تھی۔ شہر کے بہترین ڈیزائنر کا انتخاب کیا تھا اس نے اور تمام پسندیدہ ڈریس ایک دن میں صوفیہ کے ناپ کے مطابق

ڈھل کر آ گئے تھے۔

اس کے جوڑے جو بھی دیکھ رہا تھا' بس داد و تحسین ہی مل رہی تھی اس کے انتخاب کو اور صوفیہ کی قسمت پر رشک کیا جا رہا تھا۔

''یار! یہ جس کے لیے ہم نے اتنی مشقت اٹھا رہے ہیں' وہ خود کہاں ہے' ابھی سے مایوں بیٹھ گئی ہے کیا۔''

عفت آپی سخت گرمی میں جھنجھلائی ہوئی پہنچی تھیں۔

اچانک ہی انہیں خیال آیا تھا کہ صوفیہ کی مہندی کے جوڑے پر سنہرے نگ لگانے ہیں جو کیمرے اور موی لائٹس میں شائن کریں تو وہ اس کا غرارہ لے کر بازار بھاگی تھیں۔

اب جبکہ وہ اپنے مشن میں کامیاب لوٹی تھیں تو انھیں صرف صوفیہ کی تلاش تھی جو صبح سے ان کی آنکھوں سے اوجھل تھی۔

''اے سی تو فل کرو' کیا پنکھا چلایا ہوا ہے''۔

''یہ اے سی اس وقت فل ہے' آپ پانی وانی پئیں' ذرا شانت ہو جائیں۔ کس نے کہا تھا اتنی گرمی میں جائیں اور___''

عائزہ نے چیزیں سمیٹتے ہوئے کہا' اتنی دیر میں انعم ان کے لیے ٹھنڈا انرجائل لے کر آ گئی تھی۔

غرارے اور کرتی پر نگ اتنی خوبصورتی سے لگائے گئے تھے کہ سب نے ان کو استاد مان لیا تھا۔

''ٹیلر کے سر پر کھڑے ہو کر لگوائے ہیں۔'' انہوں نے فخریہ کہا۔

''بیٹھ کر لگوا لیتیں آپی!'' انعم نے معصومیت سے کہا۔ انہوں نے غضب ناک انداز میں گھورا۔

اچھا نا غصہ کیوں کر رہی ہیں' مجھے بھی ایسا ہی بنانا ہے۔ پلیز پیلپ می''۔

وہ اپنے ہینڈی کیم میں غرارے کے شاٹس محفوظ کرنے لگی۔

کل چلنا میرے ساتھ' اچھا ابھی صوفیہ کو بلاؤ۔ ذرا یہ کرتی پہن کر دیکھ لے' مجھے کچھ ڈھیلی لگ رہی ہے اور اس کی رسم کب کرنی ہے کچھ پتا ہے کسی کو''۔

انہیں کوئی ایک فکر تھی لیکن ان کے دم سے ساری لڑکیوں کو یہ اطمینان تھا کہ سارے کام وقت پر اور طریقے سلیقے سے ہو جائیں گے۔

''اچھا یہ بتاؤ تم لوگ شجاع کی شاپنگ کمپلیٹ ہو گئی یا ابھی کچھ باقی ہے''۔

اب انہیں ایک نئی فکر لاحق تھی۔

آپ کو پتا ہے آپی! ابھی دونوں کا بارات ولیمہ کا سوٹ باقی ہے اور اس کے لیے محترم کی فرمائش یہ ہے کہ صرف وہ دونوں جائیں گے اور ایک دوسرے کی پسند سے خریدیں گے جس پر صوفیہ کی ضد شروع ہو چکی ہے کہ وہ نہیں جائے گی اور شجاع اعلان کر کے گیا ہے کہ وہ جائے گی تو تب ہی شادی کے جوڑے آئیں گے''۔

یہ ایک نئی کہانی تھی جس پر تینوں سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

''یہ کس طرح کی ضدیں ہیں' شادی میں چار دن رہ گئے اور جوڑے ابھی تک نہیں آئے''۔

شجاع بھی بچہ بنا ہوا ہے۔ بتاؤ ذرا بڑوں نے مرضی کرنے کا کہہ دیا محترم بالکل ہی پھیل گئے''۔

عفت آپی نے چیزیں ادھر سے ادھر کرنا شروع کر دی تھیں' باقاعدہ غصے کا اظہار کیا۔

''بلاؤ شجاع اور صوفیہ دونوں کو' کہاں ہیں یہ؟''۔

اان کا انداز بالکل جیلر والا تھا۔ عائزہ اور انعم نے بمشکل ہنسی ضبط کی۔

صوفیہ تو خیر اوپر والے پورشن میں محدود ہو گئی تھی' البتہ فوری طور پہ شجاع کو تلاش کرنا ذرا مشکل کام تھا۔ انعم نے اس کی کال ملائی اور سیل فون عفت آپی کو تھما دیا۔

''واقعی ان دونوں کی ضدوں سے آپیاں ہی نبٹ سکتی ہیں''۔

عائزہ چپس کا پیکٹ لے کر صوفے پر سمٹ گئی۔ ایک نیا معرکہ شروع ہونے والا تھا مزے دار سا۔ وہ چپس کھاتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد واقعی میں صوفیہ اور شجاع دونوں ہی لائن حاضر تھے۔ عفت آپی اور ثمرہ آپی بلا رعایت شروع تھیں۔

''شجاع! یہ کیا فضول فرمائش لے کر بیٹھے ہو تم۔''

ان کا فضول کہنا تو غضب ہو گیا تھا۔

''آپی! مجھے یہ بتائیں اس میں غلط کیا ہے' فضول کیا ہے۔''

''لیکن اگر صوفیہ کمفرٹیبل نہیں پھر کیوں؟'' یہ انعم نے لقمہ دیا تھا جس پر وہ بس اسے گھور کر رہ گیا تھا۔ آج کل سب نے ہی پارٹی بدلی ہوئی تھی.

''لیکن صوفیہ کمفرٹیبل کیوں نہیں ہے' کیا میں اسے بھگا کر لے جا رہا ہوں''۔ اس کی دبی دبی جھنجلاہٹ کے ساتھ سرگوشی سب کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر گئی تھی۔

''اب ہمیں کیا پتا' تمہارے کیا ارادے ہیں۔ شادی سے پہلے تم نے اکیلے جانے کی خواہش کیوں رکھی ہے۔ بس مجھے یہ بتاؤ''۔ ثمرہ آپی نے بھرپور جرح کا ارادہ کیا۔

''آپ خواتین کی کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے' پتا نہیں ایسا کیا گناہ کر دیا میں نے''۔ وہ احتجاجاً جھنجلایا تھا۔

''کیوں صوفیہ! تم کیوں اس کی بات نہیں مان رہیں' کل بھی تم نے اس کے ساتھ شاپنگ کرنی ہے تو پھر آج سے کیوں نہیں''۔

عفت آپی کا انداز ججوں والا تھا۔ صوفیہ کو پورا یقین تھا سب نے مل کر اس کے ساتھ یہ ڈرامہ کیا ہے اور یہ پوری پارٹی شجاع کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔

''آئی ایم سوری' میں ابھی سے اتنی بے تکی باتیں ماننے کی پابند نہیں۔''

عفت آپی پر تو ویسے ہی غصہ تھا' رات کو انہوں نے خوب پیلا پیلا ابٹن مل کر اس کی رنگت ہی بدل ڈالی تھی۔ اس وقت بھی اس کے سنہرے چمکتے چہرے سے روشنی سی پھوٹ رہی تھی جو کوئی اور محسوس کرے نہ کرے' شجاع کا بس نہیں چل رہا تھا' اس دھلے دھلائے چہرے کو دل میں چھپا لیا اور اپنی نظروں کے سامنے سے ایک پل کو اوجھل نہ ہونے دے مگر اس کے ساتھ بھی ظالم سماج والا کردار یہ ساری کزنز ادا کر رہی تھیں۔

لیکن اس وقت وہ اپنی طرف داری پر نہال ہو گیا تھا۔

''یہ کوئی بے تکی بات نہیں' ہر بات میں ضد اچھی نہیں ہوتی۔ آج شام کو دونوں چلے جاؤ اور باہر کے سارے کام جتنی جلدی ہو سکے' ختم ہو جائیں تو اچھا ہے۔

یہ شادی ہے' کوئی گڑیا گڈے کا بیاہ نہیں کہ کوئی ایک دو گھنٹے میں نبٹ جائے گا' ہر چیز طریقے سلیقے سے وقت پر ہو جاؤ تو اچھا ہے''۔

اس بار ان کا انداز جیلر والا نہیں تھا۔ شجاع کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی اور صوفیہ کو پورا یقین ہو گیا یہ سب شجاع سے ملے ہوئے ہیں۔

''تو ٹھیک ہے' میں جانے کو تیار ہوں لیکن میرے ساتھ آپ دونوں بھی چلیں گی۔''

اس نے اتنی آسانی سے ہار تو ماننی نہیں تھی' ویسے بھی وہ اول دن سے اس فرمائش سے خائف تھی' سب کیا سوچیں گے' کیا کہیں گے اسے ایک ہی فکر تھی اور شجاع ایسی ہی فکر سے ہمیشہ کی طرح بے نیاز.....

''لیکن صوفی میری جان! اگر شجاع کا تمہارے ساتھ شاپنگ کا دل ہے تو اس میں کیا حرج ہے۔'' اب منت سماجت کا مرحلہ آ گیا تھا اور اسے پتا تھا' بعد میں اس بات پر اس کا ریکارڈ ہی لگنا تھا۔

''لیکن میرا آپ کے ساتھ دل ہے پھر___''اس کی بے ساختگی پر انعم نے عائزہ کو دیکھا اور دونوں کی بے ساختہ ہنسی پر کمرے کا ماحول زعفران زار ہو گیا۔

''شادی سے چند دن پہلے تمہارے دل کی ہیرا پھیری کچھ نہ سمجھ میں آنے والی بات ہے''۔انعم کے شرارتی چہرے پر بلا کی معنی خیزی تھی۔شجاع نے کشن اٹھا لیا تھا۔

''تم دونوں اپنا منہ بند کرو یا شکل گم کرو''۔دھمکی زوردار تھی۔

''یہ لونیکی کا زمانہ ہی نہیں' ایک تو ان کی لاڈلی محترمہ کو حجرے سے نکال کر لائے' ان کی منت سماجت کی' بیک ڈور ڈپلومیسی سے کام لیا کہ محترمہ جانے کو راضی ہو جائیں اور یہ ہمارا ہی پتا کاٹنے پر تلے ہوئے ہیں''۔عائزہ نے دُہائی دی۔

اس دوران صوفیہ کا سنہرا چہرا سرخ ہو چکا تھا' سب کو ڈر رہی تھا کہ پتا نہیں یہ لڑکی شادی والے دن بھی شرمائے گی یا نہیں لیکن اس بات پر سب حیران بھی ہوتے تھے کہ شجاع کے دیکھتے ہی وہ چھوئی موئی ہو جاتی تھی۔

اس لیے تو اس وقت یہ محفل سجائی گئی تھی' دونوں کو آمنے سامنے بٹھا کر جملے بازی کا مزا ہی کچھ اور تھا۔

''آپ سب لوگ یہ ڈرامہ بند کر دیں' مجھے کہیں نہیں جانا وانا' شادی ہی کرنی ہے نا' اتنے سارے کپڑے آ چکے ہیں' کوئی سے بھی پہن لوں گی۔''

اس کی بے نیازی قابل دید گی۔

شجاع نے کن اکھیوں سے دیکھا۔

سب نے خوب واہ واہ کی۔

''کیا بچت پالیسی ہے' ویری گڈ۔''

''آپی! ذرا مجھے جگہ دیں نا میں اپنی محترمہ کے برابر میں بیٹھنا چاہتا ہوں''۔شجاع نے ثمرہ کے

برابر میں جگہ نکالی اور اچک کر دونوں کے درمیان میں آ گیا۔

''ہاں تو آپ کیا کہہ رہی ہیں' براہ راست مجھ سے کہیں نا''۔ وہ اب اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ اپنے چہرے کا تو پتا تھا کہ وہاں ایک شوق کا جہاں آباد تھا' البتہ اس کے چہرے کے رنگ اتنے دلکش اور پاگل کر دینے والے تھے کہ دل کہہ رہا تھا چار دن بعد کے بجائے آج ہی رخصت کروا کر لے جائے۔

''مجھے آپ سے کوئی بات نہیں کرنی' آپ جائیں۔ آپی! یہ فاؤل ہے' میں اسی لیے نہیں آ رہی تھی' آپ ان کو نکالیں یہاں سے ورنہ میں چلی جاؤں گی۔''

اس نے بلا توقف ساری باتیں کہہ دی تھیں' سب کو دونوں کا دوبدو مقابلہ اتنا بھلا لگ رہا تھا کہ کوئی بھی اس ٹرانس سے باہر آنے کو تیار نہیں تھا۔ اس پر ستم یہ کہ انعم نے اپنا ہینڈی کیم آن کر لیا تھا۔

''اب تو جہاں بھی جائیں گے' ساتھ جائیں گے۔ جینے مرنے کا وعدہ بھی یاد ہے' لاسٹ سٹرڈے کو ہی ہم نے کیا تھا۔'' شجاع نے بمشکل ہنسی روکی۔

ثمرہ آپی اور عفت آپی کا بھی یہی حال تھا۔

صوفیہ کو اندازہ ہو چکا تھا' اب شجاع کی زبان کے آگے بند باندھنا مشکل ترین کام ہوگا۔

وہ یکدم روہانسی ہو گئی۔

''پلیز۔ آپ کیوں مجھے تنگ کر رہے ہیں۔''

میں تنگ تو نہیں کر رہا' میں تو صرف ریکویسٹ کر رہا ہوں۔ انداز میں بلا کی معصومیت تھی۔ صوفیہ کا بس میں چل رہا تھا' اس کی دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھ لے' کس قدر روشنی تھی اور اس روشنی میں وہ صرف خود کو دیکھ رہی تھی' ہر زاویے' ہر انداز سے' اسے خود سے شرم نہ آتی تو کیا کرتی۔

''نہیں مجھے نہیں جانا' کہہ دیا نا ایک بار''۔

اب وہ بھاگنے کو پر تول رہی تھی۔ شجاع کے سینے سے بے ساختہ گہری سانس خارج ہوگئی۔

اس نے کوشش کی تھی وہ اس ضدی لڑکی کی ضد توڑ کر اسے جھکنے میں عظمت کے احساس سے آشکار کرے مگر وہی خود ہار گیا تھا لیکن صوفیہ اپنی ضد پر قائم تھی۔

اپنی تمام تر ضدوں کے باوجود وہ اس کے دل کی دھڑکن تھی جس کو زندگی بھر سینے میں چھپا کر رکھنا اس کی مجبوری بن چکا تھا۔

''کیا ہو جائے گا اگر تم شجاع کی بات رکھ لوگی''۔ بالآخر پھر ثمرہ آپی نے مداخلت کی' معاملہ گمبھیر ہو چکا تھا۔

''مجھے آنے والی زندگی میں ان کی ہر بات ماننی ہے اور میں اس عہد پر ہمیشہ قائم رہوں گی لیکن ابھی تو مجھے حق ہے نا کہ میں انکار یا اقرار کر سکوں''۔

وہ خاصی سنجیدہ تھی' ایک دم ماحول کی گھمبیرتا میں اضافہ ہو گیا۔

اس کی بات سے کسی کو انکار بھی نہیں تھا حتیٰ کہ شجاع کو بھی۔

''اوکے۔ لیٹس فنش اٹ۔ آپی جو آپ لوگوں کا دل کرے لے آئیں اور علی کو ساتھ لے جائیں۔ اس کو میری چوائس کا پتا ہے۔ دیکھیں جو اچھا لگا خرید لیں۔''

وہ بے حد سنجیدہ تھا' کمرے میں جو تھوڑی دیر پہلے ہنسی مذاق کا ماحول بنا ہوا تھا' وہ خواہ مخواہ سنجیدگی میں ڈھل گیا تھا۔ خود شجاع کے چہرے کے سارے رنگ بھی غائب ہو گئے تھے۔

صوفیہ نے ایک نظر سب پر ڈالی' یہ سب لوگ اسکی خوشی کے لیے پاگل ہیں اور کتنے دن ہو گئے ہیں بغیر تھکن' وقت کی کمی کا احساس کیے بغیر صرف اس کی خوشیوں کو بھرپور منانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

بس ایک لمحے کی بات تھی' اس کے دل نے کہا۔

''مجھے ان سب کی بات مان لینی چاہیے اور پھر یہ تو طے ہے نا کہ مجھے زندگی بھر اس شخص کی پسند ناپسند کا خیال رکھنا ہے تو آج سے کیوں نہیں''۔

''کیا مطلب جو اچھا لگے خرید لیں۔ چلیں ابھی چلنا ہے یا شام کو بلکہ شام تو ہو گئی ہے۔ چلیں۔'' وہ یکدم کھڑی ہو گئی۔

اپنی خفت چھپانے کے لیے بلا کی عجلت تھی اس کے انداز میں۔ ایک لمحے کو سب کے چہرے پر حیرت کا رنگ ابھرا' اور پھر وہی چھت پھاڑ قہقہہ۔

بے نیازی دکھانے کی باری اب شجاع کی تھی۔

''سوچ لیں پھر آپ کہیں گی' میری بات نہیں رکھی''۔

''بس کرو تم دونوں ہی ڈرامے باز ہو۔ چلو صوفی تم تیار ہو کر آؤ اور اب دیر مت کرو۔ شادی کے جوڑے لینے ہیں' کوئی آلو مٹر نہیں خریدنے جا رہے ہو''۔

عفت آپی نے فیصلہ سنا دیا تھا۔

صوفیہ بھی خاموشی سے باہر کی طرف مڑ گئی۔

''آپ لوگ بھی تیار ہو جائیں' سب چلتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ان حالات میں ہم آلو مٹر ہی خرید کر لے آئیں۔''

اس نے صوفیہ کو سنانے کے لیے ذرا بلند آواز کہا۔

وہ بس ایک لمحے کو پلٹی' اس کے قدموں کو چند سیکنڈ کا بریک لگا۔

''ڈرامے باز کہیں کا''۔ اس کا جملہ عائزہ اور انجم کے ''ہرے'' میں دب چکا تھا لیکن شجاع کا تو رواں رواں سماعت بنا ہوا تھا' وہ بھلا کیسے نہ سن پاتا۔

''یاد رکھنا اس کا بدلہ تو چکانا پڑے گا تمہیں بلی!'' سب کی پرشور ہنسی اور شجاع کی دھمکی نے اس کا

تعاقب کیا تھا اور وہ ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی ہوئی لابی میں آ گئی تھی۔

صوفیہ نے کمرے میں جا کر اپنا سیل فون اٹھایا اور ٹیکسٹ میسج میں جا کر چند لفظ لکھے اور سینڈ کر دیے۔

شجاع کے موبائل کی رنگ اور ایس ایم ایس کی بپ ایک ساتھ ہی بجی تھیں' اس نے کال ہولڈ پر کر کے ایس ایم ایس کھولا۔

''آئی لو یو_''ایک مسکراتے آئی کون کے ساتھ لکھا تھا۔محبتوں کے سفر میں آج پہلی بار اتنا بے ساختہ بھرپور شدتوں کو عیاں کرتا جملہ صوفیہ کی طرف سے آیا تھا کہ وہ کال اٹینڈ کرنا ہی بھول گیا۔

وہ ہمیشہ اپنے صبح وشام کا آغاز اس ٹیکسٹ کے ساتھ کرتا تھا اور جواب کا منتظر بھی رہتا تھا مگر وہاں سے کبھی شرارت کا اظہار کرتے آئی کون کے علاوہ کچھ نہ آیا تھا۔

اور آج_اس نے جواباً'' لکھا پورے یقین اور شدتوں کے ساتھ۔

''زندگی' اور بھیج دیا اپنی سرشاری پر قابو پاتے ہوئے جب دھیان ڈی ایس پی طاہر کی کال کی طرف گیا وہ یکدم ہوش میں آ گیا۔

اس وقت ان کی کال بے مقصد نہیں تھی۔آج عظیم شاہ کی عدالت میں پیشی نہیں ہو سکی تھی' صبح اس کے وکیل نے انفارم کیا تھا۔

''یار! میں تمہیں کب سے کال کر رہا ہوں' ایٹ لسٹ میرا فون تو ریسیو کر لیا کرو۔''

دوسری طرف ان کی برہمی بجا تھی' شجاع نے فوراً''___معذرت کی_

''تمہیں پتا ہے عظیم شاہ نے خودکشی کر لی ہے''۔خبر تھی یا دھماکا۔

کمرے میں موجود سارے نفوس ساکت ہو گئے تھے اور وہ باہر لابی میں آ گیا تھا۔

ڈی ایس پی طاہر اسے بتا رہے تھے۔

آج صبح جب اسے لاک اپ سے واپس لایا جا رہا تھا تو اس نے ڈیوٹی اہلکار کی گن چھین کر خود کو گولی

مار لی۔ تمہیں پتا تو ہے وہ کتنا شاطر اور مضبوط آدمی ہے' کوئی بھی کچھ نہیں کر سکا اور وہ موقع پر ہلاک ہو گیا۔

تمام چینلز پہ خبر آ چکی ہے اور تم بے خبر بیٹھے ہو''۔

''یار! آپ کو تو پتا ہے گھر میں شادی کا ہنگامہ چل رہا ہے' صبح سے شاید کسی نے ٹی وی آن ہی نہیں کیا ہوگا اور میں خود بھی کافی مصروف تھا۔''

بہر حال اس کے ورثا آئے تھے ڈیڈ باڈی لینے۔ کچھ قانونی کاروائی کے بعد ہم لاش ان کے حوالے کر دیں گے' ابھی وہ لوگ یہیں موجود ہیں۔ کیا تم نے آنا ہے۔''

''ویٹ۔ میں ابھی پھوپھی جان سے بات کر کے آپ کو بتاتا ہوں۔ اس نے عجلت میں کہا اور سیڑھیوں کی طرف مڑ گیا۔

☆.....☆.....☆

نعمان اور اظہر کے درمیان چوہے بلی کا کھیل زیادہ دیر نہیں چل سکا تھا' پر ہجوم سڑک اور ٹریفک نے دونوں کو جلد ہی ایک دوسرے کے آمنے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔

یہ اظہر کی کم بختی ہی تھی کہ وہ نعمان کے سامنے آ گیا تھا اور نعمان اس میدان کا پرانا کھلاڑی تھا۔ اسے پتا تھا کہ کہاں کس وقت کیا داؤ کھیلنا ہے۔

ایک مقام پر آ کر وہ دونوں گتھم گتھا ہو گئے تھے' نعمان نے اس کی کار کے سامنے ٹیکسی روک کر اسے باہر آنے کا اشارہ کیا تھا۔ یہ بات اظہر بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ نعمان خالی ہاتھ تو ہونے سے رہا۔ اگر وہ پسٹل لیے گھومتا ہے تو نعمان پھر اس معاملے میں اس کا باپ تھا۔

سعدیہ نے اپنا چہرہ چادر میں چھپایا ہوا تھا' گاڑی کا دروازہ کھل چکا تھا۔

ایک طویل قید کے بعد رہائی اس کی منتظر تھی' اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور دروازہ کھول کر باہر کی طرف بھاگی۔ نعمان اور اظہر کی لڑائی کا انجام کیا ہونا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ کیا سلوک

کرنا تھا' وہ اس وقت کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے بس اتنا پتا تھا کہ قدرت نے اسے شر کی دنیا سے بھاگنے کا موقع فراہم کیا ہے اور اسے ہر حال میں اس موقع سے فائدہ اٹھانا ہے۔

وہ سرپٹ الٹی سمت کی طرف بھاگی' یہ قدرے سنسان سی گلی تھی۔

اسے کچھ نہیں پتا تھا' یہ کون سی جگہ ہے' کس سمت جانا ہے۔ وہ بس اظہر کی نظروں سے اوجھل ہونا چاہتی تھی۔ شاید فیصلے کی اس گھڑی میں نعمان کی آواز نے بھی اس کے حوصلے کو تقویت بخشی تھی۔

اس کے پاس پیسے تھے نہ زیور' نہ کوئی بیگ اور نہ ہی موبائل فون۔

اس نے تیز دموں کے ساتھ چلتے ہوئے سوچ لیا تھا' وہ سڑک پر پہنچ کر کسی بس میں بیٹھ جائے گی بھکارن کے روپ میں لیکن کسی انجان گاڑی یا ٹیکسی میں بیٹھنے کی غلطی نہیں کرے گی۔ وہ ایک خطا_ وہ ایک غفلت.....

اور گھر سے بدگمانی میں نکلا ہوا انجان قدم جب اپنی سمت بھول گیا تو پھر سنگریزے ہی سنگریزے تھے۔ ہر موڑ پر جنہوں نے پاؤں کے تلووں میں اتنے چرکے لگائے تھے کہ روح تک درد سے تڑپ اٹھتی تھی۔

''یا اللہ___ میں اس بار صرف تجھ سے اپنی اماں مانگتی ہوں میں تجھ سے مدد کی طلب گار ہوں' تو مجھے بچالے۔''

اس کا رواں رواں دوا بنا ہوا تھا اور آنکھیں جل تھل' پاؤں دکھنا شروع ہو گئے تھے اور روح جھلسنے لگی تھی مگر وہ ٹھہرنا نہیں چاہتی تھی اسے جلد از جلد اس علاقے سے نکلنا تھا اور کہاں جانا تھا'

اس سوچ کے دروازے پر جیسے کوئی قفل لگا ہوا تھا۔

''نعمان___ میں کیا کروں' کہاں جاؤں۔'' اس نے بے ساختہ دہائی دی۔

حالانکہ وہ ان سے بہت دور نکل آئی تھی اور جس اسٹاپ پر وہ کھڑی ہوئی تھی' وہاں سے دو تین بسیں اس کے اپنے گھر کے روٹ کی تھیں۔

سعدیہ رحمت اللہ نے اپنی یاداشت پر زور دیا' ایک بار پھر پوری شدت کے ساتھ اللہ کا نام لیا اور بس میں بیٹھ گئی۔

رات دھیرے دھیرے گہری ہو رہی تھی اور راجہ طارق محمود ایک مدت بعد اس کی تاریکی سے محو کلام تھے'

ستاروں بھرے نیلے آسمان کو تکتے ہوئے انہوں نے خود سے بار ہا یہ سوال کیا تھا۔

جب سب معاملے تقدیر کے آگے سرنگوں ہیں تو پھر ہم کیوں انسانوں پر اپنی خواہشوں کا بوجھ لاد کر ان کے پورا نہ ہونے کا گلہ کرتے ہیں۔

میرے خوابوں کا دریا اتنا طاقتور نہ تھا کہ شمائلہ کی خواہشوں کے تلاطم کو روک پاتا پھر میں کیوں زندگی بھر اپنی ناکام حسرتوں کا غم مناتا رہا۔

اور میں نے اپنی ادھوری زندگی کا انتقام شاید خود سے وابستہ ہر رشتے سے لیا۔

خالہ جان کو اکیلا کر دیا۔ عاشر سے دور ہو گیا۔ مریم سے ٹوٹ کر پیار کیا مگر اسے نام نہ دے سکا۔

کاش میں اتنا زود رنج اور حساس نہ ہوتا' کاش میرے اندر سچائی کو فیس کرنے کی صلاحیت ہوتی جس طرح شمائلہ میں تھی۔ اس نے برا یا بھلا ہو بھی اپنے حق میں کیا پوری ایمانداری سے کیا اور میں حقائق سے چھپتا رہا۔"

وہ اس کی پراسراری خاموشی سے اپنا آپ یوں شیئر کر رہے تھے جیسے کبھی مریم ان کی ذات کے پرت کھولا کرتی تھی۔

ایک دفعہ اس نے جھنجھلا کر کہا تھا۔

کیا ایسے کم سخن سے کوئی گفتگو کرے
جو مستقل سکوت سے دل کو لہو کرے

اور اس کی بات پر وہ بے ساختہ قہقہہ لگا بیٹھے تھے' وہ قہقہہ شاید ان کی زندگی کا پہلا اور آخری قہقہہ تھا جس کے بعد انہوں نے مریم کی آنکھوں میں اپنے لیے بے تحاشا خوبصورت رنگ دیکھے تھے۔

وہ کتنی دیر محویت سے تکتی رہی تھی اور پھر اپنے صوفے سے اٹھ کر ان کے سامنے زمین پر گھٹنے بچھا کر بیٹھ گئی تھی جبکہ سر ان کے گھٹنے پر ٹکا کر بڑے سکون سے آنکھیں موند لی تھیں۔

پتا ہے میں نے اپنے رب سے دوسری زندگی مانگی ہے اور اس زندگی میں آپ کا ساتھ ___ آپ انکار تو نہیں کریں گے نا۔"

اس نے پہلی بار اپنی شدتوں کو عیاں کیا تھا۔

راجہ طارق محمود کا بھاری ہاتھ بے اختیار اس کے سنہرے بالوں میں الجھ کر رہ گیا۔

اور آنکھوں کی سرخی نیم گرم پانی میں گلابی مائل ہو گئی تھی۔

چلو ایسا کریں مل کر ستارے بانٹ لیتے ہیں

ضرورت کے مطابق سب سہارے بانٹ لیتے ہیں

محبت کرنے والوں کی تجارت بھی انوکھی ہے

منافع چھوڑ دیتے ہیں' خسارے بانٹ لیتے ہیں

محبت کے علاوہ پاس اپنے کچھ نہیں محسن

اسی دولت کو ہم قسمت کے مارے بانٹ لیتے ہیں

انہیں حیرت ہوئی تھی اس وقت بھی ان کی آنکھیں گلابی مائل ہو رہی تھیں اور کوئی بہت قریب کہیں گنگنا رہا تھا

"چلو ایسا کریں مل کر ستارے بانٹ لیتے ہیں"

"مت تنگ کیا کرو مریم ایک تو جانے کی جلدی تھی اور پھر اب میرا مذاق اڑانے آ جاتی ہو۔"

''جانتی ہو وہ ہمارا دشمن اسی شہر میں ہے' ہم سب کے درمیان___ لیکن پتا ہے اس بار وہ اپنے دام میں آپ آئے گا' تم میرا یقین کرو۔''

''مجھے پتا ہے اس کے بعد تم بھی پرسکون ہو جاؤ گی۔ میری طرح تم بھی اس کی سزا کی منتظر ہونا۔''

وہ خود سے باتوں میں اتنا محو تھے کہ انہیں احساس ہی نہیں ہوا کہ وہ ان کے پیچھے آن کھڑی ہوئی تھیں اور اب اپنے نرم ہاتھوں سے سر سہلانے لگی تھیں۔ وہ یکدم پلٹے۔

''خالہ جان_ آپ_''

''رات آدھی سے زیادہ ڈھل چکی اور تم اکیلے بیٹھے ہو یہاں۔ بچے کہاں ہیں' کس نے تمہیں یہاں بٹھایا۔''

حالانکہ وہ خود بھی زخموں سے نڈھال تھیں مگر مسیحائی کا انداز وہی پرانا تھا۔

راجا طارق محمود نے ان کے دونوں ہاتھوں پر محبت سے بوسہ دیا اور اپنے قریب سنگی بینچ پر بٹھا لیا۔

''خالہ جان! آپ کیوں نہیں سوئیں''۔

''کئی برسوں بعد شمائلہ کی آواز سنی تو دل عجیب سا ہو گیا ہے۔ پتا ہے طارق! وہ ذرا بھی تو نہیں بدلی۔''

ان کے لہجے میں صدیوں کی تھکن اتر آئی۔

خالہ جان! اگر وہ بدل جاتی تو شاید اس وقت ہمارے درمیان ہوتی' مانا کہ میرا اور اس کا رشتہ ٹوٹا تھا لیکن اس گھر میں آپ تھیں' عاشر تھا' کسی کے لیے تو وہ خود کو اس دلدل سے نکالنے کا سوچتی۔ میں جانتا ہوں' وہ اس وقت کہاں ہے' مجھے کاشف نے سب بتا دیا ہے اور اس کے پاس شمائلہ اور منیر کمال کے جرموں کی طویل فہرست ہے۔ خالہ جان! میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔ آپ کی امانت کی حفاظت نہ کر پایا۔''

وہ آبدیدہ ہو گئے تھے' نانو کی آنکھوں سے بھی موتیوں کی لڑی ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرنے لگی تھی۔

''بچے! اس میں تیرا کیا قصور' رشتے اور سودے میں یہی تو فرق ہوتا ہے۔ وہ رشتہ قائم نہ کر سکی تو

سودا طے کیا تو خسارہ اس کا مقدر نکلا۔

تیرا کوئی دوش نہیں طارق!

میں نے اسے کہہ دیا تھا' جب تمہارے باپ کی زندگی میں اس گھر کے دروازے تم نے خود بند کر دیے تھے تو اب مجھ سے کسی بھلائی کی امید مت کرنا' مجھے تمہارے باپ کی موت کا ایک ایک پل اور اس گھر کے اجڑنے کا ایک ایک دن یاد ہے۔"

وہ رو بھی رہی تھیں اور اپنی بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے طارق محمود کو حوصلہ بھی دے رہی تھیں۔

وہ عظمت کے اس پیکر کو بس دیکھ کر رہ گئے تھے۔

عورت_ عورت_ عورت_ کس قدر انوکھے روپ ہیں اس مخلوق کے۔

کہیں خواہشوں کے گرداب میں الجھی ہوئی' کہیں انا کا پندار سلامت رکھنے کی تگ و دو میں نڈھال' کہیں نفس کے آگے بے بس' کہیں بدگمان راستوں پہ لہولہان چلتی ہوئی۔ کس قدر طاقتور ہے یہ عورت_ اور کتنا کمزور ہے وہ مرد_ جو بزدل دشمن کی طرح پشت پیچھے سے وار کر کے اپنی فتح کا جشن مناتا رہتا ہے۔

"آپ کو پتا ہے کل اس کا چالان کورٹ میں پیش ہو جائے گا اور پھر....."

انہوں نے گہری سانس لی۔ سیاہ رات کو جشن منانے کا موقع مل رہا تھا مگر اسے محبت کے ان اسیروں پر رشک سا آیا۔

"جانتی ہوں تو اس نے بویا ہے' وہ تو کاٹے گی نا اور اچھا ہے دنیا میں ہی سزا کاٹ لے ورنہ آخرت کا عذاب کیسے جھیلے گی"۔

انہوں نے طارق محمود کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔

"طارق تم بھی اسے معاف کر دینا۔"

وہ دونوں بھی ایک دوسرے سے لپٹ کر رونے لگے تھے اور قطرہ قطرہ پگھلتی رات محبت کے ان اسیروں میں حوصلے کی نئی کرنیں منتقل کرنے کا سوچ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

''عظیم شاہ مر گیا تھا اپنی ہی گولی سے بیچ سڑک پر۔''

'مسکن میں جو بھی سن رہا تھا' ششدر تھا۔

راحت بیگم نے بمشکل ستون کا سہارا لے کر خود کو گرنے سے روکا۔''اتنی اچانک اتنی غیر متوقع موت اور ایسا بھیانک انجام___''

وہ ندیم شاہ کے بڑے بھائی کے اس ''انجام'' پر سسک پڑی تھیں۔شجاع انہیں کمرے کے اندر لے آیا تھا اور اس وقت انہیں صرف رونے دینا چاہتا تھا۔

وہ جانتا تھا' برسوں کا رنج' ملال اور رشتوں کی پامالی کا غبار دل پر چھایا ہے جسے صرف آنسوؤں کی برسات ہی دھو سکتی تھی۔ روتو صوفیہ بھی رہی تھی اور شجاع نے پوری محبت اور استحقاق سے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔ یکدم ابٹن کی خوشبو نے حصار باندھا تھا۔

وہ بھی تھوڑی دیر پہلے والا منظر یاد کر کے آبدیدہ ہو گیا۔سب کتنا تنگ کر رہے تھے اس کی ''ہرنی'' کو اور اس وقت وہ سب کچھ بھلائے اس کے اندر سمٹی ہوئی تھی۔

کیسے ہوتے ہیں دل کی ڈور سے بندھے رشتے' لمحوں میں ضد اور انا کا بت پاش پاش کر دیتے ہیں۔

''صوفی! پھوپھی جان کی فکر کرو' تم خود کو سنبھالو' جو ہوتا ہے اچھے کے لیے ہوتا ہے۔شاید کوئی بھی عظیم شاہ کی زندگی سے اٹھتا نقاب برداشت نہیں کر سکتا تھا۔خاص طور پر اس سے وابستہ رشتے اور خود عظیم شاہ بھی۔بس دعا کر اللہ ان کی اگلی منزلیں آسان کرے۔''

وہ اسے راحت بیگم کے پاس بٹھا کر سمجھا رہا تھا اور دونوں ماں بیٹی عجیب سے احساس سے دوچار

بس روئے جا رہی تھیں۔

''میں معلوم کرتا ہوں ڈیڈ باڈی گھر آ گئی ہو تو پھر۔''

وہ ذرا سا جھجک گیا۔

''ہاں میں جانا چاہتی ہوں' تم پتا کرو''۔ ان کی آواز لرز رہی تھی۔

لیکن آپ خود کو سنبھالیں' ایسے نہیں چلے گا بلکہ میں نہیں جانے دوں گا دونوں کو اس حالت میں۔''

اس نے ڈی ایس پی طاہر کا نمبر ڈائل کرتے ہوئے تنبیہہ کی۔ صوفیہ نے ایک خاموش سی نگاہ پر ڈالی تھی اور پانی کا گلاس اٹھا لیا تھا۔

''مجھے ابھی طاہر سے ملنا ہے' آپ کو وہاں پہنچ کر کال کرتا ہوں لیکن پلیز سنبھالیں خود کو' اس طرح بالکل نہیں لے کر جاؤں گا۔'' اس نے صوفیہ کو بھی تاکید کی تھی نگاہوں کی زبان میں اور باہر نکل گیا تھا۔

اس کے باہر جاتے ہی راحت بیگم کے ضبط کا بند ٹوٹ گیا تھا۔

''پتا ہے کل ہی تو میں نے تمہاری خوشیوں کے لیے دعا مانگی تھی' مجھے ان سے کسی اچھائی کی امید نہیں تھی۔ جو شخص سالوں پہلے کی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے اپنے غنڈے بھیج کر مجھے اغوا کروا سکتا ہے' اپنی ہوس مٹانے کی کوشش کر سکتا ہے' میں اس سے بھلا کسی اچھائی کی توقع کیسے کر سکتی ہوں لیکن اللہ نے یہ کیسی سزا رکھی ان کے لیے' دونوں جہاں میں عافیت کو خود سے دور کر دیا انہوں نے۔''

وہ اپنی فطرت سے مجبور تھیں' انہوں نے پورے خشوع و خضوع کے ساتھ سورہ فاتحہ کا ورد شروع کر دیا تھا اور ان کی مغفرت کی دعا بھی۔

صوفیہ کو بھی قرار آ رہا تھا' اسے پتا تھا وہ جس صابر ماں کی بیٹی ہے وہ ماں اپنے کسی دشمن کے حق میں بھی خیر کی دعا کرنے والی تھی' اس نے وضو کے لیے واش روم کا رخ کیا تھا۔

عظیم شاہ کی لاش پولیس وین میں گھر پہنچی تھی اور اس کے بعد بھی آہ و بکا کا عالم تھا۔ تائی کو غش پر غش آ

رہے تھے۔ عالیہ اور عظمیٰ بھی آ گئی تھیں ان کی آنکھوں کے سوتے تو خشک تھے مگر چہرہ غم سے نڈھال تھا۔

گھر میں تعزیت کرنے والوں کی آمد شروع ہو گئی تھی۔ ایسے میں صوفیہ' راحت بیگم اور شجاع کی آمد پر پہلے تو کسی نے توجہ نہیں کی تھی لیکن اچانک ہی فہیم شاہ کی نظر ان پر پڑی تھی اور وہ سپاٹ چہرہ لیے ان کے پاس چلے آئے تھے۔

''آپ لوگ_'' ان کی حیرت بجا تھی۔

''کیا ہمیں تعزیت کے لیے نہیں آنا چاہیے تھا''۔ راحت بیگم کی خاموشی کا دفاع شجاع نے کیا۔

''نہیں' کیوں نہیں۔ بھابھی ہو سکے تو بھائی صاحب کو معاف کر دیجے گا''۔ انہوں نے التجائیہ انداز میں ہاتھ جوڑے۔

''میں تو رب غفور کی ادنیٰ سی بندی ہوں' میری کیا بساط۔ وہ ہے نا اپنے بندوں کے عیب سمیٹنے والا اور انہیں معاف کرنے والا''۔

وہ آج بھی اسی حیرت سے اس گھر کے در و دیوار دیکھ رہی تھیں۔ کچھ بھی نہیں بدلا تھا' سب کچھ جوں کا توں تھا انہوں نے ایک گہری سانس لی اور تائی کے پاس چلی آئیں۔

اس کا چہرہ چادر میں چھپا ہوا تھا' وہ حیرت اور صدمے سے اپنے گھر کے باہر کا ہجوم دیکھ رہی تھی۔ چھوٹا سا ٹینٹ لگا ہوا تھا اور بہت سارے لوگ اس کے اندر بیٹھے تبصرے میں مصروف تھے۔

''اگر وہ بے گناہ ہوتا تو اس طرح کی حرکت کبھی نہیں کرتا''۔ اس کے کانوں میں آواز پڑی' دل دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ وہ سست قدموں سے دروازے پر آئی۔ اندر صحن میں عورتوں کا ہجوم تھا اور شاید ایک طرف چارپائی پر سر تک چادر تانے کوئی وجود ابدی نیند سو رہا تھا۔

اس نے اسی ہجوم میں ایک بے قرار نگاہ کسی شناسا چہرے کی تلاش میں ڈالی۔ امی' تائی' عظمیٰ' عالیہ' سفیر اور ابا_ ایک آہ سی نکلی_ سب لوگ کہاں غائب تھے اور یہ کون تھا جس کے لیے اتنا ہجوم نظر آ رہا تھا۔

وہ چند قدم آگے بڑھی' بالکل چوروں کے سے انداز میں۔ حالانکہ کتنی ساری خواتین اندر باہر آ رہی تھیں۔ اس وقت اس کی طرف کوئی متوجہ نہیں تھا مگر وہ اپنے دل کے خوف کا کیا کرتی جو سارے حوصلے پست کیے دے رہا تھا۔

بھکارن کا روپ دھار کر وہ یہاں تک پہنچ گئی تھی لیکن اب ہمت نہیں تھی کہ سر جھکا کر ہاتھ جوڑ کر ماں باپ کے سامنے بیٹھ جاتی کہ جو چاہے سزا دو مگر اس گھر کی چھت میں آنے دو۔ بہت سزا کاٹ لی۔

وہ تائی کے کمرے کے سامنے کھڑی تھی اور اندر سب موجود تھے' سب اس کے اپنے سارے شناسا چہرے یہاں تک کہ صوفیہ بھی اور ان سب کے درمیان تائی بین کر رہی تھی۔

اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

''سفیر کے ابا کیسے ظالم نکلے تم' مرتے وقت بھی رسوائی اس گھر کے دروازے پر بٹھا گئے۔ ہائے کیا کیا تم نے.....''

وہ تیز قدموں سے واپس پلٹی۔ چارپائی کے قریب پہنچ کر ہمت تو نہیں ہوئی کہ چادر ہٹائے۔ بس وہیں قریب ہی سر گھٹنوں میں دے کر بیٹھ گئی' ابھی بہت سارا رونا تھا۔ اس کا نڈھال وجود ہولے ہولے لرزنے لگا۔ درد، تھکن اور طویل مسافت کے بعد پڑاؤ.....

اسے لگ رہا تھا جیسے ساری آوازیں آپس میں مدغم ہو رہی ہوں۔ اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبنے لگا۔

شمائلہ کو ایک دن کے ریمانڈ پر جیل بھیج دیا گیا تھا اور کاشف نے اپنی ٹیم کے ساتھ اس کامیابی کو سلیبریٹ کرتے ہوئے منیر کمال کی تلاش میں زیادہ مستعدی دکھانے کی تاکید کی تھی۔

''دیکھو اکبر! یہ شخص ابھی تک اسی شہر میں ہے۔ میری اطلاع کے مطابق ابھی تک اس نام کا کوئی بندہ ٹرانزٹ لاؤنج سے باہر نہیں گیا۔ دیکھو ہماری ذرا سی غفلت کے باعث سرمد بخاری ہاتھ سے نکل گیا۔ میں نے کہا تھا تم لوگوں سے۔ ہمارا ٹارگٹ کوئی عام لوگ نہیں' یہ گروہ بہت شاطر ہے اور سب سے

بڑی بات اس کے پیچھے جو لوگ سرگرم ہیں' ان پر ہاتھ ڈالنا شاید ہماری حکومت کے بس کی بات نہیں۔"

کاشف کا لہجہ خالصتاً پیشہ ورانہ تھا' اسپیشل تفتیشی افسر اکبر سمیت اس کے تینوں ساتھی پوری سنجیدگی کے ساتھ آئندہ کا لائحہ عمل بھی سوچ رہے تھے اور کاشف کو دھیان سے بھی سن رہے تھے۔

"سر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی' انہوں نے اب تک شمائلہ کو اپروچ کیوں نہیں کیا۔ شمائلہ کے موبائل فون سے جو خاص تین نمبر اور نام ہماری ہٹ لسٹ پر ہیں ان میں سے کسی نے بھی اس سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔" ان کی تفتیش میں رکاوٹ اسی بات کی تھی۔

"میں نے کہا نا' یہ گروہ ہماری سوچ سے زیادہ شاطر ہے۔ وہ لوگ کبھی بھی براہ راست اس سے رابطہ نہیں کریں گے' البتہ تم لوگوں نے اس کی ایک ایک حرکت کو واچ کرنا ہے۔ کون آ رہا ہے' کون جا رہا ہے' اس کی پل پل کی خبر رکھو۔ مجھے یقین ہے منیر کمال زیادہ دیر تک چھپ نہیں سکے گا اور شمائلہ کی خاموشی تو خیر ایک دن میل ٹوٹ سکتی ہے' اگر تمہارے بندے چاہیں تو"

کاشف کے چہرے پر معنی خیزی تھی۔ اکبر نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کھلی ہوئی فائل بند کر دی۔ اب اس فائل کی ہر تحریر اس کے ذہن میں درج ہو چکی تھی۔

شہر کے اہم مقامات' ریلوے اسٹیشن اور ائیر پورٹ پر ناکے کا آرڈر تو وہ دے ہی چکا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اپنے ماتحت کو مخصوص الفاظ میں سخت چیکنگ کا آرڈر دیتے ہوئے کاشف کو اجازت طلب نظروں سے دیکھا تھا۔

یہ شہر بہت چھوٹا ہے اور قانون کے ہاتھ بہت لمبے' مجھے صرف آپ کی اجازت درکار تھی۔ شمائلہ کے سارے ساتھی گھنٹوں میں آپ کے سامنے ہوں گے اور شمائلہ کا اقرار بھی اور کوئی حکم"۔

وہ مسکرا دیا تھا۔

"بس کل تک مجھے بالکل تنگ نہیں کرنا۔ رات کو مجھے ایک فیملی گیدرنگ میں جانا ہے' میں وہاں

کسی قسم کی ڈسٹرنس نہیں چاہتا۔ شمائلہ اب تمہارے حوالے ہے' یاد رکھنا وہ عورت نہیں ناگن ہے' اس کا زہر بہت پھیل چکا اب اور نہیں۔''

کاشف نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

''آپ کو شکایت نہیں ہوگی' میں اور میری ٹیم کو آپ جیسے رہنما کی ضرورت ہمیشہ رہتی ہے۔''

واپنے مخصوص لہجے میں کہہ کر پلٹ گیا تھا بیرونی دروازے کی طرف اور اس کے ساتھیوں نے اس کی تقلید کی تھی۔

کاشف کی پرسوچ نگاہیں ان کی پشت پہ پر جمی رہ گئی تھیں۔

وقت کم اور بہت سارے کام کرنے کے لیے باقی تھے۔

آج خزیمہ کے والدین اسلام آباد پہنچ رہے تھے اور وہ پہلے خود ان سے ملنا چاہتا تھا۔

اسے بہت سارے حقائق کی تصدیق خود بھی کرنا تھی۔ اس نے راجہ طارق محمود کا موبائل نمبر ڈائل کیا۔

''راجہ صاحب! ہم منزل کے قریب کھڑے ہیں' بتایئے کیا انعام دینے والے ہیں آپ مجھے۔'' وہ شرارت سے پوچھ رہا تھا۔

''صاحبزادے! ہم نے تو پہلے ہی کہا تھا آپ کی جاسوسی ہماری مرضی کے بغیر کسی کام کی نہیں۔''

بیشک ___ مجھے اعتراف کرنا پڑے گا' اگر مجھے گائیڈ نہ کرتے تو شاید یہ کیس بھی بہت سارے دوسرے کیسوں کی طرح سرد خانے کی نذر ہو جاتا لیکن دیکھ لیں اس مشقت ایک اور انعام خولہ اور کشمالہ کے وہ رشتے بھی ہیں جن سے شاید وہ کبھی نہیں مل پاتیں۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو' شاید اس ساری مشقت کا حاصل میری بیٹیوں کے چہرے کی انوکھی مسکراہٹ اور خوشی ہے اور میں نے مریم سے وعدہ کیا تھا میں ایک دن انہیں ان کے اپنوں میں ضرور لے جاؤں گا اور میں جانتا ہوں وں آج وہ بہت خوش ہوں گی۔

وہ کاشف سے بے حد مسرور لہجے میں بات کر رہے تھے جیسے دو دیرینہ دوست ایک دوسرے سے دل کی باتیں کرتے ہوں۔

''میں نے آپ کو ان دنوں میں بہت مس کیا جب آپ پاسپٹل میں ہم سب سے غافل پڑے ہوئے تھے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا میں کس سے اپنے دل کی بات کروں۔ پہلی بار جب شمائلہ کو دیکھا تو دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ مجھے یقین ہو گیا بدبختی اس عورت کے تعاقب میں ہے لیکن مجھے ڈر تھا کہیں عاشر کو وہ کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔

''آئی ایم ساری۔ راجہ صاحب میں اس عورت کے لیے عزت اور احترام کے لفظ نہیں استعمال کر سکتا' شاید یہ میرے پروفیشن کی مجبوری ہے۔''

راجہ طارق محمود اس کی معصومیت پر بس مسکرا دیے۔

''میرا رشتہ برسوں پہلے اس کے ساتھ ختم ہو چکا اور اپنی آزادی کی شرط پر اس نے عاشر سے اپنا ہر تعلق' واسطہ ختم کر لیا تھا۔ اب وہ ہمارے لیے اجنبی عورت ہے تم اسے کسی بھی نام سے پکار سکتے ہو۔''

''میں بالکل بھی آپ کو اداس نہیں کرنا چاہتا' میں کل تک آپ کو ایک اور بڑی خوش خبری دوں گا۔ اب آپ تیار ہو جائیں' ابھی میں اور آپ ایک بہت ضروری کام سے جا رہے ہیں۔ میں آپ کے پاس آدھے گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں''۔

''اچھی بات ہے' میں انتظار کر رہا ہوں۔'' انہوں نے فون بند کر کے ایک گہری سانس لی اور اپنی وارڈروب کے سامنے آئے۔ آج انہوں نے مریم کے بھائی سے ملاقات کرنا تھی' ان کا دل چاہا سب سے بہترین لباس پہنیں۔

اپنی پسندیدہ خوشبو لگائیں۔

کتنے مہینوں کے بعد تو انہوں نے خود کو دھیان سے آئینے میں دیکھا تھا۔

اور آئینہ کہہ رہا تھا' ماہ و سال کے اس سفر میں راجہ طارق محمود تم نے کچھ بھی تو حاصل نہیں کیا' سوائے آنکھوں کی سرخی اور چہرے کی پر سوز سنجیدگی کے۔

لیکن یہ بھی سچ ہے کہ وقت نے تمہارے جمال میں کوئی کمی نہیں کی ہاں مگر تمہارا تھکا ہارا دل اس آئینے کو بالکل اچھا نہیں لگتا۔ آجاؤ زندگی کی طرف جو سفر باقی ہے اس کے ساتھ انصاف کرو۔"

وہ آئینے کی اس صدا پر مسکرا دیے۔

تم ٹھیک کہتے ہو مجھے ابھی اپنے بچوں کی خوشیوں کے لیے بہت سا جینا ہے اور بھرپور توانائی کے ساتھ۔"

آئینہ گویا تائید کرتے ہوئے ان کی اس بات پر مسکرا دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

اتنی بھیانک' تاریک اور حبس آلود رات ___ شمائلہ کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

گرمی' پیاس' ذہن پر اعمال کا بوجھ' جسم و جاں تھکن اور نیند سے نڈھال۔

کھردرے فرش والا سیلن زدہ ٹارچر سیل..... شمائلہ کمال یہ ہو تم اور تمہارے سامنے ہے تمہارا انجام۔

"یہ میں کہاں آ گئی اور کیوں آ گئی؟" وہ اپنا سر گھٹنوں میں دیے اپنے ساتھ ہونے والے اگلے سلوک کی منتظر تھی۔

جب اسے عدالت میں پیش کیا گیا تھا وہاں اس نے صرف کاشف کو دیکھا تھا' اس کی نظریں بہت دیر تک کسی شناسا چہرے کو تلاش کرتی رہیں۔

"عاشر' اماں کوئی تو نظر آنا"۔

وہ آج بھی احمقانہ حد تک خوش فہم یا پھر دنیا کو اپنے پیچھے پاگل سمجھتی تھی۔

شاید یہ احساس برتری یہی تکبر اس کی زندگی کے روشن مقدر کو تاریکی میں دھکیل گیا تھا۔ جو وہ اس کال کوٹھری میں اس وقت بالکل تنہا تھی۔

اس نے بہت سارے لوگوں کے لیے ایسی بے بسی کا سامان کیا تھا مگر یہ نہیں جانتی تھی' مکافاتِ عمل زندگی کا حصہ ہے جس کا آغاز ضروری نہیں کہ مرنے کے بعد ہی ہو' کبھی کبھی زندگی میں ہی عبرت کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔

نشہ ٹوٹنے کے بعد قوتِ مدافعت بھی ختم ہو رہی تھی' وہ اپنے ہاتھوں کو کاٹنے' نوچنے لگی۔

آنکھوں کے سوتے ہمیشہ کی طرح خشک تھے' نہ میں ندامت کے آنسو تھے اور نہ پچھتاوے کا احساس.....

بس غصہ تھا اپنی بے بسی کا اور ان یاروں دوستوں کی بے وفائی کا جو اس موڑ پر تنہا کر گئے تھے۔ مگر اس کے باوجود وہ پر امید تھی' یہ زیادہ دن نہیں چلے گا' اس نے آج اچھی طرح سوچنا تھا کہ وہ اس عذاب سے نکلنے کا سامان کس طرح کر سکتی تھی۔

آہ.....انسان کس قدر خسارے میں ہے۔ اگر اسے اپنے سیاہ اعمال کے بدلے میں ملنے والی جہنم کی ایک رات کا بھی ادراک ہو جاتا تو شاید اس کا سر کبھی سجدے سے نہ اٹھتا۔

وہ نڈھال ہو کر ایک طرف کو گر پڑی تھی' اس کا زردی مائل چہرہ دھیرے دھیرے سیاہ ہو رہا تھا اور دل کی دھڑکنیں سست۔

☆.....☆.....☆

اس گھر کی ہر ریت ہی عجیب تھی ابھی عظیم شاہ کو دفنا کر آنے والے اپنے گھروں کو بھی نہ پہنچے تھے کہ اس کہ موت کا غم طاق میں رکھ کر سعدیہ کو مرنے اور غرق ہونے کی دعائیں شروع ہو گئی تھیں۔

اور سعدیہ کو بھی پتہ تھا کہ یہ سب تو ہو گا، وہ تو اس گھر کیلیے مر چکی تھی۔ اب اگر ایک مرا ہوا انسان

پھر سے سانس لینے لگے, زندہ ہو کر سامنے آن بیٹھے تو کس میں اتنا دم خم ہوگا کہ وہ اس کو گلے لگائے۔

وہ بھی ضبط کا پہاڑ اپنے اردگرد تان چکی تھی، اس لیے نہ تائی کی آواز سنائی دے رہی تھی، نہ ماں کی اور نہ ہی بہت سارے تماشا دیکھنے والے لوگوں کی اس کوئی پروا تھی۔

وہ جو دیکھ آئی تھی جو کچھ جھیل کر یہاں پہنچی تھی، اس کے بعد یہ تو بہت کم تھا، اب اس کا ضبط بھی چٹان جیسا ہو گیا تھا، سو وہ سب کو سنتی رہی اور روتی رہی۔

اس نے سوچا تھا جب سب چپ ہو جائیں گے تو وہ بولے گی لیکن اس سے پہلے ہی نعمان بول پڑا تھا۔

''پلیز آپ سب لوگ اس کا پیچھا مت لیں، موت کا گھر ہے، کچھ تو لحاظ کریں۔ لوگ کیا سوچتے ہوں۔''

''چپ کر لوگ اس کو یہاں دیکھ کر کیا سوچ رہے ہیں، تجھے اس کی کوئی پروا ہے۔''

''مجھے اس کی کوئی پروا نہیں، میں نہ لوگوں کے ٹکڑوں پر پل رہا ہوں نہ مجھے اپنی زندگی ان کے سہارے گزارنی ہے۔ اپ لوگ نہ سمجھ میں آنے والے ماں باپ ہیں، کم از کم یہ تو اس سے پوچھیں۔ وہ کہاں تھی کیا گزری اس پر۔''

وہ براہ راست چچا، چچی سے مخاطب تھا اور سعدیہ حیرت سے نعمان کو دیکھ رہی تھی، یہ وہ نعمان تھا جو اس سے متنفر ہی رہتا تھا، اس وقت وہ اس کیلیے سب سے لڑ رہا تھا۔

اس کی آنکھوں سے آنسوں رواں ہو گئے، اس کا بس نہیں چل رہا تھا، وہ نعمان کے قدموں میں بیٹھ جاتی۔

''سعدیہ اٹھو یہاں سے اور جاؤ جا کر اپنا حلیہ ٹھیک کرو، اب تم اپنے گھر میں ہو۔ بابار تماشا بننے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' اس کا دبنگ انداز سب کو حیران کر گیا تھا۔

سفیر کی آنکھوں میں بھی عجیب سا تاثر ابھرا لیکن وہ نعمان کو اس حد تک تو جانتا تھا کہ وہ جو کہتا ہے، کر کہ دکھاتا ہے۔

اس وقت اس گھر میں سعدیہ کا واحد غم گسار نعمان ہی تھا۔ سعدیہ عقیدت مندانہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

تائی جو سب سے زیادہ بول رہی تھیں، انھوں نے چپ ہونے میں عافیت جانی۔

بڑی دیر بعد انھیں پھر احساس ہوا تھا کہ جو کچھ ان کے ساتھ ہو چکا ہے، اس کا مداوا تو شاید ممکن ہی نہیں۔ آنے والی نسلوں کو بھی شاید اس بات کا جواب درکار ہوگا کہ عظیم شاہ نے کورٹ کے احاطے میں خود کو گولی کیوں ماری تھی۔

لیکن یہ وہ ان کہی داستان تھی جو عظیم شاہ کی موت کے ساتھ ہی قبر کی تاریکی میں اتر گئی تھی۔

یہ سچ ہے کہ ہماری پوری زندگی رشتوں کو بنانے اور انہیں سنوارنے میں گزر جاتی ہے کبھی یہ رشتے خلوص کا پیکر بن کر ہمیں مضبوط کرتے ہیں اور کبھی ہم ان کے ڈھونگ کا شکار ہو جاتے ہیں۔

قدسیہ کو بھی احساس ہو رہا تھا کہ جو کچھ منیر کمال کہہ رہا ہے۔ وہ اتنا بھی سچ نہیں کہ دل بلا سوچے سمجھے ایمان لے آئے لیکن شاید اس کے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔

قدسیہ ہمیں آج شام کو یہاں سے نکلنا ہوگا، تم نے جو اپنی ضروری چیزیں ساتھ رکھنی ہیں، رکھ لو زیادہ سامان سمیٹنے کی ضرورت نہیں ہم پہلے کراچی جائیں گے' کچھ دن مزے اور سکون سے گزاریں گے' وہاں پر میرا چھوٹا سا ٹھکانا ہے' مجھے یقین ہے تم اسے اپنے ہاتھوں سے بنا سنوار کر گھر بنا دوں گی۔''

وہ اس کے صبیح چہرے پر نظریں جمائے بیحد ملائمت سے کہہ رہا تھا وہ آج کل وہی منیر کمال بنا ہوا تھا جس نے اپنی شخصیت اور گفتگو کے سحر میں شمائلہ کو جکڑا تھا۔ اور اس وقت اسے یاد ہی نہیں تھا کہ شمائلہ کمال کہاں ہے کس حال میں ہے۔

وہ بے حسی کی انتہا پر پہنچ کر کر ان لمحوں کی دلفریبی کو سوچ رہا تھا جو قدسیہ کے ساتھ گزرنے والے تھے۔ اس نے قدسیہ پر اپنی شرافت' دیانت داری اور اعتماد قائم کرنے کے لیے ابھی تک کسی قسم کے ''حقوق'' کا استعمال نہیں کیا تھا بس وہ اسے اپنی باتوں کے حصار میں لے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آئی الجھنوں کو دور کر رہا تھا اور بلا کی اداکاری کرتے ہوئے اس کے چہرے کو نرمی سے چھو کر چھوڑ دیتا۔

''جب ہمیں پوری زندگی ساتھ رہنا اور ساتھ جینا ہے تو پھر جلدی کس بات کی' میں تو اپنی قدسیہ کو اب پھر سے دلہن کے روپ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔''

اور وہ اس کی بات پر بس اتنا ہی سوچ کر رہ گئی تھی کہ اسے تو نہیں یاد کہ وہ کبھی دلہن بنی ہو۔ پھر سے دلہن کیسے۔

اس نے بے دلی کے ساتھ اپنا سامان سمیٹنا شروع کیا تھا۔ وہ بے یقین سی تھی۔

''پتا نہیں اب یہ راستے کس منزل کی طرف لے کر جائیں گے یا پھر کسی موڑ پر میں بھٹک جاؤں گی''۔

وہ مسلسل سوچ رہی تھی اور نم آنکھوں کے ساتھ تیاری میں مصروف تھی' ''پتا نہیں کب دوبارہ یہاں آنا ہو.....'' اس نے کھانے پینے کی تمام اشیاء پڑوس کے گھر میں بھجوا دی تھیں۔

منیر کمال گہری پر سوچ نگاہوں کے ساتھ اس کی تمام سرگرمیوں پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس نے شکر ادا کیا تھا کہ قدسیہ کے پڑوس میں تعلقات برائے نام ہی تھے یا پھر اکیلے ہونے کی وجہ سے اس کے پاس کوئی نہیں آتا جاتا تھا اس طرح کا ماحول اس کے حق میں بہتر ہی ثابت ہوا تھا کہ وہ بہت سارے سوالوں کے جوابوں سے بچ گیا تھا۔

زندگی ایک نئی ڈگر پر رواں دواں ہونے کے لئے تیار تھی اس نے اپنے ذہن میں آنے والے ہر خدشے کو پیچھے جھٹک کر اور کسی حد تک اپنی غلطیوں سے سبق سیکھنے کا عزم کرتے ہوئے سفر کا ارادہ کیا تھا۔

''بہت جی لیا دوسروں کے سہارے اب جو کرنا ہے خود کرنا ہے' شمائلہ تو جیل میں سڑے گی اور سرمد مجھے یقین ہے وہ شاطر آدمی اب تک باہر بھاگ چکا ہوگا۔''

وہ پتا نہیں فون پر کس کو بتا رہا تھا قدسیہ بس اتنا ہی سن پائی تھی کہ وہ شاطر آدمی باہر بھاگ چکا ہوگا۔اس کا دل ایک لمحے کو بڑی تیزی سے دھڑکا مگر فطری جذبے یا مرعوبیت کے باعث وہ کوئی سوال نہ کر سکی۔بس خود کو کسی نے امتحان کے لیے تیار کر لیا۔

گھر کی دہلیز پار کرتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔منیر کمال ہے اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے بھرپور انداز میں تسلی دی۔

''دیکھو ہم صرف گھومنے پھرنے اپنا ہنی مون منانے جا رہے ہیں۔یہ جگہ مجھے بہت پسند آئی ہے پرسکون اور خوبصورت بلکل تمہاری طرح' ہوسکتا ہے میں یہیں اپنا کاروبار کر لوں اور اپنی جنت اسی جنت میں آباد کر لیں۔

اس کی سرگوشی' مضبوط انداز بیاں قدسیہ کے حوصلے مجتمع کرنے لگا۔

ان لوگوں نے ایک پرائیویٹ کار کے ذریعے سفر کا آغاز کیا تھا اور گاڑی خوبصورت نظاروں کو برق رفتاری سے عبور کرتے ہوئے اس منزل کی جانب رواں دواں تھی جس کا علم صرف اور صرف منیر کمال کا تھا۔

وہ اس وقت بھی ٹیرس پر اپنے پسندیدہ مقام پر کھڑی ستاروں بھرے آسمان کو تک رہی تھی۔

حیرت انگیز طور پر اس وقت بھی وہ کچھ سوچ رہی تھی نہ ہی گھر میں بیٹھے ہوئے مہمانوں کے بارے میں کسی تذبذب کا شکار تھی۔

خزیمہ کے ابا نے دیکھتے ہی بے ساختہ جس انداز میں ''مریم'' کہا تھا اور انہیں دیر تک خود سے لپٹائے رکھا تھا اس کے بعد کسی شک وشبے کی گنجائش ہی ختم ہوگئی تھی۔

ان کے پاس خستہ سی البم بھی تھی جس میں مریم سمیت تمام بہن بھائیوں کا گروپ فوٹو تھا۔

کچھ اور بھی یادداشتیں جو طارق محمود کو بے اختیار تائید کرنے پر مجبور کر گئی تھیں کیونکہ مریم نے شاید ہی اپنی زندگی کا کوئی گوشہ ان سے پوشیدہ رکھا تھا اور انھیں آج بھی اس کی ہر بات پورے سیاق وسباق کے ساتھ یاد تھی۔

پہلے انکشافات' پھر طویل خاموشی اور اب صرف باتیں ہی باتیں خوشگوار ماحول میں.....

وہ چپکے سے اٹھ کر باہر آ گئی تھی۔

''کیا بات ہے خولہ' آج بھی اتنی اداسی''۔ کاشف جانے کب اس کے پیچھے آن کھڑا ہوا تھا۔

نہیں میں اداس تو نہیں ہوں.....'' اس نے سر جھٹکا۔

''تو پھر کیا سوچ رہی ہو''۔

''میں کچھ بھی نہیں سوچ رہی۔ بس یوں ہی باہر آ گئی تھی''۔

وہ مسکرا دی اور پلٹ کر اسے دیکھنے لگی۔

''تمہیں خوشی نہیں ہوئی' یہ جو سب کچھ غیر متوقع طور پر ہوا' کم از کم تم لوگوں کو پاکستان میں رہنے کا جواز مل گیا''۔

''کیا پاکستان میں رہنے کے لئے پاپا کا ہونا کافی نہیں تھا کاشف''۔

''کیوں نہیں ہے' وہ تم لوگوں کا سب سے مضبوط حوالہ ہیں لیکن رشتوں کی زنجیر میں ہر کڑی اپنی جگہ اہم ہوتی ہے''۔ کاشف کو پتا تھا ان رشتوں کو تلاش کرنے میں سب سے زیادہ دلچسپی ہی طارق محمود کی تھی۔

''فلاسفر صاحب! آپ یہ جاسوسی وسوسی چھوڑیں اور رائٹر بن جائیں''۔

''تم ساتھ دو گی''۔ وہ شرارت سے نہیں بلکہ کسی اور ہی موڈ میں تھا۔

''کیا مطلب___'' اس نے حیرانی سے ابرو اچکائے۔

''مطلب یہ کہ دونوں مل کر کہانیاں لکھیں گے اور ایک دوسرے پر اپنی قابلیت کا روپ جھاڑا

کریں گے"۔ وہ مزے سے بولا

"کیا زندگی اتنی آسان اور سیدھی سادی ہے کہ ایک دوسرے پر قابلیت کا رعب جھاڑنے میں ہی گزر جائے گی"۔ وہ مسکرادی۔

"گویا تم ایگری ہو....." وہ اپنے مخصوص انداز میں خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

"کیا ایگری ہوں۔ دماغ خراب ہے تمہارا۔ وہ یکدم بدک کر بولی۔

اور ہاتھ اٹھا کر فوراً ہی راہِ فرار اختیار کی۔

"مائی گاڈ! تم لڑکی ہو یا بھوتنی۔ کھڑے کھڑے بیان بدل لیا' اندازہ بھی ہے تمہاری اس حرکت سے میرا ننھا سا دل ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا اب کیسے سنبھالوں اس درد کو۔" وہ بھی کمال کا اداکار تھا سینہ تھام کر رہ گیا۔

"کاشف! ایک بات بتاؤں تم بیک وقت اتنے سارے کام کیسے کر لیتے ہو جاسوسی بھی' ڈرامے بازی بھی اور فلرٹ بھی۔" وہ مسکرائی۔

"او۔ گڈ کوئسچن مادام! آپ کو کہاں سے لگتا ہے یہ جو میں آپ کے ساتھ وقت گزارنے کی جستجو کر رہا ہوں، آپ کے ساتھ کچھ قیمتی لمحے گزارنے کی جو خواہش ہے وہ دراصل فلرٹ ہے۔" اس نے دونوں ہاتھ سینے پر لپیٹتے ہوئے، نظروں میں بڑا معنی خیز تاثر سمو کر سوال کیا تھا کہ ایک لمحے کو خولا کے چہرے پر بھی کچھ حیرانی کے رنگ سے بکھر گئے تھے۔

ہمیشہ کی طرح کاشف کا ہر روپ ہر انداز حیران کن۔

لیکن اگلے ہی لمحے وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی بڑی۔

"کاشف! تم بالکل پاگل ہو، تم جیسے لوگ نعمت ہوتے ہیں، اللہ کی، زندگی سے بھرپور، محبت سے بھرپور۔

اس نے ایک گہری سانس لے کر چمکتے تاروں بھرے آسمان کی طرف دیکھا اور کچھ تارے اپنی آنکھوں میں بھی سمیٹ لئے۔

''پتا ہے، جو تم نے ہمیں پہچان کے نئے موڑ پر لا کر کھڑا کیا ہے نا، اس کو قبول کرنا اتنا بھی آسان نہیں، یہ سب مام کے کے اپنے تھے اور ہم نے ان سب کے ہوتے ہوئے تکلیف اور در بدری کی زندگی گزاری ہے۔''

''میری سویٹ سی خولا کیا یہ نہیں سوچتی کہ وہ کل تو خود کو تنہا اور رشتوں کے بغیر ادھورا محسوس کرتی تھی لیکن آج ان کے آس پاس رشتوں کا ہجوم ہے ان کا بے لوث پیار ہے اب وہ لڑ جھگڑ کر سب سے محبتوں کا حصہ وصول کر سکتی ہے۔''

کاشف اسے یوں بہلا رہا تھا، جیسے کوئی نیا کھلونا اس کے ہاتھ میں دے کر کہہ رہا ہو، اس سے کھیلنے کا طریقہ یہ ہے۔

وہ محض کاشف کے خلوص کا جواب خلوص سے دینے کے لیے بہل بھی گئی، اور اس کی بات پر مسکرا بھی دی۔

''اندر چلیں۔'' اس نے قدم بڑھائے۔

''کیوں ڈرنے لگی ہو مجھ سے۔'' وہ لہجے میں زمانے بھر کی شرارت سمیٹ لایا تھا مگر خولا پر بھی مجال ہے جو اثر ہو کسی بات کا۔

''کاشف! تم کس قدر فضول ہو.....نا''

''میں صرف فضول ہوں، اور تم دنیا کی بے کار ترین لڑکی۔ تم سے فلرٹ کرنے کے بجائے میں کسی دیوار سے لپٹ کر اظہار محبت کر لوں تو زیادہ بہتر ہوگا۔'' وہ جھنجلایا۔

''دیکھا آ گئی نا دل کی بات زبان پر، وہ اس کی بات پر کھلکھلا دی تھی، ہنسی کا دورانیہ ضرور طویل ہوتا لیکن کشمالہ دونوں کے سر پر کھڑی خونخوار نظروں سے گھور رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

یہ کیسا خلا ہے۔

جو خوابوں کے راستے میری روح میں آ گیا ہے

میں جس پھول بن میں ہری گھاس پر تتلیاں چن رہی تھی

وہ فرش کہہ میرے قدموں سے کیسے جدا ہو گیا

میں جس آسمان کے ستاروں میں

اپنا ستارا الگ کر رہی تھی

وہ تاروں بھری چھت میرے سر سے کیوں ہٹ گئی

زمین پر ہوا ور نام میں زیرِ فلک نہ دھڑکا ہے دل کو نہ کوئی کسک

تیرے ساتھ ہو نہ تیرے بغیر جیے جا رہی ہو میں نے بغیر

اس نے انگڑائی لینے کی کوشش کی تھی مگر وہ بیدار جسم اور سوئے ہوئے ذہن کے ساتھ کچھ نہ کر سکی۔

جسم کا ایک ایک حصہ درد اور اذیت میں مبتلا تھا، کل جو ہوا تھا اس کے بعد وہ اپنی موت کو یقینی دیکھ رہی تھی، مگر اس وقت اپنے سخت جان ہونے پر حیرت ہو رہی تھی۔

وہ ٹارچر سیل کی بھیانک رات اور دن گزارنے کے بعد بھی زندہ تھی، اور سب سے بڑی بات وہ اس غنودگی کے عالم میں بھی اپنے بھیانک ماضی سے روشن دن تلاش کر رہی تھی۔

اور ان روشن دنوں میں، سب سے زیادہ روشن وہ ایک دن ذہن سے چمٹا ہوا تھا۔ جب اس کی زندگی میں عاشر عباس آیا تھا۔

وہ آنکھیں بند کرتی تھی تو گول مٹول، سرخ و سپید بچہ، اس کی یادداشت کے پردے پر لہرانے لگتا وہ آنکھیں کھولتی تو تاریک سیاہ رات کی مانند جس آلود دیواریں دیکھنے کی حس سے محروم کر دیتیں۔

عاشر..... اس نے دیوار کے ساتھ سر مارا اور آنکھیں موندلی سر پھوڑے کی مانند دکھ رہا تھا، البتہ

بند آنکھوں کے پیچھے سے زندگی بلا رہی تھی۔

وہ تخلیق کے کرب سے بھی تو نہیں گزری تھی، اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ کوئی درد نہیں جھیلے گی، اس لیے ڈاکٹر کے مشورے کے بعد درد کم کرنے کے لیے انجیکشن لے لیا تھا۔

طارق کے لئے اس کی خوشی، اس کی مرضی اور اس کی صحت سب سے اہم تھی اور ویسے بھی ماں بننے کے تجربے سے گزر رہی تھی، اسے اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق تھا۔

انہوں نے بس اسے بساط بھر سہولت اور سکون فراہم کرنا تھا۔

''اف.....قدرت وہ درد خوش نصیبوں کو عطا کرتی ہے اور میں اس درد سے بھاگ نکلی تھی، کیا وہ اس درد سے زیادہ ہوگا۔''

وہ اپنی نازک جلد پر لگی خراشوں، اور روح پر پڑی گہری چوٹوں کے درد سے تڑپتے ہوئے بے ساختہ چلا اٹھی تھی۔

اس کے آس پاس کوئی نہیں تھا، اس لئے اس کی آواز سیلن زدہ دیواروں سے ٹکرا کر واپس اس کی سماعتوں پر ہتھوڑے کی طرح برس گئی تھی۔

عاشر اس کی گود میں آیا تھا، تو راجہ طارق محمود نے اس کے آس پاس نعمتوں کے ڈھیر لگا دیے تھے۔ اس نے کچھ دن عاشر کو فیڈ کروانے کی کوشش کی، لیکن وہ جلد ہی اس کی پابندی سے تھک گئی تھی، اسے لگتا تھا عاشر نے اس کے معمولات میں ہی خلل نہیں ڈالا بلکہ اسے عجیب سی قید کا سامنا ہے۔

شمائلہ کو کوئی قید کرے، یا اس کو اپنا آپ پابندی کی زندگی میں جکڑا ہوا محسوس ہو یہ کیسے ممکن ہے۔

تب عشق ایک رشین نانی کی گود میں آ گیا، شمائلہ کو آزادی مل گئی۔

آزادی کا وہ احساس کتنا طاقتور تھا نا، لیکن اسے نہیں پتا تھا کہ قدرت کو یہ بغاوت پسند نہیں آئی تھی۔

شاید تب سے ہی طویل قید، اس کا مقدر کر دی گئی۔

''اف..... یہ قید، کب نجات ملے گی، کون نکالے گا مجھے اس جہنم سے، یہ لوگ آخر مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔

ایک بار ہی بتا کیوں نہیں دیتے، میرے ساتھ کیا کرنا ہے، مجھے کیوں نہیں بتا دیتے۔

میں ان سب کو دیکھ لوں گی، جس جس نے بھی مجھے ہاتھ لگایا ہے اور میرے ہاتھ سے بچے گا تو نہیں، بہت برا انجام ہوگا۔''

وہ اپنے بازو نوچنے کھسوٹنے اور کاٹنے لگی تھی، اس کی زردی مائل جلد سے خون رسنے لگا تھا۔

اس نے اپنے دونوں ہاتھ فرش پر مارتے ہوئے سر زمین پر ٹکا لیا تھا۔

''عاشر!'' اس نے بے ساختہ پورے دل کی شدتوں سے پکارا۔

''کیا تجھے بھی اپنی ماں کو ہی سزا دینی ہے، مانا کے میں تیری مجرم ہوں۔

لیکن تم مجھے سزا ہی کیوں دینا چاہتا ہے، معاف بھی تو کر سکتا ہے نا۔

اب بولیں نا عاشر کو اسے تو آپ نے پالا ہے، بڑا کیا ہے، آپ جیسا مہربان کیوں نہیں، یہ آپ جیسی محبت کیوں نہیں کرتا وہ۔''

''اماں.....'' وہ چیخ چیخ کر پکارنے لگی تھی، یوں لگ رہا تھا جیسے پاگل پن کا دورہ پڑا ہو اس پر، یا پھر کوئی مرگی کی مریضہ اپنی انتہائی کیفیت میں تڑپ رہی ہوں۔

''اماں..... میں تو آئی تھی نا آپ کے پاس معافی مانگنے کے لیے، لیکن آپ نے دروازہ ہی نہیں کھولا کیوں..... اماں، ابا، ہوتے تو مجھے معاف کر دیتے نا، وہ آپ کی طرح نہیں تھے سخت اور ظالم..... ہاں وہ مجھے معاف کر دیتے، مگر آپ کو تو طارق سے پیار تھا نا، مجھ سے تو آپ نے کبھی پیار نہیں کیا اماں..... کبھی نہیں.....''

اب سارے گلے شکوے اس ماں سے تھے، جو زندگی کے ہر موڑ پر شمائلہ کو روکتی رہی اور احساس

دلاتی رہی کہ" صحیح اور غلط کا فیصلہ کرتے وقت، تکبر کی عینک اتار کر پھینک دو، ورنہ انسان خود کو نعوذ باللہ، اللہ کے مقابل سمجھنے لگتا ہے۔ اس کی فلاح اس میں ہے کہ وہ عاجزی اور انکساری کو قائم رکھتے ہوئے اپنے حق میں فیصلہ کرے، ورنہ تکبر اور ناشکرا پن ان انسانوں کی فہرست میں لے آتا ہے، جو اللہ کا نام تو لیتے ہیں، مگر خسارے میں رہتے ہیں۔"

"اماں..... عاشر..... اماں..... کوئی تو ہے میرے پاس" وہ مستقل چیخ رہی تھی، تبھی ایک اہلکار سلاخوں کے باہر آ کر کھڑا ہوا تھا۔

☆.....☆.....☆

"دیکھو راحت! جو ہونا تھا، وہ ہو چکا ہے، عظیم شاہ سے صوفیا کا رشتہ ہے، مگر عظیم شاہ اس دنیا میں نہیں رہا، اور شاید اس نے اپنے حق میں جو بہتر سمجھا، وہی کیا، اگر وہ ایسا نہ کرتا تو شاید اعمال کا بوجھ اسے پاگل کر دیتا۔

ہوتے ہیں کچھ لوگ ایسے جو تمام عمر اپنی ذات سے انتقام لیتے رہتے ہیں، اور انہیں احساس بھی نہیں ہوتا کہ ان کے انتقام کی زد میں کون کون آ گیا، شاید اس کا ادراک جب ان کو ہوتا ہے، تو وہ خود کو گولی مار لیتے ہیں۔"

بڑے بھائی کے پاس بٹھا کر ان کی تسلی و تشفی کرنا چاہیے تھی، ورنہ وہ جب سے عظیم شاہ کے گھر آئی تھیں، ساکت و جامد سی تھیں۔

جو کچھ اس نے اپنے ساتھ کیا، جو کچھ اس کے بعد وہ عظیم شاہ کے گھر میں دیکھ آئی تھیں، اس کے بعد ان کا احساس دل اور دماغ، سوچوں کا میدان جنگ بنے ہوئے تھے۔

پہلے ندیم شاہ، پھر عظیم شاہ، اور اب نعمان ان کو ایسا لگ رہا تھا جیسے ایک اور عظیم شاہ کا جنم ہوا ہو، اور وہ تو ایسا ہے کہ سب کو گولی مار کر خود کو بھی گولی مار دے گا۔

''دیکھو اس وقت ہمیں صوفیہ کی خوشیاں، اور اس کی زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ مدنظر رکھنا ہے اور میرے خیال میں یہ شادی اپنے مقررہ وقت پر ہی ہو تو بہت اچھا ہے۔'' انھوں نے فیصلہ سنا دیا تھا، راحت نے چونک کر سر اٹھایا۔

یہ تو وہ بھول ہی گئی تھیں کہ صوفیہ کی شادی میں اب دن ہی کتنے رہ گئے تھے۔ شاید تین یا چار جبکہ بچوں نے تو رسموں کا ہنگامہ کب سے شروع کیا ہوا تھا۔ شاید جس دن سے تاریخ طے ہوئی تھی۔ انہوں نے سوچا۔

البتہ عظیم شاہ کی موت کی خبر کے بعد سرگرمیاں معدوم پڑ گئی تھیں، سارے کام اپنی جگہ پر رک سے گئے تھے اور سب منتظر تھے کہ راحت کی خاموشی جیسے ہی ٹوٹے وہ لوگ پھر سے مستعد ہو جائیں، کیونکہ سب کو اندازہ تھا کہ راحت اپنی حساس طبیعت سے مجبور ہیں اور وہ اس وقت جس ذہنی اور اعصابی دباؤ سے گزر رہی ہیں اس کا احساس شاید کوئی اور نہیں کر سکتا۔

''آپ لوگ جو سوچ رہے ہیں، ٹھیک سوچ رہے ہیں، کام آپ نے کرنے ہیں، شادی کے سارے انتظامات بچوں نے سنبھال ہوئے ہیں، مجھے تو پتا بھی نہیں کون کیا کر رہا ہے، صوفیہ کی رخصتی جس جو دن آپ لوگوں نے مقرر کیا ہے وہ نہیں بدلے گا، سب اپنی وقت پر ہوں گ، آپ لوگ میری طرف سے پریشان بالکل نہ ہوں۔'' ان کی بات نے بھائیوں کے چہرے پر اطمینان کے رنگ بکھیر دیے تھے۔

''مجھے اب سچائی کو قبول کرنا ہوگا کہ ندیم شاہ کے بعد عظیم شاہ بھی ناگہانی موت کیا شکار ہوا، شاید اس گھر کے مقدر میں کچھ ایسا ہی لکھا ہے۔''

ان کی نظروں میں نعمان کا چہرہ گھوم گیا۔ وہ ہو بہو عظیم شاہ تھا۔ انہوں نے ایک جھرجھری سی لی۔

''اللہ کرے جو میں سوچ رہی ہوں وہ سب ویسا نہ ہو۔''

انہوں نے اس کا جو نیا روپ دیکھا تھا اس کے بعد ان کا دل چاہ رہا تھا ان تمام ماں، باپ کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر احساس دلائیں کہ اپنے جھگڑوں میں اپنی اولاد کی حق تلفی نہ کرو، ان کے سامنے رشتوں کو

بوجھ نہ بناؤ، لیکن پھر انہیں یاد آیا کہ نعمان کی ماں اور سعدیہ کی تائی اس وقت بھی اپنے ساتھ ہونے والے دکھ کا ماتم کرنے کے بجائے سعدیہ کو کوس رہی تھیں اور راحت بیگم کو ہمیشہ کی طرح کینہ توز نظروں سے دیکھتے ہوں۔ رخ پھیر لیا تھا۔ ''تماشا دیکھنے آئی ہو یا زخموں پر نمک لگانے''

ان کے الفاظ راحت کو عجیب نہیں لگے تھے بلکہ اگر وہ ایسا نہ کرتیں تو شاید راحت کو عجیب لگتا، کیونکہ وہ معمول سے ہٹ کر ہوتا اور راحت کو اب تک اس گھر کے معمولات بھولے نہیں تھے، وہ اپنی یادداشت کے آتے مجبور تھیں۔

انہوں نے بھائیوں کے چہرے پر اطمینان اور خوشی کی جھلک دیکھی تو اپنے ذہن پر رکھا بوجھ بھی دھیرے دھیرے سرکنے لگا۔

اور شاید اس وقت کا تقاضا بھی یہ ہی تھا۔ زندگی کہیں نہیں رکتی، اس کا حسن ہی یہ ہی ہے کہ ایک واقعہ دوسرے حادثے کی شدتوں کو کم کرتا رہتا ہے۔

☆.....☆.....☆

صوفیہ کو واپس ہنستے کھیلتے ماحول کا حصہ بننے میں دقت ہو رہی تھی، مگر سب کہ خوشی کی خاطر اور خاص طور پر اپنی ماں کی خوشی کی خاطر وہ کمرے کی تنہائی سے نکل آئی تھی۔ ''شجاع پہلی فرصت میں کالے بکرے کا صدقہ دو۔'' آپیوں نے اسے مشورہ دیا تھا۔

''کیوں کیا ، صوفیہ کو نظر لگ جانے کا امکان ہے جو حفظِ ماتقدم کے طور پر.....'' وہ بالکل سنجیدہ نہیں تھا۔

''بکواس مت کرو، تمہاری شادی میں کوئی نہ کوئی مسئلہ آجاتا ہے اور صدقہ بلاؤں کو ٹالتا ہے۔'' عفت آپی نے سنجیدگی سے کہا تو وہ سر ہلا کر رہ گیا۔

''آپ کہتی ہیں تو آج ابھی یہ کر لیتا ہوں، لیکن آپ کو تو پتا ہے میں حالات کے سامنے سرنگوں

نہیں کرتا، بلکہ حالات کو اپنے ساتھ کر لیتا ہوں اور وہ میری طاقت بن جاتے ہیں۔"

اس کی نظریں غیر مرئی نقطے پر مرکوز تھیں۔ عفت آپی نے آم کی قاش اس کی طرف بڑھاتے ہوئے محبت سے دیکھا اور پھر دل سے دعا دی۔

"اللہ تم دونوں کو سکھی اور آباد رکھے۔ آج شام کو ساری شاپنگ نبٹا لو، صوفیہ بھی بہل جائے گی، ظاہر ہے اس کا تو رشتہ ہی ایسا تھا اور جس طرح موت ہوئی وہ بھی دھچکا ہی ہے۔" مسکن کی یہ ہی تو خوبی تھی خوشیوں کے لمحے ہوں یا دکھ کی گھڑی ایک دوسرے کو تنہا نہیں کرنا تھا۔

"ٹھیک ہے شام کو آپ لوگ بھی تیار رہنا، سب چلیں گے۔"

اس نے پروگرام طے کیا۔ عفت آپی کو کوئی اعتراض نہیں تھا، البتہ ثمرہ آپی نے بچوں کی وجہ سے ساتھ نہ جانے کا اعلان کر دیا۔ فائزہ، عائزہ، انعم اور علی کی شمولیت کے بغیر یہ شاپنگ تو کیا مسکن کا کوئی بھی کام درست طریقے سے ہو ہی نہیں سکتا تھا، سو سب کی ایکسائٹمنٹ کا آغاز ہو گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

کیا میری بلی آج بھی پنجے مارے گی۔" صوفیہ کے موبائل کی اسکرین جگمگا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

"اب کیا پریشانی ہے؟" اس نے مسکراتے ہوئے آئی کون کے ساتھ بھیجا۔

"دیکھنا ہے۔" بہت مختصر سا مطالبہ تھا، اس کو محسوس ہوا جیسے کمرے کی تنہا اور اداس سی فضا میں جلترنگ سے بج گئے ہوں۔

"ڈرامے باز۔" وہ اسے اکثر لکھ کر بھیجتی تھی۔ جس پر اس کا ہمیشہ کی طرح جواب آتا تھا۔

"صرف تمہارا۔" اور اس وقت بھی وہ یہ ہی جواب پڑھ رہی تھی۔

"مسئلہ کیا ہے کیوں تنگ کر رہے ہیں؟" لاڈ بھرا انداز۔

''شام کو تیار رہنا , اس بار اگر نخرے کیے تو۔'' جواباً ویسی ہی دھمکی۔

''کیا مطلب۔۔ تیار رہنا، اب کہاں جانا ہے۔ وہ انجان بن گئی۔

اس نے ٹیکسٹ کیا جواباً'' بیل بجنے لگی۔

''آپ کو چین نہیں ہے۔'' چھوٹتے ہی کہا، حالانکہ یہ تو اب پوچھنے کی بات نہیں تھی۔

''تمہیں پتا تو ہے پھر بار بار ایک سوال کیوں کرتی ہو یار۔'' وہ مسکراتے لہجے میں بولا۔

''اچھا چلیں کام کی بات کریں۔'' اس نے مصنوی رعب سے کہا۔

''کام کی بات بتا دی ہے، شام کو تیار رہنا، تمہاری خواہش تھی کہ سب شاپنگ کے لیے چلیں گے سو میں اپنی پوری بارات کے ساتھ اپنا اور تمہارا ویڈنگ ڈریس خریدنا چاہتا ہوں، اب بتا دو تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں۔'' وہ اپنی شعوری کوشش سے اس کے ذہن پر چھائے غبار کو کم کر رہا تھا، وہ جانتا تھا جس حساس لڑکی سے اس کا ناتا جڑنے والا ہے وہ بلی کے بچے کے مرنے کے غم پر بھی دنوں رو سکتی ہے اور اس رشتے کا امتحان اب شروع ہو چکا تھا، اسے ہر حال میں موسموں کی طرح مزاج بدلنے والے ساتھی کا خیال رکھنا تھا۔

''شجاع! کیا میرا جانا ضروری ہے، پتا ہے جب دل و دماغ ایک دوسرے کی مخالف سمت میں جا رہے ہوں تو پھر کچھ نہیں اچھا لگتا۔'' وہ بھی ذہن پر چھائے غبار سے اکتا گئی تھی۔

''صوفی! زندگی ہر پل نیا رنگ بدلتی ہے اور ہمیں ان رنگوں کو ہر حال میں قبول کرنا پڑتا ہے۔

تم نے اپنے تایا کو اتنے دنوں میں سمجھا تو ہوگا نا کہ ان جیسا آدمی اپنی ہار کبھی نہیں مان سکتا۔ سارے حالات، ساری دلیلیں اور ساری شہادتیں ان کے مخالف چلی گئی تھیں۔ ایسے میں ان کے پاس کون سا رستہ تھا۔''

''مگر شجاع تایا ایسے نہ تھے , پتا نہیں کیوں کسی نے بھی ان کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔'' وہ کسی کے بارے میں برا سوچ سکتی تھی اور نہ برا کرنے کی سکت تھی اس میں۔

''صوفی! میری جان..... میں جانتا ہوں تم اس وقت الجھن میں ہو، شاید تم اپنی فطرت سے مجبور ہو، تم دنیا کو اپنی خوب صورت آنکھوں سے خوب صورت ہی دیکھنا چاہتی ہو، جبکہ ایسا نہیں ہے۔''

وہ بہت کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ یہ وقت سچ بولنے کا نہیں تھا۔

''تمہارے تایا اب ہم میں نہیں، ہمیں دعا کرنی چاہیے کہ اللہ ان کی باقی منزلیں آسان کرے۔'' اس نے فیصلہ تقدیر کے ہاتھوں میں دے دیا۔

''میں اتنا برا مرد میں ہوں کہ تمہارے احساسات پر اپنے جذبات کا بوجھ رکھ دوں۔ ہمارا رشتہ بہت طاقت ور ہے، جو تم سوچتی ہو، محسوس کرتی ہو، وہ تم مجھ سے نہیں کہو گی تو پھر کس سے کہو گی اور مادام..... یہ بندہ ناچیز آپ کی ہر بات سننے اور آپ کا ہر تیور سہنے کا پابند ہے نا آج سے نہیں بلکہ ہمیشہ سے کیونکہ روحوں کا ملن تو کہیں اور ہوتا ہے تا اور ہم جب سے ساتھ ہیں۔''

صوفیہ کو احساس ہو رہا تھا کہ کمرے میں بجتے جلترنگ مزید اونچی اور سریلی موسیقی بکھیرنے لگے تھے۔

اللہ نے جو شخص اس کے لیے منتخب کیا تھا وہ اس کی کسی نیکی کا ہی انعام تھا۔

''ہیلو۔۔ ہیلو..... کہاں گم ہو گئیں۔ چلو اب تیاری پکڑو، بالکل اداس ہونے کی نہیں ہو رہی، جو وقت ہاتھ آئے اس سے خوشیاں کشید کرنی چاہئیں، پتا نہیں کل کیا ہو کس نے دیکھا.....'' اس کے لہجے میں بلا کی عجلت تھی۔

''چلو ہری اپ۔'' اس نے تابعداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بس ''اچھا'' کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔

کسی حیل و حجت کی گنجائش ہی کہاں رہی تھی کہہ تو دیا تھا اس نے۔ ''میں اتنا برا مرد نہیں کہ تمہارے احساسات پر اپنے بذبات کا بوجھ رکھ دوں۔''

صوفیہ کا چہرہ انجانی تپش تے جھلسنے لگا تھا۔

☆.....☆.....☆

ایک طویل مدت بعد وہ پھر سے اپنے کمرے میں تھی، وہی اسٹور نما کمرہ جو اس کو خوابوں کی دنیا میں لے جاتا تھا اور پھر ان خوابوں کی تلاش میں اس نے اپنا آپ مٹی میں رول دیا تھا۔

اظہر، سرمد بخاری اور پھر سے اظہر، لیکن اس سفر میں اس نے کیا کچھ نہ دیکھا تھا اور کیا کچھ نہ جھیلا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا، وہ اس سفر کی کٹھنائیاں عبور کر کے پھر سے اپنے گھر، اپنے لوگوں میں پہنچ گئی تھی۔

گو کہ گھر کے کسی فرد نے اس سے بات کی تھی اور نہ ہی اس کے پاس آنے کی کوشش کی تھی، گلے لگانا تو بہت دور کی بات۔۔

مگر اس کے لیے یہی کافی تھا کہ اسے دھکے دے کر نکالنے کی بجائے نعمان نے اس کمرے کی راہ دکھائی تھی۔

''نعمان۔۔ میرا سب سے بڑا ہمدرد سب سے بڑا غمگسار۔۔'' اس کا دل عقیدت سے بھر گیا۔

منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھپاکے مارتے ہوئے بھی وہ اس کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

''پتا نہیں اظہر سے کیسے جان چھڑائی ہوگی اور اظہر وہ درندہ جانے کس حال میں ہوگا۔''

وہ دوپٹے سے منہ پوچھتے ہوئے ایک شکستہ دیوار گیر آئینے کے سامنے آ کھڑی ہوئی، یہ آئینہ ہی تو اس کے ساتھ شغل کرتا تھا، کبھی تعریف کرتا تو کبھی غرور میں مبتلا کر دیتا تھا۔ اور آج یہ آئینہ ہی اس کی حقیقت بھی بتا رہا تھا۔

سیاہ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے، سیاہی مائل رنگت اور چہرے پر صدیوں کی تھکن۔

وہ بے ساختہ جھرجھری لے کر رہ گئی۔

''کوئی پوچھے مجھ سے بھی کہ کیا بیتی مجھ پر یا سب ایک ہی بات کہیں گے کہ جانے کہاں منہ کالا کر کے آئی ہے۔''

وہ اپنے ہر سوال کا جواب اپنے اندر سے خود ہی لے آتی تھی تب ہی دروازے پر آہٹ سی ہوئی۔

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ سامنے نعمان تھا۔

ان سارے دنوں میں وہ کافی بدل گیا تھا اس کے کندھے مزید چوڑے ہو گئے تھے بال ذرا اور لمبے اور چہرہ بھرا بھرا سا۔

اس کا دل چاہا وہ تھوڑی دیر اسے دیکھتی رہے یہ ہی تو تھا اس کا مسیحا۔

''دیکھو! سعدیہ۔'' وہ اندر آ گیا تھا اور بدرنگی سی کرسی پر ٹکتے ہوئے بلا تمہید شروع ہو گیا تھا۔

''مجھے نہیں پتا کب پولیس میری تلاش میں یہاں تک پہنچ جائے، اگر اظہر مر گیا ہو گا تو ٹھیک ہے پھر تو میں بچ جاؤں گا آج کل آئے دن شہر میں کسی نا کسی کا قتل ہو رہا ہے کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔ لیکن اگر وہ زندہ ہے تو پھر ہوش میں آنے کے بعد وہ سب سے پہلے میری تلاش میں آئے گا یہ تو تم اس کے بارے میں جانتی ہو اس لیے میں نہیں

چاہتا کہ تم پھر سے کسی مصیبت میں پھنسو۔

میں تم سے نہیں پوچھوں گا کہ تم کس کے ساتھ تھیں اور تم کیا کرتی رہی ہو، کیونکہ جن لوگوں کے ساتھ رہ کر تم جس دنیا کی سیر کر آئی ہو میں ان کو اچھی طرح سے جانتا ہوں، تمہاری خوش قسمتی کہ تم دبئی کے کسی بار کی کال گرل بننے سے رہ گئیں۔''

وہ بڑی سفاکی سے سچ بول رہا تھا، سعدیہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''اب رونے کی ضرورت نہیں۔۔۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ وقت واپس نہیں آتا، اس گھر پر بھی ایک قیامت آ کر گزر گئی ہے آہستہ آہستہ تمہیں سب پتا چل جائے گا فی الحال مجھے تمہاری فکر ہے کیونکہ تم سب کے لیے بے عزتی اور شرم کا باعث ہو، موت کا گھر ہے اور تم زندہ سلامت ہو، جبکہ تمہاری موت کا اعلان بہت پہلے کر دیا تھا اس لیے میں نے سوچا ہے تم کچھ دنوں کے لئے ان سب کے سامنے نہ ہی آؤ تو بہتر ہے۔ اپنی ماں کو تو میں اچھی طرح جانتا ہوں، جو دنیا کو نہیں بھی پتا ہو گا وہ بتا کر دم لیں گی۔'' نعمان سنجیدہ

بھی تھا اور ہمیشہ کی طرح بے رحم بھی سعدیہ کا سر جھکتا چلا گیا اس نے بارہا نعمان کو دھوکا دیا تھا۔ بے عزت کیا تھا۔

''جو تم کہو گے نعمان، میں ویسا ہی کروں گی، میرے لیے یہی کافی ہے کہ میں تم سب کے درمیان ہوں، سب بیشک مجھے لعنت ملامت کریں میں سہہ لوں گی آخر مجھے بھی تو میرے کیے کی سزا ملنی چاہیے۔ مانا کہ میں گھر سے بھاگی نہیں تھی لیکن میرے قدم تو غلط راستے پر چل پڑے تھے نا مجھے تو سزا ملنی چاہیے نا۔''

وہ روتے روتے اعتراف کر رہی تھی۔ نعمان نے ہمدردی سے اسے دیکھا اس وقت سعدیہ کو تنہائی کی نہیں خاص توجہ کی ضرورت تھی۔ یکدم اس کے خیال کی رو بھٹک گئی۔ وہ بے رحم تھا مگر سفاک اور بدگمان نہیں۔ اسے اچھی طرح اندازہ تھا سعدیہ کو اس کی نادانیوں نے برباد کیا۔ ''راحت چاچی.....'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

''سعدیہ تم اپنا حلیہ ٹھیک کر لو، دیکھو کپڑے شپڑے اگر کہیں نظر آ رہے ہیں تو ساتھ رکھ لو، میں تمہیں راحت چاچی کے پاس لے جاتا ہوں تم کچھ دن ان کے پاس رہو۔۔ جب تک میں سوچتا ہوں کرنا کیا ہے اور گھر والوں سے کس طرح تمہاری جان بخشی کروانی ہے۔'' وہ یکدم مطمئن نظر آ رہا تھا اس لیے چہرے پر مسکراہٹ بھی آ گئی تھی۔ سعدیہ نے روتی آنکھوں سے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔

''مگر میں وہاں.....وہ لوگ کیا سوچیں گے۔''

''وہ لوگ کچھ بھی نہیں سوچیں گے یہ میرا یقین ہے البتہ تم یہاں پر رہیں.....تو سب ایک دوسرے کو کاٹ کھائیں گے۔''

وہ ہنس پڑا تھا۔ اس کو حالات سے آگاہی کا خداداد وصف حاصل تھا وہ خود کو شاباش بھی دے رہا تھا۔ جو بروقت یہ خیال دماغ کو سوجھ گیا تھا۔

سعدیہ کو راحت چاچی کے حوالے کر کے وہ بہت سارے مسئلے مسائل نبٹا سکتا تھا جو عظیم شاہ کی

موت کے بعد اظہر کے زخمی ہونے کے بعد سے اسر پر منڈلاتے ہوئے نظر آرہے تھے۔

سعدیہ اسے تشکر بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔ وہ اتنا متنفر اور بدگمان نہیں تھا جتنا وہ سوچا کرتی تھی۔

☆.....☆.....☆

مہمان جا چکے تھے، آج شام سے پہلے وہ لوگ اجنبی ضرور تھے لیکن اب ان سے گہرا رشتہ استوار ہو گیا تھا اور ان کے جانے کے بعد اب صرف ان کا ہی تذکرہ تھا۔

ایک مدت بعد نانو کے چہرے پر بھی اطمینان بھری مسکراہٹ تھی، راجہ طارق محمود عین ان کے سامنے کرسی پر براجمان تھے، عاشر اپنی پسندیدہ جگہ پر ان کے پہلو سے لگ کر بیٹھا ہوا تھا البتہ کاشف نے اپنے لیے طارق محمود کے برابر میں جگہ بنائی ہوئی تھی۔

خولہ نے ضد کر کے نانو کے بائیں طرف قبضہ کر لیا تھا، کشمالہ فروٹ باسکٹ کے ساتھ اندر آئی تو ماحول ہی بدلا ہوا تھا، یہ بالکل ویسی ہی روشن اور زندگی سے بھرپور رات تھی جب وہ پہلی بار اس گھر میں آئی تھیں اور اس نے لمبے چوڑے عاشر کو نانو کی گود میں تو کبھی ان کے کندھے پر سر رکھے دیکھا تھا۔

وہ منتظر تھی کوئی اسے بلائے۔۔ حالانکہ کمرہ اتنا وسیع اور ہر طرح کی سیٹنگ سے بھرپور تھا کہ تنگی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا لیکن اسے بھی تو نانو کے پاس جگہ چاہیے تھی۔

''مالا بچے ادھر آجاؤ..... یہ سامان ادھر ٹیبل پر رکھ کر یہاں میرے پاس آؤ۔'' نانو نے کمال کی جگہ ڈھونڈی تھی عاشر اور ان کے درمیان۔ اس کا دل خوامخواہ اچھل کر حلق میں آگیا۔ حالانکہ عاشر نے تو صرف ایک نگاہ ڈالی تھی لیکن اس کے لیے وہی کافی تھی۔

اور ستم یہ کہ اس نگاہ کرم کے بعد وہ مسکرا رہا تھا۔

''نانو! میں یہاں ہی ٹھیک ہوں فروٹ بھی تو کاٹنے ہیں..''

وہ فروٹ باسکٹ کی طرف متوجہ ہو گئی تھی اور عاشر نے نانو کے گرد بانہوں کا حلقہ تنگ کر لیا تھا۔

کاشف کو اس کی سب ''چالاکیاں'' سمجھ میں آ رہی تھیں۔ اس نے فوراً سے بیشتر کاوچ کشمالہ کے سامنے کھینچ لیا۔

''چلو یار۔ فروٹ چاٹ بناتے ہیں، تمہیں پتا ہے نا۔ یہ سب لوگ مفت خورے کام دام تو کرتے نہیں۔ بس کھانے آ جاتے ہیں۔

''ہائیں یہ کون کون سے مفت خورے کا ذکر ہو رہا ہے، دیکھو بھئی میں تو رٹائرمنٹ کو پہنچ چکا ہوں اس لیے میرا تو حق بنتا ہے بیٹھ کر کھانے کا۔'' راجہ طارق محمود کے چہرے پر مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

''یہ کسی دشمن کی خبر ہو گی جناب عالی! آپ کے سارے پروجیکٹ ادھورے پڑے ہیں۔ راجہ ہاوس میں بھی چڑیلوں نے بسیرا کر لیا ہو گا اور آپ کہہ رہے ہیں کہ ریٹائرمنٹ۔۔ بس بہت ہو گیا آرام۔۔ فوراً اپنی ذمہ داریاں سنبھال لیجیے، کیوں نانو؟ وہ بڑی مہارت سے آڑو کاٹتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کر رہا تھا اور نانو کی تائید بھی حاصل ہو گئی تھی۔

عاشر کو ہمیشہ کی طرح اس کی خوش بیانی پر رشک آ رہا تھا۔

''طارق! بچے بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں، بہت دن ہو گئے کوئی کہیں نہیں گیا، میرے خیال میں بچیوں کو کراچی جانے سے پہلے اپنی زمینوں پر سیر کرا کر لے آؤ۔''

''کراچی جانے سے پہلے۔ کراچی کون جا رہا ہے؟ استفسار خولہ نے کیا تھا شر اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی ایسا ہی سوال تھا۔

''کراچی مالا اور خولہ جائیں گی۔'' راجہ طارق محمود گویا فیصلہ کر چکے تھے۔

''مگر پاپا کیوں۔۔ وہ لوگ آئے تھے ہم ان سے مل چکے۔ اب کیا ضرورت ہے۔'' پہلی بار کشمالہ نے بھی اس موضوع میں حصہ لیا۔

''میرے بچے صرف اتنا کافی نہیں۔ اب یوں سمجھو تم لوگوں کا ننھیال ہے تمہارے ماموں کا گھر،

اور ان کے گھر جانے میں بچوں سے گھلنے ملنے میں کوئی حرج نہیں۔'' نانو سادگی سے وضاحت کر رہی تھیں۔ کاشف کو اچھو لگ گئی۔

''ہاں کوئی حرج نہیں ان کے بچوں سے گھلنے ملنے میں۔'' اپنا ہی جملہ حلق میں پھنس گیا تھا اس کے، خولہ نے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا تھا۔ مسکراہٹ تو عاشر اور کشمالہ کے چہرے پر بھی معنی خیزی کے ساتھ آئی تھی۔

''میرے خیال میں کراچی کے بارے میں بعد میں سوچا جائے گا، فی الحال تو راجہ ہاؤس جانے کی بات ہو رہی ہے اور ہم نے پہلے وہاں جانا ہے بس۔'' خولہ نے فیصلہ سنا دیا تھا۔

''ڈن۔۔'' سب سے پہلے عاشر کی آواز آئی تھی، راجہ طارق محمد کی آنکھیں روشن سی ہو گئی تھیں۔ کتنا تڑپایا تھا اس نخریلے سجیلے بیٹے نے اور اب تو یوں لگتا تھا جیسے اس سے زیادہ سعادت مند کوئی نہیں۔

وہ نام نہاد سنجیدگی کا چولا جو اس نے خود پر چڑھا رکھا تھا وہ بھی کہیں غائب ہو گیا تھا۔''

وہ اس کی ایک ایک ادا کو نوٹس کرتے تھے اور نہال ہوتے تھے۔'' برخوردار! یہ ٹرپ خولہ اور کشمالہ کا ہے آپ کو کس نے دعوت دی۔'' کاشف نے پلٹ کر بدلہ لیا تھا۔

''مجھے تو ویسے بھی اپنے آفس میں کچھ معاملات کلیر کرنے ہیں آپ کو کوئی اعتراض۔''

اسے بھی بروقت جواب سوجھ گیا تھا۔ کاشف نے مدد طلب نظروں سے کشمالہ کو دیکھا۔

جس کے چہرے پر واضح لکھا تھا۔'' بھلا عاشر کے بنا وہاں جانے کا فائدہ اور اب تو یہ طے ہو چکا ہے کہ اس کے بغیر کہیں نہیں، کبھی نہیں۔''

آم کو نفاست سے کیوب کی شکل میں کاٹنے کی کوشش میں اس کے ہاتھ تر بتر ہو چکے تھے اور کاشف چاٹنے کا مشورہ دے رہا تھا۔

''منہ پر نہ پھیر دوں تمہارے۔''

''میرے نہیں آپ کا پرنس ادھر ہے۔'' کاشف کی سرگوشی اور اشارہ دونوں ہی اعلان تھے۔

کشمالہ نے وہاں سے اٹھ جانے میں ہی عافیت جانی، ویسے بھی فروٹ سارے کٹ چکے تھے اب انہیں سرو کرنے کی باری تھی یہ کام کاشف بہت مزے سے کرتا تھا۔

''تم دونوں نواب ہو گیا۔ چلو اپنی اپنی پلیٹیں اٹھاؤ، راجہ صاحب آپ اس کاہل کو اب بالکل ڈھیل نہ دیجیے گا کل آفس لے جائیں۔''

وہ اس وقت لڑاکا بہو کی طرح عاشر پر حملہ آور ہوا تھا پتا نہیں کس بات کا غصہ تھا شاید اس پروجیکٹ کے اختتام پر اسے واپس لوٹنا تھا کسی نئی اور انجان منزل کی جانب، اب اس کا قیام بس کچھ دن اور تھا، اور اس کے بعد وہ ان دنوں کو بھلا کیسے فراموش کرے گا وہ گزرے دن سے مستقل یہ ہی سوچ رہا تھا اور ایک بار تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھی آ گئے تھے۔

''میں آپ سب لوگوں کو بہت مس کروں گا، بہت۔'' اس کی سرخ آنکھیں راجہ طارق محمود کے سامنے برس پڑیں۔

''تم میرے بیٹے ہو، بالکل عاشر کی طرح، یہ تمہارا گھر ہے بلکہ ہر وہ گھر تمہارا ہے جو عاشر کا ہے، اب تم ہماری زندگی کا حصہ ہو اتنی آسانی سے الگ نہیں ہو سکتے۔'' انہوں نے اسے خود سے لپٹا لیا تھا۔

''پاپا جلد آنے والے ہیں، آپ کو ان سے ملواؤں گا بلکہ آپ دونوں ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔''

اس نے دھیمے سے کہا، وہ مسکرا دیے۔

''ضرور .. بس اب کچھ دن آرام کرو۔ میں جانتا ہوں جو تم نے کہا اور جس طرح تم نے اپنی ٹیم کو ہر ہر پل گائیڈ کیا یہ اتنا آسان نہیں تھا۔ کچھ دن سکون کا سانس لو، پھر نئے مشن کا سوچنا، میری دعائیں اور محبتیں تمہارے ساتھ ہیں۔''

اس قدر محبتوں کے بعد وہ یہاں سے جانے کے خیال سے چڑ چڑا ہو رہا تھا اور خود بھی نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے عاشر نے تو اس کا جملہ بھی ہوا میں اڑا دیا تھا البتہ خولہ نے بغور اسے دیکھا تھا۔

طارق محمود تو اس کی کیفیت سمجھ رہے تھے اس لیے فوراً اس کی بات کی تائید کی۔

''کاشف ٹھیک کہہ رہا ہے، تمہیں اب اپنی ذمہ داری محسوس کرنا ہوگی میرا بازو بننا ہوگا۔''

''بھلا عاشر نے کب انکار کیا ہے، یہ اب وہی کرے گا جو اس کل باپ کرتا رہا ہے۔'' نانو کی حتمی بات پر سب کے چہرے مسکراہٹ سے کھل اٹھے تھے۔

کاشف کا سیل فون وائبریٹ کر رہا تھا اس نے سائیڈ پاکٹ سے نکال کر چیک کیا اور سب سے ایکسیوز کرتا ہوا فون کان سے لگا کر باہر نکل گیا۔

یہ اس کا معمول تھا وہ بھی کسی کے سامنے فون ریسیو نہیں کرتا تھا البتہ اس وقت راجہ طارق محمود اور عاشر عباس نے بیک وقت نگاہوں سے تعاقب کیا تھا۔

عاشر نے آڑو کا ایک ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا کشمالہ ہاتھ دھونے گئی تھی ابھی تک نہیں آئی تھی۔ اسے کچھ کمی سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اٹھ کر باہر آ گیا۔

کچن میں کوئی نہیں تھا، لابی خالی تھی اور لاؤنج میں بھی ملگجا سا اجالا۔

''کیا وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔'' اس نے بے اختیار سوچا اور لابی کی طرف قدم بڑھا دیے وہ سیڑھیاں عبور کر کے اوپر جانا چاہتا تھا تب ہی اسے برآمدے کے دوسرے سرے پر سایہ سا محسوس ہوا۔

''کاشف تو لابی کے دوسرے کونے پر تھا، پھر یہاں کون بیٹھا تھا۔''

وہ واپس برآمدے کی طرف مڑ گیا۔

اور پہلی بار اس نے بالکل بچوں والی حرکت کی تھی۔

''ہاؤ۔'' کر کے کشمالہ کو ڈرایا تو وہ دو قدم اچھل کر پیچھے ہٹ گئی۔ آواز عاشر کی تھی مگر وہ ایسا مذاق بھی کر سکتا ہے یہ بات سمجھ سے باہر تھی۔

''آپ نے مجھے ڈرا ہی دیا۔'' مرکری لائٹ کی روشنی میں اس کا چہرہ دمک رہا تھا اور آنکھوں میں پورے چاند کی چاندنی چمک رہی تھی۔

''میں آپ کو ڈرانے ہی آیا تھا۔ وہاں سب آپ کو ڈھونڈ رہے ہیں اور آپ یہاں۔'' عاشر نے کرسی کھینچ کر اپنے بازو اس پر ٹکا لیے اور نظریں کشمالہ کے چہرے پر جما دیں۔

شریر بڑی بڑی آنکھیں۔ کشمالہ کو اپنا پوسٹ مارٹم کرتے ہوئے محسوس ہو رہی تھیں مگر فرار کی ساری راہیں مسدود تھیں

''اور آپ یہاں کیوں آ گئے۔ اب سب ہم دونوں کو ڈھونڈتے ہوئے یہاں آ جائیں گے کتنی بری بات ہے۔'' دانشمندی تو ورثے میں ملی تھی نا۔

''اس میں بری بات کیا ہے ڈھونڈنا یا یہاں آنا۔'' وہ بھی حاضر جواب ہو گیا تھا یہ بات کشمالہ کو اچھی طرح پتا چل گئی تھی۔

''ایک بات پوچھوں آپ سے؟'' عاشر اس کی اجازت لینے والی ادا پر مغرور سا ہو گیا تھا۔

''اگر جواب طلب ہوئی تو ضرور جواب دوں گا ورنہ میری خاموشی ہی۔۔''

''جی جانتی ہوں۔ آپ کی خاموشی بہت سارے سوالوں کا جواب ہوتی ہے۔ آپ کو ہماری مما سے کوئی شکایت، کوئی گلہ تو نہیں، آپ انہیں معاف کر دیں اور آپ اپنی مما کو بھی معاف کر دیں۔'' اس نے ڈرتے ڈرتے کہا تھا۔

''میں آپ کی مما سے کبھی بھی ناراض نہیں تھا اور نہ ہی مجھے ان سے کوئی شکایت تھی، مجھے تو آپ دونوں سے چڑ تھی، آپ لوگوں سے شکوے گلے تھے۔ آپ کی مما تو بابا جان کی غمگسار تھیں، تنہائی کی

ساتھی اور وہ بھی انتہائی مختصر مدت کے لیے۔

اور ایسے لوگ تو مقدر سے ملتے ہیں، ان سے شکوہ نہیں انہیں پیار کیا جاتا ہے۔" وہ بلا کا سنجیدہ تھا کشمالہ کو اس لمحے وہ ہو بہو راجہ طارق محمود کا عکس لگا تھا انہیں کی طرح مختصر اور گہری باتیں کرنے والا۔

"اور جو گلے شکوے ہم سے تھے کیا وہ ختم ہو گئے، دل صاف ہو گئے۔۔" اس کی نظریں جھک گئیں کیونکہ وہ ان نظروں کی حدت کا سامنا نہیں کر سکتے تھی۔

"یہ تو آپ اپنے دل سے پوچھیں نا , کیا آپ کو آنکھیں پڑھنا نہیں آتیں۔" یہ کہہ کر حیرت انگیز طور پلٹ گیا تھا۔اب کشمالہ کے سامنے اس کی پشت تھی، چوڑی مضبوط اور نا قابلِ تسخیر۔

اس کا دل چاہا بہت چپکے بہت حق کے ساتھ ان مضبوط شانوں پر اپنا سر رکھ دے۔

ان لمحوں کو گواہ بنا کر اپنی ساری شدتوں کا اقرار کر لے مگر تمام بے قراریوں پر حیا کے تقاضے ایک پل میں غالب آ گئے تھے۔اس نے خود کو سرزنش کی

"تو کیا جو آنکھوں میں لکھا ہے، وہ سچ ہے۔" عاشر اس کے جواب کا منتظر تھا جب ہی رخ موڑے کھڑا رہا اس آواز آنے تک۔۔ جو بہت دیر کے بعد کہیں دور سے برآمد ہوئی تھی۔

"اور جو میں پہلے دن سے آنکھوں میں پڑھ رہا ہوں۔۔وہ۔۔" اس نے الٹا سوال داغ دیا تھا، کشمالہ سٹپٹا کر رہ گئی اپنی آنکھوں سے تو گلہ اسے ہمیشہ سے ہی رہا جن میں سب سچ جھوٹ لکھا نظر آ جاتا تھا۔

وہ تو اس لمحہ موجود کی طرح سچ ہے' رات کے اس خاموش پہر کی طرح حقیقت ہے وہ تو میری زندگی کا سب سے بڑا ارمان ہے"۔اس نے لفظوں کی امانت کو اس کے امین تک پہنچانے کا سوچا تو خود بہ خود دل کی بات زبان پر آ گئی۔

"تو پھر اس لمحہ موجود سے پوچھ لیں تا کہ ان آنکھوں میں اسے اس وقت کون نظر آ رہا ہے"۔

وہ ڈرامائی انداز میں پلٹا تھا اور کشمالہ کے سامنے آ کر چہرہ جھکا لیا تھا۔

یہ سب کچھ اتنا غیر متوقع تھا کہ نہ اس کے پاس بھاگنے کا کوئی موقع تھا اور نہ ہی اس حملے سے بچنے کا۔ وہ بالکل اس کے سامنے تھا اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا اور وہی بیٹھتی چلی گئی۔ عاشر کا جاندار قہقہہ اس کی سماعتوں سے ٹکرا رہا تھا۔

''بس یا کچھ اور.....'' اس نے پوچھا تھا پھر اس کے قدموں کی چاپ کشمالا کو دور جاتے محسوس ہوئی تھی۔ اس نے سر اٹھایا' وہ پھر لمحے بھر کو پلٹا تھا۔

''بزدل.....'' یہ اگلا جملہ تھا۔

وہ اتنا کچھ بول سکتا تھا اتنا بولتا تھا۔ کشمالہ اس انکشاف پر ہی نڈھال ہو گئی تھی۔

کبھی خوابوں کی طرح آنکھ کے پردے میں رہو
کبھی خواہش کی طرح دل میں بلا لیں تم کو

☆.....☆.....☆

رنگا رنگ کہانیوں سے سجا، خوبصورت اور دلکش

سوہنی ڈائجسٹ

SohniDigest.Com

اگر آپ بھی لکھ رہے ہیں اور اُردو قارئین کی تلاش میں ہیں تو اپنی کہانیاں Inpage میں کمپوز (ٹائپ) کر کے پورے اعتماد کے ساتھ سوہنی ڈائجسٹ میں بھیجئے۔ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔

ابھی sohnidigest@gmai.com پر ای میل کریں۔

آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا' محکمہ موسمیات والے موسلا دھار بارش کی پیشن گوئی کر چکے تھے۔

''اگر آج بارش ہوئی نا تو تمہاری خیر نہیں۔'' گھوم پھر کر صوفیہ کے کانوں میں یہ جملہ پڑتا تو وہ بس مسکرا کر رہ جاتی۔

اب بھلا موسم اگر سازش پر آمادہ تھا تو اس کا کیا قصور۔

بار بی کیو کا انتظام' مہندی کے کھیل تماشے کے لیے لان سجایا گیا تھا تو کسی نے اس سے مشورہ تھوڑی کیا تھا۔ ورنہ وہ تو یہ ہی کہتی کہ ساون کا مہینہ لگا ہوا ہے ایسا نہ ہو کہ برس جائے مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنے۔

سب ہی اس شادی کو یادگار بنانے کے ہنر اور حربے آزما رہے تھے۔

بیوٹیشن اس کے دونوں ہاتھوں کو بازو تک دلکش ڈیزائن سے مزین کرنے کے بعد اب پاؤں پر محنت کر رہی تھی اور وہ کسی اسٹیچو کی طرح بس اس کے رحم و کرم پر تھی۔

''پلیز مجھے کوئی پانی ہی پلا دے۔'' بڑی دیر بعد انعم نظر آئی تو اس نے صدا لگائی۔

''دلہنیں پانی نہیں پیتیں' کوئی اور کام بولو''۔

وہ کہیں سے پھولے سانسوں کے ساتھ تھکی ہاری آ رہی تھی فوراً مکر گئی۔

''مر جاؤ''۔ سلگ کر منہ سے نکلا۔

''پلیز ابھی نہیں کم از کم تمہارے ولیمہ تک سارے سوٹ ریڈی ہیں۔ اس کے بعد''۔ وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بیڈ پر دراز ہو گئی۔

تم کون سے پہاڑ کھود کر آ رہی ہو۔ آخر تم لوگ اتنے کانشس کیوں ہو رہے ہو کیا مہندی دوسرے گاؤں سے آ رہی ہے''۔

تم چپ کرو' تمہیں کیا پتا شادی زندگی میں ایک ہی بار ہوتی ہے اب دولہا' دلہن ایک گھر میں ہوں

یا الگ الگ شہروں میں رسمیں ساری ہونی چاہئیں''۔

انعم نے بی اماں کی طرح لیکچر جھاڑا تھا۔ بیوٹیشن نے بڑا سا سر اثبات میں ہلا دیا۔

میں آپ کی بات سے اتفاق کرتی ہوں''۔

''ساری دنیا کر لیتی ہے مگر یہ چڑیل.....'' انعم اسے پیار سے دیکھنے لگی۔

دلہناپے کا خوب روپ آیا تھا اس پر' ویسے بھی پیلے جوڑے میں ابٹن سے دھلی دلہن کا روپ ہی انوکھا ہوتا ہے' شجاع نے کہا تھا۔

''مجھے ایسی ہی دلہن دے دو' جب میرا جی بھر جائے گا پھر اسے عروسی جوڑا پہنا دینا''۔

جس پر پرثمرہ آپی نے زوردار دھپ کمر پر لگائی تھی۔

''مفت کا مال ہے نا''۔

''یہ کیا بات ہوئی مفت کا مال۔ مال تو اپنا ہے نا اب ایسے دیکھو یا ویسے''۔ وہ کہاں چوکنے والا تھا۔

''بس کچھ دن کے ناز نخرے ہوتے ہیں اس کے بعد تم مردوں کے دل سے سب سے پہلے بیوی اترتی ہے''۔

''یار آپی' عادل بھائی اتنے برے انسان تو نہیں' آج تک آپ کے لیے پاگل ہیں روز شام کو صرف آپ کو دیکھنے کی خاطر مسکن کا چکر لگاتے ہیں''۔

شجاع ان کا اکثر ریکارڈ لگاتا اور وہ سرخ گلاب کی طرح کھل جاتیں۔

انہی شرارتوں میں آج مہندی کا دن آن پہنچا تھا جس کا سارا اہتمام لان میں کیا گیا تھا۔ باربی کیو کے لیے بھی جگہ مختص تھی۔ غزل نائٹ کے لیے بھی ساز و سامان منگوایا گیا تھا۔ ایسے میں بادل گھر گھر آ رہے تھے اور گھر کے بڑے اپنے بچوں کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار دیکھ کر بہت محظوظ ہو رہے تھے۔ کسی حد تک صوفیہ بھی بڑوں کا ساتھ دے رہی تھی اس کا من نہیں تھا اس سارے ہنگامے کے ساتھ مگر محض

اپنے دل کے لیے اتنے سارے لوگوں کی خوشیوں اور خواہشوں کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی تھی۔

بیوٹیشن بہت محنت اور دلجمعی کے ساتھ صوفیہ کے ہاتھ پیر سجا رہی تھی اور انعم رشک بھری نگاہوں سے اس کے ہاتھوں کی فنکاری کو سراہ رہی تھی۔

''یار مجھے بھی یہ سیکھنا ہے۔ یہ تو آرٹ ہے' زبردست کام ہے''۔ وہ شاید سب سے چھپ کر بیٹھی ہوئی تھی اس لیے پھولے سانس بحال کر کے بیوٹیشن کے برابر میں دھرنا دے کر بیٹھ گئی تھی۔

ہاں کوئی کام رہ نہ جائے تمہارے ہاتھوں سے''۔

''ارے یار کیمرہ کدھر ہے میں ابھی آئی۔'' اچانک ہی اسے یاد آیا اور وہ ایک ہی جست میں دروازہ عبور کر گئی۔ جاتے جاتے وہ راحت بیگم اور ان کے ساتھ آنے والے اجنبی چہرے سے ٹکرائی بھی مگر اس نے کہاں دھیان دینا تھا۔ مہندی اختتام کو پہنچ رہی تھی اور وہ ویڈیو بنانا بھول گئی تھی۔

اس کے تعاقب میں صوفیہ نے دروازے کی طرف نگاہ کی تو واپس پلٹنا بھول گئی۔

''سعدیہ! تم۔'' بے اختیار اس نے اٹھنا چاہا مگر پاؤں بیوٹیشن کے قبضے میں تھے۔

''ایکسکیوزمی پلیز''۔ اس نے بیوٹیشن کو لجاجت سے کہا۔

''بس ایک منٹ''۔ وہ اپنی حیرت اور بے چینی پر قابو نہیں رکھ سکی تھی راحت بیگم کے چہرے پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی سعدیہ کو دیکھ کر اس کی حیرت لازمی تھی خود راحت بیگم بھی ابھی تک اسی طرح حیران تھیں۔

سعدیہ اس سے لپٹ گئی تھی۔

سعدیہ کے لیے خود یہ سب کچھ غیر متوقع تھا' اس کا خیال تھا کہ صوفیہ کی شادی ہو چکی ہوگی مگر جب وہ یہاں پہنچی تو راحت بیگم کے ساتھ اس ہنگامے نے اس کا استقبال کیا۔ نعمان بھی کچھ کنفیوز سا ہو گیا لیکن اب تو دونوں آ چکے تھے دروازے پر پہنچ کر جب انہوں نے راحت بیگم سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو وہ خوش اخلاق سا نوجوان ان دونوں کو لے کر ان کے کمرے میں آ گیا اور راستے میں یہ بھی بتا

دیا کہ" صوفیہ کی شادی ہے اور اگر بارش ہوگئی تو خیر نہیں اس کی' یہاں لان میں بٹھا کر نہلا دوں گا اسے"۔

سعدیہ کے تو پاؤں ویسے ہی من من کے ہو رہے تھے پھر صوفیہ کی شادی اور اتنے سارے لوگوں کا سامنا کرنے کا سوچ کر ہی ہتھیلیاں نم ہوگئی تھیں مگر راحت بیگم جس تپاک سے ملیں جتنے تحمل سے انہوں نے نعمان کا مدعا سنا اور سعدیہ کو گلے لگا کر ہر خدشے کو مٹانے کے ساتھ نعمان کو بالکل بے فکر رہنے کی تاکید کی اس کے بعد کسی حد تک سعدیہ کا اعتماد بحال ہو گیا تھا اور اب وہ صوفیہ کے گلے لگ کر رو رہی تھی۔

کل وہ اپنے شکستہ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر روئی تھی' دل کا غبار کچھ کم کیا تھا اور آج اس نے باقی کے سارے آنسو صوفیہ کے کندھے پر بہا دیے تھے۔ پھر راحت بیگم نے ہی دونوں کو الگ کیا۔

"یہ تمہارا اپنا گھر ہے اور یہ سب لوگ جو تمہیں اجنبی لگ رہے ہیں دیکھنا تھوڑی دیر کے بعد ایسا لگے گا جیسے بچپن سے تمہارے ساتھ ہیں کوئی پریشانی ہو بلا جھجک کہہ دینا۔" راحت بیگم نے اسے اپنے ساتھ لگا کر بھرپور انداز میں تسلی دی ماتھے پر پیار کیا۔

وہ جانتی تھیں کہ جس ماحول میں اس کی پرورش ہوئی ہے وہاں اس نے زندگی برتنے کا سلیقہ نہیں سیکھا بلکہ زندگی سے بغاوت کے کئی روپ اس کے ذہن میں آتے ہوں گے انہیں سعدیہ کے چہرے پر صاف لکھا نظر آ رہا تھا کہ کچھ لوگ نفسانی خواہشات میں الجھ کر غلط فیصلہ نہیں کرتے بلکہ رنگ خوابوں کی تکمیل کا اشتیاق ان کے قدموں کو انجان راستوں پر ڈال دیتا ہے۔

"مجھے کیا پتا تھا تمہاری شادی ہے' مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا پاگل ہوں میں ہمیشہ غلط ہی ہوتا ہے مجھ سے سب لوگ کیا سوچیں گے"۔ راحت بیگم کے جانے کے بعد وہ روتے ہوئے بولی۔

"پاگل تو تم ہو۔ تمہیں یاد ہے جب تم نے مجھ سے فون پر بات کی تھی تو میں نے اس وقت بھی تم سے کہا تھا آ جاؤ میرے پاس اور تم نے اس وقت میری نہ سن کر غلطی کی تھی۔ اب تم نے سب سے اچھا کام کیا ہے جس پر میں بہت خوش ہوں"۔ صوفیہ کی خوشی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ بیوٹیشن منتظر تھی

کب پاؤں دوبارہ اس کے سامنے آئیں۔

''تمہیں پتا ہے اگر مجھے نعمان نہ ملتا تو شاید آج میں پاکستان میں کیا اس دنیا میں ہی نہ ہوتی تو پتا نہیں وہ منحوس آدمی مجھے کہاں لے کر جا رہا تھا لیکن میں نے سوچ لیا تھا جیسے ہی موقع ملے گا اس منحوس آدمی کے پستول سے خود کو گولی مار لوں گی''۔

اچھا بس اب ساری تلخ باتیں بھلا دو ہم فرصت سے ساری باتیں کریں گے تم چینج کر لو یہاں سامنے والی وارڈ روب میں میرے سوٹ پریس کیے رکھے ہیں جو اچھا لگے پہن لو میں جب تک اس مشکل سے فارغ ہو جاؤں''۔

اس نے وارڈ روب کی طرف اشارہ کیا ملگجے سے رنگ کے لباس اور سیاہ چادر میں وہ کچھ زیادہ ہی مضمحل اور نڈھال لگ رہی تھی اور صوفیہ نہیں چاہتی تھی کوئی بھی اس سے ہمدردی کرے اسے دیکھ کر انہیں یاد آئے کہ وہ یہ وہ لڑکی ہے جس کے گھر سے جانے کا قصہ عام ہوا تھا۔

''میں اپنے ایک دو جوڑے لائی ہوں' ادھر تائی کے کمرے میں شاپر رکھا ہے صوفیہ''۔

''چپ کرو۔ بس جو میں کہہ رہی ہوں وہ کرو یہاں تمہاری ایک نہیں چلے گی''۔

وہ پھر سے اتنی عنایتوں پر شرمسار ہونے لگی نعمان کی یہ دوسری مہربانی تھی جو وہ اسے یہاں لے آیا تھا اس نے دل ہی دل میں نعمان کے لئے ڈھیر ساری دعائیں مانگ ڈالیں۔

''اللہ اس کو محفوظ رکھے اور سیدھے راستے پر بھی''۔

''اور یہ نعمان مجھ سے کیوں نہیں ملا' جب یہاں آ ہی گیا تھا تو' اس کا نمبر تو ہوگا نا تمہارے پاس میں ابھی بات کرتی ہوں اس سے۔ پتا ہے اس گھر میں اگر کسی کو یاد کیا جا سکتا ہے تو صرف نعمان ہے سچا کھرا مضبوط آدمی''۔

صوفیہ نے کھل کر تعریف کی تو سعدیہ کو حیرانی سے ہوئی۔

وہ صوفیہ کی بات سے انکار نہیں کر سکتی تھی اور اگر وہ نعمان کی تعریف کر رہی تھی تو پھر اس میں کچھ تو تھا ایسا جو یاد رکھا جاتا اسے بھی بار ہا مشکل میں گھر کا کوئی بندہ یاد نہیں آتا تھا سوائے نعمان کے اور اسے حیرت بھی ہوتی تھی کہ اس لمحے وہ نفاق اور عناد کہاں چلا جاتا تھا جو بچپن سے دونوں کے درمیان موجود تھا شاید سعدیہ نے جس چیز سے سے بیر باندھا تھا اس کی روک ٹوک تھی اور اسے آج آ کر احساس ہو رہا تھا کہ وہ روک ٹوک تو اس کی بھلائی کے لئے تھی اس گھر میں ماں باپ کے بعد اس کا سب سے بڑا خیر خواہ نعمان تھا۔

''وہ اب بھی ویسا ہی ہے' بد دماغ اور صاف گو یا پھر تھوڑا بدل گیا ہے''۔ صوفیہ نے دلچسپی سے پوچھا تو اس کے چہرے پر بھولی بھٹکی سے مسکراہٹ آ گئی۔

''پتا ہے نا میری سب سے زیادہ لڑائی اسی کے ساتھ ہوتی تھی لیکن سچ بتاؤں مجھے سب سے زیادہ یاد بھی اسی کی آئی''۔ اس نے سادگی سے اعتراف کیا

''اوہو یہ تو کسی اور ہی جذبے کے آثار ہیں سعدیہ'' صوفیہ نے معنی خیزی سے کہا

''مجھے تو بس اتنا پتا ہے میں اس کی مقروض ہو گئی ہوں' مجھے تو ساری زندگی کے لیے اس کی غلامی منظور ہے''۔

وہ آج بھی وہی سعدیہ تھی منہ پھٹ' سوچے سمجھے بغیر بولنے والی' صوفیہ بے اختیار ہنس پڑی بہت دنوں کے بعد وہ یوں کھل کر ہنس رہی تھی۔ سعدیہ نے قدرے شرمندگی سے اسے دیکھا۔

''تم کیوں اتنا ہنس رہی ہو''۔ بالآخر وہ جھنجھلا گئی۔

''بس میرا دل چاہ رہا ہے ہنسنے کا۔

سوچ رہی ہوں ایک پاگل پاگل سی لڑکی اور ایک پاگل پاگل سا لڑکا کیسے لگیں گے''۔

''دیکھو تم غلط سوچ رہی ہوں ایسا کچھ نہیں ہے میں اس کے کیا اب شاید کسی کے بھی قابل نہیں'

میں اب کسی کی زندگی برباد نہیں کر سکتی صوفیہ"۔

"بے وقوف لڑکی! تم کیا ہو؟ کون ہو؟ تمہیں کیا کرنا ہے؟ اب یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے اگر نعمان تمہیں امی کے حوالے کر کے گیا ہے تو اس نے یہ فیصلہ کچھ سوچ کر ہی کیا ہوگا۔ اب تم بالکل بے فکر ہو جاؤ تمہارے لئے سب اچھا ہوگا۔ کیونکہ یہ مسکن کی ریت ہے یہاں کسی کے ساتھ زیادتی نہیں ہوتی اور نہ ہی حق تلفی ہوتی ہے۔

انجوائے کرو اور بالکل ریلیکس ہو جاؤ' میں امی سے کہتی ہو وہ تمہاری اچھی شاپنگ کروا دیں آخر کو مابدولت کی واحد چچازاد ہو تم جو اس کی شادی میں شریک ہو رہی ہو' جاؤ جا کر اپنی پسند کے دو دن سوٹ لے لو"۔

صوفیہ نے فٹ سے سارا پروگرام ترتیب دے دیا تھا سعدیہ ممنونیت سے اسے دیکھنے لگی کتنی پرسکون کتنی پُر اعتماد تھی وہ خوشی' شرارت اور دلفریب سی چمک اس کے چہرے سے پھوٹ رہی تھی۔

سعدیہ کا دل چاہ رہا تھا وہ بولتی رہے اور وہ سے دیکھتی رہے۔

"کیا جنہیں زندگی میں سب کچھ مل جاتا ہے وہ اتنے ہی مسرور اور پرسکون ہو جاتے ہیں کہ ان کا چہرہ اس تکمیل کی گواہی دینے لگتا ہے یا پھر جو لوگ اللہ کی دی گئی نعمتوں پر صبر و شکر ادا کرتے اور اپنی زندگی کا ہر فیصلہ اس کی رضا پر چھوڑ کر بس انتظار کرتے ہیں اور اس انتظار میں بھی ان کے لب شکر کا کلمہ پڑھتے ہیں"۔ وہ خود سے پوچھ رہی تھی اور اسے جواب بھی مل رہا تھا جو لوگ صبر اور آسودگی کے لئے اللہ کی رضا کے متمنی ہوتے ہیں ان کے اندر کی طمانیت چہرے کی دلفریبی اور دلکشی میں ڈھل جاتی ہے۔

"میں ان لوگوں میں سے کیوں نہیں.....؟" اس نے بے اختیار دعا کی۔

بیوٹیشن صوفیہ کی مہندی مکمل کر چکی تھی اب اگلے حکم کی منتظر تھی۔

"سعدیہ! چلو نا چینج کر لو۔ کن سوچوں میں گم ہو گئیں' سوچتی رہنا بعد میں فرصت سے نعمان کو پہلے یہ مہندی لگوا لو' ورنہ جیسمین اس کمرے سے چلی گئی تو پھر ہاتھ نہیں آئے گی۔

تم ابھی میری کزنز سے ملی نہیں ہو شاید' سب نے بازو بھر بھر کر مہندی لگوانے کا پروگرام بنایا ہوا ہے مجھے تو جیسمین پر ترس آ رہا ہے کتنا تھک جائے گی۔''

صوفیہ نے خود ہی اٹھ کر اسٹائلش سا نیوی بلیو گولڈن کنٹراسٹ کا سوٹ اس کے حوالے کیا۔

''واش روم ادھر ہے' نو سستی اب۔'' ایسا لگ رہا تھا وہ برسوں سے ساتھ رو رہی ہوں' اسی کمرے میں' اسی گھر میں سعدیہ اس کے ہاتھ سے ہینگر لے کر واش روم کی طرف چلی گئی۔

صوفیہ نے انٹرکام ملایا۔ دوسری طرف عائزہ تھی۔

''تم جلدی سے میرے پاس آ جاؤ بہت ضروری کام ہے''۔ سعدیہ کی شاپنگ کے لیے امی سے زیادہ' عائزہ مناسب ہے اس نے سوچا اور اپنی الماری کے لاکر کی طرف بڑھ گئی۔

☆.....☆.....☆

منیر کمال کو فتح جھنگ کے پاس سے اسپیشل کرائم برانچ کی پولیس نے گرفتار کیا تھا اس کے ساتھ ایک لڑکی کی اطلاع نے کاشف کو اچنبھے میں ڈال دیا تھا اسے جب اطلاع ملی تھی تو اس کے ذہن میں سب سے پہلے کسی کاروباری عورت کا خیال آیا تھا منیر کمال کے ساتھ کوئی شریف عورت کیسے ہو سکتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی قسمت ایسے لوگوں پر خوب مہربان ہوتی ہے' مریم' شمائلہ اور اب قدسیہ۔

اسے آسمان اپنے سر پر گرتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

وہی سیاہ چادر کی اوٹ سے جھانکتی آنکھیں' وہی پر اعتماد مگر حیا سے بوجھل چہرہ۔ اس نے بمشکل خود کو یقین دلایا تھا کہ پولیس کسٹڈی میں اس وقت منیر کمال کے ساتھ قدسیہ ہے۔

وہ لمحوں میں گئے دنوں کی بازگشت سن کر حال میں پلٹا تھا۔

مختصر سے وہ دن مگر یادوں میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئے تھے' اسے کبھی کبھی وہ چمکتا ہوا دن بہت یاد آتا تھا جب اس نے قدسیہ کو دیکھا تھا' وہ بہت مختلف سی لڑکی تھی بڑی سی سیاہ چادر اس کا اعتماد تھی

اور اس کا لہجہ وہاں کی ہر لڑکی سے مختلف تھا بلا کا مہذب شائستہ اور اہل زبان جیسا۔

قدسیہ کی والدہ بیمار نہ ہوتیں تو شاید اس کے بارے میں کبھی بھی کچھ نہیں پتا چلتا حالانکہ اس نے خود تو کبھی کچھ کھل کر نہیں بتایا تھا مگر جو ادھوری کہانی سماعتوں سے گزری تھی اس کے بعد کاشف کو خاصی مایوسی ہوئی تھی اسے دکھ ہوتا تھا بار ہا یہ سوچ کر کہ لوگ اپنی ہیرا صفت بیٹیاں جانے کیوں ایسے پردیسیوں کے حوالے کر دیتے ہیں جن کی اپنی قسمت کا فیصلہ اغیار کے ہاتھوں میں ہوتا ہے ان کے اپنے پاؤں اپنی زمین پر مضبوطی سے جمے نہیں ہوتے تو وہ بھلا دوسروں کا سہارا' دوسروں کا سائبان کیسے بنیں گے۔

اس نے خلوص دل سے قدسیہ کو دعا دی تھی کہ وہ اپنی تقدیر کے جس روشن ستارے کی منتظر ہے وہ جلد از جلد اس کی زندگی کو محبتوں کی رفاقتوں کی روشنی سے ہمکنار کر دے اور اس کی تنہائی کا ساتھی اس کے سارے درد سمیٹ لے مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی دعا قبول ہوگی تو قدسیہ کو امتحان کا سامنا کرنا پڑے گا۔

''شاید قدسیہ کو کچھ بھی نہیں پتا''. اس نے ایک گہری سانس لی۔

''مجھے اس لڑکی سے اکیلے میں ملنا ہے. جاؤ لے کر آؤ''۔

اس نے ڈیوٹی آفیسر کو اشارہ کیا۔

تھوڑی دیر کے بعد قدسیہ اس کے سامنے تھی اور ڈیوٹی آفیسر کمرے سے باہر جا چکا تھا صرف باہر دروازے پر ایک اہلکار پہرہ دے رہا تھا۔

گہری خاموش رات میں دو نفوس ایک دوسرے کی سانسوں کی آہٹ بہ خوبی سن سکتے تھے۔

قدسیہ گرفتاری سے زیادہ کاشف کیانی کے اس روپ پر حیران تھی وہ تو شاید کوئی ڈاکیومنٹری میں کرتا' اور اپنی ایک دور پورٹس کی تیاری کے دوران اس نے قدسیہ کی مدد بھی لی تھی۔ وہ یہاں کیا کر رہا تھا؟ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید اس کی طرف سے پہلا سوال یہ ہوتا' مگر اس وقت وہ مجرم کے کٹہرے میں تھی اور کاشف کیانی کو اپنی تفتیش مکمل کرنی تھی۔

اسے اتنا تو اندازہ ہو گیا تھا کہ منیر کمال کو کسی شک و شبے میں گرفتار نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کی گرفتاری باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت ہوئی جس طرح اسے پولیس کی بھاری نفری کے ساتھ یہاں لایا گیا تھا اس کے بعد قدسیہ کو اپنا آپ گہرے پاتال میں گرتا ہوا محسوس ہوا تھا' پھر جب کاشف سے سامنا ہوا اور جس طرح کی باتیں اس نے منیر کمال سے کی تھیں رہی سہی ہمت اس وقت جواب دے گئی۔

اس وقت کاشف کچھ پوچھتا بھی تو اس کا حلق خشک ہو چکا تھا مگر نہ جانے وہ کیوں اتنا خاموش تھا۔

اسے وحشت ہونے لگی۔

اس خاموشی سے' اس تاریک رات سے اور اس ویران تھانے کے پراسرار کمرے سے۔

ایک ہی بلب روشن تھا اور اس کے پیلی زرد روشنی نے کاشف کے چہرے کی اپنائیت کو بھی دھندلا کر دیا تھا یا پھر جو کچھ وہ دیکھنا چاہتی تھی وہاں ایسا کچھ نہیں تھا۔

کاشف کیانی کے سامنے بس ایک مجرم کی ساتھی عورت بیٹھی تھی ہلکی ہلکی ٹھنڈک اور خوف کے باوجود اس کے پاؤں سے پسینہ پھوٹ پڑا ہتھیلیاں نم ہونے لگیں۔

اسے پتہ بھی نہیں چلا کب آنسو پلکوں کی باڑ توڑ کر سیاہ چادر کے دامن پر آ گرے۔

ایک' دو' تین پھر تو برسات ہی شروع ہو گئی تھی کاشف کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ کہاں سے شروع کرے کیا پوچھے۔ کاش کہ وہ خود ہی بولنا شروع ہو جائے مگر وہاں آنسوؤں کے سوا کچھ نہ تھا وہ بے بسی سے اسے دیکھنے لگا۔

''یہ شخص کب سے آپ کے ساتھ ہے؟'' وہ پھٹ پڑا اور اسے اپنی آواز ضرورت سے زیادہ بلند لگی۔

''میں نے اس شخص کو پندرہ دن پہلے کبھی نہیں دیکھا' مجھے بس اس کا نام پتا تھا اور اپنی بدنصیبی کا.....''

وہ بھی اسی انداز میں قدرے چیخ کر بولی فرسٹریشن دونوں طرف برابر کی تھی' کرب بھی ایک جیسا تھا۔

''آپ کو پتا ہے یہ کون ہے' آپ کو پتا ہے اس کا پس منظر۔ آپ کو پوری دنیا میں کوئی اور نہیں ملا

تھا۔'' کاشف کا ملال کم نہیں ہو رہا تھا۔

''یہ سوال آپ مجھ سے نہ کریں اس کا اختیار میرے پاس کبھی نہیں تھا میرا بھائی زندہ ہے اس سے پوچھ لینا یا میری مری ہوئی ماں کو آواز دیں جنہیں اپنی اکلوتی بیٹی کے لیے کوئی امیر کبیر چاہیے تھا جو اسے سکھ بھری زندگی دیتا جو اس کو تکلیفوں بھرے شب و روز سے دور لے جاتا''۔

یہ کوئی اور قدسیہ تھی' ہاری ہوئی' تھکی ہوئی۔ یہ قدسیہ اس سیاہ چادر والی لڑکی سے بالکل مختلف تھی جس کے اعتماد کے سامنے کاشف اور عاشر دونوں ہی مرعوب ہونے پر مجبور ہو گئے تھے۔

کاش زندگی کے فیصلے محض دولت اور حیثیت کو معیار بنا کر نہ ہوا کریں دولت تو انسان کے اپنے عمل و فضل سے بھی آ جاتی ہے اور کردار کی دولت اللہ کی رضا اور مہربانی سے ملتی ہے۔

آپ نے کچھ تو پوچھا ہوتا۔ یوں ہی بلا سوچے سمجھے بوریا بستر باندھ کر ایک اجنبی شخص کے ساتھ چل پڑیں قدسیہ۔''

قدسیہ کو اب جا کر اس پہلے والے کاشف کی جھلک نظر آئی تھی اس نے بھی اپنے حوصلے کو مجتمع کیا اور وہ تمام شب و روز من و عن کاشف کے گوش گزار دیے جو منیر کمال کے ساتھ اس کی رام کہانی سنتے گزرے تھے۔

''بکواس کرتا ہے۔ سالا۔ جھوٹا۔ بدمعاش۔'' جذبات کی رو میں بہہ کر وہ جانے کتنا کچھ بول جاتا مگر یکدم قدسیہ کی موجودگی کا احساس ہوا تو شرمندہ سا ہو گیا۔

''آئی ایم سو سوری۔''

''اٹس او کے۔ میں نے سنے ہیں اس طرح کے جملے بھی منیر قوال کے منہ سے اور اس وقت میں نے صرف اپنی تقدیر سے گلہ کیا تھا۔'' وہ اب اپنے آنسو پونچھ رہی تھی۔ رو رو کر اس نے اپنی آنکھیں اور چہرہ سرخ کر لیا تھا۔ کاشف کو اس پر ترس آ رہا تھا اور وہ اپنے فرائض کے آگے مجبور تھا جب تک باقی

قانونی تقاضے پورے نہیں ہو جاتے اسے لاک اپ میں رکھنا اس کی مجبوری تھا۔

''اف پتا نہیں صبح کب ہوگی۔'' بیاختیار قدسیہ کی آواز بلند ہوئی تھی اور کاشف نے حیرانی سے دیکھا وہ بھی تو اس وقت یہی سوچ رہا تھا۔

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ جلدی سے صبح ہو جائے آئے تو ایٹ لسٹ میں آپ کو یہاں سے تو شفٹ کروں۔

آئی ایم سوری قدسیہ جب تک میں قانونی کارروائی پوری نہ کرلوں میں آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکتا۔ منیر کمال جس قماش کا آدمی ہے وہ اتنی آسانی سے آپ سے دستبردار نہیں ہوگا۔ ابھی پتا نہیں وہ کتنے ڈرامے کرے گا' آپ نے اس کا ایک ہی روپ دیکھا ہے' آپ کا مظلوم اور مہربان شوہر۔ میں آپ کو اس کے بہت سارے رشتوں سے ملواؤں گا۔ اس کی دو ینگ بیٹیاں بھی ہیں اور ایک عدد بیوی۔ خاصی مشہور خاتون ہیں شاید آپ نے نام سنا ہو۔ شمائلہ کمال وہ بھی بند ہے عورتوں کی اسمگلنگ کے الزام میں۔

اور بھی نہ جانے کتنے دھندے ہیں۔ جو لوگ انسانوں کے بیوپار ہوں انہیں ڈرگ سپلائر کہنا چھوٹا لفظ لگتا ہے۔ لمبی فہرست ہے' فرصت سے بتاتا ہوں آپ کو اور اس سلسلے میں آپ کا گھر بھی زیر تفتیش آئے گا۔ تو پلیز آپ کو بہت حوصلے سے کام لینا ہوگا۔ آپ کا نام بھی اچھلے گا لیکن سچ جانیے قدسیہ! آپ کو جس دلدل سے اللہ نے بچایا ہے اس کے سامنے یہ کچھ بھی نہیں اور میں جانتا ہوں آپ بہت حوصلے والی خاتون ہیں اللہ اپنے پیارے بندوں کو ہی آزمائش کے لئے چنتا ہے''۔

وہ اتنا کچھ بول رہا تھا قدسیہ پھر سے رونا شروع ہوگئی تھی اتنے آنسو تو شاید گھر چھوڑتے ہوئے بھی نہیں بہائے تھے شاید لاشعور میں کہیں جلد لوٹ آنے کا یقین موجود تھا۔

''قدسیہ پلیز آپ بالکل نہیں روئیں گی اب۔ مجھے کچھ کام نہیں نبٹانے ہیں اور آپ کو کچھ دیر مزید منیر کمال کے ساتھ رہنا ہے لیکن میرے اور آپ کے درمیان جو بھی بات ہوئی آپ اس کا بالکل بھی ذکر

نہیں کریں گی۔ میرا خیال ہے مجھے آپ کو مزید سمجھانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

کاشف نے قریب آ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا ہوہ یکدم کھڑی ہوگئی۔

"آپ میرا یقین کریں یہ وقتی تکلیف ہے جلد دور ہو جائے گی اللہ انصاف کرنے والا ہے جب آپ بے قصور ہیں تو سزا آپ کو نہیں ملے گی مگر جو سزا پر قادر ہے وہ ان کو کبھی نہیں معاف کرتا جو اس کی ذات کو بھلا کر خود کو نعوذ باللہ خدا سمجھنے لگتے ہیں اور ہر فیصلہ اپنے اختیار میں لے لیتے ہیں۔ یہ کھلنڈرا سا بندہ اتنی دانائی کی باتیں بھی کر لیتا تھا قدسیہ کو حیرت ہوئی تھی۔

اس کا سر جھکتا چلا گیا اس کے پاس کوئی راستہ نہیں تھا سوائے صبر اور انتظار کے' پہلا انتظار تو اس رات کی صبح کا تھا۔ یہ شاید اس کی زندگی کی طویل ترین رات تھی جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی کاشف کا موبائل بلنک کر رہا تھا۔ اسکرین پر عاشر کا نام چمک رہا تھا۔ وہ ایکسکیوز کر کے باہر آ گیا اور قدسیہ کی نظریں دروازے کے باہر کھڑے سنتری سے الجھ گئیں۔ کاشف نے اسے کچھ اشارہ کیا تھا اور وہ اندر آ گیا۔

☆.....☆.....☆

"تمہاری ملاقات آئی ہے' میرے ساتھ آؤ۔" وہ حیران سی اس کی شکل دیکھ رہی تھی۔

بھلا اس سے ملنے کون آ گیا تھا۔

"کیا منیر۔" اس کا دل دھڑکا۔

میں نے کہا تھا نا یہ لوگ مجھ سے زیادہ دیر غافل نہیں رہ سکتے آخر کو ان کی ضرورت ہوں میں۔"

اس نے ہمیشہ کی طرح تکبر سے سوچا اور بالوں میں ہاتھ پھیرتی ہوئی اس کے پیچھے ہولی۔

دل میں کافی حد تک اطمینان اتر آیا تھا مگر یہ طمانیت وقتی تھی کیونکہ ملاقاتی کو دیکھ کر اس کے چہرے کے خدوخال پر زلزلے کے آثار نمودار ہوئے تھے یہ وہ ملاقاتی نہیں جس کا انتظار تھا اس کے

سامنے راجہ طارق محمود کھڑے تھے وہی کروفر وہی شان اور وہی خوبصورت آنکھیں۔ بس ایک لمحے کو اس کی طرف اٹھی تھیں اور پھر جھک گئی تھیں ایسے لگا جیسے سانسیں بند ہو رہی ہوں۔

''تم حیران ہونا اور تمہیں ہونا بھی چاہیے کہ کیونکہ میں ان لوگوں میں سے نہیں جو تمہیں اس قید سے نکال لے جائیں گے''۔

وہ آج بھی اس آواز کے طلسم سے باہر نہیں آئی تھی' اکثر رات کی تنہائی میں اسے طارق محمود کی سرگوشی تنگ کرتی تھی ان کی آواز کی گھمبیرتا اسے منیر کمال سے نفرت کرنے پر مجبور کرتی تھی۔

وہ اس وقت ان کے سامنے کھڑی تو تھی مگر دل چاہ رہا تھا بس قدموں میں بیٹھتی چلی جائے کیونکہ پورے جسم میں سے جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔

اس نے کبھی نہیں سوچا تھا زندگی کے اس موڑ پر سامنا ہوگا بھی تو اس مغرور آدمی سے جس نے اس کے اولین جذبوں کو قبولیت کی سند دی تھی جو اس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد تھا جس نے اس کے پور پور سے محبت کی تھی جو اس کے انگ انگ کو نزاکت سے چھوتا تھا۔ لیکن اسے یہ خاموش پرستش اچھی ہی نہیں لگتی تھی شاید ان دنوں اسے منیر کمال جو مل گیا تھا جو اس کے وجود کو ببانگ دہل سراہتا تھا جو علی الاعلان اسے احساس دلاتا تھا کہ وہ قدرت کا حسین شاہکار ہے۔ آج وہی قدرت کا حسین شاہکار اپنے شکستہ وجود کے ساتھ راجہ طارق محمود کے سامنے کھڑا ماضی کے دنوں کو یاد کر رہا تھا جب زندگی خوبصورت اور خواب مٹھی میں قید تھے۔

اس کی نگاہیں بس راجا طارق محمود کے چہرے پر جمی تھیں اور انہوں نے اسے صرف ایک بار نگاہیں اٹھا کر دیکھا تھا۔ شاید یہ نفرت کے انتہا تھی یا اس کی بے بسی کو دیکھنے کا حوصلہ نہیں کر پائے جو کچھ بھی تھا۔ شمائلہ کی آنکھیں سلگنے لگیں۔

''میں تم سے ہمدردی کرنے آیا ہوں اور نہ ہی تمہاری ماضی کی غلطی کو دہرانے کے لئے آیا ہوں۔

میں نے تمہیں محبت سے باندھنے کی کوشش کی تھی میں تمہیں کی قید نہیں کر سکا خالہ جان کو آج تک اس بات کا رنج ہے۔"

اپنے ماں کے ذکر پر اس کی پوری آنکھیں کھل گئی تھیں۔

"مجھے نہیں پتا تم نے خسارے کا سودا کیا یا تمہیں وہ سب کر کے کیا ملا لیکن مجھے اتنا پتا ہے کہ عاشر سے دستبردار ہو کر تم نے میری زندگی پر سب سے بڑی مہربانی کی تھی۔" عاشر کے نام پر وہ تڑپ اٹھی تھی۔

پتا نہیں کیوں وہ آدھی ادھوری باتیں کر کے اس کا امتحان لے رہے تھے۔

"کیسا ہے وہ میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں اس سے ملنے کے لیے تڑپ رہی ہوں۔" وہ بے ساختہ بول پڑی۔

"وہ خوش ہے اپنی زندگی میں مگن ہے اسے اب کسی کی بھی ضرورت نہیں وہ بہت مضبوط ہے اس کی فکر بالکل نہ کرو۔" وہ تلخی سے بولے پہلی بار ان کے سپاٹ لہجے میں کوئی تاثر ابھرا تھا۔

وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی شاید اب وہ اس پر برسیں اسے جھنجھوڑیں اسے احساس دلائیں کہ وہ کتنی غلط تھی اور اس کے غلطی نے انہیں بھی زندگی بھر بے چین رکھا وہ آج بھی خوش فہمی میں مبتلا تھی اور آج بھی راجہ طارق کو اپنے لیے پاگل دیکھنا چاہتی تھی واہ رے حضرت انسان تیری ہر ادا نرالی

کاتب تقدیر کو اپنے بندے کی ادا پر کوئی بھی فیصلہ کرنے میں مشکل نہیں ہوتی۔ محض اس کی ہٹ دھرمی اور ناشکرے پن کے باعث۔

"لیکن مجھے تو اس کی ضرورت ہے وہ آج میرے کام نہیں آئے گا تو کب آئے گا۔" وہ چیخ ہی تو پڑی حسب عادت فرسٹریٹ ہو کر۔

"اوہ ہاں۔ میں تمہیں یہ ہی تو بتانے آیا تھا شاید یہ تمہاری زندگی کی سب سے بڑی خبر ہوں اور میرے خاندان کے لیے خوشخبری۔ تمہیں پتا ہے منیر کمال گرفتار ہو گیا ہے اپنی ایک اور بیوی کے ساتھ۔"

اس کے سر پر بم پھٹا تھا' شمائلہ کو پہلی بار راجہ طارق کا چہرہ سفاک لگا تھا شاید وہ ناسٹلجیا سے باہر آئی تھے یا اس نے کھلی آنکھوں سے ان کو دیکھا تھا۔ دونوں ہی باتیں ہضم ہونے والی نہیں تھیں۔

''یہ سچ ہے شمائلہ کمال! میں نے تمہیں ایک دفعہ کہا تھا کہ دعا کرو میرا تمہارا زندگی میں سامنا نہ ہو اور اگر سامنا ہو بھی تو میرے پاس تمہیں دینے کے لیے کچھ نہ ہو ورنہ میں تمہیں تمہاری زندگی کا سب سے بڑا خسارہ دوں گا۔

اور دیکھو قدرت نے میری یہ خواہش کتنی جلدی پوری کر دی' آج تم بھی میرے سامنے بے بسی کی تصویر بنی کھڑی ہو اور جس کے بل بوتے پر تم نے کی زندگیاں داؤ پر لگا دی تھیں وہ بھی بالکل اسی طرح اپنے لئے اگلے حکم کا منتظر ہے۔'' اس کے سامنے کوئی مہربان شخص نہیں کھڑا تھا۔ وہ کسی بھربھری دیوار کی طرح گرتی چلی گئی تھی۔

آہا۔ وہ کتنی خوش فہم تھی وہ تو سوچ رہی تھی کہ زندگی میں جب بھی طارق محمود اس کے سامنے آئیں گے تو اسے دیکھ کر اس سے مل کر اپنے ادھورے پن کا ملال ضرور کریں گے تب وہ بھی اعتراف کرے گی کہ وہ ان سے دور تو چلی گئی تھی مگر انہیں ہمیشہ خون کی طرح رگوں میں دوڑتا ہوا محسوس کیا۔ وہ اب بھی یہ اعتراف کر لینا چاہتی تھی لیکن ذہن ماؤف اور زبان مفلوج وجہ سی ہو گئی تھی۔

''تمہارا ایک اور ساتھی پاکستان سے باہر جا چکا ہے مگر انٹرپول کارروائی کر رہی ہے۔'' یہ آخری کیل تھی۔ وہ منیر کمال کی منتظر تھی وہ سرمد بخاری کی منتظر تھی اسے پتا تھا یہ دونوں اسے قید سے ضرور چھڑا کر لے جائیں گے اپنے مطلب کے لئے مگر اب یہ آخری ''امید'' بھی دم توڑ گئی تھی اب کچھ باقی نہیں رہا تھا۔

وہی سیلن زدہ دیواریں' وہی کھردرا فرش اور وہی حبس آلود دن رات۔ اسے اپنا دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا تب بھی وہ وہ ہسٹریائی انداز میں چیخنے لگی تھی۔

''مجھے ایک بار عاشر کی شکل دکھا دو' مجھے کوئی تو اس سے ملوا دے' مجھے اماں کے پاس لے چلو مجھے

ان سے معافی مانگنی ہے' مجھے پتا ہے انہوں نے مجھے معاف نہیں کیا دل سے' ان کو کہو میری مشکل آسان کر دیں مجھے معاف کر دیں۔''

راجہ طارق محمود حیرت سے فرش پر بیٹھی بھکارن نما عورت کو دیکھ رہے تھے جو کبھی حسن و دلکشی کا شاہکار ہوا کرتی تھی اور جسے خود پسندی' نفس پرستی اور تکبر نے کہیں کا نہیں رکھا تھا۔

☆.....☆.....☆

رات ٹوٹ کر ساون برسا تھا' گرمی کی لہر ٹوٹ گئی تھی اور نانو کا درختوں میں گھرا ہوا یہ گھر اس وقت خوبصورت سبزے کی لپیٹ میں تھا۔ وہ دونوں ٹیرس پر کھڑیں موسم کی دلکشی پر تبصرہ کر رہی تھیں تب ہی ایک میٹرو کیب آ کر رکی۔

اس میں سے خزیمہ کو اترتے دیکھ کر خولہ تو غیر محسوس طریقے سے ریلنگ سے دور چلی گئی تھی جبکہ کشمالہ نے کوشش کی کہ کسی طرح وہ اوپر دیکھ لے تو اسے یہیں بلا لے مگر وہ روش سے سیدھا اندر چلا گیا تھا۔ نانو' پاپا یقیناً لاؤنج میں تھے وہ نیچے جانے کے بجائے خولہ کی طرف آ گئی جسے خزیمہ کی آمد پر چپ سی لگ جاتی تھی۔

''کیا سوچ رہی ہو۔''

''کچھ نہیں۔'' وہ واقعی کچھ نہیں سوچ رہی تھی بس دیکھ رہی تھی اردگرد زندگی کے بڑے پیارے رنگ بکھرے ہوئے تھے اسٹریٹ کرکٹ اور وہ بھی بچوں کی۔ وہ بیساختہ مسکرا دی۔

سامنے جھگڑا شروع ہو گیا تھا

چلو نیچے چلے کشمالہ نے کہا

''تم چلو میں آتی ہوں۔'' وہ مگن تھی سامنے کے منظر میں.

تم خزیمہ سے کیوں بھاگتی ہوں خولہ۔ وہ سچا لڑکا ہے اس نے جو پہلے دن سے محسوس کیا تمہیں بتا

دیا ایسے لوگ اعتبار کے قابل ہوتے ہیں بلکہ زندگی کا ساتھی بنانے کے لائق ہوتے ہیں۔"

"تمہیں پتا ہے مالا' کاشف بھی مجھے زندگی کا ساتھی بنانا چاہتا ہے۔"

"ہاں مجھے اندازہ ہے کاشف انٹرسٹڈ ہے لیکن میں _ سچ بتاؤں کاشف بہت اچھا ہے ہمارا پیارا دوست اس نے ہمارے لیے وہ کیا جو شاید کوئی نہیں کر سکتا۔ آج وہ شخص بھی سلاخوں کے پیچھے ہے جو ہماری زندگیوں کو تماشا بنا کر خود زندگی کے مزے لیتا رہا اور یہ سب کاشف نے ہی تو کیا ہے۔ لیکن پھر بھی کہیں کچھ مسنگ ہے خولہ!

"تمہیں کاشف کی آنکھوں میں زندگی نظر آئے گی' بھرپور زندگی اور خزیمہ کی آنکھوں میں اپنا آپ دیکھ سکتی ہو تم۔ اب فیصلہ تمہارے دل کی آنکھ نے کرنا ہے دیکھو زندگی ہمیں ایک بار ملتی ہے کیا خزیمہ کو دیکھ کر تمہارے اندر کوئی احساس نہیں جاگتا۔"

"یار مالا تجھے پتا تو ہے' مجھے تو کاشف کو دیکھ کر بھی کچھ نہیں ہوتا۔" وہ اب ریلنگ چھوڑ کر ٹہلنے لگی تھی اس بار اس کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں تھیں اور کشمالہ دل سے دعا گو تھی کہ وہ اپنے حق میں کوئی بہتر فیصلہ کر لے اور اس کے لئے خزیمہ سے بہتر کوئی نہیں تھا۔

"میں نے خزیمہ کا پوچھا ہے۔" وہ مصر ہوئی

"پتا نہیں میں نے اس بارے میں بھی ابھی سوچا نہیں۔" وہ اس موضوع سے گریزاں تھی۔ کشمالہ مسکرا دی۔

"تجھے اب سوچنا ہوگا ورنہ پاپا خود سوچ لیں گے۔"

اور میرے خیال میں پاپا جو سوچیں گے وہ سب سے بہتر ہوگا مجھے ان کا ہر فیصلہ منظور ہے۔" اس نے گویا ہاتھ اٹھا دیئے تھے۔ کشمالہ کے چہرے پر طمانیت کے رنگ بکھر گئے۔

شاید اس کشمکش میں سب سے بہتر یہی تھا کہ فیصلے کا اختیار اس شخص کے ہاتھ میں دے دیا جاتا جو

ان کی زندگی پر سب سے زیادہ حق رکھتا تھا اور جو انہیں سب سے زیادہ جانتا تھا۔

''تجھے پاپا کا ہر فیصلہ منظور ہوگا نا پچھتائے گی تو نہیں۔'' کشمالہ اس کے سامنے آ گئی

''پتا ہے مالا! میں خود کنفیوز ہوں۔ میں نے کوشش کی ہے اس بارے میں سوچنے کی لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا' مجھے دونوں ہی پاگل لگتے ہیں' ایک بولتا ہے ایک لکھتا ہے اب کس کی مانوں۔ وہ ہنس پڑی۔

''اس لیے تم پاپا کو کہہ دینا وہ جو کہیں گے مجھے منظور ہوگا۔ اب ہر کوئی تیری طرح لکی تو ہوتا نہیں کہ آیا، اس نے دیکھا اور فتح کر لیا۔''

وہ اسے دیکھنے لگی جہاں عاشر کے تصور نے شرمیلے سے رنگ بکھیر دیے تھے۔

''ویسے مالا! تجھے اس کی سب سے اچھی بات کیا لگتی ہے؟''

''مجھے اس کی بس ایک ہی بات اچھی نہیں لگتی کہ وہ بہت ''انٹروورڈ ہے''، مجھے اپنے ہر سوال کا جواب اس کے چہرے پر ڈھونڈنا پڑتا ہے۔'' وہ سادگی سے بولی۔

''تو کیا بولنے والے لوگ زیادہ اچھے ہوتے ہیں؟''

''تو اور کیا۔ زندگی سہل ہو جاتی ہے۔ غصہ آیا تب بول دیا، پیار کیا تب بول دیا، یہ کیا کہ سوچتے ہی رہو، اس وقت حضرت کس فریم آف مائنڈ میں ہیں۔''

''تو پھر سوچ لے، بہت مشکل ہو جائے گی۔'' خولہ نے ڈرایا۔

''بہت سوچا، صرف اتنا سمجھ آیا محبت یا تو ہمیں بدل دیتی ہے یا اپنے روپ میں ڈھال لیتی ہے۔ پھر کوئی میں، تم نہیں رہتا۔ بس ایک رشتہ بن جاتا ہے اور وہ ہے روح کا۔''

کشمالہ بہت مطمئن تھی۔ اب تو اس راستے پر چلنا ہی تھا اس یقین کے ساتھ کہ راحت ہو یا مشکل ایک دوسرے کا سایہ بنے رہنا ہے۔

''اچھا اب نیچے چلو، خزیمہ کو کافی دیر ہو گئی ہے آئے ہوئے اور مجھے پتہ ہے اس کی نظریں سب

سے پہلے تمہیں ڈھونڈتی ہیں۔"

کشمالہ کی بات پر وہ مسکرا دی تھی، بے نیازی اپنی جگہ مگر فطرت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

☆.....☆.....☆

"میں سعدیہ سے شادی کر رہا ہوں، اگر آپ لوگوں کو کوئی اعتراض ہے تو بتا دیں اور نہیں ہے تو وہ بھی بتا دیں، میں اسے گھر لے آتا ہوں، ورنہ وہ بہت اچھی جگہ پر ہے، محفوظ اور مطمئن۔"

نعمان نے گویا اپنی ماں کے سر پر دھماکا کیا تھا۔ کمرے میں بیٹھے باقی لوگ بھی ساکت ہو گئے تھے۔ چچا چاچی کے لیے تو شاید تائی سے بڑا دھماکا تھا۔ کتنی دیر تک کوئی کچھ بول ہی نہیں سکا۔ البتہ سفیر کو توقع تھی کہ اس طرح کا طبل جنگ جلد بجے گا۔

"تو جس باپ کی اولاد ہے، تیرے یہ لچھن نہیں ہوں گے تو اور کیا ہوگا۔ وہ تو مر گیا مگر میرے لیے عذاب چھوڑ گیا۔" تائی کو بہانہ چاہیے ہوتا تھا انہیں کوسنے کا۔ نعمان کو اس قسم کے ردعمل کی توقع تھی۔ وہ بس انہیں خاموشی سے دیکھنے لگا۔

"مجھے پہلے ہی پتہ تھا باپ مرے گا تو اولاد میرے سینے پر مونگ دلے گی۔"

"اچھا ہوا وہ مر گیا اب سکون سے ہوگا، میں اچ کہتا ہوں اماں اگر زندگی میں آپ نے انہیں سکون دیا ہوتا تو وہ ایسی موت کبھی نہ مرتے۔"

وہ بڑے تحمل سے گویا ہوا۔ سفیر نے حیرت سے اپنے چھوٹے بھائی جو دیکھا۔ بے شک وہ باہ کے زیادہ قریب رہا لیکن فیصلہ کرنے کی خوبی نعمان کے اندر آ گئی تھی۔

"ارے اور کس طرح سکھ دیتے ہیں، لیکن دیکھو انعام کیا ملا، مرتے مرتے بھی ساری زندگی کی بدنامی میرے حصے میں ڈال گیا۔" وہ اچانک ہی رونے لگی تھیں۔ اب پتہ نہیں غم مرنے کا تھا یا بدنامی کا۔ سفیر اٹھ کے ان کے پاس آ گیا۔

''اماں بس کرو۔ رونے سے نہ وہ واپس آئیں گے نہ کی ہماری قسمت بدلے گی۔ جو ہونا تھا ہو چکا، اب اس وقت ان باتوں کا نہیں۔ میرے خیال میں نعمان نے جو فیصلہ کیا ہے ٹھیک کیا ہے۔ آپ چچا چاچی سے باقاعدہ رشتہ مانگ لیں۔ گھر کی تو بات ہے اور ویسے بھی سعدیہ گھر سے بھاگی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ حالات ایسے ہو گئے تھے کہ وہ گھر واپس نہ آسکی۔'' نعمان نے ممنونیت سے سفیر کو دیکھا۔ اس نے یہ رائے پہلے ہی ہموار کی ہوئی تھی۔ چچا چاچی کو یوں لگ رہا تھا ان کی بیٹی کا نہیں کسی اور کی زندگی کا فیصلہ ہو رہا ہے۔ وہ پہلو پر پہلو بدل رہے تھے۔

''تو کیا داغ لگی لڑکی ہی رہ گئی میری بہو بننے کے لیے۔''

تائی کی سفاکی میں کمی نہ آئی تھی۔ چاچی کا دل چاہا صاف انکار کر دیں مگر پھر سعدیہ کا کیا ہوتا۔ اسے کون قبول کرتا۔ اس کے ساتھ جڑی کہانی نے اس کی زندگی برباد کر دی تھی۔ نعمان نے تو امید کی کرن روشن کی تھی۔ وہ انہیں ہر حال میں قبول تھا۔

''ٹھیک ہے آپ آج بھی انہی دکھوں کو لے کر بیٹھی رہیں۔ آپ کو کبھی سمجھ نہیں آئے گی کہ آپ کی انہی کڑوی باتوں نے یہاں سب کی زندگی کو تلخ بنائے رکھا۔ آپ نے کبھی کسی کے لیے اچھا سوچا ہی نہیں۔ میرا خیال تھا ابا کی موت کے بعد آپ کو احساس ہوگا کہ زندگی کے ساتھ آپ کے منفی رویے نے کسی کو سکھ نہیں دیا۔ مگر اماں وقت بدل جاتا ہے فطرت نہیں بدلتی۔ آپ رہتی رہیں اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد میں۔ شاید کبھی آپ کو سمجھ آجائے۔ اور چچا چاچی اگر آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اس کام میں دیر مت کریں۔ یہ سعدیہ کے حق میں بہتر ہے اور اس کے بعد میں یہاں اس شہر میں نہیں رہوں گا۔ میں نے انتظام کر لیا ہے بس آپ اپنا فیصلہ سنا دیں۔''

وہ حیران پر حیران کیے جا رہا تھا۔ سارے بڑے فیصلے وہ کر چکا تھا۔ اب وہ صرف گھر والوں کو اطلاع دے رہا تھا۔ چچا کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ سعدیہ کی زندگی بن رہی تھی۔ اس کا گھر آباد ہو رہا

تھا۔ نعمان جیسا بھی تھا قابل بھروسہ تھا۔ اس نے کبھی گھر کے کسی بندے کو اپنے عمل سے تکلیف نہیں پہنچائی تھی۔ وہ کیا کرتا تھا کیا کماتا تھا۔ سعدیہ کو کتنی اچھی زندگی دے سکتا تھا۔ چچا کو اس وقت ان باتوں سے سروکار نہیں تھا۔ ان کے لیے اس کا اعتماد ہی کافی تھا۔ اگر سعدیہ کی قسمت میں نعمان کے ساتھ کا سکھ لکھا ہے تو پھر کوئی طاقت رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ انہوں نے آگے بڑھ کر نعمان کو گلے لگا لیا۔ پہلی بار وہ اپنی بھاوج کے خلاف جا کر فیصلہ کر رہے تھے۔

''جاؤ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں اللہ تم دونوں کو سکھی رکھے۔'' چاچی کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ ان کی لاڈلی بیٹی کی زندگی کا فیصلہ آناً فاناً ہو گیا تھا اور اس لمحے وہ اسے گلے بھی نہیں لگا سکتی تھیں۔

تائی حیران پریشان کبھی ایک کو دیکھ رہی تھیں تو کبھی دوسرے کو۔

''اماں! مان جائیں نا۔'' سفیر نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''میرا وعدہ ہے میں اپنی شادی صرف آپ کی پسند سے کروں گا۔'' وہ مسکرا دیا۔

''جاؤ تم نے بھی جو کرنا ہے کرو۔ میرا دماغ مت کھاؤ۔ جب اسے اپنی ماں کی پروا نہیں تو

''انہیں ایک اور دکھ یاد آ گیا تھا۔ نعمان، چچا کے اشارے پر ماں کے پاس آ گیا۔ اور پھر چچا چاچی بھی ان کے قریب چلے آئے۔

''اماں کبھی کبھی دل کی بھی مان لیتے ہیں۔'' صاف چوٹ کر رہا تھا۔ سفیر نے گھور کر دیکھا۔

''بھاوج! جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے اسے ہم میں سے کوئی نہیں ٹال سکتا۔'' وہ بس اتنا ہی بول پائے تھے کہ ٹوک دیا گیا۔

''تم چپ کرو۔ ساری زندگی دوسروں کی سنتے آئے ہو۔ پہلے مجھے سعدیہ سے ملواؤ تو، میں پوچھوں تو اس سے کہاں مر گئی تھی۔ کسی کی عزت کا بھی سوچا تھا اس نے یا سب مر گئے تھے اس کے لیے۔''

یہ ان کی رضامندی کا واضح اشارہ تھا۔ سفیر نے اطمینان کی سانس لی۔ نعمان رخ پھیر کر مسکرا دیا۔

اماں کی ناراضی کے ساتھ وہ بھلا کب خوش تھا۔ ماں تو ماں ہوتی ہے نا وہ کتنی ہی بری عورت کیوں نہ ہو مگر اسے تخلیق کا درد سہنے کا انعام مل ہی جاتا ہے۔

''میں اسے لے آؤں گا۔ اماں اب ایک اور آخری بات کہوں گا وہ بھی مان لینا۔'' اس نے لگے ہاتھوں اگلا مدعا بھی بیان کرنا چاہا مگر تائی نے جوتا اٹھا لیا۔

''چل دفع ہو پیسوں کی بات کی نا مجھ سے تیرے باپ کی قبر پر جا کر بیٹھ جاؤں گی۔''

ماں پیسوں کی بات نہیں ہے۔ اچھا چل غصہ اتر جائے تو پھر بتا دوں گا۔''

وہ ماحول پر چھائی کدورت اور بدمزگی کم کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہو گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

قدسیہ پر نہ کوئی الزام ثابت ہوا تھا اور نہ ہی دو ہفتوں کے ساتھ سے زیادہ وہ منیر کمال کو جانتی تھی۔ منیر کمال سے اس کا نکاح نو سال پہلے ہوا تھا۔ جس کی شرعی حیثیت سوالیہ نشان بن گئی تھی۔ قدسیہ اب منیر کمال سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتی تھی اس نے آج تک اپنے کسی بھی قسم کے حقوق ادا نہیں کیے تھے سوا سے فیصلہ کرنے میں

کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔ اس نے تمام تر صورتحال کو کاشف کے سامنے رکھ کر اس سے مدد مانگی تھی۔ پتہ نہیں کیوں کاشف کے ذہن پر ایک بوجھ سا تھا۔ وہ قدسیہ سے بات کرنے کے بعد اس کا فیصلہ سننے کے بعد ہلکا ہو گیا۔ قدسیہ منیر کمال سے باقاعدہ خلع لے کر آزاد ہونا چاہتی تھی۔

''ارے یار میں طلاق نامہ اس کے سامنے رکھ دیتا ہوں اس کا باپ بھی سائن کرے گا۔'' کاشف کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں تھا۔

کاشف کی کوششوں کے باعث اسے ایک رات سے زیادہ تھانے میں نہیں گزارنا پڑی تھی اب وہ اور عاشر دونوں اس کے سامنے بیٹھے تھے اور یہ گھر تھا نانو کا جہاں وہ رات ہی مہمان بنی تھی۔ مہمان خدا

کی رحمت ہوتے ہیں اور نانو رب کی اس مہربانی پر ہمیشہ خوش رہتی تھیں۔ زندگی ہمیں بیشہ گردش میں رکھتی ہے اس نے کب سوچا تھا کہ کبھی عاشر کی نانو سے ملے گی۔ اس کے بابا سے ملے گی۔ نانو نے اس کی بے بسی سن کر بے اختیار اسے گلے لگایا۔ ایک مدت بعد اس کے اندر سکون سا بھر گیا تھا کسی ماں کے سینے سے لگ کر۔ ان کا دل بھی ان کے گھر کی طرح

بہت بڑا تھا۔ انہوں نے کہا تھا" بیٹیاں رحمت ہوتی ہیں۔ اللہ نے میرا گھر رحمت سے بھر دیا ہے"۔ پھر وہ دو حسین پری نما لڑکیاں، اس کا دل چاہا اس کے سامنے بیٹھی رہیں اور وہ دیکھتی رہیں دونوں ایک دوسرے کا عکس تھیں مگر چہرے کی ملاحت اور شرارت سے پہچان لی جاتی تھیں۔

کاشف نے دیر نہیں لگائی تھی ایک راز سے پردہ اٹھانے کی۔

عاشر اور کشمالہ۔۔ قدرت کچھ لوگوں پر خاص انداز سے مہرباں ہوتی ہے اسے یقین ہو گیا روحوں کا ملن آسمان پر ہوتا ہے۔ پتا نہیں اس کے مقدر میں کیا لکھا تھا۔ شاید ساری عمر کا سفر یا کہیں کوئی قیام بھی تھا۔ اس نے ایک لمحے کو سوچا پھر مسکرا دی۔ منیر کمال جیسے شخص کے ساتھ سے تو ساری عمر کا سفر کہیں بہتر ہے۔

"میرا رب میرے حق میں ہمیشہ اچھا ہی کرتا آیا ہے۔" اور عاشر سوچ رہا تھا۔" قدسیہ سے دوبارہ ملنا بے مقصد تو نہیں ہو سکتا۔

☆.....☆.....☆

مہندی کا دن تو خیر و عافیت سے گزر گیا تھا بادل گھر گھر کر آتے رہے برسے نہیں۔ رات گئے تک مسکن کے لان میں محفل بھی رہی۔ سب تو لطف اندوز ہوئے ہی سعدیہ کے دل پر چھایا غبار بھی کم ہو گیا۔ دل کا بوجھ ہلکا ہونے کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ نعمان اس کے لیے شادی کی مناسبت سے سوٹ بھی لے کر آیا تھا۔ صوفیہ نے تو بے ساختہ اس کی چوائس کی تعریف کی تھی۔

''میں نے کہا نا یہ جو نظر آتا ہے وہ ہے نہیں۔''

تب وہ صوفیہ سے بھی ملا تھا، گئے دنوں کے لاابالی کھلنڈرے سے نعمان سے بالکل مختلف بلو جینز پر وائٹ ٹی شرٹ اور چھوٹے چھوٹے بالوں کے ساتھ وہ انتہائی شائستگی کے ساتھ بات کرتا ہوا صوفیہ کو حیران کر گیا تھا۔

''کوئی نیا رول پلے کر رہے ہو۔'' صوفیہ نے معنی خیزی سے پوچھا تھا۔

''فی الحال تو نئی کہانی لکھنے جا رہا ہوں، دعا کیجیے گا۔'' اس کی مسکراہٹ میں کچھ تھا ایسا کہ صوفیہ کی نگاہیں سعدیہ سے جا ملیں وہ بھی انہیں ہی دیکھ رہی تھی۔

''آل دا بیسٹ۔ جہاں بھی میری مدد کی ضرورت ہو ضرور بتانا۔'' اس نے خلوص دل سے کہا۔

''یقیناً آپ کی مدد اور رہنمائی کے بغیر کچھ نہیں ہوگا اور اگر آپ برا نہ منائیں تو ایک بات کہوں۔'' وہ اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

''آج تمہارا دن ہے بولو۔''۔

''آپ اس ڈریس میں بہت اچھی لگ رہی ہیں خاص طور پر آپ کی مہندی۔''

وہ جو محسوس کرتا تھا بول دیتا تھا یہ ہی اس کی سب سے اچھی عادت تھی۔ صوفیہ آداب بجالائی۔

''فکر نہ کرو تمہاری دلہن اس سے بھی زیادہ اچھی لگے گی۔ یہ جوڑا دولہا والے بھجواتے ہیں کیپ ان مائنڈ۔''

''جو حکم۔'' وہ ہنس پڑا اور سعدیہ بس خاموشی سے دونوں کے مکالمے سنتی رہی تھی۔ اور آج جب صوفیہ کی رخصتی میں تھوڑی ہی دیر باقی تھی اس کو احساس ہوا کہ وہ گفتگو بے مقصد نہیں تھی۔ تائی، سفیرا می، ابو اور نعمان اچانک ہی کہیں سے نمودار ہوئے تھے۔ نعمان ہی انہیں راحت بیگم کے پاس لے کر آیا تھا۔

وہ تو اس شادی میں بھرپور تیاری کے ساتھ شریک تھی اس کی سمجھ میں نہیں آیا کس طرح اپنے گھر

والوں کا سامنا کرے۔ البتہ تائی نے جب اسٹیج پر جا کر صوفیہ کے سر پر ہاتھ پھیرا تو اس کا خوف بھی قدرے اطمینان میں ڈھل گیا۔

یہ سب کچھ اتنا غیر متوقع تھا کہ مسکن کے مکین کتنی دیر تک کچھ بول ہی نہ سکے۔ راحت بیگم بھی خاموشی کی زبان میں یہ وقت خیر و عافیت سے گزر جانے کی دعا مانگتی رہی تھیں۔ اس وقت کھل سی اٹھی تھیں، منوں بوجھ اتر گیا اور آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

''کاش ندیم آپ میرے ساتھ ہوتے۔''

قیمتی سرخ لباس میں مدھری مسکراہٹ چہرے پر سجائے صوفیہ لگ بھی تو اتنی حسین رہی تھی کہ اس کے چہرے سے نظریں ہٹانا مشکل ہو رہا تھا اور پھر اس کے پہلو میں شہزادہ نما دولہا، اتنا مکمل منظر تھا کہ وہ بار بار ندیم کو پکارنے پر مجبور ہوئی تھیں لیکن اب یہ کسی حد تک پوری ہو گئی تھی۔ صوفیہ اپنی تائی، چاچا چاچی اور کزنز کے حصار میں تھی۔ انہوں نے خصوصی طور پر تصویریں بنوائیں۔ وہ ممنونیت سے فہیم چاچا کو دیکھنے لگیں۔

''کہنا سننا پھر کبھی۔ ہم چاہتے تھے کہ ندیم کی نشانی اپنوں کی دعاؤں کے ساتھ رخصت ہو، اس کا باپ نہیں تو کیا ہوا باپ جیسا تو ابھی زندہ ہے نا۔''

وہ ان کے الفاظ پر نہال ہو گئیں۔ کہنے سننے کی بھلا اب ضرورت ہی کیا تھی۔ تائی کے چہرے پر شکنیں کم تھیں۔ یہ ہی کافی تھا۔

یہ سعدیہ کو کہاں چھپا رکھا ہے، کس قدر بے مروت لڑکی ہے۔ گھر والوں کی بھی کوئی پروا ہے اسے۔''

تائی کا لہجہ قدرے نرم تھا البتہ لفظوں کے معاملے میں انہیں خود پر اختیار نہیں تھا۔

''وہ کہیں چھپ کر نہیں بیٹھی بس شرمندہ ہے آپ لوگوں سے۔'' راحت بیگم نے رسانیت سے کہا۔ نعمان بھی وہیں آ گیا۔

''اب شرمندہ ہونے کا کیا فائدہ۔'' چاچی کا چہرہ جھک گیا۔

''اب بھی کچھ نہیں بگڑا وہ میرے لیے صوفیہ کی طرح ہے میں اسے بھی اسی دھوم دھام سے رخصت کروں گی۔ آپ بس نعمان مجھے دے دیں۔'' راحت بیگم کا ظرف آج بھی سمندر جیسا تھا۔ سجے سجائے ہال میں ایک خاموش گوشے میں وہ ان لوگوں کے ساتھ محو کلام تھیں۔ مسکن کے مکین یہ منظر دیکھ کر حیرت کے دائرے سے باہر نکل آئے تھے۔ شجاع نے بھی صوفیہ کے ساتھ سرگوشیاں شروع کر دی تھیں۔

''میری حسین دلہن اب تو دل سے خوش ہے نا ایک مظلوم آدمی کا دل تو نہیں توڑے گی۔''

''شجاع! سدھر جاؤ یہ سب نے سن لیا ہے۔'' فائزہ نے احساس دلایا۔

''تو سن لیں۔ کوئی تو میرے حق میں دعا کرے گا۔''

''میں نے اس سے پہلے بھی آپ کا دل توڑا ہے؟'' یہ پہلی سرگوشی تھی سرخ آنچل کی اوٹ سے۔ شجاع کا چہرہ مزید جگمگانے لگا۔

''ظاہر ہے اچھی بیویاں اپنی چیزوں کی حفاظت دل و جان سے کرتی ہیں۔''

اور اچھی بیویوں کے شوہر کیا کرتے ہیں۔'' یہ انعم تھی جس نے اچانک آ کر جملہ اچک لیا تھا۔

''بس اپنی بیویوں سے پیار کرتے ہیں اور کیا کرتے ہیں۔'' شجاع کی زبان کو اب بریک نہیں لگ رہے تھے۔

صوفیہ نے سرخ حنائی ہاتھ اپنی گود میں رکھ کر جوڑ دیے۔ شجاع کو اس کی یہ شرمیلی سی ادا بہت پیاری لگی تھی اور چپکے سے اپنا ہاتھ اس کے دونوں ہاتھوں پر رکھ دیا تھا اس ایک لمس میں جذبوں کی حدت کے ساتھ محبت کا مان بھی تھا، زندگی بھی تھی اور زندگی گزارنے کے لیے مضبوط سائبان ہونے کا یقین بھی تھا۔

اس نے ذرا سا پہلو بدلا تھینکس کہا اور شجاع نے ہاتھ ہٹا لیا مگر انعم اتنا دلکش منظر کیمرے میں قید کر چکی تھی۔ ''آئی لو یو سو مچ''۔ وہ اپنے کیمرے کو چوم رہی تھی شجاع نے اس کی شرارت پر بے ساختہ قہقہہ لگایا تھا۔

لڑکے لڑکیوں کا ایک غول آخری گروپ فوٹو بنوانے کے لیے اسی پر وارد ہوا تھا ان میں سعدیہ اور نعمان بھی تھے۔

صوفیہ کو بہت اچھا لگا تھا۔ وہ نعمان کو آل دا بیسٹ کا اشارہ کر کے مسکرا دی تھی اور کچھ ایسے ہی تاثرات اس کے بھی تھے۔

☆.....☆.....☆

خالہ جان ہم سے دور جا کر خوش وہ بھی نہیں رہی اس وقت بھی وہ بہت تکلیف میں ہے۔ معاف کر دیں اس کو۔ کچھ تو اس کی تکلیف کم ہو گی۔'' ان کے ذہن میں فرش پر بیٹھی شمائلہ ثبت ہوئی تھی جب سے مل کر آئے تھے وہ بے چین تھے۔

''کیا میرے معاف کرنے سے اس کے گناہ کم ہو جائیں گے کیا ان لوگوں کی تکلیف ختم ہو جائے گی طارق جو اس کی وجہ سے برباد ہوئے۔''

ان کی آنکھیں نمکین پانیوں سے لبریز تھیں۔ اس کی تکلیف اور سزاؤں کا سن کر دل گہری کھائی میں جا گرا تھا۔ وہ جانتی تھیں شمائلہ کو اس کے اعمال کی سزا ملے گی کیونکہ دنیا مکافات کا گھر ہے مگر اتنی جلدی ان کی زندگی میں ہی اس کی آزمائش کا وقت آ جائے گا یہ انہیں اندازہ نہیں تھا۔

''خالہ جان۔ ہم سب نے اپنے حصے کا کام کرنا ہے باقی وہ اوپر بیٹھا ہے نا سزا اور جزا کے سارے فیصلے سنانے والا، اس کی رحمت کے خزانے میں کوئی کمی تو نہیں اور وہ سب سے بڑا معاف کرنے والا ہے۔'' طارق محمود اٹھ کر ان کے پاس چلے آئے ان کے ہاتھوں میں تسبیح لرز رہی تھی اور آنکھیں برسنا شروع ہو گئی تھیں۔

''خالہ جان! آپ نے چلنا ہے اس کے پاس۔ وہ دھیمے سے بولے۔

''نہیں۔ نہیں میں نہیں جاؤں گی مجھ سے اس کی عاقبت نا اندیش کی حالت بھلا کب دیکھی

جائے گی یاد ہے نا جب بجلی چمکتی تھی تو وہ سارے دروازے کھڑکیاں بند کر کے بیٹھ جاتی تھی۔"

وہ اس لمحے بہت کرب میں تھیں یہ بات راجہ طارق محمود سے بہتر کون جان سکتا تھا۔ مگر ان کے پاس اس ماں کے درد کا کوئی درماں نہیں تھا۔

"تم عاشر کو کہو مل آئے اس سے اور میرا پیغام بھی دے دے۔ معاف کر دیا ایک ماں نے اسے لیکن وہ اپنی عافیت کی دعا کرتی رہے رب کے حضور، دنیا تو ختم ہو جائے گی منزل تو وہ ہے جہاں گناہوں کا بوجھ اٹھا کر نہیں پہنچ سکتے اس کو بولو میں اس کے لیے دعا کروں گی۔" ان کی آواز کپکپا رہی تھی اور آنکھیں برس رہی تھیں۔ راجہ طارق محمود کو اندر باہر کا منظر ایک جیسا لگ رہا تھا جل تھل سا۔

"خالہ جان عاشر بہت ضدی ہے میں نے اس سے کہا تھا۔"

"ماں باپ کے ہوتے ہوئے اس نے یتیمی کا دکھ دیکھا ہے زندگی کے بہت سے دکھ سکھ تنہا کاٹے ہیں تمہارا خون ہے وہ، شمائلہ کا دودھ پیا ہے اس نے کچھ تو اثر ہو گا نا تم دونوں کی خصلتوں کا۔" ان کی بات پر وہ چپ سے ہو گئے۔

عاشر ان کی طرح انا پسند تھا تو اپنی ماں کی طرح ہٹ دھرم بھی وہ اسے کوئی الزام نہیں دے سکتے تھے۔ شمائلہ اس وقت بے رحم بن گئی تھی جب اسے ماں کی سب سے زیادہ ضرورت تھی وہ اگر آج بے رحمی کا مظاہرہ کر رہا تھا تو یہ فطرت کے خلاف نہیں تھا۔ وقت لگے گا اور وہ ٹھیک ہو جائے گا انہیں یقین تھا۔ کیونکہ وہ ان کا بیٹا تھا ان کے دل کے کسی تنہا گوشے میں

بھی تو شمائلہ کے ساتھ رفاقت کے کئی سال کنڈلی جمائے بیٹھے تھے جو ابھی بھی سر اٹھاتے تو بہت تکلیف ہوتی تھی۔

جب یہ تکلیف آنکھوں کے راستے باہر نکل جاتی تو راحت کی دھوپ اس کنڈلی والے سانپ کو کہیں چھپ جانے پر مجبور کر دیتی۔

وہ نانو کو روتا چھوڑ کر خود دریچے کے سامنے آ گئے۔ آج ان کی اپنی آنکھیں بھی تو بھیگ رہی تھیں۔ اندر باہر سب جل تھل تھا۔

☆.....☆.....☆

گرجتے برستے موسم میں آؤٹنگ اور ڈنر کی اختراع کسی ایک دماغ کی کارستانی نہیں تھی بلکہ وقت کا تقاضا تھا کہ اس موسم کا مزا لیا جائے اور پھر یہ دعوت قدسیہ کو انٹرٹین کرنے کے لیے بھی دی گئی تھی۔ یہ الگ بات کہ قدسیہ سے زیادہ وہ لوگ انٹرٹین ہو رہے تھے۔ عاشر نے خزیمہ کو بھی بلایا تھا۔

ڈنر کے بعد مال روڈ کی مٹر گشت اور پھر فیورٹ کافی ہاؤس کے خوشگوار سے ماحول میں کافی کا مزہ لینے کا آئیڈیا بھی اس کا ہی تھا۔

''آپ کیوں خفا ہو رہی ہیں، بارش ہو گی تو دیکھا جائے گا آپ کو کوئی نہیں بھیگنے دے گا۔'' نازک مزاج خولہ کی برہمی پر خزیمہ کی آفر حاضر تھی۔ بہت دن خاموش رہا تھا مگر اب اس کا ساتھ چپ نہیں رہنے دیتا تھا۔

''اصل میں اسے رات سے ٹمپریچر ہو رہا ہے یہ تو آنے کو بھی تیار نہیں تھی مگر کاشف کسی کی سنتا ہے۔''

کشمالہ نے اس کا دفاع کیا تو کاشف آداب بجالایا۔ ''یاد کرو گے تم لوگ ان دنوں کو جب کاشف نہیں ہو گا۔'' وہ معصوم سی شکل بنا کر بولا۔

''بکواس نہیں کرو ہم تمہارے ہوتے ہوئے بھی ان دنوں کو یاد کر لیں گے اس کے لیے تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔''

عاشر نے فوراً ہاتھ اٹھا کر تنبیہہ کی تھی کاشف کہیں چلا جائے اب یہ بات کسی کو بھی قابل قبول نہیں تھی۔ وہ اسی خاندان کا حصہ لگتا تھا۔

''مسافر کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا دوستو؟''

''تو کون منع کر رہا ہے کہ مسافر ٹھکانہ نہ بنائے ضروری ہے ساری دنیا کو اپنی ہتھیلی پر سمیٹا

جائے۔'' خزیمہ نے جرح کی۔

''کوشش کی تھی ٹھکانہ بنانے کی مگر کسی نے ساتھ نہیں دیا صاف انکار کر دیا کہ بھئی تم پر بھروسہ نہیں تم تو ڈرامے باز ہو۔ بھلا سوچو اس طرح کے القابات کے بعد دل پر کیا گزرتی ہے۔''

وہ صاف چوٹ کر رہا تھا خولہ سامنے ہی بیٹھی تھی، بے ساختہ کیا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ کچھ یہی حال قدسیہ اور عاشر کا تھا البتہ کشمالہ فوراً ہی اپنی چیئر سے اٹھ کر اس کے پاس آئی تھی۔۔

''دیکھو میرے دوست اللہ جب ایک در بند کرتا ہے تو کئی کھول دیتا ہے تم مایوس کیوں ہوتے ہو۔'' اس نے ہنسی دانتوں تلے دبالی تھی۔ عاشر کو اس کی یہ ادا بہت پیاری لگی تھی کبھی کبھی تو اس کی سنجیدگی کا خول ٹوٹتا تھا۔

عاشر کو اب وہ اپنے جیسی لگتی تھی، خاموش، گہرے سمندر جیسی مگر ہمدرد بادلوں کے سائے جیسی۔

''میں مایوس نہیں ہوں۔ بس انصاف کا طلبگار ہوں''۔

''تمہیں انصاف ضرور ملے گا میرے دوست، ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔'' عاشر کی چھٹی حس کچھ کہہ رہی تھی مگر وہ موقع محل کی مناسبت سے اس موضوع کو چھیڑنا چاہتا تھا اور پھر رات کو اس کا موقع خود بہ خود آ گیا۔

☆.....☆.....☆

راجہ طارق محمود نے دونوں کو طلب کیا تھا اور دونوں کے سامنے اپنی خواہش بھی رکھ دی تھی۔

''مجھے نہیں پتہ کہ تم دونوں کا فیصلہ کیا ہوگا تم لوگ اتفاق کرو گے یا نہیں لیکن میں ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں اور میری زندگی کا تجربہ یہ کہتا ہے یہ تمہارے لیے بہترین ہوگا۔

عاشر تمہارے لیے کشمالہ اور کاشف تمہارے لیے قدسیہ سے بہتر کوئی رفیق نہیں ہو سکتا۔'' انہوں نے بڑے سبھاؤ سے امید باندھی تھی اور پھر دونوں کو اپنی نظروں کے حصار میں لے کر دوستانہ لہجے میں

اپنی رائے سے آگاہ کیا تھا۔

عاشر نے چونک کر پہلے کاشف کو پھر طارق محمود کو دیکھا اسے حیرت نہیں خوشی ہوئی تھی کاشف کے لیے بہت اچھا لگا تھا کہ باپ نے اس کے دل کی بات بن کہے جان اور مان لی تھی۔ البتہ کاشف کسی گہری سوچ سے باہر آیا۔

''آپ جانتے ہیں میرے کام کی نوعیت آپ کو پتا ہے میری زندگی میں صرف سفر ہی سفر ہے، میں تو سمجھتا ہوں مجھے اس جھنجھٹ میں پڑنا ہی نہیں چاہیے۔'' وہ ذرا دیر کو چپ ہوا۔

''میں سچ بتاؤں مجھے خولہ کو دیکھ کر احساس ہوا تھا کہ وہ میرے مزاج کو سمجھ سکتی ہے، وہ بہت سی عادتوں میں میرے جیسی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ زندگی گزارنے کے لیے عادتوں کا مشترک ہونا ضروری نہیں بلکہ دل پر دستک نہ ہو تو یہ فیصلہ نہیں کرنا چاہیے اور شاید میں یہ نہیں۔'' راجہ طارق محمود کو بے ساختہ اس پر پیار آیا تھا وہ تھا

تو ان کے بیٹے کا ہم عمر مگر اس سے رشتہ دوستوں والا تھا۔

''اسی لیے جب ہمیں کوئی فیصلہ کرنے میں دقت ہو تو ہمیں فیصلہ بڑوں کے ہاتھ میں دے دینا چاہیے، قدسیہ اچھی لڑکی ہے اچھے خاندان کی ہے اور سب سے بڑی بات اس کی طبیعت کا ٹھہراؤ، سلجھا ہوا مزاج اور دھیما پن تمہاری بے چین اور سیلانی فطرت کے لیے بے حد مناسب ہے''۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو انہوں نے قدسیہ سے بات کی تھی اور وہ بس رو پڑی۔

''شاید آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اس نے سر جھکا لیا سیاہ آنچل کی اوٹ سے جھانکتی سیاہ آنکھیں اسے اپنے اردگرد محسوس ہوئی تھیں۔ کیا کبھی ان آنکھوں نے اس کے دل پر دستک دی تھی۔ وہ حیرت زدہ تھا اسے جواب اثبات میں ملا تھا۔

''شاید نہیں بابا جان بالکل ٹھیک کہتے ہیں اب زیادہ ڈرامے کرنے کی ضرورت نہیں۔''

عاشر کا چہرہ خوشی سے مہکنے لگا۔ وہ دل سے ان دونوں کے ساتھ کا متمنی تھا پتہ نہیں کیوں۔؟

''اور برخوردار اپنے بارے میں کیا خیال ہے۔'' ان کی سرخی مائل آنکھوں میں شرارت کے رنگ اتر آئے۔

''اس کا خیال تو مجھ سے پوچھیں نا پہلی فرصت میں شادی کر دیں اس کی اور شادی اس لیے بھی ضروری ہے کہ کوئی تو چینج آئے کب سے زندگی ایک ہی ڈگر پر چل رہی ہے کوئی ہنگامہ ہونا چاہیے۔''

کاشف کے چہرے پر خوشی اور اطمینان نے راجہ طارق محمود کے سر سے بھی بوجھ اتار دیا۔

وہ خزیمہ کی آنکھوں میں خولہ کو دیکھ کر اترتے ستاروں کی جوت بجھنے نہیں دینا چاہتے تھے وہ دل سے چاہتے تھے

کہ مریم کے خاندان کے ساتھ رشتہ مضبوط ہو جائے انہیں یقین تھا مریم کی روح اس دن سب سے زیادہ خوش ہوگی جب خولہ خزیمہ کے ساتھ رخصت ہوگی۔

''ٹھیک ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں تم لوگ کراچی کا چکر لگا کر آؤ تو پھر کوئی ہنگامہ شروع کرتے ہیں اور ہاں کاشف تمہاری شادی راجہ ہاؤس سے ہوگی عاشر کے ساتھ اپنے بابا کو بتا دینا۔ میں نہ نہیں سنوں گا۔''

''اور یہاں پر کیا ہوگا؟'' کاشف تصور کی آنکھ سے نئے ہنگامے کا مزا لے رہا تھا۔

''یہ میری بیٹیوں کا گھر ہے ان کی مرضی وہ شادی کے بعد اپنے میکے میں رہیں یا سسرال میں۔ خالہ جان کے لیے میں ہی کافی ہوں۔'' وہ سب کچھ سوچ کر بیٹھے ہوئے تھے۔

عاشر کا دل چاہا کہ ان دونوں دوستوں کو تھوڑی دیر کے لیے تنہا چھوڑ دے وہ ایکسکیوز کرتے ہوئے باہر آ گیا۔ اس کا رخ نانو کے کمرے کی جانب تھا مگر برآمدے کی چیئر پر کوئی بیٹھا تھا۔ موڈ میں تو تھا اس لیے پیچھے سے جا کر ہلکی سی خوفناک آواز نکالی وہ مچل کر کھڑی ہوگئی۔ پلٹی تو عاشر کو دیکھ کر سانس

بحال ہوئی۔

''آپ نے مجھے ڈرا دیا۔'' وہ کسی خوفزدہ ہرنی کی طرح نظر آ رہی تھی۔ عاشر نے دلچسپی سے اس کے نازک سراپے کا جائزہ لیا اور کرسی کی پشت تھام کر کھڑا ہو گیا۔

''اتنی سی بات پر ڈر گئیں آپ۔''

یہ اتنی سی بات ہے۔ میں مما سے باتیں کر رہی تھی، اب سوچیں ان سے باتیں کرتے ہوئے کوئی بھوت بن کر آ جائے تو؟''

''یو مین، میں بھوت۔'' وہ ہنس پڑا۔

''بائی داوے۔ آپ اپنی مما سے کیا باتیں کرتی ہیں۔''

''ہوتی ہیں نا کچھ ایسی باتیں جو صرف ماں بیٹی کے درمیان ہوتی ہیں، میں نے انہیں آپ کا بھی بتایا کہ آپ اب غصہ کم کرتے ہیں ناراض نہیں رہتے۔'' وہ معصومیت سے بولی۔

''پھر انہوں نے کیا کہا۔؟'' عاشر کرسی پر بیٹھ گیا تھا اور اسے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

وہ مسکرا دیں، پتہ ہے وہ مجھ سے زیادہ پاپا سے بات کرتی ہیں، میرے پاس تو وہ کبھی کبھی آتی ہیں۔''

اس کے لہجے میں عقیدت تھی، عاشر کو سلاخوں کے پیچھے کھڑی وہ عورت یاد آئی جس سے مل کر اس کے دل میں کوئی احساس نہیں جاگا تھا سوائے تاسف اور ہمدردی کے۔

''مالا! ایک بات پوچھوں؟'' بہت دیر کی خاموشی کے بعد اس نے گہری سانس لے کر پوچھا تھا اور اس دوران کشمالہ، وہ صرف اس کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کرتی رہی، اسے افسوس ہو رہا تھا وہ کیوں اپنی مما کا ذکر کر کے عاشر کی تکلیف میں اضافہ کر بیٹھی۔

''صرف ایک بات۔'' اس نیما حول کی افسردگی کم کرنا چاہی۔

''ابھی تو صرف ایک بات۔'' وہ دھیرے سے بولا۔ کشمالہ کے دل کی دھڑکن تیز ہوئی، وہ اس

کی ہر بات سن سکتی تھی بس ایک بات کے علاوہ۔

''میں بہت ادھورا انسان ہوں بہت سی خامیاں ہیں میرے اندر، میں اپنے اندر بہت سی کمیاں محسوس کرتا ہوں، شاید میں سفاک بھی ہوں بے رحم اور بے حس بھی، کیا نباہ کر پاؤ گی؟'' وہ بول رہا تھا اور کشمالہ کی سانس اٹکی ہوئی تھی۔

''کیا آپ مجھے اجازت دیں گے کہ میں آپ کی ذات کا ادھورا پن دور کر پاؤں۔ خامیاں تو مجھ میں بھی بہت سی ہیں، بے رحم اور سفاک میں بھی ہوں، مجھے پتا ہے منیر کمال اس وقت کس حال میں ہے لیکن میرا دل اس کو معاف کرنے پر آمادہ نہیں۔''

خاموش بھیگتی رات ان کے اعترافات سن کر مسکرادی ، اسے دونوں کی سچ بولنے کی ادا اچھی لگی تھی۔ کم از کم انہیں اپنی ذات کا ادراک تو تھا۔ جو لوگ اس معاملے میں کم فہم ہوتے ہیں ان کے لیے اصلاح کے دروازے بھی کبھی نہیں کھلتے۔

کیا اب بھی آپ کو اجازت کی ضرورت ہے۔؟'' وہ صحیح سوچتا تھا، دونوں ایک جیسے تو ہیں پھر کس بات کی پریشانی۔

''مجھے اچھا لگے گا کہ میں ہر کام آپ کی اجازت سے کروں۔'' وہ دھیمے سے مسکرادی۔

''اور اگر میں منع کروں تو۔۔''

''تو میں لڑ جھگڑ کر اجازت لے لوں گی۔'' اس نے فوراً پینترا بدلا تھا۔ اتنے اچھے موسم کے اتنے قیمتی لمحے وہ اداسی اور افسردگی کی نذر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''بہت خوب۔ پھر فائدہ کیا ہوا منع کرنے کا۔''

''پھر فائدہ یہ ہوا کہ آپ مجھ سے لڑیں گے، مجھے روکیں گے، اس وقت کو یاد کریں گے۔ جل سڑ کر کہیں گے، کاش میں نے تم سے شادی کا فیصلہ نہ کیا ہوتا

''گڈ! گویا آپ میرے صبر کا امتحان لیا کریں گی۔'' عاشر محویت سے اسے دیکھنے لگا۔

''اور جو آپ ظلم کیا کریں گے تو میں بہت رویا کروں گی۔''

''پھر کیا ہوگا؟''

''پھر آپ مجھے منایا کریں گے، لیکن میں ناراض ہو کر پاپا کے پاس چلی جاؤں گی۔''

''سوچ لیں۔ میں لینے نہیں آؤں گا۔ وہ پوری طرح اس نے لڑائی جھگڑے سے محظوظ ہو رہا تھا۔

''تو کوئی بات نہیں میں خود ہی آ جاؤں گی۔ آخر آپ کے بنا رہ بھی تو نہیں سکتی۔''

وہ جس روانی میں بول رہی تھی اسی میں زندگی کا سب سے بڑا سچ بھی منہ سے نکل گیا تھا تب ہی اگلے لمحے وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر اپنی خفت مٹا رہی تھی۔ عاشر کا بلند قہقہہ اسے مزید شرمسار کر گیا تھا۔

''سچ میں شرمندگی کیسی مالا؟''

''کیا سارے سچ میں ہی بولتی رہوں گی ہمیشہ؟'' خدشہ زبان پر آ ہی گیا۔

''دستک دینے میں پہل بھی تو آپ نے کی ہے۔'' وہ مسکرا دیا شرارت سے۔

''یہ فاؤل ہے۔ میں تھک جاؤں گی۔'' اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

''یو ڈونٹ وری۔ میں نہیں تھکنے دوں گا۔ پتا ہے مالا جب خوابوں کو زندگی کا روپ مل جائے تو پھر ہمارے اردگرد خواہشوں کا میلہ سا لگا رہتا ہے۔ مجھے ڈر لگتا ہے اس ہجوم سے۔''

''عاشر! ایک بات کہوں خواب سے خواہش کا سفر اگر ریاضتوں سے بھرپور ہو۔ زندگی منتوں مرادوں کے بعد ملی ہو تو پھر آسودگی کے لمحوں میں شکر ادا کرنے کے سوا کچھ یاد نہیں رہتا۔''

''تو پھر میں اپنے رب کا شکر گزار ہوں کہ اس نے میری ذات کی تکمیل کے لیے جو بھیجا ہے وہ بالکل میرے جیسا ہے۔'' وہ اسے اپنی نگاہوں کے حصار میں لے کر بولا۔

''اور خوب گزرے کی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔''

آواز پیچھے سے آئی تھی۔ وہ دونوں اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ کاشف تالیاں بجا رہا تھا۔

''مل بیٹھیں گے دیوانے چار۔ میں ابھی قدسیہ کو بلاتی ہوں۔''

کشمالہ کو راہ فرار چاہیے تھی۔ اگلی جست میں وہ دروازے کے پیچھے غائب ہو گئی تھی۔

''خوش رہو میرے یار۔'' کاشف نے جذب سے کہا۔

''تم بھی ہمیشہ۔'' عاشر کے دل میں بھائیوں والا پیار امڈ آیا تھا۔

❁ ❁

ختم شد

نمرہ احمد کا بہت خوبصورت نیا ناول

مالا

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com

سمیرا حمید کا بہت خوبصورت نیا ناول

مشک بام

ہر ماہ باقاعدگی سے کتاب گھر پر پیش کیا جا رہا ہے
نئی اقساط پڑھنے کیلئے وزٹ کریں

kitaabghar.com